المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقام اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون: ۵۳۹۰۸

المعارف (لاہور)

جلد ۱۲ | جنوری ۱۹۷۹ - محرم الحرام، صفر ۱۳۹۹ | شمارہ ۱

ترتیب

تاثرات

اکتیس سال بعد خدا خدا کر کے ہمارے عزیز ملک پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ اور دینی اقدار کے فروغ پذیر ہونے کے مواقع میسر آ رہے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ حَمْدًا کَثِیْرًا۔

اس موقع پر ہم اپنے قابلِ احترام علمائے عظام کے باب عالی پر دستک دینا چاہتے ہیں۔ نہایت ادب سے ہم ان کی عنانِ توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں ان کی مساعی انتہائی کامیاب ثابت ہو سکتی ہیں۔ ملک و ملت کے لیے یہ بڑا ہی نازک مرحلہ ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ فقہی انداز کے فروعی اختلافات سے صرفِ نظر کر کے اسلام کے بنیادی احکام کو پیشِ نگاہ رکھیں۔ ایک دوسرے کو مطعون نہ ٹھہرائیں۔ کسی کے فقہی مسلک کو ہدفِ تنقید و تعریض نہ بنائیں بلکہ مثبت طریق سے اسلام کی خدمت انجام دیں جو سب کی مشترکہ متاع ہے۔

ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے جلسوں میں، خطبوں میں، درسِ قرآن و حدیث میں، مواعظ میں لوگوں کی اخلاقی تربیت کرنے کا عزم فرمائیں۔ ان کو معاصی سے روکیں، منہیات سے باز رہنے کی تلقین کریں، ان کے سامنے حرام و حلال کے شرعی پیمانوں کی وضاحت فرمائیں۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں خیر اور شر کے درمیان جو حدِ فاصل قائم کی گئی ہے، اس کو منقح کریں۔ عوام کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیں۔ احتکار، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، چور بازاری، سمگلنگ اور ماپ تول میں کمی بیشی سے منع کریں۔ بہتر اقدار سے روشناس کرائیں، غلط اور ناروا امور کے بُرے انجام کی نشان دہی کریں۔

اگر وہ اس قسم کی خدمات اپنے ذمے لے لیں اور تحریر و تقریر کے ذریعے نیکی کی ترویج اور برائی کی تردید کو اپنے فرائضِ منصبی میں شامل کر لیں تو ان کا یہ عظیم کارنامہ ہوگا اور وہ اس میں بہرحال کامیاب رہیں گے کیونکہ علمائے دین کو اس کے مواقع بھی حاصل ہیں اور ان میں سے ہر بزرگ اپنا خاص حلقہ بھی رکھتے ہیں جس میں ان کی آواز عزت و احترام کے ساتھ سنی جاتی ہے۔

امید ہے، پاکستان کے علمائے کرام اس طرف عنانِ توجہ ملتفت فرمائیں گے۔

(محمد اسحاق بھٹی)

محمد حنیف ندوی

قرآن حکیم اور اطاعتِ رسول

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں تشریع و قانون کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان تمام بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل، ۸۹)

اور ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جس میں ہر شے کی وضاحت ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (الانعام: ۱۱۴)

حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح المطالب کتاب بھیجی۔

الٓرٰ كِتٰبٌ أُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (ہود: ۱،۲)

الر۔ یہ کتاب وہ ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے بتفصیل بیان کردی گئی ہیں۔

آیئے ان آیات کی رو سے دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کس درجہ ضروری ہے، اور آپ کے منصب یا فرائض کار میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں تاکہ ہر مسلمان صحیح خطوط پر اپنی دینی زندگی کے نقشے کو ترتیب دے سکے، قرآن حکیم کے مطالب و معانی کو سمجھ سکے اور ان کو اپنی عملی زندگی میں سمو سکے۔ قرآن حکیم نے اس سلسلے میں دو انداز اختیار کیے ہیں۔ اکثر تو اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو بھی ضروری ٹھہرایا ہے اور کہیں صرف رسول کی اطاعت و پیروی ہی کا ذکر کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دینی نقطۂ نظر سے قرآن کے پہلو بہ پہلو، اسلام اور فقہ و تقنین کا دوسرا سرچشمہ یا مصدر ثانی جس سے ایمان و عمل کے تقاضے مکمل ہوتے ہیں، سنتِ رسولؐ ہے۔

قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (اٰل عمران ۳۲)

کہہ دو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم مانو، اگر نہ مانیں تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (اٰل عمران: ۱۳۲)

اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحمت کی جا سکے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ (النساء : ۵۹)

مومنو! خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف پیدا ہو تو اگر خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور رسول اور اپنے اولی الامر کے حکم کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (المائدہ : ۹۲)

اور خدا کی فرمانبرداری اور رسول کی اطاعت کرتے رہو اور ڈرتے رہو۔ اگر منہ پھیروگے تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ تو صرف پیغام کو کھول کر پہنچا دینا ہے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (الانفال : ۱)

اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۝ (الانفال : ۲۰)

ایمان دارو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اس سے روگردانی نہ کرو اور تم سن رہے ہو۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا (الانفال : ۴۶)

اور خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا ایسا کروگے تو بزدل ہو جاؤگے۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ ۖ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (النور : ۵۴)

کہہ دیجئے کہ خدا کی فرمانبرداری کرو اور رسولِ خدا کے حکم پر چلو، اگر منہ موڑوگے تو رسول پر اس چیز کا ادا کرنا ہے جو ان کے ذمہ ہے اور تم پر اس چیز کا ادا کرنا ہے جو تمھارے ذمے ہے اور اگر تم ان کے فرمان پر چلوگے تو سیدھا رستہ پالوگے اور رسول کے ذمے تو صاف صاف احکامِ خدا کا پہنچا دینا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (محمد : ۳۳)

مومنو! خدا کا ارشاد مانو اور پیغمبر کی فرمانبرداری کرو اور اپنے عملوں کو ضائع نہ ہونے دو۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (مجادلہ : ۱۳)

اور خدا اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کرتے رہو اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (التغابن : ۱۲)

اور خدا کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر تم منہ پھیر لو گے تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کھول کر پہنچا دینا ہے۔

یہ وہ آیات ہیں جن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں دونوں کی اطاعت و پیروی کو یکساں طور سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے، یعنی جو اسلوب، انداز اور پیرایۂ اظہار اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے اختیار کیا گیا ہے، بعینہٖ وہی نہج اور طریق اطاعتِ رسول کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اب ان آیات پر ایک نظر ڈالتے چلیے جن میں اطاعتِ رسول کو مستقل بالذات، اور منفرد دین کی اساس اور بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء : ۸۰)

جو شخص رسول کی پیروی کرے گا تو بیشک اس نے خدا کی پیروی کی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (النساء : ۶۴)

اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (آل عمران : ۳)

لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تمھیں دوست رکھے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (النور : ۶۳)

تو جو لوگ آپ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ ایسا نہ ہو ان پر کوئی آفت آپڑے یا تکلیف والا عذاب نازل ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء : ۶۵)

آپ کے پروردگار کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو آپ فیصلہ کر دیں اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے تسلیم کر لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

یہ آیات اپنے مفہوم و معنی میں اس درجہ واضح ہیں کہ ہم نے ان کی تشریح و تفسیر کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، البتہ ان آیات سے جو نکات نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آتے ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینا چاہیے۔

(۱) اطاعتِ رسول، دین کی اتنی اہم اساس ہے کہ اس سے انکار کفر کا مستوجب ہے۔

(۲) اللہ کے رسول کی اطاعت رحمت الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

(۳) کسی بھی فقہی و دینی مسئلے میں اختلاف رائے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۴) اللہ اور اس کے رسول کے پیغام پر ایمان کے تقاضے اسی وقت پورے ہوسکتے ہیں، جب کہ حضور کی اطاعت و فرمانبرداری کو حرزِ جان بنایا جائے۔

(۵) اطاعتِ رسول کی روگردانی سے حبطِ اعمال کا اندیشہ ہے۔

(۶) رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے مترادف ہے۔

(۷) ہر پیغمبر اسی لیے مبعوث ہوا ہے کہ لوگ اس کے نقشِ قدم پر چلیں۔

(۸) محبتِ الٰہی صرف ایسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے کہ آنحضرت کے ارشادات و اعمال کی پیروی کی جائے۔

(۹) جو لوگ آپ کی تعلیمات کی مخالفت میں سرگرم ہیں، ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔

(۱۰) ایمان اس وقت تک تکمیل پذیر نہیں ہوتا جب تک آنحضرتؐ کے احکام و اوامر کو پورے اخلاص سے تسلیم نہ کیا جائے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن نے آنحضرتؐ کے منصب اور فرائض کار کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے، تو اس کو سمجھنے کے لیے نامناسب نہ ہوگا کہ پہلے تصورِ نبوت سے متعلق ان خیالات و افکار کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جائے جو یکسر ملحدانہ اور غلط ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس موضوع میں اصل اشکال یہ ہے کہ نبوت کا مسئلہ خالص دینی ہے اور جب اس کو حل کرنے کے لیے عقل و خرد کی واماندگی پر اعتماد کیا جائے گا تو اس سے لازماً نبوت کی عظمت و حقیقت پر روشنی نہ پڑسکے گی اور نہ یہ بات واضح ہوسکے گی کہ انبیا کی تعلیمات میں، جو ایک طرح کا توافق اور ارتقا و تسلسل پایا جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ جس طرح سائنس کے مسائل کو غیر سائنسی اصولوں کی روشنی میں حل نہیں کیا جاسکتا، ٹھیک اسی طرح وہ مسائل جن کا تعلق خالصتہً دین سے ہے، ان کو

غیر دینی وسائل و ذرائع کے بل بوتے پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے، بعض لوگوں نے اس کے باوجود اسرارِ نبوت تک پہنچنے کی ناکام کوشش کی۔ مثلاً کچھ لوگوں نے اسے کہانت کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا، حالانکہ نبوت اور کہانت میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ جن لوگوں نے عربی ادبیات میں کاہنوں کے منقولہ اقوال کا مطالعہ کیا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جہاں ارشاداتِ انبیا میں حکمت و دانائی اور رشد و ہدایت کے موتی ضو فگن ہیں، گہرائی اور عمق ہے، وہاں کہانت میں ڈھلے ڈھلائے، بے معنی اور سطحی جملوں کے سوا کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ کاہن کو انبیا و رسل سے وہی نسبت حاصل ہے جو ذرہ کو آفتاب سے ۔۔ ان کے اقوال میں نہ صحت و بصیرت کی کوئی جھلک ہے، نہ زندگی کے مسائل سے متعلق کوئی پیغام و دعوت کا نظام پایا جاتا ہے، نہ اخلاق کو سنوارنے کی تعلیم ہے، اور نہ اللہ تعالیٰ سے رشتۂ عبودیت استوار کرنے کا کوئی طریق مذکور۔ کیونکہ یہ ساری چیزیں انبیا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

بعض حضرات نے کہا کہ نبوت اس شدید احساس و تاثر کا نتیجہ ہے جو معاشرے میں فکر و نظر کی گمراہیوں کو دیکھ کر ایک ذہین اور حساس مصلح انسان کے دل میں ابھرتا ہے ۔ ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ معاشرے میں مروجہ برائیوں کے خلاف، اصلاح کا جذبہ بعض حضرات کو اس حد تک مجبور کر دے کہ وہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن ان کے لیے یہ کیا ضرور ہے کہ وہ اپنے کو فرستادہ تصور کرنے لگیں اور اپنے خیالات و افکار کو وحی و تنزیل کا نتیجہ قرار دیں۔

نبوّت کی ایک توجیہ نفسیات کے ماہرین نے یہ بیان کی ہے کہ یہ ایک نوع کی ذہنی بیماری ہے۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص جو ذہنی و فکری لحاظ سے عدم توازن کا شکار ہے متوازن و معقول اور قابلِ عمل نظامِ حیات پیش کر سکے، اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدروں کو بیان کر سکے، تہذیب و تمدن کے سانچوں کو ترتیب دے سکے، اور ان تمام گتھیوں کو سلجھا سکے، جن سے معاشرہ دوچار ہے۔ یہی نہیں، خود بھی ایسی پاکیزہ اور بلند زندگی بسر کر سکے، جو دوسروں کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتی ہو۔

نبوت کے بارے میں یہ ان لوگوں کی توجیہات تھیں جو ادیان کی صداقت اور سچائی پر یقین نہیں رکھتے اور محض ظن و تخمین کی بنا پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کچھ لوگ

ایسے بھی ہیں جو دینی ذہن رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوصف انھوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور اس مسئلے کی تہ تک نہیں پہنچ پائے۔ مثال کے طور پر بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ نبوت ولایت ہی کے اس مقام سے متعلق ایک حقیقت ہے جہاں پہنچ کر مجاہدہ و ریاضت سے سالک کا قلب اس لائق ہو جاتا ہے کہ اس پر وحی و تنزیل کی تجلیات کا انعکاس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نبوت اور ولایت میں جو فرق ہے وہ نوعیت کا نہیں، درجے کا ہے۔

ہمارے نزدیک نبوت کی یہ متصوفانہ تعبیر اس وجہ سے غلط ہے کہ قرآن حکیم سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہو پاتا کہ منصب نبوت سے بہرہ مند ہونے سے پہلے ہر نبی نے سلوک و معرفت کی وہ تمام منزلیں طے کی ہوں، جن کی صوفیا نے نشان دہی کی ہے۔ مزید برآں اس سے عقیدۂ ختم نبوت کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کسبی ہے وہبی نہیں۔ یعنی اگر آج بھی کوئی شخص تعلق باللہ کی اس منزل تک رسائی حاصل کر لے جس کو معرفت و سلوک کی اصطلاح میں آخری منزل کہا جا سکتا ہے تو وہ نبوت و رسالت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان اس کا قائل نہیں۔ نبوت و ولایت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ نبی وحی و تنزیل کے ذریعے جن حقائق تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ تمام تر معروضی ہوتے ہیں اور ولی کے قلب و ذہن پر جو نقوش مرتسم ہوتے ہیں وہ موضوعی ہوتے ہیں اور ان کا تانا بانا، معاشرے کے حالات، اقدار اور تعلیم و تربیت کے اسلوب و نہج سے تیار ہوتا ہے، اور ان میں جو تھوڑی بہت معروضیت پائی جاتی ہے، وہ بھی صاف اور واضح نہیں ہوتی بلکہ تعبیر طلب ہوتی ہے۔ ان نقوش و تاثرات کو ہم کشوف تو کہہ سکتے ہیں، وحی نہیں۔ کشوف کی شرعی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ سالک کے ذاتی تجربات ہیں۔ لہٰذا بہرحال ان کی صحت کا معیار یہ ہے کہ آیا یہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق ہیں یا نہیں۔ جس طرح ایک مجتہد کا استدلال و استنباط صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، اسی طرح کشوف میں بھی خطا و صواب دونوں کا امکان موجود ہے، بلکہ علامہ ابن تیمیہ کی زبان میں یہ کہنا چاہیے کہ کشف بھی ایک طرح کے اجتہاد ہی سے تعبیر ہے۔

دینی حلقوں میں ایک نہایت محدود اور بجائے خود غلط حلقہ ایسا بھی ہے جو نبوت و وحی کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی تنزیل کے لیے کسی شخص کو منتخب

کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کتاب کے متن اور الفاظ و حروف کو من و عن لوگوں تک پہنچا دے، لیکن اس کے اقوال و تشریحات اور عمل و کردار کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بھی وحی و تنزیل کا نتیجہ ہوں۔ لہٰذا جہاں تک دین و شریعت کا تعلق ہے اس کا سرچشمہ صرف وہ کتاب ہوگی جو اس پر نازل ہوئی ہے۔ پیغمبر کا عمل اور ارشادات نہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے پیغمبر کی حیثیت محض مبلغ اور شارح کی ہے شارع کی نہیں۔ ان کے ہاں ہر دور کے اہلِ علم کو یہ حق ہے کہ وہ حالات کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے طور پر کتاب اللہ کی تشریح کریں، شرح و تفسیر کے سانچے کو ڈھالیں، دین کی جزئیات اور تفصیلات کو متعین کریں اور لوگوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیں۔

نبوت و رسالت کا یہ گمراہ کن تصور دراصل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ وحیِ الٰہی کا دائرہ صرف کتاب اللہ تک سمٹا ہوا ہے اور اس کی وسعتیں اور ضو فشانیاں نبی کے اعمال اور ارشادات کو متاثر نہیں کر پاتیں۔ حالانکہ وحی ایسا عمل ہے جو پیغمبر کی پوری زندگی کو اپنی آغوش میں لیے رہتا ہے۔ اس لیے پیغمبر دینی حقائق کی تبیین و تشریح کے ضمن میں جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں اس میں منشائے الٰہی کی پوری پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: ۳، ۴)

اور وہ کوئی بات خواہشِ نفس سے منہ سے نہیں نکالتا، وہ تو وحیِ الٰہی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (احزاب: ۲۱)

تمھارے لیے پیغمبرِ خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

اللہ کی اطاعت اور رسول کی متابعت کو دو مختلف اور متضاد نمونوں پر تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف اظہار یا پرتو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کتب و صحائف کے ذریعے معاشرے کے مسائل کا حل نازل فرماتا ہے اور رسول اپنے عمل، کردار اور تشریحات سے وحی و تنزیل ہی کی روشنی میں ان کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ براہِ راست وحی کو علما کی اصطلاح میں وحیِ جلی کہا جاتا ہے اور اسی کی روشنی اور تاثیر کو وحیِ خفی۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغمبر کو بھیجا گیا ہے مگر اس پر کوئی متعین کتاب نہیں نازل کی گئی، لیکن اس کے باوجود اس کی پیروی کو فرض ٹھہرایا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر کی ذات بجائے خود حجت و دلیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

ہر نبی نے اپنے دور میں کتاب اللہ کی پیروی کے پہلو بہ پہلو اپنی پیروی کی بھی دعوت دی اور لوگوں سے کہا کہ اگر تم نجاتِ اخروی کے طالب ہو تو ہمارے نقشِ قدم پر چلو۔

حضرت نوح نے فرمایا:

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ (الشعراء: ۱۰۹، ۱۱۰)

میرا صلہ تو خدائے رب العالمین ہی پر ہے تو خدا سے ڈرو اور میرے کہنے پر چلو۔

حضرت ہود نے کہا:

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۚ (الشعراء: ۱۲۶)

میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت صالح کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۚ (الشعراء: ۱۴۴)

سو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت لوط کا کہنا ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۚ (الشعراء: ۱۶۳)

سو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت شعیب نے اسی پیرایۂ بیان میں بن کے رہنے والوں سے فرمایا:

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۚ (الشعراء: ۱۷۸، ۱۷۹)

میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں سو خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

حضرت مسیح نے ان الفاظ میں بنی اسرائیل کو اپنی بعثت کے مقصد سے آگاہ کیا:

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَیِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ (الزخرف: ۶۳)

میں تمہارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں، نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، تم کو سمجھا دوں۔

آئیے! اب یہ دیکھیں کہ ان توجیہات و تصورات کے مقابلے میں قرآن حکیم نے نبوت کا کیا تصور

پیش کیا ہے۔ ہم پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم نے واضح اور غیر مبہم انداز میں اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ رسالت و نبوت کا تعلق یکسر فیضانِ ربوبیت سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے کہ عقل و خرد کی وادیوں میں بھٹکتا پھرے، بلکہ انبیاء و رسل کو بھیج کر اس کی رہنمائی کی ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝ (طٰہٰ: ۵۰)

(موسیٰ نے) کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی، پھر راہ دکھائی۔

اس لیے کہ انسانی عقل و تجربہ بہرحال محدود و ناقص ہے، اس میں یہ استعداد نہیں پائی جاتی کہ وحی و تنزیل کی روشنی سے بے نیاز رہ کر تہذیب و تمدن کی گتھیوں کو کامیابی سے سلجھا سکے۔ اور اپنے لیے ایسی راہِ عمل کا تعین کر سکے جس پر گام فرسا ہو کر یہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر سکے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریق رہا ہے کہ ہر دور میں تسلسل کے ساتھ ایسے اشخاص منتخب کر کے مبعوث فرمائے، جو ذہنی، اخلاقی اور روحانی طور سے اس طرح کامل ہوں اور اس لائق ہوں کہ انسان کو ضلالت اور گمراہی کی پستیوں سے نکال کر رشد و ہدایت کے فرازوں تک پہنچا سکیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ (الانعام: ۱۲۴)

اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کسے منصبِ نبوت سے نوازے۔

نبوت و رسالت کی ذمے داریاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں تاکہ یہ لوگ خیر و خوبی کے قافلوں کو آگے بڑھا سکیں اور شر اور برائی کے قلع قمع کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں۔ اس مضمون کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، جس سے یہ بات نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق اللہ کی تدبیر اور نظامِ ربوبیت سے ہے۔ انسانی ماحول، معاشرے، استعداد، یا مجاہدہ و ریاضت سے نہیں۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۪ (البقرہ ۲۱۳)

پہلے تو سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا لیکن وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے تو خدا نے ان کی طرف بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران: ۱۶۴)

خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔

اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے انبیا کے لیے رسل کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا (المائدہ: ۷۰)

ہم نے بنی اسرائیل سے عہد بھی لیا اور ان کی طرف پیغمبر ارسال کیے۔

آنحضرت صلعم کے بارے میں خصوصیت سے ارشاد فرمایا:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؕ (الفتح ۲۸)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اور حق ظاہر کرنے کے لیے خدا ہی کافی ہے۔

اس نظام ربوبیت کی آخری کڑی آنحضرت کی ذات گرامی ہے اور آپ کے فرائض کار میں تین چیزیں داخل ہیں:

۱۔ تعلیم و تبلیغ

۲۔ تزکیہ ۔۔۔ اور

۳۔ تبیین

جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بیک وقت معلم و مبلغ بھی ہیں، اور کتاب اللہ کے شارح اور مفسر بھی۔ تعلیم و تبلیغ سے مراد یہ ہے کہ آپ امت کو دین کے بنیادی حقائق سے آگاہ کریں، اس کے ذہنی افق کو بلند کریں، اور فکر و نظر کی صلاحیتوں کو اس طرح جلا دیں کہ خدا کی کائنات اور انسان سے متعلق امت ان تمام معلومات سے بہرہ مند ہو سکے جس پر کہ تہذیب و تمدن کا ارتقا اور تعمیر منحصر ہے۔

تزکیہ سے یہ مقصود ہے کہ آپ اپنے روحانی فیوض اور اسوۂ حسنہ سے امت کے اخلاق و کردار کو سنواریں، ان میں انسانی فرائض کا احساس پیدا کریں۔ ہمدردی، محبت، اور تعاون و خیرسگالی کے جذبات کی پرورش کریں اور یہ بتائیں کہ انفرادی و اجتماعی سطح پر تقویٰ، پرہیزگاری اور تعلق باللہ کو

منزلوں کو کیونکر کامیابی سے طے کیا جا سکتا ہے۔
تبیین کے معنی یہ ہیں کہ قرآن حکیم میں فرائض و اعمال کے بارے میں جو کچھ بھی مذکور ہے اس کی وضاحت اپنے قول و عمل سے کریں۔ اور جہاں جہاں بھی تشریح طلب اوامر و احکام مذکور ہیں وہاں ان کی تشریح کریں اور امت کو پوری پوری تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں پر شب و روز میں کتنی نمازیں فرض ہیں، قیام، رکوع اور سجود میں کیا پڑھنا چاہیے۔ مناسکِ حج کیا کیا ہیں۔ نکاح، طلاق اور بیوع یا معاملات سے متعلقہ آیات کا کیا مفہوم ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور فرائض کار کے بارے میں ہم نے جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے:
كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْكُمْ ءَايَـٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا۟ تَعْلَمُونَ ۝ (البقرہ: ۱۵۱)
منجملہ اور نعمتوں کے جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور تمھیں پاک بناتے اور کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔
يَـٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ (المائدہ: ۶۷)
اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے سب کا سب پہنچا دیجیے۔
يَـٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَـٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ ٱلْكِتَـٰبِ (المائدہ: ۱۵)
اے اہل کتاب تمھارے پاس ہمارے پیغمبر آگئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب الٰہی میں سے چھپا رکھتے تھے وہ اس میں سے بہت کچھ تمھیں کھول کر بتا دیتے ہیں۔
وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (النحل ۴۴)
اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے تاکہ جو ارشادات لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر کھول کر بیان کر دیں اور تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔
ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُۥ ۝ (القیامہ: ۱۹)
پھر اس کے (یعنی قرآن) کے معانی کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے۔

قرآن حکیم نے جس طرح تصورِ نبوت و رسالت کو نکھارا اور بیان کیا اور جس انداز سے آنحضرتؐ کی اطاعت و اتباع کو ضروری ٹھہرایا، اسی کا یہ نتیجہ اور فیض تھا کہ مسلمانوں نے ہر دور میں نہ صرف آپؐ کے نقوشِ قدم کی پیروی کی سعادت حاصل کی بلکہ ان نقوش کو اجاگر بھی کیا، اور ان کی حفاظت و صیانت کا اہتمام بھی کیا۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

بیمے کی شرعی حیثیت اور اس کا متبادل حل

بیمے کی ابتدا خالص انسانی ہمدردی کے جذبے سے شروع ہوئی تھی۔ تقریباً ۱۴۰۰ء میں اٹلی کے تاجروں میں سے ایک تاجر کا جہاز سمندر میں غرق ہوگیا اور وہ انتہائی تنگ دست ہوگیا۔ دوسرے تاجروں نے اس کے ساتھ تعاون کیا اور اس کے لیے کچھ رقم اکٹھی کرکے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکے۔

چونکہ ایسے حادثات کا آئندہ بھی امکان تھا للذا ان تاجروں نے آپس میں ایک تجویز منظور کی کہ آئندہ تمام تاجر ہر ماہ یا ہر سال جیسی بھی صورت ہو، ایک معین رقم ادا کر دیا کریں تاکہ اس فنڈ سے اس قسم کے حوادث و خطرات کے نقصان کا کسی حد تک تدارک کیا جاسکے۔

لیکن آہستہ آہستہ امداد باہمی کا یہ ادارہ کاروباری شکل اختیار کرنے لگا اور ایسے ادارے کا نام انشورنس کمپنی (INSURENCA COMPANY) تجویز ہوا۔ انشورنس دریقین دہانی" کو کہتے ہیں۔ بیمہ بھی انگریزی لفظ "انشورنس" کا ترجمہ ہے۔ گویا بیمہ کمپنی ایک ایسا ادارہ ہے، جو آفات و حوادث کے وقت نقصان کی تلافی کی یقین دہانی کراتا ہے۔

ابتداءً املاک (مثلاً بس، ٹرک، جہاز، عمارات) کا بیمہ شروع ہوا۔ بعد ازاں انسانی زندگی کا بھی بیمہ ہونے لگا۔ آج کل اس کا دائرۂ کار بہت وسیع ہوچکا ہے۔ انسان کے ایک ایک عضو کا بیمہ، جانوروں کا بیمہ اور بعض ذمہ داریوں (مثلاً بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ) کا بھی بیمہ کیا جاتا ہے۔

بیمے کے کاروبار کو بیشتر ممالک میں حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور بعض اوقات تو مجبوراً زندگی اور املاک کا بیمہ کرانا پڑتا ہے۔ ۱۹۷۲ سے پہلے ہمارے ملک میں کمپنیاں نجی طور پر بیمے کا کاروبار کرتی تھیں لیکن ۱۹۷۲ء میں حکومت نے ان کو اپنی تحویل میں لے لیا اور سب کمپنیوں کو مدغم کرکے سٹیٹ لائف کے نام سے اس کاروبار کو مزید فروغ بخشا۔ آج کل ہر سرکاری و نیم سرکاری ملازم، نیز ہر صنعتی اور تجارتی ادارے کے ملازم کا بیمہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کی موت یا حادثے کی صورت میں مقررہ رقم

اس کے ورثا کو مل جاتی ہے، جو حکومت یا متعلقہ ادارہ ادا کرتا ہے۔

بیمے کی شرائط

ایک شخص اگر اپنی زندگی کا بیمہ کرانا چاہے تو اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر اس کی صحت کا بیمہ کرکے اندازہ کرتا ہے کہ یہ شخص اتنی مدت مثلاً بیس سال تک طبعی طور پر زندہ رہنے کے قابل ہے۔ اب بیمہ کمپنی اور بیمہ دار کے درمیان ایک معاہدہ طے پاتا ہے۔ بیمہ دار جتنی رقم کا بیمہ کرانا چاہتا ہے، اسے سالانہ اقساط میں تقسیم کرکے بالاقساط بیمہ کمپنی کو ادا کرتا رہتا ہے۔ شرائط بالعموم یہ ہوتی ہیں:

۱۔ اگر بیمہ دار اپنی مدت مقررہ تک زندہ رہے، اور اقساط ادا کرتا رہے، تو اس مدت کے اختتام پر اس کو اس کی تمام جمع شدہ رقم مع مقررہ شرح کے سود ــــ جسے بیمہ کمپنی کی اصطلاح میں ایک معصوم سا نام "بونس" (فوائد) دیا گیا ہے ــــ ادا کر دی جاتی ہے۔

۲۔ اگر دورانِ مدت بیمہ، بیمہ دار طبعی طور پر یا کسی حادثے کے نتیجے میں مر جاتا ہے تو اس کی اتنی کی جمع شدہ رقم مع سود اس کے ورثا کو ــــ جنھیں وہ خود ہی نامزد کر چکا ہوتا ہے ــــ مل جاتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ادائیگی اقساط کی مدت جتنی کم ہوگی یا بالفاظِ دیگر بیمہ دار جتنی جلدی مرتا ہے شرح سود اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔

۳۔ اگر بیمہ دار کسی خاص مجبوری سے یا بالارادہ اقساط دینا چھوڑ دے تو پہلی ادا کردہ اقساط بحق کمپنی ضبط متصور ہوتی ہیں۔ اِلّا یہ کہ پالیسی پھر سے شروع کر دی جائے اور غیر ادا شدہ اقساط یکمشت ادا کر دی جائیں۔

آج کل اس شق میں یہ ترمیم کی گئی ہے کہ پالیسی ختم کرنے والے کو کل ادا شدہ رقم کا ۹۰٪ رقم واپس مل جاتی ہے۔

املاک یا بیمے کی دوسری اقسام میں بھی اس سے ملتی جلتی شرائط طے پاتی ہیں۔

بیمہ پالیسی کا اسلامی نقطہ نظر سے تجزیہ

غور کیا جائے تو بیمہ پالیسی چند در چند شرعی جرائم و منہیات سے ترکیب پاتی ہے، جو حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ شرط نمبر ۱ میں اصل ادا شدہ رقم سے زائد (مقررہ شرح سے) جو رقم ملتی ہے، وہ سود ہے، جس

کی حرمت میں کسی قسم کا شک نہیں۔

۲۔ شرط نمبر ۲ کے مطابق جو آدمی ایک آدھ قسط ادا کرنے کے بعد مرجاتا ہے، تو اسے اس کی ادا کردہ رقم سے کئی گنا زائد رقم مل جاتی ہے، جو قمار یا جوئے سے مشابہت رکھتی ہے۔ تھوڑی سی محنت پر اتفاقی طور پر بہت زیادہ رقم مل جانے کو ہی قمار کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے قمار یا جوئے کے لیے "میسر" کا لفظ استعمال کیا ہے، جو بالکل یہی مفہوم ادا کرتا ہے۔

۳۔ شرط نمبر ۲ شرعی احکام وراثت کو بھی متاثر کرتی ہے، کیونکہ اگر ایک شخص اپنی بیوی یا بیٹے کو اپنا وارث نامزد کرتا ہے تو کمپنی اسی خاص آدمی کو رقم حوالے کرنے کی پابند ہوتی ہے، جبکہ عام حالات میں اگر کوئی شخص ایسی غلط وصیت کر بھی جائے تو وہ قانوناً غیر مؤثر ہوتی ہے۔ غلط قسم کی وصیت بجائے خود ایک گناہ ہے۔ لیکن قرآن کے واضح احکام کے سامنے اس وصیت پر کوئی عمل پیرا نہیں ہوتا، نہ قانوناً ہوسکتا ہے اور نہ دوسرے وارث اسے ہونے دیتے ہیں۔ لیکن بیمہ کمپنی کی شرائط کی رو سے — جسے عموماً حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے — نامزد وارث دوسرے وارثوں کا حق غصب کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

۴۔ ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں کہ نامزد وارث بیمہ دار کو — محض حصولِ زر کی خاطر — کسی حیلے بہانے موت کے گھاٹ بھی اتار دیتا ہے۔ اسے یہ تو پہلے ہی یقین ہوتا ہے کہ دوسرے وارث اس رقم سے حصہ نہیں بانٹ سکتے۔ یہ "یقین دہانی" اسے قتل جیسے جرم کے ارتکاب کے لیے دلیر کر دیتی ہے۔ املاک کے بیمہ دار اپنی املاک کو اپنے ہاتھوں تلف کرتے دیکھے گئے ہیں۔ ایسی ہی صورت بیمے کی دوسری شکلوں میں بھی ہے۔

۵۔ بیمے کی شرط نمبر ۳ کے مطابق اگر کوئی شخص بیمہ جاری نہیں رکھ سکتا، اور کسی مجبوری کی بنا پر پالیسی سرنڈر (SURRENDER) یعنی ختم کرنے پر مجبور ہے تو اسے ادا کردہ رقم کے ۴۰٪ — بحق بیمہ کمپنی — سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ شریعت اس رقم کو ضبط کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتی، اور یہ تجارت کے متعلق قرآن کے حکم "عن تراضٍ منکم" کی صریح خلاف ورزی ہے۔

۶۔ شرط نمبر ۳ کے مطابق نہ تو بیمہ دار کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی قسطیں ادا کرے گا اور نہ بیمہ کمپنی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا وصول کرسکے گی اور اسے کیا کچھ ادائیگی کرنا پڑے گی۔ لہٰذا یہ "اندھا سودا"

یا بیع غرر (دھوکے والی بیع) ہے ، جو قطعاً ناجائز ہے۔

بیمے کے مزعومہ فوائد اور ان کا شرعی متبادل حل

بیمہ پالیسی کے عموماً مندرجہ ذیل فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔ سماجی تحفظ کے نام سے اسے مقبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۱۔ اس صورت میں ایک شخص کی رقم آسانی سے اقساط میں جمع ہوتی رہتی ہے جو ایک طویل مدت معینہ کے بعد منافع (سود) سمیت اسے واپس مل جاتی ہے۔ گویا سرمایہ بھی محفوظ رہتا ہے اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ حوادث کی صورت میں نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے

۳۔ متوفی کا بڑا بیٹا اگر خود سر ہو تو وہ جائز وارثوں یعنی ماں اور اپنے چھوٹے بھائیوں کا حق غصب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ بیمہ کمپنی متوفی کی آرزو کے مطابق اس کے نامزد کردہ وارث یا وارثوں کو یہ رقم ادا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ " ذمہ داری " کے بیمے کی صورت میں بیمہ کمپنی ایسی اولاد کی اعلیٰ تعلیم اور شادیوں کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہے۔

۴۔ ایک غریب آدمی کے لیے عام حالات میں کچھ رقم پس انداز کرنا یا ترکہ چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ بیمہ پالیسی کی صورت میں تھوڑی تھوڑی جمع شدہ رقم یتیموں اور بیواؤں کا سہارا بنتی اور آڑے وقت میں ان کے کام آتی ہے۔

تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا تمام تر صورت احوال سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ایک مخصوص ذہن عطا کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص محض اپنا ہی فائدہ سوچتا ہے۔ اور یہ بات اسلامی معیشت کی رو سے سراسر منافی ہے، جس کا پہلا سبق ہی یہ ہے کہ :

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ (مشکوٰۃ)

یعنی کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں، جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے

لہٰذا اسلامی نظامِ معیشت میں ان مندرجہ بالا صورتوں میں سے کچھ تو پیدا ہی نہیں ہوتیں اور اگر کچھ ہوتی ہیں تو ان کا واضح حل موجود ہے۔

اب ہم علی الترتیب مندرجہ بالا "فوائد" کا جائزہ لیں گے:

۱۔ جہاں تک سرمایہ کے جمع ہونے، اس کے تحفظ اور اس میں اضافے کا تعلق ہے، تو یہ کاروبار یا تجارت کی صورت میں بیمہ یا بنک سے بہتر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو واضح بات ہے کہ تجارت میں منافع سود سے زیادہ ہوتا ہے۔ ورنہ دنیا سے کاروبار مفقود ہو جاتا اور سود پر رقوم لینے والے بنک اور بیمہ کمپنیاں بھی بالآخر کاروبار ہی کرتے ہیں۔ تو گویا ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ کاروبار سود کے بجائے تجارتی بنیادوں پر ہو۔ چاہے یہ کاروباری ادارے بنک ہوں یا بیمہ کمپنیاں یا مشترکہ سرمائے کی کمپنیاں یا دوسرے بھی ادارے۔ یعنی اصل مسئلہ ان اداروں کو سود سے پاک کرنے کا ہے، نہ کہ عوام کو سودی کاروبار میں پھنسانے کا۔ یہ مسئلہ فی الحقیقت حکومت کی توجہ کا طالب ہے۔ تاہم اگر یہ ادارے چاہیں تو خود بھی اپنا کاروبار شرعی تجارت کے خطوط پر چلا سکتے ہیں، اور ایسے اداروں کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے، جو بلا سود تجارتی کاروبار کرتے، لوگوں سے ان کی بچتیں وصول کرتے اور انھیں نفع تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایسے اداروں میں رقوم جمع کرانے سے جہاں مطلوبہ تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہاں سود کی کسک سے انسان کو نجات مل جاتی ہے اور وہ حلال کمائی پر مطمئن بھی ہوتا ہے۔

۲۔ حوادث کے موقع پر نقصان کی تلافی: اسلامی نظامِ معیشت میں ایسی صورتوں میں حسبِ ضرورت بیت المال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور بیت المال کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب امداد فراہم کرے۔ لیکن ہم کو اسے اسلامی نظام پر معلق نہیں رکھنا چاہیے کہ کب بیت المال قائم ہو اور اس مسئلے کا متبادل حل سامنے آئے۔ موجودہ دور میں اس کا حل وہی ہے، جہاں سے بیمے کی ابتدا ہوئی تھی۔ مثلاً بسوں اور ٹرکوں کے مالکان ایک ایسی انجمن بنائیں، جس میں وہ ماہانہ چندہ اور عطیات ادا کریں۔ اس جمع شدہ رقم کو تجارت پر لگائیں، اور منافع تقسیم کرنے کی بجائے حوادث کی تلافی کے لیے مخصوص کر دیا جائے بلکہ حسبِ ضرورت اصل سرمائے سے بھی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔ کسی بس یا ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو جانے یا جانی نقصان کی وجہ سے کچھ معاوضہ ادا کرنا پڑے تو اس فنڈ سے ادا کر دیا جائے۔ اس طرح اصل سرمایہ بھی محفوظ رہے گا اور منافع کی رقم سے جو دوسرے مصیبت زدہ بھائی کی امداد بھی ادا کی جائے گی،

اس کا بھی بالواسطہ ہر ایک کو فائدہ ہے۔

یہ طریقہ اس لحاظ سے بہتر ہے کہ حوادث پر کنٹرول کرنے کی فکر خود اس انجمن کو ہوگی۔ وہ خود ایسی تجاویز پیش کرے گی جس سے حادثات کم سے کم رونما ہوں۔ جبکہ بیمے کی صورت میں قطعاً یہ احتیاط نہیں کی جاتی۔ بلکہ بعض اوقات مالکان خود اپنی املاک تلف کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں تاکہ وہ بیمہ کمپنی سے معقول رقم وصول کر سکیں۔ رہا قانونی گرفت کا سوال تو اس سے بچنے کی راہیں ملک کے نرم قوانین اور پھر وکلا کی موشگافیوں نے بہت حد تک ہموار کر رکھی ہیں۔

ایسی انجمنیں یا کمپنیاں جتنی زیادہ ہوں گی اتنا ہی معاشرے کی فلاح کے لیے بہتر ہوگا۔ کسی ایک مارکیٹ کے تاجر مل کر ایسی انجمن کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ دوکانوں کو بھی بعض دفعہ آگ لگ جاتی ہے، کہیں ڈاکہ پڑ جاتا ہے تو ایسی صورت میں انجمن کے فنڈ سے تلافی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح صنعت کار، کسان اور دوسرے کاروباری طبقے پیشے اور کاروباری اشتراک کو ملحوظ رکھ کر ایسی انجمن بنا سکتے ہیں۔

ہمارے خیال میں حکومت کو خود اس طرف توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ مثلاً بس اور ٹرک مالکان کی انجمن بننے سے ٹریفک کے حوادث میں خاطر خواہ کمی واقع ہو سکتی ہے اور عوام کو ٹریفک پولیس کی رشوت اور چالان سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسری صورتوں میں بھی عوام کی ذمہ داریاں بہت کم ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ وہ کاروباری لوگوں کو ایسی انجمنیں بنانے کے لیے قوانین بنائے

۳۔ متروکہ مال کی تقسیم میں گڑبڑ : ہمارے ہاں آج کل قانون وراثت رائج ہے۔ لہٰذا اگر متوفی کوئی غلط قسم کی وصیت کرے تو وہ قانوناً اور شرعاً دونوں لحاظ سے غیر مؤثر ہوگی۔ بیمہ کمپنی کی شرطیں شریعت کے قانونِ وراثت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا اور چونکہ بیمہ کمپنی حکومت کی تحویل میں ہے، لہٰذا ایسی رقم جو کسی نامزد وارث نے بیمہ کمپنی سے حاصل کی ہو، اسے اس سے واپس لے کر قانون کے مطابق تقسیم کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے، بلکہ یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔

رہا بڑے بیٹے کے خود سر ہونے کا سوال، تو ایسی صورت میں شریعت میں "وصیت" کا انتظام موجود ہے۔ اگر ایسا خطرہ موجود ہو تو متوفی اپنی برادری کے کسی قابلِ اعتماد اور دیانت دار آدمی کو وصی مقرر کر سکتا ہے۔ اگر برادری میں ایسا آدمی نہ ملے تو کسی بھی معروف اور امین آدمی کو وصی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر مرنے والا خود کسی وجہ سے وصی مقرر نہیں کر سکا تو حاکم وقت یا اس کے کسی بھی نائب کو یہ حق دیا گیا ہے

کہ وہ وصی مقرر کردے۔

وصی کے باضابطہ فرائض ہیں اور وہ ان کے لیے جواب دہ ہے۔ وصی کے فرائض یہ ہیں کہ وہ ترکے کو حسبِ دستورِ شریعت تقسیم کرے۔ اور اگر وہ یہ دیکھے کہ بچے نادان، چھوٹے اور بے سمجھ یا عیاش ہیں تو وہ ترکے کی رقم ان میں تقسیم نہیں کرے گا۔ بلکہ یہ متروکہ جائداد یا تو بیت المال میں جمع کرادے گا، یا خود اپنے پاس بطورِ امانت رکھے گا اور حسبِ ضرورت خرچ کرتا رہے گا۔ گویا وصیت کے نظام میں "ذمہ داریوں کے بیمے" کا مکمل حل موجود ہے۔

"وصایا" کے نظم پر عہدِ نبوی اور دوسرے صحابیوں پر عمل ہوتا رہا۔ خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار یہ ذمہ داری قبول فرمائی۔ حضرت زبیر بن العوام اس "بارِ وصایت" کے اٹھانے میں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ سات جلیل القدر صحابہ نے آپ کو وصی مقرر کیا تھا[1]

۴۔ پس ماندگان کی امداد — ایسے یتیم اور بیوہ جن کی گزراوقات کے لیے کچھ ترکہ نہ ہو، اسلامی نظامِ معیشت میں ان کے اخراجات کی ذمہ داری بیت المال پر ہے اور یہی ادارہ ان مشکلات کا مؤثر حل ہے۔ موجودہ دور میں اس کا حل یہ ہے کہ کاروباری انجمن کی طرز پر، پیشے کی سطح پر بھی ایسی انجمنیں تشکیل دی جانی چاہئیں۔ مثلاً مستری اپنی انجمن تشکیل دیں، باربر یا حجام اپنی، لوہار اپنی وغیرہ۔ یہ لوگ اپنے حلقۂ انجمن کو وسیع سے وسیع تر اور محدود سے محدود تر کرسکتے ہیں۔ اور ایسی انجمنوں سے، پس ماندگان کی وقتی امداد کے علاوہ کئی اور فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ باہمی تعاون اور ہمدردی کی بنا پر قائم ہوتی ہیں۔ مثلاً یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے روزگار کا خیال رکھنا اور ان کی شادی کا انتظام وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے فوائد بیمہ کمپنی سے کسی صورت میں میسر نہیں آسکتے۔

---

[1] بیمہ زندگی۔ از مفتی محمد شفیع صاحب۔

جناب اشرف صبوحی

نجف کے موتی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشادات گرامی

قلب الاحمق وراء لسانہ

احمق کا قلب اس کی زبان کے تابع ہوتا ہے۔

یہ مقولہ بتاتا ہے کہ احمق کی ہر بات بے سوچے سمجھے ہوتی ہے۔ اس کے دل میں کچھ نہیں ہوتا اور زبان پر سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کی زبان بے روک چلتی ہے۔ بے اندیشہ ہر بات منہ سے نکال دیتا ہے۔ نتیجے پر غور نہیں کرتا ہے، اور بات کہنے سے پہلے اپنے دل سے مشورہ نہیں کرتا ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ زبان دل ہی کے اشاروں پر چلا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا دل زبان کی تیزی سے دب جاتا ہے۔

لسان العاقل وراء قلبہ۔

عقلمندوں کی زبان ان کے قلب کے تابع ہوتی ہے۔

عقلمند جو بات کرتا ہے، اپنی زبان ہلانے سے پہلے وہ اس کے اثرات پر غور و خوص کر لیتا ہے۔ جو کچھ منہ سے نکالتا ہے، اس کے آغاز و انجام پر دُور تک نگاہ ڈال لیتا ہے، تاکہ اس کی اچھائیاں اور برائیاں اوّل سے آخر تک نظر آ جائیں۔ وہ فقرے فقرے کو جانچتا ہے۔ لفظ لفظ کو تولتا ہے، پھر کوئی بات کہتا ہے۔ کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ زبان ہی پر بات کے بگاڑ سنوار کا انحصار ہے۔ یہی خیالات کو آراستہ ادھر اور ادھر سے اُدھر کر سکتی ہے اور ہماری صورت نمائیوں کا آئینہ اسی کے ہاتھ میں ہے، گویا عقلمند اپنی زبان کو اپنے دل کے قبضہ میں رکھتے ہیں۔

البخیل مستعجل الفقر یعیش فی الدنیا عیش الفقراء و یحاسب فی الاخرۃ حساب الاغنیاء۔

بخیل فقیر ہو جانے کی جلدی کرتا ہے۔ وہ دنیا میں فقیروں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ مگر آخرت میں دولت مندوں کی مانند اس سے حساب لیا جائے گا۔

واجب حقوق ادا نہ کرنے کا نام بخل ہے۔ یعنی جو شخص اپنے مال کو ضروریاتِ مذہبی سے روکتا ہے، اور ضروریاتِ مروّت سے ہاتھ کھینچتا ہے، وہ بخیل کہلاتا ہے۔

بخیل کی ادنیٰ صفت بے مروّتی ہے۔ یہ نہ اپنے ساتھ مروّت برتتا ہے اور نہ دوسروں کے ساتھ کوئی سلوک کرتا ہے۔ اس کے دل میں دولت کی محبت ایسی بےطرح پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اس کے مقابل میں جان، آبرو اور ایمان تک کو ہیچ سمجھتا ہے۔ روپے پیسے کی دوستی میں دنیا بھر کو دشمن بنا لیتا ہے، اور اس خیال سے کہ کہیں حقدار میرے مال کے مدعی نہ بن جائیں، اپنے آپ کو صدا مفلس، محتاج ظاہر کرتا رہتا ہے، اور چونکہ دنیا میں زر، زن، زمین —— یہی تینوں چیزیں خصومت، دشمنی، رقابت کے بیج ہیں —— اس لیے بخیل کے مال پر ہر شخص کی نظریں پڑتی ہیں، اور انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت میں سوراخ پڑ کر کسی طرح خالصے لگ جاتی ہے۔

فقیر وہی شخص کہلاتا ہے جو محتاج ہو۔ مالِ دنیا میں سے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور جو اپنی تن پوشی اور تن پروری سے بھی عاجز ہو۔ لیکن یہ فقیر تو اس لیے فقیر کہلاتا ہے کہ اس کے پاس دولت و مال کی قسم میں سے اللہ کا نام ہوتا ہے۔ مگر بخیل باوجود ہر طرح کی استطاعت رکھنے کے فقیر ہوتا ہے۔ وہ اچھا پہن سکتا ہے لیکن پہنتا نہیں۔ وہ اچھا کھا سکتا ہے لیکن کھاتا نہیں۔ گویا کوشش کرتا ہے کہ محتاج ہو جائے اور ساعی رہتا ہے کہ جس قدر زیادہ ہوسکے فقیروں کی سی زندگی بسر کرے۔ مگر چونکہ خدا نے اس کو دولت مند بنایا ہے، اس لیے آخرت میں بھی دولت مندوں ہی کے زمرے میں اس کا شمار ہوگا اور دولت مندوں ہی کی طرح سے اس سے بھی حساب لیا جائے گا —— کیونکہ دولت مندوں کو دولت صرف کرنے کو زمین دفن کرکے رکھنے کے واسطے نہیں دی جاتی ہے، ان کو دولت کا سانپ بننے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ ... کے راستے بتا دیے گئے ہیں، اور دولت سے دنیوی زندگی بسر کرنے کا طریقہ اور عاقبت کے بیوپار کا ڈھنگ بھی سکھا دیا ہے۔ اب یہ اس بخیل کا قصور ہے، جو خدا کے اس عطیے کو کام میں نہ لائے۔ اور بخل کی بیماری میں فقیر بننے کی کوشش کرتا ہوا اور فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہوا آخرت میں امیروں کی طرح اپنی دولت کا حساب بنانے کو اچھا سمجھے۔

٭ دولت "آبِ رواں" ہے اور دنیا ایک "کشتِ زار" اور خلائق بمنزلہ قطعاتِ اراضی جس طرح پانی سے زمینیں سرسبز ہوتی ہیں، اسی طرح اضافتِ خلائق کے ساز و برگ اور نشو و نما کا سبب دولت ہے۔

اسی طرح سبزۂ حیات لہلہاتا ہے اور اسی پر شگوفہ ہائے معیشت کا دارومدار ہے۔ اسی سے اختیاج کی پیاس بجھتی ہے اور یہی تمدن کے پھولوں میں رنگ و بو پیدا کرتی ہے لیکن پست و بلند زمینوں کی مانند طبائع خلائق بھی فطرتاً بلند و پست ہوتی ہیں۔ جس طرح بلند زمینیں بقدر ضرورت سیراب ہو کر زائد پانی کو پست زمین کی طرف بھیج دیتی ہیں۔ اسی طرح بلند قدر اور عالی ہمت طبائع دولت دنیا پر حاجت کے موافق اکتفا کرتے ہیں اور باقی سب زیر دستوں پر خرچ کر دیتے ہیں، جس طرح نشیبی زمینیں پانی کو جمع کر کے پھر کبھی نکلنے نہیں دیتی ہیں، اسی طرح دنی الطبع آدمی دولت کو سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔

بخل کا مرض ہے، اس کا علاج کرنا چاہیے۔ اس سے بچنے کی خدا سے دعا مانگنی چاہیے اور جو کچھ خدا تعالیٰ نے دیا ہے اس کے شکرانے میں دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہیے۔ بڑا علاج اس کا موت کو یاد کرنا ہے۔ اپنے ہمسروں کا خیال کرے کہ مال کے جمع کرنے میں کیسی کیسی مشکلوں کا سامنا کیا، اور کیسے کیسے دکھ سہے مگر آخر کو خالی ہاتھ گئے۔ جو کچھ مدتوں میں حاصل ہوا تھا، آناً فاناً تباہ ہو گیا۔

اللّٰھم اغفر رمزات النواظر وسقطات الالفاظ وشھوات الجنان وھفوات اللسان۔

یا اللہ! تو ہماری آنکھ اور گفتار اور خواہش نفس اور زبان کی تقصیرات کو معاف فرما۔

حقوق اللہ کیا، حقوق العباد کیا، جہاں کہیں رخنے پڑتے ہیں، آنکھ، زبان اور خواہشاتِ نفس ہی کی بدولت پڑتے ہیں۔ گویا دینی اور دنیاوی قسم کے گناہوں کا سبب یہی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو واقعی آنکھ، زبان اور خواہشاتِ نفس ہی کی رہزنی ہم کو خدا اور بندگانِ خدا کا چور بناتی ہے۔ اگر ہم ان کو اپنے قبضے میں رکھیں اور ان پر جہاد کرتے رہیں تو گناہ ہمارا دامن تک نہ چھو سکیں۔ اس لیے ارشاد ہے کہ تم ہمیشہ آنکھ، زبان اور نفس کے شر سے پناہ مانگتے رہو اور سدا آنکھ، گفتار اور خواہشِ نفس اور زبان ہی کی تقصیرات سے ڈرو، کیونکہ یہی تمام گناہوں کا باعث ہیں۔

یا الٰہی! ہماری آنکھ نے تیرے حکم کے خلاف جو کچھ دیکھا ہے، اس پر پردہ ڈال دے۔

ہمارے اقوال میں جو تجھ سے سرتابی پائی گئی ہے، اس سے درگزر فرما، ہمارے نفس نے تیرے کرم کے بھروسے پر جو شرارت کی ہے اس سے چشم پوشی کر اور ہماری زبان نے تیری جناب میں جو گستاخیاں کی ہیں، تو اُن کو عفو کی مسکراہٹ کے ساتھ نظر انداز کردے۔ آمین :

ما اضمر احد شیا الا ظہر منہ فی فلتات لسانہ وصفحات وجھہ۔

انسان کا ما فی الضمیر کبھی نہ کبھی اس کے چہرے اور زبان سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

ہزاروں ارادے، ہزاروں خواہشیں اور ہزاروں باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہم ان کو کبھی تو افشائے راز کے خوف سے، کبھی حجاب کے مارے اور کبھی عداوت کے ڈر سے ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کی شکایت دل میں لیے تو بیٹھے ہیں، مگر منہ سے اس لیے نہیں نکالتے کہ کہیں اس کا بُرا اثر نہ پڑ جائے۔ ملازمت کی خواہش تو ہے لیکن زبان سے کہنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں، اس واسطے کہ لوگ ہم کو اہلِ غرض میں شمار کرنے لگیں گے کسی کی تعریف کرنا تو چاہتے ہیں، مگر یوں نہیں کرتے ہیں کہ کوئی خوشامدی نہ کہنے لگیں وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ یعنی ہزاروں خیالات ہمارے ذہن میں جمع رہتے ہیں اور ہم کسی نہ کسی وجہ سے ان کے اظہار کرنے کی جرأت نہیں کرتے ہیں لیکن ہماری یہ روک تھام آخر کار ناکافی ہوتی ہے۔ خیالات اور ارادے میں بازی لے جاتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کر ہی رہتے ہیں، خواہ کسی صورت میں کیوں نہ ہوں۔

جس طرح زبان انسان کی ما فی الضمیر کو بیان کرنے کا آلہ ہے، اسی طرح بشرہ بھی دل کو بہت سی باتیں بتانے میں نہایت درجہ مشتاق ہے۔ چہرے کی کتاب کے پڑھنے والوں پر زبان کی نسبت زیادہ دل کے راز کھل جاتے ہیں، غرضکہ جو آدمی کے دل میں ہوتا ہے، وہ ایک نہ ایک وقت ضرور زبان سے یا چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے، کیونکہ ادھر تو خیالات اور ارادے عملی صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں، اور ادھر دل ہلکا ہونا چاہتا ہے اور دل کے ہلکا ہونے کی یہی شکلیں ہیں۔ اس لیے یہی دونوں ترجمان "چہرہ اور زبان" ما فی الضمیر کا انکشاف کرتے ہیں۔ کہیں کسی جگہ اور موقعہ پر چہرہ تقدیم کرتا ہے اور کہیں زبان، بہرحال دل کی کوٹھڑی میں جو کچھ ڈھکا چھپا ہوتا ہے، منکشف ہو ہی جاتا ہے۔

محمد اسحاق بھٹی

علم حدیث اور اسماء الرجال

لفظ حدیث کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل یا تقریر پر ہوتا ہے۔ اثر، خبر، اور سنت کے الفاظ بھی انہی معنوں میں مستعمل ہیں۔ حدیث کا لفظ خود رسول اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے کلام اور ارشادات کے لیے پسند فرمایا، تاکہ آپ کے اور دوسرے لوگوں کے کلام اور اقوال میں امتیاز ہو سکے اور آسانی سے نشان دہی کی جا سکے کہ یہ آنحضرتؐ کا فرمان ہے، اور یہ کسی اور کا قول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی روایات کے اس دل آویز اور ضوفشاں ذخیرے کو جو آنحضرت کے فرامین پر مشتمل ہے "حدیث" کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ علم "علم الحدیث" کہلایا۔

پھر آگے چل کر علم حدیث میں اس درجہ وسعت اور تنوع پیدا ہوا کہ اس سے متعدد علوم، عالم وجود میں آئے اور اس شجرہ طیبہ کی طویل و عریض شاخوں نے گوناگوں اور رنگا رنگ اصناف علم کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور پروان چڑھایا، ان علوم میں ایک نہایت بنیادی، اور ضروری علم "اسماء الرجال" کا ہے، جس کی علم حدیث کے ساتھ بدرجہ غایت گہری وابستگی ہے جب ہم حدیث کا لفظ بولتے ہیں تو ذہن میں بلا کسی ادنیٰ توقف کے فوراً اسماء الرجال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس علم کی کیا تعریف ہے اور اس کے حدود اطلاق کیا ہیں — ؟

مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ رواتِ حدیث کے حالات و کوائف سے آگاہی حاصل کرنا اور ان کی سیرت و سوانح اور تراجم و احوال کو معرضِ بیان میں لانا "فنِ اسماء الرجال" یا "علم اسماء الرجال" کہلاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کرام کے عظیم الشان اجتماع میں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

فلیبلغ الشاھد الغائب: یعنی جو لوگ اس مجمع میں موجود ہیں، جو میری زندگی کے لیل و نہار

سے واقف ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں سے میرے عمل و کردار کا مشاہدہ کیا ہے اور جانتے ہیں کہ ان کے سامنے میری حیاتِ دنیوی کس انداز کی رہی ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ یہ سب باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس وقت کسی وجہ سے یہاں موجود نہیں ہیں، یا ابھی اس عالم آب و گِل میں نہیں آئے، آئندہ پیدا ہوں گے۔

چنانچہ حضور کے جاں نثاروں اور آپ کے ہر قول و عمل کی حفاظت کرنے والی عالی قدر جماعت نے جنھیں آپ کے "صحابہ" کہا جاتا ہے، آپ کے اس ارشاد کو آویزۂ گوش بنایا۔ وہ مقدس جماعت، شانِ نبوت کی ایک ایک ادائے دل نواز سے نہ صرف واقف تھی، بلکہ اس پر دل و جان سے فریفتہ بھی تھی اور فریضۂ رسالت کے تیوروں اور اس کی نزاکتوں سے خوب آگاہ تھی۔

اس طائفۂ مقدسہ نے حضور فداہ ابی و امی کے آغازِ نبوت سے لے کر آپ کے وصال تک کے تمام واقعات، اوامر و نواہی کے سلسلے کی تمام باتیں اور معاملات و عبادات سے متعلق تمام احکام اپنی اولاد، اپنے تلامذہ، اپنے اعزہ و اقارب، اپنے رفقاء و احباب اور ملنے والوں کو بلا کم و کاست سناتے۔ صحابہ کرام کے بعد ان کے جن شاگردوں نے اس مسند کو زینت بخشی، انھیں تابعین کہا جاتا ہے، تابعین نے بھی تبلیغ و تدریس حدیث میں اسی گرم جوشی کا ثبوت دیا اور نہایت دیانت کے ساتھ اس امانت کو جو انھیں اپنے اساتذہ یعنی صحابہ عظام سے ملی تھی، اپنے شاگردوں کے حوالے کیا۔ تابعین کے شاگرد تبع تابعین کہلاتے ہیں۔ تبع تابعین نے بھی انتہائی کوشش اور سعیٔ مسلسل سے یہ خدمت انجام دی اور اپنے سے بعد کے حضرات کو اس عظیم الشان دولت دینی سے مالا مال کیا۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے روح پرور حالات، آپ کے اقوال و معمولات اور اسوۂ حسنہ کو علمائے حدیث کی رفیع المرتبت جماعت نے اس نہج و اسلوب سے محفوظ و مدوّن کیا کہ دنیا کی پوری تاریخ میں اس کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ انھوں نے روایات کی مدد سے حضور کے احوال و کوائف اور اعمال و اقوال کا ایک بے مثال گلستاں سجا دیا اور اپنی مساعی جمیلہ سے معلومات کا ایک پیکرِ حسین لوگوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی کی یہ بات حقیقتِ حال کی بالکل صحیح عکاسی کرتی ہے کہ:

"مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے حالات و واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

جن برگزیدہ ہستیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کو روایت کیا، یا جن شخصیتوں نے انھیں تحریر و کتابت کی سلک میں پرویا اور ان کے تحفظ و تدوین کی خدمت انجام دی انھیں رواتِ حدیث و آثار کے پُرشکوہ نام نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں صحابہ کرام سے لے کر ان کے زمانے سے بعد تک کے بزرگانِ دین شامل ہیں۔ مشہور مستشرق سپرنگر کے محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچی ہے۔ وہ خوش بخت لوگ جنھوں نے رسولِ اکرم کی زیارت اور ملاقات کا شرف حاصل کیا، ان میں سے کم و بیش بارہ ہزار افراد کے نام اور حالات صفحاتِ کتب میں پوری آب و تاب کے ساتھ نقش ہیں۔

ان راویوں سے جو روایات مروی ہیں وہ حدیث کی کتابوں میں جوں کی توں محفوظ ہیں۔ ان کتابوں میں صحاح ستہ، مسند امام احمد اور سنن ابنِ ماجہ وغیرہ خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے علاوہ، اور بہت سی کتابیں اس ذخیرۂ دینی کو اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوتے ہیں پھر سیرت اور مغازی کے موضوع کے متعلق متعدد کتابیں معرضِ تصنیف و تالیف میں آ چکی ہیں۔ سب سے پہلے روایات و احادیث کی جمع و تدوین کے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے کہنے سے حضرت امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے مغازی اور سیرت کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی، جو اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ بعدازاں مغازی اور سیرت کے موضوع سے متعلق کئی کتابیں ضبطِ تحریر میں آئیں۔

حدیث، تفسیر اور سیرت وغیرہ کے سلسلے کا بہت سا مواد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک ہی میں متعدد صحابہ کی کوشش سے صفحاتِ قرطاس میں آ گیا تھا، عہدِ صحابہ و تابعین میں اس ضمن میں مزید تگ و تاز ہوئی، اور جن لوگوں کے پاس زبانی یا تحریری طور پر یہ موجود تھا، ان سے حاصل کر کے انتہائی احتیاط کے ساتھ جمع کیا گیا۔ وہ اس باب میں ہر سنی سنائی بات کو شائستہ التفات نہ گردانتے تھے، کیونکہ ان کے پیشِ نگاہ ہر وقت حضور کا یہ ارشاد رہتا تھا۔

كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع ۔ یعنی کسی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات آگے بیان کرنا شروع کر دے ۔

انھوں نے روایات کے اخذ و قبول کے لیے انتہائی کڑی شرائط وضع کیں اور سخت قسم کے اصول مدوّن کیے ۔

اصحابِ حدیث نے روایات کے اخذ و قبول کے جو اصول و قواعد وضع کیے اور جو پیمانے اور معیار مقرر کیے، ان میں ایک یہ ہے کہ اس راوی کی روایت کو قابلِ قبول ٹھہرایا جاتے جو خود شریکِ واقعہ اور اس روایت کا راویِ اوّل ہے ۔ اگر بالفرض وہ خود شریکِ واقعہ نہیں تو ان تمام راویوں کا سلسلہ محفوظ ہونا ضروری ہے جو شریکِ واقعہ تک ساری بات پہنچا دیں ۔ اس کے علاوہ یہ بھی لازمی ہے کہ تمام راویانِ واقعہ کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں ۔ اصل واقعہ تک پورے سلسلۂ روایت میں کہیں انقطاع پیدا نہ ہو ۔ پھر اس بات کا اہتمام بھی ضروری ہے کہ کامل تحقیق و تفحص کے بعد یہ فیصلہ بھی کر لیا جاتے کہ سند میں جن راویوں کے نام لیے جا رہے ہیں، وہ کون لوگ ہیں ؟ حفظ و اتقان میں ان کا کیا مرتبہ ہے ؟ روایت و درایت میں کس درجے کے حامل ہیں ؟ کس قسم کی فہم و فراست کے مالک ہیں ؟ ان کی عدالت و صداقت کیسی ہے ؟ ثقاہت و مروت میں ان کا کیا مقام ہے ؟ معاملات میں کس پایہ کے لوگ ہیں ؟ مذہب و مسلک اور عمل و عقیدہ میں ان کا رجحان کیا ہے ؟ باریک بین اور دقیقہ رس ہیں یا کند ذہن اور غبی ؟ کب پیدا ہوئے ؟ کہاں پیدا ہوتے ؟ عہدِ شباب کس طرح گزرا ؟ زمانۂ کہولت کس طرح بسر ہوا ؟ شیخوخت اور پیری کی منزلیں کہاں طے ہوئیں اور کس انداز سے ہوئیں ؟ تعلیم و تعلم کے مراحل کس نہج سے گزرے ؟ کن اساتذہ سے تحصیل کی ؟ طالب علمی کا زمانہ کیسا تھا ؟ نشست و برخاست زیادہ تر کن افکار و خیالات کے لوگوں کے ساتھ رہی ؟ علم و تحقیق کے کس مرتبے پر فائز تھے ؟ شب و روز کس ماحول میں بسر ہوتے ؟ رفقا و احباب کس قسم کے تھے ؟ دلچسپیوں کا اصل محور کون لوگ تھے ؟ مغفل تو نہ تھے ؟ خلفاء و ملوک سے کوئی تعلق رکھتے تھے یا نہیں ؟ اگر رکھتے تھے تو متملق اور خوشامدی تو نہ تھے ؟ زہد و عبادت کا کیا حال تھا ؟ اعزہ و اقارب سے کس قسم کے تعلقات رکھتے تھے ؟ متساہل تھے یا نہیں ؟ توہمات کا شکار رہتے یا نہیں ؟ کسی معاملے میں

احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا تھا یا نہیں؟ راوی سفیہ یا فاتر العقل تو نہیں تھا؟ اگر اسے سفاہت کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا تو اس کی کون سی مرویات دور سفاہت سے پہلے کی ہیں اور کون سی بعد کی؟ اس میں اختلال تھا یا نہیں؟ راوی کا تعلق اہل ہوئی یا زنادقہ سے تو نہیں تھا؟ مزاج میں عبوست یا یبوست پائی جاتی تھی یا نہیں؟ توازن و اعتدال کا کیا حال تھا؟ غرض ہر راوی کے بارے میں اس قسم کی جزئیات اور تفصیلات کی چھان بین کی جاتی تھی۔

یہ تھے وہ پیمانے اور معیار جو مختلف محدثین نے قائم کیے اور انہی کی روشنی میں اخذ و قبول روایت کے اصول مقرر فرمائے۔

پھر رواۃ کے مدارج اور طبقات قائم کیے۔ ظاہر ہے بعض راوی ذہانت و فطانت اور فہم و فراست کے بدرجۂ غایت اونچے فرازوں پر فائز تھے اور انتہائی دقیقہ رس اور اصحاب عدل و صدق تھے، اور بعض حضرات ان اوصاف و کمالات میں کم درجے کے حامل تھے۔ اس کے لیے طبقۂ اولی، طبقۂ ثانیہ، طبقۂ ثالثہ اور طبقۂ رابعہ وغیرہ کی اصطلاحیں معرض وجود میں آئیں اور جو کوئی، جس طبقے یا درجے کا مالک تھا، اسی کو اس چوکھٹے میں موزوں کیا گیا۔

یہ طبقات سنن کے اعتبار سے بھی ہیں اور حفظ و عدالت کے اعتبار سے بھی ہیں!

محدثین عالی مقام نے یہ خدمت نہایت دیانت داری اور بلا خوف لومۃ لائم سر انجام دی۔ راویوں کی تدلیس کی وضاحت کی، ان کی مراسیل کی نشاندہی کی اور موقوفات کو صراحت سے بیان کیا، راویوں کے ضعف و غرابت کو واضح فرمایا، اور ان کے ذہول اور نسیان کو اجاگر کیا، ان کے تعصب فی المذہب کو صاف الفاظ میں نمایاں کیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا معاملہ تھا اور اس میں کھرے کھوٹے کا امتیاز اسی طرح ممکن تھا۔ اس کے علاوہ اس کے تحفظ و استناد کی کوئی صورت نہ تھی۔

اگر کسی راوی میں محدثین کی قائم کردہ شرائط پائی جاتیں تو اس کی روایت قبول کر لی جاتی ورنہ اسے ترک کر دیا جاتا۔ اس ضمن میں یحیٰی بن سعید قطان سے کسی نے کہا:

اما تخشی ان یکون ھؤلاء الذین ترکت حدیثھم خصماءک یوم القیامۃ۔

کیا آپ اس بات سے نہیں ڈرتے کہ جن لوگوں کی روایت کو آپ نے ترک کیا ہے، وہ قیامت کے

روز آپ سے جواب طلبی کریں گے۔

اس کے جواب میں ان کے جچے تلے الفاظ یہ تھے:

لان یکون ھٰؤلاءِ خصمی احبّ الیّ من ان یکون خصمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یقول لم لم تذب عن حدیثی؟

یعنی ان لوگوں کے مجھ سے جواب دہی کرنے سے کہیں بڑھ کر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے جواب دہی کریں اور پوچھیں کہ تم نے میری حدیث کا دفاع کیوں نہیں کیا؟

پھر محدثین نے سند کا التزام کیا اور ہر روایت با اسناد بیان کی۔ ان کے نزدیک سند کو دین کے جزوِ لاینفک کی حیثیت حاصل ہے۔ امام زہری کا قول ہے:

الاسناد من الدین لولا الاسناد لقال فیہ من شاء بما شاء۔

اسناد کا معلوم کرنا دین کا حصہ ہے، کیونکہ اگر اسناد نہ ہو تو پھر حدیث کو ہر شخص جس طرح چاہے، بیان کرے گا۔

عبداللہ بن مبارک، اس سے بھی آگے گئے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

بیننا و بین القوم القوائم یعنی الاسناد۔

ہم میں اور ان واضعین حدیث میں اسناد کا فرق ہے — یعنی ہم اسناد کا التزام کرتے ہیں اور یہ لوگ اسناد کی پروا کیے بغیر جو جی چاہے بیان کر دیتے ہیں۔

رواتِ حدیث کے حالات و کوائف کا علم حاصل کرنے اور ان کو مختلف طبقات و درجات میں منقسم کرنے میں محدثین نے بے پناہ کام کیا اور اس خدمت کی انجام دہی میں اپنی عمریں کھپا دیں۔ انھوں نے دور دراز بلاد و امصار کے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، ہزاروں میل کی خاک چھانی، طویل و عریض مسافتیں طے کیں۔ شہر شہر اور قریہ قریہ میں گھومے پھرے، راویوں سے ملے، اور ان کے بارے میں ہر نوع کی معلومات حاصل کیں۔ جو لوگ ان کے زمانے میں موجود نہیں تھے اور ان سے پہلے وفات پا چکے تھے، ان سے ملنے والوں سے یا ان کے ذریعے سے دوسرے قابل اعتماد لوگوں سے، جو ان کی مقرر کردہ شرائط پر پورے اترتے تھے، ان کے حالات معلوم کیے اور اس طرح وہ عظیم الشان فن معرضِ وجود میں آیا، جسے فن اسماء الرجال کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یعنی وہ فن جو رواتِ حدیث و آثار کے اسماء، القاب، کنیتوں، سوانح حیات، سیرت اور اوصاف کا احاطہ کرتا ہے، نیز ان کے بارے میں جرح و تعدیل اور ان کے طبقات و درجات کی تعیین کا آئینہ دار ہے۔ یہی وہ فن ہے، جس کے بارے میں معروف مستشرق سپرنگر کا کہنا ہے کہ:

"دنیا میں نہ کوئی قوم ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو۔"

جن اسلافِ کرام نے اس اہم اور بنیادی کام کی تکمیل اور انجام دہی کا بیڑا اٹھایا، وہ اپنے دور کے نہایت محنتی اور انتہائی مستعد لوگ تھے، وہ اس سلسلے میں نہ کسی کے دباؤ میں آئے، کوئی دنیوی حرص و طمع ان کے سدِ راہ ہوتی اور نہ کوئی بڑے سے بڑا مفاد ان کے قلم کی بے پناہ رفتار میں رکاوٹ پیدا کر سکا۔ انھوں نے اپنی سعیِ پیہم سے حدیث کے بارے میں تمام شبہات کا ازالہ کر دیا اور شک و شبہے کی کوئی صورت باقی نہیں رہنے دی۔ چنانچہ سمتھ جیسا متعصب مستشرق یہ کہنے پر مجبور ہے کہ:

"یہاں سورج کی پوری روشنی جمع ہو گئی ہے جو ہر چیز پر براہِ راست پڑ رہی ہے اور ہر شخص تک پہنچ سکتی ہے۔"

بلاشبہ وہ تمام حالات کتبِ اسلاف میں محفوظ ہو گئے ہیں، جن کا کسی بھی نہج سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے کوئی بھی تعلق تھا۔ ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ محدثین نے جس لگن اور قلبی تعلق کے ساتھ اس فن کو لائقِ اعتنا ٹھہرایا اور جس محنت سے اس علم کو معراجِ کمال تک پہنچایا، اس میں کوئی دوسری قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تو بلاشبہ سب کے سب عادول و صدوق تھے ہی، لیکن ان کے تلامذہ میں سے اور پھر ان کے تلامذہ کے تلامذہ میں سے بہت سے حضرات نمایاں ہو کر ابھرے جنھیں رواۃ پر جرح و تعدیل کے بہت بڑے امام مانا جاتا ہے۔ مثلاً بہ ترتیبِ زمانی ان میں سے بعض ائمہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

سعید بن مسیّب، سعید بن جبیر، شعبی، محمد بن سیرین، سلیمان اعمش، معمر، شعبہ، سفیان ثوری، حماد بن سلمہ، لیث بن سعد، امام مالک، عبداللہ بن مبارک، بشیر بن مفضل، وکیع بن جراح، [illegible]

سفیان بن عیینہ۔

فنِ اسماء الرجال اور اس سلسلے کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس موضوع پر غالباً سب سے پہلے ابو سعید یحییٰ بن سعید بن فروخ نے کتاب لکھی (ان کی وفات ۱۹۸ھ کو ہوئی) لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے۔ ان کے شاگردوں میں یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد سجستانی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اسماء الرجال کے سلسلے کی جو کتابیں دستیاب ہیں، ان میں سب سے پہلے امام بخاری کی تالیفات ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

التاریخ الکبیر، التاریخ الصغیر، الضعفاء الصغیر، کتاب المفردات والوحدان۔ پھر مختلف حضرات نے ان کتابوں کے ذیول لکھے۔ امام دارقطنی اور ابن محب الدین نے التاریخ کا تکملہ لکھا۔ خطیب بغدادی نے الموضح لاوہام الجمع والتفریق کے نام سے تعقب لکھا۔ ابن ابی حاتم نے التاریخ پر استدراک سپردِ قلم کیا۔

اسی فن میں امام بخاری کے بعد امام مسلم نے کتاب المفردات والوحدان تصنیف کی۔ امام مسلم ہی کے زمانے میں احمد بن عبداللہ عجلی نے کتاب الجرح والتعدیل قلم بند کی۔ امام نسائی نے کتاب الضعفاء والمتروکین تالیف کی ۔۔ یہ نہایت اختصار کے ساتھ ان چند مشہور کتابوں کا ذکر ہے جو تیسری صدی ہجری کے اوائل تک اسماء الرجال کے فن میں لکھی گئیں۔

چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر محدثین میں سے جنھوں نے اسماء الرجال پر قابلِ قدر ذخیرہ چھوڑا، چار بزرگوں کے اسمائے گرامی لائقِ تذکرہ ہیں۔ ان میں سے ایک محمد بن احمد بن حماد الدولابی ہیں، جو ۳۱۰ھ میں فوت ہوئے اور کتاب الاسماء والکنیٰ تصنیف کی۔ اس کتاب میں راویانِ حدیث کے ناموں اور کنیتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے ابنِ ابی حاتم ہیں جو الجرح والتعدیل کے مصنفِ شہیر ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب الکنیٰ اور کتاب المراسیل بھی ان کی تصانیف ہیں، جو اسی موضوع پر مشتمل ہیں ۔۔ تیسرے امام دارقطنی ہیں، جنھوں نے ۳۸۵ھ میں وفات پائی اور ضعیف راویوں کے حالات میں کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ اسی صدی کے چوتھے بزرگ ابو احمد علی بن عدی بن علی قطان ہیں، جن کا سالِ وفات ۳۶۵ھ

ہے ۔ انھوں نے فنِ اسماء الرجال پر الکامل فی الجرح والتعدیل کے نام سے ایک کتاب لکھی ۔ اس کتاب کو الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتروکین کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے بعض لوگوں نے اس کا نام الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتحدثین بھی لکھا ہے ۔ متقدمین کے نزدیک یہ کتاب اپنے فن کی نہایت مقبول اور معروف کتاب ہے ۔ امام دارقطنی اس کتاب کی افادیت کے بہت معترف ہیں ۔ اس کتاب کے بھی قلمی نسخے موجود ہیں ۔ ابن القیسرانی محمد بن طاہر مقدسی نے اس کا ایک ذیل بھی لکھا ہے ۔ اس کتاب پر اور بھی متعدد اکابر اور اصحابِ علم نے کام کیا ہے کسی نے اس کا ذیل لکھا اور کسی نے تلخیص کی ۔

ابو احمد علی بن سدی بن علی قطان کی ایک کتاب اسماء الصحابہ ہے ۔ اس کا بھی قلمی نسخہ محفوظ ہے ۔

اسی فن میں پانچویں صدی ہجری کے آغاز کے ایک مشہور محدث عبدالغنی مقدسی نے جن کا سنِ وفات ۴۰۹ھ ہے ۔ الکمال فی اسماء الرجال کے نام سے ایک کتاب لکھی ۔ اس کی تہذیب و تکمیل یوسف بن زکی مزی نے تہذیب الکمال فی اسماء الرجال کے نام سے کی ۔ یہ کتاب بارہ جلدوں کو محیط ہے ۔ تیرہ جلدوں میں ابو عبداللہ علاء الدین المغلطائی بن قلیج نے الکمال فی اسماء الرجال کے نام سے اس کا تکملہ لکھا پھر حافظ ذہبی نے اس کی تلخیص کی ۔ ان کے علاوہ کچھ اور بزرگوں نے اس کی تلخیص بھی کی اور بعض نے اس پر اضافے بھی کیے ۔

پانچویں صدی ہجری کے بعض دیگر نامور اصحابِ حدیث اور بلند پایہ اربابِ قلم نے بھی اس موضوع پر کتابیں لکھیں ۔ مثلاً امام بیہقی نے جن کا پورا نام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی ہے اور سنِ وفات ۴۵۸ ہے ۔ "کتاب الاسماء والصفات" تحریر کی ۔

دیارِ اندلس کے معروف محدث ابن عبدالبر نے صحابہ کرام کے حالات میں "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" تالیف کی ۔ ان کا پورا نام ابو عمر جمال الدین یوسف بن عمر بن عبدالبر ہے ۔ قرطبہ کے اس عالم کو اس کے حفظ و اتقان اور وسعتِ علم کی وجہ سے "احفظ اہل المغرب" کہا جاتا ہے ۔ ان کا سالِ وفات ۴۶۳ھ ہے ۔

اس اہم موضوع کے چھٹی صدی ہجری کے مؤلفین میں سے امام ابن جوزی کی دو کتابیں لائق

تذکرہ ہیں۔ ایک کتاب الضعفاء والمتروکین اور دوسری اسماء الضعفاء والوضاعین۔ ابن جوزی نے ۵۹۷ھ کو وفات پائی۔ امام ذہبی نے ابن جوزی کی کتاب الضعفاء والمتروکین کی تلخیص بھی کی اور اس کے دو ذیول بھی قلم بند کیے۔

ساتویں صدی ہجری میں جن ائمۂ عظام نے اس ضروری عنوان کو قابل توجہ ٹھہرایا، ان میں امام نووی کا اسم گرامی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا سالِ وفات ۶۷۶ھ ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک تہذیب الاسماء اور دوسری المبہمات من رجال الحدیث۔

آٹھویں صدی ہجری کے جن اعاظم رجال نے فنِ رجال کو ہدفِ تحریر ٹھہرایا، ان میں بعض حضرات کا ذکر ضروری ہے۔ ان میں ایک حافظ ذہبی ہیں، جن کا سنِ وفات ۷۴۸ھ ہے۔ ان کی اس موضوع سے متعلق کم سے کم چھ کتابوں کا پتا چلتا ہے، جن کے نام یہ ہیں: تذکرۃ الحفاظ، طبقات الحفاظ، المشتبہ فی اسماء الرجال (اسے مشتبہ النسبۃ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے) المغنی، الکاشف، میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔

دوسرے مشہور مفسر و محدث حافظ ابن کثیر ہیں، ان کا پورا نام ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر ہے، انھوں نے ۷۷۴ھ کو انتقال کیا، یہ امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد ہیں۔ فن اسماء الرجال میں تکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل، ان کی تصنیف ہے۔

نویں صدی ہجری میں بھی اس موضوع پر بہت کام ہوا۔ اس عہد کے ایک مشہور ماہر فنِ رجال ابن مُزنی تھے۔ ان کا پورا نام ناصر بن احمد بن یوسف فزاری بسکری ہے۔ انھوں نے ۸۲۳ھ میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجر کا کہنا ہے کہ اس عالمِ حدیث نے تاریخ رواتِ حدیث کے بارے میں ایک بہت ضخیم کتاب تصنیف کی تھی، جو سو جلدوں کو محیط تھی۔ لیکن افسوس ہے یہ کتاب دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئی ہے۔

اس دور کے مشاہیر مصنفین میں سے ایک حافظ ابن حجر ہیں، جن کا سال ارتحال ۸۵۲ھ ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بڑا کام کیا اور اس سے متعلق قابلِ قدر کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں جن میں الاصابہ فی تمییز الصحابہ، تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب، لسان المیزان وغیرہ لائقِ تذکرہ ہیں۔

پھر نویں صدی ہجری کے آخر یا دسویں صدی ہجری کے بالکل آغاز میں حافظ سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے زوائد الرجال علی تہذیب الکمال کے نام سے اس موضوع پر کتاب لکھی۔ اس کے بعد اس باب میں تحقیق و تفحص کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

حافظ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے بھی اس مسئلے کو زیر بحث ٹھہرایا اور کتابیں لکھیں۔

بعض حضرات نے صرف صحاح کے راویوں کے بارے میں کتابیں لکھیں۔ بعض نے شیخین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے رواۃ پر کتابیں تصنیف کیں۔ بعض نے المؤتلف والمختلف وغیرہ نام کی کتابوں میں راویوں کے آپس میں ملتے جلتے ناموں میں التباس و اشتباہ کو رفع کرنے کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔

بعض مؤلفین نے "الموضح" کو موضوع بحث ٹھہرایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں یعنی ایسے رواۃ کا ذکر کیا جو اپنے نام، کنیت، لقب وغیرہ میں سے کسی ایک کے ساتھ مشہور ہیں لیکن سلسلۂ سند میں ان کا وہ مشہور نام یا لقب یا کنیت وغیرہ نہیں آیا بلکہ غیر مشہور نام یا لقب آ گیا ہے، ان کتابوں میں اصل حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔

پھر من نسی و حدث کے ضمن میں بھی کتابیں تصنیف کی گئیں یعنی کسی شخص نے کسی وقت کوئی روایت بیان کی لیکن بعد میں جب اس کو یہ روایت بتائی گئی تو وہ بھول چکا تھا۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ راویوں یا ان کے آباء و اجداد کے نام یا کنیتیں یا لقب یا نسبتیں باہم ملتی جلتی ہیں۔ اس سے التباس اور اشتباہ پیدا ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے، اس کی وضاحت کے لیے بھی محدثین نے مستقل کتابیں تالیف فرمائیں۔

فن اسماء الرجال پر تحقیق کا یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک چلا۔ اس عرصے میں حدیث اور رجال پر بے پناہ کام ہوا اور مختلف محدثین نے اس میں اپنی عمریں صرف کر دیں، آخری دور یعنی نویں صدی ہجری میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس موضوع سے متعلق بہت کام لیا، اسی اثنا میں ان کے تلامذہ حافظ سخاوی اور امام سیوطی نے اس فن کو مرکز تحقیق و تفحص ٹھہرایا، اور واقعہ یہ ہے کہ انہی حضرات پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ان کے بعد رواتِ حدیث پر کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ کوئی شخص اس علم میں اب مزید اضافہ نہیں کر سکتا اور نئی معلومات سے

سے اہلِ علم کو بہرہ ور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اب نہ وہ دور باقی رہا ہے اور نہ اس پر اضافہ ممکن ہے۔ اس موضوع پر استفادے کے لیے لازمًا ان ہی اصحابِ حدیث کی تصنیفات سے رجوع کرنا پڑے گا۔ ان کتابوں میں رواۃ کے تراجم اور حالات اور ان کے ذہنی، علمی، فنی اور عملی کوائف کا پوری طرح استیعاب کیا گیا ہے۔

اس فن نے یہاں تک وسعت اور تنوع اختیار کیا کہ اہلِ علم نے ہر فن اور ہر مسلک کے رجال پر "طبقات" کے عنوان سے بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً طبقات القراء، طبقات الشعراء، طبقات المفسرین، طبقات الصوفیاء، طبقات الاولیاء، طبقات الحکماء، طبقات الادباء، طبقات الحنابلہ، طبقات الشافعیہ، طبقات المالکیہ، طبقات الحنفیہ، طبقات الاطباء، طبقات اللغویین والنحاۃ، طبقات الخطاطین وغیرہ۔

لیکن چونکہ یہ کتابیں رجالِ حدیث سے متعلق نہیں ہیں، اس لیے اصطلاح میں ان پر اسماء الرجال کی کتابوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔

شیعہ اہلِ علم نے بھی اس موضوع کو لائقِ اعتناء اور قابلِ توجہ ٹھہرایا۔ ان کے ہاں اسماء الرجال پر جن لائقِ احترام حضرات نے کتابیں لکھیں، ان میں یہ بزرگ شامل ہیں، عبداللہ بن حسین تستری، ابوعبداللہ بن جبلہ الواقفی، ابوجعفر احمد بن محمد البرقی، ابوعبداللہ محمد بن حسین محاربی، ابوعمرو محمد بن عمر کشی، ابن بابویہ قمی، ابن الکوفی ابوالعباس احمد بن علی بن احمد بن نجاشی صیرفی، عبداللہ بن محمد حسن بن عبداللہ مامقانی، وغیرہ۔

ان کی تصنیفات میں سے معرفۃ اخبار الرجال، تنقیح المقال فی علم الرجال، منہج المقال فی احوال الرجال، منتہی المقال زیادہ مشہور ہیں۔ پھر ان کی تعلیقات اور ذیول وغیرہ بھی موجود ہیں۔

بہرکیف علمِ حدیث کے ساتھ ساتھ فنِ اسماء الرجال کا گہرا تعلق ہے، اور اس پر محدثین عظام نے جو کام کیا ہے، وہ عدیم المثال ہے۔ دنیا کی اور کسی قوم نے اپنے بزرگوں اور اسلاف کے حالات اس محنت اور جانفشانی سے جمع نہیں کیے جس طرح کہ محدثین نے کیے، انھوں نے اپنے اسلاف اور اکابر کے متعلق تمام امور منقح کرکے رکھ دیا ہے اور کھرے کھوٹے کی پوری وضاحت کردی ہے۔

ان کا بہت بڑا کارنامہ جس پر فخر کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھان بین اور نقد و تفحص کے سلسلے میں خالص علمی انداز کی طرح ڈالی جس کی دوسری قوموں کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

محدثین کی اس مساعی جمیلہ کے متعلق مشہور مستشرق گولڈ زیہر بھی اپنے انتہائی تعصب کے باوجود یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ جن محدثین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے طلبِ حدیث کے جذبے سے متاثر ہو کر شرق و غرب کا سفر اختیار کیا ہے، اس میں کسی مبالغہ آرائی کا دخل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ محدثین کرام کو اس بنیادی دینی خدمت کی انجام دہی پر بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ جزاهم الله عنا وعن جميع المسلمين۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان)

الفہرست : محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق ۔ اردو ترجمہ : محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآن مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علم نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعت کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیئے گئے ہیں۔

صفحات [illegible] مع اشاریہ ۔ قیمت [illegible] روپے

ملنے کا پتا : ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

جناب وفا راشدی

خواجہ محمد حسن جان سرہندی

حاجی حافظ خواجہ محمد حسن جان سرہندی نقشبندی سندھ کے مشہور مجددی سرہندی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد ماجد حضرت خواجہ حاجی عبدالرحمٰن[1] قندھاری نقشبندی اور جد امجد حضرت حاجی شاہ عبدالقیوم[2] مجددی نقشبندی اپنے وقت کے نقتدر علمائے کرام اور ممتاز مشائخ دین میں سے تھے۔ خواجہ محمد حسن کا سلسلہ نسب حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے واسطے سے سیدنا حضرت عمر فاروق ؓ سے اس طرح ملتا ہے:

خواجہ محمد حسن ابن خواجہ عبدالرحمٰن ابن شاہ عبدالقیوم ابن شاہ محمد فضل اللہ ابن شاہ ابن شاہ غلام نبی ابن شاہ غلام حسن ابن شاہ غلام محمد معصوم ثانی ابن شیخ محمد اسمٰعیل ابن شیخ محمد صبغت اللہ ابن خواجہ محمد معصوم ابن مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی الفاروقی ..... حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

خواجہ عبدالرحمٰن مجددی فاروقی حضرت خواجہ عبدالرحمٰن کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ ان کی ولادت ۴ شوال المکرم ۱۲۷۸ھ کو قندھار (افغانستان) میں ہوئی۔ ۱۲۹۵ھ میں افغانستان میں انقلاب آیا۔ ۱۲۹۷ھ کے پرآشوب دور میں خواجہ عبدالرحمٰن نے افغانستان سے ہجرت کر کے جنوبی سندھ کے قریہ ٹکھڑ (ضلع حیدرآباد) میں سکونت اختیار کی۔ ۱۳۱۲ھ میں ٹکھڑ میں زبردست سیلاب آیا تو ٹکھڑ کی سکونت ترک کر کے ٹنڈو سائیں داد میں آباد ہو گئے جہاں ۱۳۱۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔[3]

خواجہ محمد حسن نے اپنے والد بزرگوار سے صحیح بخاری شریف سبقاً سبقاً پڑھی۔ پھر قرآن کریم حفظ کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں جب ان کے والد اہل و عیال مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو محمد حسن بھی ان

---

[1] خواجہ عبدالرحمٰن کی حیات اور علمی و دینی خدمات کے لیے ملاحظہ ہو انیس المریدین (فارسی) از خواجہ محمد حسن جان سرہندی

[2] شاہ عبدالقیوم کی سوانح عمری، ملفوظات و مکتوبات کے لیے ملاحظہ ہو: حیات قیوم از مولانا اخوند امید علی ہالائی۔

[3] مونس المخلصین (فارسی) مصنفہ عبداللہ جان شاہ آغا سرہندی ص ۵ تا ۱۵

کے ہمراہ تھے۔ حج و زیارت کی سعادت حاصل کر کے خواجہ عبدالرحمن سندھ واپس آگئے، لیکن محمد حسن نے حرمین شریفین میں پانچ سال قیام کیا۔ اسی زمانے میں مولانا رحمت اللہ دہلوی المہاجر المکی کے مدرسۂ صولتیہ[۵۴] سے عربی علوم کی تحصیل کی۔ اس عرصے میں عرب و ترکان کے اساتذہ سے مستفیض ہوئے۔ علم تجوید و قرأت میں کمال حاصل کیا۔ حضرت شیخ احمد دحلان مفتی مکہ (مؤلفہ فتوحات اسلامیہ، سیرت نبویہ، تقریب الاصول وغیرہ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور استفادہ کیا۔ انہی دنوں شیخ المحدثین حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی مجددی ولد شاہ ابوسعید مجددی اور حضرت مفتی شیخ عبداللہ السراج سے علم حدیث و فقہ میں سند حاصل کی۔ حضرت شیخ ابو نصر محدث شامی سے بھی مستفید ہوئے۔

سلوک و صفا اور تصوف و معرفت کی تربیت اپنے صوفی منش باپ کے سایۂ عاطفت و شفقت میں پائی۔ والد کی وفات کے بعد درگاہ مجددیہ ٹنڈو سائیں داد کی مسند پر فائز ہوئے اور علم و عرفان اور رشد و ہدایت کی روشنی سے ہزاروں دلوں کو منور کیا۔ کہتے ہیں غیر مسلم بھی ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

حاجی حافظ خواجہ محمد حسن جان سرہندی نے پانچ مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ سندھ سے عرب تک کی سیر و سیاحت کی۔ جہاں جہاں قیام فرمایا علوم ظاہری اور نکات باطنی کا بالتفصیل مطالعہ کیا۔ انھوں نے دو سفرنامے تحریر فرمائے، جن میں ذاتی مشاہدات، تاثرات و تجربات قلم بند کیے ہیں۔

محمد حسن سندھ کے مختلف علاقوں میں رہے اور اہل دین و اہل خیر کے تعاون سے اپنی نگرانی میں سات مسجدیں تعمیر کرائیں اور "مدرسہ مجددیہ" کے نام سے ٹنڈو سائیں داد، لاڑکانہ، مہیسر، گوٹ عمر ضلع تھرپارکر میں چار مدرسے قائم کیے۔ ان مدرسوں کو حاجی لعل محمد متلوی مٹیاروش مخدوم حاجی حسن اللہ پاٹائی، مولوی خیر محمد مگسی، مولوی عبدالقیوم بختیارپوری جیسے لائق و فائق اساتذہ کی خدمات حاصل تھیں[۵۵]۔ ان مدرسوں کے اکثر طلبا نے علم و فضل میں ناموری

---

[۵۴] تذکرۂ علمائے حال، مؤلفہ محمد ادریس ٹکڑائی (قلمی نسخہ)

[۵۵] فائق علیا فرزدس، ص ۲۰۰۱۹

حاصل کی جن میں محمد حسن کے چار فرزند عبد اللہ جان شاہ آغا، حاجی عبد الستار، حافظ ہاشم جان، اور محمد حنیف جان کی علمی و ادبی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

خواجہ حافظ محمد حسن سرہندی نے ۸۷ سال کی عمر میں ۲ رجب المرجب ۱۳۶۵ھ (۲ جون ۱۹۴۶ء) کو وفات پائی۔

خواجہ محمد حسن نے اپنے کتب خانے[۵] میں عربی، فارسی، اردو کی قدیم و جدید کتابوں کا بہت قیمتی ذخیرہ چھوڑا۔ مختلف علوم و فنون کے ان ذخائر میں نادر و نایاب کتب اور مخطوطات بھی شامل ہیں۔

خواجہ محمد حسن کو شعر کہنے سے زیادہ انتخابِ شعر سے شغف تھا۔ کسی حادثے یا واقعہ سے متاثر ہو کر عربی یا فارسی میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ وہ دلچسپی سے اساتذۂ متقدمین و متوسلین کے شعروں کا انتخاب کرتے تھے۔ نظم، قطعہ، رباعی، خصوصاً تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے[۶]

محمد حسن کی عربی و فارسی تصانیف و تالیفات کی تعداد پچیس ہے، ان میں دو سفر نامے فارسی میں ہیں۔

پہلا سفر نامہ موسوم بہ "پنج گنج" ۱۳۲۰ھ میں سفر حجاز کے دوران لکھا گیا۔ پنج گنج ان پانچ رسالوں پر مشتمل ہے: (۱) سفر نامہ حرمین (۲) ادعیہ و احکامِ حج (۳) الاحادیث المسلسلۃ بالاولیۃ مع الاسانید من شیخ ابو نصر شامی (۴) شرح چہل کاف (۵) نصیحت نامہ۔

اس کتاب میں ان کے استادِ محترم حضرت محمد ابو نصر شامی کے علاوہ ان اساتذہ کرام اور علمائے عظام کا تذکرہ کیا گیا ہے جن سے انھوں نے فیض حاصل کیا۔

دوسرے سفر نامے میں ۱۳۳۲ - ۱۳۳۳ھ میں عراق، شام اور حجاز کی سیر و سیاحت کا ذکر ہے۔ فارسی کی یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے لیکن سندھی زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

مذکورہ بالا سفر ناموں کے علاوہ بعض تصانیف کے نام اور صراحت حسب ذیل ہے:

---

۵ ۔ راقم حضرت محمد حسن کے نواسے حکیم و پیر غلام محی الدین سرہندی اور مولانا اللہ بچایو خطیب مسجد درگاہ مجددیہ سندھ سائیں داد و مہتمم کتب خانہ محمد حسن کا ممنونِ احسان ہے کہ ان دونوں حضرات کی خاص توجہ اور رہنمائی کی بدولت کتب خانہ مذکور سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔

۶ ۔ محمد حسن کے عربی و فارسی کلام کے لیے ملاحظہ ہو: مونس المخلصین باب دوم

عربی - (۱) طریق النجات مع اردو ترجمہ - (مطبوعہ)

اصل عبارت کے بالمقابل ان کے لائق فرزند مولانا حافظ محمد ہاشم جان سرہندی کا اردو ترجمہ ہے۔ فاضل مصنف نے عقائد کے سلسلے میں محبت آل و اصحاب، ضرورت تقلید، تعریف بدعت وغیرہ سے متعلق عالمانہ انداز میں جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ ضخامت ۲۶۵ - مطبوعہ الفقیہ پریس امرتسر ۱۳۵۰ھ - یہ کتاب ترکی میں بھی چھپی ہے۔

(۲) - العقائد الصحیحہ مع اردو ترجمہ : مطبوعہ زیر اہتمام حکیم معراج الدین احمد نقشبندی مدیر اخبار الفقیہ، الفقیہ پریس امرتسر ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء - کتاب کے سرورق پر ناشر نے اس کا تعارف کرایا ہے۔

(۳) الاصول الاربعۃ فی تردید الوھابیہ : مطبوعہ الفقیہ پریس امرتسر ۱۳۴۶ھ - یہ کتاب متحدہ ہندوستان کے علاوہ ترکی میں بھی چھپی ہے۔ تحریک خلافت کے زمانے میں حنفی و اہل سنت کے عقائد کی تائید میں لکھی گئی۔

(۴) شفاء الامراض : (غیر مطبوعہ) سن تصنیف ۱۳۱۴ھ، مجموعہ تمائم و تعویذات، وظائف و دعوات - جسمانی بیماریوں کے روحانی علاج کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

(۵) لغات القرآن : (غیر مطبوعہ) قرآن کریم کے مشکل الفاظ کی تشریح اور ترجمے۔

(۶) رسالہ در قواعد تجوید : (غیر مطبوعہ) علم قرأت کا بیان۔

(۷) - رسالہ عالم برزخ : (غیر مطبوعہ) عالم برزخ و ارواح کے بیان میں۔

(۸) - سرور المحزون - (غیر مطبوعہ) مجموعہ لطائف و ظرائف۔

فارسی - (۱) انیس المریدین : خواجہ محمد حسن کے والد حضرت خواجہ عبدالرحمن سرہندی کی سوانح اور بزرگان نقشبندیہ کے حالات پر مشتمل ہے - اس کتاب کی تالیف کی ابتدا ۱۳۱۶ھ کو اور تکمیل ۱۳۲۸ھ کو ہوئی۔ دو سو صفحات کی یہ کتاب مطبع مجددی امرتسر سے شائع ہوئی تھی۔

(۲) انساب الانجاب : مطبوعہ مشہور عالم پریس ۱۳۴۰ھ - اس کتاب میں مصنف نے بزرگان سلسلۂ مجددیہ کی تاریخ و شجرۂ نسب کے علاوہ ان کی حیات و خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

(۳) رسالہ تہلیلیہ : مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور نے ۱۳۵۴ھ - اس کتاب میں

کلمہ طیبہ کی شرح و تفسیر۔ عقائد توحید، رسالت و نبوت، معجزے کی خصوصیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ، ولادت، ازدواج مطہرات، خلفا و صحابہ کرام کا حال ہے۔

۴۔ تذکرۃ العلما: عرب، خراسان، سندھ و ہند کے ان اولیا و صالحین کے تذکرے جن سے مصنف نے ملاقاتیں کیں اور مستفیض ہوئے۔ یہ کتاب ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۳۴۸ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوئی۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۵۔ رسالہ در علم قرأت۔ (غیر مطبوعہ)۔ فن قرأت و تجوید کے بیان میں۔

۶۔ شرح حکم: اصل کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کے مصنف شیخ عطاء اللہ اسکندری ہیں۔ اس کا موضوع علمِ توحید و معاملات عبد و معبود ہے۔ خواجہ محمد حسن نے آسان فارسی میں اس کی شرح لکھی ہے۔ یہ شرح ۱۳۴۴ھ میں مکمل ہوئی اور ۱۳۵۷ھ میں مطبع اخبار الفقیہ امرتسر سے چھپی۔

۷۔ عجائب المقدورات۔ مطبوعہ۔ ان امور نادرہ کے بیان میں جو خود مؤلف نے دیکھے۔

۸۔ بیانِ اوقاف: غیر مطبوعہ: لفظ وقف کی تشریح کے ساتھ ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے اوقاف کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۹۔ انتخاب رباعیاتِ عمر خیام (قلمی نسخہ)

۱۰۔ انتخاب دیوان مرزا صائب اصفہانی (قلمی نسخہ)

کہ کثرتِ گناہ سے میری توبہ بھی بے اثر ہوگئی ہے :

از کثرتِ جرم توبہ ام بے اثر است خون در رگِ من خشک ز دامان بر ہست
عصیانِ من از حدِ شمار است فزون خود دوزخیم حساب رحمت دیگر است

مگر پھر بھی نا امید نہیں ہوتا اور خدا سے پیہم بخشش اور عفو کی دعا کرتا ہے :

یا رب نظری بچشم خونبارم کن رحمی بدل سوختہ زارم کن
گر درخور آتشم بدوزخ مسپار یک برق ز نارِ طور در کارم کن

مومن کی رباعیات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت تھی - چنانچہ کہتا ہے :

سودا بنگر کہ بہ تمنائی قبول احرام مدینہ بست سرخیل جہول
یا رب من بدنہاد آرم ز کجا جانی کہ بود درخور ایثارِ رسول

مومن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر پورا بھروسا ہے - اس لیے وہ تمام لہو ولہب اور گناہوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا کرتے کرتے پکار اٹھتا ہے :

ای مہر پسر نہادہ در جان پدر الطاف رسولت ز پدر افزون تر
فرزندم شفاعطا کن کہ بحشر کافی است مرا شفاعتِ پیغمبر

باین ہمہ کبر و نخوت شیطانی باین ہمہ سرکشی و نافرمانی
لطفی ، کرمی نہ سختیٔ تعذیری از امتِ مرحومہ ام و میدانی

یارب روزی کہ نیک و بد را طلبی امید نجات نیست از بوالعجبی
دانم کہ جہان جہان گناہم چہ بود در پیش شفاعتِ رسولِ عربی

پھر مومن رباعیات میں اپنے علم و ادراک کی بے مائیگی اور گناہوں کا اعتراف کرتا ہے اور انسان کو گردونِ گرداں کے ہاتھوں بے بس و مجبور قرار دیتا ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور رو کر کہتا ہے کہ اے خدا! تو نے خود ہی تو ہمیں اس گناہ آلود دنیا میں بھیجا ہے اور جو کچھ ہماری تقدیر میں لکھا ہے ہم اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں - پھر اگر ہم گناہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنے کرم و بخشش سے محروم نہ رکھو، کیونکہ ہم تیرے ہی بندے ہیں :

خاکیم ز درگاہِ بدر افتادہ
خاریم ز باغ دور تر افتادہ
بر ہر کہ نگہ کنی بحسرت نگرم
مانند غلام از نظر افتادہ

محرومی بندہ ات خدا یا مپسند
مجبور چہ اینجا و چہ آنجا مپسند
پیشِ کرمت نعیم جنت خود چیست
مارا بہ ہمین عشرتِ دنیا مپسند

مومن کی رباعیات میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ تکرار ہے۔ ایک ہی موضوع کو بار بار پیش کیا گیا ہے، جس سے اکثر قارئین اُکتا جاتے ہیں اور بعض جگہ تو صرف الفاظ کے ہیر پھیر سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً ان دو رباعیات میں ملاحظہ ہو :

آزار و نشاط زندگانی ہمہ ہیچ
سر تا سر این طلسمِ فانی ہمہ ہیچ
دانم ہمہ ہیچ و چون از نیم ہیچم
دانی ہمہ ہیچ ورنہ دانی ہمہ ہیچ

بگذر بگذر ز بحثِ دنیا ہمہ ہیچ
حرف و رقم و دلیل و دعوی ہمہ ہیچ
مانند حروفِ مفردات است جہان
موجود بظاہر و بمعنی ہمہ ہیچ

دو اور رباعیات ملاحظہ ہوں جن میں صرف ردیف کی ذرا سی تبدیلی ہے :

داری بفراق بیقرارم تا کَی
خواہی بعذاب انتظارم تا کَی
دریاب بلب رسیدہ جانرا دریاب
تا کَی نرسی بحال زارم تا کَی

ای مایۂ ناز ناز تا آخر تا کَی
دین خوی جگر گداز تا آخر تا کَی
جانم بجفائی توچہ کوتاہی کرد
ای عمر غمت دراز آخر تا کَی

مومن کی رباعیات میں ہیئت کے اعتبار سے تکرار ایک خامی ہے۔ وہ لفظی تکرار پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ معمولی ردیف یا قافیہ بدل کر پوری رباعی کو دوبارہ دہرا دیتا ہے۔ بلاتردید یہ چیز ایک عظیم شاعر کی عظمت کے خلاف ہے۔ لیکن چونکہ یہ رباعیات مومن نے اس زمانے میں کہی ہیں جب اول تو ذوقِ فارسی ختم ہو چکا تھا اور اس کے بے جان قالب کو کسی اسرافیل کی ضرورت تھی جو صور پھونک کر فارسی کے مردہ جسم کو دوبارہ زندہ کرتا۔ دوسرے خود مومن کی زندگی کے آخری ایام تھے اور وہ دنیاوی لہو و لعب سے کنارہ کش ہو کر خدا کی طرف رجوع کر چکا تھا، حافظہ بھی کمزور ہو چکا تھا، اس لیے مومن فارسی رباعیات کو سنوارنے اور ان میں بوقلمونی پیدا کرنے کی طرف زیادہ مائل نہیں ہوا۔

لہٰذا تنقید کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

قصیدہ

مومن کے قصائد کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر قصیدہ گو شاعر نہ تھا۔ اس کا اصل میدان غزل تھا۔ اس کے فارسی دیوان میں چھ قصائد ملتے ہیں جو کسی دنیا دار کی تعریف میں نہیں بلکہ دوسرے اکثر شعرا کے برعکس حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں نعتیہ رنگ میں کہے ہیں، اور ایک قصیدہ اپنے روحانی پیر حضرت احمد شہید بریلوی کی مدح میں کہا ہے۔ انعام و اکرام کی خاطر اس نے کبھی کوئی قصیدہ نہیں کہا اور نہ کبھی کسی دربار سے وابستگی پیدا کی۔ اس کی بڑی وجہ اس کی طبیعت کا استغنا، خودداری اور مذہب سے وابستگی تھی۔ ایک کامیاب قصیدہ گو کے لیے جس ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مومن میں مفقود نظر آتی ہے۔ مومن نے ناصر خسرو علوی کی طرح الفاظ دری کے جواہر پاروں کو شاہانِ نافہم کی نذر نہیں کیا:

من آنم کہ در پای خوکان نریزم   مر این قیمتی در لفظ دری را[1]

مومن قصائد میں عرفی سے بہت متاثر ہے، جس کا ذکر وہ خود بھی اپنے قصیدے میں کرتا ہے:

مومن شدہ ہمزبان عرفی   از بہر امان آفرینش

چنانچہ مومن نے تمام تر قصائد شیراز کے اسی زبردست شاعر کی پیروی میں کہے ہیں۔ جہاں تک عرفی کے زورِ کلام اور رفعت فکر کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں کہ مومن اس کے پایہ کو نہیں پہنچتا، مگر جہاں تک مضمون آفرینی، دقّت نظر اور ندرتِ تخیل کے ربط کا تعلق ہے، مومن نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ قصائد میں ایک اعلیٰ معیار پیش کرے۔ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں ہر دو شعرا کے قصائد کے مطلعوں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ قارئین کا ذوقِ سخن سنجی جُز سے کل تک دلالت کر سکتا اور قصیدہ سرائی میں مومن کے اصلی مقامِ ادبی کو درک کر سکتا ہے۔

عرفی شیرازی کے اس معروف قصیدے کی تقلید میں:

جہان بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار   نیافتم کہ فروشند بخت در بازار[2]

---

[1] ناصر خسرو علوی

[2] قصائد عرفی ص ۵۱

مومن یوں طبع آزمائی کرتا ہے:

کجا شد آنکہ ز انظار لطف لیل و نہار — بلا بخواب عدم بود و طالعم بیدار[۵۳]

عرفی کے اس قصیدے کی پیروی میں:

ای مہر تو جان آفرینش — نعت تو زبان آفرینش[۵۴]

مومن یہ قصیدہ کہتا ہے:

ای جسم تو جان آفرینش — جان تو جہان آفرینش[۵۵]

عرفی کے اس قصیدہ کے تتبع میں:

دمیکہ لشکر غم صف کشد بخونخواری — دلم بنالہ دہد منصب علمداری[۵۶]

مومن یوں قصیدہ سرا ہوتا ہے:

سر وصال عدو دارد و ز عیاری — چنان رود ز بر من کہ کس بنا چاری[۵۷]

پھر عرفی کے اس قصیدے کا

در صبحدم کزو دریچۂ ادراک — گر دستم بساخت افلاک[۵۸]

مومن نہایت پختگی فکر اور جلالت لفظ کو ملحوظ رکھ کر جواب دیتا ہے کہ پڑھنے والا واقعی اس کی عظمت شعر کا اعتراف کرتا ہے:

گر چنین است گردش افلاک — زود چون گنج میروم در خاک[۵۹]

قطعات تاریخ گوئی

مومن کے فارسی دیوان میں غزلیات، قصائد اور رباعیات کے علاوہ قطعات تاریخ بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ تاریخ گوئی میں مومن کو کمال حاصل تھا۔ وہ تاریخیں نئے نئے طریقوں سے

---

[۵۳] دیوانِ مومن، ص ۵
[۵۴] قصائد عرفی، ص ۴۴
[۵۵] دیوانِ مومن، ص ۱۸
[۵۶] قصائد عرفی، ص ۲۷
[۵۷] دیوانِ مومن، ص ۱۷
[۵۸] قصائد عرفی، ص ۴۴
[۵۹] دیوانِ مومن، ص ۲۵

نکالتا تھا۔ مومن نے ویسے تو اربابِ دنیا کی تعریف میں کچھ نہیں کہا مگر جب اپنے حلقۂ احباب میں بیٹھتا ہے تو دوستوں کے مجبور کرنے پر اُن کے مختلف تعمیری کاموں کی تعریف میں قطعۂ تاریخ کہہ دیتا ہے۔ مثلاً مومن کے ایک بہت ہی قریبی اور جگری دوست تفضّل حسین خان ایک کنوئیں کی تعمیر کرتے ہیں تو مومن خوش ہو کر قطعۂ تاریخ کہتا ہے:

پیٔ سال تعمیرِ این چاہ پاک   کہ دلو آبش بود ملتمین
رقم کرد مومن کہ نابود شد   عطش ہا ز بہ تفضّل حسین

پھر جب تفضّل حسین خان اپنا نیا مکان بناتا ہے اور ایک نیا باغ لگواتا ہے تو مومن مسرور ہو کر تاریخ کہتا ہے:

بنا کرد قصری تفضل حسین   کہ از قلعہ آسمان محکم است
چہ خرم مکانی کہ تاریخ آن   نیا شد تماشا کہ عالم است

یہ قطعات واضح کرتے ہیں کہ مومن کو اپنے دوست کے ساتھ کتنی دلبستگی تھی۔ وہ کسی نہ کسی صورت میں اس کی خوشی میں شریک ہوتا تھا۔ مگر جب یہ دوست دہلی سے ہجرت کر گیا تو مومن کو اس کا نہایت صدمہ ہوا، اور اس کا قطعہ تاریخ کہا:

جہان فضل تفضّل حسین خان ناگاہ   جدا شد از من و گشتم غریب ہم بدیار
شنید مومن و زین غصّہ آہ پیہم زد   دویست بود چو اندیشہ ام گرفت شمار
بگفتمش کہ بہر حرف تست مضمونی   تو شاعری نبود آہ و نالہ ات بیکار
مگر بطرز تو ی گفتہ باشی این تاریخ   نگفت ہیچ مگر زد ششش آہ دیگر بار

مومن ایک مذہبی شاعر تھا اس لیے جب کہیں نئی مسجد بننے کی خبر سنتا تو خوش ہوتا۔ کیونکہ اس کا زمانہ افراتفری کا تھا اور انگریزوں کے غلبے نے مسلمانوں کے روحانی و مذہبی جذبات تقریباً کچل دیئے تھے، اس لیے مومن مسجدوں کی تعمیر میں بڑی خوشی کا اظہار کرتا۔ اکثر مساجد جو اس زمانے میں بنائی گئیں مومن نے ان کے قطعاتِ تاریخ کہی، جن میں سے چند درج ہیں:

حمید الدین بنائی مسجدی کرد   بسی محکم تر از بنیاد افلاک
برائی سال تعمیرش بایمان   رقم کردم عبادت خانۂ پاک

مسجدی پاک بنا عبد اللہ　　طرح بنہاد زہی نیک نہاد

پیٔ سالش سر مردم سوئی حبیب　　آنچنان رفت کہ در خاک فتاد

دیدہ در سجدہ سر اہل نماز　　گفت دل خانۂ تقویٰ بنیاد

طرح چون مہربان علی بنہاد　　سجدہ گاہی بلند و مستحکم

سال این بی نظیر بیت اللہ　　کرد مومن نظیر کعبہ رقم

بنائی مسجدی اسلام خان کرد　　بطوفش قدس را احرام باشد

زہی مسجد کہ تاریخ بنائش　　عبادت خانۂ اسلام باشد

مسجدی ساختہ عتیق اللہ　　واہ چہ خوش سجدہ گاہ کعبہ مثال

گفت بیت العتیق از سر صدق　　سال تعمیر عقل فرخ فال

بحساب حروف ملفوظی　　گر توانی رسید یابی سال

مومن کو اپنی اولاد سے بے حد لگاؤ اور پیار تھا، اس لیے بچہ گھر میں پیدا ہوتا تو مومن کو بڑی مسرت ہوتی اور ان کی تاریخیں کہتا۔ اس کے ہاں کئی بیٹے پیدا ہوئے مگر جلد ہی داغِ مفارقت دے گئے۔ مومن نے ہر ایک کا قطعۂ تاریخ کہا:

مادر خوبی پدر گلاب است　　فرزند گل جنان خوبی

تاریخ تولدش نوشتم　　تو بادۂ گلستان خوبی

خلفی دادہ اند مومن را　　کہ سزاوار دولت و رشد است

گر تو سال ولادتش پرسی　　گل گلزار دولت و رشد است

چو زائید فرخندہ خانم پسر　　مدد جستم از حافظ غیب دان

پیٔ سال تاریخ میلاد گفت　　کہ فرزند فرخندہ بی عیب دان

منور بخت را دادند پوری　　کہ از رویش منور شد مقامش

مرا اختر شناسی کرد تعلیم　　جہان اختر بود تاریخ و نامش

مومن نے اپنے ایک بیٹے کی وفات پر قطعۂ تاریخ یوں کہا:

جگر گوشۂ ما بہ کنج لحد　　امان از جہانِ پر آفات یافت

دو سال اندر آغوش مام و پدر ستم دید و یاس مکافات یافت

پھر دوسرے بیٹے کی تاریخ وفات بھی کہی :

چو فرزند اکرم گزشت از جہان پدر مبتلا شد بصد رنج و غم
برآورد دم از زندگی سال فوت زشش سال و شش ماہ و یکسال کم

بعض جگہ مومن اپنے عزیز دوستوں کے ہاں بیٹے کی ولادت کے موقع پر بھی تاریخیں کہہ کر ان کی خوشی میں شریک ہونے کی کوشش کرتا ۔ مثلاً نواب مصطفیٰ خان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو مومن نے اس کا قطعۂ تاریخ کہا ۔

اسی طرح محمد تقی خان کے بیٹے کا قطعۂ تولد کہا ۔

منصور علی خان کے بیٹے کا قطعۂ تاریخ تولد کہا ۔

پھر جب اپنے مخلص دوست تفضل حسین خاں کے ہاں بیٹے کی پیدائش کی خبر سنی تو اس کا قطعۂ تاریخ بھی کہا :

مومن کو جب کوئی واقعہ زیادہ متاثر کرتا تو اس کی تاریخ کہتا ۔ چنانچہ جب انگریزوں نے کابل پر حملہ کیا اور شکستِ فاش کھائی تو مومن نے کابل کی فتح پر اکثر قطعاتِ تاریخ کہے ۔ ملاحظہ ہوں :

باربابِ ایمان در آویختند زبس کافران ہزیمت نصیب
برآورد سر مومن ما و گفت کہ نصر من اللّٰہ فتح قریب

بخواری ز کابل برون آمدند چو کفارِ ملعون ذلت قرین
ز دَدیِ یورش سال تاریخ فتح ملک گفت فضل علی المومنین

اس کے علاوہ مومن کے فارسی دیوان میں تمام تاریخیں ان کے دوستوں، عزیزوں اور شاہان مغلیہ کی وفات کے موقع پر کہی گئیں ہیں اور خاصی تعداد میں ہیں ۔

مومن نے اپنے والد کی تاریخ وفات لکھی ۔ پھر اپنی عمہ کی تاریخ وفات کہی ۔ مومن نے خود اپنا قطعہ تاریخ وفات بھی کہا ہے :

مومن فتاد از بام گفتم چہ رفت گفتا خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ بایدت گفت تاریخ این مصیبت گفتا خموش گفتم بشکست دست و بازو

غرضیکہ مختلف نوعیت کے ۸۹ قطعات تاریخ مومن کے فارسی دیوان میں موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ مومن فن تاریخ گوئی میں ماہر تھا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

" تاریخ گوئی میں ہمیشہ تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے مگر مومن کی طبع رسا نے اسے محسناتِ تاریخ میں داخل کر دیا ۔

مرثیہ

مومن کے فارسی کلام میں باقاعدہ تو مرثیہ نگاری کا عنصر نہیں ملتا مگر دیوان فارسی کے مطالعہ کے دوران ایک ایسا مرثیہ نما قطعہ نظر آیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ ضرور مومن نے اپنی محبوبہ کے غم میں کہا ہے ۔ اگرچہ اس کا ذکر بھی کسی تذکرے میں نہیں ملتا لیکن یہ مرثیہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ یہ مومن ہی کے دل کی آواز ہے جو زخمی اور خون میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ہو سکتا ہے یہ مرثیہ امۃ الفاطمہ بیگم ہی کا ہو جس کو مومن کے عشق نے دہلی چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور مومن کے اکثر اشعار سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ امۃ الفاطمہ نے خود کشی کر لی تھی۔ بہرحال دہلی سے جانے کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں ملی ، اس لیے مومن کو ہجر میں تڑپنا ، خاک و خون میں لوٹنا اور آنسو بہانے پڑے ۔ یہی وجہ غالباً مومن کو ایسا دردناک مرثیہ لکھنے پر اکساتی ہے۔ مرثیہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

تا رفتہ است دلبرِ من از دیارِ من — از دردِ غم بحالتِ مُردن رسیدہ ام
آن آہوئے حرم کدہ و حُسن یوسفی — از من رمیدہ است و من از خود رمیدہ ام
ہمراہ او نرفتہ ام از پاسِ عرض اُو — تا آنکہ راہِ دشت و بیابان بریدہ ام
جلادِ نیم کُشتہ ز بالینِ من گزشت — خون بادِ جذبِ دل کہ بخون در طپیدہ ام
ای تیرہ رُو سپہر رُخ مہر و ماہ سیاہ — دیدی کہ روئی اُو دمِ رفتن ندیدہ ام
نی گفتہ ام بہ یار غمِ دل گداز خویش — نی حرف جان فزا ز لب اُو شنیدہ ام
سوزم بداغ ہجر ہمانا دل خودم — غلطم بخاک و خون مگر اشک چکیدہ ام
پژمردہ غنچہ ایست گُل اختر مم کہ گاہ — از باغِ آرزو گُل و صلی نہ چیدہ ام
نازم بہ سخت جانی خود زندہ ام ہنوز — با آنکہ زہر تلخئ ہجران چشیدہ ام

برپا قیامتی شد و جانم ز تن نرفت — صد بار صور نالہ و افغان دمیدہ ام
واماندہ ام کجا است مقام توای اجل — صد رہ بہ جستجوئی تو ہر سو دویدہ ام
یارب چہ شاعری و چہ سنگین دلی است این — گاہی ز ہیچ کس نہ شنیدم نہ دیدہ ام
بی دردِ مومن از پی تاریخ سر بجیب — بر واست و من ز درد گریبان دریدہ ام

تاریخ و تخرجہ بخیالش رسید و من
در سینہ چاک از غم دوری کشیدہ ام

طِبُّ العرب : ایڈروڈ جی براؤن ۔ ترجمہ : حکیم سید علی احمد نیر واسطی

فاضل مستشرق ایڈورڈ جی براؤن نے لندن کے رائل کالج آف فزیشنز میں ۱۹۱۹ اور ۱۹۲۱ میں طبِ عربی پر چار فاضلانہ خطبات دیے، جو بعد میں عربیین میڈیسن کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

پروفیسر براؤن نے اپنے ان چار خطبات کے ذریعے طبی ادب، عربی علم طب اور تاریخ علم طب پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ خطبات علمی دنیا میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے اور یورپ کی کئی زبانوں میں ان کے کئی ترجمے بھی شائع ہوئے۔

حکیم سید علی احمد نیر واسطی نے اس مجموعۂ خطبات کا انگریزی سے سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ کیا اور جا بجا اپنی جانب سے مفید تشریحات اور علمی، فنی و تاریخی تنقیدات کا اضافہ کیا۔ اپنی تشریحات اور تنقیدات میں فاضل مترجم نے نہایت قابلیت کے ساتھ جا بجا پروفیسر براؤن کے بیانات کی محققانہ تشریح و توضیح کی ہے۔

صفحات : ۵۵۲ — قیمت : ۲۲ روپے

(ملنے کا پتا)

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ لاہور

علمی رسائل کے مضامین

اقبال۔ لاہور، اپریل ۱۹۷۸ء

مضمون	مصنف
ماؤنٹ بیٹن کے نئے معذرت خواہ	ڈاکٹر عبدالحمید
کلام اقبال میں رومی کی شعری تلمیحات و اقتباسات	خواجہ عبدالحمید یزدانی
اقبال اور کبوترانِ حرم	کلب علی خاں فائق
عید پر شعر لکھنے کے جواب میں	محمد عبداللہ قریشی
نظامِ نبوّت	ڈاکٹر محمد ریاض

برہان، دہلی۔ اکتوبر ۱۹۷۸

مضمون	مصنف
ہندوستان میں علم حدیث (انیسویں اور بیسویں صدی میں)	مولانا نسیم احمد فریدی
اسلام کا نظریۂ اقتدارِ اعلیٰ	ڈاکٹر ماجد علی خاں
بھٹکل کے نوائط کی زبان	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
اردو املا	مولوی حفیظ الرحمٰن واصف

برہان، دہلی، نومبر ۱۹۷۸

مضمون	مصنف
اسلام کا نظریۂ اقتدارِ اعلیٰ	ڈاکٹر ماجد علی خاں
تذکرہ مولانا تراب علی لکھنوی	محمد ارشد اعظمی
میر غلام علی آزاد بلگرامی	ڈاکٹر عبدالغفار انصاری

البلاغ، کراچی۔ دسمبر ۱۹۷۸

مضمون	مصنف
مخطوطہ "اصول الجصاص" پر ایک نظر	ڈاکٹر سعید اللہ
امام حاکم چوتھی صدی ہجری کے مشہور محدث	جناب خالد علوی

ترجمان الحدیث، لاہور۔ دسمبر ۱۹۷۸

مضمون	مصنف
اسلام اور رواداری	عبدالرشید عراقی
سید احسان اللہ شاہ راشدی	مولا بخش محمدی

تحریک وہابیت کا اصل حریف ۔ سکھ یا انگریز ؟ — مولانا برق التوحیدی

جامعہ، دہلی ۔ نومبر ۱۹۷۸

حضرت جنیدؒ بغدادی — ضیاء الحسن فاروقی

اسرار التوحید ۔ ایک سرسری تعارف — کبیر احمد جائسی (علیگ)

احسن الدین خاں بیان دکن میں — ڈاکٹر مجاہدی بیگم مطالب

الحق، اکوڑہ خٹک ۔ نومبر ۱۹۷۸

مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی — اختر راہی

مولانا عبدالقدوس گنگوہی کی لطائف قدوسی کی تاریخی اہمیت ۔ پروفیسر محمد اسلم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ — ڈاکٹر مرزا سعید الظفر چغتائی

الفرقان، لکھنؤ ۔ نومبر ۱۹۷۸

کاروان اہل فضل و کمال حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے تلامذہ ۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

آثار شاہ اسماعیل شہید — محمد بشیر (لاہور)

بابا رتن الہندی — ڈاکٹر مولوی ماجد خان

فکر و نظر، اسلام آباد ۔ دسمبر ۱۹۷۸

امیر خسرو دہلوی، حیات اور شاعری — سید صباح الدین عبدالرحمٰن

نسخے از سوانح مولانا فراہی — شرف الدین اصلاحی

والد محترم علامہ عبدالعزیز میمن ۔ چند یادیں چند باتیں — محمد محمود میمن

قرآن کے علمی اور سائنسی معجزات — ملک محمد فیروز فاروقی

معارف، اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۷۸

سلطنت اور دین کا تعلق — مولانا سید سلیمان ندوی

راجہ جے سنگھ کی رصد گاہیں — جناب شبیر احمد خاں غوری

خطیب بغدادی اور ان کے بعض مخطوطات — ڈاکٹر ریاض احمد خان شروانی

امام مزنی — حافظ محمد نعیم الصدیقی

فروری ۱۹۶۹ء

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

تاثرات

ربیع الاول کا مہینہ اس اعتبار سے نہایت ہی بابرکت مہینہ ہے کہ اس میں بروایت صحیح ۹ ربیع الاول کو رسول اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔ آنحضرت کی تشریف آوری سے پہلے نہ صرف عالمِ عرب کی بلکہ پوری دنیا کی اخلاقی اور روحانی حالت بالکل بگڑ چکی تھی، انسانی آبادی کے ہر خطے میں تاریکی اور ظلمت کا دور دورہ تھا۔ نیکی اور عبادت کا دور دور تک کہیں نام و نشان نظر نہ آتا تھا، توحیدِ الٰہی کا باقاعدہ درس دینے والا کوئی نہ تھا، شرک و کفر کی گھٹائیں پورے افق پر چھا گئی تھیں، ہر ملک کے معاشرے میں وسیع پیمانے پر بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، برائیاں پوری قوت سے ہر جگہ دندناتی پھرتی تھیں اور اگر کہیں خال خال شرافت کا وجود تھا بھی تو وہ مارے ڈر کے کونے میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ نہ حکمرانوں میں خوفِ خدا نام کی کوئی چیز پائی جاتی تھی اور نہ رعیت ہی اس سے آشنا تھی —— ان انتہائی بگڑے ہوئے حالات میں اللہ کی رحمت نے جوش مارا اور اس کے فضلِ خاص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور آپ کو خاتم النبیین بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ علیہ الف الف تحیۃ وسلام۔

آنحضرتؐ کی بعثت کے بعد دنیا نے دیکھا کہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں حالات بالکل بدل گئے، برائی کی جگہ نیکی اور تقوے نے لے لی اور اللہ کی بے پایاں رحمت کا وسیع تر شامیانہ تمام دنیا پر سایہ فگن ہو گیا۔

ماہ و سن کی گردشِ لامتناہی کے دوش پر سوار ہو کر ربیع الاول کا مہینہ ہر سال آتا ہے، اور ہمارے قلب و ذہن کے دروازے پر دستک دیتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرماں برداری کو اپنے آپ پر لازم ٹھہرالیں، اپنے اخلاق کے معیار کو اونچا اور کردار کی سطح کو بلند کریں —— یہ مہینہ باتوں کی نہیں، عمل کی دعوت دیتا ہے اور معاشرے کے ہر فرد کو نیکی اور بدی میں امتیاز پیدا کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے تاکہ ہر نوع کی بدی کو ترک کر دیا جائے اور ہر قسم کی نیکی کو اپنا لیا جائے —— فهل من مدكر ——!!

(محمد اسحاق بھٹی)

مولانا محمد حنیف ندوی

سنّت عہدِ نبویؐ میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں حدیث وسنت کی باقاعدہ تدوین نہیں ہو پائی، اگرچہ یہ مسلمہ امر ہے کہ جہاں تک اس کی حفاظت وصیانت کا تعلق ہے اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ اسلامی معاشرے میں آنحضرتؐ کے ارشادات واسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونا، ہر مسلمان کے لیے ضروری تھا۔ آپ کی اطاعت فرض تھی، اس لیے اس بارے میں دو رائیں نہیں پائی جاتیں کہ آپ کا ہر قول وعمل دین کی تشریح وتفسیر پر مبنی ہے۔ بلکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ اگر دین کے دائرے سے آپؐ کی تعلیمات کو خارج کر دیا جائے تو سرے سے دین کی کوئی عملی شکل ہی متعین نہیں ہو پاتی اور کسی طرح یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ قرآن حکیم نے جن اخلاقی و روحانی اقدار کی تعلیم دی ہے ان سے کس طرح کی زندگی متشکل ہوتی ہے اور کس نوع کا معاشرہ معرض وجود میں آتا ہے۔ یہ آنحضرتؐ کے فیضانِ تعلیم وتربیت ہی کا کرشمہ ہے کہ قرآن حکیم ایک کامل نمونے کے قالب میں ڈھلا اور نوعِ انسانی کے لیے صحیح معنوں میں ایک رہبر اور راہ نما کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔ لہٰذا جہاں تک آپؐ کے اعمال وارشادات کا تعلق ہے، یہ کہنا متفقہ طور سے اسلامی شعور کی ترجمانی کرنے کے مترادف ہے کہ دین کی تشریح وتفسیر کے سلسلے میں قرآنِ حکیم کے ساتھ ساتھ یہ دوسرا ماخذ اور سرچشمہ ہے جو اپنی آغوش میں حجیت واستناد کی روشن اور اعلیٰ مثالیں لیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے نہ صرف آنحضرتؐ کے نقوشِ قدم کی پیروی کو سعادتِ اُخروی کا توشہ جانا بلکہ اپنے سینوں کو اس کی ضوفشانیوں سے منور بھی رکھا اور اس کی حفاظت کے لیے جو ذرائع ممکن اور اسلامی مصالح کے موافق تھے، ان کو اختیار بھی کیا۔

اس مرحلے پر یہ سوال یقیناً ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ احادیث وسنن کو اگر یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ دین کا ماخذ ومبنیٰ ہیں تو پھر ضروری تھا کہ قرآنِ حکیم کی طرح اس کی بھی عصرِ نبوت ہی میں باقاعدہ تدوین ہو جاتی۔ یہ تدوین کیوں نہیں ہو پائی؟ اس کی ایک توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آنحضرتؐ جس وقت منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے اس وقت مکہ مکرمہ میں دس سے کچھ ہی زائد افراد ایسے تھے جو لکھنا

پڑھنا جانتے تھے ۔ لطف یہ ہے کہ عام مورخین بھی یہی کہتے چلے آرہے ہیں کہ :

کانت الکتابۃ فی العرب قلیلۃ ۔

عربوں میں اس دور میں لکھنے کا رواج کم تھا ۔

ہم مستشرقین کے اس دعوے کی تائید کے حق میں نہیں ہیں کہ آنحضرتؐ جس قوم میں مبعوث ہوئے وہ اچھی خاصی لکھی پڑھی قوم تھی اور ان کی اکثریت قرأت و کتابت کے اصولوں سے بخوبی آشنا تھی اور یہ کہ قرآن میں جو ان کو اور آنحضرتؐ کو اُمّی کہا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ شریعت الٰہیہ سے ناواقف تھے ۔ اُمّی کی یہ تشریح لغت، تاریخ اور قرآن کے صریحاً خلاف ہے۔ جمہور مفسرین کا یہی عقیدہ ہے اور صحیح ہے کہ عربوں کی اکثریت نہ صرف اُمّی تھی بلکہ اس کو اپنی اُمیّت پر فخر و ناز بھی تھا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے حافظے اس درجہ قوی اور مضبوط ہیں کہ ایک دفعہ وہ جس چیز کو سن لیں اور اپنی گرفت میں لے لیں وہ ہمیشہ کے لیے ان کی لوح ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہے ۔ یہ بھی ان کا خیال تھا کہ کتابت میں تغیر و تبدل کا برابر احتمال رہتا ہے ۔ یہی نہیں کتاب ضائع بھی ہو سکتی ہے ۔ لیکن قلب و ذہن پر کندہ نقوش نہ ضائع ہوتے ہیں اور نہ ان میں تحریف و تصحیف ہی کی کوئی گنجائش رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے وہ حفظ کو کتابت پر ترجیح دیتے تھے ۔

ہم جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اگرچہ ان کی اکثریت جاہل تھی تاہم ان میں فن کتابت سے آشنا افراد کی تعداد اتنی کم نہ تھی جتنی کہ عام طور سے بیان کی جاتی ہے ۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے مکہ مکرمہ نہ صرف ایک معبد کی حیثیت سے مشہور تھا بلکہ کاروبار اور تجارت کا بہت بڑا مرکز بھی تھا اور یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ کاروباری طبقہ، تحریر و کتابت کی صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو یا اس کی ضرورت و اہمیت سے قطعی ناواقف ہو، مکہ والے فن کتابت سے بہرہ مند تھے، اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ غزوۂ بدر میں جو لوگ اسیر ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش ہوئے، آنحضرتؐ نے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ ان میں کا ہر ایک فرد مدینہ کے بچوں کو کتابت و قرأت کی تعلیم دے ۔ مزید برآں کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ لوگ جن کو کاتب وحی کے پُرافتخار لقب سے نوازا جاتا ہے اور جو تعداد میں چالیس سے کم نہیں تھے، ان میں اکثریت انہی اصحاب کی تھی جن کا تعلق مکہ مکرمہ سے تھا ۔

ورقہ بن نوفل مکہ ہی کا رہنے والا تھا۔ اس نے زمانۂ جاہلیت میں تورات اور انجیل کو عربی تحریر میں منتقل کیا۔ زمانۂ جاہلیت میں عربی میں لکھنے پڑھنے کا رواج تھا، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرآنِ حکیم میں ان تمام لوازم کا ذکر ہے جو لکھنے پڑھنے سے متعلق ہیں۔ مثلاً قرطاس:

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ (الانعام: ۹۱)

جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق پر نقل کر رکھا ہے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ (القلم: ۱)

ن۔ قلم کی اور جو اہل قلم لکھنے والے ہیں، ان کی قسم۔

سیاہی — قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ (الکہف: ۱۰۹)

کہہ دیجئے اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں، سمندر ختم ہو جائے، اگرچہ ہم ویسا ہی اور سمندر اس کی مدد کو لائیں۔

اسی طرح اور الفاظ بھی قرآن میں مذکور ہیں، جن سے مکہ والوں کی تحریری صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے۔ جیسے مرقوم، مسطور، سفرہ، کاتب، اسفار، زبر، صحف، سجل وغیرہ۔

مدینہ منورہ میں تشریف لے جا کر آنحضرتؐ نے تعلیم و تعلم کی طرف زیادہ توجہ مبذول فرمائی اور اس طرح لکھنے پڑھنے کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ اس دور میں مساجد علم کا مرکز تھیں اور مدینہ میں نو مسجدیں تھیں، جہاں مختلف قبائل کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ خصوصیت سے مسجد نبوی میں ایک مقام جسے صفّہ کہا جاتا ہے، تعلیم کا بہت بڑا مرکز تھا، یہاں صحابہ صبح و شام تحصیلِ علم میں مشغول رہتے۔ عبداللہ بن سعید بن العاص انہیں لکھنا پڑھنا سکھاتے، جو اس فن کی باریکیوں سے اچھی طرح آگاہ تھے، اور آنحضرتؐ نے خود انہیں اس کام کے لیے مامور فرمایا تھا۔ اہل علم اس حقیقت سے بھی ناآشنا نہ ہوں گے کہ پہلی ہجری میں آنحضرتؐ نے مردم شماری کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ مدینہ میں تمام ان بسنے والوں کی تعداد معلوم کی جائے جو آغوشِ اسلام میں آچکے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں باب کتابۃ الامام للناس کے تحت اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اس مردم شماری میں ایک ہزار پانچ صد مسلمانوں کے نام درج کیے گئے۔

اس تجزیہ سے یہ حقیقت بھی نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں جو

احادیث و سنن کی باقاعدہ اور رسمی تدوین نہیں ہو پائی تو اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ صحابہ میں پڑھے لکھے لوگ کم تھے، بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس دور میں آنحضرتؐ اور صحابہ کے سامنے اہم مسئلہ یہ تھا کہ تحریر کی صورت میں کہیں احادیثِ رسول اور قرآن کی آیات میں اختلاط نہ ہونے پائے، اور ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی توجہ حفظِ قرآن کی طرف سے ہٹ جائے۔ اسی اندیشے کے پیشِ نظر ابتدا میں آنحضرتؐ نے کتابت سے یہ کہہ کر روک دیا :

لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا حرج۔

کہ تم احادیث کو قلم بند نہ کرو، اور جس نے قرآن کے سوا کچھ لکھ رکھا ہے، وہ اس کو مٹا دے۔ ہاں احادیث کو بیان کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ حدیث ابو سعید الخدری سے مروی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیثِ رسولؐ بیان بھی کی جائے اور اس کے انوار سے سینوں کو فروزاں بھی رکھا جائے۔ لیکن اسے معرضِ تحریر میں نہ لایا جائے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ احادیثِ رسول اور آیاتِ قرآن میں خطِ امتیاز نہ کھینچ سکیں۔ لیکن جب قرآنِ حکیم ہر طرح محفوظ ہو گیا، صدور میں بھی اور سطور میں بھی، اور التباس و اختلاط کا یہ اندیشہ جاتا رہا تو آنحضرتؐ نے کتابتِ احادیث کی اجازت دے دی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا :

قیدوا العلم بالکتاب۔ (علم کو قیدِ تحریر میں لے آؤ)۔

رافع بن خدیج سے مروی ہے :

انہ قال! قلت یا رسول اللہ انا نسمع عنک اشیاء افنکتبھا، قال اکتبوا و لا حرج۔

رافع بن خدیج نے کہا یا رسول اللہ، ہم آپ سے بہت سی باتوں کو سنتے ہیں، کیا ہم انھیں لکھ لیا کریں۔ آپ نے فرمایا لکھ لیا کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

سنن ترمذی میں ابو ہریرہ سے یہ روایت منقول ہے کہ ایک انصاری آنحضرتؐ کی مجلس میں بیٹھتا اور آنحضرتؐ کے ارشادات کو سنتا اور استفادہ کرتا۔ لیکن اس کا حافظہ اس درجہ قوی نہ تھا کہ ان کو قیدِ حفظ میں لا سکے۔ اس لیے آنحضرتؐ سے اس نے اپنی اس کمزوری کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا :

استعن بیمینک : (اپنے داہنے ہاتھ سے کام لو)

یعنی اگر تمہیں احادیث یاد نہیں رہتیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ لکھ لیا کرو۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ نے ایک طویل اور حکیمانہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کو اسلام کا دستورِ حیات کہا جا سکتا ہے۔ آپ جب خطبے سے فارغ ہوئے تو یمن کے ایک صاحب ابو شاہ نامی شخص کھڑے ہوئے اور گزارش کی کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ خطبہ لکھوا دیجیے۔ اس پر آپؐ نے یہ حکم دیا:

اکتبوا لابی شاہ ۔ (کہ ابی شاہ کے لیے یہ خطبہ لکھ دو)

ان تصریحات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے کتابتِ حدیث سے ابتداءً اگرچہ اس خطرے کی بنا پر روکا تھا کہ احادیث اور قرآن کی آیات میں التباس و اختلاط نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ نہی عام اور مطلق نہ تھی بلکہ ایک مصلحتِ دینی کے تابع تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ قرآنِ حکیم کی آیات میں کوئی اشتباہ نہ پیدا ہو، چنانچہ جب یہ اشتباہ اور خطرہ دور ہو گیا اور قرآن کی حفاظت و صیانت کے تمام مرحلے طے ہو گئے تو آپ نے اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں احادیث کے متعدد مجموعے تیار ہو گئے، جن میں مشہور یہ ہیں۔

۱۔ سعد بن عبادۃ الانصاری کا صحیفہ

۲۔ سمرہ بن جندب کا رسالہ۔ اس کے بارے میں ابن سیرین کا کہنا ہے کہ اس میں علم کا کثیر حصہ مذکور ہے۔

۳۔ جابر بن عبداللہ کا صحیفہ۔ اس کی قدر و قیمت سے متعلق جلیل القدر تابعی قتادہ بن السدوسی کا کہنا ہے:

لان صحیفۃ جابر احفظ منی من سورۃ البقرۃ : جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے ذہن میں سورۃ بقرہ اس قدر محفوظ نہیں، جس قدر یہ صحیفہ محفوظ ہے۔

۴۔ الصحیفۃ الصادقۃ : اس کو عبداللہ بن عمرو بن العاص نے آنحضرتؐ سے سن کر لکھا۔ مسند احمد میں اس صحیفے کے مشمولات کا ذکر موجود ہے۔ اس میں اس بات کی تصریح بھی پائی جاتی ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ کیا آپ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں میں لکھ لیا کروں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، ہاں لکھ لیا کرو۔ اس نے پھر پوچھا، کیا رضا اور غضب، دونوں حالتوں میں۔ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

نعم فانی لا اقول فی ذٰلک الا حقا۔

کیوں نہیں میں دونوں صورتوں میں حق ہی کا اظہار کرتا ہوں۔

۵۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا اور عظیم الشان صحیفہ وہ ہے جس میں آنحضرتؐ نے مہاجرین و انصار اور یہود کے مابین حقوق و فرائض کی تعیین کی؛ اور ایک معاہدے کی شکل میں ترتیب دیا اس میں پانچ مرتبہ اہل ھٰذہ الصحیفۃ کا لفظ آیا ہے۔ یہ صحیفہ صحابہ میں اس درجہ مشہور و متواتر تھا کہ کتاب اللہ کے پہلو بہ پہلو اس کا ذکر کیا جاتا۔ اس میں اسلام کے کلیات و احکام کی ایسی تشریح پائی جاتی ہے، جس کی بنیاد پر مدینہ میں پہلی اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ کیا آپ کے پاس کوئی مخصوص تحریر یا کتاب موجود ہے۔ آپ نے فرمایا:

لا، الا کتاب اللہ او فہم اعطیہ رجل مسلم و ما فی ھٰذہ الصحیفۃ۔

نہیں، سوا کتاب اللہ اور اس فہم ادراک کے جس سے ہر مسلمان بہرہ مند ہے، یا جو اس صحیفہ میں مندرج ہے۔

۶۔ صحف ابن عباس۔ ان صحف کی کتابت ان کے شاگرد سعید بن جبیر نے کی، ان کی مرویات اس درجہ مشہور رہیں کہ اس سے تفاسیر و احادیث کے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

۷۔ صحف ابی ہریرہ۔ حضرت ابی ہریرہ کثیر الروایہ ہیں۔ ان کی مرویات کا مشہور مجموعہ وہ ہے جس کی ان کے تلمیذ رشید ہمام بن منبہ نے روایت کی۔ یہ اگرچہ تابعی ہیں، تاہم اس میں مذکورہ روایات چونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں، اس لیے اس صحیفے کو بھی ہم ان صحائف میں شمار کر سکتے ہیں جو عہد نبوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی دریافت کا شرف ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایسے فاضل و محقق کو حاصل ہوا، جنھوں نے برلن اور دمشق کی لائبریریوں میں سے اسے ڈھونڈ نکالا۔ تدوین حدیث میں یہ صحیفہ بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اس کی توثیق اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ یہ صحیفہ جوں کا توں مسند احمد میں مندرج ہے۔ صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی اس کی مرویات پائی جاتی ہیں۔ یہ ۱۳۸ احادیث پر مشتمل ہے۔

۸۔ مکتوبات: عہد نبوی میں اس دور کے متعدد حکمرانوں کو جو خطوط لکھے گئے، وہ بھی کتابت حدیث کے سلسلۃ الذہب کی ایک درخشاں کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ان کو اسلام کی دعوت دی گئی اور ان پر واضح کیا گیا کہ اگر یہ امرا و سلاطین دنیا و آخرت میں سلامتی کے خواہاں ہیں تو انھیں چاہیے کہ اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر لیں۔

(ماخذ: علوم الحدیث تالیف دکتور صبحی الصالح)

پروفیسر بختیار حسین صدیقی

اسلام کا فلسفۂ تعلیم

زندگی کی غایت کیا ہے؟ اور اس کے حصول کی بہترین بنیادی کس بات پر مشتمل ہے؟ یہ ہیں وہ دو بنیادی سوال جن کا جواب دیے بغیر تعلیم کے مفہوم کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ اسلام ان سوالوں کا کیا جواب دیتا ہے۔

زندگی کا خالق خدا ہے اور اس کا ارشاد ہے:

"ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے سوا کسی چیز کے لیے نہیں پیدا کیا (قرآن ۵۱ : ۵۷)

عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک حقوق اللہ کی ادائیگی اور دوسری حقوق العباد کی ادائیگی۔ اللہ کے حقوق کی ادائیگی بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے ایک پائیدار روحانی اساس مہیا کرتی ہے۔ خدا سے غافل ہو کر بندوں کے حقوق ادا نہیں کیے جاسکتے اور نہ بندوں کی حق تلفی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جو لوگ پانچوں وقت کی نماز تو پابندی سے پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود یتیموں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ غربا و مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے اور ہمسایوں کو استعمال کی چیز بھی مانگے نہیں دیتے، قرآن کے الفاظ میں وہ اپنی نمازوں سے قطعی غافل ہیں اور دین کی سراسر تکذیب کرتے ہیں:

"کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی شخص ہے جو یتیموں سے بدسلوکی کرتا ہے اور دوسروں کو مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دلاتا! افسوس ہے ان نماز پڑھنے والوں پر جو (اگرچہ نماز پڑھتے ہیں پھر بھی) اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ (وہ لوگ جو نماز پڑھتے ہیں) استعمال کی چیزیں (غریبوں کو) نہیں دینے اور استعمال کرنے سے (انھیں) منع کرتے ہیں۔" (قرآن، ۱۰۷)

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اپنا پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہ جائے۔"

صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ! فلاں عورت رات بھر نماز پڑھتی ہے اور دن کو روزہ رکھتی ہے۔ احسان اور صدقہ کرتی ہے لیکن اپنے پڑوسیوں کو بدزبانی سے دکھ دیتی ہے۔ (آپؐ نے) فرمایا۔ اس کے لیے کوئی بھلائی نہیں ہے۔ وہ دوزخی ہے۔"

پس اللہ کے حقوق کی ادائیگی بندوں کے حقوق ادا کرنے کا واحد ذریعہ اور بہترین تیاری ہے اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب کہ معاشرے کی بنیاد مادی علائق و فوائد کے بجائے اللہ کی حاکمیت پر استوار کی جائے۔ اسی بات کی تلقین کرنے اور عملی طور پر اس کی مثال قائم کرنے کے لیے رسول اکرم کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

"لوگو! بے شک تمھارا رب ایک ہے، اور بے شک تمھارا باپ ایک ہے۔ اور سنو عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سفید فام کو سیاہ فام پر اور سیاہ فام کو سفید فام پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقوے کے۔"

"تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ نے تقوے ہی کی فضیلت کی بنیاد پر زبان، رنگ، خون نسل اور مہاجر و انصار اور امیر و غریب کے تمام امتیازات اور تعصبات سے مدینہ منورہ میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس کی روح رواں اللہ کی حاکمیت اور آدمیت کے احترام کا جذبہ تھا۔"

یہ ہے اسلام کی رو سے انسان کی تخلیق کا مقصد اور اس کے حصول کی بہترین تیاری تعلیم چونکہ ہمیشہ مقصد حیات کے تابع ہوتی ہے، اس لیے اسلام کی رو سے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ انسان کو اللہ کے حقوق ادا کرنے کے قابل بنائے جو اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی لازمی شرط ہے۔ یعنی وہ اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر ایسا معاشرہ قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں مدد دے جس میں رواداری، معاشرتی انصاف، حریت، اخوت اور محبت کا بول بالا ہو۔

فلسفیانہ اساس

اسلام کی اصل دلچسپی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تہذیب و اصلاح سے ہے۔ اس کی جملہ تعلیمات کا تعلق زندگی کے ان ہی دو شعبوں سے ہے۔ سائنس کے قوانین یا فلسفے

کے مسائل سے قرآن نے کہیں بحث نہیں کی ہے۔ یہ معاملات اس نے انسانی فکر، تجربے اور مشاہدے پہ چھوڑ دیے ہیں۔ البتہ ہمیں اس طرف متوجہ کرنے کے لیے اس نے بار بار مشاہدے کرنے، سوچنے غور و فکر کرنے اور عقل سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔

دنیا کے آغاز، انجام اور اس کی تخلیق کے مقصد کے بارے میں ہر شخص کا شعوری یا لاشعوری طور پر اپنا ایک عقیدہ ہوتا ہے جس کا عکس ہمیں اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظر آتا ہے۔ عقائد کے اس مجموعے کو اس شخص کا فلسفہ کہتے ہیں۔ انسان کے متعلق سب سے زیادہ اہم اور عملی اعتبار سے قابلِ لحاظ چیز اس کا فلسفہ ہے۔ یہ اس کی سیرت و کردار کو سمجھنے کی کنجی ہے۔

یہاں یہ بات، ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ شخصی فلسفہ اصل منظم فلسفے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ اختلاف چار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے:

۱۔ شخصی فلسفے کی زبان روزمرہ کی آسان اور عام فہم زبان ہوتی ہے، جبکہ منظم فلسفے کی زبان دقیق، مجرد اور اصطلاحی ہوتی ہے جسے عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔

۲۔ شخصی فلسفہ زیادہ تر مضمرات پر مشتمل ہوتا ہے جس طرح بیج میں تنا اور درخت پوشیدہ ہوتا ہے، اسی طرح شخصی فلسفے میں فلسفیانہ افکار پوشیدہ ہوتے ہیں جن میں ایک مکمل فلسفیانہ نظام بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ منظم فلسفے میں افکار و تصورات، اصول اور کلیے مضمر نہیں ہوتے بلکہ بالکل عیاں اور واضح ہوتے ہیں۔

۳۔ شخصی فلسفے میں افکار ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، ان میں تسلسل اور مطابقت نہیں پائی جاتی بلکہ اکثر ان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ منظم فلسفہ افکار کا ایک مربوط نظام ہوتا ہے اس میں منطقی ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے ہم آہنگ ہوتا ہے، اس کی تردید یا تکذیب نہیں کرتا۔

۴۔ منظم فلسفہ شعوری طور پر ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے اور زندگی کی گتھی سلجھانے کے لیے وسعتِ نظر سے کام لیتا ہے۔ شخصی فلسفے کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے اور وہ ترقی کی منازل لاشعوری طور پر طے کرتا ہے۔

شوپنہائر (SCHOPENHAUER) نے مذہب کو عوام کی "مابعد الطبیعیات" کہا ہے جو شخصی

فلسفے کی تعبیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اس مفہوم میں اسلام ہمارا فلسفۂ حیات ہے۔ دین کی حیثیت سے اس کی اپنی مخصوص اقدار، عقائد اور اصول ہیں جنھیں اگر منظم فلسفے کی زبان میں جو وجودیات، علمیات، کونیات اور قدریات پر مشتمل ہے، بیان کیا جائے تو ان کی شکل کچھ اس طرح بنے گی:

۱۔ وجودیات (ONTOLOGY) یہ فلسفے کی وہ شاخ ہے جو زندگی یا وجود کی ماہیت سے بحث کرتی ہے اور اس بات کی تحقیق کرتی ہے کہ اساس عالم کوئی ایک جوہر ہے یا ایک سے زیادہ جواہر (SUBSTANCES) اور ان کی نوعیت مادی ہے یا روحینی۔ قرآن دینی عینیت (IDEALISM) یا روحیت کا داعی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ:

"ہر شے خدا کی طرف سے آتی ہے اور اسی کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔" (قرآن، ۲: ۱۵۶)

وجود مطلق صرف خدا کی ذات ہے، باقی ہر شے اپنے وجود کے لیے اس کی محتاج ہے۔ حقیقت اولیٰ ایک ہے اور صرف ایک اور یہ ایک حقیقت اپنی نوعیت میں خالصتاً روحانی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وہ ذات پاک جس کا نام اللہ ہے ایک ہے۔ وہ معبود برحق بے نیاز ہے۔ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ (قرآن، ۱۱۲)

یہ پاک اور بے نیاز خدا کائنات کی وجودیاتی اساس ہے۔ انسان کا ادراک، احساس، اور ارادہ جب اس عقیدے کی تفسیر بن جائے تو وہ خود یاس (قرآن، ۳۹: ۵۶) حزن اور خوف (قرآن، ۲: ۶۲) کی اخلاقی بیماریوں سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لیے اس کا وجود رواداری، اخوت اور محبت کا پیغام بن جاتا ہے۔ اس طرح اس میں وہ زبردست اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے جسے کوئی طبعی قوت زیر نہیں کر سکتی۔

۲۔ علمیات (EPISTEMOLOGY) یہ فلسفے کی وہ شاخ ہے جو علم کے امکان، اس کی ابتدا، ماہیت اور حدود سے بحث کرتی ہے۔ اسلام کی رو سے علم خدا کی صفت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

"خدا نے آدم کو اشیا کے نام سکھائے۔" (۲: ۳۱)

انھیں چیزوں کی حقیقت کا علم عطا کیا، اور یہی فرشتوں پر ان کی فضیلت کا باعث بنا۔ علم حق کا سرچشمہ قرآن ہے جو وحی کی صورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ دوسرے الفاظ میں حقیقی علم کا ذریعہ وحی ہے جس کا سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ختم ہوگیا۔ وحی کے علاوہ قرآن نے آنکھ، کان اور دل (فؤاد) ۔ (قرآن: ۱۶: ۱۰۸؛ ۲۳: ۷۸، ۳۲: ۹، ۴۶: ۲۳) یعنی اس نے ذاتی مشاہدے، دوسروں کی روایت، تفکر اور فطری وجدان کو بھی علم حق کا ذریعہ قرار دیا ہے اور ہمیں بار بار مشاہدہ کرنے، سوچنے اور عقل سے کام لینے کی تاکید کی ہے :

" بے شک زمین اور آسمان کی تخلیق اور رات اور دن کے آنے جانے اور دریا میں کشتیوں کے چلنے جس میں لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں، اور بارش جو خدا تعالیٰ آسمان سے بھیجتا ہے جس سے مردہ زمین میں پھر سے جان پڑ جاتی ہے، اور زمین پر ہر قسم کے مویشی پیدا کرنے اور ہواؤں کا رُخ بدلنے اور بادل جو زمین اور آسمان کے درمیان مسخر ہیں — ان سب چیزوں میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔" (قرآن، ۲: ۱۶۴)

مشاہدے اور غور و فکر پر زور دینے سے قرآن کا مقصود ہمیں یہ بتانا ہے کہ وحی کے علاوہ استقرائی علوم بھی اپنی جگہ پر علم حق کا ذریعہ ہیں۔ آپ باری باری سیب، پتھر اور مٹی کے ڈھیلے کو آسمان کی طرف پھینکیں۔ کچھ دُور اوپر جا کر وہ سب ایک ایک کر کے زمین پر گر پڑیں گے ۔ ان حقائق کے مشاہدے سے نیوٹن نے ایک قانون اخذ کیا جسے قانون ثقل قوت کہتے ہیں ۔ قرآن اس قانون اور اس جیسے دوسرے قوانینِ فطرت کو میکانکی قوانین کی بجائے "اللہ کی سنت" قرار دیتا ہے جس میں کبھی "تبدیلی واقع نہیں ہوتی"۔ (۴۸: ۲۳)

فطرت خدا کی تخلیق ہے اس لیے اس کے قوانین لازمی طور پر صانع فطرت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ علم حق کی ابتدا حواس سے ہوتی ہے لیکن اس کی آخری منزل وحی اور وجدان سے حاصل ہونے والا علم ہی ہے جو حسی اور فکری شعور میں نہیں سماتا ۔

۳۔ کونیات ۔(COSMOLOGY) یہ فلسفے کی وہ شاخ ہے جو دنیا میں موجود اشیا کی تخلیق، ان کی شکل و صورت، اور ان میں آپس کے باہمی تعلق سے بحث کرتی ہے :

قرآن کی رُو سے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے ان سب کا خالق خدا ہے جو دنیا

سے انتہائی بلند و بالا عرش پر متمکن ہے۔ اس نے چھ دن میں عدم سے دنیا کو پیدا کیا اور ہر شے کو اس کی شکل عطا کی۔ (قرآن، ۷:۵۴، ۱۰:۳، ۵۷:۴، ۲۵:۵۹، ۳۲:۴)۔

اسی کی بالا دستی میں اب بھی اس کا انتظام چل رہا ہے۔ وہ دنیا کا خالق ہی نہیں، اس کا رب اور پروردگار بھی ہے۔ ایک دن اس کے حکم سے یہ دنیا فنا ہو جائے گی۔ قیامت آئے گی، مردے قبروں سے اپنا اپنا اعمال نامہ لیے اٹھیں گے۔ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ نیکی کا اسے پورا پورا اجر ملے گا اور ہر برائی کی پوری پوری سزا۔ اور کسی شخص کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

انسان کی پیدائش کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ خدا نے مٹی سے آدمؑ کا پتلا تیار کیا۔ (قرآن ۱۵:۲۸، ۳۸:۷۱) اور پھر اس میں اپنی روح پھونکی۔ (۳۲:۹، ۳۸:۷۲)

جسم اور روح ایک دوسرے کی ضد ہیں اور بظاہر ان میں باہم رابطے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اللہ کے حکم سے یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس کی ذات ان دونوں میں تعامل (INTERACTION) کا موقع فراہم کرتی ہے اور ہمارے ذہنی اور جسمانی اعمال میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ جدید متکلمین میں گیولینکس (GEULINCX) اور جیسی برانش (MALE BRANCHE) بھی اسی عقیدے کے حامی ہیں۔ انھوں نے اسے موقعیت (OCCASIONALISM) کا اصطلاحی نام دیا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام کی رو سے دنیا میں ایک اصول وحدت کارفرما ہے۔ یہ اصول دنیا سے باہر ہے اس کے اندر نہیں۔ اسی کی حاکمیت میں دنیا کا نظام چل رہا ہے اور وہ اس میں پیش آنے والے ہر واقعے سے باخبر ہے۔ یہ کوئی بے غرض اور بے جان اصول نہیں ہے جسے انسان کی فلاح اور بھلائی سے دلچسپی نہ ہو۔ یہ اصول انسان کا اپنا وہی خدا ہے جسے اپنے بندوں سے محبت ہے۔ جو ان کی نجات کا خواہاں ہے، جو ان کی درد بھری پکار سنتا ہے اور انھیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔ شخصی خدا کے اس نظریے کو فلسفے کی اصطلاح میں وحدانیت (THEISM) یا ماورائی غائیت (TRANSCENDENTAL TELEOLOGY) کا نظریہ کہتے ہیں۔

۴۔ قدریات (AXIOLOGY) یہ فلسفے کی وہ شاخ ہے جو زندگی کی اعلیٰ اقدار مثلاً دینی

قدار، اخلاقی اقدار، جمالیاتی اقدار اور معاشرتی اقدار کے ماخذ اور ماہیت سے بحث کرتی ہے۔ قرآن کی رو سے خیر، خوبی اور سچائی کی تمام اقدار مطلق (ABSOLUTE) اقدار ہیں، اضافی (RELATIVE) اقدار نہیں۔ ان کی حیثیت معروضی (OBJECTIVE) ہے، موضوعی (SUBJECTIVE) نہیں۔ کیونکہ ان کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے، انسان کی پسند یا ناپسند نہیں۔ خدا نے جس بات کا حکم دیا ہے وہ اچھی ہے، جس سے منع کیا ہے وہ بری ہے۔ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم خدا کے احکام کی تعمیل کریں۔

پہلے نفسیات فلسفے ہی کا ایک حصہ تھی لیکن اب اس کا شمار تجربی علوم میں ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا ذہن یا روح کے متعلق علم سے ہوئی۔ روح کیسے پیدا ہوئی؟ یہ فانی ہے یا غیر فانی؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ وہ کون سے اعمال ہیں جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں؟ اس کا جسم کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ یہ تمام مسائل اس کا موضوع بحث تھے۔ قرآن کی رو سے روح کے بارے میں انسان کو اس کا بہت کم علم دیا گیا ہے۔ (۱۷: ۸۵)

اس کے حکم سے وہ ایک معینہ مدت کے لیے جسم کو اپنا مسکن بناتی ہے اور پھر اسی کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔ جسم اور روح کے اس مرکب کو قرآن نے نفس کہا ہے۔ اسی کی تربیت اور اصلاح سے تعلیمی عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے پہل نفس جسمانی احتیاجات اور خواہشات کا مرقع ہوتا ہے۔ اس کا میلان بدنی لذات کی طرف ہوتا ہے جو اسے برائی میں ملوث کرتا ہے۔

قرآن نے اس کی اس حالت کو نفس امارہ کہا ہے: (۱۲: ۵۳)

رفتہ رفتہ روح بیدار ہوتی ہے، جو نفس کو جسمانی لذات کی طمع پر سرزنش کرتی ہے اور وہ کشمکش اور تصادم رونما ہوتا ہے جو اخلاقی جدوجہد کی لازمی شرط ہے۔

قرآن نے نفس کی اس حالت کو نفس لوامہ سے تعبیر کیا ہے۔ (۷۵: ۲)

آخر میں جسم روح کی بالادستی کو تسلیم کر لیتا ہے۔ کشمکش اور تصادم کی صورت ختم ہو جاتی ہے اور نفس وہی کچھ کرتا ہے جس میں خدا کی خوشنودی ہوتی ہے۔ نفس کی اس حالت کو قرآن نے نفس مطمئنہ قرار دیا ہے۔ (۸۹: ۲۷)

یہ ہے منظم فلسفے کی زبان میں اسلامی عقائد اور اقدار کا خلاصہ۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ اس فلسفۂ حیات کی روشنی میں تعلیمی عمل کے کیا اغراض و مقاصد متعین ہوتے ہیں؟

تعلیمی اغراض و مقاصد

کائنات کی وجودیاتی اساس خدا ہے۔ وہی اس کا خالق ہے اور رب بھی۔ اس نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے۔ اس لیے تعلیمی عمل کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے روحانی نصب العین پر مرکوز ہو۔ اس نصب العین کے حصول کی دو شرائط ہیں پہلی شرط یہ ہے کہ تعلیم فرد کو خالق اور رب کی حیثیت سے اللہ کے حقوق ادا کرنے کے قابل بنائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اسے اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے مستعد کرے۔ بندوں کی خدمت سے خدا خوش ہوتا ہے، لیکن بندوں کی خدمت وہی شخص کر سکتا ہے جو خدا کی خوشنودی کا خواہاں ہو۔ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں پس تعلیم کا مقصود نہ صرف اچھے افراد پیدا کرنا ہے اور نہ ہی صرف اچھے شہری بلکہ بیک وقت ان دونوں مقاصد کو حاصل کرنا ہے، اور یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر رنگ، خون اور نسل کے امتیازات سے پاک ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو حریت، رواداری، اخوت، اور محبت کا مرقع ہو۔ صرف ایسے معاشرے ہی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد بطریقِ احسن ادا کیے جا سکتے ہیں۔

تعلیمی عمل

تدریسی مواد کے ذریعے تعلیم جس فعالیت (ACTIVITY) کو جنم دیتی ہے وہ اپنا عمل شاگرد کے ذہن پر کرتی ہے۔ اس فعالیت کو تعلیمی عمل کہتے ہیں۔ یہ عمل ہی فی الحقیقت تعلیم ہے۔ استاد، نصاب اور شاگرد اس کے تین ارکان ہیں اور مدرسہ وہ مخصوص جگہ جہاں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ آئیے! اب دیکھیں کہ تعلیمی عمل کے ان ارکانِ ثلاثہ اور مدرسے کے متعلق اسلام نے کیا تصور پیش کیا ہے؟

۱۔ مدرسہ۔ مسجد نبوی اسلام کی سب سے پہلی درس گاہ تھی، جہاں اسلامی ثقافت نے جنم لیا اور جہاں سے تہذیب و تمدن کی شعاعیں دور دور تک پھیلیں۔ ثقافت ایک روحانی حقیقت ہے۔ خدا اس کے ذریعے اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ انسان فطرتاً ثقافت کا محتاج ہوتا ہے۔ جسمانی طور پر دنیا میں آجانا اس کے لیے کافی نہیں۔ اگر انسان کو انسان بنانا مقصود ہے تو ثقافتی طور پر جنم لینا اس کے لیے ناگزیر ہے۔ ایک منظم ادارے کی حیثیت سے یہ

فرض صرف مدرسہ ہی انجام دے سکتا ہے۔ وہ بچے پر یہ واضح کرتا ہے کہ انسان ہونے کے کیا معنی ہیں، اور وہ اساس مہیا کرتا ہے جس سے حقیقت اولیٰ کی ماہیت کے بارے میں استدلال کیا جا سکتا ہے تعلیم خدا نے انسان پر فرض کی ہے کیونکہ یہ ثقافتی فرائض انجام دیتی ہے اور چونکہ زندگی کی اساس روحانی ہے اور ابدی۔ مدرسہ ثقافت کا محافظ ہے۔ وہ ملّی عقائد اور اقدار کو نئی نسل میں منتقل کرتا ہے، اسے انسان کے روحانی تقاضوں اور ثقافتی ضرورتوں نے جنم دیا ہے۔

۲۔ شاگرد۔ بظاہر شاگرد ایک جسم ہے لیکن خدا نے اس میں ایک روح پھونکی ہے۔ اس کے جسم کے قالب میں ایک روح ہے جس کی تخلیق خدا نے کی ہے۔ اس کی شخصیت کا احترام وہ اعلیٰ قدر ہے جس پر تعلیم کی بنیاد استوار ہے۔ شخصیت کے احترام سے مراد یہ ہے کہ تعلیم میں خلوص محبت کا جذبہ کار فرما ہو۔ سختی و درشتی سے بچّے کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ وہ خود اپنی نظر میں گر جاتا ہے اور تعلیم سے استفادہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاگرد سے اگر کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہو جائے تو استاد کیا کرے؟ غزالی کے نزدیک ایسی صورت میں استاد کا فرض ہے کہ وہ شاگرد کو تعریض و کنایہ سے سمجھانے کی کوشش کرے شفقت اور محبت کا رویّہ اختیار کرے، کھل کر اس کی غلطی کو اس کے سامنے واضح نہ کرے۔ اور نہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام لے، کیونکہ اس طرح دل سے ہیبت اٹھ جاتی ہے، اور شاگرد لغزشوں پر اتر آتا ہے۔ جس چیز سے انسان کو سختی سے منع کیا جائے وہ اس پر اور آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ترغیب لغزش ابھرتی ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر لوگوں سے کہا جائے کہ مینگنی کو نہ توڑو، تو وہ اسے توڑ کر رہیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں جو منع کیا گیا ہے تو ضرور اس میں کوئی بات ہے۔ آدم سے لغزش اسی وجہ سے ہوئی۔ تعریض و کنایہ میں یہ خوبی ہے کہ اس سے ذہین شاگرد غور و فکر کے عادی ہو جاتے ہیں اور رجوع عبرت دلانے والے دقیق معانی اس میں پنہاں ہوتے ہیں انھیں معلوم کر کے انھیں خوشی ہوتی ہے اور وہ اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ استاد کو ان کی ذہانت اور فطانت کا پورا پورا پاس ہے[۱]

۱۔ غزالی: احیاء علوم الدین، اردو ترجمہ مذاق العارفین از مولوی محمد حسن مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۵ء، جلد اول ص ۷۶۔

ابن خلدون کے نزدیک "تعلیم میں سختی برتنا سخت مضر ہے خصوصاً چھوٹے بچوں پر، کیونکہ یہ ان کی نااہلی کی دلیل ہے۔ اس سے ان کی طبیعت بجھ جاتی ہے۔ دل سے، امنگ، خوشی اور بشاشت فرار ہو جاتی ہے۔ متعلم جھوٹ اور مکر و فریب سے کام لینے لگتا ہے۔ اس کی طبیعت میں سے حمیت اور غیرت کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ یہود قوم کو دیکھ لیجیے، ظلم و تشدد کی فضا میں پلنے کی وجہ سے خباثت ان کی طبیعت میں بیٹھ گئی ہے، اور وہ خبث نفس اور مکر و کید میں ضرب المثل ہو گئے ہیں۔[۵]"

شاگرد جو کچھ بن سکتا ہے اس کی صلاحیت بالقوۃ اس میں موجود ہوتی ہے۔ تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ اسے قوت سے عمل میں لے آئے، جو چیز پوشیدہ ہے اسے ظاہر کر دے۔ شاگرد کوئی پہلے سے بنی بنائی چیز نہیں ہے۔ وہ کچھ بننے کے عمل کی آماجگاہ ہے، وہ تغیر کے عمل کا محل ہے۔ اس میں جو کچھ بالقوۃ موجود ہوتا ہے تخمیر کا عمل اسے قوت سے فعل میں لے آتا ہے۔ انسان فطرتاً اچھا ہے نہ برا، وہ کافر ہے نہ یہودی نہ عیسائی۔ اس کے ماں باپ اسے کافر، یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔ تربیت اور اکتساب سے وہ باپ دادا کا مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ تعلیم اور ماحول سے وہ اچھا یا برا انسان بنتا ہے۔

شاگرد ایک روح ہے، وہ خود خدا کی طرف اقدام کرتا ہے، وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو خدا دو قدم اس کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ روحانی اخذ و جذب کے اس عمل کا مرکز جس پر تعلیم مشتمل ہے، ایک نہاں خانہ ہے، جس میں طالب علم خود رہتا ہے، استاد اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اپنے اثر و نفوذ سے وہ اس کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیتا ہے۔ اس طرح جو رد عمل شاگرد میں پیدا ہوتا ہے اس پر اس کی ساری تعلیم منحصر ہے۔ شاگرد خود اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ تعلیمی تجربات انتہائی شخصی اور ذاتی ہوتے ہیں۔ دنیا سے متعلق شاگرد کے رد عمل کا سرچشمہ خود اس کا ذہن ہے جس کی نشو و نما کا دار و مدار اس کی اپنی خود متحرکی پر ہے۔ شاگرد خود اپنی رہنمائی کرتا ہے، اس کا ذہن خود مقاصد کی تشکیل کرتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی کوشش

---

[۵] مقدمہ ابن خلدون، مترجمہ مولانا سعد حسن خان یوسفی کراچی، ص ۵۶۴۔

کرتا ہے تعلیم پوشیدہ صلاحیتوں کے قوت سے فعل میں آنے کا ایک سلسلہ ہے جو ذہن کی نشوونما کے مختلف مدارج میں رفتہ رفتہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے تعلیم باہر سے کوئی چیز شاگرد کے ذہن میں داخل نہیں کرتی بلکہ جو چیز اس کے ذہن یا دل میں مضمر ہوتی ہے اسے باہر لے آتی ہے۔

تعلیمی عمل نفس کی اپنی اخلاقی جدوجہد پر مشتمل ہے جس کا مرکز نہاں خانۂ دل ہے۔ نفس کی معرفت اس جدوجہد کی ابتدا ہے اور انتہا بھی، کیونکہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا۔ نفس کی معرفت کے تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ نفس امارہ کا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں جسمانی احتیاجات اور خواہشات کی حکمرانی ہوتی ہے اور نفس ہمہ تن ان میں غرق ہوتا ہے اور برائی کی طرف راغب۔ دوسرا مرحلہ نفس لوّامہ کا ہے۔ اس مرحلے میں روح بیدار ہوتی ہے جو برائی سے روکتی ہے اور اخلاقی جدوجہد کو تقویت پہنچاتی ہے۔ تیسرا مرحلہ نفس مطمئنہ کا ہے جو اخلاقی جدوجہد کی معراج ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں روح جسم کو اپنا مطیع بنا لیتی ہے۔ عقل فطرت کو مسخر کر لیتی ہے اور کشمکش و تصادم کی صورت ختم ہو جاتی ہے بندہ خدا سے راضی ہو جاتا ہے اور خدا بندے سے، یہ اللہ سے تقرب کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔

۳۔ استاد۔ مسجد نبویؐ اسلام کی پہلی درس گاہ تھی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پہلے معلم۔ یہ درس گاہ دینی عینیت کا گہوارہ تھی، اس لیے اس میں معلم کی حیثیت اساسی اور مرکزی تھی۔ عینیتی نظام تعلیم میں استاد ہی تعلیم کے لیے مناسب ماحول کا انتخاب کرتا ہے۔ موزوں موادِ تدریس مہیا کرتا ہے اور شاگرد پر سب سے زیادہ اہم اثر ڈالنے والی واحد شخصیت کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ثقافتی ورثے کے محافظ کی حیثیت سے وہ شاگرد کے لیے حقیقت مجسم ہوتا ہے جس کی شخصیت میں ساری کائنات سمو دی گئی ہو۔ شاگرد اس حقیقت مجسم کا بے انتہا ادب، احترام اور تعظیم کرتا ہے کیونکہ یہی وہ سب سے بڑی قدر ہے جس پر تعلیم کی بنیاد استوار کی جاتی ہے جس طرح استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ شاگرد کی شخصیت کا احترام کرے اسی طرح شاگرد کے لیے لازم ہے کہ وہ استاد کا ادب و احترام کرے۔ ایصال و ابلاغ (COMMUNICATION) کا نام تعلیم ہے اور یہ عمل اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا،

جب تک کہ شاگرد اور استاد دونوں کے دل ایک دوسرے کے لیے احترام کے جذبے سے لبریز نہ ہوں۔ خلوص اور محبت تعلیمی عمل کی روح رواں ہیں۔

استاد خدا کی طرف سے ایک مبلغ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ شاگرد کی سمجھ سے بالاتر بات نہ کرے اور نہ درس و تدریس کا کوئی معاوضہ لے۔ اگر وہ اپنا صحیح اور پورا کردار ادا کرے تو وہ ثقافت کا محافظ اور روحانی ترقی اور دینی تسلسل کا ضامن بنے۔ اس کے پیشے کا تقاضا خود ستائی اور خود نمائی نہیں بلکہ شاگردوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اپنے آپ کو غرق کر دینا ہے تاکہ جو کچھ ان کے اندر بالقوۃ موجود ہے وہ بالفعل ظہور میں آجائے۔ اس کا کام طلبا میں اپنے نصب العین کے حصول کی لگن اور شوق پیدا کرنا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ ان کے بڑھتے ہوئے احساس ذات کو ٹھیس نہ پہنچنے پائے کیونکہ یہ احساس ہی تعلیمی عمل کی روح ہے۔

طلبا استاد کے اثر کو نقل کے ذریعے قبول کرتے ہیں نقل کرنا چونکہ ایک فطری عمل ہے لہٰذا استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرے اور اپنے کردار کی مثال پیش کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ نقل کرنا سراسر ایک تعلیمی عمل ہے۔ اس سے شاگرد میں ایک نئی قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے۔ استاد سے گہرا شخصی رابطہ قائم کرنے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی تقلید کرنے سے ہی اس میں ندرتِ فکر و عمل پیدا ہوتی ہے۔ اس کی تقلید کر کے ہی وہ اس سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ پس استاد کے لیے لازم ہے کہ اس کا علم جامع ہو اور اس کا کردار مثالی، تاکہ شاگرد میں اس کے ہر فعل کو نقل کرنے کی تحریک پیدا ہو۔ اس کے قول و فعل میں تضاد ہرگز نہ ہو ورنہ شاگرد پر اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

۴۔ نصاب۔ بچوں کو یہ حق قطعی نہیں پہنچتا کہ زندگی کا راستہ منتخب کرنے کے لیے انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ انھیں ہدایت کا راستہ دکھانا اور گمراہی سے بچانا ہمارا فرض ہے، انھیں اس ورثے سے فائدہ اٹھانے کا حق پہنچتا ہے جو نسل انسانی انھیں پیش کر سکتی ہے۔ والدین اور اساتذہ اگر اسے ان کے سامنے پیش نہیں کریں گے تو پھر یہ مسخ ہو کر دوسرے ذرائع سے ان تک

پہنچے گا۔ بچہ مجبو کا نہیں رہے گا۔ اچھی غذا نہ ملے تو پھر خراب غذا کھائے گا۔ انسان کا مثالی کردار اور مثالی معاشرے کی خصوصیات نسلِ انسانی کا وہ ورثہ ہیں جس کا مدرسے کو نئی نسل میں منتقل کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نصابِ تعلیم ہمیشہ فلسفۂ حیات کے تابع ہوتا ہے۔ کوئی نصاب شاگرد نواز ہوتا ہے، کوئی مضمون نواز، کوئی معاشرہ نواز اور کوئی نصب العین نواز۔ اسلام کی رُو سے شاگرد ایک روح ہے۔ استاد خدا کی طرف سے مبلغ ہے اور خدا کی خوشنودی وہ نصب العین ہے جس پر نصاب کو مرکوز ہونا چاہیے۔ پس قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، کلام، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مثالی کردار اور اس مثالی معاشرے کی خصوصیات جو آپ نے مدینے میں قائم کیا تھا نصاب کی بنیادی اکائی ہیں۔ فکر، احساس اور عمل کی دنیا میں اسلاف کے کارنامے ہی ہمارے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ سیرت النبی، سیرت صحابہ، آئمہ عظام اور مشائخ کرام کے نقشِ قدم پر چل کر ہی ہم اچھے فرد اور اچھے شہری بن سکتے ہیں اور ایسا معاشرہ قائم کر سکتے ہیں جس میں رواداری، اخوت اور محبت یعنی آدمیت کا بول بالا ہو۔

اسلام صرف کتابی مطالعے کو کافی نہیں سمجھتا۔ فطرت یعنی انفس اور آفاق کو بھی اس نے علم کا ذریعہ قرار دیا ہے اور ہمیں بار بار مشاہدے، تعقل اور تفکر کی دعوت دی ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:

"ایک نشانی ان کے لیے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو اس وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج ہی کے لیے ممکن ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آ سکتی ہے۔ سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔" (۳۶: ۴۰)

"ہم جلد ہی لوگوں کو آفاق اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔" (۴۱: ۵۳)

"اور اہلِ یقین کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں اور ان کے انفس میں بھی۔ تو پھر تم ان کا مشاہدہ کیوں نہیں کرتے۔" (۵۱: ۲۱)

"جسے حکمت دی گئی، بے شک اسے خیر کثیر دی گئی۔" (۲: ۲۶۹)

انسان روح اور جسم کا ایک مرکب ہے۔ اسلام نے ان دونوں کو اپنے نظام تعلیم میں جگہ دی ہے۔ عینیت اور فطرتیت دونوں اس کے دامن میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف عینیت کا علم بردار ہے اور نہ صرف فطرتیت کا بلکہ ان دونوں کا ایک کامیاب امتزاج ہے۔ کامیاب سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام فطرتیت کو بے لگام نہیں چھوڑنا چاہتا۔ وہ اسے اپنی دینی عینیت کے تابع رکھنا چاہتا ہے۔ فطرت یعنی زمین و آسمان کے مشاہدے پر بے شک اس نے زور دیا ہے۔ طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، ارضیات، موسمیات، بحریات وغیرہ کے علوم استقرائی مشاہدے ہی کا ثمر ہیں، لیکن ان علوم سے حاصل ہونے والی بے پناہ طبیعی قوت کو وہ قدرت کی اندھی یا میکانکی قوت سمجھنے کے خلاف ہے۔ فطرت کا مشاہدہ اگر صانع فطرت تک رہنمائی نہیں کرتا تو وہ ادھورا، ناقص اور نامکمل ہے۔ یہ بین استقرائی حدود میں رہتے ہوئے وہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت (فطری وجدان) کی بھی ضرورت ہے، جس کے بغیر مظاہر قدرت میں اللہ کی نشانیاں ہرگز نظر نہیں آسکتیں۔ قرآن نے نفس کی اپنی اخلاقی جدوجہد اور اس کے باہر زمین اور آسمان میں آیاتِ الٰہیہ دکھانے کا جو وعدہ کیا ہے، اس کی اصل منشا یہی ہے کہ فطرتیت کو عینیت کا تابع بنایا جائے، بصارت کو بصیرت کا جامہ پہنایا جائے اور استقرائی علوم سے حاصل ہونے والی بے پناہ طبیعی قوت کو اخلاقی قوت کے ماتحت رکھا جائے تاکہ وہ تباہی و ہلاکت کے بجائے دنیا کے لیے سراسر رحمت بن جائے۔

پس دینی علوم کے ساتھ ساتھ استقرائی علوم بھی اسلام کے نصب العین و از نصاب کا لازمی حصہ ہیں۔ عمرانی علوم میں قرآن نے تاریخ کا بالتصریح ذکر کیا ہے اور اسے "ایام اللہ" (۱۴: ۵) کا نام دیا ہے۔ جس طرح دن اور رات کے آنے جانے، سمندروں میں کشتی چلنے، بادلوں سے پانی برسنے اور زمین سے اناج اگنے میں ہوشمندوں کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح قوموں کے عروج و زوال میں ارباب دانش کے لیے اخلاقی سبق ہے کہ قوموں کے کردار پر ہمیشہ اجتماعی حیثیت سے حکم لگایا جاتا ہے اور یہ کہ ان کی بداعمالیوں کی سزا انھیں اس دنیا میں ملتی ہے۔ اہلِ بصیرت اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اللہ کا قانون کبھی

بدلتا نہیں، خواہ اس کا تعلق طبیعیات سے ہو یا تاریخ سے، قدرتی مظاہر سے ہو یا اقوام کے کردار سے۔

استقرائی اور عمرانی علوم کو نصاب میں شامل کرنے کا فلسفہ یہ ہے کہ آرٹ، سائنس اخلاق، تاریخ، سیاسیات وغیرہ میں انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ صرف اس حد تک اس کی ترقی کا پیمانہ ہے جس حد تک اس نے خود اپنے آپ کو ذہن مطلق کا آئینہ دار بنایا ہے۔ آرٹ کے ذریعے انسان کی رسائی حسن مطلق تک ہوتی ہے۔ سائنس ذہن مطلق کی عکاسی کرتی ہے جتنا اور جیسا کچھ وہ اس مادی دنیا میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اخلاقی اقدار خیر مطلق کی جزوی اور دھندلی جھلک ہیں۔ تاریخ ذہن مطلق کو ظاہر کرتی ہے۔ زبان عقل کی مظہر ہے جو خدا کی بہترین تخلیق ہے۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کا علم اپنے طور پر شخصیت کے ارتقا میں اضافہ کرتا رہتا ہے کیونکہ وہ اسے روح مطلق کو زیادہ بہتر طریقے سے منعکس کرنے کے قابل بناتا ہے۔

انسان فقط روح نہیں۔ وہ جسم کے قالب میں ایک روح ہے اور جسم دنیا کی فلاح کا خواہاں ہے جس طرح کہ روح آخرت کی فلاح کی خواہاں۔ اسلام نے دنیوی فلاح کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا ارشاد ہے:

"دنیا سے اپنا حصہ لینا مت بھولو۔" (۲۸ : ۷۷)

اس نے ہمیں یہ دعا مانگنا سکھائی:

"اے میرے رب ہمیں دنیا کی بھلائی عطا فرما اور آخرت کی بھلائی۔" (۲: ۲۰۱، ۷: ۱۵۶)

رسول اکرم کا ارشاد ہے:

"جو شخص دنیا کی فلاح چاہتا ہے اسے علم حاصل کرنا چاہیے۔ جو شخص آخرت کی فلاح چاہتا ہے اسے علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو شخص دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح چاہتا ہے اسے علم حاصل کرنا چاہیے۔"

قرآن اور حدیث کے ان احکام کی روشنی میں مفید ہنر سیکھنا بھی اسلام کے نصب العین نواز نصاب کا لازمی حصہ ہے۔ ان مہارتوں اور ہنروں کا انتخاب بہرحال اس نے معاشرے کی ضروریات

کے اعتبار سے انسان کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔

طریقِ تعلیم

"کیا پڑھا جائے" کا براہِ راست تعلق "کیسے پڑھایا جائے" سے ہے۔ موادِ تدریس کو طریقِ تدریس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تعلیمی عمل کا مرکز نہاں خانۂ دل ہے جس میں طالب علم خود رہتا ہے۔ استاد اس نہاں خانے کا اپنے اثر و رسوخ سے چار دل طرف سے محاصرہ کر سکتا ہے لیکن وہ اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ شاگرد خود اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ اس کی نشوونما خود اس کی اپنی خود متحرکی پر منحصر ہے۔ اس خود متحرکی کو تقویت پہنچانے کے لیے نصاب مطالعے، مشاہدے اور تفکر کے لیے مواد مہیا کرتا ہے اور بصارت کو بصیرت سے ہم کنار کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

عینیتی نظامِ تعلیم میں کتاب کے استعمال پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کتاب کا درس ایصالِ علم کا بہترین طریقہ ہے لیکن درس کس طرح دیا جائے؟ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "انبیا کو یہ حکم ہے کہ لوگوں کو ان کے مرتبوں میں رکھیں اور ان کی عقلوں کے بموجب ان سے بات کریں۔ اس سے یہ اصول مرتب ہوا کہ استاد کے لیے لازم ہے کہ اسے شاگرد کی صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ ہو اور یہ کہ وہ انھیں وہی بات بتائے جو اُن کی سمجھ سے بالاتر نہ ہو۔ اگر کوئی بات شاگرد کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے چاہیے کہ استاد سے پوچھ لے۔ اپنی خود متحرکی کو وہ ہرگز نہ دبائے کیونکہ اسی پر اس کی تعلیم موقوف ہے۔ غزالی کے الفاظ میں علم ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی کنجی سوال ہے۔ پس شاگرد کو سوال ضرور کرنا چاہیے۔ اس میں چار آدمیوں کا بھلا ہے۔ خود سوال کرنے والے کا، استاد کا، سننے والے کا اور اس کا جو ان سب سے محبت کرتا ہے[۵۳]۔

لیکن اسے صرف سوال کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ مسائل کو سمجھ لینے اور انھیں یاد کر لینے سے علم میں ملکہ نہیں حاصل ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے، جیسا کہ ابن خلدون نے زور

---

۵۳ غزالی احیاء علوم الدین۔ اردو ترجمہ مذاق العارفین ج ۱ ص ۱۴۔

دیا ہے کہ: "طلبا کو بحث و مناظرے کا عادی بنایا جائے، مسائل علمیہ پر تحقیقی بحثیں ہوں، مختلف مضامین پر گفت گو چھڑے اور طلبا اس میں سرگرمی سے حصہ لیں۔ اس طریق تعلیم اور اسلوبِ درس سے ملکہ بہت جلد پیدا ہوتا ہے"۔[۵۴]

سوال کرنا اور تحقیقی بحث و تحمیص میں حصہ لینا حصولِ علم کا وہ طریقہ ہے جس کا تعلق شاگرد کی اپنی ذات سے ہے۔ آئیے! اب ہم دیکھیں کہ استاد کس طریقے سے علمی حقائق کو شاگرد کے دل میں اتارتا ہے؟ کسی مضمون کو سمجھنے اور اسے دل نشین کرنے کی استعداد رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے اس لیے تعلیم کا بہترین" طریقہ یہ ہے کہ علوم کو رفتہ رفتہ اور تھوڑا تھوڑا ذہن نشین کیا جائے"۔

ابن خلدون نے اس سلسلے میں استاد کے لیے یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ ہر مضمون کے تین تین دور کرائے۔ پہلے دور میں وہ زیرِ مطالعہ مضمون کے صرف اصولی مسائل بیان کرے اور شاگرد کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اجمالی طور پر ان کی تشریح کرے۔ حسی مثالوں کے ذریعے مجرد حقائق کو سمجھائے اور پیچیدہ مسائل کو اس مرحلے میں بالکل نہ چھیڑے۔ دوسرے دور میں اس مضمون کی تعلیم پھر از سرِ نو شروع کرے اور اس مرتبہ تعلیم کا معیار کچھ بلند کر دے۔ اجمال و اختصار کی جگہ شرح و بسط سے مسائل کو سمجھائے۔ ساتھ ہی ساتھ اختلافی مسائل پر روشنی ڈالے اور وجہ اختلاف بھی بیان کرے۔ تیسرے دور میں اس مضمون کی تعلیم پھر سرے سے شروع کرے اور اس مرتبہ کسی مشکل اور مغلق مسئلے کو بغیر تشریح و توضیح اور تنقیح کے نہ چھوڑے۔ ہر مسئلے کو تفصیل کے ساتھ سمجھائے۔ اس کے مضمرات کو عیاں کرے تاکہ شاگرد کی رسائی اور دقیق معانی تک ہو سکے۔ اس طرح ہر مضمون کو تین تین مرتبہ پڑھنے سے اس میں" بڑی گہری نظر پیدا ہو جاتی ہے"، اور شاگرد کو اپنے علم پر عبور حاصل ہو جاتا ہے[۵۵]۔

کسی مضمون میں" گہری نظر" پیدا کرنے کے لیے ابن خلدون نے دو اور باتیں کہی ہیں، جن کا لحاظ رکھنا استاد کے لیے ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کسی مضمون کو مختلف نشستوں

---

۵۴ مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۵۵۔

۵۵ ایضاً ۸ ۵۵۔

میں نہ پڑھا جائے، درمیان میں وقفہ آجانے سے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، بھول چوک کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔ مختلف اسباق میں ربط و اتصال قائم نہیں رہتا اور ملکہ کا حصول دشوار اور مشکل ہو جاتا ہے جس کا اقتضا یہ ہے کہ کوئی ایک مضمون مسلسل اور لگاتار پڑھا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دو ایک مضمون ایک ساتھ ہرگز نہ پڑھے جائیں ورنہ شاگرد کو کسی مضمون میں درک حاصل نہیں ہوگا۔ اس صورت میں اس کی توجہ اور قوت فہم بٹ جائے گی۔ وہ کبھی ایک مضمون کو چھوڑ کر دوسرے مضمون کی طرف آئے گا اور کبھی دوسرے کو چھوڑ کر پہلے کی طرف اور اس طرح دونوں سے محروم رہے گا۔[۵۶]

پس تعلیم کا مفید ترین طریقہ یہ ہے کہ دو علوم ایک ساتھ نہ پڑھائے جائیں اور نہ کسی ایک علم کو مختلف نشستوں میں پڑھایا جائے۔ ہر علم کے مجوزہ شرائط کے مطابق تین تین دور کرائے جائیں۔ تعلیم کا دارومدار چونکہ شاگرد کی اپنی خود متحرکی پر ہے، اس لیے درس کے دوران میں سوال کرنے کی عام اجازت ہو۔ نیز بحث و مباحثے کا اہتمام کر کے شاگرد کو کسی رائے کے انتخاب یا کسی بات کا فیصلہ کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ضرورت پڑے تو فکر انگیز سوال کر کے استاد اس فیصلے کی طرف شاگرد کی رہنمائی کرے۔

عینیتی نظامِ تعلیم بالعموم غیر محسوس مجرد (ABSTRACT) حقائق کو دل نشین کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن اسلام نے غیر محسوس مجرد حقائق کے ساتھ ساتھ حقیقت کے اس پہلو کو بھی جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک علم حق کا ذریعہ صرف دل یعنی تفکر اور فطری وجدان ہی نہیں، آنکھ اور کان بھی علم حق کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے کتاب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس نے فطرت کا مشاہدہ کرنے کی بھی بار بار تاکید کی ہے۔ اسی دعوت عام کے مدنظر اقبال کہتے ہیں کہ:

"اسلام کا ظہور عقلِ استقرائی کا ظہور ہے"۔[۵۷]

---

[۵۶] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۵۵۔

[۵۷] اقبال: تشکیل الٰہیاتِ اسلامیہ۔ مترجم سید نذیر نیازی۔ بزم اقبال، لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۳

اسلام ٹھوس حقائق کے مشاہدے سے عام کلیّہ اخذ کرنے پر بھی اتنا ہی زور دیتا ہے جتنا کہ کسی عام کلیے کو ایک خاص واقعے پر اطلاق کرنے پر۔ کلیات سے جزئیات کی طرف بڑھنا اس کے نزدیک کافی نہیں۔ وہ جزئیات سے کلیات کی طرف بڑھنے کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کا طریق تعلیم صرف استخراج (DEDUCTION) پر مشتمل نہیں، جو کلیات سے جزئیات کی طرف بڑھنے کا ایک عمل ہے۔ استخراج کے ساتھ ساتھ استقرا (INDUCTION) بھی اس میں شامل ہے جو جزئی حقائق کے مشاہدے سے عام اصول اور کلیّہ اخذ کرتا ہے اور جسے وسیع پیمانے پر استعمال کر کے قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں نے سائنس کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ یورپ کی ولادتِ نو استقرائی طریق فکر ہی کی رہین منت ہے۔ اس نے "اسلام سے جو کچھ حاصل کیا اسی سے فائدہ اٹھا کر وہ مسلمانوں پر سبقت لے گیا"[۹۸]

---

۹۸ انگلستان کا مشہور ماہر انسانیات رابرٹ بریفالٹ (۱۸۷۶-۱۹۴۸) اپنی کتاب میکنگ آف ہیومنٹی (لندن ۱۹۳۰) مترجم عبد المجید سالک بعنوان تشکیل انسانیت (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶) میں لکھتا ہے :

"راجر بیکن نے عربی زبان اور عربی سائنس کا علم حاصل کیا تھا۔ راجر بیکن اور اس کے ہم نام کے متعلق جو بعد کو پیدا ہوا یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ تجربی اسلوب کی ترویج کا سہرا ان کے سر ہے۔ راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ مسیحی یورپ کو مسلمانوں کی سائنس اور ان کا اسلوب سکھانے کا ذمہ دار تھا اور وہ اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے تھکتا ہی نہ تھا کہ اس کے معاصرین کے لیے علم صحیح کا واحد ذریعہ صرف عربی زبان اور عربی سائنس ہے۔" (ص ۳۱۳)

"عربوں کے علم ہیئت نے کوئی کوپرنیکس یا نیوٹن نہیں پیدا کیا۔ لیکن انھوں نے جو کچھ کیا اس کے بغیر کوپرنیکس اور نیوٹن پیدا ہو ہی نہ سکتے تھے۔" (ص ۲۹۵) ــــــ ہماری سائنس پر عربوں کا جو احسان ہے وہ چونکا دینے والے انکشافات یا انقلابی نظریات پر مشتمل نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی زیادہ عربوں کی ثقافت کی ممنون احسان ہے، کیونکہ دراصل سائنس کو اسی ثقافت نے جنم دیا ہے۔ ہم اس سے قبل ثابت کر چکے ہیں کہ دنیائے قدیم قبل سائنس کی دنیا تھی۔ یونانیوں کی فلکیات وریاضیات باہر سے درآمد ہوئی تھیں۔ چنانچہ یونانی ثقافت انھیں پورے طور پر کبھی جذب نہ کر سکی اس میں شک نہیں کہ یونانی اپنے علوم کو مرتب کرتے تھے، اہمیت دیتے تھے، نظریات قائم کرتے تھے لیکن ماہرانہ تحقیق و تفتیش، مثبت علم کی فراہمی، سائنس کی باریک بینی، مفصل اور طویل مشاہدات اور تجربی تجسس یہ سب لوازم یونانی مزاج سے قطعاً بعید تھے۔" (ص ۲۹۶)

پروفیسر منظور الحق صدیقی

مرکزی سیرت کمیٹی پٹی

تعارف

پٹی ایک قصبہ ہے جو ضلع لاہور میں تھا اور ریڈکلف ایوارڈ نے اسے بھارت کو دے دیا۔ سترہ سال تک یہ قصبہ اشاعتِ سیرت کا مرکز رہا۔ مرکزی سیرت کمیٹی کے بانی قاضی عبدالمجید قرشی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کی اشاعت کا کام جس وسیع پیمانے پر کیا اس کی مثال برصغیر پاکستان و ہندوستان کی بارہ ساڑھے بارہ صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شاہ افغانستان غازی نادر شاہ، شاہ عراق، سلطان فیصل، شیخ عبدالظاہر امام خانہ کعبہ، شیخ الاسلام حکومتِ مصر، علامہ کاشف الغطا امام الشیعہ عراق، امیر شکیب ارسلان شامی، محمد علی پاشا، علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی ایسے حضرات نے سیرت کمیٹی کے کام کی تائید کی۔ مدیر "مدینہ" بجنور مولانا حامد الانصاری نے قرشی موصوف کے نام اپنے خط میں لکھا: "آپ اپنے انفرادی وجود سے ہزارہا انجمنوں کا کام دے رہے ہیں"۔ ایران کے ایک سابق وزیر اعظم سید ضیاء الدین طباطبائی نے لکھا: "سیرت کمیٹی کا کام ہر اس شخص کے لیے جو اسلام کی شوکت دیکھنا چاہے، ایک زندہ نمونہ ہے"۔ اور دنیائے اسلام کی اپنے وقت کی عظیم اور محبوب شخصیت مفتی اعظم سید امین الحسینی نے لکھا: "سیرت کمیٹی کے کام پر صرف دنیائے اسلام ہی نہیں خود اسلام بھی شکر گزار ہے"۔

یہ قاضی عبدالمجید قرشی ہی تھے جنھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی ملی تاریخ میں پہلی بار یہ کامیاب تجربہ کیا کہ بغیر کسی قسم کے چندے کے ایک معمولی قصبے میں بیٹھ کر ایک تہی دست انسان ملکوں ملکوں میں اشاعتِ اسلام کر سکتا ہے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۴۰ کو راقم الحروف پٹی گیا۔ دو حضرات مجھے لینے کے لیے اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بڑے چالیس بیالیس کے پیٹے میں ہوں گے۔ قد پانچ فٹ سے نکلا ہوا،

ننگا سر، سر کے بالوں میں پشین بکھری ہوئی، داڑھی ایسی کہ دو روز سے نہ منڈوائی ہو، دانت خراب اور تہ در سے باہر نکلے ہوتے۔ بمپ شو، نہ بند اور کرتے کے اوپر کھری سردی میں صرف واسکٹ پہنے ہوتے۔ ایک ایسی شخصیت جس میں ظاہری کشش نام کو نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ ہیں مولانا عبدالمجید قریشی جن کے نام کا ڈنکا برِصغیر کے شہر شہر میں بج رہا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ مردِ درویش بہت سفر کرتا ہے مگر ہمیشہ تیسرے درجے میں۔ کھانے کا وقت ہو گیا تو کسی تندور پہ بیٹھ کر دال روٹی کھا لی۔ ان کی ضروریات بس اتنی تھیں کہ جسم و روح کا رشتہ قائم رہے۔ ایک ماہ پہلے انھوں نے اپنے اخبار ایمان (۵ انومبر ۱۹۴۸ص ۲) میں لکھا تھا کہ "نہ میری بیوی، نہ اولاد ہے۔ البتہ سگا بھائی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر تیس روپے ماہانہ کی غریبانہ مدرسی کر رہا ہے۔" یہ بھائی عبدالحمید تھے۔ ان کے آفس سکریٹری حمید انور نے ۱۴ نومبر ۱۹۸۷ کو بتایا کہ "وہ جس طرح وضع قطع میں سادہ تھے تقریر و تحریر میں بھی نہایت سادہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ بات مختصر مگر جامع ہوتی تھی۔ بڑے ہی حاضر جواب تھے۔ نہایت اطمینان کے ساتھ مدلل گفتگو کرتے تھے۔ سامنے سوال کرنے والا اجتماع ہو تو تسلی کے ساتھ ہر ایک کو قائل کرتے جاتے تھے۔ میں کئی سفروں میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔ ان کا لوگوں پہ اتنا اثر تھا کہ اگر وہ کوئی دعویٰ کر دیتے تو بہت سے لوگ اسے تسلیم کر لیتے۔"

حمید انور مزید کہتے ہیں کہ "میں ان کا کئی سال آفس سکریٹری رہا۔ ایک روز میں نے کہا کہ مجھے کسی ولی اللہ کی تلاش ہے۔ بولے کہ شام کو سیر کو جائیں گے تو دکھاؤں گا۔ شام کو سیر کو نکلے کہ ایک کسان ہل چلا کر کھیت سے نکل رہا ہے۔ میلے کچیلے کپڑے، جسم گرد آلود۔ کہا کہ یہ زمین سے فصل اگاتا ہے، حلال کی روزی کماتا ہے، اپنے اور اپنے بال بچوں کے لیے محنت کرتا ہے۔ یہ کام کرتے کرتے اتنا تھک گیا ہے کہ اب بڑا کام کرنے کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں۔ یہ ہے ولی اللہ"۔

تنظیم کمیٹی میں

قاضی عبدالمجید قریشی کی پبلک زندگی کا آغاز امرت سر کی تنظیم کمیٹی سے ہوا۔ یہ رسالہ

تنظیم امرت سر" کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ہمارے پیشِ نظر اس رسالے کی جلد ۴ کا شمارہ نمبر ۱ ہے جون ۱۹۲۷ کا یہ عید نمبر ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق پر "اللہ اکبر" کے نیچے لکھا ہوا ہے:

"نگران پالیسی: کچلو ایڈیٹر: قریشی"

اداریہ "راہ نجات: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم" قریشی نے اور شذرہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے لکھا۔ پندرہ مضامین میں سے صرف ایک عید سے متعلق ہے۔ لکھنے والے مونندو ناتھ چیٹرجی، راجہ نریندر ناتھ، مولانا عارف ہسوی دہلی۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی مقیم برلن، چودھری فضل محمد بینوار، ڈاکٹر بشارت احمد، خواجہ عبدالحی فاروقی استاد التفسیر جامعہ ملیہ دہلی، ملک عبدالقیوم بیرسٹر گوجرانوالہ، پروفیسر مولانا نیر واسطی، بھائی پرمانند اور چودھری ولی محمد گوہر ہیں۔ اخبار "ایمان" ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۹ کے صفحات، اور پر "نظام نامہ سیرت کا دیباچہ" کے عنوان سے قاضی عبدالمجید قریشی نے اپنے بارے میں لکھا:

"۱۹۲۵ میں ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے امرت سر میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی گئی جس میں علی برادران سے لے کر سر محمد شفیع تک اور جمعیتہ العلما سے لے کر قادیان تک کے تمام گروہ شامل تھے۔ اس کانفرنس کے نتیجے کے طور پر آل انڈیا تنظیم بنائی گئی۔ حاجی رحیم بخش اس کے صدر تھے، ڈاکٹر کچلو سکریٹری تھے اور میں نائب سکریٹری۔ تین سال کے عالم گیر جوش وخروش کے بعد مسلمانوں کی اس تنظیم کا یہ سب سے بڑا خواب ہمیشہ کے لیے پریشان ہوگیا۔

"اس تمام کشمکش کے دوران میں تمام وقت دفتر تنظیم کا ناظم تھا اور آخری سالوں میں رسالہ تنظیم کا ایڈیٹر تھا۔ اس واسطے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں مجھ سے زیادہ کسی بھی شخص کو یہ علم نہیں کہ امرت سر کی تحریک تنظیم کی ناکامی کے حقیقی اسباب کیا تھے؟

"۱۹۲۸ میں تحریک تنظیم ختم ہوچکی تھی، مگر امرت سر میں اس کی دو یادگاریں باقی تھیں ایک ہفتہ وار اخبار تنظیم اور دوسرے تنظیم یتیم خانہ امرت سر۔ اس وقت میں نے ارادہ کیا کہ میں ایسی کوشش کروں کہ جن رکاوٹوں کے باعث تحریک تنظیم فیل ہوئی ہے، ان سے دامن بچاتے ہوئے امرت سر میں تحریک تنظیم کی صحیح بنیادیں رکھ دی جائیں۔ اس ارادے کے ساتھ میں نے

اپنے ذاتی خیالات "تنظیم بواسطہ مساجد" کے مضمون میں ملک کے سامنے پیش کیے۔ یہ مضمون میرا ذاتی مضمون تھا۔ میرا مقصود یہ تھا کہ اخبار "تنظیم" کے ذریعے سے پچاس ہزار روپیہ جمع کر کے تنظیم یتیم خانہ امرتسر کو ایک تنظیم ٹریننگ سکول کی شکل دے دوں اور پھر ایسے مبلغ اور کارکن پیدا کرنے کا سامان کردوں جو ہندوستان کے ہر گوشے میں مسلمانوں کی شرعی اور دینی تنظیم کا بیڑا اٹھالیں۔ میں نے اپنے اس منصوبے کے مطابق تنظیم یتیم خانہ امرتسر کی سپرنٹنڈنٹی کا بار اٹھایا اور صرف تین ہی مہینے کی کوشش سے قریباً دس ہزار روپیہ نقد جمع کر لیا۔ مگر افسوس یہاں پھر ایسے جھگڑے بروئے کار آئے جن میں میں نے محسوس کیا کہ میں کامیاب نہیں ہوں گا۔ اس واسطے میں مذکورہ بالا دونوں اداروں سے الگ ہوگیا۔ میرے بعد اخبار تنظیم بند ہوگیا اور سرمایہ کی آمد رک گئی اور آج امرتسر کی تحریک تنظیم کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

"(نوٹ) تقریباً دس ہزار روپیہ جو میں نے جمع کیا تھا وہ نصفا نصفی مسلم بنک امرتسر اور دی سنٹرل کواپریٹو بنک امرتسر میں میرے نام محفوظ تھا۔ مسلم بنک کا روپیہ ایک معطی کی منظوری کے بعد ڈاکٹر اقبال مرحوم نے غازی نادرشاہ مرحوم کی امداد کے لیے افغانستان بھیج دیا اور کواپریٹو بنک کا روپیہ تنظیم یتیم خانہ امرتسر کو دے دیا گیا:

صرف بہانۂ مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہوگئے

مرکزی سیرت کمیٹی کا قیام

جس پس منظر میں سیرت کمیٹی پٹی کا قیام عمل میں آیا اس کا ذکر بھی مذکورہ "نظام نامۂ سیرت کا دیباچہ" میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

امرتسر چھوڑنے کے بعد میں برابر کئی مہینے مسلمانوں کی تنظیم پر غور کرتا رہا، اور آخر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس مسئلہ کا حل دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۹۲۸ کے آخر میں مولانا سید کشفی صاحب نظامی رنگون سے پنجاب تشریف لائے اور آپ نے مجھے دوبارہ کام کرنے کی ترغیب دی اور اسلامیہ کالج لاہور میں ایک اہم مجلس شوریٰ بلائی جس میں لاہور کے تمام اسلامی اخباروں کے ایڈیٹر، کالج کے پروفیسر اور کئی معززین شامل تھے۔ اس مجلس میں میں

نے تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات پیش کیے اور اپنے سہ سالہ ذاتی تجربات کی روشنی میں مسئلہ تنظیم کا حل بتایا جسے تمام اصحاب نے خوش آمدید کہا۔ اس کے چندروز بعد کالجوں کے مسلم طلبا کی کوشش سے لاہور میں ایک زبردست جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں میں نے دوبارہ تفصیل کے ساتھ بتایا کہ وہ کون سے اصول ہیں جن پر میں دوبارہ مسلمانوں کی تنظیم کا کام کروں گا۔

"جب میں نے کام شروع کیا تو میرے پاس صرف تئیس روپیہ کا ذاتی سرمایہ تھا۔ کام جاری کرانے کے بعد سید کشفی شاہ صاحب نظامی رنگون تشریف لے گئے۔ (جزاہ اللہ احسن الجزا) اور میں آج بھی منجدھار میں بہا جا رہا ہوں ..... تاریخی طور پر ..... ۱۹۲۹ء میں راقم الحروف نے ذاتی حیثیت سے پٹی میں "دفتر اشاعت سیرت" قائم کیا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں اخبار نکالا اور اس کے ساتھ ایک کتب خانہ بڑھایا۔ ۱۹۳۲ء تک یہ تمام کاروبار "دفتر اشاعت سیرت" کے نام سے ہوتا رہا۔ ۱۹۳۲ء میں میں نے پہلی مرتبہ پٹی میں مقامی سیرت کمیٹی بنائی اور اس کے لیے اپنے دفتر سے ایک ہزار روپیہ سرمایہ بہم پہنچایا۔ پھر ۱۹۳۴ء میں ماتحت کمیٹیاں بنانے کی دعوت شروع کی اور اس کی کامیابی پر اگلے سال ۴ جولائی ۱۹۳۵ء کو معززین لاہور کے اجتماع میں (۱) آٹھ ہزار روپیہ نقد (۲) اخبار ایمان، (۳) ۷۰ مجالس سیرت کا انتظام پیش کر کے دعوت دی کہ ایک قومی بورڈ بنا کر اس تحریک کو چلایا جائے لیکن اتفاق سے ملک سر فیروز خاں نون جو اس کام کے ذمہ دار بنائے گئے تھے، ہائی کمشنر ہو کر انگلستان چلے گئے۔ چونکہ باقی اصحاب نے ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا، اس واسطے اخبار اور کتب خانے کا کام میری ذمہ داری پر بدستور جاری رہا۔"

قومی بورڈ کی تجویز

مذکورہ بالا اقتباس میں جس قومی بورڈ کا ذکر ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ قریشی مرحوم نے سر فیروز خاں نون وزیر تعلیم پنجاب کو خط لکھا اور انھوں نے ۴ اپریل ۱۹۳۵ء کو اپنے مکان پر معززین کا ایک اجتماع کیا۔ اس میں میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا سابق صدر بلدیہ لاہور، خان بہادر حاجی رحیم بخش، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش مدیر احسان، مولانا سید حبیب، مولانا عبدالمجید سالک، ملک لال دین قیصر، مولوی غلام محی الدین خاں سکرٹری

انجمن حمایت اسلام لاہور، میاں امیرالدین میونسپل کمشنر اور میاں فیروزالدین احمد میونسپل کمشنر وغیرہ نے شرکت کی۔ بانیٔ تحریک سیرت نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا :

"سیرت کی تحریک اس اصول پر شروع کی گئی تھی کہ اس کام میں کسی قسم کا چندہ نہیں کیا جائے گا اور تحریک کے تمام کام اخبار "ایمان" اور کتب سیرت کی فروخت سے پورے کیے جائیں گے۔ کام شروع کرتے وقت یہ اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ مجھے جس قدر بھی آمدنی حاصل ہوگی، اس میں سے پچاس روپے ماہوار ذاتی تنخواہ اور سٹاف کے ضروری اخراجات وضع کرکے باقی رقم قوم کے حوالے کردی جائے گی۔ گزشتہ پانچ سال کا کام آپ کے سامنے ہے۔ اس وقت بائیس زبانوں میں سیرت نبویؐ کا ترجمہ ہوچکا ہے اور شاہان اسلام سے عامۃ المسلمین تک تمام دنیا کے مسلمان تحریک سیرت کے کام سے متاثر اور مسحور ہیں۔ اس وقت "ایمان" کی اشاعت تین ہزار سے زائد ہے اور باوجودیکہ اخبار میں ایک سطر بھی اشتہار کی نہیں ہوتی، تاہم تمام اخراجات نکال کر اخبار کا مستقل منافع دوڈیڑھ سو روپیہ ماہوار سے کم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ۲۶ سو روپے کا نقد سرمایہ میرے پاس موجود ہے۔ مجھے پٹی میں کوئی ایسا مسلمان نظر نہیں آتا جو میرے بعد اس کام کو جاری رکھے۔ میں چاہتا ہوں کہ اشاعت سیرت اور تنظیم ملت کا یہ مرکز عمل جس سے تمام دنیا کو فائدہ پہنچ رہا ہے، میرے بعد بھی جاری رہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اپنی زندگی میں اپنے کام کی بقا کا انتظام کرجاؤں اور اسی لیے آج آپ کو تکلیف دی گئی ہے۔ میں سردست چھ ہزار روپیہ اور اخبار "ایمان" کامل طور پر قوم کے حوالے کر رہا ہوں۔۔۔"

قاضی عبدالمجید قریشی کی اس پیشکش کو تمام حاضرین نے سراہا۔ ملک لال دین قیصر نے کہا، "مجھے قریشی صاحب اکثر دفعہ ملتے رہے۔ میں انھیں ہمیشہ کہتا تھا کہ آپ اپنے ساتھ دوسرے معززین کو کیوں شامل نہیں کرتے؟ آپ ہمیشہ یہ جواب دیتے تھے، ملک صاحب! اس طرح کام میں حرج ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب انھوں نے مسلسل کام کیا تو ثابت ہوگیا کہ ان کا خیال صحیح تھا۔ آج میں دیانت داری سے اعتراف کرتا ہوں کہ میرا خیال غلط تھا اور اب میری رائے ہے کہ روپیہ اور کام سب کچھ انھیں واپس کردیا جائے۔ یہ ان کے پاس بنکوں سے زیادہ محفوظ ہوگا۔۔" اس پر مولانا عبدالمجید سالک نے کہا: "قریشی صاحب پانچ سال سے اس کام کو

اچھی طرح چلا رہے ہیں۔ وہ کسی سے چندہ نہیں مانگتے۔ انھوں نے ایک ایک پیسہ کر کے کفایت شعاری سے چھ ہزار روپیہ جمع کیا ہے۔ ہمیں اس روپے کا کوئی علم نہیں، نہ اس پر ہمارا کوئی حق ہے۔ ہم نے زندگی بھر میں ایک بھی ایسی مثال نہیں دیکھی کہ ایک شخص اپنا سب کچھ قوم کے حوالے کر دے یہ تو رہنے دیجیے کہ یہ سب کام قریشی صاحب پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔" (ایمان ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء ص ۱۳، ۱۴)

اس کے باوجود قریشی صاحب کے اصرار پر ملک فیروز خاں نون اور میاں عبدالعزیز بیرسٹر پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا گیا۔ پیشتر ازیں کہ یہ بورڈ سرمایہ اور ایمان اخبار اپنی تحویل میں لیتا ملک صاحب انگلستان چلے گئے۔

گیارہ سال کی خدمات

مرکزی سیرت کمیٹی پٹی نے اپنے قیام کے بعد ابتدائی گیارہ برس میں اس کے بانی کے الفاظ میں حسب ذیل خدمات انجام دیں:

۱۔ تمام کرۂ زمین پر جلسہ ہائے سیرت کا نظام قائم کیا۔

۲۔ اکیس لاکھ کتب سیرت چھبیس زبانوں میں شائع کر کے تقسیم کرائیں۔

۳۔ چار لاکھ قرآنی لکچر اور درس تین زبانوں میں پھیلائے اور پہنچائے۔

۴۔ سات بیرونی ممالک میں تبلیغ کے لیے مبلغ بھیجے۔

۵۔ سات ہزار مساجد کو وقت کے مطابق کئی لاکھ اردو خطبے بہم پہنچائے۔

۶۔ نومسلم ہوم کے لیے پانصد ایکڑ اراضی وقف کرائی۔

۷۔ نظام سلور جوبلی کا سپاسنامہ چھبیس زبانوں میں نشر کرایا۔

۸۔ چھ ہزار روپیہ مظلومین ترکی و فلسطین کو بھیجا۔

۹۔ ادارے نے دس ہزار روپیہ ذاتی فنڈ سے تبلیغ کے لیے وقف کیا۔

طاقت

۱۔ اس وقت مرکز کے تحت پانچ سو کمیٹیاں دنیا بھر میں تبلیغ کر رہی ہیں۔

۲۔ کمیٹی کا اخبار دو زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔

۳۔ تین ہزار مسجدوں میں کمیٹی کے اردو خطبے سنائے جاتے ہیں۔

۴۔ تحریک درسِ قرآن میں ایک لاکھ مسلمان روزانہ قرآن پڑھتے ہیں[۱]

ہم یہاں سلسلہ وار ہر خدمت کا جائزہ لیتے ہیں:

جلسہ ہائے سیرت کا انتظام

مسلمان صدیوں سے میلاد کی محفلیں منعقد کرتے چلے آئے ہیں۔ اس کے لیے ۱۲ ربیع الاول کی قید نہیں۔ ایسی محفلیں سارا سال ہوتی رہتی ہیں، لیکن سیرت کے جلسوں کا رواج اتنا قدیم نہیں۔ جب قاضی عبدالمجید قرشی نے دفتر اشاعت سیرت قائم کیا۔ اس زمانے میں بھی برصغیر کے بعض شہروں میں سیرت کے جلسے ہوتے تھے اور کہیں کہیں جلوس بھی نکلا کرتے تھے۔ انھوں نے ان جلسوں اور جلوسوں میں ایک نظم پیدا کیا اور انھیں بہت زیادہ فروغ دیا۔ وہ شرعی حیثیت سے نہیں بلکہ انتظامی سہولت کے لیے ۱۲ ربیع الاول پہ زور دیتے تھے۔ ۱۹۳۷ میں انھوں نے لکھا: "میری معلومات کے مطابق اس ایک دن میں تمام کائنات میں عملی طور پر سیرت نبوی کی اس قدر غیر معمولی اشاعت ہو جاتی ہے جو معمولی حالات میں پچاس سالوں کے اندر بھی نہیں ہوتی۔" کسی ایک ۱۲ ربیع الاول کے جلسوں کی کارروائی پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس بیان میں قطعی مبالغہ نہیں کیا۔ ان جلسوں کی ایک خصوصیت یہ تھی برصغیر کے طول و عرض میں ہر سال ان میں لاکھوں غیر مسلم شرکت کیا کرتے تھے اور ہر سال سینکڑوں غیر مسلم ان میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر تقریریں کیا کرتے تھے۔ کئی غیر مسلم ان میں نعتیں پڑھتے۔ ایسے ہی ایک جلسے میں مدراس میں تھضما چاریہ نے حضورؐ کی شان میں ایک زوردار سنسکرت قصیدہ پیش کیا۔ ایک مسلمان نے اس کا تامل زبان میں ترجمہ سنایا۔ بعض مقامات پر ایک ایک جلسے میں چھ چھ زبانوں میں سیرت پاک پر تقریریں کی گئیں۔ یہ بات نہیں کہ برصغیر میں سیرت پر جتنے جلسے ہوتے تھے وہ مرکزی سیرت کمیٹی پٹی ہی منعقد کراتی تھی۔ کئی مقامات ایسے بھی تھے جہاں مقامی انجمنیں ان کا انتظام کرتی تھیں۔ اخبار ایمان کی ۱۲/۱ جولائی ۱۹۳۸ کی اشاعت میں بمبئی میں ایک جلسۂ سیرت کی روداد چھپی ہے جو وہاں کی بیس انجمنوں نے متفقہ طور پر منعقد کیا اور جس میں

---

[۱] ایمان ۲۵/۱۸ نومبر ۱۹۴۰ ص ۱۵

نواب بہادر یار جنگ نے خطبہ صدارت پڑھا اور مسٹر محمد علی جناح نے انگریزی زبان میں مختصر سی تقریر کی بلہ

کتب سیرت

قاضی عبدالمجید قرشی نے ۱۹۳۰ء میں سیرت کمیٹی قائم کیا اور دس سال کے عرصے میں سیرت کمیٹیوں کی معرفت ۲۱ لاکھ کتب سیرت ۲۵ زبانوں میں تقسیم کیں۔ ان زبانوں میں برصغیر کی معروف زبان کے علاوہ افریقہ اور برما کی بعض زبانوں میں ان کے تراجم شائع کیے سیرت نبوی کا جاپانی ترجمہ پانچ ہزار کی تعداد میں چھاپ کر ٹوکیو میں مفت تقسیم کرایا اور اسلامی سوسائٹی ٹوکیو کو دیگر ہزارہا کتب مفت بھیجیں۔ سیرت کمیٹی رنگون نے مرکزی سیرت کمیٹی پٹی کی چھپوائی ہوئی کتابوں کے برمی زبانوں میں تراجم اکتوبر ۱۹۳۸ء تک ۶۴۰۰۵ کی تعداد میں مفت تقسیم کیے۔ اشتہاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر پیغمبر اسلام تیرہ زبانوں میں اور تقریر ہادی اسلام سولہ زبانوں میں چھپی تھی۔ ہم نے جن مطبوعات کو اوپر لکھا ہے، یہ در اصل ۳۲، ۳۲ یا کچھ زائد صفحوں پر مشتمل رسائل تھے جن میں مشاہیر کے مضامین اور تقریریں تھیں۔ قرشی صاحب کے اپنے لکھے ہوئے مضامین بھی تھے۔ انھوں نے چوبیس رسائل کو یک جا کر کے گیارہ سو صفحات کی ایک کتاب بھی شائع کی جس کی قیمت صرف دو روپیہ رکھی۔ اس کتاب میں دس ہندو فضلا کے علاوہ علامہ امیر شکیب ارسلان شامی، سید رشید رضا مصری، سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین، لارڈ ہیڈلے فاروق، ڈاکٹر خالد شیلڈرک، نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، سید نواب علی وزیر مالیات جوناگڑھ وغیرہ کے مضامین یا تقاریر بر سیرت تھیں۔

رسائل سیرت کے علاوہ سیرت کمیٹی نے اسلامی موضوعات پر متعدد رسائل شائع کیے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے ڈاکٹر ضیاء الدین، حافظ محمد ابراہیم اور سید طفیل احمد پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی نے مسلمانوں کے افلاس پر ایک رپورٹ مرتب کی اور

سلہ اخبار ایمان، جولائی ۱۹۳۸ء

اس کو طبع کراکے اس کی قیمت چار آنے مقرر کی۔ سیرت کمیٹی پٹی نے صرف تین تین پیسے میں ہزاروں
کی تعداد میں تقسیم کیا۔ اسی طرح امیر شکیب ارسلان شامی کی اسباب زوالِ ملت ۴۸ صفحوں
کی کتاب کی اشاعت بیسی ہزاروں میں ہوئی۔ "انقلابِ ہند اور مسلمان" ۴۸ صفحات کا
رسالہ تھا۔ قیمت ایک آنہ (موجودہ چھ پیسے) پہلی بار آٹھ ہزار کی تعداد میں چھاپا گیا اور
ایک مہینے میں بالکل ختم ہو گیا۔ اسی طرح ۲۰۸ صفحے کی کتاب "اسلام زندہ باد" شائع کی۔ اس
کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ اس میں ستائیس حیرت انگیز اور روح پرور واقعات کا ذکر ہے،
جن میں چار واقعات علامہ اقبال سے منقول ہیں۔ سیرت بکڈپو میں ایسی کتابیں بھی ملتی
تھیں جو مرکزی سیرت کمیٹی کی شائع کردہ نہ تھیں، ان میں سے ایک قابلِ ذکر کتاب تاریخ
مسلم لیگ مرتبہ مرزا اختر حسین ایڈووکیٹ ایم ایل اے تھی۔ یہ کتاب مسلم لیگ کی ابتدا سے یومِ نجات
تک کی مکمل تاریخ ہے۔ ۱۹۰۷ سے ۱۹۳۹ تک مسلم لیگ کے ۲۶ سالانہ اجلاسوں کے استقبالیہ
اور صدارتی خطبات، لیگ کے سولہ صدروں کے فوٹو بلاک صفحات ۶۰۰، قیمت ڈھائی روپے۔

قرآنی لکچر

۱۹۳۷ میں سیرت کمیٹی پٹی نے قرآنی لکچر کے نام سے تبلیغ قرآن کا کام شروع کیا۔ فیصلہ
کیا گیا کہ ہر سال دس قرآنی لکچر شائع کیے جائیں گے اور یہ لکچر محصول ڈاک وصول ہونے
پر مفت روانہ کیے جائیں گے۔ ۶۴ صفحوں کا پہلا لکچر "حقیقت دین" کے نام سے چار
ہزار انگریزی میں شائع کیا گیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ۱۹۴۰ تک کئی قرآنی لکچروں کے
تین زبانوں میں چار لاکھ نسخے شائع ہو چکے تھے۔ ان لکچروں میں علامہ رشید رضا کے مقاصد
قرآن کے دس بے مثال لکچر بھی شامل تھے جنھیں بعد میں ۲۳۶ صفحات پر کتابی شکل میں
بھی شائع کیا گیا۔

خطباتِ جمعہ و عیدین

۱۹۳۷ میں خیال پیدا ہوا کہ تنظیم مساجد کے لیے ضروری ہے کہ ان میں ایک ہی خطبہ جمعہ
دیا جائے۔ تین سال میں سات ہزار ائمہ مساجد نے ان سے خطبات طلب کیے۔ یہ خطبات
سال بھر ہفتے وار بھیجے جاتے تھے اور ان ۵۲ خطبات کے صرف آٹھ آنے (موجودہ پچاس پیسے)

وصول کیے جاتے تھے۔

دوسری جنگ عالمگیر میں کاغذ کی مہنگائی کے باعث اخبار ایمان کے سال ۱۱ نمبر ۸، ۹ کو خطبہ نمبر قرار دیا اور اس میں ۲۷ جون ۱۹۴۱ جمعہ سے ۷ ستمبر جمعہ تک خطبات شائع کیے جن کے موضوع یہ ہیں: تیاری کا وقت، تعلیم اور مسلمان، راہ خدا کی قربانی، قیامت کے نشانات، قرآن اور مسلمان، عذاب نار کا نظارہ، ایمان کی تحریک، خطرناک پارٹی بندی، ہمارا کل اور آج، وعظ کی باتیں، فضول خرچی۔ اس طرح عیدین کے موقعوں پر خطبے شائع کیے جاتے۔

درس قرآن

۱۹۳۸ میں قاضی عبدالمجید قریشی نے درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا اور اخبار "ایمان" میں لکھا۔ "ہم آپ کو آٹھ آنے سالانہ میں چونسٹھ چونسٹھ صفحے کے بارہ رسائل بھیجیں گے۔ ہر رسالے میں تیس درس ہوں گے۔ ہر درس دو صفحے کا آسان تقریری شکل میں۔ ہر درس میں اوپر ایک آیت ہوگی اور نیچے صرف دو صفحوں میں ترجمہ اور تشریح۔ آپ گھر میں ایک وقت مقرر کردیں کہ اس وقت گھر کا کوئی ممبر غیر حاضر نہ ہو۔ ایک جگہ فرش بچھا کر ہر روز ماں، بچے، بہن بھائی سب حلقہ بنا کر بیٹھ جائیں اور آپ صرف چار منٹ میں انھیں روزانہ ایک درس پڑھ کر سنا دیا کریں۔ جس دن باپ نہ ہو، بیٹا مسند ہدایت پر بیٹھے اور ایک درس پڑھ کر سنائے۔ ہر مسجد، ہر زنانہ اور مردانہ سکول اور اسلامی گھر میں ایک ایک آیت روزانہ سکھانے کا سلسلہ شروع کردیا جائے۔"

درس قرآن کا پہلا نمبر ساٹھ ہزار چھاپ کر پھیلایا گیا۔ دوسرا نمبر کتابی سائز کے ۱۲۸ صفحات پر شائع کیا گیا اور اس کی قیمت مع محصول ڈاک پانچ پیسے رکھی گئی۔ تیسری جلد ۱۱۲ صفحات پر چھپی۔ اس میں نمبر ۱۰۱ سے ۱۵۲ تک کل ۵۲ درس ہیں۔ یہ کتاب ۱۰ جون ۱۹۳۹ کو شائع کی گئی۔ چوتھے نمبر میں ۱۵۳ سے ۲۱۷ تک اور پانچویں میں ۲۱۸ سے ۲۸۶ تک ۹۶ درس ہیں۔ یہ پانچویں جلد ۷ اکتوبر ۱۹۴۰ کو شائع کی گئی اور اس میں ۹۶ صفحات ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب درسوں کی تعداد ۳۶۵ ہوگئی تو چھ پاروں کی یہ تفسیر ۶۲۵ صفحات پر یک جا شائع کردی گئی اور اس کا ہدیہ سوا روپیہ رکھا گیا۔

اخبار "ایمان"

سیرت کمیٹی پٹی کا ترجمان پندرہ روزہ اخبار "ایمان" تھا۔ اس کا پہلا نمبر جولائی ۱۹۳۰ کو شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر قاضی عبدالمجید قریشی، ان کے آفس سکریٹری حمید انور، اور پھر سے قاضی موصوف رہے۔ اس کا گجراتی ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا کئی جگہ اس کے انگریزی اور ہندی ایڈیشن شائع کرنے کا اشتہار بھی دیکھا ہے۔ نہ معلوم اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔ بقائے عالم گیر کے زمانے میں بھی یہ اخبار چار ہزار کی تعداد میں ڈمی کاغذ پر ۶ صفحوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس پر لاگت پانچ پیسے آتی تھی اور چار پیسے میں بیچا جاتا تھا اور یہ چار پیسے بھی بعض نا خیں مار لیتی تھیں۔ اس میں اشتہار نہیں چھپتے تھے۔ ایک موقع پر بانی تحریک سیرت نے لکھا کہ "اگر اخبار باقی نہ رہا تو تحریک اپنے آپ فنا ہو جائے گی"۔ اس اخبار کی اشاعت اور علاقہ اشاعت کئی اردو روزناموں سے زیادہ اور وسیع تر تھا۔

بیرونی ممالک میں مبلغ

کئی اسلامی ملکوں اور بادشاہوں کے پاس مبلغ اسلام بھیجے گئے۔ ایک مبلغ افغانستان بھیجا گیا۔ ایک مبلغ عراق و مصر بھیجا گیا۔ ایک مبلغ چین و جاپان کے لیے تیار رہے اور دو گریجویٹ موٹر سائیکل پر تمام کرۂ زمین کے گرد تبلیغی سفر کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ سیرت کمیٹی نے سلطان ابن سعود کے پاس ایک سفیر بھیجا تھا جس کی کوشش سے سلطان نے حاجیوں کے لیے جملہ اخراجاتِ حج میں ۲۵ فی صد خرچ معاف کر دیا۔[۱۳]

فلسطین فنڈ

قاضی عبدالمجید قریشی تحریک سیرت کو بغیر کسی چندے کے چلاتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے مداحین کے زور دینے پر انھوں نے فلسطین کے مسلمانوں کی امداد کے لیے رقوم وصول کیں۔ ایمان کی ۳۰ اگست ۱۹۳۹ میں ہے کہ کل ۷ ۱۱۴ روپیے ۴ آنے جمع ہوتے جو سب بھیج دیے گئے۔

پانسو ایکڑ اراضی کا عطیہ

موضع کچی (حیدرآباد دکن) کی پانسو ایکڑ اراضی کا حق تولیت محترمہ ستہ الوہاب صاحبہ کی

---

[۱۳] کتابچہ "تقریر سیرت" کا آخری صفحہ

طرف سے راقم الحروف (قاضی عبدالمجید قرشی) کے سپرد کیا گیا تھا۔ اب خاکسار نے اس کے لیے ایک باقاعدہ کمیٹی بنا دی ہے جس کے صدر شیخ عبداللہ احمد صاحب انواری بازار امراؤتی اور سکریٹری جناب محمد عبدالستار صاحب مراد منزل حیدرآباد دکن مقرر کیے گئے ہیں۔ آئندہ زمین کے ساتھ سیرت کمیٹی پٹی یا راقم الحروف کا متولی کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا بلکہ صرف کمیٹی مذکورہ زمین کا انتظام اور نومسلموں کی آبادی کی ذمہ داری ہوگی"[۵۴]

چھاپہ خانہ کی تجویز

۱۹۴۰ میں بانی تحریک سیرت نے مرکزی تبلیغی مطبع کے قیام کی سکیم پیش کی اور لکھا کہ:

"سیرت کمیٹی اس وقت پچیس ہزار درس قرآن، سات ہزار دو خطابات اور روزانہ بانوں میں اخبار "ایمان" چھاپ رہی ہے۔ ہزارہا کتب سیرت اور دوسری تصانیف اس کے علاوہ ہیں۔ ان تمام تالیفات کی طباعت پر کمیٹی کو ہر مہینے تین سو روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ اسی خرچ میں ایک پورا مطبع چل سکتا ہے۔ اس مطبع کے لیے پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ کہ ایک دن مقرر کرکے اگر درس قرآن کے پچیس ہزار خریدار کم از کم ایک ایک روپیہ خود یا جمع کرکے بھیج دیں تو غریبوں کی کوشش سے بھی صرف ایک دن ہی میں یہ رقم پوری ہو سکتی ہے۔ اس تجویز پر صرف ایک سال میں چار ہزار آٹھ سو اکیس روپے ساڑھے تیرہ آنے جمع ہو گئے"[۵۵]

سیرت کمیٹیاں

سیرت نبوی ؐ کے جلسے تو بعض جماعتیں کئی سال پہلے سے کرتی رہتی تھیں، مگر ایک ایسی جماعت جس کا کام ہی اشاعت سیرت ہو اور وہ سارا سال یہی کام کرتی رہے، پہلی مرتبہ قصبہ پٹی میں ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی۔ اس جماعت کے سادہ سے نام (یعنی سیرت کمیٹی پٹی) نے اسے مقبول عام بنانے میں بڑا کام کیا۔ ۲۱ نومبر ۱۹۳۶ء کے اخبار ایمان کے صفحہ ۱۱ پر "نظام سیرت کا دستور العمل اور پروگرام" شائع ہوا۔ جب برصغیر کے ہر صوبے میں سیرت کمیٹی پٹی کی کئی کئی

---

۵۴ ایمان ستمبر ۱۹۳۷ء ص ۲

۵۵ ایمان ۱۲ جون ۱۹۴۱ء ص ۱۲۔

شاخیں کھل گئیں تو تنظیمی سہولت کے پیش نظر ۱۹۳۸ میں صوبائی تنظیموں کا آغاز کیا گیا[۵۶]
اگلے سال بارہ شقوں پر مشتمل "سیرت کمیٹی پٹی کا نظام نامہ" شائع کیا گیا[۵۷]
دو ماہ بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ کے ایمان میں نو شقوں پر مشتمل "ماتحت کمیٹیوں کے لیے ضمنی قواعد"
شائع کیے گئے۔ اس وقت برصغیر اور بیرونی ملک میں سیرت کمیٹیوں کی تعداد پانسو تھی۔

بانیٔ تحریک سیرت کے سفر

قاضی عبدالمجید قرشی نے تحریک کے سلسلے میں متعدد سفر کیے۔ ان کے اخبار "ایمان" کی
جلد ۸ کے صرف سات پرچوں سے ان کے چار طوفانی سفروں کی تفصیل کا علم ہوتا ہے،
جس طرح ان کی تحریروں میں نپے تلے الفاظ ہوتے تھے اسی طرح ان کا کوئی قدم بھی تفاصیل
طے کیے بغیر نہ اٹھتا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک دورے کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

"تحریک سیرت کی دوسری منزل کا کام شروع کیا جارہا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ نظام سیرت کے ذریعے
دینی بنیادوں پر مسلمانوں کی صوبہ واری تنظیم کی جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے میں ہندوستان بھر کے بڑے بڑے
شہروں کا ایک دورہ کرنا چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ میرے دورۂ ملک کا مقصد اصلی یہی ہے کہ ہر ایک صوبے میں
مبلغین اسلام کی مستقل جماعت مہیا کی جائے جو صوبجاتی سیرت کمیٹی سے تنخواہ پائے اور عام مسلمانوں سے کسی
قسم کا کرایہ یا نذرانہ لیے بغیر سارا سال اپنے صوبے کے مسلمانوں کی دینی تنظیم کے لیے ایک نبی اور ایک ملت
کے اصول پر ایک پراونشل کمیٹی قائم کریں ۔ ۔ ۔

دورے کی ترتیب میں پنجاب و سرحد، یوپی اور سی پی، بہار، اڑیسہ، جنوبی ہند، پھر بمبئی، سندھ،
آخر میں بنگال اور برما رکھا گیا ہے۔ سفر کے جملہ اخراجات سیرت فنڈ سے ادا کیے جائیں گے اور ہر صوبے
کے مسلمانوں سے تحریک کے مقاصد پیش کرنے کے سوا کسی قسم کا چندہ یا امداد قبول نہ کی جائے گی"[۵۸]

پہلا سفر بیس روز کا تھا۔ دوسرا سفر آگرہ، جھانسی، بمبئی، ناگپور، مومن پورہ، کامٹی، اکولہ
پھر بمبئی کا کیا۔ تیسرا سفر ناگپور، امراؤتی، بدنیرہ اور جبل پور کا تھا۔ ان میں سے بمبئی کے

---

۵۶ ایمان ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء، ص ۲
۵۷ ایمان ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء، ص ۷-۱
۵۸ ایمان ۱۵ اپریل ۱۹۳۸ء

حالات کا ایک مختصر سا حصہ ہم اخبار "ایمان" کی ۳۰ جولائی ۱۹۳۸ء کی اشاعت سے یہاں نقل کرتے ہیں:

" ۲۷ جولائی کو بمبئی پہنچا تاکہ قرآنی مدرسہ کا افتتاح کروں۔ یہاں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس کی شرمندگی کو میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں۔ بمبئی میں افتتاح مدرسہ کے لیے جو پوسٹر شائع ہوئے، ان میں لکھا تھا کہ حضرت علامہ مولانا عبدالمجید قرشی۔۔۔ مدرسہ کا افتتاح کریں گے۔ حالانکہ میں مولانا ہونے سے کوسوں دور ہوں اور علامہ ہونے کی مجھے آج تک ایک مرتبہ بھی ہوا نہیں لگی، اور حضرت کہنا تو ایک ایسا اونچا درجہ ہے کہ جس کو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ باقی رہا خدمتِ دین کا کام تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ خداوند تعالیٰ بعض دفعہ کسی فاسق و فاجر آدمی سے بھی اپنے دین کی تائید کرا لیتا ہے۔ یقین کیجیے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث صرف میرے ہی لیے ہے۔

مسٹر جناح سے شرفِ نیاز

۴ جولائی ۱۹۳۸ کو مسٹر جناح سے شرفِ نیاز حاصل کیا۔ جناب عثمان قاسم صاحب اور قریشی نظام الدین صاحب سکریٹری سیرت بورڈ احمد آباد ساتھ تھے۔ یہ دلچسپ اور پُر محبت ملاقات سوا گھنٹے تک جاری رہی۔ سوال زیر بحث یہ تھا کہ ہم مسلمانوں کو کس طرح اقوامِ عالم کے مقابلے پر لا کھڑا کر سکتے ہیں۔ گفتگو کی دلچسپی اور مسٹر جناح کی اخلاقی عظمت کا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ صاحب موصوف کھانے کے لیے بھی نہیں گئے۔ آپ نے وہیں دفتر میں کھانا منگوایا۔ جہاں تک میرا خیال ہے مسٹر جناح کا دل و دماغ، آنکھیں، زبان اور کان پوری طرح زیر بحث گفتگو میں منہمک تھے۔ اس واسطے یہ کہنا نہایت ہی مشکل ہے کہ اس دن مسٹر جناح نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ تفصیلات سننے کے بعد بزرگ محترم نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور اپنی انگشتِ شہادت سے دماغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، جو کچھ آپ چاہتے ہیں میں پوری طرح سمجھ گیا۔ میرے لائق کوئی خدمت؟ میں نے عرض کیا، صرف مشورہ کرنا مقصود تھا۔ چندہ ہم لیتے نہیں، جلسوں کا ابھی ہمارے لیے موسم نہیں آیا۔ مرکزی سیرت کمیٹی نے اپنے پاس سے دو ہزار کی کتب سیرت برادرانِ بمبئی کی خدمت میں پیش کی ہیں کہ ان کی فروخت کے دو ہزار روپے سے دفتر سیرت قائم کر دیا جائے گا۔ یہ کام ہو گیا تو میں پھر حاضر ہوں گا تاکہ دفتر کا افتتاح کر کے کام شروع کر دیا جائے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے متعلق اہم گفتگو ہوئی۔ جب میں نے رخصتی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میرے دل نے آواز دی محمد علی جناح زندہ باد۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر جناح نے میری اس قلبی دعا کو سنا، یا نہیں[۵۹]

چوتھا سفر اگست ۱۹۳۸ء میں یو پی کا کیا گیا۔ ۱۹ کو رہتک پہنچے۔ یہاں مجلس شوریٰ میں انھوں نے مقاصد سیرت پر تقریر کی۔ شام کو جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ حافظ منور علی صدیقی، قاری محمد صدیق صدیقی، حاجی الٰہ دین، پیر رحمت اللہ اور حافظ محمد عمر صاحبان کا قریشی صاحب نے "ایمان" میں خصوصی ذکر کیا ہے۔ ۱۹ کو دہلی پہنچے۔ یہاں لطیف الرحمٰن صدیقی اور سید سعید احمد نقوی ان کے ساتھ ان کی تقریر سننے میرٹھ تک گئے۔ میرٹھ میں جلسۂ عام، مجلس شوریٰ اور فیض عام ہائی سکول میں انھوں نے تقریریں کیں۔ ۲۲ کو علی گڑھ پہنچے۔ وہاں شیخ عطاء اللہ لکچرر شعبہ معاشیات ان کے میزبان ہوئے۔ مولانا شیخ شفیق حسن ان کے معلم تھے۔ وہاں ڈاکٹر سید شاہ سلیمان وائس چانسلر، پروفیسر اے بی اے حلیم، ڈاکٹر ظفر الحسن، ڈاکٹر عابد امجد علی، جناب عمر الدین لکچرر، جناب انطاف حسین سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشنل کانفرنس مولانا اکرام اللہ خاں ندوی مدیر کانفرنس اور پروفیسر عبد العزیز صاحبان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یونین ہال میں "مسلمانوں کا نصب العین" اور اسلام کی نشاۃ کے عنوان پر دو تقریریں کیں۔ علی گڑھ میں تین دن بڑے ہی مصروف گزارے۔

بلوچستان کا دورہ

قاضی عبد المجید نے ۱۹۴۲ء میں بلوچستان کا تبلیغی دورہ کیا۔ یہاں کام کرنے کے لیے انھیں وسیع میدان ملا، اور فیصلہ کیا کہ کوئٹہ کو مرکز بنا کر سرحد، سندھ اور بلوچستان کے مسلمانوں کی دینی تنظیم کی جائے۔ وہ تن تنہا ہجوم مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے تھے، اس کا اندازہ ان کی جامع مسجد کوئٹہ کی ایک تقریر سے ہوتا ہے جو ۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کے "ایمان" میں پوری نقل ہوئی ہے۔ اس تقریر کے مطالعہ سے قاضی عبد المجید قریشی کا طریق کار کردگی اور ان کی سیرت کے کئی پہلو ہی نہیں بلکہ وہ خود اپنے ظاہر و باطن کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ تقریر یہ تھی:

---

۵۹ ص ۱۰، نمبر ۱۰۵۳، مورخہ ۲۲ جون ۱۹۳۹ء

حضرات! پہلے دن جبکہ میں کوئٹہ آیا، بعض اصحاب نے مجھے پھولوں کے ہار پہنائے۔ مگر میں نے ایک لمحے کے لیے بھی ان ہاروں کو قبول نہ کیا۔ میں اپنی بساط سے خوب واقف ہوں۔ میں نے کوئی خدمت نہیں کی اور اس کے لیے میں کسی بھی عزت و نمائش کا مستحق نہیں ہوں۔ پھر جب میں نے اسی مسجد میں پے در پے تقریریں کیں اور عوام کے دل پہ درد دل کی کمندیں پھینکیں تو عام لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید یہ مفکر سچا نکلے، لیکن اس کے چند ہی روز بعد جب میں نے درس قرآن اور کتب سیرت کی فروخت شروع کر دی تو کئی جلد باز طبیعتوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں ایک کتب فروش ہوں اور صرف سیم و زر کی فراہمی کے لیے کوئٹہ میں وارد ہوا ہوں۔ آج تک میں نے اس الزام کا ایک ہی جواب دیا ہے اور وہ یہ کہ جس دن میں کوئٹہ سے رخصت ہوں گا، آپ صاحبان کو معلوم ہو جائے گا کہ میں یہاں کی کتب فروشی سے کتنا روپیہ اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔ کل میں پندرہ دن کے لیے کوئٹہ سے واپس جا رہا ہوں، اس لیے آج اپنے آمد و رفت کا حساب مسلمانوں کے سامنے پیش کروں گا۔

حضرات! میری زندگی میں تیسرا موقع ہے کہ میں نے ایک کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے تبلیغی بیت المال یا مطبع کا فیصلہ کیا تھا۔ قبل اس کے کہ میں لوگوں کو دعوت دیتا، میں نے اپنے محاسب سے کہا، میری آمد و خرچ کا حساب کرو، اور میرا تمام قرض ادا کر دو۔ حساب کے بعد معلوم ہوا کہ میرے گھر میں تمام نقدی ایک سو روپیہ اور چند آنے ہیں۔ میں نے یہ پوری رقم دے دی۔ اس دن میری جیب میں چائے کے لیے ایک آنہ بھی موجود نہ تھا — دوسری مرتبہ میں نے پاکستان کی تحریک کا فیصلہ کیا۔ اس دفعہ بھی میں نے تمام آمد و جمع کا حساب کرایا اور جتنا بھی روپیہ میرے گھر میں یا میری جیب میں موجود تھا وہ سب میں نے فنڈ میں دے دیا۔ اس دفعہ پھر میری جیب میں ایک پائی تک نہ تھی۔ آج یہ تیسرا موقع ہے کہ میں اللہ کے گھر میں اسی مسجد کے اندر بلوچستان میں تبلیغ اسلام کی خدمت کا فیصلہ کرتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ آپ صاحبان کے سامنے دو چیزیں پیش کر دوں۔ میں اپنی تقریروں میں انجمن وطن، جمعیۃ العلما، احرار اور مسلم لیگ وغیرہ جماعتوں پر کچھ نہ کچھ تنقید کرتا رہا ہوں۔ میں اپنی گفتگو کی تلخی کے لیے ہر ایک جماعت اور ہر ایک مسلمان سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر جمعیۃ العلما والوں کو مجھ سے کچھ بھی شکایت

ہو تو میں ان سے معافی مانگتا ہوں وہ مجھے معاف کر دیں۔ میں علمائے کرام کا خادم ہوں۔ اگر انجمن وطن اور دوسرے آزاد خیال دوستوں کو کبھی مجھ سے رنج پہنچا ہو تو میں ان سے بھی معافی مانگتا ہوں۔ میں انھیں اپنا اسلامی بھائی ہی سمجھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ بھی مجھے اپنا بھائی سمجھیں گے۔ میں مسلم لیگ کا ہم خیال ہوں۔ اگرچہ میں سیاسیات میں حصہ نہیں لیتا ہوں، اس لیے میں کارکنان لیگ سے معافی نہیں مانگتا، بلکہ اپنی پارٹی کی حیثیت سے میں ان پر یہ حق رکھتا ہوں کہ وہ میرے الفاظ کی لاج رکھیں۔

برادران اسلام! قبل اس کے کہ میں اپنے تبلیغی پروگرام کا اعلان کروں میں حاجی فضل الٰہی صاحب سے اس مسجد خدا میں سوال کرتا ہوں۔

مقرر: حاجی صاحب! اب تک کتنے روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں؟

حاجی صاحب! کل چھ سو نوے روپے کی نقدی اب تک وصول ہوئی ہے۔

میں یہ تمام رقم اللہ کے لیے تبلیغ اسلام کی خاطر وقف کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کتابوں کی قیمت کے تیس روپے مستونگ سے قابل وصول ہیں۔ یہ بھی اللہ کے لیے دیے۔ تیس روپے قاضی حفیظ الدین صاحب سے، پچاس روپے ارباب کرم خاں سے، ایک سو پچاس روپے قاضی محمد عیسیٰ خاں صاحب سے، بیس روپے میاں نصیر الدین احمد صاحب سے، بیس روپے نواب صاحب رئیسانی (وغیرہ وغیرہ) سے کتابوں کی قیمت قابل وصول ہے۔ میں یہ تمام رقم اللہ کے لیے تبلیغ اسلام کی نذر کرتا ہوں۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو کچھ روپے ساتھ لایا تھا۔ ان میں سے جو کچھ باقی ہے، وہ بھی میں نذر اسلام کرتا ہوں۔ حاجی صاحب! یہ رقم گن لیجیے (گننے سے یہ رقم چودہ روپے نکلی) اب میرے گھر کی دولت صرف میری کتابیں ہیں۔ میں نے آج یہ تمام کتابیں بھی مسجد کے دروازے کے سامنے لا کر رکھ دی ہیں۔ یہ تین سو روپے کی کتابیں ہوں گی۔ اب یہ کتابیں بھی اللہ کا مال ہے (تمام اعلان کردہ رقوم کا حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ جملہ رقوم کی میزان ایک ہزار پانسو دس روپے ساڑھے دس آنے ہے)

اس کے بعد مقرر نے کہا: حضرات! آپ کلمہ پڑھیں۔ جب تمام مسجد ذکر کلمہ شہادت سے گونج اٹھی تو مقرر نے کہا میں دو مہینے سے کوئٹہ میں ہوں، میں نے ایک پائی گھر نہیں بھیجی اور اب

ایک پائی فروخت کتب کی میرے پاس نہیں رہی۔ اس سلسلے میں جتنا نقد، جتنا ادھار اور جتنی بچت تھی، وہ سب میں نے آج بلوچستان میں تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دی ہے۔

ہماری اس تحریک کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہ ہوگا، نہ بالواسطہ، نہ بلاواسطہ میری ڈکشنری میں اطاعت و اشاعتِ قرآن، اطاعت و اشاعت رسول اور قیام ارکان کے سوا کوئی چوتھا لفظ موجود نہیں ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ یہاں چھ سو روپیہ ماہوار مسلمانوں کو پابند مذہب بنانے پر خرچ کیا جائے گا۔ دو سو روپے ماہوار کے مبلغ رکھے جائیں گے جو بلوچستان کے قصبات و دیہات میں سارا سال گشت لگائیں گے اور مسلمانوں کو ایک مرکزِ دین پر جمع کرنے کی دعوت دیں گے، مبلغین سے معاہدہ لیا جائے گا کہ وہ موجودہ سیاسیات میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کریں گے اور نہ کسی بھی قبائلی، مذہبی، یا سیاسی جماعت کے مخالف پراپیگنڈا کریں گے۔ ایک سو روپیہ مرکزی سیرت کمیٹی کے ایک کارکن کو دیا جائے گا، جو وہاں بیٹھ میں میری غیر حاضری میں کام کرے گا۔ باقی سو روپیہ ماہوار میں یہاں ایک دینی اور تبلیغی کلاس قائم کی جائے گی جس میں تمام بلوچستان سے منتخب کارکنوں، نوجوانوں اور با احساس ائمہ مساجد کو بلایا جائے گا، اور پندرہ بیس دن میں ٹرینڈ کر کے اپنے اپنے مرکزوں میں بھیج دیا جائے گا تاکہ وہ وہاں تنظیم مساجد کا کام سیرت کے پروگراموں کے مطابق انجام دیں۔ یہ زندہ دل کارکن جو ہم سے ٹریننگ لے کر اپنے اپنے مقامات میں واپس جائیں گے دینِ حق کے رضا کار ہوں گے۔ وہ ہم سے وابستہ رہ کر اپنے اپنے حلقۂ عمل میں ایک ہی پروگرام پر عمل کریں گے۔ اس تمام کوشش سے ہمارا مقصود اصلی صرف یہ ہے کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں اور ان کی اجتماعی زندگی درست ہو جائے۔ یا اللہ! ہمارے ارادوں کو برکت دے۔"

تحریکِ پاکستان سے تعاون

تحریک سیرت کا سیاسیات سے جس قدر تعلق تھا اس کا اندازہ مولانا احمد سعید (مرحوم) ناظم جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے قاضی عبدالمجید قرشی کو لکھا:

محترم قریشی صاحب! سلام مسنون

گرامی نامہ کا شکریہ۔ تفصیلی جواب تو پھر کسی وقت عرض کروں گا لیکن مجھے اس وقت صرف اسی قدر عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ مرکزی سیرت کمیٹی (اگر کوئی مرکز ہے) کا رویہ غیر جانبدارانہ نہیں ہے، بلکہ مرکزی سیرت کمیٹی کا لٹریچر عام طور سے مسلم لیگ کی پالیسی کی حمایت کر رہا ہے بلکہ سیرت کمیٹی سے مسلم لیگ کی نشوونما کا کام لیا جا رہا ہے۔ جماعت بنانے وقت یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ جماعت کو مضبوط کرنے کے بعد وہی جماعت اس دعویٰ کو فراموش کر دیتی ہے۔

آپ کا مخلص

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

اس کے جواب میں قریشی موصوف نے لکھا کہ:

"سیرت کمیٹی نے جماعتی حیثیت سے کبھی عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیا۔ کسی امیدوار اسمبلی کے موافق یا مخالف فیصلہ نہیں کیا۔ کبھی کسی الیکشن میں اپنا امیدوار کھڑا نہیں کیا۔ کبھی لیگ یا کانگرس کے حق میں یا خلاف کوئی ریزولیوشن پاس نہیں کیا۔ رہی نظری سیاست تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ چونکہ نظامِ سیرت اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کے نظریہ میں متحد ہیں اور راقم الحروف بھی مسلم لیگ کا ہم خیال ہے اور مسلمانوں کی بہت غالب اکثریت بھی مسلم لیگ کی حامی ہے، اس کے علاوہ نظامِ سیرت کے چلانے والے ۹۵ فیصدی مسلم لیگی ہیں، اس واسطے یہ قدرتی بات ہے کہ ہم لوگ جب بھی اپنی جگہ پر کسی عام ملکی واقعہ کی توضیح کریں گے تو ہماری یہ توضیح مسلم لیگ کے نظریے سے بہت زیادہ قریب ہوگی"[۱۰]

جب ان سے سوال کیا گیا کہ آپ اسلام سے سیاست کو جدا نہیں کر سکتے تو سیرت کمیٹی کے لیے سیاست کو کیوں شجرِ ممنوعہ قرار دیتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا:

"قرآن کریم یا سیرت نبوی میں ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ

---

[۱۰] اخبار ایمان ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ ص ۴

ایک مسلمان بہ حیثیت غلام کس طرح زندگی بسر کرے۔ قرآن اور سیرت آپ کو یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ بہترین آزاد حکومت کس طرح قائم کر سکتے ہیں مگر وہ آپ کو یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ سرکار انگریزی کے بہترین غلام بن کر کس طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جب قرآن اور سیرت نبوی میں غلامانہ زندگی بسر کرنے کے متعلق سرے سے کوئی ہدایت ہی موجود نہ ہو تو فرمائیے کہ میں اس غلامانہ سیاست کے پروگرام کو سیرت کمیٹی کے مقاصد میں کیسے شامل کر لوں؟ مختصر یہ کہ قرآنی سیاست جو انسانوں کو ایک خدا کا غلام بناتی ہے سیرت کمیٹی کے پروگرام میں شامل ہے۔ مگر انڈیا ایکٹ کی سیاست جس کا آخری نتیجہ صرف یہی ہے کہ ہم ایک قاعدے کے ساتھ غلامانہ زندگی بسر کریں' سیرت کمیٹی کے مقاصد میں شامل نہیں[۱۱]

ذاتی حیثیت سے وہ پانچ صوبوں پر مشتمل پاکستان کی بجائے مسلم فیڈریشن کے حامی تھے جس میں اس علاقے کے علاوہ بنگال اور مسلم ریاستیں بھی شامل ہوں۔ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں متعدد سکیمیں پیش کی گئیں۔ ان میں سے وہ سر سکندر سکیم کو زیادہ اچھا سمجھتے تھے: ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کے موقع پر انھوں نے کارکنانِ سیرت سے گزارش کی کہ وہ اس میں شریک ہوں[۱۲] یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے جماعتی حیثیت سے ایک سیاسی اجلاس میں شرکت کی۔ وہ قراردادِ لاہور کے حامیوں میں سے تھے، مگر پنجاب مسلم لیگ کی سست روی کو دیکھ کر انھیں زیادہ امید نہیں تھی کہ یہ جماعت پاکستان کو آزاد کرا سکے گی۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۰ء کو میری ان سے بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ میں نے اس روز کی ڈائری میں لکھا تھا "قریشی صاحب کا خیال ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو اپنے نصب العین کا خیال چھوڑ دینا چاہیے اور کچھ عمل کرنا چاہیے کیونکہ عملی دنیا خیالی دنیا سے بہت دور ہے"۔ اس ملاقات سے اہم ترین بات جو زیرِ بحث آئی وہ "پاکستان" نام سے ایک انگریزی روزنامہ کا اجرا تھا۔ اس کے لیے تو قریشی صاحب اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے، البتہ اسی نام سے اردو روزنامہ پر ہم نے انھیں آمادہ پایا اور فیصلہ کیا کہ ابتدا میں یہ ہفت روزہ یا دس روزہ

---

[۱۱] ایمان ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء ص ۱۱، ۱۲
[۱۲] ایمان ۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء، ص ۸

ہو اور امرت سر سے نکالا جائے ـــــ اس بات چیت کے ایک ماہ چھ دن بعد انھوں نے 'ایمان' کی
۱۵ جنوری ۱۹۴۱ کی اشاعت کا اداریہ 'ایمان کی بجائے پاکستان' لکھا اور لکھا کہ ہمارے ایک معزز اور قابلِ اعتماد دوست
امرت سر سے اخبار 'پاکستان' نکال رہے ہیں ہم نے ان کی یہ خواہش قبول کر لی ہے کہ اخبار "ایمان" کے قارئین
کو ایک مہینہ 'ایمان' نہ بھیجا جائے نہ شائع کیا جائے! اس کی بجائے اخبار 'پاکستان' بھیجا جائے ۲۰ مارچ ۱۹۴۱
کے "ایمان" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اخبار کا پاکستان نمبر پچاس ہزار کی تعداد میں تقسیم کیا جائے گا جن
میں سے دس ہزار شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۶ جون ۱۹۴۱ کے "ایمان" میں 'پاکستان' کا التوا کی خبر شائع ہوئی؛
اس میں بتایا گیا کہ جنگ کی نزاکت، کاغذ کی گرانی اور اخبار "پاکستان" کے ڈیکلریشن کی منظوری کے لیے
پانسو روپے نقد زرِ ضمانت کی طلبی کے باعث اخبار کا اجرا ملتوی کر دیا گیا ہے۔[۱۳]

وفات

مولانا عبدالمجید قرشی ۱۹۴۷ میں پٹی سے لاہور آ گئے۔ وہ دفتر کا پورا ریکارڈ بھی ساتھ نہیں لاسکے۔
آبادی کی نقل مکانی اس کثرت سے ہوئی کہ اگر دفتر میں لکھے ہوئے پتے بھی دست یاب ہو جاتے تو
پتوں پر آدھے بھی خطوط نہ پہنچ سکتے۔ راقم الحروف سے ان کی آخری ملاقات ۱۹۴۸ کے آخر میں ہوئی۔
ریمیکلوڈ روڈ پر دفتر "زمیندار" کے سامنے والی بالائی منزل میں رہتے تھے۔ ان کے عزائم میں ایک
عزم یہ تھا کہ "اسلامی یونیورسٹی" قائم کی جائے جس میں علم کے ساتھ ہنر بھی سکھایا جائے کہ علما و
مبلغین کسی کے محتاج نہ رہیں۔ یہ سکیم پرانی تھی اور اس کے لیے ایک سرکاری ملازم جناب
شیخ محمد شیفتہ نے اپنے ضلع جالندھر میں زمین کی پیشکش بھی کی تھی۔ قرشی صاحب چاہتے تھے کہ وہ
جمع شدہ سرمایہ سے پاکستان میں ایسی یونیورسٹی قائم کریں۔

وسط مارچ ۱۹۴۹ میں غالباً ان کے ایک نجی ملازم نے انھیں قتل کر دیا۔ روزنامہ "امروز"
لاہور کی ۴ اپریل کی اشاعت میں سٹاف رپورٹر کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی:

"معلوم ہوا ہے کہ مولوی عبدالمجید قرشی مدیر اخبار "ایمان" (پٹی) کو قتل کر دیا گیا ہے بیان
کیا جاتا ہے کہ بیس روز کے بعد ان کی لاش ان کے مکان سے نکالی گئی ہے۔ لاش سڑ گئی ہے،
اور مقتول کے جسم پر کئی ایک زخموں کے نشانات ہیں۔ ان کا مکان باہر سے مقفل تھا اور وہ

۱۳؎ ص ۱۴

ملازم فرار ہیں۔ پولیس تحقیقات کر رہی ہے۔ لاش کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کو تقریباً بیس روز قبل قتل کیا گیا ہے۔"

حرفِ آخر

مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب "سرگزشت" میں لکھا :

"مولانا عبدالمجید قرشی ایسے بے نظیر، سنجیدہ اور خاموش کارکن تھے کہ مسلمانوں میں ایسے مثالیں نہایت کم یاب ہیں ... درویشی کی زندگی بسر کرتے ... دھیلے دھیلے اور پائی پائی کا حساب رکھتے۔ سیرت کی تقریبوں اور اخبار "ایمان" سے انھوں نے پیسہ پیسہ کر کے ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ جمع کیا، جس پر ان کا ذاتی کوئی دعویٰ نہ تھا۔ اس کو قومی سرمایہ کہا کرتے تھے ..... مجھے معلوم ہے کہ تحریک سیرت کا جو سرمایہ قرشی صاحب چھوڑ گئے ہیں وہ لاہور کے ایک بنک میں محفوظ پڑا ہے"[۱۳۳]

اخبار اور کتب سیرت سے آنا روپیہ جمع کرنے کا راز یہ تھا کہ اس وسیع کاروبار پر اخراجات اتنے کم تھے کہ اس سے کم ممکن ہی نہ تھے۔ قرشی صاحب دفتر میں خود بھی جھاڑو دے لیا کرتے تھے۔ پورا عملہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ہر ایک کم از کم دس گھنٹے کام کیا کرتا تھا۔ ۱۹۴۰ میں ان کا مشاہرہ یہ تھا :

ناظم مرکزی سیرت کمیٹی	(عبدالمجید قرشی)	۵۰ روپے
آفس سکریٹری	(حمید انور)	۳۰ روپے
مینجر	(محمد افضل)	۲۰ روپے
دفتری		۱۰ روپے
کرایہ دفتر و رہائش گاہ		۲۰ روپے
	کل	۱۳۰ روپے

۱۳۳؎ سرگزشت، ص ۲۶۸، ۲۶۹۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی صُبْرَةِ مِنْ طَعَامٍ فَاَدْخَلَ یَدَهٗ فِیْهَا فَنَالَتْ اَصَابِعُهٗ بَلَلًا، فَقَالَ مَا هٰذَا یَا صَاحِبَ الطَّعَامِ؟ قَالَ اَصَابَتْهُ السَّمَآءُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ قَالَ اَفَلَا جَعَلْتَهٗ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰی یَرَاهُ النَّاسُ۔ مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنَّا۔ (بلوغ المرام کتاب البیوع - بحوالہ صحیح مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک مرتبہ غلے کے ایک ڈھیر پر گئے۔ آپ نے اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو انگلیوں کو تری پہنچی۔ آپ نے فرمایا، اے غلے کے مالک! یہ تم نے کیا کر رکھا ہے؟ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ، اس کو آسمان کا پانی پہنچا ہے۔ (یعنی اس ڈھیر پر بارش پڑ گئی ہے) آپ نے فرمایا، اگر ایسا ہو گیا تھا تو تم نے اس حصے کو غلے کے اوپر کیوں نہیں کر دیا، تاکہ لوگ اسے دیکھ سکیں۔ یاد رکھو! جو شخص لوگوں کو دھوکا دیتا ہے، وہ ہمارے طریقے میں نہیں ہے۔

کتب احادیث میں کاروبار اور تجارت کے بارے میں "کتاب البیوع" کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے، جس میں اس موضوع سے متعلق احکام بیان کیے گئے ہیں اور تفصیل سے ایک ایک بات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں غلے کی تجارت، مال مویشی کی تجارت، پھلوں کی تجارت، سونے چاندی کی تجارت اور اس کے تبادلے کے احکام، زمین اور جائداد کی خرید و فروخت کے مسائل، سکونتی مکانوں کے بارے میں ضروری احکام وغیرہ تمام امور بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض چیزوں کی تو بہت ہی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ ان میں کچھ تو کتاب البیوع کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں اور کچھ دوسرے مناسب مواقع و مقامات پر درج ہیں۔

سب سے بڑی اور بنیادی چیز جو بیان فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کسی سودے اور کاروبار میں کوئی فریق کسی کو دھوکے میں نہ رکھے - یہ نہیں ہونا چاہیے کہ مکر و فریب سے یا کسی فریق کی سادگی سے کسی کو ناقص مال زیادہ قیمت پر دے دیا جائے ، یا اچھا اور عمدہ مال بیچنے والے کی بے خبری اور عدم واقفیت کی بنا پر کم قیمت پر لے لیا جائے - اگر کوئی شخص اس قسم کا لین دین کرے گا اور دوسرے کو اندھیرے میں رکھے گا تو وہ سخت دھوکے باز اور مکار ہوگا- وہ شخص دنیا میں بھی لوگوں کی نظروں میں گر جائے گا اور اسلام کی رُو سے بھی سخت بدمعاملہ قرار پائے گا -

بعض لوگ اس طرح دھوکے سے ناقص مال بیچتے ہیں کہ اوپر تو اچھا اور عمدہ مال رکھ دیتے ہیں اور نیچے خراب مال رکھ دیتے ہیں تاکہ خریدنے والا دھوکے میں رہے ، یہ نہایت ہی غلط طریقِ تجارت ہے اس سے احکامِ شریعت کی مخالفت ہوتی ہے اور ایسے تاجر کا کردار لوگوں کی نظروں میں مذموم قرار پاتا ہے --- ایک شخص جو دھوکے میں آکر اس قسم کا ناقص مال خریدے گا تو وہ بیسیوں کو آگے بتائے گا- اس کی دھوکے بازی سے لوگوں کو باخبر کرے گا اور اس سے دُور رہنے کی تاکید کرے گا - یہ بات کاروباری حلقے میں پہنچ جائے گی اور اس کے کاروبار پر اس کا سخت بُرا اثر پڑے گا ---- اگر وہ کپڑے کا کاروبار کرتا ہے اور اس میں مکر و فریب کا سلسلہ جاری ہے تو کپڑے کے بیوپاری اس سے دُور بھاگیں گے ، اگر مال مویشی کا لین دین کرتا ہے تو اس کے تاجر اس سے سودا کرنے سے گریز کریں گے ، اگر سوت کی تجارت کرتا ہے تو سوت خریدنے والے اس سے بچنے کی کوشش کریں گے ، غرض جس قسم کا بھی وہ کاروبار کرتا ہے ، اس حلقے کے لوگ اس سے پہلو بچانے ہی میں اپنی عافیت سمجھیں گے -

اسلام ہرگز کسی کو لین دین میں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا - اوپر جو حدیث بیان کی گئی ہے وہ اس سلسلے میں کتنی واضح ہے کہ جو شخص کسی سے دھوکا کرتا ہے وہ ہمارے طریقے سے خارج ہے - اصل شے دیانت اور صداقت ہے - شریعت اسلامی کو یہی مطلوب ہے اور تقاضائے اخلاق اور دیانت بھی یہی ہے --- ایک شخص کی بددیانتی اور دھوکا دہی پورے ملک اور پوری قوم کی بدنامی کا باعث بن جاتی ہے -

نقد و نظر

مکتوبات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف و ترتیب: مولانا سید محبوب رضوی

ناشر: ادارہ اسلامیات، ۱۹۰، انارکلی، لاہور

صفحات: ۲۷۰، جلد، کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ - قیمت ۱۸ روپے

اگر یہ درست ہے کہ کسی شخص کی صحیح پہچان اور اس کے ذہن و فکر کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کا بنیادی پیمانہ اور اصل آئینہ اس کے اقوال و ارشادات اور خطوط ہی ہو سکتے ہیں، تو اسی آئینے میں سرورِ عالم حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کی بے پناہ رفعتوں کا بھی اندازہ کیجیے۔ اس کے لیے زیر نظر کتاب — مکتوباتِ نبوی — ہماری پوری رہنمائی کرے گی۔ اس کے لائق احترام مصنف و مرتب سید محبوب رضوی نے کمال محنت اور عرق ریزی سے آنحضرت کے تمام مکتوبات جو آپ نے مختلف حکمرانوں، قبائل کے سرداروں اور اہم شخصیتوں کے نام ارسال فرمائے، پھر جن قوموں اور لوگوں سے جو معاہدے کیے اور مختلف اوقات میں حسب ضرورت جن قبائل کے لیے جو تشریعی فرامین جاری کیے، وہ اس کتاب میں نہایت عمدہ ترتیب اور بہترین انداز سے جمع کر دیے ہیں۔ ہر مکتوب الیہ کا ذاتی تعارف بھی کرا دیا ہے، ہر مکتوب کا نتیجہ بھی واضح کر دیا ہے، جن ملوک و عمال کو خطوط تحریر فرمائے، ان کے ملک اور علاقے کے بارے میں بھی ضروری معلومات درج کر دیے ہیں اور اس کی موجودہ حیثیت بھی واضح کر دی ہے — یہ سلسلہ مواد احادیث و سیر کی مختلف کتابوں میں بکھرا ہوا تھا، فاضل مصنف نے پوری تگ و تاز کے بعد اسے جمع کر کے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ زبان بڑی رواں، شستہ اور عام فہم ہے۔ اس کے مطالعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔

کتاب کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ مکتوبات کے عکس بھی دیے گئے ہیں اور یہ بتا دیا ہے کہ یہ مکتوباتِ گرامی کہاں سے دستیاب ہوتے — لائق مصنف نے یہ کتاب ترتیب دے کر بہت

بڑی علمی اور تحقیقی خدمت انجام دی ہے اور ادارہ اسلامیات لاہور نے اسے شائع کرکے قارئین کے لیے بہترین مواد مہیا کیا ہے ۔ اس موضوع پر یہ سب سے زیادہ بہتر اور لائقِ اعتماد کتاب ہے ۔

مکتوباتِ رئیس الاحرار (سیاسی)

مرتبہ : ابوسلمان شاہ جہان پوری

ناشر : موڈرن پبلشرز، ۸۶ گول ایمپریس روڈ۔ کراچی ۔

صفحات : ۳۰۴، جلد، سرورق، کتابت، کاغذ، طباعت، دیدہ زیب۔ قیمت ۲۸ روپے ۔

جناب ابوسلمان شاہ جہان پوری صاحب علمی اور تحقیقی حلقوں میں بڑی شہرت کے مالک ہیں، وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ تذکرہ رجال ان کا خاص موضوع ہے بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے بہت کام کیا ہے ۔ زیرِ تبصرہ کتاب ــ مکتوبات رئیس الاحرار ــ ان کی تازہ ترین تصنیف ہے جو مولانا محمد علی جوہر کے انتالیس مکتوبات پر مشتمل ہے ۔ یہ تمام مکتوبات سیاسی نوعیت کے ہیں ۔ مکتوب الیہم حضرات کے نام یہ ہیں : تصدق احمد خاں شروانی، جیمز مارلے، سر جیمز مسٹن، مولانا حسرت موہانی، رنگا آئر، ریمزے میکڈانلڈ، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولوی محمد عرفان، نواب سید علی حسن خاں، علی محمد علی خاں، راجہ محمود آباد، لارڈ مارلے، لارڈ کریو، مولوی محمد ... حمد عباسی، مظہر الحق، مولانا غلام رسول مہر، نشاط النساء بیگم حسرت موہانی، پنڈت جواہر لال نہرو، غلام بھیک نیرنگ، نواب وقار الملک، مدیرانِ اخبارات، مکتوب الیہ العلوم، اہل قلم ــ مکتوبات بڑے دلچسپ ہیں، ان کے مطالعے سے برصغیر پاک و ہند کی گذشتہ سیاسی تاریخ کے بہت سے سیاسی واقعات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور خود مولانا مرحوم کی شخصیت اور ان کے ذاتی حالات بھی واضح ہو جاتے ہیں ــــ آغاز کتاب میں لائق مرتب نے ایک طویل مقدمہ سپرد قلم کیا ہے جو جالیس سے زائد صفحات کو محیط ہے ۔ اس میں مولانا کے کچھ حالات، اس دور کے سیاسی کوائف، مولانا کا اسلوبِ عمل، ان کی سرگرمیاں اور زندگی کے بعض ادوار کی وضاحت کی گئی ہے ۔

ابوسلمان صاحب نے ایک قابلِ تعریف کام یہ کیا ہے کہ "مکتوباتِ رئیس الاحرار" میں جن شخصیتوں کا تذکرہ ہوا ہے آخر کتاب میں ان کا تعارف کرا دیا ہے ۔ یہ تعارف "تذکرہ رجال مکتوباتِ رئیس الاحرار" کے عنوان سے صفحہ ۲۴۵ سے ۲۷۱ تک پھیلا ہوا ہے ۔ آخر کتاب میں اشاریہ رجال بھی ہے ۔

کتاب بڑی دلچسپ اور لائقِ مطالعہ ہے ۔ باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری محاسن سے بھی مزین ہے ۔

علمی رسائل کے مضامین

بینات، کراچی۔ نومبر ۱۹۷۸

تفہیم القرآن پر ایک نظر (مسلسل)	مولانا محمد اسحاق صدیقی
تقلید مجتہدین خیر القرون	مولانا محمد عبد الرشید نعمانی
طلاق کے احکام (مسلسل)	شیخ محمد زاہد الکوثری ترجمہ: محمد یوسف لدھیانوی
معارف انور (مسلسل)	صوفی محمد اقبال قریشی

بینات، کراچی۔ دسمبر ۱۹۷۸

تفہیم القرآن (مسلسل)	مولانا محمد اسحاق صدیقی
نظریۂ خلافت	پروفیسر محمد اسلم
دورِ صحابہ میں بصرہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا ایک جائزہ	محمود عارف

ترجمان الحدیث، لاہور۔ جنوری ۱۹۷۹

تحریک وہابیت کے اصل حریف۔ سکھ یا انگریز؟	مولانا برق التوحیدی
سیدنا فاروق اعظم	جناب نثار المصطفیٰ اثیدائی

ترجمان القرآن، لاہور۔ دسمبر ۱۹۷۸

تعزیراتِ اسلام (مسلسل)	مولانا بشیر احمد قاضی
امام المحدثین امام بخاریؒ	پروفیسر عبد المنان
حیاتِ انسانی کا مقام	ڈبلیو ہیٹلر، ترجمہ: خورشید رضوی

الحق، اکوڑہ خٹک۔ دسمبر ۱۹۷۸

علومِ اسلامیہ کے سرچشمے	مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
دار العلوم دیوبند	ابو سلمان شاہ جہان پوری
اسلامی اور اقتصادی انشورنس کی اصلاحی تنظیم	نور محمد غفاری

مارچ ۱۹۶۹ء

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

مجلس ادارت

مدیر

پروفیسر محمد سعید شیخ

مدیر مسئول

محمد اسحاق بھٹی

ارکان

مولانا محمد حنیف ندوی — محمد اشرف ڈار ، معتمد مجلس

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقام اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون : ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۲ | مارچ ۱۹۷۹ | ربیع الثانی ۱۳۹۹ | شمارہ ۳

ترتیب

تاثرات

نہایت افسوس ہے، ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو پاکستان کی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس ایس۔ اے رحمٰن وفات پاگئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ماہر قانون، کئی کتابوں کے مصنف، بہترین ادیب اور اونچے مرتبے کے شاعر اور نقاد تھے۔ بلند منصب پر فائز ہونے کے باوجود خلوص اور تواضع ہمیشہ ان کی شخصیت کا جزو رہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک مخلص اور باعمل مسلمان تھے۔ پاکستان اور بانیٔ پاکستان سے ان کو انتہائی محبت تھی، اور وہ اس ملک میں اسلام کی نشوونما کے متمنی تھے۔ اہلِ علم سے ان کو قلبی لگاؤ تھا اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ متعدد علمی اور تحقیقی اداروں کے رکن تھے اور ان کے کاموں سے پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ نیز ان اداروں کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے رکن تھے اور ادارے سے ان کو بے حد تعلق خاطر تھا۔ ادارے کی طرف سے اردو اور انگریزی میں ان کی کتابیں بھی شائع ہوئیں جو اصحابِ علم میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

مرحوم، اعتدال و توازن کا پیکر اور اصابتِ رائے کی صحیح تصویر تھے۔ افسوس ہے انھوں نے ایسے وقت میں سفرِ آخرت اختیار کیا جب کہ ملک و قوم کو ان کی شدید ضرورت تھی، اور وہ منزل قریب آگئی تھی، جس کی انھیں تلاش تھی۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے متعلقین واحباب اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

اللّٰھم اغفر وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

(محمد اسحاق بھٹی)

جسٹس ایس۔اے۔رحمن مرحوم

غزل

تری راہیں مجھ سے گریزاں گریزاں
مری آرزوئیں پشیماں پشیماں

رہی آگے آگے امیدوں کی خوشبو
چلا پیچھے پیچھے میں افتاں وخیزاں

نظر کھوج میں بے نشاں منزلوں کی
خیالوں کی دنیا، بہاراں بہاراں

طلسم آفریں ہے تصوّر کا ساحر
کہیں ناز خنداں، کہیں رنگ رقصاں

تری جستجو زندگی میرے دل کی
کھلی ہیں نظر میں تبسم کی کلیاں

سفر میں ہے راہی، سفر میں ہے منزل
افق پار تاباں ہیں انوارِ جاناں

نہ سنگی نہ ساتھی نہ توشے کی تسکیں
نصیحت فروشاں سرِ راہ ارزاں

عجب دل کے ساغر کی کیفیتیں ہیں
بہ لب خندہ، طوفانِ گریہ بداماں

چل اے دل، نہیں شوق کا کوئی ساحل
قدم پر قدم، رم ہے خوئے غزالاں

سرابوں کا صحرا میں بھی کچھ ہے مصرف
نظر سے نہ ہوں بدگماں تشنہ کاماں

شبِ تار ہے بے نواؤں کا پردہ
سروں پر ہے لطفِ سحر گوہر افشاں

کہیں تو پہنچ جائے گی خاک اڑ کر
نہ تندی پہ اترائیں کم ظرف طوفاں

یہ دل کی ہے مشکل، خلش ہے تو دل ہے
میں راضی ہوں، مشکل نہ ہو میری آساں

ہم اس کی جھلک دیکھ پائیں نہ پائیں
مہکتا رہے نت شبستانِ خوباں!

مولانا محمد حنیف ندوی

روایت کی دو قسمیں

صحابہ، تابعین اور ان کے اتباع کی عادت میں یہ بات داخل تھی کہ بالعموم آنحضرتؐ کے ارشادات، اعمال یا تقریرات کو من وعن بیان کیا جائے اور اپنی طرف سے اس میں کسی حذف یا اضافہ سے کام نہ لیں۔ بعض تو اس بارے میں اس درجہ احتیاط و تورع سے کام لیتے تھے کہ نہ صرف حرف یا کلمہ کی تبدیلی کو ناجائز سمجھتے تھے، بلکہ ان کے ہاں یہ بھی درست نہ تھا کہ روایت میں جو الفاظ جس ترتیب سے وارد ہوئے ہیں ان میں کسی طرح کی تقدیم و تاخیر کو روا رکھا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

من سمع حديثاً فحدث به كما سمع فقد سلم۔

جس شخص نے حدیث سنی، اور اس کو جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیا، وہ احتساب سے بچ گیا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے وہ حدیث بیان کی جس میں اسلام کے ارکانِ خمسہ کا ذکر ہے۔ اس کو ایک شخص نے سنا، لیکن جب اس کو دہرایا تو اس کی اس ترتیب کو قائم نہ رکھ سکا، جو حدیث میں مذکور تھی۔ عبداللہ بن عمر نے اس پر فوراً اس کو ٹوکا اور بتایا کہ اس حدیث میں یہ الفاظ اس ترتیب سے آئے ہیں۔ رواتِ حدیث میں بعض حضرات یہ بھی گوارا نہیں کرتے تھے کہ حدیث میں اگر ایک لفظ مشدد آیا ہے تو اس کو لفظ خفیف سے بدل دیں۔

کچھ حضرات مزید احتیاط سے کام لیتے اور اس وقت تک مطمئن نہ ہوتے جب تک سننے والا حدیث کے الفاظ کو قلم بند نہ کر لے۔ محمد بن عمرو اپنے سامعین سے کہا کرتے تھے:

لا احدثكم حتى تكتبوه۔

میں اس وقت تک حدیث بیان نہیں کروں گا، جب تک تم اس کو لکھ نہ لو۔

ابنِ عون کا کہنا ہے، میں نے تین اشخاص کو دیکھا جو روایت کے معاملے میں اس بات کے قائل تھے کہ اس میں الفاظ و حروف کی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ قاسم بن محمد کو حجاز میں، محمد بن سیرین

کو بصرہ میں اور رجاء بن حیوۃ کو شام میں۔

ابن عیینہ سے روایت ہے کہ حجاز کے محدثین یعنی ابن شہاب، یحییٰ بن سعید اور ابن جریج بھی اسی زمرے میں داخل ہیں، جو الفاظ و حروف کو من و عن بیان کرنے کے قائل ہیں۔ مالک بن انس کا بھی یہی مسلک تھا کہ حدیث و روایت میں الفاظ، حروف اور ترتیب کو بہر حال قائم رکھا جائے اور اس میں کسی نوع کے تغیر کو روا نہ رکھا جائے۔ یہ روایت باللفظ کی صورت ہے۔

اکثر روایات میں جو آنحضرتؐ سے منقول ہیں الفاظ و حروف کو بعینہٖ قائم رکھا گیا ہے یا باللفظ بیان کیا گیا ہے، اس کی تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ صحابہ و تابعین میں بعض حضرات کو اللہ تعالیٰ نے ایسا قوی اور غیر معمولی حافظہ بخشا تھا کہ ان کو الفاظ و حروف کے حفظ میں کوئی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ جب یہ احادیث کو سن لیتے تو یہ لوحِ قلب پر آپ سے آپ مرتسم ہو جاتیں۔ تاریخ میں اس نوع کے متعدد شواہد ملتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کو دیکھ لیجیے، ان کی مرویات و احادیث کا دائرہ کس درجہ وسیع ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ابن ابی ربیعہ کا قصیدہ، جو اسّی اشعار پر مشتمل ہے، ایک ہی بار سن کر یاد کر لیا تھا۔ زید بن ثابت نے نہ صرف بلوغت سے قبل ہی قرآنِ حکیم کا بیشتر حصہ حفظ کر لیا تھا، بلکہ ان سے متعلق یہ بھی مروی ہے کہ سترہ ہی دن میں عبرانی بھی سیکھ لی تھی۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ حفظ و ذکا کے معاملے میں نمونے کی حیثیت رکھتی تھیں اور اس امر کی متعدد مثالیں تاریخ و حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

تابعین میں نافع، ابن شہاب زہری، عامر الشعبی اور قتادہ بن دعامہ السدوسی بے نظیر حافظے کے مالک تھے۔ یہ صحیح ہے کہ روایات میں بسا اوقات مختلف طرق میں الفاظ و حروف کے اختلاف کا پتا چلتا ہے، لیکن ان کا تعلق ان اخبار و روایات سے ہرگز نہیں، جو تعبدیات یا جوامع کلم کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں، بلکہ ان روایات سے ہے جو کسی واقعہ یا مشاہدہ کی عکاسی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے ان مواقع پر ہر راوی کو اظہار و بیان کے لیے اس واقعہ یا مشاہدہ کو اپنے ہی الفاظ کا جامہ پہنانا چاہیے۔ اس لیے ان مرویات میں محض الفاظ یا پیرایہ بیان کے اختلاف کو مستبعد یا غیر طبعی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ان تصریحات کے پہلو بہ پہلو ایسی روایات بھی پائی جاتی ہیں، جن کو روایت بالمعنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ صحابہ اور تابعین میں بعض حضرات نے اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا کہ آنحضرتؐ کے ارشادات

کا مفہوم و معنی بیان کرنے میں الفاظ کی پابندی نہ کی جائے، لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب ضرورت اس کی مقتضی ہو ۔ مثلاً یہ کہ انھیں تیقن کے ساتھ یہ یاد نہ رہے کہ آنحضرتؐ کے ٹھیک ٹھیک الفاظ کیا تھے ؟ اس کے ساتھ وہ اس امر کی طرف یہ کہہ کر اشارہ بھی کر دیتے تھے کہ شاید آنحضرتؐ نے، یہ الفاظ استعمال فرمائے، یا اس سے ملتا جلتا پیرایہ بیان اختیار کیا ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں مشہور روایت ہے کہ جب وہ یہ فرماتے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ بھی کہہ دیتے ھکذا، یا نحواً عن ھکذا۔ یعنی اس طرح یا اسی قسم کے الفاظ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمائے ۔ ان کے احساسِ ذمہ داری اور خشیتِ الٰہی کا یہ عالم تھا کہ جب حدیث بیان کرتے تو سارا جسم کانپ اٹھتا۔

حضرت ابو الدرداء کی بھی یہ عادت تھی کہ جب حدیث کی روایت سے فارغ ہوتے تو اس بات کی تصریح ضرور کر دیتے ۔ ھٰذا یا نحو ھٰذا ۔ کہ یا تو یہ الفاظ تھے اور یا اس سے ملتے جلتے۔

محمد بن سیرین کا کہنا ہے کہ انس بن مالک قلیل الروایہ تھے، لیکن جب بھی حدیث بیان کرتے از راہ احتیاط یہ ضرور کہہ دیتے ۔او کما قال ۔ یعنی یا تو یہ الفاظ تھے، یا جس طرح حضورؐ نے فرمایا۔

بعض صحابہ روایت بالمعنی کو جائز قرار دیتے تھے ۔ اس کی تائید عروہ بن زبیر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں انھوں نے کہا ہے کہ حضرت عائشہ نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میری روایات لکھ لیتے ہو ۔ عروہ بن زبیر نے کہا، جی ہاں میں آپ سے بھی حدیث سنتا ہوں، اور آپ کے علاوہ دوسرے اصحاب سے بھی، اور پھر اس حدیث کو قلم بند کر لیتا ہوں ۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے پوچھا کہ میری روایت اور دوسروں کی روایت میں معنی و مفہوم کا اختلاف تو پایا نہیں جاتا ۔ عروہ نے کہا جی نہیں ۔ اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا : لا باس بذالک اس صورت میں حدیث بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔

اس بارے میں اس سے بھی واضح یہ روایت ہے ۔ محمد بن سیرین کا کہنا ہے ۔

ربما سمعت الحدیث عن عشرۃ کلھم یختلف فی اللفظ والمعنی واحد ۔

میں اکثر ایک ہی حدیث دس اصحاب سے سنتا، سب کا پیرایہ بیان اگرچہ مختلف ہوتا، مگر معنی و مفہوم میں کوئی فرق نہ پایا جاتا۔

تحدیث بالمعنی کی جن اصحاب نے اجازت دی، ان میں عبداللہ بن مسعود، ابو الدرداء، انس بن مالک، عمرو بن دینار، عامر الشعبی، ابراہیم النخعی، ابن ابی نجیح، عمرو بن مرہ، سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید القطان

ایسی جلیل القدر شخصیتیں شامل ہیں۔

اس سلسلے میں ان حضرات کا موقف یہ تھا کہ خود قرآن حکیم نے ایک ہی واقعہ کو باختلاف الفاظ، متعدد جگہ بیان کیا ہے، مگر بایں ہمہ ان میں معنی و مفہوم میں کوئی تضاد پایا نہیں جاتا، اس لیے اگر احادیث کی روایت میں بھی معنی و مفہوم کی یکسانی قائم رہے تو الفاظ کا اختلاف کوئی مضرت پیدا نہیں کرتا۔

روایت بالمعنی کی تائید آنحضرت کے اس طرز عمل سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت اکثر اپنے سفیروں کو مختلف قوموں کی طرف رسائل و خطوط دے کر بھیجتے۔ ظاہر ہے کہ یہ سفرا ان رسائل و خطوط کو ان لوگوں کی زبان ہی میں پیش کرتے اور اس بات کا خاص طور سے خیال رکھتے کہ ترجمے میں وہی الفاظ استعمال کیے جائیں جو آنحضرت کے الفاظ سے قریب تر ہوں۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور ترجمے سے کام نہ لیتے تو اسلام کا پیغام ان لوگوں تک پہنچانا قطعی دشوار ہو جاتا۔

روایت بالمعنی کی اجازت سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تمام رواۃ کے لیے اذن عام کے مترادف ہے۔ صحابہ کو تو بلا شبہ یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ آنحضرت کے ارشادات کو اپنے الفاظ میں بیان کریں، کیوں کہ انھوں نے آنحضرت کے فیضان صحبت سے استفادہ کیا تھا اور اسلام کی روح سے پوری طرح آشنا تھے، یہی نہیں احکام و مسائل کے پس منظر سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن صحابہ کے علاوہ جو رواۃ ہیں ان کے لیے ائمہ حدیث نے کچھ شرائط کا تعین کر رکھا ہے۔

الرامہرمزی کا کہنا ہے کہ امام شافعی نے اس محدث یا راوی کو روایت بالمعنی کی اجازت دی ہے جو دین میں ثقہ ہو، سچائی اور صدق میں مشہور ہو، عاقل ہو اور زبان کے تیور پہچانتا ہو، تاکہ معنی و مفہوم کو ادا کرنے کے لیے، وہ جو الفاظ منتخب کرے ان کو کسی غلط محمل پر محمول نہ کیا جا سکے۔

الماوردی کا قول ہے:

ان نسی اللفظ جاز، لانه تحمل اللفظ والمعنی وعجز عن اداء احدهما فیلزمه اداء الآخر لاسیما ان ترکه قد یکون کتما للاحکام فان لم ینسه لم یجز ان یورده لغیره لان فی کلامه صلی اللہ علیه وسلم من الفصاحة ما لیس فی

اگر راوی روایت میں سے کوئی لفظ بھول جائے تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس کے بجائے دوسرا لفظ استعمال کرے، اس لیے کہ اس نے حفظ کے سلسلے میں لفظ و معنی دونوں کو ملحوظ و مرعی رکھا ہے، لیکن ان میں کا ایک

چونکہ ذہن کی گرفت سے نکل گیا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے مترادف دوسرا لفظ استعمال کرے، ورنہ کتمانِ حق کا اندیشہ ہے، اور اگر وہ روایت کے الفاظ کو بھول نہیں پایا ہے تو اس کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ اصل لفظ کے بجائے دوسرا لفظ استعمال کرے، کیونکہ آنحضرتؐ کے کلام میں جو فصاحت پائی جاتی ہے، وہ دوسروں کے کلام میں پائی نہیں جاتی۔

علامہ سیوطی نے روایت بالمعنی کے بارے میں کہا:

ولا شك في اشتراط ان لا يكون مما تعبّد بلفظه ... وعندي انه يشترط ان لا يكون من جوامع الكلم۔

یعنی روایت بالمعنی کے جواز کے بارے میں جو یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ اس کے الفاظ تعبدیات سے متعلق نہ ہوں، یہ صحیح ہے ... لیکن میرے نزدیک اس چیز کو بھی شرط قرار دینا چاہیے کہ روایت آنحضرتؐ کے حکیمانہ اور جامع کلمات پر مشتمل نہ ہو۔

ظاہر ہے یہ بحث اپنے موضوع کے اعتبار سے سراسر فنی ہے۔ دونوں مدرسۂ فکر کے حامل حضرات ایسے ہیں کہ جنھوں نے اپنے اپنے دور میں اشاعتِ سنت کی بھرپور کوشش کی ہے، اور اگر ہم یہ کہیں کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی مخلصانہ جدوجہد ہی کا یہ ثمرہ ہے کہ احادیثِ رسول کا بہت بڑا ذخیرہ آئندہ نسلوں تک پہنچا، اور زندگی کا دستور العمل قرار پایا تو اس میں قطعی مبالغہ آرائی نہ ہوگی، بلکہ یہ اسلامی تاریخ اور شعور کی صحیح ترجمانی ہوگی۔ اور اب جب کہ یہ قیمتی ذخیرہ صحاح ستہ میں پوری احتیاط اور چھان بین کے بعد عہد بہ عہد منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور تدوین کی باقاعدہ شکل اختیار کر چکا ہے، روایت باللفظ، یا روایت بالمعنی کی بحث ختم ہو جانی چاہیے۔

لیکن برا ہوا استشراق زدہ حضرات کا کہ انھوں نے نہ صرف از سرِ نو اس بحث کو چھیڑا اور اچھالا ہے بلکہ اس سے غلط نتائج اخذ کرنے کی مذموم سعی بھی کی ہے۔ حالانکہ ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ احادیث کا کثیر حصہ باللفظ ہی مروی ہے اور جہاں تک روایت بالمعنی کا تعلق ہے اس کا وقوع بھی صدرِ اول میں ہوا اور وہ بھی عند الضرورت، اور اس احتیاط کے ساتھ کہ معنی و مفہوم میں کوئی تغیر نہ رونما ہونے پائے۔ ظاہر ہے یہ وہ مبارک دور تھا جب لوگ عربیت کا صحیح ذوق رکھتے تھے، اور اس کے مختلف اسالیب کو خوب جانتے بوجھتے تھے، اور اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ آنحضرتؐ کا طریقِ تکلم کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس احتیاط کے باوجود روایت بالمعنی سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں، لیکن محدثین نے ایک ایک روایت کو مختلف طرق کے ذریعے جس دقتِ نظر سے دیکھا اور جانچا ہے اور متن و رجال کے نقد و تفحص کے سلسلے میں جس علمی اور تحقیقی منہاج کی طرح ڈالی ہے، اس کے بعد احادیث کی حجیت و استناد کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

ماخذ: السنۃ قبل التدوین، تالیف محمد عجاج الخطیب۔

پروفیسر علی محسن صدیقی

جامعہ ازہر

جامعہ ازہر دنیا کی ان چند درس گاہوں میں سرفہرست ہے جو اپنی قدامت اور شہرت کے لیے ممتاز ہیں۔ اس کی تاریخ ایک ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے، اس مختصر گفتگو میں اس کے متعلق صرف چند باتیں ہی کہی جا سکتی ہیں۔

مشہور فاطمی حکمران معز کے عہدِ حکومت میں اس کے سپہ سالار جوہر صقلی نے ۳۵۸ھ بمطابق ۹۶۹ء میں مصر فتح کیا۔ فُسطاط کے قدیم شہر کے مضافات میں جبلِ مقطّم کے دامن میں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی اور اپنے آقا کے نام پہ اس کا نام قاہرہ معزیہ رکھا۔ قصرِ شاہی کے جنوبی گوشے میں ایک عالی شان مسجد کی بنیاد رکھی۔ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۳۵۹ھ بمطابق ۴ اپریل ۹۷۰ء کو اس کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا، اور ۷ رمضان ۳۶۱ھ (۲۲ جون ۹۷۲ء) کو اس کی افتتاحی تقریب عمل میں آئی۔ مُعز کے جانشین عزیز کے عہد میں مسجد کے پہلو میں اساتذہ کی رہائش کے لیے ایک بڑی عمارت تعمیر کی گئی۔ عزیز کے بعد اس کے بیٹے حاکم کے عہدِ حکومت میں ۴۰۰ھ میں طلبہ کی کثرت کی وجہ سے ایک نئی عمارت کا اضافہ کیا گیا اور مصارف کے لیے اوقاف قائم کیے گئے۔ مستنصر کے زمانے میں عمارتوں میں مزید توسیع ہوئی۔ وہ آخری فاطمی بادشاہ جس کے دور میں جامعہ ازہر کی عمارتوں میں اضافے ہوئے، حافظ (۵۲۴-۴۴ھ / ۱۱۳۰-۴۹ء) تھا۔

جب بنو فاطمہ کی بساطِ سیاست الٹی اور آل ایوب حکمران ہوئے تو عملاً الازہر کی درس گاہ بند کر دی گئی۔ مملوک سلاطین کے عہدِ حکومت میں اس درس گاہ کو پھر اگلی سی رونق حاصل ہوئی اور اس کی عمارتوں میں توسیع کی گئی۔ سلطان بیبرس نے اس کی توسیع کی اور مسجد کو دوبارہ سُنّیوں کے لیے کھول دیا اور کسی قدر وقف بھی کیا۔ پھر امیر سلار، امیر قلاؤدن اور بل یک خازندار نے اپنے اپنے عہد میں پرانی عمارتوں کی مرمت، نئی عمارتوں کی تعمیر اور نئے اوقاف قائم کیے۔

ممالیک کے جانشین سلاطین عثمانیہ ہوئے۔ آلِ عثمان نے بھی جامعہ ازہر کی ضروریات کو مدِنظر رکھا۔ چنانچہ عثمانی گورنر حسن پاشا، قاصد او غلو اور عبدالرحمٰن کتخدا نے عمارات میں اضافے کیے اور بڑھتے ہوئے

مصارف کے لیے نئے اوقاف قائم کیے۔

۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء میں محمد علی پاشا مصر کا عثمانی گورنر ہوا۔ اس کے عہد میں مصر سلطنتِ عثمانیہ سے الگ ہوکر ایک نیم خود مختار حکومت قرار پایا۔ محمد علی اور اس کے جانشینوں کا دورِ حکومت مصر کی ترقی اور خوشحالی کا عہد ہے۔ چنانچہ الازہر میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ محمد علی نے الازہر میں نئے رواق (ہاسٹل) قائم کیے۔ ۱۳۰۶ھ بمطابق ۱۸۸۹ء میں خدیو توفیق پاشا نے اور ۱۳۰۹ھ بمطابق ۱۸۹۲ء میں خدیو عباسی حلمی پاشا نے نئی نئی عمارتوں سے جامعہ ازہر کی پہنائیوں میں وسعت پیدا کی۔ اسی زمانے میں یہاں ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا گیا۔ ۱۳۵۴ھ بمطابق ۱۹۳۵ء میں طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ ازہر کے گرد و نواح کی مساجد کو درس گاہ کی ملحقہ عمارتوں کے بطور استعمال کیا جانے لگا۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے حکومتِ مصر نے الازہر کی وسعت کے پیشِ نظر ایک نئے شہر جامعہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ قاہرہ کے مضافات میں دراسہ اور عباسیہ کے درمیان ایک وسیع و عریض قطعۂ زمین میں تعمیرات کا آغاز ہوا۔ ان تمام عمارتوں کا نام "مدینۃ الازہرا" رکھا گیا۔ اس میں جامعہ ازہر کا مرکزی ادارہ، ماتحت درس گاہیں، اقامت گاہیں اور کتب خانے شامل ہیں۔ نئے شہر کی یہ تمام عمارتیں قدیم عمارات سے ملادی گئی ہیں۔ اس طور سے ہزار سال کے طویل زمانے میں ازہر، جس کا آغاز ایک مسجد سے ہوا تھا عہد حاضر کی ایک وسیع و عریض درس گاہ بن گیا۔ اس جامعہ کی بنیاد اس لیے رکھی گئی تھی کہ مذہب اسمٰعیلی کے مبلغ اور داعی تیار کیے جائیں، جو نو مفتوحہ ملک میں نئے مذہب کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دیں، اس لیے ازہر کا ابتدائی نصابِ تعلیم اسماعیلی حدیث و فقہ تک محدود تھا۔ ۳۷۲ھ میں عزیز کا وزیر یعقوب بن کلیس، جو بڑا علم دوست اور معارف پرور تھا، ازہر کے نصابِ تعلیم میں اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اسماعیلی مذہب کی درسیات کے علاوہ عربی ادب، فلسفہ، منطق اور علومِ نظری و عملی کی تعلیم کا اجرا کیا۔ پینتیس[۳۵] معلمین کی ایک جماعت مقرر کی جن کا صدر معلم قاضی الخندق ابو یعقوب تھا۔ حاکم کے زمانے میں مشہور مسلمان سائنس دان و ماہر بصریات ابن الہیثم نے بھی اس جامعہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ المستنصر باللہ کے عہد میں اسماعیلی مذہب کے علاوہ مذاہب جعفریؒ، مالکی اور شافعی کی تعلیم کے بھی انتظامات کیے گئے۔ اس زمانے میں مشہور ایرانی فلسفی حکیم ناصر خسرو اور ممتاز اسماعیلی عالم و داعی لوائید شیرازی نے بھی یہاں تدریس کی خدمات انجام دیں۔

مملوکوں کے دور میں جامعہ ازہر کو از سرِ نو درس و تدریس کے لیے کھول دیا گیا۔ یہاں فقہ شافعی کی تعلیم

کی غرض سے ۶۶۵ھ/ ۱۲۶۶ء میں امیر بل بک خازندار نے سرمایے کا انتظام کیا اور ساتھ ہی ساتھ حدیث و قرآن کے اساتذہ بھی مقرر کیے۔ سلطان ناصر کے عہد (۷۶۱ھ/ ۱۳۶۰ء) میں ازہر میں فقہ حنفی کا حلقہ درس قائم کیا گیا۔ بعدازاں اہلِ سنت کے چاروں مسلکوں (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) کی فقہی تدریس کے انتظامات کیے گئے اور مذاہب اربعہ کے الگ الگ شیوخ مقرر کیے گئے۔ ان دنوں یتیم طلبہ کے لیے ایک الگ مدرسہ بھی قائم کیا گیا۔

اب سے ایک صدی پہلے تک الازہر بنیادی طور پر علوم قرآن، تجوید و تفسیر، علوم حدیث و اصول کے علاوہ فقہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کی درس گاہ تھا۔ طلبہ کی تقسیم بھی ان ہی فقہی مسالک کے مطابق ہوتی تھی اور وہ اپنے اپنے مسلک کے شیوخ و اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے رواق (ہاسٹل) بھی الگ الگ ہوتے تھے۔ یہاں صبح کو تفسیر، حدیث و فقہ کا درس ہوتا تھا۔ دوپہر کو عربی زبان پڑھائی جاتی تھی، اور ظہر کے بعد دیگر مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر امتحان کا کوئی طریقہ رائج نہ تھا۔ ۱۲۸۸ھ بمطابق ۱۸۷۳ء میں حکومت نے امتحان کا طریقہ رائج کیا اور اعلیٰ جماعت میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو الشادۃ العالمیۃ (عالم کی سند) دینے کا حکم نافذ کیا۔ اسی سال اعلیٰ تعلیم کا ایک اور دارالعلوم بھی قائم کیا گیا۔ شیخ محمد عبدہٗ کی تحریک پر ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء میں خدیو عباس حلمی نے الازہر کے نظم و نسق کی نگرانی کی غرض سے ایک مجلس "ادارۃ الازہر" کے نام سے قائم کی۔ اسی سال قاہرہ کے باہر طنطا، دمیاط اور دسوق کی دینی درس گاہوں کو ازہر سے ملحق کر دیا گیا۔ ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں ازہر میں ایک قانون کے ذریعہ نئی اصلاحات کا نفاذ ہوا اور "ادارۃ الازہر" میں جامعہ ازہر کے تین علما اور دو سرکاری افسروں کو شامل کیا گیا۔ طلبہ کے داخلے کے لیے کم از کم عمر کا تعین کیا گیا جو ابتدا میں پندرہ سال تھی اور اب ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء کی اصلاحات کی رو سے مصری طلبہ کے لیے سولہ اور غیر مصری طلبہ کے لیے اٹھارہ سال ہے۔ ان طلبہ کے لیے لکھنے پڑھنے سے واقفیت اور نصف قرآن کے حافظ ہونے کی شرط عائد کی گئی۔ البتہ غیر مصری طلبہ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ ۱۳۱۴ھ بمطابق ۱۸۹۶ء کی اصلاحات کا ایک اہم نقطہ یہ تھا کہ ازہر میں مدتِ تعلیم کا تعین کیا گیا۔ بارہ سال کی اس مدت میں پہلا امتحان آٹھ سال کی تدریس کے بعد لیا جانے لگا اور کامیاب طلبہ کو "الشہادۃ الاہلیۃ" (اہلیت کی سند) دی جانے لگی۔ بارہ سال کی مدت مکمل کرنے والے طلبہ کو "الشہادۃ العالیمۃ" (عالمیت کی سند) کا مستحق قرار دیا گیا۔ اسی طرح نصابِ تعلیم میں عصرِ جدید کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا اور تعطیلات کی مدت مقرر کی گئی۔ ریاضی،

جغرافیہ، تاریخ اور قانون بین الممالک کو نصاب کا جزو قرار دیا گیا۔ عربی کے علاوہ جدید مغربی زبانوں میں سے فرانسیسی اور انگریزی کی تعلیم بھی ضروری قرار پائی۔

۱۹۰۳ء میں اسکندریہ میں بھی ازہر کے طرز پر ایک درس گاہ قائم کی گئی اور اس کا الحاق ازہر سے کیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۰۷ء میں شرعی عدالتوں کے لیے قاضیوں کی تربیت کی غرض سے ازہر میں ایک مدرسہ قانون کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۰۸ء میں نصابِ تعلیم میں از سر نو اصلاح کی گئی۔ پورے نصاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر حصے کی مدتِ تدریس چار سال قرار پائی اور اس مدت کے اختتام پر امتحان کا طریقہ رائج کیا گیا، جس کے بعد بالترتیب ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ جماعتوں کی تکمیل کی سند دی جانے لگی۔ اس طرح ۱۹۱۱ء میں یہ قانون نافذ کیا گیا کہ شیخ الازہر کا تقرر خدیو مصر کرے گا۔ ادارۃ الازہر کی بھی توسیع کی گئی۔ اس کے ارکان میں شیخ الازہر کے علاوہ چاروں مذاہب کے شیوخ، اوقاف کا ناظمِ اعلیٰ اور کابینۂ وزرا کے نامزد تین ارکان، کُل نو افراد شامل کیے گئے۔ اسی طرح تیس صدور شعبہ (شیوخ) کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جن میں سے شیخ الازہر کا انتخاب ہوتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ادارۃ الازہر میں اور توسیع کی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں نصابِ تعلیم میں مزید ترمیم کی گئی اور جدید زبانوں میں فرانسیسی اور انگریزی کے علاوہ فارسی و ترکی کو شامل کیا گیا۔ اسی طرح سائنسی مضامین کا بھی اضافہ کیا گیا۔

اس وقت الازہر کی ہیئت ترکیبی یوں ہے۔ پوری جامعہ تین کلیات، کلیۂ شریعت، کلیۂ اصولِ دین اور کلیہ عربی پر مشتمل ہے۔ جن میں مدتِ تعلیم پندرہ سال ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں ابتدائی جماعتوں کا نصاب چار سال، ثانوی جماعتوں کا پانچ سال اور اعلیٰ جماعتوں کا چھ سال ہے۔ ان تینوں کلیات (فیکلٹیز) میں عہدِ جدید کی اعلیٰ ترین تعلیم دی جاتی ہے۔ جس میں ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی بھی شامل ہے۔ ازہر کا "قسم البعوث" غیر ملکی طلبہ کے لیے مختص ہے اور اس میں چار چار سال کے تین درجے ہیں۔

جامعہ ازہر میں عصرِ جدید کے تقاضوں کے مطابق برابر اصلاحات کی جارہی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں طالبات کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں ازہر کی مرکزی درس گاہ کے ساتھ ساتھ قاہرہ، منصورہ، طنطا، سیوط کی درس گاہوں کا الحاق کیا گیا۔ غرض اصلاح و ترقی کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔

جامعہ ازہر کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اس میں طلبہ سے ملکی ہوں یا غیر ملکی، کوئی فیس نہیں لی جاتی، ان کے قیام و طعام کے سارے انتظامات حکومت کی جانب سے کیے جاتے ہیں اور انھیں وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔ الازہر کے یہ تمام اخراجات محکمۂ اوقاف اور مصری حکومت پورے کرتی ہے۔

سید محمد متین ہاشمی

رسالہ رموزات اور اس کے مصنف

دیال سنگھ لائبریری کے ریسرچ سیل میں تصوف کا ایک نہایت موجز و بلیغ مخطوطہ موجود ہے جس کے کسی مطبوعہ نسخے کا ابھی تک پتا نہیں چل سکا ہے۔ غالب گمان ہے کہ یہ کتاب طبع ہی نہیں ہوئی ہے۔ جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے اس کا ایک نسخہ ایران میں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کسی دوسرے کتب خانے میں بھی موجود ہو۔ بہرحال اس کے مؤلف مولانا سید عبدالجلیل بلگرامی ہیں۔ رسالے کا نام "رسالہ رموزات" ہے۔

رسالے کی تقطیع ۱۵ × ۸ س م ہے۔ اور ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۱۳۰ھ میں محمد وزیر کاتب نے اس کی کتابت کی ہے۔ ترقیمہ کاتب درج ذیل ہے:

"تمت تمام شد بتاریخ دہم شہر ذی الحجہ ۶ بروز چہار شنبہ روز عید الضحیٰ (؟ الاضحیٰ) بوقت چاشت در شہر اسلام سانبھر در عہد محمد شاہ پادشاہ مطابق ۱۱۳۰ھ النبوی رسالہ رموزات من تصنیف عبد جلیل رحمۃ اللہ علیہ غفرلہ و کاتبہ (؟ و لکاتبہ) محمد وزیر ساکن بلدہ مبارک سورت والسلام و الاکرام۔"

یہ مخطوطہ مکمل ہے اور اس کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کاتب نے اسے مصنف کی حیات میں لکھا ہے۔ خطبے کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے:

"الحمد للہ صانع القدرۃ و التحیات علیٰ رافع العزۃ و الثناء علیٰ مبین الکثرۃ و الاستعانۃ علیٰ صاحب الصنعۃ۔"

اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے:

"پرسید کہ ای سیاحی از کجا تا کجا گردی و تا بہ کجا رسیدی سیاحی جوابش داد و گفت چوں از ملک عدم سیر کردہ آمدہ ام بولایت لا رسیدم ہر چند کہ گشتم باز بملک لا آمدم۔

مصنف کے مختصر حالات

مصنف مولانا سید عبدالجلیل بلگرامی سید احمد حسینی واسطی کے صاحب زادے ہیں۔ آپ کی ولادت

۱۳ شوال ۱۰۷۱ھ کو بلگرام میں ہوئی۔ آپ نے علومِ عقلیہ و نقلیہ مولانا غلام محمد نقشبندی لکھنوی سے حاصل کیے اور بہت جلد اپنے ہم عصروں کے درمیان ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی، شیخ نور الحق محدث دہلوی کے شاگردِ رشید سید مبارک محدث بلگرامی سے آپ نے علمِ حدیث کی تحصیل کی۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف رحمان علی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے :

" در تفسیر و حدیث و تاریخ و لغت و ادب و شعر گوئی مہارتی و بزبان عربی و فارسی و ترکی و ہندی طلاقتی وا فرداشت و بہرزبانی تصنیفی رشیق و تالیفی انیق از و یادگار اند از عہد اورنگ زیب تا زمان فرخ سیر از شاہانِ دہلی بعہدہ بخشی گری و سوانح نگاری باعزاز تمام بسر بردہ "[1]

حدائق الحنفیہ کے مصنف نے آپ کو ان القاب سے یاد کیا ہے :

سید عبد الجلیل بن سید احمد حسینی واسطی بلگرامی محدث، مفسر، فقیہ، ادیب، لغوی، علامہ بارع، کوکب ساطع، قاموس اللسان، طلیق البیان "[2]

سلافۃ العصر کے مصنف سید علی معصوم اورنگ آبادی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ :

" میں نے ہند میں آپ ایسا کوئی نہیں دیکھا "[3]

ابتدا میں عالمگیر بادشاہ نے آپ کو بخشی گری کے عہدے پر مامور کیا اور بعد میں ضلع گجرات (پنجاب) کا وقائع نگار مقرر کیا۔ اس کے بعد وہ سندھ اور سیوستان کے علاقوں میں بھی اسی طرح کی خدمات انجام دیتے رہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے نہایت ذہانت اور محنت سے اپنے فرائض انجام دیے۔ ۱۱۱۱ھ میں جب اورنگ زیب نے قلعہ " ستارہ " فتح کیا تو سید عبد الجلیل نے ایک رات میں گیارہ قطعہ تواریخ نظم کیے اور ان کے مجموعے کا نام " گلزار فتح شاہ ہند " رکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے آپ کو مراحم خسروانہ سے مشرف فرمایا۔

عربی قطعہ تاریخ کا نمونہ ملاحظہ ہو :

---

[1] رحمان علی : تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۸ - طبع نولکشور لکھنؤ

[2] فقیر محمد جہلمی : حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۳ - نولکشور لکھنو

[3] ایضاً

لما توجہ سلطان الانام الی ... رب السمٰوٰت فی تائید اسلام
اقوا بھامہٗ فی احصل خنصرہٖ ... بورد یا قادر فتاح اکمام
فصار حین افتتاح الاسم مفتحا ... حصنا لمن عبدوا احجار اصنام
نظرت فی الخات وھی اربعۃ ... من فوق ابھامہ من غیر ابھام
وجدتھن لعام الفتح حینئذٍ ... رقیما علی سنۃ من مد ابھام
اللہ تلک ید بیضاء قد ترعت ... للناظرین فیا للمعجز السامی
ھذا البدیع من التاریخ انشأہ ... عبد الجلیل بتائید ات الھام

فارسی قطعۂ تاریخ پیشِ خدمت ہے :

چوں شہ ابہام زیر خنصر آوردہ ... بوردِ اسم اعظم در شمارہ
قلاع کفر شد مفتوح فی الحال ... ز تیغ او عدو شد پارہ پارہ
ز انگشتان شہ بر مد ابہام ... برابر چار الف کردم شمارہ
بعینہ بود شکل سال ہجری ... پئے تاریخ تسخیر ستارہ
چنیں تاریخ گفتن اختراعیست ... شد از عبد الجلیل ایں آشکارہ [۵۴]

۱۱۲۶ھ میں ضعف کے باعث انھوں نے سلطان فرخ سیر سے ملاقات کی اور مزید خدمت سے معذرت کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا اور اپنی جگہ پر اپنے بیٹے سید محمود کو مقرر کرا کر خود بلگرام چلے گئے۔ ایک سال تک بلگرام میں قیام کرنے کے بعد دہلی گئے اور وہیں ربیع الآخر کی ۲۳ تاریخ کو شنبہ کی رات ۱۱۳۸ھ میں وفات ہوئی، جسدِ خاکی بلگرام لایا گیا اور بستانِ محمود میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ تاریخ وفات اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ جَنّٰتُ عَدْنٍ سے نکلتی ہے [۵۵]

رسالہ رموزات

گو کہ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی اس کے مضامین کی گہرائی اور گیرائی ہے اور خیر الکلام ما قل و دل کا قول اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ مصنف نے کتاب کو چار منازل پر تقسیم کیا ہے۔ (۱) شریعت (۲) طریقت (۳) حقیقت (۴) معرفت

---

[۵۴] تذکرہ علمائے ہند : ۱۰۸

[۵۵] حدائق الحنفیہ : ۱۰۹

صوفیائے سلف کی طرح مصنف نے بھی شریعت کو سب پر فوقیت دی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"بدانکہ شریعت بمعنی لغوی شروع کردن یعنی رجوع کردن بسوی حق سبحانہ و تعالیٰ چنانچہ حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ اند براں راسخ بودن و یکموی تجاوز و تفاوت نکردن"[۵۶]

جس نے بھی تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اس المناک حقیقت سے ضرور واقف ہوگا کہ جب سے چند مغلوب الحال صوفیا نے چاہے جس وجہ سے بھی ہو شریعت سے اپنا دامن چھڑایا اور شریعت وطریقت میں ثنویت و مغائرت پیدا کی "احسان" کا وہ چشمۂ صافی جس سے روحیں سیراب ہوتیں اور عبد و معبود کے درمیان رشتۂ محبت استوار ہوتا تھا، گدلا ہوتا چلا گیا، حقائق گم ہوگئے اور اوہام و خرافات نے جگہ بنالی۔ رفتہ رفتہ عجمی تصورات غالب آنے لگے، جس کے نتیجے میں "آبروئے شیوہ اہل نظر" بھی جاتی رہی اور "تصوف" چند رسوم و توہمات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اس کا رونا تو حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ بھی رو رہے ہیں۔

"خداوند عزوجل مارا اندر زمانہ پدیدار آوردہ است کہ اہل آں ہوا را شریعت نام کردہ اند وطلب جاہ و ریاست وتکبر را عز وعلم و ریا و خلق را خشیت ونہاں داشتن کینہ را اندر دل حلم و مجادلہ را مناظرہ و محاربہ و سفاہت را عظمت ونفاق را زہد و تمنی را ارادت و ہذیان طبع را معرفت و حرکات دل و حدیث نفس را محبت والحاد را فقر و جحود را صفوت و زندقہ را فنا و ترک شریعت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) را طریقت و آفت اہل زمانہ را معاملت نام کردہ اند"[۵۷]

شریعت کی وضاحت

شریعت کی مکمل پیروی پر زور دینے کے بعد رسالہ رموزات کے مصنف نے مختصر الفاظ میں شریعت کی وضاحت کی ہے:

"وفرمودن آنحضرت پنج چیز است اول کلمہ طیب گفتن، دوم پنج وقت نماز گزاردن، سیوم روزۂ ماہ رمضان داشتن، چہارم زکوٰۃ دادن، پنجم حج کردن، واداءی ایں پنج چیز درد است و رنج۔"

کلمہ طیبہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

۵۶ مخطوطہ رموزات: ۲ ۵۷ الہجویری: کشف المحجوب: ۸ - طبع ایران

"رمز اول بشنو در کلمۂ طیب گفتن یعنی لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ اگر طالب صادق باشد بگفتن، کلمۂ طیب مقصودش دریا بد چناں دریا بد کہ بدنہ بد"

آگے چل کر فرماتے ہیں :

"اینجا است کہ شمس تبریز فرمودہ اند: بیت

فنا اندر فنا یعنی فنا ہست — بقا اندر بقا یعنی بقا ہست

چوں سالک دریں مقام رسد یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ۔ ویرا کشف شود ۔"

رمز دوم میں لکھتے ہیں :

"رموز دوم نماز گزاردن بدانکہ نماز گزاردن فرض عین است وگزاردن ہم با دل وجان فرض عین است ۔ اگر نماز بے ریا بگزارد اسلام عین است واگر با ریا بگزارد کفر عین است وگزاردن فرض عین است باید کہ نماز بے ریا بگزارد چناں بگزارد کہ بگزارد ازاینجا است کہ گفت پیغامبر علیہ السلام من ادا العبادة لعبد الوصول فقد اشرك باللّٰه[۵۸] ہر کہ ایں چنیں نماز ادا کند وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۔ ویرا کشف شود آں زمان مصلی مسلم شود و نمازش قبول افتد چوں قبول افتاد اضافش افتاد چوں اضافش افتاد عبد و رب یافت تمثیل برف وآب دراں وقت رفت وہم سیراب و سالک گشت ازینجا است کہ فرمودہ اند علیہ السلام من عرف نفسه فقد عرف ربه[۵۹] چوں سالک دریں مقام رسید لذت وحدت چشید آں زمان لا الٰہ الا ھو ویرا کشف شود ۔

رمز سوم میں روزے کے بارے میں فرماتے ہیں :

روزہ بمعنی راز است نہ کہ دین بستن ازینجا است کہ فرمودہ اند علیہ السلام صوموا برؤیته وافطروا برؤیته[۶۰]۔

---

۵۸ مستند احادیث میں یہ روایت موجود نہیں ہے ۔ غالب گمان ہے کہ یہ موضوع روایت ہے ۔ واللّٰہ اعلم بالصواب

۵۹ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ کسی عارف کا قول ہے جو بطور حدیث کے مشہور ہو گیا ۔

۶۰ مؤلف نے چاند دیکھنے کی روایت کو رویت باری پر محمول کیا ہے جو محل نظر ہے، کیونکہ سلف صالحین کی کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے ۔

آگے چل کر فرماتے ہیں :

" بدانکہ روزہ داشتن فرض عین است یعنی داشتن خود فرض عین است آری ہمیں طور ہست آمنّا وصدقنا ہر کہ خود را داشت عین یافت آں زمان عین بعین خود دید کہ عین بعین است ازینجا است کہ فرمودہ اند علیہ السلام من رأنی فقد رأ الحق و بزبان حال گفت۔

چوں او عین من و من عین اویم انا الحق چوں نہ گویم چوں نگویم

ازینجا است کہ خاتم النبی فرمودہ اند، رأیت ربی بربی چوں سالک دریں مقام رسید اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - ویرا کشف شد۔

رسالہ رموزات کے مؤلف چونکہ وحدت الوجود کے قائل تھے، اس لیے انھوں نے وہی اسلوب بیان اختیار کیا ہے جو عموماً وجودی صوفیہ اختیار کرتے ہیں۔ تاکہ ان لوگوں تک ان کے خیالات نہ پہنچ سکیں جو ان خیالات کے اہل نہیں ہیں۔ فصوص الحکم کے مقدمے میں ابوالعلا عفیفی لکھتے ہیں :

المعروف عن الصوفیۃ اطلاقاً انھم قوم لا یتکلمون بلسان عموم الخلق ولا یخوضون فیما یخوض فیہ الناس من مسائل علم الظاہر وانما یتکلمون بلسان الرمز والاشارۃ اما ضنا بما یقولون علی من لیسوا اھلاً لہ واما لان لغۃ العموم لا تفی بالتعبیر عن معانیھم وما یحسونہ فی اذواقھم ومواجدھم اما ما یرمزون الیہ فحقائق العلم الباطن الذی یتلقونہ وراثۃ عن النبی وھذہ الحقائق لا یستقل بفھمھا عقل ولا بالتعبیر عنھا لغۃ [۱۱]

عام طور پر صوفیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لوگ عامۃ الناس کی زبان میں کلام نہیں کرتے اور نہ ان مسائل میں دخل دیتے ہیں جن کا تعلق علم ظاہر سے ہے۔ وہ تو رمز و کنایہ کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں یا تو اس وجہ سے کہ نااہل ان کی باتوں تک رسائی نہ حاصل کر سکیں یا اس لیے کہ عام طرق اظہار ان کے معانی و افکار اور احوال و مواجید کو کماحقہٗ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا پھر اس لیے کہ جن باتوں کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں وہ ایسی حقیقتیں ہیں، جنھیں متوارث طور پر انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہے اور یہ حقائق تو عقل میں سما سکتے ہیں،

---

[۱۱] عفیفی ابوالعلا : تعلیقات علی فصوص الحکم : ۱۵ ، طبع بیروت

اور نہ زبان و بیان کی گرفت میں آسکتے ہیں۔

زکوٰۃ کی تشریح کرتے ہوئے رمز چہارم میں لکھتے ہیں :

" بدانکہ زکوٰۃ دادن فرض عین است یعنی دادن خود فرض است قال اللہ تعالیٰ : اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ آری ہمیں طور است ہر کہ خود را داد خدا را یافت ازینجا است کہ نا یافتن خود یافتن خدا است و نادیدن خود دیدن اوست تا آنکہ سالک خود را از خود بر ندارد اگر زاہد ہچو بریان باشد دنیادار ہچو قارون باشد ازینجاست کہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اشارت کردہ اند حب الدنیا راس کل خطیئۃ و ترک الدنیا راس کل عبادۃ ، چوں سالک تا اینجا سیر کند از کلی تفرقہ خود را سیر کند آں زمان وَ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ویرا کشف شود"

حج کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

" بدانکہ حج رفتن خود خدائیست و در رفتن آن خدائیست آنجاکہ خدائیست خود نمائیست و آنجاکہ خود نمائیست جدائیست و آنجاکہ جدائیست نابینائیست و آنجاکہ نابینائیست بروی نازل شدہ است وَمَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ۔

طریقت کی تعریف

مصنف نے طریقت کی اس انداز میں تعریف کی ہے :

" بدانکہ طریقت بمعنی اصطلاحی مجاہدہ کردن بنفس خود یعنی سہو کردن نفس در نفس خود چوں سالک تا اینجا سیر کند دراں وقت اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ویرا کشف شود طریقت بمعنی لغوی راہ رفتن (یعنی) خود رفتن آری ہمیں طور است یافتن خدا در خود است نہ کہ در آسمان و زمین چنانچہ در حدیث آمدہ است القلوب بیت اللہ چوں بیت را یافت صاحب بیت را یافت صاحب بیت را یافت خود را شناخت خدا را شناخت باخودی خود در عالم خود باخت آں زمان کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لاعرف دریافت ۔

حقیقت و معرفت

رمز ہفتم و ہشتم میں حقیقت و معرفت کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں :

"بدانکہ حقیقت بمعنی لغوی حق بودن واضافت ربودن ومعیت دریدن واز تمنا رمیدن از اینجا است کہ حضرت فرمودہ اند الفقر لا یحتاج الا اللہ۔"

معرفت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یعنی ہمہ جا ذات پاک واحد یافتن و دریں ظہور کونین گوناگوں غیر مکرر با حق بودن اگرچہ صورت ہائے مختلف ناپاک (دہشت ناک) پیش آید خوف و ذوق نشاید و در احدیت محکم باید از اینجا است کہ فرمودہ اند الایمان بین الخوف والرجا۔"

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی اپنے انداز میں تشریح کرنے کے بعد مصنف نے چاروں عوالم یعنی ناسوت، ملکوت، جبروت ولاہوت کا تذکرہ اور تشریح وجودی صوفیا کے انداز میں کی ہے۔

لاہوت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"بدانکہ معنی لفظ لاہوت یعنی نیست او جز تو"[۱۲] آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اگر کسے گوید کہ ایں بشر چگونہ او باشد و او شد از کلام رب العالمین بشنو کہ بحضرت محی الدین گفتہ اند یا غوث الاعظم الانسان نفسک وقالبہ وروحہ وسمعہ وبصرہ ولسانہ ویدہ ورجلہ وکل ذلک اظہر لنفسی لنفسی لاھو الا انا ولا انا غیرہ۔"[۱۳]

رمز دہم میں جبروت کی تشریح مشاہدہ رب سے کی ہے اور رمز یازدہم میں ملکوت کے بارے میں فرمایا ہے:

"در ملکوت بودن یعنی پاک و باصفا بودن از ماسوا۔"

رمز دوازدہم میں ناسوت کی بابت فرماتے ہیں:

"ناسوت یعنی غافل بودن غفلت بدو معنی آید کہ اگر موصوف باشد باوصاف ذمیمہ آں معنی بداست اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بروی نازل شود واگر موصوف باشد باوصاف (؟ جمیلہ) آں معنی بدایت است یعنی چنانچہ بود ہمچناں است۔ چناں بود کہ جز وحدت وکثرت بدست وشرک واضافت نداشت مطلق بود . . . از اینجا است کہ سلف

---

[۱۲] لفظ لاہوت کی یہ تشریح محل نظر ہے

[۱۳] یہ قول بے سند ہے۔

فرمودہ اند النہایۃ ھو الرجوع الی البدایۃ ، آں مقام ہاہوت است۔ پس ہاہوت و ناسوت ہر دو یکی شد و آنچہ بود ظاہر شد ازینجا است فرمودہ اند: من عرف اللہ کل لسانہ۔

آگے چل کر مصنف نے اپنے وجودی عقائد و نظریات کے تحت عوالم اربعہ کی نہایت انیق تعبیرات اور موجز استدلات کا نمونہ پیش کیا ہے۔ عبارات کا ایجاز اور استدلال کا انداز خاصے کی چیزیں ہیں ملاحظہ ہو۔

"وجہ دیگر بشنو کہ در ناسوت نادانستن و در ملکوت دانستن و در جبروت دیدن و در لاہوت بودن و در ہاہوت گزشتہ باز ناسوت و ہاہوت یکی شد"۔ "وجہ دیگر بشنو در ہاہوت نابودن و در لاہوت بودن، و در جبروت نمودن و در ملکوت شنیدن و در ناسوت نابودن باز ناسوت و ہاہوت یکی شد"

"وجہ دیگر بشنو کہ در ناسوت محو خواب بود و در ملکوت ہمچو بیدار و در جبروت با یار و در لاہوت خود یار و در ہاہوت بے یار باز ناسوت و ہاہوت یکی شد"

مذکورہ بالا تمام تشریحات فلسفہ وحدت الوجود کی روشنی میں کی گئیں ہیں۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انداز بیان کی ندرت سے تو انکار ممکن نہیں۔

علامہ قشیری رسالہ قشیریہ میں وجودیت کے فلسفے کو اس انداز میں بیان فرماتے ہیں، راقم الحروف کے خیال میں یہ انداز بیان اقرب الی الفہم بھی ہے اور اقرب الی الشرع بھی:

اما الوجود فھو بعد الارتقاء عن الوجد و لا یکون وجود الحق الا بعد خمود البشریۃ لانہ لا یکون للبشریۃ بقاء عند ظھور سلطان الحقیقۃ وھذا معنی قول ابی الحسن النوری انا منذ عشرین سنۃ بین الوجد و الفقد ای اذا وجدت ربی فقدت قلبی و اذا وجدت قلبی فقدت ربی وھذا معنی قول الجنید علم التوحید مباین لوجودہ و وجودہ مباین لعلمہ وفی ھذا المعنی انشدوا۔

وجودی ان اغیب عن الوجود بما یبدو علی من الشھود[۱]

لیکن وجود کا مقام وجد کے مقام سے ترقی کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور وجود حق بشریت کے فنا ہو جانے کے بعد متجلی ہوتا ہے کیونکہ جب سلطان حقیقت کا ظہور ہوتا ہے تو پھر بشریت کہاں باقی رہ سکتی ہے اور ابوالحسن نوری کے اس قول کا یہی مطلب ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ "میں بیس برس سے وجد و فقد کے درمیان ہوں

---

[۱] القشیری ابوالقاسم: الرسالۃ القشیریۃ، ۳۴، طبع مصر ۱۳۴۶ھ

یعنی جب اپنے رب کو پاتا ہوں تو اپنے قلب کو گم کر دیتا ہوں اور جب میرا قلب مجھے ملتا ہے تو رب کو گم کر دیتا ہوں۔
حضرت جنیدؒ نے یہ جو فرمایا کہ توحید کا علم اس کے وجود کا مبائن ہے اور اس کا وجود اس کے علم کا مبائن ہے،
اس کا بھی مطلب ہے، اور اسی لیے کہنے والوں نے یہ شعر کہا کہ "میرا وجود یہ ہے کہ میں وجود ہی سے غافل ہو
جاؤں اور ان تمام مشہودات کو فراموش کر دوں جو مجھ پر ظہور کر رہے ہیں۔
پیر ہرات حضرت خواجہ عبداللہ انصاری قدس سرہٗ العزیز اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:
خدایا! ایں چہ بوالعجبی است کہ با دوستان خود می کنی وقتیکہ ترا می جویم خود را می یابم و وقتیکہ خود را
می جویم ترا می یابم۔
علامہ اقبال اسی مضمون کو یوں بیان فرماتے ہیں:

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی — کہ او پیدا ہست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی — تلاش خود کنی جز او نیابی

مصنف کے نزدیک منزل پر پہنچانے والی چیز عشق ہے نہ کہ علم۔ اٹھارھویں رمز میں فرماتے ہیں:
"ای عزیز ہرگز بعلم خویش کسی بخدا نرسد و ہر کہ از علم خویش برسید ہرگز بہ نہایت نرسید"
بائیسویں رمز میں فرماتے ہیں:
"ہر کہ بر اثبات ثابت است کافر است تاکہ اثبات را نہ کند از لذت ایمان محروم است۔"
تیئیسویں رمز میں ارشاد ہے:
"ہر کہ خود را داند کافر است تاکہ خود را خدا نداند از کفر برنیاید۔"
یہ بھی وحدت الوجودی نظریے کا بیان ہے۔
چھبیسویں رمز میں حضور و غیاب کو اس انداز میں بیان فرماتے ہیں:
"ہر کہ حضوری دارد مطلق دور است تاکہ دور نہ گردد حضور نگویند۔"
اکتیسویں رمز میں ارشاد ہے:
"ہر کہ مراد دارد نامراد است تاکہ نامراد نباشد بمراد نرسد۔"
بتیسویں رمز میں فرماتے ہیں:
"مردی مدتی در پی خود شناسی بود چوں خود را شناخت ہیچ نیافت۔"

تینتیسویں رمز میں فرماتے ہیں :

"طالبی سالہا در طلب حق بود چوں حق را شناخت نامش گرفتن غیرت آمد۔"

چونتیسویں رمز میں فرماتے ہیں :

"از خود کفر کردم چوں بخود آمدم شرک دیدم چو از ہر دو رفتم آرام یافتم۔"

پینتیسویں رمز میں فرماتے ہیں :

"ہر چہ میدیدم نابینا بودم چوں ہیچ ندیدم بینا شدم"

رموز کے عنوان سے مصنف نے اس رسالے میں کمال ایجاز کے ساتھ تصوف کے ادق مسائل کو بیان کیا ہے، اور اہلِ نظر کو دعوتِ فکر دی ہے۔ چند نمونے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

۱۔ آری بندہ را از بندگی خود کار است نہ کہ چون و چرا در کار است ہر چہ می شود برو گذرا است و آنچہ میگذرد برو راضی باشد و آنچہ خواہد بروی بازی باشد۔

۲۔ بدانکہ مراد از عشق آنست کہ عاشق و معشوق نیست وجود درمیان بہانہ است عاشق ہم او و عشق و معشوق ہم او عارف ہم او و عرف و معروف ہم او خود است مظہر برائے دیدن ہم او خود آئینہ گشتہ خود بخود بیند ہم او۔

۳۔ بدانکہ قلب قلب را گویند و تا آنکہ قلب در قالب است ہمیشہ در قلب است چنانچہ گاہی حاجب است گاہی ناظر است وگاہی قادر است و گاہی عاجز است وگاہی غافل است و گاہی ذاکر است وگاہی شاکر است وگاہی ساکر است و گاہی خیر وگاہی شر است وگاہی عالم و گاہی جاہل است و گاہی بی اوست و گاہی با او و گاہی بیرون از ہر دو از ینجا است کہ حضرت علیہ السلام فرمودہ اند : یا لیت رب محمد لم یخلق محمداً۔

(۴) بدانکہ روح بی چون و بی چگون است و بی شبہ و بی نمونست . . . ہر چند فکر کردہ می شود یافتہ نمی شود و بنقلاً در شریعت گفتہ اند بی چون و بی چگون است و بی شبہ و بی نمونست، پس این صفات ذاتی است جائی کہ صفات و ذات یک باشد آں عین ذات باشد۔

(۵) بدانکہ بہشت دریگانگی است از انکہ بیروں از بے گانگی است و آنجا کہ بیروں از بے گانگی است بہمہ حال حدیث یگانگی و در آنجا کار یکی دیدن و یکی دانستن و یکی شنیدن و یکی گفتن است۔

(۶) بدانکہ دوزخ در بیگانگی است از انکہ دوزخ بیرون از بیگانگی است اینجاست کہ حق تعالیٰ فرمودہ اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ۰

(۷) قیامت بمعنی اصطلاحی استادہ شدن است و آں ایستادن بچند وجہ است یکی ہر دم است کہ فرو می رود دمی ایستد دودم ہر ساعت باطراف و طرف قلب قلب است سیوم ہر روز است و آں طلوع میکند و تمام عالم را بکار و بار مشغول می کند چہارم وجہ بر جمیع عالم مرکب است وجہ پنجم وقت است و آں رفتن خودی است چوں از خود رفت خدا را یافت و ہرگز بجانب خود نشافت از ینجا است کہ حضرت علیہ السلام فرمودہ اند من مات فقد قامت قیامتہ ، چوں سالک دریں مقام رسید کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ بروی روی نماید۔

(۸) بدانکہ فکر بمعنی دریافتن یعنی دریافتن آں دریا وطن چوں آں دریا وطن دریافت دُر یافت مراد از دُر وجود است و مراد از دریا موجود است چوں در دریائے موجود غوطہ خورد خود را دریا بد۔

مندرجہ بالا اقتباسات کے انداز میں مصنف نے تلاوت قرآن، علم، حلم، خلق و خالق، خاموشی، قناعت، عزلت، تسبیح، مراقبہ، مجاہدہ، مشاہدہ، صلاحیت، ہمت، مسکنت، رضا، ایمان، اخلاص، استقامت، توبہ، شکر، صبر، توکل، تلقین، تجرید، تفرید اور عرفان وغیرہ کی تشریح فرمائی ہے۔

اور رمز ہشتاد چہارم سے چھوٹے چھوٹے جملوں میں سلوک و طریقت کے اصول بیان کر دیئے ہیں، جملے کیا ہیں نگینے ہیں جو کتاب کے اوراق میں انتہائی چابک دستی سے جڑ دیے گئے ہیں۔

چند جملے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ ہر کہ بر منظور ناظر باشد از حقیقتش کور باشد۔

۲۔ واصل را حقیقت نیست

۳۔ دریافت آں است کہ بے یافت گردد

۴۔ نفی و اثبات از وجود است چوں وجود رفت ہیچ نیافت ۔ (۵) خلق را با خالق دیدن شرک است ۔ (۶) چوں طالب مطلوب گردد از مطلب گردد۔ (۷) چوں سالک بمنزل رسد منزل نہ بیند۔

یہ مخطوطہ ایک سو ایک رموز پر مشتمل ہے اور با ذوق و اہل حال حضرات کے لیے اس کے دامن میں بہت کچھ موجود ہے۔

شبیر احمد خاں غوری

علم منطق
ایک تاریخی جائزہ

منطق ہماری تعلیمی تاریخ کا ایک اہم موضوع رہی ہے اور آخر میں اس صدی کے ثلث اول میں تو ہماری قدیم درس گاہوں کے نصاب پر منطق ہی منطق چھا کر رہ گئی تھی، حالاں کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جبکہ من منطق تزندق کے مصداق اس میں اہتمام و مشغولیت الحاد و بددینی کا پیش خیمہ سمجھے جاتے تھے اور اسے انتہائی معتوب بلکہ مبغوض بتایا جاتا تھا۔ اس انقلاب اقدار کی داستان یقیناً بڑی دلچسپ ہوگی۔ نظر بریں اسلامی فکر میں منطق کے داخلہ سے لے کر موجودہ صدی تک اس کے رد و قبول کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ و باللہ التوفیق۔

منطق کی حقیقت و ماہیت

منطق کو بعض حضرات "کج بحثی" اور "کٹ حجتی" کا مترادف سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کے اصول و قواعد کی مراعات فکر انسانی کی صحت کی ضامن ہے۔ اس لیے اس کی منطقی تعریف بدیں طور کی گئی ہے:

المنطق الۃ قانونیۃ تعصم مراعاتھا الذھن عن الخطاء فی الفکر۔[1]

منطق ایک آلہ قانونیہ ہے جس (کے اصول و قواعد) کی مراعات ذہن کو خطائے فکری سے محفوظ رکھتی ہے۔

اس تعریف سے چند باتیں صاف ہو جاتی ہیں:

۱۔ منطق خواہی نخواہی انسان کو فریق مخالف کے مقابلے میں بحث و مباحثہ کے اندر غلبہ دلانے کا ذریعہ نہیں ہے۔

۲۔ وہ اسے غور و فکر سکھانے کی بھی مدعی نہیں ہے (یہ ملکہ تو خود انسان کی فطرت ہی میں مرکوز ہے)

۳۔ نہ وہ براہ راست اسے فکر صحیح کی تعلیم دیتی ہے۔

۴۔ ہاں جب اس کی فکر یا استدلال صحیح جہت سے بھٹکنے لگتے ہیں تو انھیں ان کی خطا فکری پر متنبہ کر دیتی

---

[1] قطبی شرح شمسیہ

ہے اور واضح اور متعین طور پر ان کی تفکیری غلطی کی نشاندہی کر دیتی ہے۔ اس طرح وہ بالواسطہ صحیح غور و فکر میں اعانت کرتی ہے۔

مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

منطق کا آغاز

منطق علی الاصح الاقوال فلسفہ و حکمت ہی کا جزء ہے اور فلسفہ کے بارے میں یہ سوال بیکار ہے کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا۔ فلسفہ بدو آفرینش سے انسان کے ساتھ موجود رہا ہے، چنانچہ کننگھم کہتا ہے:

"اس طرح فلسفہ براہ راست زندگی اور اس کی ضرورتوں کے نتیجہ میں پیدا ہو کر ترقی کرتا ہے۔ ہر انسان جو زندگی بسر کرتا ہے، کسی نہ کسی حد تک فلسفی ہے، بشرطیکہ وہ غور و فکر کی زندگی گزارتا ہو۔"

لیکن فلسفہ بشمول اپنے جملہ اقسام و اجزاء کے بیک وقت وجود میں نہیں آیا، بلکہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ تمدنی ضرورتوں کے پیشِ نظر اس کے محتویات کی ثروت میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ انسانی ذہن نئے نئے علوم وضع کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

منطق بھی ایک مستقل علم کی حیثیت سے ارسطو کی کاوشِ فکر کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوا (تفصیل آگے آ رہی ہے)۔ اس سے پہلے DIALECTICS (جدلیات) کا تو پتا چلتا ہے (جو مناظرہ بازی کا دوسرا نام تھا) مگر تشکّل علم المنطق کا نہیں۔ اسی (ارسطو ہی) نے فکرِ صحیح کے ان پیمانوں کو جو نہاں خانۂ لاشعور کے اندر نمائی حالت میں پڑے ہوئے تھے، بالخصوص (SYLLOGISM) یا قیاس کو ایک باقاعدہ اور منظم علم کی حیثیت سے مدون کیا۔ لہٰذا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے جیسا کہ مشہور انگریز فلسفی جان لاک (المتوفی ۱۶۰۴) نے کیا تھا۔

"اگر قیاس (SYLLOGISM) ہی کو تفکیرِ صحیح کا آلہ اور حصولِ علم کا وسیلہ سمجھا جائے تو لازم آئے گا کہ ارسطو سے پہلے کوئی انسان ایسا نہیں تھا جو غور و فکر کے ذریعہ کوئی بات دریافت کر سکے، لیکن خدائے تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ انسان کو دو ٹانگوں والی مخلوق بنا کر اپنا کام ختم کر دے اور انھیں عقیل و فہیم بنانے کا کام ارسطو کے لیے چھوڑ دے۔"

کیونکہ بقول وائلے:

"اگر ہاروے (HARVEY) کے انکشاف دورانِ خون کی قدر شناسی یہ کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ اس نے

انسان کی رگوں میں خون دوڑ ایا تو ارسطو کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان میں ملکۂ تفکیر کو پیدا کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ ارسطو سے پہلے بھی غور و فکر کرتے تھے اور چونکہ لاشعوری طور پر ان بنیادی اصولوں کی مراعات کرتے تھے جو فکرِ صحیح کی شرائطِ لازمہ ہیں۔ اس لیے ان کا استدلال و استنتاج عموماً صحیح ہوتا تھا لیکن جہاں ان اصولوں کی مراعات میں ان سے چوک ہو جاتی، وہیں ٹھوکر کھا جاتے۔ ٹھوکر کھانا تو اتنا بُرا نہیں، مگر مشکل یہ تھی کہ ان دو زلل اقدام" پر تنبیہ کا ان کے پاس کوئی ضابطہ نہ تھا۔ اس لیے با اصرار علی الباطل پر جمے رہتے یا کٹ حجتی پر اُتر آتے۔ اس مشکل کو ارسطو نے حل کیا۔ اس کی توضیح امثلہ ذیل سے ہو گی:

۱۔ ارسطو سے پہلے اس کا استاد افلاطون الفاظ کا صحیح مصداق متعین کرنے پر زور دیتا تھا۔ لہٰذا اس کے ایک شاگرد نے اس سے "انسان" کی تعریف پوچھی۔ افلاطون نے کہا:

"بے پر والی دو ٹانگوں کی مخلوق"

بات غلط بھی نہیں ہے۔ انسان دو ٹانگوں والی ہی مخلوق ہے اور اس کے پر بھی نہیں ہوتے۔ شاگرد کو شرارت سوجھی۔ اس نے ایک مرغ لے کر اس کے پر نوچ ڈالے اور سارے شہر میں دکھاتا پھرا کہ یہ ہے۔ "افلاطون کا انسان"

لیکن آج منطق کا ایک ذہین طالب علم فوراً کہے گا کہ یہ تعریف ہی غلط تھی۔ منطقی تعریف کو جنس قریب اور فصل قریب سے مرکب ہونا چاہیے۔ دو ٹانگوں والا یا پیروں سے خالی ہونا، انسان کے عوارض میں اس کی ماہیت کے اجزاءِ حقیقی نہیں۔ یہ ہے سبب اس مغالطہ کا۔

اور یہ جنس اور فصل، قریب و بعید، اجزاءِ حقیقی اور عوارض کی تدقیق یا حدِ تام کی جنس قریب اور فصل قریب سے ترکیب ارسطاطالیسی منطق ہی کی دین ہیں۔

۲۔ قبل ارسطاطالیسی فلسفہ میں جس کے زمانہ کو ملا محمود جونپوری نے "قبل استقرار عرض الحکمۃ" سے اور اس کی تفکیری سرگرمیوں کو ظن و تخمین سے تعبیر کیا ہے، حقیقت "زمان" کے بارے میں جو مختلف مذاہب مروّج تھے، ایک قول یہ تھا کہ "فلکِ اعظم" ہی زمانہ ہے۔ اس مذہب کے قائلین کا استدلال تھا کہ:

کل جسم فی فلک وکل جسم فی زمان۔

ہر جسم فلکِ اعظم کے اندر ہے (ہر جسم کو فلکِ اعظم احاطہ کرتا ہے)

اور ہر جسم زمانہ کے اندر ہے (ہر جسم کو زمانہ احاطہ کیے ہوئے ہے)

فی الفلک ھو الزمان۔

پس فلک ہی زمانہ ہے۔

مگر ایک منطقی فوراً اس استدلال کی تغلیط کرے گا۔ وہ کہے گا یہ دلیل ناقابلِ تسلیم ہے۔ کیوں کہ صورۃ یہ منطق کی "شکل ثانی" ہے۔ جس کے قابل انتاج ہونے کے لیے کلیت کبریٰ کے ساتھ دونوں مقدموں (صغریٰ اور کبریٰ) کا کیف (ایجاب و قبول) میں مختلف ہونا ضروری ہے۔ یہاں کبریٰ کلیہ ضرور ہے مگر مقدمتین (صغریٰ اور کبریٰ) دونوں ہی موجبہ ہیں۔ ان سے کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل سکتا[۲۵]

یہ شکل اول و ثانی وغیرہ کا تعین اور ان کے قابل انتاج ہونے کی شرائط ارسطو ہی کی کاوشِ ذہنی کا نتیجہ ہیں، جن کی اس سے پہلے کسی فلسفی کو ہوا تک نہیں لگی تھی۔

غرض ارسطو سے پہلے لوگ یقیناً غور و فکر کرتے تھے، ان کا استدلال اور استنتاج صحیح بھی ہوتا تھا اور غلط بھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ان اغلاط پر تنبیہ کا ان کے پاس کوئی ضابطہ نہ تھا۔ اس مشکل کو ارسطو نے حل کیا۔ اس نے فکر صحیح کے قوانین کو بڑی دقتِ نظر سے مدون کیا اور اس طرح علم منطق کا آغاز کیا۔

ارسطو کا مقام

ارسطو صرف یونانی فلسفہ ہی کا ممثل اعظم نہیں ہے، عالمی فلسفہ کی تاریخ میں بھی ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس مقام کو سمجھنے کے لیے یونانی فلسفہ کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا مستحسن ہوگا:

یونانی فلسفہ کی ابتدا تالیس الملطی سے ہوئی جس کا زمانہ ۶۲۴ - ۵۴۸ ق م ہے اور انتہا ۵۲۹ء میں جبکہ قیصر جسٹینیان کے حکم سے ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ بند کر دیا گیا اور معلمین فلسفہ ایران میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اس گیارہ سو سال کی طویل مدت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ قبل سقراطی دور یا اہل الطبائع PHYSICISTS کا زمانہ۔

۲۔ یونانی فلسفہ کا طلائی دور یا سقراط، افلاطون اور ارسطو کا زمانہ۔

۳۔ بعد ارسطاطالیسی دور یا متشککین، ابیقوریہ اور رواقیہ کا زمانہ۔

۲۵۔ ملا محمود جونپوری: الشمس البازغہ

۴۔ یونانی فلسفہ کا آخری دور یا یونانی یہودی فلسفہ، نوفیثا غورثیت اور نوفلاطونیت کا زمانہ۔

(۱) قبل سقراطی دور کے اہل الطبائع کی تفکیری سرگرمیاں اس محور کے گرد گردش کرتی رہیں کہ کائنات کا مبداء اوّلین کیا ہے۔ ان کے تین طبقے ہیں:

پہلا طبقہ حکمائے ملطیہ کا تھا۔ یہ لوگ قوامِ کائنات کے لیے مبداء مادی پر زور دیتے تھے۔ تالیس جو یونانی فلسفہ کا مفتتح ہے، اسے پانی قرار دیتا تھا۔ تالیس کا شاگرد (ANAXIMANDER) اُسے مادۂ غیر متمیز (UN-DIFFERENTIATED MATTER) بتاتا تھا اور موخرالذکر کا شاگرد انکسیمنس (ANAXIMENES) اسے ہوا سمجھتا تھا۔ دوسرے طبقہ کے سامنے یہ نیا مسئلہ تھا کہ اگر کائنات کی اصل واحد ہے تو اس سے مختلف اشیا کس طرح پیدا ہوئیں؟ ایلیائی فلاسفہ نے اس کا جواب حدوث و تغیر کے انکار سے دیا۔ اس کے برعکس ہراقلیطس (HERACLITUS) نے تغیر ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ وہ آگ کو مبداء اوّلین کائنات سمجھتا تھا۔

تیسرے اور آخری طبقہ میں بنیادی مسئلہ کو مبداءِ واحد کی بجائے "مبادی اولیا" کی کثرت سے حل کیا گیا۔ انبذقلیس (EMPEDOCLES) نے "عناصر اربعہ" کو اصل کائنات بتایا۔ دیمقراطیس (DEMOCRITUS) نے "لا یتجزیٰ" یا سالمات (ATOMS) کو اور انکساغوراس (ANAXAGORAS) نے "جراثیم" کو۔

مشرقی یونان کے ان حکمائے طبیعیین نے کائنات کی اصل مادی مبادی ہی میں تلاش کی لیکن دورِ مغرب میں فیثاغورث نے اسے "مجردات" میں ڈھونڈا۔ اس کے نزدیک "عدد" ہی کائنات کی اصل ہے۔

مگر حکمائے قدیم کی اس ہمہ دانی اور عائیت نے ذہن انسانی کی اُس صلاحیت ہی کو ماؤف کر دیا جو ادراکِ حقائق کی اہل ہے، لہٰذا اس "دوتحکمیت" (DOGMATISM) نے فرقۂ سوفسطائیہ کی "لا ارتیابیت" کو جنم دیا۔ نتیجہ میں بعض لوگ جیسے گورگیاس (GORGIAS) نے سرے سے حقائق ہی کا انکار کر دیا (عنادیہ)، بعض انھیں تابعِ اعتقادات بتانے لگے (عندیہ) اور بعض متشکک (SCEPTICS) ہوگئے (لا ادریہ)۔

(۲) یونانی فلسفہ کا طلائی دور۔ اس دور کا مفتتح سقراط ہے جس نے سوفسطائیوں کے ادعائے ہمہ دانی کے ردِ عمل کے طور پر اپنی توجہ معمائے کائنات کے سلجھانے کے بجائے بقول مسعودی نفسِ انسانی کی اصلاح پر مرکوز کر دی۔ اس کے نزدیک "نیکی ہی علم ہے۔"

سقراط کا شاگرد رشید افلاطون (PLATO) تھا جو استاد کی وفات (۳۹۹ ق۔م) پر مصر چلا گیا تھا جہاں پیروانِ فیثاغورث کی تعلیم سے متاثر ہوا۔ فیثاغورث "عدد" کو اصل کائنات بتاتا تھا۔ افلاطون کی مادیت

بیزاری نے نئے استاد کی تقلید میں "تصوراتِ کلیہ یا کلیات" (IDEAS) کو اصل کائنات قرار دیا جو آگے چل کر "مثل افلاطونی" اور "اعیانِ ثابتہ" کہلائے۔

افلاطون کا شاگرد "ارسطو تھا جو یونانی فلسفہ کا ممثل اعظم ہے۔

[بعد کے ادوار کی تفصیل آگے آ رہی ہے]

غرض یونانی فلسفہ کا بانی و مفتتح تالیس الملطی ہے، تالیس کا شاگرد انکسیمندر تھا اور بقول موسیٰ ویبر (WEBER) انکسیمندر کا شاگرد فیثاغورث تھا[۵۳]۔ پیروانِ فیثاغورث اپنے سلاسل تلمذ کا باقاعدہ ریکارڈ نہیں رکھا کرتے تھے مگر اتنا محقق ہے کہ انہی پیروانِ فیثاغورث سے افلاطون نے اپنی سیاحتِ مصر کے دوران میں خوشہ چینی کی اور افلاطون کا شاگردِ رشید ارسطو تھا۔

اس طرح فلسفہ و حکمت کا جو سلسلہ تالیس الملطی سے شروع ہوا، ارسطو اس کا واسطۃ العقد ہے۔

یونانی فلسفہ کا ممثلِ اعظم۔ ارسطو

ارسطو شہر اسطاغیرا (STAGIRA) کے اندر ۳۸۴ ق.م میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ نیقوماخس (NICOMACHOS) شاہ مقدونیہ کا طبیب تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ایتھنز آیا اور افلاطون کے حلقۂ درس میں داخل ہوا۔ سریانیوں میں اور ان کی تقلید میں مسلمانوں کے یہاں مشہور تھا کہ اس کے باپ نے بوثیون کے ہیکل میں وحیِ آسمانی سنی جس کے اندر اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ ارسطو کو لے جا کر افلاطون کے سپرد کر دے۔ چنانچہ ابن القفطی نے بطلیموس الغریب سے روایت کی ہے:

قال بطلیموس الغریب ان تسلیم ارسطوطالیس الی افلاطون کان بوحی من اللہ فی هیکل بوثیون۔

بطلیموس الغریب نے لکھا ہے کہ ارسطو کے باپ نے اسے افلاطون کی شاگردی میں وحیِ الٰہی کے مطابق داخل کیا تھا جو اس نے بوثیون کے مندر میں سنی تھی۔

افلاطون کے مدرسہ میں وہ اس کی وفات تک رہا۔ ابن القفطی اس زمانۂ تعلیم کو بیس سال بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ جب افلاطون صقلیہ گیا تھا تو اس کی عدم موجودگی میں اکادیمیا کے اندر اس کے نائب کی حیثیت سے تعلیم

---

[۵۳] ابن القفطی: تاریخ الحکما، ص ۳۲

تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔[۵۴]

۳۴۲ ق م میں وہ مقدونیہ کے دربار میں اسکندر کی تعلیم کے لیے بلایا گیا اور وہاں اس وقت تک مقیم رہا، جبکہ اسکندر ایشیائی فتوحات کے لیے روانہ ہوا۔ ابن القفطی نے روایت کی ہے کہ وہ سکندر کا وزیر مشیر تھا اور اس کی ہدایت کے مطابق سکندر سلطنت کا انتظام کرتا تھا۔ اسی کے مشورے سے بادشاہ نے ملک میں شرک و بت پرستی کا استیصال کیا، نیک باتوں کی اشاعت کی اور عدل و انصاف کا بازار گرم کیا۔ ارسطو نے اسکندر کو بہت سے خطوط لکھے تھے جو بعد میں مدون کیے گئے۔[۵۵] ان خطوط کے ایک مجموعہ کا دوسری صدی ہجری کے آغاز میں اموی دربار کے ایک کاتب سالم بن سطا نے عربی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔[۵۶]

ارسطو ۳۳۴ ق م میں ایتھنز واپس آیا اور لائیسیئن اپولو کے جمنازیم میں اپنا مدرسہ کھولا جو (LYCEUM) PERIPATETIC SCHOOL کہلایا، کیونکہ وہاں ارسطو ٹہل ٹہل کر درس دیا کرتا تھا اور اسی لیے اس کے متبعین "مشائیہ" کہلاتے ہیں۔

ارسطو نے ۳۲۲ ق م میں وفات پائی۔

ارسطو افلاطون کے شاگردوں میں سب سے ممتاز تھا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:[۵۷]

وکان افلاطون یوثرہ علی سائر تلامیذہ و یسمیہ العاقل۔

افلاطون، ارسطو کو اپنے سارے شاگردوں پر ترجیح دیتا تھا اور اس کو دانش مند کے نام سے یاد کیا کرتا تھا۔

ارسطو نہ صرف عالمی فلسفہ و حکمت کی تاریخ میں اہم ترین شخصیت ہے، اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں بھی اونچا مقام رکھتا ہے۔

چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

---

۵۴ ابن القفطی: تاریخ الحکماء ص ۲۲ : ومکث فی التعلیم عشرین سنۃ فانہ لما غاب افلاطون الی صقلیہ، کان ارسطو طالیس یخلفہ علی دار التعلیم۔

۵۵ ایضاً ص ۲۹ : وکان ارسطو طالیس معلم الاسکندر بن فیلبس ملک مقدونیہ وبآدابہ عمل فی سیاسۃ رعیتہ وسیرۃ ملکہ و انقمع بہ الشرک فی بلاد الیونانیین وظہر الخیر وفاض العدل ولارسطو طالیس الیہ رسائل کثیرۃ معروفۃ مدونۃ۔

۵۶ ابن الندیم: کتاب الفہرست

۵۷ قاضی صاعد الاندلسی: طبقات الامم

والى ارسطاطاليس انتهت فلسفة اليونانيين وهو خاتم حكمائهم وسيد علمائهم [58]

اور ارسطو پر یونانیوں کا فلسفہ ختم ہوگیا۔ وہ ان کے حکما کا خاتم اور ان کے علما کا پیشوا ہے۔

مسلمانوں میں یونانی حکمت اور ارسطو مترادف سمجھے جاتے تھے، چنانچہ جب خلیفہ مامون کا میلان فلسفہ کی جانب حد سے زیادہ ہوگیا تو خواب میں اس نے جس حکیم کو شکل اختیار کی وہ ارسطو ہی تھا [59] یہی وجہ ہے کہ جب امام غزالی نے فلسفہ کا رد کرنا چاہا تو یونانی فلسفہ کے بے شمار اساطین میں سے انھوں نے اس کام کے لیے صرف ارسطو ہی کے فلسفہ کو منتخب کیا، جیسا کہ "تہافت الفلاسفہ" کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

ليعلم ان الخوض في حكاية اختلاف الفلاسفة تطويل ... فلنقتصر على اظهار التناقض في رأى مقدمهم الذى هو الفيلسوف المطلق والمعلم الاول فانه رتب علومهم وهذبها بزعمهم وحذف الحشو من آرائهم وانتقى ما هو الاقرب الى اصول اهوائهم وهو ارسطاطاليس [60]

جاننا چاہیے کہ فلاسفہ (یونان) کے اختلافات میں غور و خوض تطویل لاطائل ہے ... لہذا ان کے پیشوا کی رایوں میں جو تناقض ہے ہم اسی کے اظہار پر اکتفا کریں گے۔ یہ پیشوا ارسطو ہے جو فلسفی علی الاطلاق اور معلم اوّل ہے۔ اسی نے ان کے علوم کو مرتب کیا اور ان کے گمان کے مطابق اس کی تہذیب کی، نیز اس نے حشو و زوائد کو حذف کیا اور جو چیز ان کے اصولی مزعومات و مظنونات کے قریب ہے اسے منتخب کیا۔ او وہ عظیم فلسفی ارسطو ہے۔

یوں بھی قسام ازل نے یہ شرف ارسطو ہی کے لیے مقدر کیا تھا کہ اس کے فلسفیانہ نظام کو یہ دیرپائی نصیب ہو۔ ارسطو کے بعد بھی یونان میں مشاہیر فلاسفہ پیدا ہوئے جیسے تاؤفرسطس، اسکندر افرودیسی، ثامسطیوس اور خود اسلامی فکر میں ابونصر فارابی۔ مگر ان افاضل نے باوجودیکہ ان میں کا ہر فرد اپنے عہد کا مفکر اعظم تھا، اپنی مساعی کو معلم اوّل (ارسطو) کی تعلیمات کی توضیح و تبیین تک ہی محدود رکھا اور جن لوگوں نے ارسطو کی فکری شاہراہ سے ہٹ کر نئی شاہراہیں اختیار کیں جیسے زینون رواقی، کریسفورس، ابیقورس، کرنیاڈیز، فلاطینوس، فرفوریوس ایامبلیکس وغیرہم، ان کو عظمت کے باوجود ان کے فکری نظاموں کو دیرپائی نصیب نہ ہوسکی۔

---

[58] قاضی صاعد اندلسی: طبقات الامم

[59] ابن الندیم: کتاب الفہرست

[60] امام غزالی: تہافت الفلاسفہ

ارسطو کی منطقی تصانیف

لیکن ارسطو کا سب سے بڑا کارنامہ علمِ منطق کی تنظیم و تدوین ہے اور اسی لیے وہ مسلمانوں میں "صاحب المنطق" کہلاتا تھا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:

هو اول من خلص صناعة البرهان من سائر الصناعات المنطقية وصورها بالاشكال الثلاثة وجعلها الة للعلوم النظرية حتى لقب صاحب المنطق وله في جميع العلوم الفلسفية كتب شريفة كلية وجزئية [۱]

وہ پہلا فاضل ہے جس نے منطق کی دوسری صنعتوں سے فن برہان کو علیحدہ کر کے منظم کیا اور اس کی تین شکلیں قائم کیں اور اسے دیگر علومِ نظریہ کا آلہ بنایا، یہاں تک کہ وہ "صاحب المنطق" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس نے تمام علومِ فلسفیہ میں نہایت اچھی کتابیں تصنیف کیں خواہ وہ علوم کلی ہوں یا جزئی۔

لہٰذا اس کی عظمتِ فکر سے متاثر ہو کر جاحظ نے جب اس کی کاوشوں کا عہدِ اسلام کے فلاسفہ منطقیین سے مقابلہ کیا تو اسے اعتراف کرنا پڑا:

فمتى كان رحمه الله تعالى ابن البطريق وابن ناعمة وابو قرة وابن فهر وابن وهيلي وابن المقفع مثل ارسطوطاليس [۲]

مشاہیر منطقیین اسلام ابن البطریق، ابن ناعمہ، ابوقرہ، ابن فہر، ابن وہیلی اور ابن المقفع ارسطاطالیس جیسے کب ہو سکتے ہیں۔

ارسطاطالیسی عبقریت کا سب سے بڑا مظہر علمِ منطق کی تنظیم و تدوین ہے، جس کا ان سے پہلے نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ چنانچہ وہ خود اپنی کتاب "سوفسطیقا" میں کہتا ہے، جیسا کہ قاضی صاعد اندلسی نے اس سے نقل کیا ہے:

واما صناعة المنطق وبناء السلوجيسموس فلم نجد فيما خلا اصلاً متقدماً يبنى عليه - لكنا وقفنا على ذلك بعد الجهد الشديد والتعب الطويل - فهذه الصناعة وان كنا نحن ابتدعناها فقد حصنا جهتها وزممنا اصولها ولم نفقد شيئاً مما ينبغي ان يكون موجوداً فيها كما فقدت الاوائل الصناعات لكنها كاملة مستحكمة متينة

---

[۱] طبقات الامم

[۲] التراث الیونانی فی الاسلام

اساسها مزعومة قواعدها وثيق بنيانها معروفة غاياتها واضحة اعلامها[۱۳]

جہاں تک علم منطق اور سلوجسموس بنانے کا تعلق ہے تو گزشتہ زمانہ میں ہمیں کوئی ایسی بنیادی شال نہیں ملی جس پر اس علم کی بنیاد رکھی جاتی، لیکن سخت کوشش اور پیہم محنت کے بعد ہمیں اس علم کے دریافت کرنے اور اسے منظم و مدون کرنے کی توفیق ہوئی۔ لہٰذا اگرچہ اس علم کو ہمیں نے پہلی مرتبہ ایجاد کیا ہے، مگر ہم نے اس کی مختلف جہات کو محفوظ کر دیا ہے اور اس کے مختلف اصول کو منظم کر دیا ہے، ہم نے اس فن کی کسی ایسی بحث کو نہیں چھوڑا جس کا ہونا مستحسن ہے، جس طرح متقدمین نے اس علم کو چھوڑ دیا تھا، اس کے برعکس ہماری تدوین کے بعد یہ فن کامل اور مستحکم ہوگیا ہے، اس کی اساس مضبوط ہے، اس کے قواعد منظم ہیں، اس کی بنیاد قابلِ اعتماد ہے، اس کی غرض وغایت معلوم و معروف ہے اور اس کی نشانیاں واضح ہیں۔

صناعت منطق کے سلسلے میں ارسطو نے جو کتابیں لکھی تھیں، مسلمان منطقیوں میں [اور غالباً ان سے قبل متاخر یونانی شارحین ومفسرین میں بھی] ان کی تعداد آٹھ تسلیم کی جاتی ہے۔ چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے:

واما الكتب التى فى الآلات المستعملة فى علوم الفلسفة فهى كتبه الثمانية المنطقية التى لم يسبقه احد ممن علمناه الى تاليفها ولا تقدمه الى جمعها۔

رہیں وہ کتابیں جو علوم فلسفیہ میں مستعمل ہونے والے آلات پر ہیں تو وہ اس کی منطق کی آٹھ کتابیں ہیں جن کی تالیف و تدوین کی جانب جہاں تک ہمارا علم ہے کسی نے سبقت نہیں کی اور نہ کسی نے اس سے پہلے انھیں جمع کیا۔

ابن الندیم نے "کتاب الفہرست" میں "الکلام علی کتبه المنطقیة" کے زیرِ عنوان ان کے نام بدیں طور ثبت کیے ہیں[۱۴]:

۱۔ قاطیغوریاس	(CATEGORIAE)	یا کتاب المقولات
۲۔ باری ارمینیاس	(DE INTERPRETATIONE)	یا کتاب العبارة
۳۔ انالوطیقا	(ANALYTICA PRIOR)	یا کتاب القیاس
۴۔ ابودیقطیقا	(APODEICTICA)	یا کتاب البرہان

۱۳۔ طبقات الامم

۱۴۔ ابن الندیم: کتاب الفہرست

۵۔ طوبیقا (TOPICA) یا کتاب الجدل

۶۔ سوفسطیقا (SOPHISTIS) یا کتاب الحکمۃ المموہہ

۷۔ ریطوریقا (RHETORICA) یا کتاب الخطابہ

۸۔ بوطیقا (POIETICA) یا کتاب الشعر

مسلمانوں کے فلسفیانہ ادب میں ان "کتب ہشتگانہ" کا قدیم ترین حوالہ مشہور عرب فلسفی الکندی کی کتاب "فی کمیۃ کتب ارسطا طالیس وما یحتاج الیہ فی تحصیل الفلسفۃ" میں ملتا ہے۔ پہلے تو وہ ارسطا طالیسی تصانیف کو چار بڑی قسموں یعنی منطقیات، طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات میں تقسیم کرتا ہے۔ پھر وہ منطق کی ان کتب ہشتگانہ کو متعارف کراتا ہے[۵]

الکندی سے زیادہ منطقی انداز میں فارابی جو اس کی وفات کے کوئی آٹھ دس سال بعد پیدا ہوا تھا منطق کے آٹھ اجزا کے یونانی اور عربی ناموں کو گنا تا ہے۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں ان کے محتویات کی شرح و تفصیل بیان کرتا ہے[۶]

---

[۵] رسالۃ الکندی فی کمیۃ کتب ارسطو طالیس مشمولہ رسائل الکندی۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالہادی ابو ریدہ نشر کردہ دارالفکر العربی بمصر ۱۹۵۰ء، ص ۳۶۴ - ۳۶۸ نیز، ص ۳۷۹ - ۳۸۲ -

[۶] ابونصر الفارابی: احصاء العلوم، مرتبہ: ڈاکٹر عثمان امین استاذ تاریخ الفلسفہ بکلیۃ الآداب بجامعۃ فؤاد الاول، مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد بمصر ۱۹۴۹ء، ص ۷۰ - ۷۲ -

سبط الحسن ضیغم

کشف المحجوب ــــــ ایک مطالعہ

حضرت شیخ ہجویری نے متعدد کتب رقم کیں، جن کا تذکرہ انھوں نے خود اپنی غیر فانی تخلیق کشف المحجوب میں بھی کیا ہے، اور اس وقت صرف کشف کی اس شہادت کی بنیاد ہی پر یہ نام سامنے آئے ہیں، مگر اب ان میں سے کوئی بھی کتاب دستیاب نہیں ہوئی اور نہ ان کے مخطوطے ہی دنیا کی کسی لائبریری میں موجود ہیں۔ البتہ کشف الاسرار کے نام سے ایک رسالہ کئی بار شائع ہو چکا ہے جسے ان کی تصنیف بتایا جاتا ہے مگر اس کی داخلی شہادتوں سے اس عہد کے محقق جناب حکیم محمد موسیٰ چشتی امرتسری نے اسے جناب ہجویری کی تصنیف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

کشف المحجوب دنیائے تصوف میں ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اور بعض اہلِ قلم کے نزدیک یہ کتاب رسائل قشیریہ کے مقابلے میں "ایک مستند محققانہ تصنیف" ہے۔

دنیائے تصوف کی یہ وہ اہم دستاویز ہے جو مدینۃ الاولیا و العلوم لاہور میں لکھی گئی، جو لسانیاتی مطالعہ کے نقطۂ نظر سے فارسی نثر کے عہدِ ساسانیاں یعنی دورِ اول سے متعلق ہونے کی وجہ سے فارسی ادبیات میں اہم مقام کی حامل ہے۔ اور ملک الشعرا ایران محمد تقی بہار کی یہی رائے ہے۔

مشہور روسی مستشرق زوکوفسکی نے اپنی مرتبہ کشف المحجوب میں ان ماخذوں کی بڑی محنت سے نشاندہی کی ہے، جن سے اس کتاب کی تصنیف میں مدد لی گئی ہے۔ ان میں تاریخ اہلِ صفہ، مولفہ ابو عبدالرحمن سُلمی (م ۴۱۲ھ) طبقات الصوفیہ، رسالۃ القشیریہ، کتاب محبت مؤلفہ عمر بن عثمان مکی (متوفی ۲۹۷-۲۹۶ھ) لمع فی التصوف مولفہ ابو نصر سراج، کتاب مقدسی، حکایاتِ عراقیاں وغیرہ شامل ہیں، اس کے علاوہ حضرت ہجویری نے تصانیف حسین بن منصور حلاج، رسائل ابو العباس سیاری، رسائل حکیم ترمذی، کتاب سماع، روایات مولفہ ابو الفضل ختلی، غلط الواحدین مصنفہ ابو محمد دیمی، تصحیح الارادہ مصنفہ جناب جنید بغدادی اور مراۃ الحکما وغیرہ سے بھی کشف لکھنے میں کماحقہٗ استفادہ کیا۔

آپ کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں نے آپ کی اس کتاب سے پوری طرح مستفید ہونے

کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ خواجہ فریدالدین عطار نے اپنی تالیف تذکرۃ الاولیا مرتب کرتے ہوئے سب سے زیادہ استفادہ کشف المحجوب ہی سے کیا مگر انھوں نے اپنے اس ماخذ کا جو حوالہ دینے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں کی، جس کی وجہ سے روسی مستشرق ژوکوفسکی کو ان الفاظ میں اس کا تذکرہ کرنا پڑا۔

شیخ عطار در تذکرۃ الاولیائے خود مکرر از کشف المحجوب ہجویری جلابی غزنوی استفادہ کردہ و موارد متعدد بدون ذکر ماخذ از اقتباساتی کردہ است۔[1]

شیخ عطار نے اپنے تذکرۃ الاولیا میں کشف المحجوب ہجویری جلابی غزنوی سے کئی بار استفادہ کیا ہے اور ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر کئی مطالب کے ان سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔

ملک الشعرا بہار نے اس کا تذکرہ یوں ضروری سمجھا:

عطار ظاہراً از کتاب کشف المحجوب استفادہ کردہ است و غالباً عبارات آن بدون ذکر خود کتاب یا مؤلف با اندک تصرفی کہ تبدیل کہنہ بہ نو باشد نقل نمودہ است۔[2]

عطار نے ظاہری طور پر کشف المحجوب سے استفادہ کیا ہے اور کتاب یا مؤلف کا ذکر کیے بغیر معمولی تبدیلی کے ساتھ جو پرانے کو نئے میں بدلنے کی مانند ہے، اکثر عبارتیں وہاں سے نقل کی ہیں۔

مشہور مستشرق اے جے آربری مرحوم نے تذکرۃ الاولیا کے انگریزی ترجمہ میں "تعارف" میں جو الفاظ لکھے ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے:

جناب ہجویری کا حوالہ دیئے بغیر کئی پیرے نقل کیے ہیں۔ جب کہ جناب ہجویری نے اسے خود فارسی میں لکھ کر نئے سرے سے لکھنے کو آسان بنا دیا تھا۔[3]

اس کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے نفحات الانس میں، خواجہ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ) نے اپنے مکتوبات میں، سید اشرف جہانگیر سمنانی کے ملفوظات لطائف اشرفی مرتبہ نظام غریب یمنی، خواجہ محمد پارسا (م ۸۲۲ھ) نے اپنی تصنیف فصل الخطاب میں، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے اپنی تصانیف میں، شاہزادہ محمد دارالشکوہ نے سفینۃ الاولیا میں، مفتی غلام سرور لاہوری نے حدیقۃ الاولیا اور خزینۃ الاصفیا میں، نائب الصدر حاج میرزا معصوم بن رحمت علی شاہ قزوینی (متوفی ۱۳۴۴ھ) نے طرائق الحقائق میں اور متعدد ایرانی دانشوروں نے نامۂ دانشوران میں جابجا کشف المحجوب کے

---

[1] ص ۶۰ [2] ص ۲۶۰۔ جلد دوم۔ سبک شناسی یا تاریخ تطور نثر فارسی [3] ص ۱۶

حوالے دیئے ہیں۔

اس قدر اہم اور عظیم تخلیق کی اشاعت میں پاک و ہند کے مقابلے میں ہند بھر میں بخل سے کام لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد میں اسے شائع کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ ایل۔ ایس ڈیوگن نے اپنے مقالہ کشف المحجوب مطبوعہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ جلد ۹ ۱۹۴۲ میں جن فارسی مطبوعہ نسخوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک تو مطبع پنجابی لاہور میں ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا، جب کہ بہاولپور پریس لاہور سے شائع ہونے والے فارسی متن کا انھوں نے سنِ اشاعت ۱۹۰۳ء لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مطبع اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور سے متذکرہ بالا نسخہ ۱۹۲۳ء میں اور ایک اور ایڈیشن رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ البتہ مطبع نامی گرامی حرمت شد سلیبانوف (سمرقند) سے ۱۹۱۲ء میں ایک نسخہ انتہائی اہتمام اور شوق سے شائع کیا گیا۔ لیکن اس سلسلے میں اہم ایڈیشن وہ ہے جو پروفیسر ژوکوفسکی نے مرتب کیا اور لینن گراڈ (روس) سے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا گیا۔ یہی نسخہ ادارہ انتشارات امیر کبیر تہران سے ۱۳۳۶ھ میں فاضل محمد لوی عباسی کی تہذیب کے ساتھ شائع ہوا۔

نامی پریس لاہور سے تقریباً ۱۹۶۰ء میں شائع ہونے والا ایڈیشن ۲۸ صفحات پر مشتمل وضاحتی فہرست کے باوجود ناقص ہے۔ مگر ۱۹۷۸ء میں احمد ربانی نے جو ایڈیشن شائع کیا، وہ اشاعت وطباعت اور کتابت کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کے ناشر احمد ربانی کے نزدیک اس ایڈیشن کو اس نسخے سے نقل کیا گیا ہے جو حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے ۶۶۴ھ میں کتابت کیا تھا؛ جیسا کہ اس کے آخری صفحہ پر بہاء الدین ذکریا کے دستخط موجود ہیں۔

العزیز بہاولپور کے فروری ۱۹۴۵ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں کشف المحجوب کے کسی ایسے مخطوطے کا تذکرہ کیا گیا تھا جو حضرت زکریا ملتانی نے خود کتابت کیا تھا، جس سے اس گمان کو تقویت ملتی ہے کہ جناب زکریا ملتانی نے یقیناً کشف المحجوب کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہوگا، تو پھر کیا متذکرہ نسخہ وہی ہے اور اگر وہی ہے تو یہ نسخہ یقیناً انتہائی اہم اور قابل قدر ہے۔ مگر محققین اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، چنانچہ مولوی نور محمد فریدی کی تحقیق اس سلسلے میں حسبِ ذیل ہے:

حال ہی میں جناب احمد ربانی صاحب نے محکمہ اوقاف کی اعانت سے کشف المحجوب کا ایک فارسی نسخہ طبع کرایا ہے

ان کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کی ڈھنڈیا پڑ رہی ہے۔ انھوں نے اس نسخے کے پہلے اور آخری صفحے کا عکس بھی دیا ہے مگر اسے حضرت شیخ الاسلام سے منسوب کرنے میں چند اشکال حائل ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر تاریخ ارقام ۶۶۴ھ درج ہے حالانکہ حضرت کا سنِ وصال بالاتفاق ۶۶۱ھ ہے۔ دوسرے یہ کہ دستخط کی عبارت بہار الدین زکریا پر مشتمل ہے، لیکن حضرت شیخ الاسلام کا نام صرف زکریا ہے۔ ابومحمد کنیت اور بہار الدین لقب ہے۔ کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ اپنے قلم سے لقب نہیں لکھا کرتا، چہ جائیکہ حضرت شیخ الاسلام جیسی منکسر المزاج شخصیت اپنے نام سے پہلے بہار الدین لکھنا پسند کرتی۔ لہٰذا اس قلمی نسخے کا حضرت سے انتساب صحیح نہیں ہے[۴]

جناب زکریا کی وفات بالاتفاق ۶۶۱ھ نہیں ہے۔ اس بارے میں مختلف رائیں ہیں، جیساکہ دارا شکوہ کے نزدیک آپ کی وفات ۶۶۶ھ میں ہوئی۔ گویا تاریخ کتابت کے ایک سال بعد وصال ہوا۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ بہارالدین اور ذکریا دونوں غلط لکھے گئے ہیں، کیونکہ بہاءالدین کے درمیان واؤ کی بجائے ہمزہ ہوتا ہے۔ اور جبکہ اس نسخے میں بہا اور الدین کے درمیان ہمزے کی بجائے واؤ پڑی ہوئی ہے۔ اور اسی طرح زکریا ز کی بجائے ذال سے لکھا ہوا ہے۔ ایسی فاحش غلطی کا امکان حضرت شیخ الاسلام سے ناممکن ہے۔ ۶۶۶ھ کے بارے میں حکیم محمد موسیٰ یوں رقم طراز ہیں:

اگر ۶۶۶ھ ہی صحیح قرار دے دیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر ۹۵ برس سے کچھ اوپر ہوگی۔ کیا اس عمر میں وہ اتنی ضخیم کتاب کی نقل کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے؟ ...[۵]

اور ہماری طرف سے ایک اور بات کا اضافہ کر لیجیے کہ اگر یہی بات ہوتی کہ متذکرہ نسخہ ۶۶۴ھ میں رقم کیا جاتا، تو مولوی محمد شفیع اس بارے میں یقیناً روشنی ڈالتے، حالانکہ یہ نسخہ ان کی لائبریری سے متعلق ہے۔ اور وہ مخطوطات کی پرکھ کے معاملے میں حافظ محمود شیرانی کے ہم پلّہ تھے۔ وہ اس نسخے سے پاک و ہند کے قارئین ہی کو آگاہ نہ کرتے بلکہ یورپ کے مستشرقین کے نوٹس میں بھی یہ بات لاتے کہ جناب زکریا ملتانی کا مکتوبہ نسخہ مل گیا ہے۔ مگر ان کی کوئی تحریر اس مخطوطے کے بارے میں موجود نہیں ہے۔

کشف المحجوب ایسی کتاب ہے جس کے مخطوطے ذاتی اور دنیا کی مشہور لائبریریوں میں بھی ہیں۔ ان میں موجود نسخوں میں ایک وہی ہے جو پروفیسر ژوکوفسکی کے سامنے رہا ہے۔ فلوگل اس کے بارے میں

---

[۴] ص ۸۶ - ۱۸۵ - تاریخ ملتان جلد اوّل
[۵] ص ۴۶ - مقدمہ - کشف المحجوب المعارف ایڈیشن اوّل

کہتے ہیں کہ اس کی کتابت نویں صدی ہجری میں ہوئی۔ یہ نسخہ وی آنا کے سرکاری کتب خانے میں موجود ہے۔ پیٹرز برگ یونیورسٹی لائبریری میں ۱۰۰۱ھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ بھی موجود ہے۔ جناب ایشیاں نقشبندی (لاہور میں مدفون ہیں) ان بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے لاہور میں نقشبندی فکر و نظر کی آبیاری کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا کشف المحجوب کا نسخہ کراچی میں عبدالعزیز کے پاس ہے، جس پر اُن کی مہریں بھی موجود ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی ایک اہم مخطوطہ موجود ہے۔ لیکن ان سب سے اہم مخطوطہ وہ ہے۔ جو حکیم محمد موسیٰ چشتی امرتسری نے چند سال پیشتر کابل سے خریدا۔ یہ نسخہ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے مشہور مرید اور خلیفہ عبدالغفور لاری کی تحریر معلوم ہوتا ہے۔

دارا شکوہ ان کے بارے میں سفینۃ الاولیا میں لکھتے ہیں کہ وہ مولانا جامی کے مرید کامل اور شاگرد رشید ہیں۔ انھوں نے تکملہ نفحات الانس اور حاشیہ شرح ملّا لکھیں۔ ۵ شعبان ۹۱۲ھ کو فوت ہوئے۔

متذکرہ نسخے میں مولانا لاری کا اہم اوراق پر لکھا ہوا ایک اہم مقدمہ بھی ہے۔ جسے تصوف پر ایک مستقل کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ علاوہ ازیں کشف المحجوب میں جا بجا حواشی بھی درج ہیں۔ فن کتابت کے نقطۂ نظر سے یہ نسخہ انتہائی اہم ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مولانا لاری کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے یا ان کے نسخے کی نقل ہے۔

اس مخطوطے سے ملحقہ کاغذوں پر ایسی تحریریں موجود ہیں، جو اسے دو سو سال پہلے لے جاتی ہیں۔ اندازِ تحریر، اعراب اور نقطوں کا انداز بھی تین صدی سے پیشتر والا ہے۔ جلد پر متعدد ایسی مہریں ہیں جو ابھی تک پڑھی نہیں جا سکیں، جنھیں کتب فروش نے چھپانے کی کوششیں کی ہیں، جس سے وہ شاید حقِ ملکیت کو مٹانا چاہتا تھا۔ کاغذ اور سیاہی کی قدامت بھی ہمیں تین چار صدیاں پہلے لے جاتی ہیں۔ دنیا کی کسی بھی لائبریری میں مولانا لاری کے اس نسخے کی اصل یا نقل موجود نہیں ہے۔ گویا یہ دنیا میں پہلا اور واحد نسخہ ہے۔ اگر تکملہ نفحات الانس اور حاشیہ شرح ملا یا ان کی کسی تحریر کا کوئی ایسا عکس مل جائے جس سے اس نسخے کا تقابل کیا جا سکے تو اس بارے میں بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ ہمیں یوں ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ مولانا لاری کے اپنے ہاتھ ہی کی تحریر ہے۔ بہر حال ابھی تک اس سے زیادہ حتمی بات کرنا مشکل ہے کہ اس نسخے کی کتابت تین ساڑھے تین سو سال سے بہر حال پیشتر ہوئی ہے اور محقق حضرات کے لیے اس بارے میں ایک دعوتِ تحقیق و جستجو موجود ہے۔

کشف المحجوب کا انگریزی میں صرف ایک ترجمہ موجود ہے، جو فاضل پروفیسر نکلسن نے کیا۔ وہ پہلی بار ۱۹۱۱ء میں گب میموریل لندن سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء، ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۷ء میں بھی یہی ترجمہ شائع ہوتا رہا ہے، اور مقامِ مسرت ہے کہ اب لاہور میں تصوف پر کتب شائع کرنے والے اشاعتی ادارے المعارف نے اسے جناب ہجویری کے گزشتہ عرس پر شائع کر دیا ہے، جس میں مشہور نومسلم صوفی اور ذوقی شاہ مرحوم کے خلیفہ شہید اللہ مرحوم کا مبسوط دیباچہ بھی شامل ہے۔ پاکستان کی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان پنجابی میں اس کا ترجمہ فارسی اور پنجابی کے مشہور استاد فاضل شریف کنجاہی نے کیا ہے جو تاحال زیورِ اشاعت سے آراستہ نہیں ہوا، مگر اردو میں اس کے بیس کے قریب تراجم ہیں جو تمام کے تمام لاہور ہی سے شائع ہوتے ہیں۔ مدینۃ العلوم والاولیا لاہور میں مدفون اس عظیم صاحبِ قلم کی غیر فانی تخلیق کے اردو تراجم کو بھی دہلی، لکھنو اور حیدر آباد کے اشاعتی اداروں نے شائع نہیں کیا۔ بہرحال اس کے معروف اردو ایڈیشن حسبِ ذیل ہیں:

مولوی فیروز ڈسکوی نے بھی اس کا ترجمہ کیا اور یہ بات عرفِ عام ہے کہ مولوی فیروزالدین کے نام سے شائع ہونے والا ترجمہ مولوی فیروز ڈسکوی ہی کا ہے ـــــ ترجمہ شمس الہندی ایزدی۔ شائق کے نام سے بھی لکھتے تھے۔ غالباً ترقی بن شائق کے بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے ـــــ مولوی محمد حسین مناظر کا ترجمہ شیخ الٰہی بخش جلال الدین نے شائع کیا۔ یہ بزرگ ضلع گوجرانوالہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پنجابی نما اردو میں اچھا ترجمہ ہے۔

ظہیر احمد ظہیری بدایونی کا ترجمہ ظہیر المطلوب ترجمہ کشف المحجوب حاجی چراغ الدین سراج الدین کشمیری بازار نے شائع کیا۔

مولوی غلام معین الدین نعیمی مراد آبادی کا ترجمہ کشف المحجوب نوری کتب خانہ لاہور اور مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی نے شائع کیا۔

پروفیسر عبدالمجید یزدانی کا ترجمہ گنج مطلوب کے نام سے ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا جو نسخہ ژوکوفسکی، کا ترجمہ ہے اور بہتر انداز میں ہے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز نے دو ترجمے شائع کیے۔ جن میں سے ایک نشتر جالندھری نے کیا۔

ایف ڈی گوہر نے احمد ربانی والے نسخے کا ترجمہ کیا جو احمد ربانی نے شائع کیا۔ المعارف نے مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری کا ترجمہ شائع کیا جس میں حکیم محمد موسیٰ چشتی امرتسری کا جامع اور مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ ترجمہ کے لحاظ سے مولوی فیروزالدین، پروفیسر عبدالمجید یزدانی، ایف ڈی گوہر اور مولانا ابوالحسنات والے تراجم بہتر ہیں، جبکہ مقدمہ اور دیباچہ کے لحاظ سے پروفیسر یزدانی والا ایڈیشن اور المعارف والا ایڈیشن بہتر ہیں۔

محمد بشیر ایم اے

شاہ اسمٰعیل شہید ــــــ مشاہیر کی نظر میں

مجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ایمان افروز مساعی سے لاکھوں گم گشتگانِ راہِ حق شرک کے مہلک گرداب اور بدعات کے دامہائے خوش رنگ سے نکل کر جادۂ "تقویۃ الایمان" اور "صراط مستقیم" پر گامزن ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ یہ جامع الصفات ہستی اپنے روشن کردار کے باعث زندۂ جاوید ہے۔ اہلِ نظر بے اختیار اس کی عظمت اور جامعیت کا اعتراف کرتے اور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ سطور ذیل میں چند مشاہیر کے رشحات اسی ضمن میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

سید احمد شہیدؒ کا تبلیغی قافلہ جب لکھنؤ پہنچا تو وہاں کے ایک دین دار بزرگ منشی خیر الدین نے ایک استفتا مولانا عبدالحیؒ بڈھانویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی خدمت میں پیش کیا، جس پر بعض علما نے حج کی عدمِ فرضیت کا فتویٰ دے رکھا تھا۔ مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل نے مدلل اور پُر زور طریقے پر اس کی مخالفت کی اور حج کی فرضیت کا فتویٰ لکھا، منشی صاحب موصوف نے یہ فتوے شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں دہلی بھیجے۔ منشی صاحب کے جواب میں سراج الہند شاہ عبدالعزیزؒ رقم طراز ہیں :

مشفقِ من ! . . . مضمونِ جوابِ ثانی تاج المفسرین، فخر المحدثین سرآمد علمائے محققین مولویین موصوفین مطابق و موافقِ احادیثِ قویّہ و کتبِ اصولِ فقہ معتبرہ، چنانچہ مقابل دستخطِ ایشاں تصحیح و مہرِ خود ثبت نمودہ شد، ملاحظہ فرمایند تا کہ اطمینانِ کلی خواہد گردید۔ و فرستادنِ استفتائے مذکور نزدِ فقیر در صورتِ بودنِ مہر و دستخط برخورداران ممدوحین احتیاجے نداشت، چرا کہ ایشاں در علمِ تفسیر و حدیث و فقہ و اصول و منطق وغیرہ از فقیر کمتر نیستند۔ مہر و دستخطِ ایشاں گویا دستخطِ ایں فقیر است و عنایت جنابِ باری عزّ اسمہٗ کہ شاملِ حال مولویین موصوفین است، شکرِ ایں نعمتِ عظمیٰ ادا کردن نمی توانم۔ حق جلّ و علیٰ زیادہ ازیں بہ مراتبِ عالی فائز گرداند و برائے اشخاصانِ مبینِ اصل شریعت جمیع مومنین در جنابِ الٰہی ہمیں دعا خواستن موجب نجاتِ اُخروی است۔

مخلصِ من ! مولویین ممدوحین را یکے از علمائے ربانی تصور دیدہ، اشکالے کہ افتتاحِ آں محال باشد

رو بروئے ایشاں پیش خواہند کرد۔ عنایت فرمائے من! اگرچہ ایں کلمات ناطق بر تعریف و توصیف خود تصور تواں کرد، لیکن اظہار امر حق ہم بر واقفان واجب ولازم است۔ لہٰذا چشم پوشی در حق مناسب ندانستیم و سردو استفتا بکف رقیمۂ ہذا می رسید واز و رسیدش تحت بیاخود۔ ایں وقت بسبب ضعف طبیعت بر ہمیں قدر اکتفا گردید۔ والاجمال عندھو سغن عن التفصیل واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل والسلام علیکم و بارک اللہ فی معاشکم و معادکم۔[۵]

مشفق من! . . . دوسرے جواب کا جواب تاج المفسرین، فخر المحدثین سر آمد علمائے محققین مولوی عبدالحی صاحب و مولوی اسمٰعیل صاحب کا لکھا ہوا ہے اور احادیث قویہ اور اصول فقہ کی معتبر کتابوں کے موافق ہے۔ چنانچہ ان کی مہر اور دستخط کے مقابل میں نے بھی اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ ملاحظہ فرمالیں تاکہ اطمینان کلی ہو جائے۔

ایسی صورت میں کہ عزیزان موصوف کی مہر اور دستخط موجود تھے، اس استفتا کے میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے کہ یہ دونوں علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول و منطق میں مجھ سے کم نہیں۔ ان کی مہر اور دستخط گویا میری مہر اور دستخط ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جو عنایت ان دونوں عزیز فاضلوں کے شامل حال ہے۔ اس نعمت عظمیٰ کا شکر مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ ان کو اس سے بھی بلند مراتب پر فائز فرمائے۔ ان لوگوں کے حق میں، جو اصل شریعت کے واضح کرنے والے ہیں، تمام مومنین کا حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرنا خود ان کے لیے نجات اُخروی کا باعث ہے

میرے دوست، مولوی عبدالحی اور مولوی اسمٰعیل کو علمائے ربانی میں شمار کرنا چاہیے اور جس اشکال کا حل ہونا دشوار و محال ہو وہ ان کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ میرے کرم فرما! ان کلمات سے بظاہر اپنی تعریف نکلتی ہے، لیکن امر حق کا اظہار واقفوں پر واجب ولازم ہے۔ لہٰذا حق کے معاملے میں چشم پوشی مناسب معلوم نہ ہوئی۔ دونوں استفتا اس خط کے ساتھ پہنچیں گے۔ ان کی رسید سے مطلع فرمایا جائے۔ اس وقت ضعف کی وجہ سے اتنے ہی پر اکتفا کی گئی۔ اور دونوں کے مجمل کلام کی موجودگی میں میری تفصیل کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے معاش و معاد میں برکت عطا فرمائے . . .“

---

[۵] سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہیدؒ، ج ۱، ص ۲۱۸، ۲۲۰

سرسید احمد خان محی السنۃ قامع البدعۃ مولانا مولوی محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں:

علم برکش اے آفتاب بلند خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دل رعد چوں کوس شاہ بخند اے لب برق چوں صبح گاہ
بباد اے ہوا قطرۂ تاب را بگیر اے صدف در کن ایں آب را
برآ اے دراز قصہ دریائے خویش بتاج اے سر شاہ کن جائے خویش

یعنی شاہ کشورِ شریعت گستری، ملک الملوک دیارِ دیں پروری، قامع بتانِ شرک وطغیان، حاویِ موجباتِ علم و ایقان، مؤسس اساسِ کمال، مہذب اوضاعِ حال و قال، سالک مسالکِ ہدایت وارشاد، مجلّیِ آئینہ صافی اعتقاد، مرکزِ دائرۂ علوم، منطقۂ آسمانِ فہوم، مرتقی مدارج درجاتِ عالی، پیشوائے ادانی و اعالی، مرجع و مآب فضائل، کامروائے طبائع فاضل، رموز فہم سرائر تفسیر قرآنی، دقیقہ یابِ معالم تقدیراتِ ربانی، جامع کمالاتِ صوری و معنوی، نکتہ سنج کلامِ الٰہی و حدیثِ نبوی، قدوۂ اہالی پیش گاہِ قبول، جلال غوامض معقول و منقول، بانی و مبانی فضل و افضال، مہد قواعد تکمیل و اکمال، جاہد حق و یقین، مثبت دلائل دین، مولائی مخدوم الانامی مولوی محمد اسمعیل قدس سرہٗ . . . آپ کے آئینہ خاطر نے مصقلہ تائید الٰہی سے ایسی صفا اور جلا حاصل کی تھی کہ اسرارِ اجل بے حجاب آپ پر منکشف تھے . . . اکثر فضلائے کمال کہ دعویٰ کتاب دانی و دقیقہ شناسی کا رکھتے تھے، وہ مقاماتِ باریک کہ جن کے صاف کرنے میں روزگار دراز فکر کرنا چاہیے، آپ سے سرِراہ ملاقی ہو کر باعتبار ظاہر کے بطور مناظر کے اس کا استفسار کرتے، بایں لحاظ سے کہ اگر ان کے مکان پر جاویں گے تو شاید مطالعہ کتاب یا اعانتِ شروح اور حواشی سے اس کو بیان کریں، اور آپ بے تامل اس کو اس طرح سے تقریر فرماتے کہ ان کو اس جرأت سے کمال خجالت حاصل ہوتی۔

ذکر اس زبدۂ اربابِ کمال کا داعی ہے کہ ہزار ہزار محامد پسندیدہ کو زبان پر لا کر اندر کے آتشِ شوق کو تسکین دے :

گہر نثار کند بر سرِ زبان چشم مرا چو نام شریف تو بر زباں آید

لیکن کیا کرے کہ نہ زبان کو طاقتِ تقریر ہے اور نہ قلم کو یارائے تحریر۔ معقولات میں آپ کا تبحر وہم مثل یقینیات اور منقولات میں آپ کی تنہا نقل مانند متواترات . . . جی چاہتا ہے کہ آپ کے حالِ ہدایت اشتمال میں سے قدرے ہدیہ اربابِ کمال کیا جاوے تاکہ خلق ہو نا ایسے فردِ کامل کا نمونۂ قدرت

رب ذو الجلال سمجھا جاوے ۔ ۔ ۔ (حج سے فراغت کے بعد) ہندوستان کو مراجعت کرکے حضرت (سید احمد شہید) کی خدمت میں اطراف و جوانب میں بسر کی اور ہدایت و ارشاد سے عباد اللہ کو راہِ راست دکھلائی۔ اس اثنا کے احوال تو اس قدر ہیں کہ زبانِ قلم اس کے تصور سے شق ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ آخر میں بارشاد سید الطائفہ پیرِ طریقت کے احوالِ مردمِ شاہ جہان آباد کی طرف سے ملتفت ہوکر راہِ رشد و ہدایت کو وا کیا، اور وعظ و نصائح سے اہلِ غفلت کے کان کھول دیئے، جو جو مسائل کہ ان پر مواظبت کرنی ضروریاتِ دین سے تھی اور بہ سببِ سستی اور کاہلی علمائے وقت کے عوام روزگار کیا بلکہ خواص کے گوش و وہم تک بھی نہ پہنچے تھے، آپ کی سعی و جدو جہد سے سب پر کھل گئے اور آوازہ اعلامِ سنت اور ہدمِ بنیانِ شرک و بدعت کا وضیع و شریف کے کان تک پہنچ گیا۔ باوجودیکہ اربابِ مشیخت اور صاحبانِ تشخیص کہ سلسلۂ اعتقاد و سر رشتۂ ارادت خاص و عام ان کے ساتھ مستحکم تھا اور کسی کو ان کی مداہنت کا گمان نہ ہوتا تھا۔ اس گمان سے کہ اگر مسائل حقہ گوشِ مردمِ روزگار تک پہنچا تو ہمارے حق میں موجب ضعف کا ہو جائے گا، علمِ منازعت اور لوائے مخالفت بلند کرکے درپے اذیت و اہانت ہوتے، لیکن چونکہ (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) مؤید بتائید اللہ تھے، اس ہدایت و ارشاد سے باز نہ آئے اور خلق کو یہاں تک توفیق اختیارِ سنتِ نبوی اور ترکِ بدعات و محدثات کی ہوئی کہ ایک اور ہی طرح کا نور ہر ایک کی پیشانیِ احوال سے چمکنے لگا اور ان مفسدانِ مضل کا بازار کاسد ہو گیا اور لوگوں نے جان لیا کہ یہ بزرگ بطمع اخذ و جر کے امرِ حق کو آج تک چھپاتے رہے۔

اور بچشمِ خود دیکھا گیا کہ وضیع و شریف کو توفیق نماز کی ایسی ہوئی کہ مسجد جامع میں نماز جمعہ کے واسطے ایسی کثرت ہونے لگی جیسے عید گاہ میں نمازِ عیدین کے واسطے ہوا کرتی ہے، اور تائیدِ الٰہی اور ان کی صدقِ نیت اور خلوص طویت کی برکت سے الی الآن وہی حال چلا آتا ہے، اور یہ ثواب ان ہی حضرت کے جریدۂ اعمال میں لکھا گیا اور آج تک اس کا اجر ان کی روح پر فتوح کو پہنچتا جاتا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

آپ کی حسن تقریر سے وہ مسائل غامضہ کہ طالبِ علم کو بعد رد و قدح کے ذہن نشین ہو، جہلائے عامی کو مجرد استماع کے سمجھ آجاتے تھے اور اس طرح منقوشِ خاطر ہوتے تھے کہ مخالفین میں سے بعضے اہلِ علم چاہتے کہ کچھ دلائل علمی سے اس کا رد کرکے اس کے ذہن سے نکالیں، ممکن نہ ہوتا۔

جب یہ مطالب خوب چھن گئے، بموجب ارشادِ سید اصفیا یعنی پیر طریق ہدیٰ کے اس طرح سے تقریرِ وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ کی صیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینہ باطن مصفا اور مجلا ہوگیا اور اس طرح سے راہِ حق میں سرگرم ہوئے کہ بے اختیار چاہنے لگے کہ سر اُن کا راہِ خدا میں فدا ہو اور جان ان کی اعلائے لوائے دینِ محمدی میں صرف ہو . . . تائیدِ الٰہی سے ان حضرت کا رعب کفار کے دل میں ایسا متمکن ہوا کہ جس جگہ گروہِ قلیل غزاتِ مسلمین سے متوجہ ہوتا اور اس کا سرگروہ یہ حضرت ہوتے، لشکرِ کفار اگرچہ مور و ملخ سے زیادہ ہوتا ہے سروپا فراری ہوتا [52]

برصغیر پاک و ہند کے ممتاز و مقتدا عالمِ دین مولانا رشید احمد گنگوہی ایک استفتا کے جواب میں رقم فرما ہیں :

"مولوی محمد اسمٰعیل صاحب عالم متقی، بدعت کے اکھاڑنے والے اور سنت کے جاری کرنے والے اور قرآن و حدیث پر پورا عمل کرنے والے اور خلق کو ہدایت کرنے والے تھے - اور تمام عمر اسی حال میں رہے - آخر کار جہاد میں کفار کے ہاتھ سے شہید ہوئے - پس جس کا ظاہر حال ایسا ہووے - وہ ولی اللہ اور شہید ہے - حق اللہ فرماتا ہے :

ان اولیاءہ الا المتقون ہ

کوئی نہیں اولیا حق تعالیٰ سوائے متقیوں کے -

پس بموجب اس آیت کے مولوی اسمٰعیل ولی ہوئے اور حسبِ فحوائے حدیث : من قاتل فی سبیل اللہ فواق ناقتہ فقد وجبت لہ الجنۃ، کے وہ جنتی ہیں - سو ایسا جو شخص ہو کہ ظاہر میں ہر روز تقویٰ کے ساتھ رہا اور پھر حق تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوا وہ قطعی جنتی ہے اور مخلص ولی ہے . . . مولوی محمد اسمٰعیل شہید ولی مہبط رحمتِ حق تعالیٰ کے ہیں [53]

مؤلف "الیانع الجنی" شیخ محمد محسن بن یحییٰ ترہٹی رقم طراز ہیں :

کان من اذکی الناس بایامہ . . . وکان اشدھم فی دین اللہ واحفظھم للسنۃ یغضب لھا ویندب الیھا ویشنع علی البدع واھلھا . . ." [54]

---

[52] سر سید احمد خان - آثار الصنادید باب چہارم، ص ۹۷-۱۰۳، مطبوعہ سید الاخبار ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء

[53] مولانا رشید احمد گنگوہی - فتاوی رشیدیہ - ج ۳، ص ۴۹، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۲ء

[54] محمد محسن بن یحییٰ ترہٹی - الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی، ص ۱۰۹، مطبوعہ دہلی ۱۳۶۹ھ

شاہ اسمٰعیل شہید اپنے زمانے کے ذکی ترین انسان، اللہ کے دین میں بڑے مضبوط اور سنتِ رسول ؐ کے نگہبان تھے۔ وہ سنت کی حمایت ہی میں ناراض ہوتے اور سنت ہی کی طرف دعوت دیتے تھے اور سنت ہی کی خاطر بدعات اور اہلِ بدعات پر برافروختہ ہوتے۔

مولانا کرامت علی صاحب جون پوری تحریر فرماتے ہیں :

"مولانا اسمٰعیل صاحب اور مولوی عبدالحی رحمۃ اللہ علیہما بڑے دین دار اور تابع سنت تھے اور ظاہر و باطن کے علوم میں پکے کامل تھے۔ لوگوں کو ہمیشہ توحید اور سنت کی راہ بتلاتے تھے، اور شرک و بدعت کی بُرائی سناتے تھے، سارے ہندوستان اور بنگالے میں اسلام جو محض ضعیف ہو گیا تھا، انہی بزرگوں کی کوشش سے قوی و تازہ ہو گیا اور لوگ گھر گھر غازی بن گئے اور اکثر لوگ شرک و بدعت کو چھوڑ کر دین دار متقی ہو گئے اور کبھی ان بزرگوں کے قول و فعل سے کوئی امر خلافِ شرع کا آج تک ثابت نہ ہوا۔"[۵۹]

پاک و ہند کے ممتاز عالمِ دین مولانا محمد میاں ؒ رقم طراز ہیں :

"ملک و ملت کا وہ سرفروش مجاہد جس کا ہمس فلسفۂ ولی اللہ کی تفسیر تھا، اور جس کا ایثار قربانیٔ ذبیح اللہ کی زندہ تصویر! جس کا دل دولتِ درد سے مالا مال تھا اور جس کا جگر سوزِ محبت کا سرمایہ دار، جس کا علم ہم دوش عمل اور جس کا عمل آئینہ دارِ علمِ بے پایاں، آزادیٔ فکر کا سب سے بڑا حامی . . . غلامی کے ناپاک تصور سے ناآشنا، اس کی زندگی سعیٔ پیہم تھی، کتابِ زندگی کا آغاز بابِ جہاد سے ہوا اور اسی جہاد پر زندگی کا آخری ورق پلٹا گیا۔"[۶۰]

مولانا مرحوم ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :

"جس بات کو شاہ ولی اللہ صاحب نے اشاروں میں سمجھایا تھا، جس مفہوم کو شاہ عبدالعزیز صاحب نے غیر مطبوعہ تفسیر کی عبارتوں میں سمویا تھا، آپ نے کھلے بندوں اس کو واضح کیا اور اس کے ہر ایک پہلو پر روشنی ڈالی۔"[۶۱]

مصورِ پاکستان علامہ اقبال، اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

مجدد الف ثانی ؒ، عالمگیر ؒ، اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیا کی کوشش کی،

---

[۵۹] مولانا کرامت علی جون پوری، مقامع المبتدعین، ص ۲۲۹ بحوالہ تکفیری افسانے مصنفہ مولانا نور محمد، ص ۵۱۔ لاہور ۱۹۷۶ء

[۶۰] مولانا محمد میاں ؒ، علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ ج ۲، ص ۱۹۰، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۷ء [۶۱] ایضاً، ص ۱۹۶۔

مگر صوفیا کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔[۸]

مولانا غلام رسول مہر تحریر فرماتے ہیں :

"شاہ صاحب کی شجاعت، دلیری اور بہادری ستائش سے بالاتر ہے۔ وہ اپنی جان عزیز جس بلند مقصد کے لیے نذر کر چکے تھے، اس میں ہر قدم پر شہادت کا خطرہ موجود تھا، تاہم شاہ صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ گولیوں کی بارش میں انتہائی بے تکلفی سے جاتے تھے، دوسرے لوگ پھولوں کی بارش میں بھی اس طرح جانا گوارا نہ کریں۔"[۹]

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں :

"تیرھویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم و بدعات کا زور تھا، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا، جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دو بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی، جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔"[۱۰]

عالمِ اسلام کے مایہ ناز مفکر سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں :

"آپ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کے شجرۂ طوبیٰ کی ایک شاخ ہیں۔" "آپ وہ قابل شخص ہیں کہ جس قوم و ملک میں پیدا ہوتے اس کے لیے قابلِ فخر ہوتے، اسلام کے ان اولوالعزم، عالی ہمت، ذکی، جری اور غیر معمولی افراد میں ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔"[۱۱]

سید موصوف ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں :

الشیخ العالم الکبیر العلامۃ المجاھد فی سبیل اللہ الشھید اسماعیل ابن عبدالغنی بن ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدھلوی احد افراد الدنیا فی الذکاء والفطنۃ و الشھامۃ وقوۃ النفس والصلابۃ فی الدین ... وکان نادرۃ من نوادر الزمان و بدیعۃ من بدائع الحسان مقبلا علی اللہ علی قلبہ و قالبہ مشتغلا بالافادۃ والعبادۃ

---

۸ عطاء اللہ شیخ، اقبال نامہ ج ۲، ص ۴۷ ۹ غلام رسول مہر: جماعت مجاہدین، ص ۱۳۰، ۱۳۱

۱۰ ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید، ج ۱، ص ۲

۱۱ ایضاً، طبع دوم لکھنؤ (۱۹۴۱ء)، ص ۳۲۲ ۱۲ ایضاً، ص ۳۲۲، ۳۲۳

مع تواضع وحسن اخلاق وکرم وعفاف وشهامة نفس، وصلابة دين، وحسن محاضرة وقوة عارضه، وفصاحة ورجاحة، فاذا جالسه منحرف الاخلاق او من له في المسائل الدينية بعض شقاق جاء من سحر بيانه بما يؤلف بين الماء والنار، و يجمع بين الضب والنون فلا يفارقه الا وهو عنه راض ...؂[13]

عظیم عالم، علامہ، مجاہد فی سبیل اللہ اور بالآخر شہید راہِ حق جناب شیخ اسماعیل بن عبدالغنی بن ولی اللہ بن عبدالرحیم عمری دہلوی، ذہانت، تیزیٔ فہم، بہادری، قوتِ نفس اور دین پہ عمل میں مضبوطی عمل کے مالک رکھتے ۔ ۔ ۔ وہ زمانے کے نوادر میں سے ایک عظیم نادرۂ روزگار تھے، دل وجان سے شیدائے رب تھے۔ شائقین کی علمی رہنمائی، عبادت، تواضع، حسنِ اخلاق، سخاوت و پاک دامنی، شجاعت، دین میں مضبوطی، دقیق علمی مسائل پہ بے تامل ماہرانہ گفتگو، خطیبانہ قوت، فصاحت اور بے مثال قوتِ تاثیر ان کے عالی اوصاف تھے۔

جب کوئی شخص اخلاق سے گرا ہوا ہوتا یا دینی مسائل میں جھگڑے کرتا تو آپ اس سے ایسے ساحرانہ انداز میں گفتگو فرماتے کہ اس کو آگ اور پانی باہم جمع نظر آتے، وہ جب آپ کی مجلس سے اٹھتا تو اپنی تمام اکڑ بازیاں ختم کرکے آپ کا دم بھرتا ہوا جاتا ۔ ۔ ۔ "

برصغیر کے ممتاز عالمِ دین مولانا محمد منظور نعمانی رقم فرما ہیں:

"حقیقتوں کا پورا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، لیکن جہاں تک بشری معلومات اور اطلاعات کا تعلق ہے اپنی حد تک پورے اطمینان کے ساتھ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ و شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد تیرہویں صدی ہجری (اور انیسویں صدی عیسوی) میں ان کے اخلاف و وارثین حضرت شاہ اسمٰعیل شہید و حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقا نے اللہ کی راہ میں جو قربانیاں دیں اور اسلام کے فروغ اور اس کی سربلندی کے لیے جو محنتیں کیں، یہاں تک کہ بالاکوٹ کے معرکہ میں اسی راہ میں اپنی جانیں بھی قربان کر دیں، اور پھر ان کی محنتوں اور قربانیوں کا یہاں کے مسلمانوں پر جو اثر پڑا اور اس ملک میں دین کی جو تجدید ظہور میں آئی اور صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ اور روحِ جہاد اور اتباعِ سنت کی صفات میں خود ان بزرگوں کا جو حال تھا ان سب چیزوں کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ حضرات اس دور میں اللہ تعالیٰ کے خاص مقبول بندوں میں سے تھے۔"[14]

---

[13] ابی الحسن علی الحسنیؒ، ترجمۃ السید الامام احمد بن عرفان الشہید، ص ۲۲، ۲۳۔ مطبوعہ مطبعۃ المنار مصر، ۱۳۵۰ھ

[14] محمد منظور نعمانی، فیصلہ کن مناظرہ، ص ۷، فیصل آباد، ۱۹۶۴ء

مصنف "الحیاۃ بعد المماۃ" لکھتے ہیں :

"ان میں تمام باتیں اپنے حقیقی دادا شاہ ولی اللہ اور بڑے دادا حضرت عمرؓ کی موجود تھیں"[۱۵]

نامور اہلِ قلم سید صباح الدین عبد الرحمٰن رقم طراز ہیں :

"حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی علمی سرگرمیوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ اب اس کا وقت نہیں رہا کہ علما اربابِ رخصت بن کر مدرسوں میں درس دیتے رہیں اور محراب و منبر کی زینت بن کر صحیح عقائد کے اعلان پر قناعت کریں، بلکہ اس کا وقت آگیا ہے کہ اربابِ عزیمت بن کر اسلام کی عزت و ناموس کی پاسبانی کریں، مسلمان خواص و عوام دونوں کی بگڑی ہوئی معاشرت کو سنواریں اور کانٹوں کی راہ پر چل کر سر بکف اور کفن بردوش ہو جائیں۔

انھوں نے تجدیدِ اصلاح کی خاطر پہلے بدعتوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی، مسجدوں، عرسوں اور مجلسوں میں جہاں مسلمان جمع ہو جاتے، وعظ کہنے لگتے، اور ان کو توحید اور تقویٰ کی طرف پکار پکار کر بلاتے، معصیت کے اڈوں پر پہنچ کر بھی اللہ کا پیغام سناتے اور معصیت کی زندگی چھوڑ کر صالح زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے۔"[۱۶]

پروفیسر ضیاء الدین احمد شکیب "عبقات" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

"شاہ صاحب کی تقاریر نے وقت کی سیادت، عوام کے فکر و نظر اور مذہب کی تعبیر و توجیہ، حیات و کائنات کے روایتی مفہوم سبھی میں انقلاب پیدا کیا اور قوم کو سعی و عمل کے مزے اور موت کی لذت سے آشنا کر دیا۔"[۱۷]

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال رقم طراز ہیں :

"میرے سفر کی تیسری منزل برصغیر ہند میں اسلام کے احیا کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ اس باب کو تحریر کرتے وقت میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوا وہ شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید تھے۔

شاہ ولی اللہ کی تحریروں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ فقہ اسلامی اجتہاد کے دروازے کھولنے سے ہی متحرک ہو سکتی ہے۔ نیز شاہ اسمٰعیل شہید کے غیر مقلد ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے تنزل شدہ اسلامی معاشرہ کے فقہی جمود توڑنا چاہتے تھے۔ یہ تاثر ان کی تصانیف "صراطِ مستقیم" اور "تقویت الایمان" کے مطالعے سے قائم ہوتا

۱۵؎ فضل حسین : الحیاۃ بعد المماۃ، ص ۱۰۵۔ آگرہ ۱۹۰۸ء

۱۶؎ صباح الدین عبد الرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص ۹۴۔ اعظم گڑھ ۱۹۶۴ء

۱۷؎ ضیاء الدین احمد شکیب، پیش لفظ "عبقات"، ترجمہ مناظر احسن گیلانی، ص و

ہے۔ علامہ (اقبال) کے نزدیک یہ دو ہستیاں ان بلند پایہ علما میں سے تھیں جنھیں ہندی اسلام نے پیدا کیا تھا۔[۱۸]

مشہور ادیب و صحافی نصر اللہ خان عزیز مرحوم لکھتے ہیں :

"شاہ صاحب کی زندگی کا نمایاں ترین عنصر "باعملی" تھا اور اس نے ان کے اندر وہ تمام جوہر پیدا کر دیئے تھے جو ایک عظیم الشان انسان کے لیے ضروری ہیں۔"[۱۹]

تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت کے مصنف سید ہاشمی فرید آبادی رقم طراز ہیں :

"شاہ ولی اللہ اصلاحات کے بانی اور جانشین، مفسر و ناشر تھے، مگر ان سے سخت کا کام شاہ اسمٰعیل نے لیا۔"[۲۰]

ہاشمی صاحب موصوف نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی شہادت کا قطعۂ تاریخ بایں الفاظ موزوں کیا ہے :

فاضل عالی مقام، زاہد والاجناب — وارث و شائع گر علم رسالت مآب

زینتِ اسمِ ذبیحؑ، عزت نسلِ عدی — قائدِ خالدؓ مثل کشتۂ حمزہؓ جواب

مظہرِ عاشقِ حمید، مصدق مات شہید — عالمِ کامل عمل، صالحِ مصلح خطاب

زندۂ جاوید را سالے وفاتے نبود !

چشمِ بصیرت ببیں "شاہ شہیدے بہ خواب"۔"[۲۱]

۱۲۴۶ھ

(باقی آئندہ)

---

[۱۸] جاوید اقبال، مئے لالہ فام، ص گ، ل

[۱۹] نصر اللہ خان عزیز، مقالہ "اسوۂ شہید اور مسلمانانِ ہند"، مشمولہ "شاہ اسمٰعیل شہیدؒ"، ص ۳۲

[۲۰] ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، ج ۲، ص ۳۰۱

[۲۱] ایضاً، ص ۳۰۴

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُکَافِیِٔ وَلٰکِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِیْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُہٗ وَصَلَھَا۔ (صحیح بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں ہے جو برابر کی سطح پر تعلقات قائم کرتا ہے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جو انقطاع کے بعد تعلقات استوار کرتا ہے۔

یہ حدیث صحیح بخاری اور احادیث کی دیگر کتابوں میں موجود ہے۔ اس کے راوی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحب زادۂ گرامی قدر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث اگرچہ مختصر اور چند الفاظ پر مشتمل ہے لیکن معاشرتی اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں زندگی کے ایک عمدہ اصول کی وضاحت کی گئی ہے اور معاشرے کو صحیح ترین خطوط کی طرف گام زن ہونے کی تلقین فرمائی گئی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ایک دوسرے سے میل جول کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ صلہ رحمی کے کیا تقاضے ہیں اور لوگوں سے تعلقات قائم اور استوار کرنے میں کس چیز کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ عام طور پر لوگ مکافات پر عمل کرتے اور برابر کی سطح پر رہتے ہیں، جس قسم کا کسی نے برتاؤ کیا، اسی قسم کا اس کے ساتھ خود کر دیا۔ اگر اس نے کسی معاملے میں تھوڑی بہت ہمدردی کا اظہار کیا یا کسی سلسلے میں کوئی مدد کی تو اتنا ہی بدلہ دے دیا تاکہ بوجھ اتر جائے اور احسان باقی نہ رہے۔ پھر اس کا نام صلہ رحمی رکھ دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بے شک یہ انداز تعلق بھی صلہ رحمی کی تعریف میں داخل ہے لیکن فقط اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھنا چاہیے۔ صلہ رحمی یہ ہے کہ ان لوگوں سے تعلقات استوار کیے جائیں، جن سے منقطع ہو چکے ہوں۔

درحقیقت یہی امتحان کی منزل ہے۔ ایک طرف ذاتی غرور اور پندار کا سوال ہے، دوسری طرف صحیح فطری

جذبات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ غرور آگے قدم بڑھانے سے روکتا ہے، وہ دل میں یہ غلط خیال پیدا کرتا ہے کہ فلاں شخص چونکہ مجھ سے دور ہو گیا ہے، لہٰذا میں بھی اس سے دُور رہوں گا، اگر وہ میرے قریب آنے میں سبکی محسوس کرتا ہے تو میں بھی تو اپنا ایک مقام رکھتا ہوں، کیوں اس کے قریب جاؤں ــــ یہ شیطانی خیالات ہیں جو اس کو خیر کی طرف پیش قدمی کرنے اور نیکی کی طرف بڑھنے سے روکتے ہیں۔

اس کے برعکس صحیح فطری جذبات ہیں جو ہر انسان میں موجود ہیں، وہ اگرچہ بعض دفعہ دب جاتے ہیں، مگر بالکل ختم نہیں ہوتے۔ وہ جذبات انسان کو ان لوگوں کے ساتھ بھی تعلقات و روابط قائم رکھنے پر مجبور کرتے ہیں، جو کسی وجہ سے اس سے الگ ہو چکے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ اصل انسان وہ ہے، جو اس نازک موقع پر جھوٹے غرور کو ترک کر دیتا ہے اور اپنے غلط پندار کو ختم کر کے ایک مسلمان بھائی کے پاس آتا ہے، اس کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھاتا ہے، اگر اپنی غلطی ہو تو اس کا اعتراف کرتا ہے اور طالبِ معذرت ہوتا ہے۔ دوسرے کی غلطی ہو تو اسے نظر انداز کر دیتا ہے اور ٹوٹے ہوتے تعلقات کو دوبارہ جوڑنے کا اہتمام کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی رو سے اصل انسان وہی ہے جو بگڑے ہوئے معاملات کو درست کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سب باتوں کو نظر انداز کر کے روٹھے ہوئے بھائیوں کو منانے کے لیے ساعی ہوتا ہے۔

اگر معاشرے کا ہر فرد اس پر عمل کرنے کو اپنے لیے ضروری قرار دے لے تو ایک دوسرے سے بغض و عداوت کا سلسلہ قطعی طور سے ختم ہو جاتا ہے اور دنیا سکون و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو جاتی ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

اوقاف ۔ اسلام آباد ۔ جنوری ۱۹۷۹ء

سید البشر	صادق حسین طارق
اصلاح معاشرہ	سید احمد حسنی
صفر المظفر	امتیاز احمد سعید
حضرت علی ہجویری	راجا رشید محمود
حضرت خدیجۃ الکبریٰ	ڈاکٹر صغریٰ بانو شگفتہ
اسلام کا نظامِ اخلاق	ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
اسلامی قانون کی اساس	شیر محمد اختر
حضرت مجدد الف ثانی	ہسرور انبالوی

البلاغ ۔ کراچی ۔ فروری ۱۹۷۹

مکاتیبِ حکیم الامت	مولانا مفتی محمد شفیع
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ	مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری
فسادِ معاشرہ ــ شاہ ولی اللہ کی نظر میں	محمد طاہر ملک
اسلامی مملکت میں غیر مسلم شہری کے حقوق	مولانا انیس الرحمٰن لدھیانوی
سجع گوئی اور تاریخ نگاری کا فن	مولانا رشید اشرف

البلاغ ۔ بمبئی ۔ جنوری ۹۷۹ا

عقیدۂ توحید اور اس کے عملی تقاضے	مولانا نظام الدین اسیر آوروی
اسلامی فنونِ لطیفہ ۔ ولید بن عبد الملک کے عہد میں	چوہدری محمد اشرف ایم ۔ اے
مسجدِ اقصیٰ	محمد ابراحسین فاروقی
مولانا عبد العزیز میمنی راجکوٹی	قاضی اطہر مبارک پوری

مضمون	مصنف
مولانا محمد علی کی تعلیمی تقاریر	سید مصطفیٰ علی بریلوی
مولانا محمد علی جوہر کی ملی اور تعلیمی خدمات	جناب محمد صدیق
مولانا محمد علی جوہر — ذاتی مشاہدات	جناب مینا زبیری (علیگ)
مولانا محمد علی کی یاد میں	سید محفوظ علی بدایونی
مولانا محمد علی خبروں کے آئینے میں	سید مصطفیٰ علی بریلوی
مولانا محمد علی مرحوم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ	ڈاکٹر قاضی عبدالحمید زبیری
علی برادران — نام و نسب	جناب اللہ بخش یوسفی
مولانا محمد علی جوہر کی شاعری - ایک آپ بیتی	جناب انعام عظیم برنی
مولانا محمد علی	قاضی عبد الغفار

فاران - کراچی - جنوری ۱۹۷۹

مضمون	مصنف
حضرت کعب بن مالک انصاری	طالب ہاشمی
ہمارے محسن۔ ہمارے بزرگ، مولانا ماہر	سلطان صالحین

الفرقان - لکھنؤ، فروری ۱۹۷۹

مضمون	مصنف
کاروان اہلِ فضل و کمال (مسلسل)	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی
ایک مثالی شخصیت - مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی
متجدد محاذ کی سیاست	مولانا وحید الدین خاں
بابا رتن الہندی (مسلسل)	مولانا محمد منظور نعمانی

الفیصل - فیصل آباد

مضمون	مصنف
علامہ عبدالعزیز میمن کی یاد میں	پروفیسر غلام احمد حریری
قرآنِ پاک کا استغاثہ بارگاہِ خداوندی میں	مولانا محمد صادق خلیل
اسلام میں حقوق العباد کی اہمیت	مولانا محمد یوسف انور
اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم	فصیح اللہ خاں عاصی
بہائیت کیا ہے ؟	ہشام الوحلکہ - ترجمہ: ریاض احمد خاں محمود

[illegible] مطابق اپریل ۱۹۶۹

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ، لاہور	دین محمدی پریس، لاہور

المعارف لاہور

جلد ۱۲ || اپریل ۱۹۷۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ || شمارہ ۴

ترتیب

تاثرات

اسلام کی تعلیمات کا سلسلہ بڑا ہی وسعت پذیر اور ہمہ گیر ہے۔ اخلاقِ حسنہ، بلندیٔ کردار، صحتِ عمل، صفائی قلب، صدقِ مقال، ایفائے عہد، صلہ رحمی، اپنے سے بڑے کا احترام، چھوٹے پر شفقت، تقویٰ، نیکی، شرافتِ نفس، امر بالمعروف، تحمل و بردباری، فرض شناسی، دیانت داری، ذمہ داری کا احساس، وقت کی پابندی، اپنے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے لیے مسلسل سعی و کوشش، کارِ خیر میں جدوجہد، ہر معاملے میں احتیاط و اعتدال، بات چیت میں توازن، کاروبار میں دیانت، دوسرے کے لیے امن و عافیت کا بھرپور جذبہ، اپنے ساتھی کی حوصلہ افزائی، عفو و کرم، کسی کی لغزشِ فکر و عمل پر درگزر، ہمسائے سے حسنِ تعلق، مستحق کی امداد، یتیم کی اعانت، مسکین کی دستگیری، مریض کی عیادت، یہ اور اس قسم کی بے شمار چیزیں ہیں جنھیں اسلامی تعلیمات کے مثبت پہلوؤں سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

ہم مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنے اسلام پر فخر کا اظہار کرتے ہیں، اور بلاشبہ اس دعوئ فخر میں ہم حق بجانب بھی ہیں، اس کے لیے بعض دفعہ کسی نہ کسی سطح پر ہمیں جانی اور مالی یا کسی اور قسم کا نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ــــ لیکن ہمیں اپنی نیتوں کو ٹٹولنا اور دلوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ کیا ہم ان اسلامی تعلیمات کو کسی طرح بھی اپنا مقصدِ زندگی قرار دیتے اور مطمحِ نظر ٹھہراتے ہیں۔ کیا ہمارا اخلاقی پہلو اتنا بلند ہے کہ ایک غیر مسلم کے لیے اس سے اثر پذیری کا داعیہ پیدا ہو؟ کیا ہمارا کردار اس قدر اونچا ہے کہ دوسرا اس کو اپنے لیے ایک نمونہ قرار دینے پر مجبور ہو؟ کیا ہم کاروبار اور معاملات میں اس درجہ دیانت داری اور ایمان داری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ دوسروں کے نزدیک ہماری ساکھ بڑھے اور اس میں وہ ہمیں لائقِ اعتماد گردانیں ۔ ؟

ان امور پر ہم میں سے ہر شخص کو غور کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ ہمارے اندر کیا کیا کمزوریاں پائی جاتی ہیں، جو ہمارے اخلاق کی دولت کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں، اور ان سے نجات حاصل کرنے کا کیا صحیح طریقہ ہے؟

(محمد اسحاق بھٹی)

مولانا سید محمد متین ہاشمی

اسلامی قانونِ شہادت

کچھ عرصہ قبل ہمارے ملک میں برطانوی قوانین رائج تھے اس لیے برطانوی قانونِ شہادت بھی چل رہا تھا، لیکن اسلامی نظام اور اسلامی حدود کے نفاذ کے بعد ضروری ہوگیا ہے کہ یہاں اسلامی قانونِ شہادت کے تحت مقدمات کی سماعت کی جائے۔ اس ضرورت کے باعث شہادت کا مسئلہ اہمیت اختیار کر گیا ہے، لہٰذا اس سلسلے میں چند اصول و مبادی زیرِ بحث لائے جا رہے ہیں۔

شہادت کی تعریف

شہادت خبرِ قاطع کو کہتے ہیں۔ علامہ ابن نجیم نے شہادت کی فقہی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

وھی اخبار عن مشاهدة وعيان لا عن تخمين وحسبان[1]

یعنی شہادت کسی واقع کے بارے میں اپنے مشاہدے اور دید کے مطابق خبر دینے کو کہتے ہیں نہ کہ ظن و تخمین کی بنیاد پر۔

علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے:

"شہادت اس قطعی اور فیصلہ کن بیان کا نام ہے جو قانونی عدالت میں حاضر ہو کر کسی ایسے معاملے کے متعلق دیا جاتا ہے جو بیان کرنے والے کے شاہد نے صاف طور پر دیکھا ہو"[2]

مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے:

يلزم ان يكون الشهود قد عاينوا بالذات المشهود به وان يشهدوا على ذلك الوجه ولا يجوز ان يشهد بالسماع[3]

---

[1] ابن النجیم۔ بحر الرائق : ۷ : ۵۵ طبع مصر

[2] العینی : عمدۃ القاری، ۶ : ۱۱۱

[3] المجلۃ: ۳۷۶ طبع نور محمد کراچی

گواہ کے لیے یہ لازمی ہے کہ جس چیز کی شہادت دے اسے اس نے خود دیکھا ہو اور شہادت میں یہی کہے اور یہ جائز نہیں کہ سماعی شہادت دے۔

شہادت کی اقسام

اسلامی قانون شہادت (Law of Evidence) کی تین اقسام ہیں:

۱۔ شہادت

۲۔ اقرار

۳۔ حلف یا یمین

۱۔ قسم اول شہادت

شہادت دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے پاس ایک امانت ہے یعنی یہ کہ اگر کسی شخص سے کسی واقعہ کے بارے میں دریافت کیا جائے اور وہ حقائق کو اپنے مشاہدے کے ذریعے جانتا ہو تو اس کا فرض ہے کہ اپنے علم و مشاہدے کے مطابق صحیح صحیح بات حاکم مجاز کی عدالت میں بیان کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۴۰)

اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی گواہی کو جو اس کے پاس ہے، چھپائے، اور اللہ تعالیٰ اس عمل سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔

ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ: ۲۸۳)

اور شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو شخص شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل گناہ گار ہے اور اللہ تعالیٰ اس چیز سے بخوبی واقف ہے جو تم کرتے ہو۔

ضروری ہے کہ ادائے شہادت کے وقت کامل عدل اختیار کیا جائے نہ طرف داری کی جائے اور نہ کسی کی عداوت میں غلط بیانی سے کام لیا جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ

الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (النساء : ۱۳۵)

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ سے (ڈرتے ہوئے) گواہی دو (یعنی سچی سچی بات بیان کر دو) اگرچہ وہ گواہی خود تمہارے خلاف ہی کیوں نہ ہو یا تمہارے والدین یا عزیز و اقارب کے خلاف ہو۔ اگر کوئی شخص مال دار یا مفلس ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا تم سے زیادہ نگاہ بان ہے۔ تم انصاف کو چھوڑ کر اپنے نفس کی خواہش پر مت چلو، اور اگر گواہی میں ایچ پیچ کرو گے (یعنی جان بوجھ کر کسی کو بچا دو گے) تو اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔

سورۃ مائدہ میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ : ۸)

اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے میں مستعد رہو اور ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی عداوت تم سے گواہی دینے میں بے انصافی کرائے۔ انصاف کرو، انصاف ہی پرہیزگاری تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے، اور اللہ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے مندرجہ ذیل نکات مستفاد ہوتے ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ کہ شہادت اللہ کی طرف سے بندے کے پاس ایک امانت ہے جس کا ادا کرنا ضروری ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ شہادت کا چھپانا گناہ ہے۔

۳۔ تیسری یہ کہ ادائے شہادت کے وقت پوری دیانت داری کرنی چاہیے خواہ وہ شہادت خود گواہ یا اس کے والدین یا دیگر اعزہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ چوتھی یہ کہ شہادت کی ادائیگی کے وقت ہر قسم کے لالچ اور خوف سے مستغنی ہونا چاہیے اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

۵۔ پانچویں یہ کہ واقعات کو صاف صاف بغیر ایچ پیچ کے بیان کر دینا چاہیے تاکہ حاکم کو صحیح

نتیجے پر پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔

۶۔ اور چھٹی یہ کہ کسی کی عداوت میں شہادت دیتے وقت انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

ادائے شہادت کی کیفیت

۱۔ عدالت سے باہر کی شہادت معتبر نہیں ہوتی۔ المجلہ میں ہے:

لا تعتبر الشهادة التي تقع في خارج مجلس المحكمة۔[۵۴]

مجلس عدالت کے باہر جو شہادت دی جائے وہ معتبر نہیں ہے۔

۲۔ ضروری ہے کہ گواہ لفظ شہادت (گواہی) استعمال کرے۔

ولا بد في ذلك كله من العدالة ولفظة الشهادة فان لم يذكر الشاهد لفظة الشهادة وقال اعلم او اتيقن لم تقبل شهادته۔[۵۵]

تمام حقوق میں گواہ کے عادل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی گواہی میں لفظ شہادت استعمال کرے۔ سو اگر گواہ نے لفظ شہادت استعمال نہیں کیا اور اس کی بجائے یہ کہا کہ "میں جانتا ہوں یا میں یقین کرتا ہوں"، تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔

۳۔ اگر شاہد نے یہ نہیں کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں بلکہ کہا کہ "میں اس بات کو جانتا ہوں" اس پر حاکم نے دریافت کر لیا کہ "کیا تم اس کی شہادت دیتے ہو اور اس نے جواب میں کہا کہ" ہاں! میں ایسی ہی شہادت دیتا ہوں" تو یہ شہادت معتبر ہوگی۔[۵۶]

۴۔ شاہد کا شہادت دیتے وقت مشہود لہٗ (جس کے حق میں شہادت دی جائے) اور مشہود علیہ (جس کے خلاف شہادت دی جائے) کی طرف اشارہ کرنا (اگر یہ لوگ عدالت میں حاضر ہوں) کافی ہے مشہود لہٗ اور مشہود علیہ کی ولدیت بتلانا ضروری نہیں۔ لیکن اگر شہادت موکل یا میت کے بارے میں ہو تو شاہد کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ان کے باپ اور دادا کا نام لے، البتہ اگر وہ لوگ بہت مشہور ہوں تو پھر ان کا نام لے لینا اور ان کی شہرت کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔[۵۷]

---

۵۴ المجلہ: ۳۷۹

۵۵ ہدایہ: ۳: ۲۰۸ نولکشور

۵۶ المجلہ: ۳۷۹

۵۷ ایضاً، ص ۳۸۰

۵۔ جائیداد غیر منقولہ کے بارے میں شہادت دیتے وقت جائیداد کے حدود کا بیان کرنا ضروری ہے، لیکن اگر شاہد نے حدود نہ بیان کیے مگر یہ وعدہ کیا کہ موقع پر وہ جائیداد کو دکھا سکتا ہے اور تعیین کر سکتا ہے تو اسے دکھانے اور تعیین کرنے کا حکم دیا جائے گا[8]

شہادت کی بنیادی شرائط

۱۔ لوگوں کے حقوق کے بارے میں کسی شہادت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس سے پہلے حق مذکور کا دعویٰ کیا جا چکا ہو[9]

۲۔ کوئی ایسی دلیل جو محسوس کے خلاف قائم کی جائے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی، مثلاً کوئی شخص کسی کی موت کی دلیل پیش کرے اور وہ شخص زندہ موجود ہو، یا کوئی کسی مکان کے برباد ہو چکنے کی دلیل پیش کرے اور مکان موجود ہو اور دیکھا جا سکتا ہو[10]

۳۔ کسی خبر متواتر کے خلاف دلیل قابلِ قبول نہیں ہوتی[11]

۴۔ ایسی شہادت جو صرف نفی کے لیے ہو، ناقابلِ قبول ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ فلاں نے یہ کام نہیں کیا یا فلاں مکان فلاں شخص کا نہیں ہے یا فلاں شخص فلاں شخص کا مقروض نہیں ہے[12]

۵۔ ضروری ہے کہ شہادت دینے کا مقصد کسی مضرت کا دفع کرنا یا کسی منفعت کا حاصل کرنا نہ ہو[13]

۶۔ زنا میں چار مردوں کی گواہی ضروری ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ گواہ بالصراحت عملِ زنا کی گواہی دیں[14]

۷۔ حدود و قصاص میں عورتوں کی شہادت معتبر نہیں ہے[15]

۸۔ زنا کے علاوہ دیگر حدود میں دو مردوں کی گواہی معتبر ہوتی ہے[16]

۹۔ دیگر حقوق مثلاً نکاح، طلاق، وکالت، وصیت وغیرہ میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت احناف کے نزدیک معتبر ہے[17]

۱۰۔ ایسے معاملات جن کے بارے میں عورتوں کے سوا دوسرے واقفیت نہ رکھ سکتے ہوں، ایک عورت

---

[8] المجلہ : ۳۸۰ [9] ایضاً : ۳۸۱ [10] ایضاً
[11] ایضاً [12] ایضاً [13] ایضاً
[14] ہدایہ ۳ : ۲۰۵ [15] ایضاً، ص ۲۰۶ [16] ایضاً [17] ایضاً

کی شہادت بھی معتبر ہوتی ہے۔ مثلاً ولادت، بکارت یا عورتوں کے وہ عیوب جن کے بارے میں مرد واقفیت حاصل نہ کر سکتے ہوں[18]

۱۱۔ کسی کے نسب، موت، نکاح اور دخول کے بارے میں اگر کسی قابلِ وثوق ذریعے سے خبر ملی ہو تو گواہ بغیر آنکھوں سے دیکھے ہوئے بھی شہادت دے سکتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں گواہ پر لازم ہوگا کہ وہ عدالت سے اپنے اس قابلِ وثوق ذریعے کا بھی انکشاف کرے[19]

۱۲۔ اگر کسی نے گواہی دی کہ وہ زید کے جنازے میں شریک ہوا تھا تو اگرچہ اس نے زید کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ اس نے زید کے جنازے سے کپڑا ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا تاہم زید کی موت کے سلسلے میں اس کی شہادت قبول کی جائے گی بشرطیکہ وہ شہادت محسوس کے خلاف نہ ہو۔ (جیسا کہ گزر چکا ہے)

ہدایہ میں ہے:

ومن شهد انه شهد دفن فلان اوصلى على جنازته فهو معاينة[20]

جس نے گواہی دی کہ وہ فلاں شخص کے دفن میں شریک ہوا یا اس نے شخص مذکور کے جنازے کی نماز میں شرکت کی تو اس کی یہ شہادت عینی شہادت کے برابر متصور ہوگی۔

۱۳۔ ضروری ہے کہ شاہد اور مشہود علیہ کے درمیان کوئی دنیوی عداوت نہ ہو۔

ويشترط ان لا يكون بين الشاهد والمشهود عليه عداوة دنيوية وتعرف العداوة الدنيوية بالعرف۔[21]

شہادت کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ شاہد اور مشہود علیہ کے درمیان کوئی دنیاوی عداوت نہ ہو اور دنیاوی عداوت کی تعریف عرفِ عام کے مطابق ہوگی۔

۱۴۔ کوئی شخص خود ہی شاہد اور خود ہی مدعی نہیں ہو سکتا، اسی لیے یتیم کے حق میں وصی کی اور موکل کے حق میں وکیل کی شہادت صحیح نہیں ہوتی[22]

۱۵۔ شاہد کے لیے عادل ہونا ضروری ہے۔ عادل کی تعریف یہ ہے:

---

[18] ہدایہ: ۳: ۲۰۷ [19] ایضاً، ص ۲۱۳ [20] ایضاً، ص ۲۱۴

[21] المجلہ: ۲۸۳ [22] ایضاً

والعادل من تکون حسناته غالبة علی سیئاته[۲۳]

اور عادل وہ ہوتا ہے جس کی خوبیاں اس کی برائیوں پر غالب ہوں۔

۱۶۔ شہادت اسی وقت قابلِ قبول ہوگی جب کہ دعویٰ اور شہادت میں توافق ہو ورنہ نہیں[۲۴]

۱۷۔ شاہدوں کی قلت و کثرت قابلِ اعتبار نہیں۔ یعنی یہ کہ اگر ایک فریق کے گواہ زیادہ ہوں اور فریق ثانی کے کم، تو لازمی نہیں کہ کثرت کو قلت پر ترجیح دی جائے۔ بجز اس صورت کے کہ یہ کثرت حدِ تواتر کو پہنچ گئی ہو[۲۵]

۱۸۔ تواتر علم یقینی کا فائدہ دیتا ہے اس لیے تواتر کے خلاف دلیل قائم نہیں کی جا سکتی[۲۶]

۱۹۔ تواتر میں خبر دینے والوں کی تعداد معین نہیں ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ایسا جمِ غفیر ہو جس کا کذب پر اتفاق کر لینا ممکن نہ ہو[۲۷]

۲۰۔ دیگر حقوق میں ادائے شہادت فرض ہے لیکن حدود میں شاہد کو اختیار ہے کہ وہ پردہ پوشی کرے یا شہادت دے۔ پردہ پوشی افضل ہے[۲۸]

۲۱۔ اگر شہادت میں شاہد فعل ماضی استعمال کرے یعنی اشهد (میں گواہی دیتا ہوں) کی بجائے شہدت (میں نے گواہی دی) کہے تو شہادت قبول نہ ہوگی[۲۹]

جھوٹی شہادت

جھوٹی گواہی دینا گناہِ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ (الحج: ۳۰)

جھوٹی گواہی دینے سے بچو۔

ایک مقام پر مومنوں کی پہچان بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۔ (الفرقان: ۷۲)

---

۲۳ المجلہ: ۳۸۲ — ۲۴ ایضاً — ۲۵ ایضاً: ۳۹۰

۲۶ ایضاً — ۲۷ ایضاً

۲۸ ہدایۃ، ۳: ۱۳۸ مجتبائی — ۲۹ ردالمحتار، ۴: ۵۸۳، طبع مصر

اور جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے ۔

مشکوٰۃ میں صحیح بخاری و مسلم کے حوالے سے روایت ہے :

وعن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکبائر الاشراک باللہ وعقوق الوالدین وقتل النفس والیمین الغموس وفی روایۃ وشھادۃ الزور[۳۰]

حضرت انسؓ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبیرہ گناہ یہ ہیں، اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی، (ناحق) کسی کو قتل کرنا، جھوٹی قسم کھانا، اور ایک روایت میں ہے کہ جھوٹی گواہی دینا۔

ابوداؤد شریف میں ہے :

عن خریم بن فاتک قال صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الصبح فلما انصرف قام قائما فقال عدلت شھادۃ الزور بالاشراک باللہ ثلاث مرات ثم قرأ : فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور حنفاء للہ غیر مشرکین بہ[۳۱] (الحج : ۳۰)

حضرت خریم بن فاتک کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی اور جب لوگوں کی طرف رخ پھیرا تو بیٹھے رہنے کے بجائے آپ سیدھے کھڑے ہوگئے اور تین بار ارشاد فرمایا : جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا دونوں برابر کے گناہ ہیں۔ پھر آپ نے آیت پڑھی کہ تم ناپاکی یعنی بتوں سے دور رہو اور جھوٹی بات کہنے سے دور رہو اور خدا کے لیے یکسو ہو جاؤ، یعنی شرک چھوڑ کر توحید اختیار کرو۔

جھوٹی شہادت کی سزا

ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے جتنا پست ہو چکا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ معمولی فائدے کی خاطر جھوٹی شہادت دے کر کسی بے قصور کو پھنسا دینا اور کسی قصور وار کو بچا لینا روزانہ کا معمول ہو چکا ہے۔ ان حالات میں اسلامی قوانین اور حدود کے نفاذ کے بعد ملک کے عوام بالعموم اور قانون دان طبقہ بالخصوص سخت الجھن میں گرفتار ہے۔ کیوں کہ پہلے کی سزاؤں کے مقابلے میں اسلامی حدود سخت ہیں۔ لہٰذا لوگوں کے

---

[۳۰] مشکوٰۃ : ۱ : ۲۲ طبع دمشق

[۳۱] ابوداؤد شریف ، ۵۰۶ طبع کان پور

دلوں میں بجا طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ اگر شہادتوں کا یہی معیار قائم رہا جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے تو یہ بات خارج از امکان نہیں کہ قصوروار بچ نکلیں اور بے قصوروں کے ہاتھ کٹ جائیں۔ لہٰذا موجودہ حالات میں اس کا سدِ باب ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا اقدام تو یہ کرنا چاہیے کہ تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے لوگوں میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کی جائے، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر مدتوں پتھر پر پانی گرتا رہے تو پتھر گھس جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام تو بہر حال مسلمان ہیں اور ان کے دلوں میں کسی قدر خوفِ خدا پہلے ہی سے موجود ہے، صرف ضرورت ان کے جذباتِ عالیہ کو اپیل کرنے اور ان میں اسلام کی اخلاقی اقدار سے محبت پیدا کرنے کی ہے۔ لیکن ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو اچھی تعلیمات سے متاثر نہیں ہوتے۔ ان کی بہیمی صفات ان کے انسانی و ملکوتی اوصاف پر غالب ہوتی ہیں۔ شریعت ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے تعزیر استعمال کرتی ہے۔ تاکہ بدنہاد افراد میں خوف پیدا ہو جائے اور وہ خوف کی وجہ سے ان اقدامات سے باز رہیں جو شریعت کی منشا کے برخلاف ہوں۔

جھوٹی شہادت دینے والے کے لیے قرآن میں کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی ہے، البتہ بہت سی احادیث میں اس پر عمل کرنے والوں کے لیے سخت وعید اور آخرت کے عذاب کا ذکر موجود ہے۔ چوں کہ اُمت کے لیے خلفائے راشدین کی سنّت بھی لائق استناد ہے، لہٰذا حضرت عمرؓ کے عمل کو اختیار کرنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ جھوٹی گواہی دینے والوں کی تشہیر کراتے تھے (یعنی اس کے منہ میں کالک لگا کر عام جگہوں پر پھراتے اور اعلان کراتے کہ یہ شخص جھوٹا ہے)۔ ایک موقع پر آپ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے جھوٹی گواہی دینے والے کو چالیس کوڑوں کی سزا دی۔

امام سرخسی نے المبسوط میں امام محمد کا قول نقل کیا ہے جسے انھوں نے قاضی شریح کے حوالے سے ذکر فرمایا ہے کہ جب قاضی شریح جھوٹی گواہی دینے والے کو عصر کی نماز کے بعد جب کہ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم ہوتا عدالت کے کارندے کے ہمراہ بھیج دیتے اور وہ بازار میں اعلان کرتا کہ قاضی شریح نے تم سب کو سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ شخص جھوٹی گواہی دینے والا ہے، اس سے بچو۔ اگر وہ شخص بازار سے متعلق نہ ہوتا تو پھر وہ عدالت کے کارندے کے ہمراہ اسے اس کے قبیلے اور محلے میں بھیجتے اور عدالتی کارندہ اسی قسم کا اعلان اس کے قبیلے میں کرتا۔ (ملخصاً)[۲۳]

---

۲۳ السرخسی: المبسوط: ۱۶: ۱۴۵، طبع مصر ۱۳۳۴ھ

امام ابوحنیفہ نے قاضی شریح کے عمل کو اختیار کیا ہے اور انھوں نے یہی فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی گواہ پہلی مرتبہ جھوٹی گواہی دے تو اس علاقے میں جہاں وہ متعارف ہو اسی طرح اس کی تشہیر کرائی جائے لیکن اگر وہ بار بار ایسا کرے تو تشہیر کے علاوہ اسے کوڑے بھی مارنے جا سکتے ہیں۔ لیکن صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے کہ جھوٹے گواہ کو قید اور تعزیر دی جائے جس کی مقدار اور تو عیت کا تعین قاضی اپنی صوابدید سے کرے گا۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ قاضی پچاس اور محمد کوڑے بھی مار سکتا ہے۔[۳۳]

معاشرے کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ ہمارے مناسب حال صاحبین کا قول ہے۔ یعنی جھوٹی گواہی دینے والے کو تشہیر کے علاوہ کوڑے بھی مارے جائیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اگر یہ اقدام دو چار مرتبہ کر دیا جائے تو لوگ اس حرکت سے باز آ جائیں گے۔ تشہیر کے سلسلے میں موجودہ ذرائع ابلاغ مثلاً اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

امام شافعی کا مسلک بھی وہی ہے جو صاحبین کا ہے

المہذب میں ہے :

واذا ثبت انہ شاھد زور و رأی الامام تعزیرہ بالضرب او الحبس او الزجر فعل۔[۳۴]

اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ گواہ جھوٹا ہے اور امام خیال کرے کہ اس کی تعزیر بمعانی ضرب یا قید یا تنبیہ کے طور پر مناسب ہے تو وہ یہ اقدام کر سکتا ہے۔

یہی مسلک امام احمد بن حنبل کا بھی ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ :

"جب حاکم کو یہ بات (وثوق سے) معلوم ہو جائے کہ گواہ جھوٹا ہے تو اسے گواہ کو تعزیر دینی چاہیے اور اسے چاہیے کہ گواہ کو اس علاقے میں گشت کرائے جہاں وہ شہرت رکھتا ہو اور اعلان کرا دیا جائے کہ یہ شخص جھوٹی گواہی دینے والا ہے، اس سے بچو۔"[۳۵]

امام مالک کا بھی یہی مسلک ہے۔ حوالے کے لیے عبدالسمیع الآبی کی جواہر الاکلیل دیکھیے۔

جھوٹی گواہی دینے والے کو آئندہ کے لیے مردود الشہادۃ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

---

۳۳ ایضاً ۳۴ الشیرازی الفیروز آبادی : المہذب ، ۲ : ۳۳۰ (مصر)

۳۵ ابن قدامہ : المقنع ، ۳ : ۲۲۰

گواہ کی اہلیت

مشکوٰۃ شریف میں حضرت عائشہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

لا تجوز شهادة خائن ولا خائنة ولا مجلود حدًا ولا ذي غمر على اخيه ولا ظنين في ولاء ولا قرابة ولا القانع مع اهل البيت[٣٦]

خائن مرد اور خائن عورت محدود فی القذف اور ایسے شخص کی شہادت معتبر نہیں ہے جو اپنے بھائی (مشہود علیہ) سے عداوت (دنیوی) رکھتا ہو، نہ آزاد کردہ غلام کی شہادت (اپنے سابق مالک کے حق میں) نہ ایک گھر میں پرورش پانے والوں کی شہادت دوسرے کے حق میں۔ نہ رشتہ داروں کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں معتبر ہے۔

مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے کہ :

١۔ اصل کی شہادت فرع کے حق میں یا فرع کی شہادت اصل کے حق میں مقبول نہیں ہوتی۔ یعنی باپ والدہ، نانا نانی، دادا دادی کی شہادت بیٹے، بیٹی، پوتے پوتی، نواسے نواسی کے حق میں یا اس کے برعکس پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کی شہادت دادا دادی، نانا نانی، باپ والدہ کے حق میں ناقابلِ قبول ہے۔ اسی طرح شوہر کی شہادت بیوی کے حق میں یا بیوی کی شہادت شوہر کے حق میں ناقابل قبول ہے۔ ان قرابت داروں کے علاوہ دوسرے قرابت داروں کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں معتبر ہوگی۔ اسی طرح ایسے خادم کی شہادت جو آقا کے روپے پر گزر بسر کرتا ہو یا کسی خاص اجیر کی شہادت آجر کے حق میں معتبر نہیں ہوگی۔ لیکن ایک ہی آقا کے مختلف خادموں کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں قبول کی جائے گی۔ ایک شریک کی شہادت مالِ شرکت کے بارے میں دوسرے شریک کے حق میں قابلِ قبول نہیں[٣٧]

٢۔ ایک دوست کی شہادت دوسرے دوست کے حق میں قابلِ قبول ہے، مگر جب دوستی اس مرتبے تک پہنچ جائے کہ ایک دوست دوسرے دوست کے مال میں بلا تکلف تصرف کرنے لگے تو پھر ایک کی شہادت دوسرے کے حق میں قابلِ قبول نہ ہوگی[٣٨]

٣۔ ضروری ہے کہ شاہد اور مشہود علیہ کے مابین کوئی دنیوی عداوت نہ ہو[٣٩]

٤۔ اگر کوئی حاکم اپنے شہر سے دور رہ کر کبھی اپنے عہدے سے علیحدہ نہ ہوا ہو تو خود اپنے حکم کے

---

٣٦ مشکوٰۃ : ٢ : ٣٢٦ (طبع دمشق)

٣٧ المجلہ : ٣٨٢

٣٨ المجلہ : ٣٨٢

٣٩ ایضاً

خلاف کوئی شہادت نہیں دے سکتا، البتہ اگر اپنے عہدے سے علیحدہ ہو چکا ہو اور یہ شہادت دے کہ میرے اجلاس میں فلاں شخص نے یہ اقرار کیا تھا تو اس کی شہادت معتبر ہوگی [۴۰]

۵۔ ایسے لوگوں کی شہادت مقبول نہیں ہوتی جو عادۃً آبرو مندی کے خلاف حرکات میں مشغول رہتے ہیں، مثلاً ناچنے والے، مسخرے، گپی یا ایسے اشخاص جن کا جھوٹا ہونا مشہور ہو [۴۱] اسی ضمن میں پولیس کے ٹاؤٹ گواہ بھی آتے ہیں۔

۶۔ نابینا اور محدود فی القذف (جس آدمی پر زنا کی تہمت لگانے کے الزام میں حد لگ چکی ہو) کی شہادت معتبر نہیں [۴۲]

۷۔ مخنث کی شہادت اگر وہ فاسق ہو تو معتبر نہیں۔ لیکن اگر وہ فاسق نہ ہو تو معتبر ہوگی [۴۳]

۸۔ (معاوضے پر) نوحہ کرنے والی اور گانے والی عورتوں کی شہادت معتبر نہیں [۴۴]

۹۔ عادی شرابی، فاسق اور ایسے شخص کی شہادت معتبر نہیں جو ستر کھول کر لوگوں کے سامنے حمام میں جاتا ہو یا سود خور ہو یا جواری ہو یا ایسا شطرنج اور چوسر کھیلنے والا ہو کہ کھیلنے میں اس قدر مشغول ہو جاتا ہو کہ نماز قضا ہو جاتی ہو [۴۵]

۱۰۔ راہ چلتے کھانے والے اور شارع عام پر بے حیائی سے پیشاب کرنے والوں کی شہادت معتبر نہیں [۴۶]

۱۱۔ سلف صالحین کو برا کہنے والے کی شہادت معتبر نہیں [۴۷]

۱۲۔ غیر مسلموں کی شہادت غیر مسلموں کے معاملات میں معتبر ہے [۴۸]

۱۳۔ خصی اور ولد الزنا کی شہادت معتبر ہے [۴۹]

۱۴۔ سرکاری ملازمین کی شہادت معتبر ہے [۵۰]

---

[۴۰] المجلہ: ۳۸۲

[۴۱] ایضاً

[۴۲] ہدایہ: ۳۔ ۲۱۶ بعد

[۴۳] ایضاً، ص ۲۱۹

[۴۴] ایضاً، ص ۲۲۰

[۴۵] ایضاً

[۴۶] ایضاً

[۴۷] ایضاً

[۴۸] ایضاً، ص ۲۲۱

[۴۹] ایضاً، ص ۲۲۲

[۵۰] ایضاً، ص ۲۲۳

۱۵۔ اگر شاہد کہے کہ میں فلاں گواہ کی گواہی پر شہادت دیتا ہوں یا کہے کہ میں اس کی شہادت کی طرح شہادت دیتا ہوں تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔[۱۵۱]

۱۶۔ فاسق کی شہادت مقبول نہیں لیکن قاضی اگر اس کی شہادت کو قبول کرکے فیصلہ صادر کر دے تو اس کی قضا نافذ ہوگی اور قاضی گناہ گار ہوگا۔[۱۵۲]

۱۷۔ فاسق اگر اپنے فسق سے توبہ کرلے تو بھی جب تک بقول بعض چھ ماہ اور بقول بعض ایک سال اس کی توبہ پر نہ گزر جائے، اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔[۱۵۳]

اختلاف فی الشہادۃ

۱۔ اگر گواہوں کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو شہادت قابلِ قبول نہ ہوگی، مثلاً ایک گواہ نے بیان دیا کہ زید کے بکر پر ایک ہزار طلائی سکّے باقی ہیں اور دوسرے نے کہا کہ ایک ہزار نقرئی سکّے باقی ہیں تو ایسی صورت میں دونوں کی شہادتیں ناقابلِ قبول ہیں۔[۱۵۴]

۲۔ اگر شاہدوں کے بیانات میں ایسا اختلاف ہو جس سے اصل واقعے میں اختلاف لازم آتا ہو تو ان کی شہادتیں غیر معتبر ہوں گی، لیکن اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ واقعے کے کسی ایک جزیئے میں ایسا اختلاف ہو جس سے اصل موضوع شہادت میں اختلاف نہ ہو رہا ہو تو اختلاف غیر معتبر اور شہادت معتبر ہوگی، مثلاً ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ تم نے یہ مال میرے ہاتھ فروخت کر دیا ہے، لہٰذا یہ مال میرے سپرد کر دو، اور ایک گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے مال فلاں مکان میں فروخت کیا تھا اور دوسرے نے کہا کہ فلاں دکان میں فروخت کیا تو دونوں گواہوں کی گواہی معتبر ہوگی کیونکہ مال کی فروخت کی بابت دونوں گواہوں کے بیانات ایک ہیں۔[۱۵۵]

۳۔ اگر مال مغصوب کے رنگ یا جنس یعنی نر و مادہ ہونے میں شاہدوں کے بیانات مختلف ہوں، تو شہادت ناقابلِ قبول ہوگی۔ مثلاً ایک گواہ نے مغصوب جانور کے بارے میں بیان کیا کہ اس کا رنگ زرد

---

[۱۵۱] شرح فتح القدیر: ۶ : ۱۰ — ایضاً در مختار: ۵۴۴ طبع کلکتہ ۱۸۵۶

[۱۵۲] ایضاً، ص ۱۱

[۱۵۳] ایضاً

[۱۵۴] المجلۃ: ۳۸۵

[۱۵۵] ایضاً

تھا اور دوسرے گواہ نے بیان دیا کہ سرخ تھا یا ایک نے بیان کیا کہ مغصوب جانور نر تھا اور دوسرے نے کہا کہ مادہ تھی تو ان دونوں کی شہادتیں ناقابلِ قبول ہوں گی[156]

۴۔ اگر کسی معاملے کے بارے میں دعویٰ کیا جائے اور بدل کی مقدار میں اختلاف ہو جائے مثلاً ایک گواہ کہے کہ یہ مال پانچ سو میں فروخت کیا گیا اور دوسرے نے شہادت دی کہ تین سو میں فروخت کیا گیا تو دونوں شہادتیں ناقابلِ قبول ہوں گی[157]

۵۔ اگر مدعی کسی پر ڈیڑھ ہزار روپے کا دعویٰ کرے، پھر اپنے دعوے کے ثبوت میں دو گواہ پیش کرے، اور ایک گواہ ایک ہزار بتائے اور دوسرا ڈیڑھ ہزار کہے تو اس گواہ کی شہادت مانی جائے گی جو ایک ہزار کہے کیونکہ ایک ہزار کی رقم میں دونوں گواہ متفق ہیں[158]

رجوع عن الشہادہ

۱۔ اگر حاکم کے فیصلہ کرنے سے قبل گواہ اپنی گواہی سے رجوع کر لے تو اس کی گواہی ساقط ہو جائے گی۔ یعنی حاکم اس گواہی کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صادر کرنے کا مجاز نہ ہوگا اور گواہی سے رجوع کرنے والے گواہ پر کوئی تاوان بھی نہیں ہوگا اس لیے کہ اس نے مدعی یا مدعیٰ علیہ میں سے کسی کا حق تلف نہیں کیا ہے[159]

۲۔ البتہ اگر گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر حاکم نے فیصلہ کر دیا، اس کے بعد گواہوں نے اپنی گواہی سے رجوع کر لیا تو حاکم کا فیصلہ علیٰ حالہٖ باقی رہے گا البتہ گواہوں پر تاوان واجب ہوگا[160]

۳۔ رجوع عن الشہادۃ وہی معتبر ہوگا جو حاکمِ مجاز کی عدالت میں ہو[161]

۴۔ دو گواہوں نے گواہی دی کہ فلاں شخص پر فلاں شخص کی اتنی رقم باقی ہے۔ حاکم نے ان دونوں گواہوں کی بنیاد پر فیصلہ کر دیا اور مدعیٰ علیہ سے اتنی رقم مدعی کو دلوا دی۔ بعد میں ان دونوں گواہوں نے اپنی گواہی سے رجوع کر لیا تو ان پر اتنے مال کا تاوان واجب ہوگا جو وہ مشہود علیہ کو ادا کریں گے۔ کیونکہ انھی کی گواہی کی وجہ سے مشہود علیہ کو وہ رقم ادا کرنا پڑی ہے[162]

---

[156] المجلہ، ۳۸۶ [157] ایضاً
[158] ہدایہ : ۳ : ۲۲۷ [159] ایضاً : ص ۲۲۹
[160] ایضاً: ص ۲۳۰ [161] ایضاً [162] ایضاً

۵۔ اگر دو گواہوں میں سے صرف ایک گواہ نے رجوع کیا تو وہ نصف مال کا تاوان ادا کرے گا[۶۳]

۶۔ اگر کسی قتل کے مقدمے میں حاکم نے دو گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر کسی شخص کو قصاص میں قتل کرادیا اور بعد میں ان دونوں گواہوں نے اپنی شہادت سے رجوع کرلیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان دونوں گواہوں سے قصاص میں قتل کیے جانے والے شخص کی دیت (خون بہا) وصول کیا جائے گا اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ ان دونوں گواہوں کو قتل کرایا جائے گا[۶۴]

تزکیۃ الشہود

۱۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حدود و قصاص کے مقدمات میں گواہوں کا تزکیہ (یعنی ان کے چال چلن کا پتا لگانا) قاضی کے لیے ضروری ہے، دیگر مقدمات میں ضروری نہیں۔ البتہ اگر فریقِ مخالف گواہوں پر عیب لگائے تو گواہوں کا تزکیہ کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک تمام مقدمات میں گواہوں کا تزکیہ کرنا ضروری ہے۔ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے[۶۵]

۲۔ تزکیہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مستورہ (خفیہ) دوسرا اعلانیہ۔ ہمارے زمانے میں اول الذکر افضل ہے[۶۶]

۳۔ شاہدوں کا تزکیہ اس حلقے سے ہوگا جس سے ان کا تعلق ہو۔ مثلاً اگر وہ طلبا میں سے ہوں تو ان کا تزکیہ ان کے اساتذہ اور درس گاہوں کے قابلِ اعتماد لوگوں سے کیا جائے گا۔ اور وہ فوجی ہوں گے تو ان کے افسروں سے ان کے چال چلن کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ اگر وہ سرکاری افسر ہوں گے تو ان کے افسرانِ بالا سے، اگر وہ تاجر ہوں گے تو ان کے حلقے کے قابلِ اعتماد تاجروں سے، اگر اہلِ حرفہ میں سے ہوں گے تو ان کے کارخانہ داروں سے، اور اگر عوام میں ہوں گے تو ان کے محلے یا گاؤں کے قابلِ اعتماد لوگوں سے ان کی بابت دریافت کیا جائے گا[۶۷]

۴۔ تزکیہ مستورہ کی صورت یہ ہے کہ قاضی ایک کاغذ پر گواہ کا نام، ولدیت، حلیہ اور اس کی جائے

---

[۶۳] ہدایہ ۳ : ۲۴۱ [۶۴] ایضاً، ص ۲۴۳

[۶۵] البابرتی اکمل الدین : شرح العنایہ علی الہدایۃ علی ہامشۃ فتح القدیر : ۶ : ۱۲

[۶۶] ایضاً، ج ۶، ص ۱۳ [۶۷] المجلہ : ۳۸۷

رہائش سے قریب ترین مسجد کا نام لکھے اور اسے ایک لفافے میں بند کر کے اس پر اپنی مہر ثبت کر دے اور اپنے کسی نہایت قابل اعتماد آدمی کے بدست وہ لفافہ معدل (وہ آدمی جس سے گواہ کے حالات کا پتا لگایا جا رہا ہو) کے پاس بھیج دے۔ ضروری ہے کہ معدل نیک، زاہد، متدین اور واقف کار ہو۔ گوشہ نشین قسم کا نہ ہو۔ نہ لالچی اور بالکل بے حیثیت ہو۔ اگر فقیہ ہو تو انسب ہے۔ معدل کو چاہیے کہ قاضی کا ملفوف ملتے ہی گواہ کے پڑوسیوں سے اس کے حالات معلوم کرے، اور صرف اس کی عبادت و ریاضت ہی نہ دیکھے بلکہ یہ بھی پتا کرے کہ معاملات کے لحاظ سے وہ کیسا آدمی ہے، اور اگر گواہ معیار پر پورا اترتا ہو تو اس کے نام کے نیچے لکھ دے: عدل جائز الشهادة (یعنی گواہ ثقہ اور مقبول الشہادت ہے) اور اگر بالفرض گواہ فاسق ہو تو کچھ نہ لکھے، اور اسی حالت میں قاضی کے مکتوب کو واپس کر دے یا لکھ دے کہ واللہ اعلم بالصواب۔ اور اگر گواہ مستور الحال ہو تو اس کے نام کے نیچے "مستور" لکھ دے، اور انتہائی خفیہ طریقے سے وہ مکتوب قاضی کو لوٹا دے۔ اس سارے عمل میں کمال رازداری کو ملحوظ رکھنا ہوگا ورنہ ممکن ہے کہ ملزم اور اس کے ساتھی معدل کو رشوت دینے یا کسی طور پر اس کی رائے کو متاثر کرنے کی کوشش کریں یا اس کو ایذا پہنچائیں۔[۶۸]

۵۔ اگر ایک ہی معدل سے تزکیہ کر لیا جائے تو کافی ہے لیکن افضل ہے کہ دو معدلین سے تزکیہ کیا جائے۔[۶۹]

۶۔ اگر کسی گواہ کا ایک مرتبہ تزکیہ کر لیا جائے پھر کچھ دنوں بعد وہی گواہ کسی دوسرے مقدمے میں پیش ہو تو دوبارہ تزکیہ کرنا ضروری نہیں ہے لیکن امام محمد کے نزدیک ایک ماہ گزر جانے کے بعد اور امام ابو یوسف کے نزدیک چھ ماہ گزر جانے کے بعد دوبارہ تزکیہ کرنا ہوگا، اور یہی درست ہے۔[۷۰]

۷۔ جب گواہ گواہی دے چکیں تب قاضی ان کا تزکیہ کرے، اس لیے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ شہادت کے بعد گواہوں کا تزکیہ کیا تھا۔[۷۱]

۸۔ غیر مسلم گواہ کے تزکیہ میں یہ دریافت کیا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب پر عامل ہے یا نہیں؟

---

۶۸ شرح فتح القدیر: ۶ : ۱۳   ۶۹ ایضاً: ۶ : ۱۵
۷۰ ایضاً   ۷۱ اعلاء السنن: ۱۵ : ۳۸ طبع کراچی ۱۳۸۶ھ

سچ بولتا ہے یا عادتاً جھوٹ بولتا ہے ؟ دیانت دار ہے یا بددیانت ؟ ہوش و خرد والا ہے یا نرا احمق ؟[۷۲]

۹۔ نشہ باز ذمی کی شہادت مقبول نہیں ہوگی ۔[۷۳]

۱۰۔ اگر معدل لکھ دے کہ میں "گواہ" کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا تو اتنا ہی کافی ہے، گواہ قابلِ اعتبار متصور ہوگا ۔[۷۴]

۱۱۔ اگر گواہ پردیسی ہو اور اس کا کوئی معدل نہ ہو تو قاضی کو چاہیے کہ اس کے شہر کے قاضی سے اس کا تزکیہ کرائے ۔[۷۵]

۱۲۔ غلام، عورت، نابینا، محدود فی القذف اگر وہ توبہ کر لے۔ نابالغ ، بیوی شوہر کے لیے، شوہر بیوی کے لیے، باپ بیٹے کے لیے، بیٹا باپ کے لیے معدل ہو سکتے ہیں اور ان کا تزکیہ قبول کیا جا سکتا ہے ۔[۷۶]

۱۳۔ اگر معدل کے پاس سے جواب آجائے اور حاکم کسی دوسرے معدل سے بھی دریافت کرنا چاہے تو اسے دوسرے معدل کو پہلے معدل کی رائے کے بارے میں کچھ نہیں بتلانا چاہیے کیوں کہ ایسا کرنے سے دوسرے معدل کی رائے متاثر ہوگی ۔[۷۷]

۱۴۔ اگر معدل گواہ کو مجروح قرار دے دے اور اس کی گواہی ساقط الاعتبار ہو جائے تو حاکم مدعی کو یہ نہ بتائے کہ تمہارا پیش کردہ گواہ غیر معتبر ٹھہر گیا ہے بلکہ اس سے یہ کہے کہ میرے خیال میں تمہارا پیش کردہ گواہ معیار کے مطابق نہیں ہے ۔[۷۸]

۱۵۔ اگر تین معدلین میں سے دو تو گواہ کو عادل قرار دیں ۔ ایک مجروح بتلائے تو عادل قرار دینے والوں کی بات مانی جائے گی ۔[۷۹]

---

[۷۲] بحرالرائق : ۷ : ۶۴ [۷۳] ایضاً

[۷۴] ایضاً [۷۵] ایضاً ، ۷ : ۶۵ [۷۶] ایضاً : ص ۶۷

[۷۷] علاء الدین الطرابلسی : معین الحکام ، ۱۰۵

[۷۸] ایضاً [۷۹] ایضاً : ۱۰۷

۱۶۔ اگر مستورہ حاکم کے پاس مہر زدہ واپس آجائے اور اس پر کچھ نہ لکھا ہو، نہ یہ لکھا ہو کہ عادل مقبول الشہادۃ، نہ یہ لکھا ہو کہ عادل نہیں ہے یا نہ معلوم یا مجہول لکھا ہو، صراحتاً یا دلالتاً کوئی جرح نہ لکھی ہو تو ان تمام صورتوں میں حاکم گواہ کی گواہی کو قبول نہیں کرے گا۔[۵۸۰]

۱۷۔ اگر مشہود علیہ (جس کے خلاف شہادت دی جائے) تزکیہ سے قبل یا بعد شاہدوں پر کوئی ایسا الزام لگائے جو قبولِ شہادت میں مانع ہو (مثلاً یہ کہ شاہد کسی کو بچانا چاہتا ہے یا شہادت کے ذریعے کوئی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے) تو حاکم مشہود علیہ سے اس الزام کی دلیل طلب کرے گا۔ اگر مشہود علیہ نے ثابت کر دیا تو حاکم شاہدوں کی شہادت کو رد کر دے گا اور اگر ثابت نہ ہوا تو شاہدوں کا تزکیہ نہ ہونے کی صورت میں ان کے تزکیہ کے بعد اور اگر تزکیہ ہو چکا ہو (اور تزکیہ شاہدوں کے حق میں ہو) تو اسی وقت ان شہادتوں کے مطابق فیصلہ کر دے گا۔[۵۸۱]

۱۸۔ اگر دو مزکیوں میں سے ایک نے عادل اور دوسرے نے مجروح قرار دے دیا ہو تو حاکم اس شہادت پر فیصلہ نہیں کرے گا۔[۵۸۲]

۱۹۔ اگر شاہد شہادت دینے کے بعد مر جائیں یا غیر حاضر ہو جائیں تو حاکم کو اختیار ہے کہ ان کا تزکیہ کرے اور ان کی شہادتوں پر فیصلہ کر دے۔[۵۸۳]

۲۰۔ اگر مشہود علیہ حاکم سے اصرار کرے کہ شاہدوں کو قسم دی جائے کہ وہ اپنی شہادت میں کاذب نہیں ہیں اور ایسی کوئی وجہ موجود ہو کہ شہادت قسم سے قوی ہو جائے گی تو حاکم کو یہ اختیار ہے کہ شاہدوں کو قسم دے اور ان سے یہ کہے کہ اگر تم نے قسم کھالی تو میں تمھاری شہادت کو قبول کروں گا ورنہ نہیں۔[۵۸۴]

تحریری ثبوت

۱۔ مطلق تحریر یا مہر پر عمل نہیں ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر وہ تحریر یا مہر جعل سازی کے ہر شبہے سے محفوظ ہو تو وہ حکم کی بنیاد بن سکتی ہے۔

۲۔ شاہی فرامین اور عدالتی کاغذات بھی اگر جعل سازی سے مامون ہوں تو ان پر عمل ہو سکتا ہے۔

---

۵۸۰ المجلہ : ۳۸۷ — ۵۸۱ ایضاً : ۳۸۸

۵۸۲ ایضاً — ۵۸۳ ایضاً — ۵۸۴ ایضاً : ۳۸۹

۳۔ سرکاری کاغذات اگر توثیق شدہ (Certified) ہوں تو ان پر عمل ہو سکتا ہے اور وہ حکم کی بنیاد بن سکتے ہیں [۵۸۵]

قرائن قاطعہ

حکم کے اسباب میں قرائن قاطعہ یا شہادت حال یعنی (Circumstancial Evidence) بھی شمار کیے جا سکتے ہیں اور وہ بھی حکم کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ قرائن قاطعہ سے ایسے قرائن مراد ہیں جو یقین کی حد تک پہنچا دیں۔ مثلاً ایک آدمی ایک خالی مکان سے خائف و مدہوش نکلا، اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری تھی، اس کے نکلتے ہی چند لوگ گھر میں داخل ہوئے تو اسی وقت کا ذبح کیا ہوا ایک آدمی ملا۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ گھر سے نکلنے والا ہی شخص اس مقتول کا قاتل ہے۔ اس صورت میں صرف واہمی احتمالات کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی کہ شاید مقتول نے خودکشی کر لی ہو [۵۸۶]

قسم دوم۔ اقرار۔ کسی شخص کے اپنے اقرار کو بھی شہادت کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اس کے اقرار سے بھی کسی بات کی حقیقت ثابت ہو جاتی ہے۔ حضرت ماعز اسلمی کے واقعے میں راوی حضرت جابرؓ نے ماعز کے اقرار کو شہادت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے:

عن جابر ان رجلا من اسلم جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاعترف بالزنا فاعرض عنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی شھد علی نفسہ اربع مرات قال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابک جنون قال لا قال احصنت قال نعم فامر بہ فرجم بالمصلی [۵۸۷]

حضرت جابر سے روایت ہے کہ قبیلہ اسلم کے ایک شخص (ماعز اسلمیؓ) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر زنا کا اعتراف کیا تو آپ نے اس سے اپنے رخ کو پھیر لیا (وہ اعتراف کرتا رہا اور آپ اپنا رخ پھیرتے رہے) یہاں تک کہ اس نے اپنے گناہ پر چار مرتبہ شہادت دی۔ تب آپ نے دریافت فرمایا، کیا تو پاگل ہے؟ اس نے عرض کیا "نہیں" آپ نے دریافت فرمایا "کیا تو شادی شدہ ہے؟" اس نے کہا

---

۵۸۵ المجلہ: ۳۹۱ ۵۸۶ ایضاً: ۳۹۰

۵۸۷ البخاری: ۲: ۱۰۰۷ طبع کرزن پریس دہلی

جی ہاں" تب آپ کے حکم سے اسے عیدگاہ میں رجم کر دیا گیا۔

اس روایت میں ماعزؓ کے اقرار کو شہد علی نفسہٖ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ار بھی شہادت ہی کے درجے میں ہے۔ البتہ جرائم حدود میں زنا میں چار مرتبہ اقرار اور دیگر جرائم ں دو مرتبہ اقرار صریح بلا اکراہ بقائمی ہوش و حواس ہونا ضروری ہے۔ تحریری شہادت بھی اقرار کے سن میں آتی ہے۔

سم سوم، حلف بالیمین

دیوانی معاملات میں حلف بالیمین بھی قابل اعتبار ہے۔ فرنچ کوڈ میں بھی حلف بالیمین کو قابلِ عتبار تسلیم کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ[۸۸]

یعنی بار ثبوت مدعی پر ہوتا ہے اور مدعی علیہ پر قسم ہے۔

۱۔ اگر مدعی علیہ کو حلف اٹھانے کے لیے کہا جائے اور وہ اس سے انکار کر دے تو شرعاً مدعی کا دعویٰ ابت ہو جاتا ہے کیونکہ قسم سے انکار بھی اقرار ہی کی ایک صورت ہے۔

۲۔ دونوں فریقوں میں سے کسی سے اگر قسم لی جائے گی تو اللہ تعالیٰ کے نام پر لی جائے گی یعنی وہ لے گا کہ "میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں"۔

۳۔ قسم صرف حاکم یا اس کے نائب کے روبرو لی جائے گی، کسی اور کے سامنے قسم کھانے سے ر مدعی علیہ انکار کر دے گا تو وہ انکار قابلِ اعتبار نہ ہوگا[۸۹]

۴۔ قسم لینے میں نیابت ہو سکتی ہے لیکن قسم کھانے میں نیابت نہیں ہو سکتی۔ مدعی کے وکیل قسم لے سکتے ہیں، لیکن مدعی علیہ کا وکیل مدعی علیہ کی بجائے قسم نہیں کھا سکتا، بلکہ خود مدعی علیہ کو قسم کھانی ہوگی۔[۹۰]

۵۔ قسم صرف فریق مخالف کے مطالبے پر ہی لی جا سکتی ہے لیکن حاکم کی طرف سے چار مواقع پر بلا طلب بھی قسم لی جا سکتی ہے۔

(الف) جب کوئی شخص کسی میت کے ترکے میں کسی حق کا دعویٰ کرے اور اپنے دعوے کو ثابت کر دے

---

۸۸ مشکوٰۃ ... ۸۹ المجلہ : ۲۴۲ ۹۰ ایضاً

توحاکم اس سے اس بات کی قسم لے گا کہ اس نے یہ حق کسی طور پر میّت سے نہ خود وصول کیا ہے اور نہ کسی کے ذریعے وصول کیا ہے اور نہ میّت کو اپنے حق سے بَری قرار دیا ہے اور نہ کسی دوسرے کے حوالے ہوا ہے۔ اور نہ کسی دوسرے کی طرف سے یہ حق ادا کیا گیا ہے اور نہ میت کی کوئی اس کے حق کے مقابلے میں رہن ہے۔ اس قسم کو "قسم استظہار" کہتے ہیں۔

(ب) جب کسی مال کا کوئی مستحق نکلے اور اپنا دعویٰ ثابت کر دے تو حاکم اس سے اس بات پر قسم لے گا کہ اس نے اس مال کو نہ بیچ کیا ہے اور نہ ہبہ کیا ہے اور نہ کسی طرح اس نے اسے اپنی مِلک سے خارج کیا ہے۔

(ج) جب خریدار کسی چیز کو عیب کی وجہ سے واپس کرنا چاہے تو حاکم اس سے اس بات پر قسم لے گا کہ وہ اس عیب کے باوجود اس سے رضامند نہیں ہوا نہ قولاً اور نہ دلالۃً۔

(د) شفعہ کا حکم دیتے وقت حاکم شفیع سے قسم لے گا کہ اس نے کسی صورت سے کبھی اپنا حقِ شفعہ باطل نہیں کیا ہے۔[91]

۶۔ گونگے کی قسم یا قسم سے انکار اشارہ سے معتبر ہوگا۔[92]

۷۔ اگر فریقِ مخالف کی طلب پر مدعیٰ علیہ حاکم کے مطالبے سے پہلے ہی قسم کھالے تو اس کا اعتبار نہ ہوگا، حاکم کے کہنے پر دوبارہ قسم کھانی پڑے گی۔[93]

خلاصۂ کلام

مختصر یہ کہ تینوں قسم کی شہادتوں (شہادت، اقرار، حلف یالیمین) میں اصل چیز تقویٰ اور خوفِ خدا ہے۔ کسی معاشرے میں یہ بات دو چار دنوں میں پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ تبلیغ، ترغیب اور ترہیب کا عمل عرصے تک جاری رہنے سے معاشرہ خود بخود صلاح وفلاح اور نیکی و پرہیزگاری کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ قدریں بدل جاتی ہیں اور لوگ تاریکی سے نور کی طرف، بے ایمانی سے ایمان داری کی طرف اور باطل سے حق کی طرف آہستہ آہستہ چلے ہی آتے ہیں۔ اس سفر میں موانع بھی ہیں اور مشکلات بھی، لیکن اگر عزم راسخ اور جذبِ پیہم ہو تو انشاء اللہ العزیز سارے موانع دُور ہو جائیں گے:

در رہ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہا ست بجاں   شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

۹۱۔ ... ۹۲۔ ... ۹۳۔ ...

پروفیسر منظور الحق صدیقی

"رفیقِ نبوّت" ـــــ کلامِ اقبال میں

کلامِ اقبال میں ساڑھے تین سو سے زیادہ مشاہیر کا ذکر آیا ہے۔ انھوں نے ان مشاہیر کی جن جن خاص باتوں کا ذکر کیا ہے، وہ اگر یکجا کر کے لکھ دی جائیں تو انسان کی روحانی اور مادی کامیابیوں اور ناکامیوں کی ایک اجمالی تاریخ ضرور بن جائے۔ یہاں ہم رموزِ بےخودی، پیامِ مشرق، بانگِ درا، بالِ جبریل مسافر اور ارمغانِ حجاز سے وہ شعر پیش کرتے ہیں جو سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہیں۔

رموزِ بیخودی (۱۹۱۸ء)

رموزِ بیخودی کے آخر میں "خلاصۂ مطالبِ مثنوی در تفسیر سورۂ اخلاص" کے عنوان سے حضرت ابوبکر صدیق کی زبانی سورۂ اخلاص کے مطالب بیان کیے ہیں۔ ابتدائی پانچ شعروں میں بڑے ہی جچے تُلے الفاظ میں صدیقِ اکبرؓ کی زندگی کے چھ نسبتاً اہم واقعات کا ایجاز و اختصار کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں:

۱۔ من شبے صدیق را دیدم بخواب   گل ز خاکِ راہِ او چیدم بخواب

ایک رات میں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور آپ کے راستے کی خاک سے پھول چنے۔

اس کے مصرعہ ثانی کی طرف علامہ سید سلیمان ندوی نے علامہ اقبال کی توجہ دلائی۔ جواباً اقبال نے لکھا۔ "دوسرے مصرع پر آپ کا ارشاد تھا کہ مطلب زیادہ واضح ہونا چاہیے۔ اور "گل ز خاکِ راہِ او چیدم" کا کیا مطلب ہے؟ یہ واقعہ خواب کا ہے، جو خواب میں دیکھا گیا، بعینہٖ اسی طرح نظم کر دیا گیا۔"[1] اگر جواب ٹھیک نقل ہوا ہے تو مطلب پھر بھی واضح نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے "بقیہ اسی طرح"، کی بجائے "بعینہٖ" تجویز کیا۔[2]

۲۔ آن امن النّاس بر مولائے ما   آن کلیم اوّل سینائے ما

وہ ابوبکرؓ جن کے احسان ہمارے آقا پر تمام انسانوں سے بڑھ کر ہیں۔ وہ صدیق اکبرؓ جو ہمارے کوہِ سینا کے پہلے کلیم تھے۔

---

[1] اقبال نامہ، حصۂ اوّل، ص ۹۵   [2] مطالب اسرار و رموز، ص ۲۷۱

اقبال نے حاشیے میں وہ حدیث نقل کی ہے جو شعر کے پہلے مصرع کا مآخذ ہے : امن الناس علیّ فی صحبتہٖ و مالہٖ ابوبکر۔ یعنی تمام انسانوں میں مجھ پر رفاقت اور مال میں سب سے بڑھ کر احسان ابوبکر نے کیا۔ اس حدیث کی روشنی میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو صحابہ میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ رضؓ سے زیادہ کسی اور کو حضورؐ کا شرف رفاقت حاصل نہیں ہوا۔ یہ تعلق بعثت سے پہلے بھی تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قائم رہا۔ اسی حدیث میں رسول اللہ نے اپنے رفیق کے جس مالی ایثار پر اظہارِ احسان مندی فرمایا ہے بقول صاحب کشاف اس کا ذکر کلامِ پاک میں بھی ہے :

الذین ینفقون اموالھم باللیل والنھار سرًّا وعلانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم (البقرۃ: ۲۷۴)

جو لوگ دن کو اور رات کو پوشیدہ اور ظاہر طور پر اپنا مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، پس ان کے واسطے ان کے رب کے پاس ثواب ہے۔

صاحبِ کشاف لکھتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی شان میں نازل ہوئی۔ آپ نے چالیس ہزار دینار خرچ کیے۔ دس ہزار رات میں اور دس ہزار دن میں اور دس ہزار ظاہر اور دس ہزار پوشیدہ۔

قبولِ اسلام کے وقت حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس چالیس ہزار دینار نقد تھے۔ اس تمام سرمائے کو آپ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گزاری، تقویتِ اسلام اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے خرچ کر دیا۔ جامع ترمذی اور ابن ماجہ میں حضور کا ارشاد اس طرح منقول ہے :

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما نفعنی مال احد ما نفعنی مال ابی بکر قال بکی ابوبکر و قال ھل انا و مالی الا لک یا رسول اللہ۔

حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ نے مجھے کسی کے بھی مال سے مطلقاً نفع نہیں پہنچا بجز مال ابوبکر کے۔ راوی نے کہا کہ ابوبکر رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ میری ذات اور میرا مال سب آپ کے واسطے ہے۔

الخطیب نے ابو محمد سعید بن المسیب سے مرسلاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضؓ کا مال اسی طرح صرف فرماتے تھے جیسا کہ آپ اپنا مال خرچ فرماتے تھے۔ ابن عساکر ابن عباس سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا "کسی شخص کے ہاتھوں نے مجھے ابوبکر رضؓ کے ہاتھوں سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچایا، جس نے مجھے جانی اور مالی امداد دی اور اپنی بیٹی سے میری شادی کی۔

اس شعر کے مصرع ثانی میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو "ہمارے سینا کا پہلا کلیم" بتایا ہے۔ اس کی تشریح

ں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں: "کہ وہ پہلے مسلمان تھے۔ رسول اللہ کی ذات بابرکات کو کوہِ طور سینا فرض
رلیا جائے تو اس طور پر تجلیم سب سے پہلے پہنچا وہ حضرت ابوبکر صدیق تھے۔" ممکن ہے اقبال کے پیش نظر
ہ واقعہ ہو جب مسجد حرام میں حضور اکرم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیق نے پہلی بار کھلے بندوں
لمایہ دین اور اشاعتِ اسلام کی۔ ابتدائے بعثت سے اس وقت تک مخفی طور پر دعوتِ اسلام دی جاتی
ں۔ صدیق رضؓ کے خطاب سے کفار بھڑک اٹھے اور آپؓ کو اتنا زدوکوب کیا کہ آپ قریب المرگ ہو گئے۔

۳۔ ہمت او کشتِ ملت را چو ابر ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

حضرت ابوبکر صدیق کی ہمت ایسی تھی جیسا کہ کھیتی کے لیے ابرِ رحمت۔ وہ اسلام، غار، بدر اور قبر میں دوسرے تھے۔

مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کے نام اپنے مکتوب گرامی مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء میں علامہ
قبال لکھتے ہیں: "صدیق رضی اللہ عنہ پر بھی خوب مضمون لکھا گیا ہے۔ میں نے ان کی زندگی کے تمام
قعات ایک شعر میں بند کر دیئے ہیں۔[۵۳] اس کے بعد مذکورہ شعر لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کے
پہلے ہی مصرع کی تشریح حضرت ابوبکرؓ کی پوری کتابِ زندگی ہے۔ آپ کی وساطت سے مسلمانوں کو جو سربلندی
سیب ہوئی اور اسلام کو جو استقلال اور فروغ حاصل ہوا اسے دو دو تین تین حرفی صرف سات لفظوں میں
یان کر دینا، دریا کو کوزے میں سمو دینا ہے۔ دوسرے مصرعے میں آپؓ کے چار امتیازات بتائے ہیں۔
س شعر کا ماخذ تابعین کے سردار ابومحمد سعید ابن المسیب کا وہ قول ہے جو اقبال نے رموزِ بیخودی کے پہلے
یڈیشن کے حاشیے میں درج کیا تھا:

کان ابوبکر الصدیق من النبی مکان الوزیر وکان یشاورہ فی جمیع امورہ و کان
ثانیہ فی الاسلام وثانیہ فی الغار وکان ثانیہ فی العریش یوم بدر وکان ثانیہ فی القبر
لم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقدم علیہ احداً۔

ابوبکر صدیق کی حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں وزیر کی تھی۔ آپ ہر معاملے میں ابوبکر سے مشورہ
کرتے۔ ابوبکرؓ اسلام میں اور غار میں دوسرے تھے۔ جنگِ بدر کے دن سائبان میں دوسرے تھے، اور قبر میں دوسرے
تھے۔ رسول اللہ کے نزدیک ان سے مقدم کوئی نہ تھا۔

---

۵۳ اقبال نامہ: ۱: ۵۷

یہ قول جانِ اختصار ہے اور اسے اور بھی کم الفاظ پر مشتمل ایک شعر میں باندھ دینا کمالِ بلاغت ہے۔ دوسرے مصرعے میں اقبال نے بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ وہ غارِ ثور میں آپ کے ساتھ تھے۔ جنگ بدر میں آپ کے ساتھ تھے اور موت کے بعد آنحضرتؐ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

روایات میں جن ہستیوں کا اوّل اوّل اسلام لانا مسلّم ہے ان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے علاوہ حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت ہیں۔ ان میں سے حضرت خدیجہؓ آپؐ کی حرم تھیں۔ حضرت علیؓ ابھی آٹھ برس کے تھے یعنی سنِ بلوغت کو بھی نہ پہنچے تھے اور ساتھ ہی رسول اللہ کے زیرِ کفالت تھے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے۔ ان چاروں میں سے آزاد اور کاملاً خود مختار صرف حضرت ابوبکرؓ تھے۔

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک ہجرت حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک پُرخطر سفر تھا۔ دورانِ سفر میں سب سے زیادہ خطرناک وہ تین روز تھے جن میں آپؐ نے غارِ ثور میں قیام فرمایا۔ اس وقت آپ کے ساتھ صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ اس پر قرآن گواہ ہے۔ ثانی اثنین اذ ھما فی الغار۔
یعنی جب وہ دو غار میں تھے تو ان دو میں سے دوسرا۔ ثانی غار اسی لیے کہا گیا ہے۔

آپؓ ثانیِ بدر بھی تھے۔ اس سے مراد ہے کہ میدانِ بدر میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اور محافظِ خاص تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سعد بن معاذ کی تجویز پر آنحضرتؐ کے لیے کھجور کا ایک سائبان (عریش) تیار کیا گیا۔ البزار حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "یوم بدر میں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آفتاب سے بچاؤ کی غرض سے ایک سائبان بنا دیا تھا۔ پھر ہم نے کہا رسول اللہ کے ساتھ کون رہے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مشرکین میں سے کوئی آپ پر حملہ کر دے۔ پس خدا کی قسم ماسوا ابوبکر کے ہم میں سے کوئی قریب نہ گیا۔ وہ ننگی تلوار سے رسول اللہ پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ جس کسی نے آپؐ پر حملہ کیا ابوبکرؓ اس پر ضرور حملہ آور ہوئے۔ اس لیے آپؓ بہادر ترین لوگوں میں سے ہیں۔"

آخر میں ثانیِ قبر کہا گیا ہے۔ ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں آپؐ کے پہلو میں دفن ہیں۔

۴۔ گفتمش اے خاصۂ خاصانِ عشق   عشقِ تو سرمطلعِ دیوانِ عشق

میں نے عرض کیا کہ اے عشق کے برگزیدوں میں سے برگزیدہ، آپؓ ہی کا عشق دیوانِ عشق کا پہلا مطلع ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی ذاتِ گرامی معیارِ عشقِ رسولؐ ہے۔ حضور کا ہر فرمان بےچون وچرا اور بلادلیل حجت ماننا اور ایسے حالات میں بھی ماننا جب مصلحتِ وقت اور ظاہر اسباب اس کے خلاف ہوں، آپؓ کا معمول رہا ہے۔ عشقِ حق میں بھی آپؓ یگانہ تھے۔ بایں ہمہ جذبِ کامل آپ نے الوہیت اور نبوت، خدا اور انسان اور خالق ومخلوق کے فرق کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ دوسرے مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ آغازِ سلام سے اب تک خدا اور رسولِ خدا کے جتنے عشاق گزرے ہیں ان میں اولیت آپؓ کو حاصل ہے۔

۵۔ پختہ از دستت اساسِ کارِ ما چارۂ فرما پئے آزارِ ما

ہمارے کام کی بنیاد آپ ہی کے ہاتھ سے پختہ ہوئی۔ اب بھی آپ ہی ہماری بیماری کا علاج تجویز کیجیے

آنحضرتؐ کی رحلت پر اشاعتِ دین کا فریضہ پہلی مرتبہ ایک غیر نبی کے کندھوں پر رکھا گیا۔ ابھی دنیا کو یہ دکھانا تھا کہ ایک شخص جو براہِ راست خدا سے ہدایات حاصل نہیں کرتا اور نہ عصمت کا مدعی ہے اس فریضے کو کس طرح بجا لاتا ہے۔ کتاب وسنت کی رہنمائی کی عملی شکل کیا ہوگی۔ دورِ نبوت کے بعد یہ اہم ترین کام تھا جو کسی شخص کے سپرد ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی جو بنیاد رکھی تھی وہ ابوبکرؓ کے زمانے میں اس قدر پختہ ہوگئی کہ مستقبل اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ بحیثیت غیر نبی حضرت ابوبکرؓ نے پہلی بار دنیا کے سامنے اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کا عملی نمونہ پیش کیا۔ رموزِ بیخودی میں "رسالت" کے عنوان سے ۳۳ شعر ہیں[۵۴]۔ شروع کے چودہ شعروں میں بتایا گیا ہے کہ ہم صرف رسول اللہ کے ساتھ نسبت ہونے کی وجہ سے ایک قوم ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

۶۔ معنی حرفم کنی تحقیق اگر بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر

۷۔ قوتِ قلب وجگر گردد نبی از خدا محبوب تر گردد نبی

جو کچھ میں نے کہا ہے اگر تو اس کی تحقیق کرے اور اس کے لیے حضرت ابوبکرؓ کی نگاہ پیدا کرلے تو حضورؐ کی ذاتِ گرامی تیرے قلب وجگر کی قوت بن جائے گی اور نبی اللہ سے بھی زیادہ محبوب بن جائے گا۔

پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء)

اس کتاب کی پیش کش میں فرماں روائے افغانستان امیر امان اللہ خان سے خطاب میں دو مختلف

---

[۵۴] اسرار ورموز، ص ۱۱۵ - ۱۱۸

مقامات پر حضرت صدیقؓ کا اسم گرامی آتا ہے :

۸ ۔ تازہ کن آئینِ صدیقؓ و عمرؓ چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر[۵۵]

۹ ۔ سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب ذرۂ عشقِ نبی از حق طلب[۵۶]

حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کے خیالات و عملی اقدامات کو فروغ دے اور اپنے ملک میں ان کا سا نظامِ حکومت قائم کر۔ صبا کی طرح لالہ صحرا کی پرورش کر۔ لالہ صحرات مراد وہ غیور افغان مراد ہیں جو تہذیبِ مغربی کے بُرے اثرات سے اب تک محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اس دردمندی کی خواہش کر جو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ میں تھی اور خدا سے دعا کر کہ تجھے بھی حاصل

بانگِ درا (۱۹۲۴ء)

بانگِ درا میں "صدیقؓ" کے عنوان سے مندرجہ ذیل نظم ہے :

۱۰ ۔ اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحاب سے کہا دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار

۱۱ ۔ ارشاد سُن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اُٹھے اس روز اُن کے پاس تھے درہم کئی ہزار

۱۲ ۔ دل میں یہ کہہ رہے تھے صدیقؓ سے ضرور بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار

۱۳ ۔ لائے غرض کہ مال رسولِ امینؐ کے پاس ایثار کی ہے دستِ نگر ابتدائے کار

۱۴ ۔ پوچھا حضور سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار

۱۵ ۔ رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟ مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

۱۶ ۔ کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

۱۷ ۔ اتنے میں وہ رفیقِ نبوتؐ بھی آگیا جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

۱۸ ۔ لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار

۱۹ ۔ مِلکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس اسپِ قمر سم و شتر و قاطر و حمار

۲۰ ۔ بولے حضورؐ چاہیے فکرِ عیال بھی کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار

۲۱ ۔ اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

۲۲ ۔ پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول بس[۵۷]

---

۵۵ اسرار و رموز، ص ۵ ۵۶ ایضاً، ص ۸ ۵۷ ایضاً، ص ۲۵۰-۲۵۲

واقعہ غزوۂ تبوک (۹ھ) کا ہے۔ اس کا ماخذ ابوداؤد اور ترمذی ہیں۔ روایت عمرؓ بن الخطاب کی ہے۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ اس نظم میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو "رفیق نبوت" کہا ہے اور اسلام کے فروغ کے لیے ایک بے مثال مالی ایثار کا ذکر کیا ہے۔

بانگ درا کی مشہور نظم خضر راہ میں بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر ہے:

۲۳۔ اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش ‌ ‌ ‌ ‌ اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

یہ شعر اقبال کی طویل نظم خضر راہ سے ہے۔ شارح اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں: "اے مسلمانو! مجھے افسوس ہے کہ تم خفی اور جلی یعنی پوشیدہ اور ظاہر میں فرق نہیں کر سکتے۔ تم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ضروری کیا ہے اور غیر ضروری کیا ہے، یعنی تم یہ نہیں جانتے کہ اصولی باتیں کیا ہیں اور فروعی امور کیا ہیں۔ میری یہ کہ جو قومیں دنیا میں ترقی کرنے کی آرزو مند ہوتی ہیں وہ جلی (واضح اصول) کو چھوڑ کر خفی (فروعی یا مبہم امور) کا اتباع نہیں کیا کرتیں۔ اے نادانو! تم کب تک اس مسئلے پر آپس میں لڑتے رہو گے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ میں سے کون افضل ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ مرشد رومی کا ارشاد ہے:

نورِ حق کے بر تو گردد منجلی ‌ ‌ ‌ ‌ اے گرفتہ ابوبکرؓ و علیؓ

تاریخ دولتِ فاطمیہ

مولانا رئیس احمد جعفری

ہمارے مورخوں نے اپنی کتابوں میں مصر کے فاطمیین کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق تھے۔ حالانکہ فتوحات کی وسعت، اسلام کی تبلیغ، علم کی ترویج اور غیر مسلموں سے روادارانہ سلوک کے باعث وہ تاریخ اسلام کا ناقابلِ فراموش حصہ بن چکے ہیں۔ اس اعتبار سے اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں پوری غیر جانبداری کے ساتھ فاطمیوں کے محاسن و کمال اور ان کے سیاسی کارناموں کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: ۵۳۰

ملنے کا پتا:- ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاھور

پروفیسر محمد صدیق

اقبال اور مسینون

ہندوستان میں تحریک آزادی مختلف مراحل طے کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں نئے دستوری تجاویز کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، تو یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ ہند کی تمام سیاسی جماعتوں بالخصوص مسلم لیگ اور کانگرس کے نقطۂ نگاہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس ذہنی اور اصولی خلیج کو پاٹنے کے لیے برطانیہ نے لندن میں گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا تاکہ آئینی مسائل کا متفقہ حل تلاش کیا جا سکے۔

پہلی گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۰ء سے ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک جاری رہی۔ اس کا افتتاح جارج پنجم شاہ برطانیہ نے لندن میں کیا۔ اس کانفرنس میں علامہ اقبال کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء سے شروع ہو کر یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک منعقد ہوتی رہی۔ تیسری گول میز کانفرنس کا اجلاس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء سے ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں علامہ کو شرکت کی دعوت دی گئی اور آپ ان دونوں کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جب علامہ انگلستان کو روانہ ہوئے تو سید امجد علی ان کے رفیق سفر تھے۔ سید فقیر وحید الدین رقم طراز ہیں:

"۱۹۳۲ء کی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جاتے ہوئے جب ڈاکٹر صاحب کا جہاز بندرگاہ "وینس" پر لنگر انداز ہوا، تو ڈاکٹر صاحب نے سید امجد علی سے جو ان کے رفیق سفر تھے، فرمایا کہ یہاں سے لندن ٹرین میں چلیں گے اور راستے میں دو تین دن پیرس میں ٹھہریں گے۔ چنانچہ یہ دونوں وینس سے ٹرین میں سوار ہو کر پیرس پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے امراؤ سنگھ مجیٹھیا موجود تھے۔" "پیرس پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے امراؤ سنگھ مجیٹھیا سے کہا کہ مجھے پیرس میں پہلے نپولین کی قبر پر جانا ہے۔ پھر مشہور ریسرچ اسکالر مسیگ نون (مسینون) سے ملاقات کرنی ہے۔ اور تیسرا کام یہ ہے کہ میں فرانس کے شہرۂ آفاق فلسفی پروفیسر برگسان سے ملنا چاہتا ہوں۔"[1]

---

[1] روزگار فقیر جلد اوّل، ص ۱۳۳، ۱۳۴۔ ایڈیشن ۱۹۶۶ء

امراؤ سنگھ مستقل طور پر پیرس میں مقیم تھے۔ انھوں نے شاعر اور صحافی کی حیثیت سے جو شہرت حاصل کی تھی، اس نے ان کو بہت سی علمی شخصیتوں کے قریب کر دیا تھا۔ برگسان اور مسینون بھی ان شخصیتوں میں تھے، جن تک امراؤ سنگھ کی رسائی تھی۔

مسینون کے ساتھ ملاقات کے وقت سید امجد علی کے علاوہ امراؤ سنگھ بھی یقیناً موجود ہوں گے، کیوں کہ پیرس پہنچتے ہی علامہ نے ان سے یہ فرمائش کی تھی۔ علامہ نے "جاوید نامہ" مسینون کو تحفۃً ارسال کیا۔ امراؤ سنگھ علامہ کے مداح تھے۔ ان پر مضامین لکھ چکے تھے۔ ان کے اشعار کا ترجمہ انگریزی میں کر چکے تھے اور ان کے دوست تھے۔ علامہ نے عطیہ فیضی کے نام ایک خط، جولائی ۱۱۹۱ء کو لکھا:

"میں نے اپنے دوست سردار امراؤ سنگھ صاحب کو (جنھیں امید ہے آپ جانتی ہوں گی) لکھا ہے کہ مجھے ان شعار کا انگریزی ترجمہ بھیجیں۔"[۵۲]

جب علامہ پیرس میں تھے تو اتفاق سے برگسان وہاں موجود نہیں تھا۔ اس وجہ سے برگسان سے تو ملاقات نہ ہو سکی۔ چنانچہ وہ نپولین کی قبر پر تشریف لے گئے۔ اس کے علاوہ وہ مسینون سے ان کے گھر پر ملے۔ یہ ملاقات ۱۳ نومبر ۱۹۳۲ کو ہوئی۔ جس کا ذکر خود مسینون نے بھی کیا ہے۔ اس ملاقات سے علامہ نے اسلام، مطالعہ اسلام اور اہل مغرب کا مذہب اسلام سے تعصب جیسے اہم موضوعات پر بحث کی۔ اس علمی بحث کے متعلق سید وحید الدین لکھتے ہیں:

"مشہور اسکالر میسگ نون سے ملاقات کے وقت سید امجد علی، ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے میسگ نون سے دریافت کیا کہ مغرب کے مورخین کو اسلام سے جو تعصب وعناد ہے، وہ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو رہا ہے اور اسلام کی صداقت وحقیقت ان پر آشکار اور واضح ہوتی جارہی ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فرانسیسی عالم نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے کہ اب مغربی مورخین نسبتاً غیر جانب دارانہ نقطہ نگاہ سے اسلامی تحریکوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ میسگ نون نے یہ بھی کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں۔ انھوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا، اور تعلیم ومعاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے مواقع عطا کیے ——— میسگ نون سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات بہت دیر تک رہی، اور ان دونوں عالموں کے درمیان اہم تبادلہ خیال ہوتا رہا۔"[۵۳]

---

۵۲ اقبال نامہ۔ شیخ عطاء اللہ۔ جلد دوم، ص ۱۴۹۔ ۵۳ روزگار فقیر جلد اول، ص ۱۳۵، ایڈیشن ۱۹۶۶

حضرت علامہ مسینون کی معروف تحقیقی کاوش "کتاب الطواسین" کے مطالعہ کے بعد ان کے زیادہ قریب ہوئے، کیوں ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کو آپ نے حافظ اسلم جے راج پوری کے نام ایک خط میں لکھا۔

"منصور حلاج کا رسالہ "کتاب الطواسین" جس کا ذکر ابن حزم کی "فہرست" میں ہے فرانس میں شائع ہو گیا ہے۔ مؤلف (مسینون) نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں۔ آپ کی نظر سے گزرا ہو گا۔ حسین کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزا دہی میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے، اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ غیر صوفیا قریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے۔ معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر دلدادہ کیوں ہو گئے"[۴۵]

اس خط میں علامہ ممدوح نے مسینون کی اس محنت اور علمی تبحر کی تعریف کی ہے کہ انھوں نے "کتاب الطواسین" کو مفید اور پُر مغز حواشی سے آراستہ کر کے شائع کیا ہے۔

۱۷ مئی ۱۹۱۵ کو آپ کتاب الطواسین کے بارے میں حافظ صاحب کو یہ لکھتے ہیں۔ مگر اپنے معروف خطبات میں خودی کی بحث کرتے ہوئے منصور حلاج کا ذکر کرتے ہیں اور جب سید نذیر نیازی ان خطبات کا ترجمہ کر رہے ہوتے ہیں تو تیسرے خطبے "ذاتِ الٰہیہ کا تصوّر اور حقیقتِ دعا" کے ترجمے کے سلسلے میں ان کو کتاب الطواسین کا مطالعہ کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل سید نذیر نیازی کے الفاظ میں پیش خدمت ہے:

"ایک روز تیسرے خطبے کے سلسلے میں جہاں خودی کی بحث آئی ہے، حلاج کا ذکر آ گیا اور حضرتِ علامہ نے بعض مسائل کی تشریح کرتے ہوئے اس صوفی مصلوب و مظلوم کی کتاب الطواسین کا حوالہ بھی دیا جس کی شہادت نے "دار" اور "جز" اور "راز اور وعظ" ایسے الفاظ میں ایک جہانِ معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ اور پھر ارشاد ہوا کہ مجھے خود بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا یونیورسٹی لائبریری میں تو شاید اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں، فرمایا "کیا مضائقہ ہے کہ میرا ذاتی نسخہ لے جاؤ اور بہ غور اس کا مطالعہ کرو۔

"لیکن ۳۱ جولائی ۱۹۳۰ کی شام کو جب میں لاہور سے دہلی روانہ ہوا اور حضرت علامہ سے اجازت طلب کی تو فرمایا کتاب الطواسین کہاں ہے۔ میں نے عرض کیا، اسمٰعیل صاحب آج ہی بغرضِ استفادہ لے گئے ہیں، صبح آپ کی خدمت میں پہنچا دیں گے۔ حضرت علامہ نے فرمایا بہتر، لیکن میں نے دیکھا کہ بہتر کہتے ہوئے ان کا چہرہ کچھ متغیر

---

[۴۵] اقبال نامہ، جلد اوّل، ص ۴۵ ۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ

سا ہو گیا جس پر مجھے بڑی ندامت ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ حضرت علامہ سے اجازت لیے بغیر مجھے کتاب اسمٰعیل کو نہیں دینا چاہیے تھی۔ میں اس وقت بڑی مشکل میں تھا۔ میرا دہلی جانا ضروری تھا اور اسمٰعیل صاحب سے ملنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ لہٰذا میرے لیے بجز خاموشی کوئی چارہ نہیں تھا۔ خجالت آمیز خاموشی جس کو شاید حضرت علامہ نے بھی محسوس کیا تھا۔ بہرحال اگلے روز دہلی پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے عزیز دوست سید سلامت اللہ شاہ سے بذریعہ تار درخواست کی کہ اسمٰعیل صاحب سے ملیں اور کتاب اگر حضرت علامہ کی خدمت میں نہیں پہنچی تو فوراً پہنچا دیں۔ لاہور سے روانہ ہوتے ہوتے بھی میں یہی بات تاکیداً ان سے کہہ آیا تھا مگر خلافِ توقع انھوں نے میرے تار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں بڑا پریشان تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ مارے خجالت کے حضرتِ علامہ کی خدمت میں کچھ لکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ پھر جب تیسرے روز شاہ صاحب کا خط آیا کہ اسمٰعیل صاحب تو لکھنؤ میں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت علامہ کا ایک عتاب نامہ بھی، تو میرے اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ عتاب نامہ خلافِ معمول انگریزی میں تھا، جس سے میں نے اندازہ کیا کہ مسائل فلسفہ یا زیادہ گہری علمی گفتگو کی طرح حضرتِ علامہ خفگی کا اظہار بھی انگریزی ہی میں کرتے ہیں۔ آخر مجبور ہو کر یہی سمجھ میں آیا کہ اس بے بسی میں ایک خط تو سید سلامت اللہ کو اور ایک لکھنؤ میں اسمٰعیل صاحب کو لکھوں۔ بارے ان کا جواب آیا کہ کتاب حضرتِ علامہ کی خدمت میں پہنچ گئی اور میری پریشانی دور ہوئی۔ لیکن حضرتِ علامہ خاموش تھے۔ لہٰذا مصلحتاً میں بھی خاموش رہا۔ آخر خدا خدا کر کے ۱۵ اگست کو ایک گرامی نامہ موصول ہوا۔

ڈیر نیازی صاحب۔ اسلام علیکم۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ کتاب الطواسین بذریعہ ڈاک لکھنؤ سے آگئی ہے۔ جلسۂ لیگ ملتوی ہو گیا ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہو گا، غالباً لکھنؤ میں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور جگہ ہو، لکھنؤ پنجاب والوں کے لیے ذرا دور رہے۔ بہت سے لوگ جانے کو تیار تھے مگر اخراجات سے گھبراتے تھے۔ عابد حسین صاحب سے کہہ دیجیے کہ مناسب ترمیم کے بعد بل بھجوا دیں۔ میں روپیہ بھجوا دوں گا۔

سورتی صاحب سے ضرور ملیے۔ وہ آپ کو تراجم کے متعلق (بالخصوص اصطلاحات تراجم کے متعلق) بہت مفید مشورہ دیں گے۔ عابد صاحب سے یہ بھی پوچھیے کہ فاؤسٹ میں PROLEGOMENA IN HEAVEN کا کیا اردو ترجمہ انھوں نے کیا ہے[۵۵]۔ والسلام

محمد اقبال

---

۵۵ مکتوباتِ اقبال مرتبہ نذیر نیازی۔ ایڈیشن اکتوبر ۱۹۷۷ء ص ۲۹ - ۳۰

میسینون نے ابن حلاج کے متعلق مفصل تحقیق کی ہے ۔ کتاب الطواسین ابن حلاج کی گفتار کا مجموعہ ہے ۔ یہ مجموعہ گفتار عربی اور فارسی دو زبانوں میں ہے ۔ کتاب الطواسین اقبال کی عزیز ترین کتب میں سے تھی ۔ میسینون نے ۱۹۱۳ء میں پیرس سے اس کو شائع کرایا تھا ۔ وہ لکھتا ہے کہ ابن حلاج کی عارفانہ گفتگو چند مقامات پر ناقابلِ فہم ہے ۔ ان دو تین مقامات کے علاوہ باقی سب باتیں معنی خیز اور گہری ہیں ۔ اس کتاب پر غور کرنے سے ابن حلاج کی زبردست شخصیت سامنے آتی ہے ۔

لفظ طواسین، طاسین کی جمع ہے ۔ یہ قرآن مجید کے حروف مقطعات میں سے ہے ۔ ان کے معنی معلوم کرنا ناممکن ہے ۔ ابن حلاج نے اسی لیے اپنی کتاب کا نام کتاب الطواسین رکھا کہ اس میں اسرار و رموز اور تصوف کے راز جمع کیے گئے تھے ۔

کتاب الطواسین مندرجہ ذیل گیارہ طاسین پر مشتمل ہے :

۱۔ طاسین معراج محمدی ۲۔ طاسین فہم

۳۔ طاسین صفا ۴۔ طاسین دائرہ

۵۔ طاسین نقطہ ۶۔ طاسین ازل والتباس

۷۔ طاسین مشیت ۸۔ طاسین توحید

۹۔ طاسین اسرار توحید ۱۰۔ طاسین تنزیہہ

۱۱۔ طاسین بوستان معرفت

۱۹۲۹ء میں میسینون نے ایک کتاب "RECUEIL DE TEXTES INDEITS" ایڈٹ کی ۔ یہ کتاب فارسی اور عربی زبان میں ہے ۔ میسینون نے وہ کتاب امراؤ سنگھ کو پیش کی تو امراؤ سنگھ نے اس نوٹ کے ساتھ وہ کتاب علامہ کی خدمت میں ارسال کی کہ یہ آپ کے لائق ہے ۔ میرے نہیں ۔ اب یہ کتاب اسلامیہ کالج سول لائنز میں مخزونہ اقبال کولیکشن کی زینت ہے ۔ اس کتاب کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے ۔

اس کتاب کا موضوع تصوف اور تاریخ تصوف ہے جس میں میسینون نے حیات، حیات بعد ممات، روح اور حقیقت روح کے متعلق مختلف مسلمان صوفیا اور صوفی شعرا کے اقوال فارسی اور عربی میں جمع کیے ہیں ۔ ان صوفی شعرا اور صوفیا کا مختصر سوانحی خاکہ بھی فرانسیسی زبان میں تحریر کیا ہے ۔ یہ کتاب ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جسے میسینون نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلے حصے میں پہلی صدی ہجری سے ۲۹۰ ہجری تک کے صوفیا کا

کا کلام اور سوانحی خاکہ ہے۔ دوسرا سیکشن ۲۹۰ھ سے ۵۰۰ھ تک کے صوفیا کے کلام اور سوانحی خاکے سے مزین ہے۔ تیسرا سیکشن ۵۰۰ھ سے شروع ہو کر آخری دور تک آتا ہے۔ اور چوتھا سیکشن مسلم صوفی فلسفیوں کے خیالات، فلسفہ اور ان کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ اس کتاب پر امراؤ سنگھ نے ایک آٹھ سطری عبارت بزبانِ انگریزی لکھ کر علامہ کو ۱۴ نومبر ۱۹۲۹ء کو پیرس سے ارسال کی۔

حضرت علامہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسینون سے اپنا علمی اور ذاتی تعلق قائم رکھا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اس زمانے میں پیرس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حضرت علامہ نے ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء کو یعنی اپنی رحلت سے تقریباً ۸ ماہ پہلے عبداللہ چغتائی کو خط لکھا اور اس میں اس عظیم فرانسیسی مستشرق کے نام سلام بھیجا۔ خط کی نقل درج ذیل ہے۔

لاہور۔ ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء

ڈیر ماسٹر عبداللہ!

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ بخیریت ہیں۔ چغتائی صاحب سنا ہے کہ اب لاہور پہنچ گئے ہیں، لیکن مجھ سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کے ذہن میں جو تجویز ہے، اس کے معلوم ہونے پر رائے ظاہر کر سکوں گا۔

اٹالین رسالوں کے مضامین کا انگریزی ترجمہ بہت جلد ارسال کیجیے۔ بلکہ اصلی رسالے بھی ترجمہ کے ساتھ بھیج دیجیے۔ یہ دونوں رسالے محفوظ رکھے جائیں گے اور جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کو دے دیے جائیں گے یا اگر آپ چاہیں تو ان کو بذریعہ ڈاک آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔

باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ شیدائی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ سلام قبول کریں۔ لاہور میں سخت گرمی ہے۔ ساون کا مہینہ غیر معمولی طور پر خشک گزرا ہے۔ آج کل پیرس میں خوب موسم ہوگا۔ قادیان کے احمدیوں میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور خلیفہ قادیان پر ان کے باغی مریدوں کی ایک جماعت نے نہایت فحش الزام لگائے ہیں۔ نقصِ امن کے احتمال سے وہاں کل سے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کیا گیا ہے۔

سید راس مسعود وزیر معارف بھوپال دفعتاً اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے۔ خدائے تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ بڑے مخلص اور دردمند آدمی تھے۔ پروفیسر MASSIGNON سے آپ کی ملاقات ہو تو میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام عرض کیجیے۔ والسلام[56]

محمد اقبال

---

[56] اقبال نامہ۔ مرتبہ شیخ عطا اللہ۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۶

علامہ اقبال نے اس جہانِ فانی کو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو خیر آباد کہا۔ مسینون ۱۹۴۵ء میں ہندوستان آتے ہیں۔ شاعرِ مشرق کی وفات کے تقریباً ساڑھے سات سال بعد وہ ۱۵ جون ۱۹۴۵ء میں ان کی آرامگاہ پر حاضری دیتے ہیں۔ مسینون نے بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں تک ان سے اپنا قلبی و روحانی رشتہ استوار رکھا۔ مسینون نے ۱۹۶۲ء میں اس فانی دنیا سے کوچ کیا۔

ایوا میروچ (Eva Meyerowich) نے فرانسیسی میں علامہ کی پیامِ مشرق اور جاوید نامہ کا ترجمہ کیا تو پیامِ مشرق کے ترجمے پر مسینون نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا۔ یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ مسینون نے ابنِ عربی کے فلسفے اور نظریات پر ایک مستند کتاب لکھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے عہدِ سپین پر بھی کام کیا۔ آپ کی کتاب الطواسین ۱۹۱۳ء میں اور اخبار حلاج ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔

سطعات

از: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ——— اردو ترجمہ: مولانا سید محمد متین ہاشمی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی برِصغیر پاک و ہند کی وہ عظیم شخصیت ہیں، جنھیں پورے عالمِ اسلامی میں نہایت قابلِ فخر اور بلند مرتبت ہستی سمجھا جاتا ہے ——— وہ بہترین مصلح، بہت بڑے مصنّف، جیّد عالمِ دین، نامور مفسّر، جلیل القدر محدّث، بہت بڑے فقیہ، بلند پایہ مفکر اور عظیم صوفی تھے۔ ان کی تصنیفات اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ ہر دَور کے لیے مفید اور قابلِ عمل ہیں۔

شاہ صاحب کی گراں قدر تصنیفات میں "سطعات" کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس کے اردو ترجمے کی شدید ضرورت تھی۔ ملک کے مشہور عالم مولانا سید محمد متین ہاشمی نے اس کو اُردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے ——— فاضل مترجم نے حلِ طلب مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے حالات اور ان کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

قیمت: ۱۳ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

پروفیسر علی محسن صدیقی

چلپی ضیاء الحق حسام الدینؒ

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ مثنوی معنوی کے دفتر چہارم کے آغاز میں فرماتے ہیں :

ہم چناں مقصود من زیں مثنوی　　　اے ضیاء الحق حسام الدین توئی

یہ ضیاء الحق حسام الدین جو مثنوی معنوی کا مقصود و مطلوب ہے اور مولانا نے جن کا ذکر ان اعلیٰ الفاظ میں فرمایا ہے۔ اپنے عہد کے بہت بڑے بزرگ، عالم اور صوفی تھے۔ نسلاً ترک تھے اور ترکوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو اخی تحریک سے وابستہ تھا۔ حسام الدین کے باپ دادا اناطولیہ کے ممتاز اخی تھے۔ ان اخی ترکوں میں سے ایک معزز گھرانہ ارمیہ سے قونیہ منتقل ہو کر آیا اور اسی گھرانے میں حسام الدین پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان کی تاریخ ولادت کسی تذکرے میں مذکور نہیں ہے مگر افلاکی کے ایک بیان سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ ۶۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔

حسام الدین کا نام حسن، باپ کا نام محمد اور دادا کا نام بھی حسن تھا، وہ ابن اخی ترک کہلاتے تھے اور حسام الدین بھی ابن اخی ترک کے نام سے مشہور ہوئے۔ حسام الدین ابھی کم سن ہی تھے کہ سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا مگر اس عہد کے نامور فضلا، صوفیا اور علما سے انھوں نے علم شریعت و طریقت حاصل کیا۔ جب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نوجوانی کے باوصف علم و عمل کے میدان کے شہسوار تھے۔ چلپی حسام الدین نے مولانا کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتے وقت اپنا سارا مال و متاع اللہ کی راہ میں لٹا دیا، تمام غلاموں اور باندیوں کو آزاد کر دیا، گویا فکرِ دنیا سے وارستہ ہو کر عارف رومی کی خدمت میں آئے اور فکر و عمل کی تمام تر توانائیوں کو ذکرِ الٰہی، تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کے لیے وقف کر دیا۔

حسام الدین اور ضیاء الحق ان کے القاب ہیں جو پیر رومی کی بارگاہ سے انھیں عنایت فرمائے گئے۔ اس طرح "چلپی" کا لفظ جو سابقہ و لاحقہ کے طور پر ان کے نام کے ساتھ آتا ہے، ایک لقب ہی ہے۔ قدیم ترکی میں اس لفظ کے معنی حسین و جمیل معشوق کے ہیں، لیکن جلد ہی اس کا استعمال معشوقِ حقیقی کے ساتھ مختص ہو گیا۔ بعد میں "چلپی" ارباب قلم کو بھی کہا جانے لگا۔ اور علما و فضلا کے لیے اظہار احترام کے طور پر

اسے نام سے پہلے یا بعد میں شامل کر لیا گیا۔ صاحب الجواہر المضیہ فی تراجم الحنفیہ کے نزدیک اس مفہوم میں "چلپی" مترادف ہے "مولائی" کا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اس لفظ کے معنی ہیں "سیدی"۔ بہرکیف سلسلہ مولویہ کے مشائخ میں سب سے پہلے "چلپی" کا لقب حسام الدین ہی کے لیے استعمال کیا گیا اور آپ کے بعد اس سلسلے کے شیوخ لازماً چلپی سے ملقب کیے گئے۔ یہی لفظ عربی میں "جلبی" و "شلبی" بن گیا اور ترکوں میں علما کے لیے استعمال ہونے لگا۔

چلپی حسام الدین نے بیس سال سے بھی کم عمر میں مولانا رومی کا قلادۂ ارادت اپنے گلے میں ڈالا اور مولانا کے دو نائبین مولانا شمس الدین تبریزی اور صلاح الدین زرکوب سے بھی کسب کمال کیا اور مولانا شمس الدین تبریزی کی غیبت آخری کے وقت جو ۶۴۵ھ میں پیش آئی آپ بھی سخت مضطرب تھے۔

چلپی حسام الدین کی دیانت و حسن انتظام سے مولانا اس درجہ متاثر تھے کہ اپنے اوقاف کی آمدنی کا ان ہی کو نگران مقرر فرمایا تھا نیز جو کچھ فتوح سے حاصل ہوتا ان کے ہاں بھجوا دیتے اور ان ہی کے ذریعے مولانا کے متعلقین و مریدین پر یہ رقوم خرچ ہوتی تھیں، مگر خود چلپی حسام الدین کے ورع کا یہ عالم تھا کہ اس میں سے ایک گھونٹ پانی کے سوا اپنی ذات پر کچھ صرف نہ فرماتے تھے۔ دوسری جانب مولانا کا یہ دستور تھا کہ جو کچھ آتا اسے چلپی ہی کے پاس بھجوا دیتے اور ان ہی کے ذریعے اسے صرف کیا جاتا۔
مناقب العارفین کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ امیر تاج الدین نے ان سے سات ہزار دینار مولانا کی خدمت میں بطور نذر روانہ کیے اور لکھا کہ یہ حلال کی کمائی ہے۔ مولانا نے خدام سے فرمایا کہ اسے چلپی حسام الدین کے پاس لے جاؤ۔ مولانا کے صاحب زادہ سلطان ولد نے عرض کیا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے اور جو کچھ آتا ہے سب حسام الدین کے پاس بھیج دیا جاتا ہے، آخر ہم لوگوں کا کام کیسے چلے گا؟ مولانا نے فرمایا "بہاء الدین! اگر لاکھ زاہد کامل متقی حالات مخمصہ میں پڑے ہوں اور میرے پاس ایک روٹی ہو تو بھی کسی کا خیال نہ کروں گا اور اسے بھی حسام الدین ہی کے ہاں بھیجوں گا خواہ ان کے پاس دنیا بھر کا مال جمع ہو۔ کیوں کہ وہ مرد خدا ہیں اور ان کا سارا کام خدا کے لیے ہے۔ ان کو دنیا کے مال سے کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ انھیں اس میں تصرف کرنا حلال ہے اور دوسروں کے لیے حرام، کیوں کہ دوسروں میں یہ بات نہیں۔" جب یہ رقم چلپی حسام الدین کے پاس پہنچی تو انھوں نے اس میں سے سلطان ولد، ان کے بھائی چلپی امیر عالم اور سوتیلی والدہ قرہ خاتون کے ہاں بقدر ضرورت پیسے بھجوائے اور خود اپنے لیے کچھ نہ رکھا۔

چلپی حسام الدین مولانا کا اس درجہ ادب کرتے تھے کہ مدت العمر مولانا کے وضو خانے میں وضو نہ کیا اور سخت سے سخت سردی میں بھی گھر جاکر وضو کرکے آتے اور مولانا کے ساتھ نماز ادا کرتے۔

مولانا کے ایک مکتوب سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے چلپی کی سفارش کرکے انھیں خانقاہ ضیا اور لالہ کا شیخ مقرر کرایا تھا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو چلپی کو ملا اور اس سے مولانا کے اس حسن ظن کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو انھیں اپنے اس مرید خاص سے تھا، لیکن چلپی کی نسبت مولانا کے دلی خیالات کا حال مثنوی کے ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے دفتر اول کے سوا ہر دفتر میں لکھے ہیں اور جن کی تعداد چونتیس ۳۴ ہے۔ ان اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے مرید نہیں بلکہ خود مولانا ان کے مرید ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے نام پر مولانا نے مثنوی کو "حسامی نامہ" بھی کہا ہے۔ دفتر ششم کے آغاز میں فرماتے ہیں:

گشت از جذب چو تو علامۂ در جہاں گرداں "حسامی نامۂ"

مولانا کے خلیفہ شیخ صلاح الدین زرکوب نے محرم ۶۵۷ھ میں انتقال کیا تو مریدوں میں سب سے نمایاں و سربرآوردہ چلپی حسام الدین ہی تھے، اس لیے ان ہی کو اختصاص حاصل ہوا اور ان ہی کو مولانا کی نیابت عطا ہوئی۔ مگر مستقل خلافت ۶۶۲ھ میں ملی اور دس سال تک قائم رہی۔ جمادی الاخریٰ ۶۷۲ھ میں مولانا نے انتقال فرمایا تو ایک روایت کی رُو سے آپ کی وصیت کے مطابق اور دوسری روایت کی رو سے مولانا کے فرزند سلطان ولد اور مریدوں کے اتفاق سے چلپی حسام الدین آپ کے جانشین مقرر ہوئے۔ گیارہ سال تک اس منصب بزرگ پر فائز رہنے کے بعد ۱۲ شعبان ۶۸۳ھ مطابق ۲۵ اکتوبر ۱۲۸۴ء کو وفات پائی اور مولانا کے مقبرے میں پیوندِ خاک ہوئے۔ دورِ جانشینی میں چلپی نے مولانا کا مقبرہ تعمیر کرایا اور سلسلہ مولویہ کا یہ اصول مقرر کیا کہ محفل سماع نماز جمعہ کے بعد تلاوت قرآن شریف سے شروع ہوتی اور اس کے بعد مثنوی پڑھی جاتی۔

مولانا کے فرزند سلطان ولد کی روایت ہے کہ ایک بار کسی نے مولانا سے یہ دریافت کیا کہ آپ کے اصحاب خاص مولانا شمس الدین تبریزی، شیخ صلاح الدین زرکوب اور چلپی حسام الدین میں کون اعلیٰ ہے۔ مولانا نے فرمایا، شمس مثل آفتاب ہیں، صلاح الدین ماہتاب کے مانند ہیں اور حسام ستارہ ہیں لیکن حقیقت میں تینوں صاحبان یک ساں ہیں:

ہمہ را ایک شناس چو مکہ ترا　　می رسانند ہر یکے بخدا
دامن ہر یکے کہ گیری تو　　زندہ گردی دگرنہ میری تو

مگر چلپی حسام الدین کو سب سے بڑی خصوصیت یہ حاصل ہے کہ ان ہی کی فرمائش پر مولانا نے مثنوی لکھنا شروع کی۔ انھوں نے ۶۵۸ میں مولانا سے عرض کیا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ شیخ فریدالدین عطار کی منطق الطیر کے طرز پر ایک مثنوی تحریر فرما دیتے۔ مولانا نے فرمایا کہ میرے دل میں بھی یہی خیال آرہا ہے، چنانچہ مثنوی کی تحریر کا کام شروع ہوا۔ چلپی حسام الدین مثنوی کی خود کتابت کرتے اور مولانا کو سناتے تھے۔ پہلی جلد کی تحریر کے بعد چلپی کی زوجۂ محترمہ کا انتقال ہوگیا اور مخمصۂ دنیا میں ایسا الجھے کہ قریب قریب دو سال تک مثنوی کے لیے مولانا سے اصرار نہ کرسکے۔ چنانچہ مثنوی کا سلسلہ بھی موقوف رہا۔ جب چلپی کو یکسوئی ہوئی تو انھوں نے تحریک کی اور دفتر دوم کا آغاز ہوا اور یہ سلسلہ جاری ہوگیا۔ مولانا دفتر دوم کے شروع میں فرماتے ہیں:

مدتی ایں مثنوی تاخیر شد　　مہلتی بایست تا خوں شیر شد
چوں ضیاء الحق حسام الدین عناں　　باز گردانید ز اوج آسماں
چوں بمعراج حقائق رفتہ بود　　بے بہارش غنچہ ہا نشکفتہ بود

چلپی حسام الدین سے متعلق مدحیہ اشعار مثنوی کے دفتر اول سے تا بقیہ پانچوں دفاتر میں موجود ہیں، دفتر دوم کے اشعار اوپر درج کیے گئے ہیں تیسرے دفتر کے آغاز میں فرماتے ہیں:

اے ضیاء الحق حسام الدین بیار　　ایں سوم دفتر کہ سنت شد سہ بار

دفتر چہارم میں فرماتے ہیں:

اے ضیاء الحق حسام الدین توئی　　کہ گزشت از مہ بنورت مثنوی
مثنوی را چوں تو مبدا بودۂ　　گر فزوں گردد تواش افزودۂ

دفتر پنجم کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

شہ حسام الدین کہ نور انجم است　　طالب آغاز سفر پنجم است
اے ضیاء الحق حسام الدین راد　　اوستادان صفا را اوستاد

دفتر ششم میں چلپی کا ذکر یوں آتا ہے:

اے حیاتِ دل حسام الدین بسے ‏ ‏ میل می جوشد بقسمِ سادسی
پیش کش می آردت اے معنوی ‏ ‏ قسمِ سادس در تمامِ مثنوی

مآخذ

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:

۱۔ سلطان بہاء الدین ولد، مثنوی ولدنامہ، طبع ایران

۲۔ فریدوں بن احمد سپہ سالار، رسالہ، طبع ایران ۱۳۲۵ھ ش

۳۔ شمس الدین احمد افلاکی، مناقب العارفین، طبع انقرہ ۶۱-۱۹۵۹ء (در دو مجلد)

۴۔ قاضی تلمذ حسین، صاحبِ مثنوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۷ء

۵۔ علامہ شبلی نعمانی، سوانح مولانا روم، مکتبہ دین و دنیا، لاہور ۱۹۵۹ء

۶۔ مولانا روم، مثنوی معنوی، طبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۳۸ء

۷۔ محمد ابن بطوطہ، الرحلۃ، مصر ۱۲۸۷ھ (در دو مجلد) (تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار)

۸۔ عبد القادر بن محمد القرشی، الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، حیدر آباد دکن ۱۳۳۲ھ (در دو مجلد)

جناب محمد بشیر ایم اے

شاہ اسماعیل شہیدؒ ــــ مشاہیر کی نظر میں

(۲)

مولانا محمد تقی خان صاحب دہلوی تلمیذ رشید مولانا شاہ محمد اسحقؒ ایک استفتا کے جواب میں حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرماتے ہیں :

راقم الحروف نے حضرت ممدوح مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مغفور و مرحوم مصنف اس کتاب (تقویۃ الایمان) کو خوب دیکھا اور فیوض و برکات بے پایانی ان کی صحبت سے اور انوار ایمانی ان کی مجلس وعظ و نصیحت میں پائے اور ہزاروں منکرین خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیز اور ہزاروں فاسقین دائم الخمر اور زانی بدکار ان کی صحبت سے تائب اور پارسا ہو گئے[۱]

مصنف تذکرۂ علمائے ہند رقم طراز ہیں :

"مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ابن مولوی عبدالغنی بن مولانا شاہ ولی اللہ در دیانت و رسائی فکر یگانۂ روزگار و مشارٌ علیہ علمائے کبار بود[۲]"

مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنوی اپنی مشہور تصنیف نزہۃ الخواطر میں رقم فرما ہیں۔

(شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) وقت کی نادرۂ روزگار ہستی تھے۔ یادِ خدا میں دل و جان سے مشغول رہتے، علمی افادہ و استفادہ ان کا مشغلہ تھا، حسنِ اخلاق، پاکیزہ فطرت، دلیری، دین میں مضبوطی، حاضر جوابی، فصاحت اور ردِ کلام آپ کے اوصافِ عالیہ تھے۔ آپ کی گفتگو کی سحر طرازی اس قدر نکتہ سنجی اور سچی حقیقتوں سے لبریز ہوتی کہ مخالف سے مخالف آدمی بھی بالآخر آپ کے لیے رام ہو جاتا اور راضی خوشی آپ کا شریک کار بن جاتا[۳]

---

[۱] عزیز الدین مراد آبادی، اکمل البیان، ص ۸۱۲

[۲] رحمن علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۔۱۷ (نولکشور ۱۹۱۴)

[۳] عبدالحی، نزہۃ الخواطر۔ ج ۷، ص ۵۷

ڈاکٹر سید عبد اللہ صدر شعبۂ اُردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لکھتے ہیں :

شاہ صاحب جس عظیم تہذیب کے فرد تھے اس میں عام طور سے مکمل شخصیت کے انسان پیدا کیے جاتے تھے ... حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان یوں بھی مستجمع الصفات تھا، اس خانوادے کی ایک امتیازی خصوصیت یہی یہ تھی کہ اس کے نامور افراد بیک وقت کئی کئی شعبہ ہائے کمال میں فائق و ممتاز تھے۔ شاہ عبد العزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبد القادرؒ، شاہ عبد الغنیؒ ـــــ ان میں سے ہر ایک سپہرِ علم کا آفتاب تھا۔ یہی امتیاز حضرت شاہ اسمعیلؒ کو حاصل تھا۔ مجاہدِ عظیم، محقق، فقیہ، واعظ ـــــ اور ان سب اوصافِ فائقہ کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی۔[۴۹]

ڈاکٹر ایس۔ ایم اکرام لکھتے ہیں :

مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا نام مولوی عبد الحی صاحب کے بعد لیا جاتا ہے، لیکن سید صاحب کی اصلاحی کوششوں کو جتنی تقویت اور رونق آپ سے ہوئی، شاید ہی کسی اور فردِ واحد کی مدد سے ہوئی ہو ... آپ کی ذات میں بڑی خوبیاں جمع تھیں ... آپ بڑے بہادر اور زیرک جرنیل تھے اور سرحد کے جن معرکوں کی کمان آپ کے ہاتھ میں تھی وہ اکثر کامیاب رہے ... آپ زبردست مقرر اور با اثر واعظ تھے۔ آپ کے وعظ و ارشاد نے مسلمانوں کی مذہبی اور ذہنی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ سامعین بلکہ مخالفین پر بھی مولانا محمد اسمٰعیل کے وعظ کا جو اثر ہوتا تھا، اس کا اندازہ معاصرانہ تحریروں مثلاً آثار الصنادید سے ہو سکتا ہے۔ ان کی علمی قابلیت، عقلِ سلیم، تیز منطق اور زورِ کلام کا ثبوت ان کتابوں سے ملتا ہے جو انھوں نے یادگار چھوڑیں۔[۵۰]

مولانا نسیم احمد فریدی رقم طراز ہیں :

شاہ عبد الغنی کی شہرت ان کے صاحبِ فضیلت فرزند شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کے ذریعے مقدر ہو چکی تھی۔ بڑی سے بڑی کوئی کتاب بھی شاہ عبد الغنی تصنیف کرتے تو ان کو وہ لازوال اور ابدی معروفیت حاصل نہ ہوتی جو اس عالمِ دینِ متین، محافظِ ملت، مجاہد و شہید فی سبیل اللہ فرزند کے دینی کارناموں سے حاصل ہوئی، بہرحال ان کے لیے یہی بات کافی ذریعۂ افتخار ہے کہ ان کی تربیت سے ان کا نورِ چشم اتنی صفات کا مالک ہوا کہ ان کا احاطہ مشکل

---

[۴۹] سیف محمد خالد، کلام شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، ص ۱۵، ۱۶ - فیصل آباد

[۵۰] اکرام، ایس۔ ایم، موجِ کوثر، ص ۴۷، ۴۸

ہے۔[۵۶] آپ کے معاصرین میں سے بڑے بڑے دعویداران علم کو آپ کی قابلیت کا لوہا ماننا پڑا اور آپ کی علمی ہیبت ہمیشہ ان کے قلوب پر طاری رہی۔[۵۷]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ باعتبار علم و فضل و تقویٰ و طہارت ان عظیم المرتبت بزرگوں میں سے تھے، جو صدیوں میں کبھی پیدا ہوتے ہیں۔"[۵۸]

مولانا موصوف ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

ہندوستانی مسلم انقلابی شخصیتوں میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا درجہ بہت بلند ہے، انھوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد اسلام کی سربلندی تھا۔ نیز وہ ذرائع کلیتہً اسلامی تھے جو اس انقلاب کو پیدا کرنے کے لیے بروئے کار لائے گئے۔[۵۹]

پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں:

شاہ ولی اللہ نے تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ اشارہ کیا تھا کہ "اگر موقع و محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا تھا"[۶۰] زمانہ کا یہ تقاضا نہ تھا اس لیے وہ خاموش رہے، کچھ عرصہ کے بعد حالات نے ایک مجاہد کو پکارا تو شاہ صاحب کی یہ "صلاحیت" شاہ محمد اسمٰعیل کی صورت میں نمودار ہوئی۔ شاہ محمد اسمٰعیل، شاہ صاحب کے پوتے تھے اور "حضرات ثلاثہ"[۶۱] کی صحبت اور تربیت سے انھوں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو شاہ ولی اللہ کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ تھا۔[۶۲]

انھوں نے ہزاروں کے اجتماع میں وعظ کیے، سینکڑوں کو بدعت سے نکالا، سنت پر جمایا اور جہاد کے

---

۵۶ فریدی، نسیم احمد، "شاہ اسمٰعیل شہیدؒ مختصر سوانح"، ص ۴۔ بھیرہ ضلع سرگودھا ۱۹۷۶ء   ۵۷ ایضاً

۵۸ سعید احمد اکبر آبادی، "مسلمانوں کا عروج و زوال"، ص ۲۳۹ - دہلی ۱۹۶۳ء

۵۹ ایضاً، مقالہ "اسلامی انقلاب کا پہلا علَم بردار" مشمولہ در مقالات "شاہ اسمٰعیل شہیدؒ" مرتبہ عبداللہ بٹ، ص ۱۰۶، ۱۰۷۔

۶۰ ولی اللہ شاہ، تفہیمات الٰہیہ۔ ج ۱، ص ۱۰۱

۶۱ یہ اصطلاح شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

۶۲ نظامی، خلیق احمد، تاریخی مقالات، ص ۲۴۹ - دہلی ۱۹۶۶

لیے تیار کیا، ان کی اس مسلسل کوشش نے عروقِ مُردہ میں ایک نئی روح پھونک دی ... انھوں نے مسلمانوں میں جو روح پھونک دی تھی اس کے مظاہرے ان کی شہادت کے بعد عرصہ تک ہوتے رہے۔[۱۳]

سرسید کا بیان ہے :

اس واقعہ کو (یعنی شہادت کو) چودہ پندرہ برس گزرتے ہیں اور چونکہ یہ طریقہ آخر الزمان میں بنیاد ڈالا ہوا ان حضرات کا ہے اب تک اس سنت کی پیروی عباد اللہ نے ہاتھ سے نہیں دی اور ہر سال مجاہدین اطراف مختلفہ سے بہ نیتِ جہاد اسی نواح کی طرف راہی ہوا کرتے ہیں اور اس امرِ نیک کا ثواب آپ کی روحِ مطہر کو پہنچتا رہتا ہے۔[۱۴]

مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر کرتے ہیں :

سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک اسلامی ہند کے مسلمانوں کے لیے دینی تلاطم اور روحانی انقلاب کی لاہوتی نعمت تھی، جو مادی حکومت سے محروم ہو جانے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی۔[۱۵]

مولانا عبد المجید سالک لکھتے ہیں :

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ نے روحِ جہاد تازہ کی۔ ملت کو سخت کوشی کا سبق دیا جو وہ صدیوں سے فراموش کر چکی تھی۔ ملت کے سیاسی اقتدار کو واپس لانے کی جد و جہد میں اپنی جانیں ہنسی خوشی نثار کر دیں، غرض ان بزرگوں نے اس صنم خانۂ ہند میں اسلام کے عقائد، اعمال، افکار اور ثقافتی اقدار کو محفوظ کر دینے میں جس ہمت و عزیمت کا ثبوت دیا، اس کی مثالیں دور دور تک نایاب ہیں۔[۱۶]

عبد اللہ ملک لکھتے ہیں :

تحریک کی کامیابی کے لیے مبلغ ہونا اور اپنے مسلک کے لیے جنون کی حد تک لگن کا اظہار بنیادی شرطیں ہیں، ان پر سید احمد جیسا پیر اور شاہ اسمٰعیل جیسا مرید دونوں ہی پورے اترے ہیں، لیکن جو سعادت اس

۱۳۔ نظامی، خلیق احمد، تاریخی مقالات، ص ۲۵۰، دہلی ۱۹۶۶ء۔

۱۴۔ سید احمد خان، سر، آثار الصنادید باب چہارم، ص ۳۰، طبع سید الاخبار ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء۔

۱۵۔ گیلانی، مناظر احسن، سوانح قاسمی، ج ۱ ص ۶۳ طبع اول دیوبند۔

۱۶۔ سالک، عبد المجید، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۴۲۹ لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (س ن)۔

ہے روزگار کو حاصل ہوتی وہ بہت کم مریدوں کو حاصل ہوتی ہے۔ بعض دفعہ خود مرشد اس مرید کی شہرت کے مینار میں گم ہو جاتا ہے۔[۱۷]

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں :

انھوں نے عملاً عامۂ خلائق کے دین، اخلاق و معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے، وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابۂ کرام کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

انھوں نے اتنے وسیع پیمانے پر، جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سرِ تنزل ملک میں ممکن تھا، جہاد کی تیاری کی اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا ... انھوں نے صحیح معنوں میں روحِ اسلامی کا پھر ایک مرتبہ دنیا کے سامنے مظاہرہ کر دیا ... ان کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظامِ حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشا کے مطابق ہے، اس غرض کے لیے جب وہ لڑے، (تو) حسبِ قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمامِ حجت کر کے تلوار اٹھائی اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ و وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا، جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔

ان کو ایک چھوٹے سے علاقے میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا، اس میں انھوں نے ٹھیک اسی طرز کی حکومت کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے ... ہر پہلو سے انھوں نے اس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی صدیق و فاروق (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے کی تھی۔ ... خیالات میں جو حرکت وہ پیدا کر گئے تھے اس کے اثرات ایک صدی سے زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود اب تک ہندوستان میں موجود ہیں۔[۱۸]

نواب محمد ناصر الملک مرحوم مہتر چترال ایک نہایت مخلص انسان تھے، اچھے شاعر اور علم دوست حکمران تھے، بہت سے اوصاف کے حامل تھے، شاہ اسمٰعیل شہید کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں زمزمہ پیرا ہیں۔

---

[۱۷] عبداللہ ملک، بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہدِ آزادی، ص ۳۴۸۔ لاہور

[۱۸] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، "تجدید و احیائے دین" مقالہ مشمولہ در "الفرقان" شاہ ولی اللہ نمبر، ص ۹۲، ۹۳

در یادِ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ :

اے قلم بنویس حالاتِ شہے — تانیش پیدا نہ شد بعدش کسے
ہندیانِ خفتہ را بیدار کرد — بندگانِ نفس را احرار کرد
خونِ خود را در کہہ وکہسار ریخت — لیک بیخ حریّت در ہند بیخت
اے ذبیح اللہ اسمٰعیل ما ! — شد ندایت صورِ اسرافیل ما
در رہِ حق تیز چوں بشتافتی — ہادیِ دورانِ خود را یافتی
شرک و بدعت را زبن بہر کندہ — گلشنِ دین را طراوت دادہ
ہم چو مجنوں خویشتن را سوختی — شیوۂ عشاق بخدا آموختی
اندر آں وقتے کہ در ہندوستاں — سنّت اندر ابرِ بدعت بُد نہاں
گفت اسمٰعیل معبودم خدا ست — پیشوائے من محمد مصطفٰےؐ است
ترک بہ رسمے کہ در اسلام نیست — کم بیآں شیوہ کہ در احکام نیست
صرف کردہ بیہدہ دولت چرا — مے خری خسراں تو اندر دو سرا
شرک را در دینِ احمد راہ نیست — برتر از مشرک کسے گمراہ نیست
حاجتے خود را تو از خالق بجوئی — قبر کے کس را بہ بخشد آبروئی
آں نداند تا کسں را نہ زجا — پس بگیر عبرت ز احکامِ خدا

تو دریں گفتار اندیشک مماں
انک لا تسمع الموتیٰ بخواں [۱۹]

---

[۱۹] محمد ناصر الملک، "در یادِ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ" مشمولہ در مجموعہ مقالات "شاہ اسمٰعیل شہیدؒ" مرتبہ عبد اللہ بٹ، ص ۲۹، ۳۰

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

فصلِ خصومات و قضایا اور فرائضِ قاضی کے سلسلے میں کتبِ احادیث میں بے شمار احادیث مروی ہیں اور اس اہم اور بنیادی مسئلے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین نہایت واضح ہیں۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ قاضی کو حکمت و دانائی اور فہم وادراک کی نعمت سے مالا مال ہونا چاہیے تاکہ اس کا ذہن فریقین کی بات سننے کے بعد فیصلہ کن نتیجے تک پہنچ سکے اور مسئلہ زیرِ بحث کے متعلق حتمی رائے قائم کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ یہ حکمت و دانائی جس کے ذریعے انسان صحیح فیصلے کی منزل کو پا لیتا ہے، آنحضرتؐ کی حدیث کی رو سے اللہ کی بہت بڑی دین ہے۔ اس باب میں ایک حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح بخاری میں کئی مواقع پر مذکور ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

لا حسد الا فی اثنتین رجل اتاہ اللہ مالا فسلطہ علی ھلکتہ فی الحق ورجل اتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا ویعلمھا[1]

رشک دو باتوں میں کرنا چاہیے، ایک اس شخص پر جس کو اللہ نے دولت دی اور اس نے فراخ دلی کے ساتھ صحیح جگہ پر خرچ کی۔ دوسرے اس شخص پر جس کو اللہ نے حکمت و دانش سے نوازا اور وہ اس سے صحیح صحیح فیصلے کرتا ہے اور اس کی لوگوں کو تعلیم دیتا ہے۔

یعنی حکمت و دانش وہ زینت ہے، جس سے قاضی کو بہر کیف مزین ہونا چاہیے اور اس سے اپنے ذہن و فکر کو جلا دینی چاہیے —— اور پھر یہ چیز اس میں اتنی کثیر مقدار میں ہونی چاہیے کہ لوگ اس پر رشک کریں اور عوام میں اس کا بہت شہرہ ہو، تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ یہ شخص جو مسندِ قضا پر متمکن ہے عقل و خرد

---

[1] صحیح بخاری مطبع اصح المطابع۔ جلد اول، کتاب العلم (باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ)، ص ۱۷۔ کتاب الزکوٰۃ۔ (باب انفاق المال فی حقہ) ص ۱۸۹۔ و جلد ثانی۔ کتاب الاحکام (باب اجر من قضی بالحکمۃ)، ص ۱۰۵۷۔

اور حکمت و دانش سے پوری طرح بہرہ ور ہے اور فیصلہ کرنے میں عمداً لغزش کا مرتکب نہیں ہوگا — یہی وہ حکمت ہے، جو قاضی کو کسی کا ہدفِ طعن بننے کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی اور اس کی نیک شہرت کا باعث بنتی ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جو شخص عقل و حکمت کی وافر مقدار کا حامل نہ ہو، اس کو محکمہ قضا کے منصبِ جلیلہ پر متعین نہیں کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں جہاں اس کے علم و تقوٰی کا امتحان ضروری ہے وہاں اس کی حکمت و دانش کا معلوم کرنا اور اس کی تربیت دینا بھی ایک لازمی امر ہے۔ اس ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش نگاہ رہنا چاہیے،

تفقھوا قبل ان تسودوا[۲]

یعنی قبل اس کے کہ تمھیں کسی عہدہ و منصب پر فائز کیا جائے، فقاہت و حکمت حاصل کرو۔

فصلِ خصومات کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ضروری اور بنیادی ارشاد یہ ہے کہ حاکم اور قاضی غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کریں۔ چنانچہ امام بخاری نے کتاب الاحکام میں ایک باب باندھا ہے۔ ھل یقضی الحاکم[۳] او یقضی وھو غضبان۔ اس باب کے تحت انھوں نے یہ حدیث درج کی ہے،

کتب ابوبکرۃ الیٰ ابنہ وکان بسجستان ان لاتقض بین الاثنین وانت غضبان۔ فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لایقضین حکم بین اثنین وھو غضبان[۴]

ابوبکرہ نے اپنے بیٹے کو جو سجستان کا والی تھا، یہ خط لکھا کہ جب تم غصے کی حالت میں ہو تو دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرنا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حاکم جب غصے میں ہو تو فریقین کے درمیان فیصلہ نہ کرے۔

اس حدیث کی شرح کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ غضب چونکہ عقل و فہم میں خلل ڈال دیتا ہے، فکر و رائے کے زاویوں کو بدل دیتا ہے اور طبع انسانی میں تغیر بپا کر دیتا ہے، للٰذا حالتِ غضب میں کوئی فیصلہ نہیں صادر کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی شارحین رقم طراز ہیں کہ جو چیز بھی تغیرِ طبع، ضعفِ فہم اور عزلِ عقل کا

---

[۲] صحیح بخاری مطبع اصح المطابع۔ جلد اوّل (باب الاغتباط فی العلم)، ص ۱۷

[۳] ایک نسخے میں "القاضی" ہے۔ [۴] صحیح بخاری جلد ثانی، ص ۱۰۵۹ و ۱۰۶۰

باعث بنتی ہے، اس کی موجودگی میں قاضی کو مسندِ قضا پر متمکن نہیں ہونا چاہیے۔ بھوک، تنگ دستی، مرض اور دیگر عوارضِ جسمانی سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔ جب تک ان کا ازالہ نہ ہو جائے، فصلِ خصومات کی ذمہ داری نہیں قبول کرنی چاہیے[۵]۔

قاضی کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ جب مدعی اور مدعیٰ علیہ کسی فیصلہ طلب معاملے کے لیے اس کے پاس آئیں تو وہ نصیحت و موعظت کرے اور انھیں سمجھائے کہ وہ اس کے سامنے غلط بیانی سے کام نہ لیں اور کوئی فریق اپنا دعویٰ اس طرح پیش نہ کرے کہ قاضی اس کی چرب زبانی اور تیز کلامی کی گرفت میں آجائے بلکہ وہ واقعات سے بحث کریں اور سادہ و آسان اسلوب میں اظہارِ مدعا کریں۔ الفاظ کے طوطے مینا بنانے اور بات کو حسین سے حسین انداز میں پیش کرنے کا محل قاضی کی عدالت نہیں ہے۔ اس طرزِ کلام سے خطرہ ہے کہ قاضی کا ذہن کسی فریق کے حسنِ کلام سے متاثر ہو جائے اور اسے بات کی تہہ تک پہنچنے کا موقع نہ ملے، جس کے نتیجے میں فیصلہ غلط رُخ اختیار کر جائے اور دوسرے کا حق مارا جائے۔ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن ام سلمۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انما انا بشر و انکم تختصمون الیّ ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی علی نحو ما اسمع فمن قضیت لہ بحق اخیہ شیئًا فلا یاخذہ فانما اقطع لہ قطعۃ من النار[۶]

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو۔ ہو سکتا ہے، تم میں کوئی شخص اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنے میں دوسرے فریق سے زیادہ چرب زبان ہو اور میری حالت یہ ہے کہ جو کچھ سنتا ہوں، اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔ لہٰذا میں اگر اس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا اس کے لیے فیصلہ کر دوں، تو وہ اسے قبول نہ کرے۔

---

[۵] فتح الباری، جزء ۱۳ طبع ہند۔ ص ۱۱۱، ۱۱۲۔ نیز ملاحظہ ہو کرمانی شرح بخاری۔

[۶] صحیح بخاری جلد ثانی کتاب الاحکام (باب موعظۃ الامام للخصوم)، ص ۱۰۶۲، ۱۰۶۵۔ نیز کتاب الحیل، ص ۱۰۳۰۔ الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ یہ حدیث جلد اوّل، ص ۳۳۲۔ ابواب المظالم والقصاص کے باب اثم من خاصم فی باطل وھو یعلمہ میں بھی ہے۔

میں تو اسے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص اس درجہ طلاقت لسانی کا مالک ہے کہ اپنی جھوٹی بات کو بھی سچی ثابت کر سکتا ہے اور دوسرے فریق کی (جو درحقیقت سچا ہے مگر زیادہ بات نہیں کر سکتا) عجز کلامی کی وجہ سے قاضی کی عدالت میں جیت جاتا ہے تو یہ قطعی طور پر غلط ہے۔ اس کے غلط دلائل سے متاثر ہو کر قاضی نے اس کے حق میں فیصلہ کر بھی دیا ہے تو جس چیز کے بارے میں فیصلہ کیا گیا ہے اس پر اس کا قابض ہونا درست نہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اس قسم کے فیصلے سے قاضی پر کوئی گرفت نہیں۔ قاضی بہرحال بری ہے۔ قابل مواخذہ وہ فریق ہے جس نے قاضی کے سامنے کذب بیانی کی اور اسے دھوکے میں ڈالا۔

دیوانی معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلے صادر فرمائے، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مدعیٰ علیہ کی رعایت رکھی جائے گی۔ اس کی تائید صحیح بخاری کی ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کعب بن مالک کا عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی کے ذمے کچھ قرض واجب الوصول تھا۔ اس قرض کے سلسلے میں فریقین کے درمیان مسجد میں جھگڑا ہوا۔ اس وقت آنحضرت اپنے مکان پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے اپنے مکان کا دروازہ کھول کر کعب بن مالک سے فرمایا کہ آدھا قرض لے لو، انھوں نے حضور کا یہ فرمان مان لیا۔[۵۷]

یہ واقعہ سنن نسائی میں بھی موجود ہے۔ امام نسائی نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ حاکم یا قاضی اپنے گھر میں بھی مقدمات کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ حدیث کتاب آداب القضاۃ باب حکم الحاکم فی دارہ میں درج کی ہے۔[۵۸]

---

۵۷ صحیح بخاری جلد اوّل - کتاب الصلوٰۃ (باب التقاضی والملازمۃ فی المسجد)، ص ۶۵۔ فی الخصومات (باب کلام الخصوم بعضھم فی بعض)، ص ۳۲۶۔ باب فی الملازمۃ، ص ۳۲۷

۵۸ ملاحظہ ہو نسائی - ج ۲، ص ۲۶۶

نقد و نظر

مجموعہ رسائل چاندپوری (حصہ اوّل)

تصنیف : مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری

ناشر : انجمن ارشاد المسلمین - ۶ بی شاداب کالونی - حمید نظامی روڈ لاہور۔

کتابت، طباعت، کاغذ بہترین - قیمت پچیس روپے

مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری، ضلع بجنور (یو پی) کے قصبہ چاندپور کے رہنے والے تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مجاز تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا ذوالفقار علی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ معقولات کے ماہر اور منقولات کے نامور عالم تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۱ء کو فوت ہوئے۔

مولانا ممدوح بہت بڑے مناظر اور مصنف بھی تھے۔ توحید کی اشاعت اور تبلیغ ان کا اصل موضوع تھا۔ اس ضمن میں کسی مصلحت کی پروانہ کرتے اور صاف لفظوں میں واضح دلائل کے ساتھ اپنے افکار ضبطِ تحریر اور معرضِ بیان میں لاتے ——— ان کا زیرِ نظر مجموعہ رسائل اسی موضوع سے متعلق ہے۔

یہ مجموعہ آٹھ رسائل پر مشتمل ہے ۔ رسائل کے نام یہ ہیں :- تزکیۃ الخواطر، توضیح البیان فی حفظ الایمان، احدی التسعۃ والتسعین، انتعاف ابری، الختم علیٰ لسان الخصم، الکوکب الیمانی، اسکات المعتدی، شکوۃ الحاد ملقب بہ لزام علی اللئام المسمیٰ بہ کفر و ایمان کی کسوٹی ———

ابتدا کے ۱۷ صفحات کا مقدمۂ کتاب ہے جو مصنفِ شہیر کے تعارف اور بعض دیگر امور کو محیط ہے۔ پہلا رسالہ ۷۴ صفحات پر، دوسرا ۴۸ صفحات پر، تیسرا ۴۲ صفحات پر، چوتھا ۱۶ صفحات پر، پانچواں ۳۰ صفحات پر، چھٹا ۲۲ صفحات پر، ساتواں ۱۸ صفحات پر اور آٹھواں ۷۸ صفحات پر فتویٰ ہے۔ آخر میں ۱۳ صفحات مقدمۂ کتاب کے مآخذ اور چند نظموں پر مشتمل ہیں۔

کتاب کے کل صفحات ۴۹۵ ہیں۔ توحید اور رد بدعات اس کا موضوع ہے اور اس سلسلے میں بعض

حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی یا بعض دیگر حضرات کو جو ہدفِ تنقید ٹھہرایا جاتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان۔ (اردو ترجمہ)

تالیف : شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ

اردو ترجمہ : مولانا غلام ربّانی مرحوم

ناشر : المکتبہ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور

صفحات ۱۹۴، قیمت پندرہ روپے

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی تصنیفات میں الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، عمل و کردار میں اللہ کے اطاعت گزاروں اور شیطان کے پیچھے چلنے والوں کے درمیان فرق کی وضاحت کی گئی ہے، اور کتاب وسنّت کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ان دونوں قسم کے لوگوں کے کیا اوصاف ہیں۔ اصل کتاب عربی میں ہے، ہمارے پیشِ نگاہ اس کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا غلام ربانی مرحوم نے کیا ہے۔ ترجمے کی زبان بڑی صاف ستھری اور عام فہم ہے۔

سب سے پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے سچے اور جھوٹے اولیا میں کیا امتیاز ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ کے نقطۂ نظر سے اولیاء اللہ کے اوصاف سے بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں بعض بزرگوں کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں۔

کتاب جس موضوع کو محیط ہے، اس کی تمام تفصیلات اس میں خوب صورت انداز اور بہترین اسلوب میں مندرج ہیں۔ اس نوع کی کتابوں کا مطالعہ اخلاق وسیرت کو جلا بخشنے کا موجب بنتا ہے۔ المکتبہ السلفیہ نے اصل عربی کتاب بھی علیحدہ شائع کی ہے۔ اب اُردو دان طبقے کے لیے اس کا اردو ترجمہ بھی چھاپ دیا ہے اور یہ اس کی بہترین خدمتِ علم ہے۔

(م - ا - ب)

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، کراچی۔ مارچ ۱۹۷۹

مضمون	مصنف
محسنِ انسانیت اور اصلاحِ معاشرہ	شیخ رحیم الدین دکنی
قصیدہ بردہ کے چند اشعار	مولانا مفتی عبدالحکیم
عمرو بن علی الفلاس	عبدالحسن۔ ترجمہ مولانا محمود اشرف عثمانی
اسلام میں نماز کا مقام	شیخ رحیم الدین دکنی
دورِ خلفائے راشدین میں اصولِ قضا کا نظام اور اس کا طریقِ کار	حاجی سیف الرحیم

ترجمان الحدیث، لاہور۔ مارچ ۱۹۷۹ء

مضمون	مصنف
مغربی جمہوریت	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی
علامہ محمد حیات سندھی	مولانا ارشاد الحق اثری
امام ابن جوزی	جناب عبدالرشید عراقی

فاران، کراچی۔ (ماہر القادری مرحوم نمبر)

مضمون	مصنف
داماں نگہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار	اقبال احمد صدیقی
ماہر القادری — اپنی تحریروں کے آئینے میں	مولانا عبدالغفار حسن
کلام اللہ — حکمت و دانش کے چند نئے پہلو	ڈاکٹر محمد حمید اللہ
کوئی جہاں میں تیری مثال نہ لا سکا	مہدی علی صدیقی
خود نوشت ماہر القادری	ماہر القادری مرحوم
میری کہانی، میری زبانی	ماہر القادری مرحوم
ماہر القادری زندۂ جاوید	شفیق بریلوی
میرا دوست ماہر القادری	نواب مشتاق احمد
ماہر القادری۔ ایک نیک صفت انسان	وفا راشدی

محترم ماہر القادری مرحوم	مولانا محمد تقی عثمانی
حرفے چند — بیادِ ماہر	ڈاکٹر محمد ریاض
اے ہم نفسانِ محفلِ ما (ماہر)	اسماعیل احمد مینائی
دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا بھی خواہ	جوہر سعیدی
بیادِ ماہر — کویت میں طرحی مشاعرہ	سید فدا حسین
اسیرِ موج در موج — ماہر القادری	ابو عمران
بجلی چمک رہی تھی نشیمن کے آس پاس	روح الامین
اردو زبان پر تحقیق اور اصلاح	پروفیسر رحیم بخش شاہین
مولانا ماہر القادری کی دینی خدمات	حبیب احمد صدیقی
اسلامی شاعر و ادیب — ماہر القادری	مولانا محمد منظور نعمانی
ایک عزیز مخلص دوست	مولانا سید عبد القدوس ہاشمی
ماہر تنقید اور صحافت کے میدان میں	ایم اے رشید
یاد رفتگان کی محفل رچانے والا ... ماہر	شاکر عروجی
ایک باغ و بہار شخصیت — ماہر القادری	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
آسمانِ ایمان و ادب کا چمکتا ستارہ	جناب محمد نواز
ایک ممتاز نعت گو	گوہر ملسیانی
اے مری بزمِ وفا سے جانے والے	علامہ عرشی امرتسری
مولانا ماہر القادری کا عشق رسول	طالب ہاشمی

معارف، اعظم گڑھ - فروری ۱۹۷۹ء

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ	علامہ سید سلیمان ندوی
جمالی لودھی اور مغل دور کا شاعر	ڈاکٹر ظفر الہدیٰ - ترجمہ: جناب سلطان احمد
اقبال اور نئی دنیا	ڈاکٹر عبد المغنی
مثنوی مجنون لیلیٰ اور نل دمن پر ایک طائرانہ نظر	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی

مئی ۱۹۶۹

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ، لاہور	دین محمدی پریس، لاہور

فون : ۵۳۶۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۲ | مئی ۱۹۷۹ جمادی الاخری ۱۳۹۹ | شمارہ ۵

ترتیب

تاثرات

مارچ ۱۹۷۹ کی ۲۹ تاریخ کو پاکستان کے نامور اہلِ علم اور مشہور مصنّف جناب بشیر احمد ڈار نے وفات پائی۔ وہ سرطان کے خطرناک مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور کئی ماہ سے صاحبِ فراش تھے۔

مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک اور عمدہ اوصاف کے حامل تھے۔ بہترین مصنّف، مشہور محقق اور فلسفی تھے۔ انھوں نے کئی علمی اور تصنیفی اداروں میں کام کیا اور ہر جگہ اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ ۱۹۵۳ سے اپریل ۱۹۶۵ تک ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک رہے، اس اثنا میں انھوں نے متعدد اردو اور انگریزی کتابیں تصنیف کیں جو ادارے کی طرف سے شائع کی گئیں اور حلقہ اہلِ علم میں مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد وہ پاکستان اقبال اکیڈیمی کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس منصب پر وہ پانچ سال متعین رہے۔ علامہ اقبال کے افکار و تصورات کے بارے میں انھوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کئی کتابیں لکھیں، جنھیں اقبالیات سے متعلق اصحابِ تحقیق میں قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور اس سلسلے میں انھیں کتبِ حوالہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

ڈار صاحب مرحوم کا اصل موضوع فلسفہ تھا اور اس میں انھیں بڑا درک حاصل تھا۔ وہ پاکستان فلوسوفیکل کانگرس کے سرگرم رکن تھے، مختلف اوقات میں وہ اس کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ کئی سال فلوسوفیکل کانگرس کی تصنیفات اور اس کی سالانہ رودادوں کی ترتیب کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر اس کا سہ ماہی جرنل بھی مرتب کرتے رہے۔ علاوہ ازیں وہ ۱۹۵۲ سے ۱۹۶۵ تک بزمِ اقبال کے مجلہ، اقبال (لاہور) کے معاون مدیر بھی رہے۔ ان کی علمی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع تھا اور انھوں نے ایک محقق اور مصنّف فلسفی کی حیثیت سے اربابِ علم میں بڑی شہرت پائی

مرحوم میں بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر وقت خندان و فرحاں رہتے، خوش مزاجی اور زندہ دلی ان کی زندگی کا جز تھا۔ دوسروں کی علمی خدمات پر بالخصوص مسرت کا اظہار کرتے اور اُسے داد دیتے۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں میں جو خشکی، یبوست اور تنگ نظری پائی جاتی ہے، وہ ان میں ہرگز نہ تھی، کسی کو خواہ مخواہ ہدفِ تنقید ٹھہرانا اور اپنے کام کو اس کے مقابلے میں بڑا ثابت کرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ اعتدال و توازن کا صحیح نمونہ تھے۔ ان کی وفات سے اہلِ علم کی مجلس میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے ۔۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

(محمد اسحاق بھٹی)

مولانا نصرت علی آشیر

امام زفر بن الہذیل

نام و نسب

زفر نام اور ابوالہذیل[1] مشہور کنیت تھی۔ اس کے علاوہ آپ کو العنبری، التیمی، الکوفی اور فقیہ الحنفی کی نسبت سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ طاش کبری زادہ نے اپنی کتاب "مفتاح السعادۃ" میں کنیت ابوخالد بھی لکھی ہے۔ والد کا نام ہذیل تھا۔ سلسلۂ نسب معد بن عدنان سے جا ملتا ہے۔ تاریخ ابن خلکان میں آپ کا شجرۂ نسب یوں درج ہے: ابوالہذیل بن قیس بن سلیم بن مکمل بن ذہل بن ذویب بن جذیمہ بن عمرو بن جنخود ابن جندب بن العنبر بن عمر بن تمیم بن مر بن اد بن طانجہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان[3]

ابن حزم[4] نے بھی ابن جندب تک سلسلۂ نسب اسی طرح ذکر کیا ہے، جب کہ طاش کبری زادہ[5] نے دادا کا نام قیس کی بجائے صباح لکھا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سلسلۂ نسب کے کچھ نام حذف کر دیئے ہیں۔

آپ کے والد ہذیل مروان بن محمد کے عہد میں اصفہان کے والی تھے[6]۔ آپ کی والدہ ماجدہ عجمی لونڈی تھیں، جس کی وجہ سے آپ کی شکل و صورت عجمی اور زبان خالص عربی تھی[7]۔ ہذیل اپنی ولایت ہی کے زمانے

---

[1] حافظ ابونعیم اصبہانی : کتاب ذکر اخبار اصبہان، ۱ : ۳۱۲، مطبوعہ لندن

[2] طاش کبری زادہ : مفتاح السعادۃ ۲ : ۱۱۳، مطبوعہ حیدرآباد

[3] ابن خلکان : تاریخ ابن خلکان : ۱ : ۲۰۸، مطبوعہ ایران ۱۲۸۴ھ (نسخہ سمرقند)

[4] ابن حزم : جمہرۃ الانساب : ۲۰۸، مطبوعہ مصر

[5] طاش کبری زادہ : مفتاح السعادۃ : ۲ : ۱۱۳، مطبوعہ حیدرآباد

[6] ابن حزم : جمہرۃ الانساب : ۲۰۸، مطبوعہ مصر

[7] کردری : مناقب امام اعظم : ۲ : ۱۸۶، مطبوعہ ہند

میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ آپ کے چار بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں: (۱) کوثر (۲) ہرثمہ (۳) زفر (۴) صباح[۵۸]۔ حافظ ابونعیم نے صباح[۵۹] کا ذکر نہیں کیا جو بنو تمیم کے صدقات کے والی تھے۔

ولادت

آپ ۱۱۰ھ[۶۰] میں پیدا ہوئے۔ ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں سالِ پیدائش ۱۱۶ھ لکھا ہے[۶۱]۔ لیکن کسی اور تذکرہ نگار نے اس کو اختیار نہیں کیا۔ طاش کبری زادہ اور خیر الدین زرکلی[۶۲] نے اپنی کتابوں میں آپ کا اصلی وطن اصبہان لکھا ہے۔ حافظ ابونعیم نے اس کو ایک دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

كان ابو الهذيل باصبهان في خلافة يزيد بن الوليد بن عبد الملك وكان ينزل قرية بُزاء[۶۳]

یزید ابن الولید کے دور میں ابوالہذیل اصفہان میں مقیم تھے اور قریہ بزا میں ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ان عبارات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام زفر کے والد اصبہان کے والی بننے سے پہلے یہاں کے مکین تھے۔ ۱۲۷ھ میں مروان بن محمد کے زمانے میں وہ اصفہان کے والی بنے اور ولایت کے زمانے ہی میں رحلت فرماگئے۔ بُزار کی بستی اس خاندان کا مسکن تھی۔ زفر اس وقت سترہ برس کے تھے جب آپ کے والد ماجد کو ولایت کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ والد کی وفات تک تو آپ اصفہان ہی میں رہے، بعد میں کوفہ آگئے۔

تعلیم و تربیت

آپ کی تربیت اعلیٰ خاندانی روایات کے مطابق ہوئی جس کی وجہ سے آپ کو دینی علوم سے قلبی لگاؤ پیدا ہوگیا۔ علما کی مجالس سے فیض یاب ہوتے۔ حدیث سے آپ کو عقیدتاً اُنس رہا، جس کی وجہ سے آپ کی ابتدائی مجالس ایسے حفاظ حدیث کے ساتھ رہیں جو حدیث میں سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد میں جب مسائل

---

۵۸ ابونعیم اصبہانی: کتاب ذکر اخبار اصبہان: ۱: ۳۱۲، مطبوعہ لندن

۵۹ طاش کبری زادہ: مفتاح السعادۃ: ۲: ۱۱۳، مطبوعہ حیدر آباد

۶۰ ابواسحاق الشیرازی: طبقات الفقہا: ۱۱۳، مطبوعہ بغداد

۶۱ ابن کثیر: البدایہ والنہایۃ: ۱۰: ۱۲۹، مطبوعہ مصر ۶۲ خیر الدین زرکلی: الاعلام: ۳: ۴۵

۶۳ حافظ ابونعیم الاصبہانی: کتاب ذکر اخبار اصبہان: ۱: ۳۱۲، مطبوعہ لندن

کی پیچیدگیوں سے سامنا پڑا تو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے درس میں جاکر زانوئے تلمذ تہ کیا اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ میں نے بیس سال تک کا عرصہ امام ابو حنیفہ کی صحبت میں گزارا[۱۵] پھر امام صاحب کی رحلت کے بعد آپ کی مسندِ درس پر ان کے جانشین بنے[۱۶]

اساتذہ

آپ نے علما کی ایک کثیر تعداد سے فیض حاصل کیا۔ نمایاں شیوخ مندرجہ ذیل ہیں:[۱۷]

(۱) محمد بن اسحاق صاحب المغازی (متوفی ۱۵۰ھ)، (۲) سلیمان بن مہران الاعمش (۶۰ تا ۱۴۸ھ)، (۳) یحییٰ بن عبداللہ التیمی، (۴) اسمٰعیل بن ابی خالد الاحمسی، (۵) نعمان بن ثابت الامام ابو حنیفہ (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ)، (۶) ایوب بن ابی تمیمہ کیسان السختیانی، (۷) زکریا بن ابی زائدہ (متوفی ۱۵۰ھ)، (۸) سعید بن ابی عروبہ، (۹) یحییٰ بن سعید الانصاری، (۱۰) قیس بن جنتر[۱۸]، (۱۱) عبداللہ بن عبدالرحمٰن الاشجعی (متوفی ۱۸۲ھ)، (۱۲) حجاج بن ارطاۃ[۱۹]

شاگرد

امام زفرؒ علم و عمل کے ایک درخشندہ آفتاب تھے، جس کے نور سے کئی اذہان کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ آپ جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے کسی قسم کی کوئی تشنگی نہ چھوڑتے اور جب کسی سے کسی معاملے میں بحث ہو جاتی تو مقابل کی زبان گنگ ہو جاتی۔ آپ نے علومِ دینیہ کو عقل و خرد کی میزان پر لاکر ہر پہلو سے جانچا اور ثابت کر دیا کہ اسلام کا پیش کردہ ضابطۂ زندگی ہر دور کے لیے ایک روشن مینار ہے۔ اس آفتاب کی کرنوں سے کئی آفتاب فیض یاب ہوئے۔ بعض کے نام درجِ ذیل ہیں۔ ان حضرات نے علامہ موصوف سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

(۱) عبداللہ بن المبارک (۱۱۸ھ تا ۱۸۱ھ)، (۲) شقیق بن ابراہیم البلخی (متوفی ۱۹۴ھ)، (۳) محمد بن الحسن

---

۱۴ کردری: مناقب امام اعظمؒ، ۲: ۱۸۵، مطبوعہ ہند ۱۵ ایضاً، ۲: ۱۰۴

۱۶ ابن عبدالبر: انتقاء: ۱۷۳، مطبوعہ مصر ۱۳۵۰ھ

۱۷ علامہ زاہد الکوثری: لمحات النظر: ۱۳، مطبوعہ مصر ۱۸ ایضاً، ص ۱۵

۱۹ محی الدین نووی: تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۱۹۷، مطبوعہ مصر

الشیبانی (۱۳۲ھ تا ۱۸۷ھ)، (۴) وکیع بن الجراح (۱۲۷ھ تا ۱۹۷ھ)، (۵) سفیان بن عیینہ (۱۰۷ھ تا ۱۹۸ھ)، (۶) ابو علی عبید اللہ بن عبد المجید، (۷) محمد بن عبد اللہ الانصاری القاضی، (۸) ہلال بن یحیٰی المعروف بہلال الرائے (متوفی ۲۴۵ھ)، (۹) حکم بن ایوب، (۱۰) شداد بن حکیم (متوفی ۲۲۵ھ)، (۱۱) نعمان بن عبد السلام (متوفی ۱۸۳ھ)، (۱۲) مالک بن فدیک، (۱۳) ابو عاصم النبیل الضحاک بن مخلد (متوفی ۲۱۲ھ)، (۱۴) حسن بن زیاد اللولوی (متوفی ۲۰۴ھ)، (۱۵) ابو وہب محمد بن مزاحم المروزی، (۱۶) ابو نعیم الفضل بن وکین (متوفی ۲۱۶ھ)، (۱۷) بشر بن القاسم (متوفی ۲۱۵ھ)، (۱۸) سعید بن اوس (متوفی ۲۱۵ھ)، (۱۹) ابراہیم بن سلیمان (متوفی ۱۷۳ھ)، (۲۰) حسان بن ابراہیم، (۲۱) مسلم بن ابراہیم، (۲۲) اکثم بن محمد، (۲۳) حسن بن الولید، (۲۴) محمد بن اعین، (۲۵) عبد اللہ بن ابی رزمہ، (۲۶) محمد بن وہب، (۲۷) عمر بن الزجاج، (۲۸) عبد اللہ بن داؤد الخریبی (متوفی ۲۱۳ھ)، (۲۹) خالد بن حارث (متوفی ۱۸۶ھ)، (۳۰) عبد الواحد بن زیاد (متوفی ۱۸۶ھ)، (۳۱) یحیٰی بن احمد بن محمد الزجاجی، (۳۲) خلف بن ایوب البلخی (متوفی ۲۱۵ھ)، (۳۳) یحیٰی ابن احمد بن محمد بن اسحاق، (۳۴) عبد الرحمٰن بن محمد۔

امام زفر اور حدیث

امام زفر کو حدیث سے والہانہ تعلق تھا۔ آپ قرآنِ مجید کے بعد حدیث سے استنباط کرتے تھے۔ رشد اللہ سندھی نے طبقات القاری کے حوالے سے عبد اللہ ابن المبارک سے امام زفرؒ کا ایک قول لیا ہے۔ عبد اللہ ابن المبارک فرماتے ہیں کہ میں نے امام زفر کو کہتے سُنا:

لا ناخذ بالرای ما دام اثر اذا جاء الاثر ترکنا الرای[۵۳]

جب تک ہمیں کوئی "اثر" ملتا رہتا ہے ہم رائے پر عمل نہیں کرتے اور اگر رائے پر عمل کرتے ہیں اور اس کے بعد کوئی اثر مل جاتا ہے تو عمل بالرائے کو ترک کر دیتے ہیں۔

اس روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام زفر کی جملہ فقہی آرا یا تو حدیث سے مستنبط ہوتی تھیں یا اگر حدیث نہ ملتی تو پھر قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں رائے اختیار کرتے، اپنے قول کے خلاف کوئی حدیث پا لیتے تو اپنے قول کو ترک کر دیتے اور حدیث کو اختیار کر لیتے۔ اس سے بعض تذکرہ نگاروں

---

[۵۳] رشد اللہ سندھی: کشف الاستار عن رجال معانی الآثار: ۳۵، مطبوعہ ہند ۱۳۴۹ھ۔

کی ان آرا ۔ وکان من اصحاب الحدیث فغلب علیہ الرای کی تاویل کرنا پڑے گی، کہ آپ نے اصحابِ حدیث کی وہ روش ترک کر دی جس کی رُو سے حدیث کی عدم موجودگی میں کسی قسم کی کوئی رائے اختیار کی جا سکتی تھی۔ جہاں حدیث نہ ملتی وہاں خاموش رہتے۔ لیکن مسائل کی پیچیدگیاں جب بڑھنے لگیں اور بعض معاملات کی صورتیں ایسی پیش آئیں جن میں متضاد احادیث سامنے آئیں تو پھر احادیث کو سند و نقد کی میزان پر رکھ کر دیکھتے۔ جو حدیث زیادہ راجح نظر آتی اس کو اختیار کر لیتے اور جہاں کوئی حدیث نہ ملتی وہاں دیگر آثار اور تعلیماتِ اسلامی کو مدنظر رکھ کر رائے کا اظہار کرتے، اور یہی قیاس تھا۔

آپ کو سند حدیث اور روایتِ حدیث میں مہارتِ تامہ تھی۔ ابونعیم الفضل بن دکین روایت کرتے ہیں:

قال لی زفر هات احادیثك اغربلها لك غربلة۔ [۲۱]

امام زفرؒ نے مجھ سے کہا کہ اپنی احادیث لاؤ، میں انھیں (جرح و تعدیل) کی چھلنی میں چھان لوں۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے:

کان زفر متقنا حافظا قلیل الخطاء لم یسلك مسلك صاحبه فی قلة التیقظ فی الروایات وکان اقیس اصحابه واکثرهم رجوعا الی الحق اذا لاح له [۲۲]

زفر صائب الرائے، حافظ الحدیث اور قلیل الخطا تھے۔ جن روایات کے بارے میں انھیں خیال ہوجاتا کہ امام ابوحنیفہ نے پوری توجہ سے ان کی چھان پھٹک نہیں کی ہے، ان کا اتباع نہ کرتے۔ گو کہ وہ اپنے تمام ساتھیوں میں سب سے زیادہ قیاس کے معاملے میں مہارت رکھتے تھے اور جب حق ان پر ظاہر ہوجاتا تو وہ اکثر اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔

محمد بن وہب کہتے ہیں:

انه کان من اصحاب الحدیث وکان احد العشرة الذین دونوا الکتب [۲۳]

آپ محدثین میں سے تھے، اور ان دس آدمیوں میں سے شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے تدوین کتب کیں۔

جب جامع سفیان آپ کے سامنے لائی گئی تو آپ نے کہا:

۲۱ھ کردری: مناقب امام اعظم، ۲: ۱۸۳، مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۲۱ھ

۲۲ھ ابن حبان: کتاب الثقات

۲۳ھ محی الدین ابو محمد عبدالقادر القرشی: ذیل الجواہر المضیہ: ۲: ۵۳۴، مطبوعہ ہند ۱۳۳۲ھ

عن عکرمة قال لما قدم زفر البصرة نقل الیه جامع سفیان فقال ھذا کلامنا ینسب الی غیرنا[۲۴]

عکرمہ سے روایت ہے کہ جب زفر بصرہ آئے تو جامع سفیان آپ کے یہاں لائی گئی تو کہنے لگے یہ ہمارا کلام ہے جو غیروں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

حافظ ابونعیم الفضل بن دکین فرماتے ہیں:

انه کان ثقة مامونا[۲۵]

یعنی یہ کہ وہ حدیث میں ثقہ اور غلطیوں سے مامون تھے۔

ابوعمر کہتے ہیں،

انه کان ثقة فی الحدیث[۲۶]

یہ کہ وہ حدیث میں قابلِ اعتماد شمار کیے جاتے تھے۔

عباس الدوری سے روایت ہے:

سمعت یحیی (ابن سعید) یقول انه ثقة مامون زاھد و به عنه انه کان غیر مرة یضعه بالایثاق والزاھد والصلاح[۲۷]

عباس الدوری سے مروی ہے کہ انھوں نے یحیی ابن سعید سے سنا کہ امام زفر ثقہ، مامون اور زاہد تھے، اور آپ نے بارہا امام زفر کو ثقہ، زاہد اور صالح کے اوصاف سے متصف کیا۔

یحیی ابن معین فرماتے تھے: "زفر صاحب الرائے ثقة مامونا"[۲۸]

ابنِ سعد نے طبقات الکبری میں لکھا ہے:

لم یکن فی الحدیث بشئ[۲۹]

---

[۲۴] کردری: مناقب امام اعظم، ۲: ۸۳، مطبوعہ ہند ۱۳۲۱ھ۔ [۲۵] فقیر محمد جہلمی: حدائق الحنفیہ: ۱۵۹، مطبوعہ اول کشور ۱۳۲۴ھ

[۲۶] محی الدین ابو محمد عبد القادر: الجواہر المضیہ: ۱: ۲۴۳، مطبوعہ ہند ۱۳۳۲ھ

[۲۷] کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۳، مطبوعہ ہند ۱۳۲۱ھ

[۲۸] محی الدین نووی: تہذیب الاسماء واللغات: ۱: ۱۹۷، مطبوعہ مصر

[۲۹] ابن سعد: طبقات الکبری: ۶

یعنی امام زفرؒ سے حدیث میں کوئی قابلِ ذکر چیز منقول نہیں ہے۔

علامہ زاہد الکوثری ابن سعد کے اس قول پر اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

قال ابن سعد، لم یکن فی الحدیث بشئ لعله یرید قلة حدیثه لانه یقال فلان لم یکن فی الحدیث بشئ بمعنی انه قلیل الحدیث یعنی فی نظر القائل کما فی الرفع والتکمیل لعبد الحی اللکھنوی وهذا ربما یسلم بالنظر الی علم ابن سعد فقط والا فزفر علی علو منزلته فی الاجتهاد حافظ معروف بالاتقان عند ابن حبان وغیره۔[۳۰]

ابن سعد کہتے ہیں کہ امام زفر کی حدیث میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں۔ شاید کہ ان کی مراد قلتِ حدیث سے ہو، اس لیے کہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی حدیث میں کوئی چیز نہیں، یعنی اس کی کم حدیثیں ہیں (کہنے والے کی نظر میں) جیسا کہ عبدالحی لکھنوی نے الرفع والتکمیل سے اس کی تاویل کی ہے۔ یہ بات ابن سعد کی صرف علمی عظمت کی وجہ سے کسی حد تک قابلِ قبول بھی ہے۔ لیکن امام زفر اجتہاد کی اعلیٰ خصوصیات کے حامل تھے۔ پرہیزگاری میں مشہور حافظ حدیث تھے۔

مشہور محدث وکیع ابن الجراح فرماتے ہیں کہ مجھے امام زفر کی مجالس کے سوا کسی مجلس نے اس قدر نفع نہیں پہنچایا۔ امام زفر ایک قابلِ اعتماد اور غلطیوں سے محفوظ راوی تھے، جس پر ہم عصر علما کے اقوال شاہد ہیں۔ آپ نے حضرت امام ابوحنیفہ سے کتاب الآثار روایت کی جو آپ سے محمد بن مزاحم المروزی، حکم بن ایوب اور شداد بن حکیم نے روایت کی۔ اس کا تذکرہ امام حاکم نیساپوری کی تصنیف معرفۃ علوم الحدیث کے صفحہ ۳۷ پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایک آپ سے روایات ابونعیم کی تاریخ اصفہان اور تاریخ خطیب جیسی کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ صحاح ستہ کے مشہور راوی وکیع بن الجراح، محمد بن عبداللہ، الضحاک بن مخلد النبیل اور خلف بن ایوب جیسے نامور آئمہ حدیث کو آپ کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

امام زفرؒ اور علمِ فقہ

امام زفر کی پوری زندگی فقہ، ورع، اجتہاد اور عبادت گزاری پر مبنی ہے اور یہی وہ نمایاں خصوصیات

---

[۳۰] زاہد الکوثری: لمحات النظر: ۲۲، مطبوعہ مصر ۱۳۶۸

تھیں جن کی وجہ سے امام صاحب کی رحلت کے بعد تشنگانِ علم و عرفان کی نظریں اس چشمۂ صافی پر مرکوز ہوئیں۔ ملیح بن وکیع اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں:

قال کان زفر ورعا شدید الورع والاجتهاد والعبادة وقلیل الکتابة یحفظ ما یسمع حسن القیاس فلما مات الامام اقبل الناس علیه فما کان یاتی لابی یوسف الا نفر یسیر النفسان والثلاثه[۳۱]

کہتے ہیں کہ امام زفر نہایت پرہیزگار تھے۔ یہ پرہیزگاری اجتہاد اور عبادت میں غالب اثر رکھتی تھی۔ آپ بہت کم لکھتے تھے۔ جو کچھ سنتے یاد کر لیتے۔ آپ بہترین قیاس کرتے تھے۔ جب امام ابوحنیفہ فوت ہو گئے تو لوگوں نے آپ کو مرکز التفات قرار دے لیا۔ ابو یوسف کے ہاں صرف ایک، دو یا تین آدمی آیا کرتے تھے۔

ابنِ حبان نے کہا ہے:

کان فقیها حافظا قلیل الخطاء[۳۲]

آپ ایک فقیہ، حافظ اور کم غلطی کرنے والے تھے۔

یحییٰ بن اکثم فرماتے ہیں:

قال اکثر المجالسة ابی بعد الامام معه لانه کان جمع الی الفقه الورع[۳۳]

میرے والد کی اکثر مجالس امام زفرؒ کے ساتھ رہیں، اس لیے کہ امام زفرؒ میں فقہ اور پرہیزگاری کا امتزاج تھا۔

المدینی الخوارزمی محمد بن حنفیہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ اور ابوبکر بن ابی شیبہ سے امام زفرؒ کے بارے میں استفسار کیا تو دونوں نے کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ فقیہ تھے، اور ابونعیم اس سے بھی زیادہ مرتبہ دیتے تھے[۳۴]

خیر الدین زرکلی نے اپنی کتاب "الاعلام" میں لکھا ہے:

ابو الهذیل فقیه کبیر من اصحاب الامام ابی حنیفه[۳۵]

۳۱ھ کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۵، مطبوعہ ہند ۳۲ھ ابن حبان: کتاب الثقات

۳۳ھ کردری، مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۳، مطبوعہ ہند

۳۴ھ زاہد الکوثری: لمحات النظر، ۲، مطبوعہ مصر

۳۵ھ خیر الدین زرکلی: الاعلام: ۳: ۷۸، مطبوعہ مصر ۱۳۷۲ھ

ابوالہذیل (امام زفر) امام ابوحنیفہ کے ساتھیوں میں سے ایک بہت بڑے فقیہ تھے۔

میزان الاعتدال میں ہے:

زفر بن الھذیل احد الفقھاء والعباد صدوق وثقه ابن معین وغیر واحد [۳۶]

زفر بن الہذیل فقیہوں میں سے ایک فقیہ اور سچے عبادت گزاروں میں سے ایک عابد تھے۔ یحییٰ بن معین اور ان جیسے دوسروں نے بھی انھیں ثقہ مانا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام زفرؒ

اسمٰعیل بن حماد بن ابی حنیفہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کے دس نمایاں شاگرد تھے، جو ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو البجلی، عافیہ الاودی، داؤد الطائی، قاسم بن معن المسعودی، علی بن مسہر، یحیی بن زکریا بن ابی زائدہ اور حبان و مندل ابنا علی العنزی۔ لیکن ابو یوسف اور زفر جیسا کوئی بھی نہ تھا [۳۷]

امام ابوحنیفہ آپ کی بہت قدر کرتے تھے۔ آپ کے تبحر علمی کا اکثر اظہار کیا کرتے۔ امام زفر کی شادی کے موقع پر آپ نے فرمایا:

ھذا زفر من ائمة المسلمین وعلم من اعلامھم فی شرفه وحسبه ونسبه [۳۸]

یہ امام زفر مسلمانوں کے امام ہیں) اور اپنے شرف اور حسب و نسب میں سرداروں کے سردار ہیں)۔

مصعب بن مقدام سے روایت ہے:

سمعت الامام (اباحنیفہ) یقول لا اجتمع قلبی کله لرجل الا لزفر اذا تکلم [۳۹]

میں نے امام ابوحنیفہ کو کہتے سنا کہ میں نے زفر کے سوا کبھی کسی کی بات دلی توجہ سے نہیں سنی۔

احمد امین لکھتے ہیں:

---

۳۶ ذہبی، میزان الاعتدال: ۲: ۷۱، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ عیسی البابی الحلبی و شرکاہ ۱۳۸۲ھ

۳۷ موفق: مناقب امام اعظم: ۲، ۲۴۵، مطبوعہ حیدرآباد ہند

۳۸ محی الدین ابی محمد عبد القادر: الجواہر المضیہ: ۱: ۲۴۳، مطبوعہ حیدرآباد ہند

۳۹ کردری، مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۹ مطبوعہ حیدرآباد ہند۔

امام زفر من تمیم کان من اشھر اصحاب ابی حنیفۃ وکان امھرھم فی القیاس و اکثرھم التزامًا لمسلکہ فی الرای کان ابوہ ھذیل والیا علی البصرۃ وکانت امہ فارسیۃ فورث وجھہ من امہ ولسانہ من ابیہ وکان قوی الحجۃ مقدما عند اصحاب ابی حنیفۃ قیاسًا۔ ولد سنۃ ۱۱۰ھ وتوفی ۱۵۸ھ۔

ویعجبنی فی المقارنۃ بین الثلاثۃ ما روی عن المزنی صاحب الشافعی انہ جاء رجل فسئالہ عن اھل العراق قال ما تقول فی ابی حنیفۃ؟ قال سیدھم۔ قال فابو یوسف؟ قال اتبعھم للحدیث قال محمد بن الحسن؟ قال اکثرھم تفریعا قال فزفر؟ قال احدھم قیاسا[40]

امام زفر تمیمی تھے۔ ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔ ان سب سے قیاس میں زیادہ ماہر تھے۔ اور ان میں سے زیادہ آپ کی رائے کا آپ کے مسلک کی وجہ سے التزام کرتے۔ آپ کے والد ہذیل بصرہ کے والی تھے اور والدہ فارسی النسل تھیں۔ آپ کا چہرہ والدہ سے مشابہ تھا اور زبان باپ سے۔ آپ پختہ دلیل کے مالک تھے۔ قیاس میں ابوحنیفہ کے شاگردوں میں درجہ اول کے شاگرد تھے۔ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۸ھ میں فوت ہوئے۔

اور یہ بات مجھے اچھی لگی ہے جو ان تینوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے لیے امام شافعیؒ کے شاگرد مزنی سے روایت کی گئی ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور اہلِ عراق کے بارے میں پوچھا۔ کہ ابوحنیفہ کے بارے کیا کہتے ہو۔ جواب دیا کہ وہ اُن کے سردار ہیں۔ پوچھا ابویوسف کے بارے میں۔ جواب دیا کہ وہ ان میں سب سے زیادہ حدیث کی اتباع کرنے والے ہیں۔ پوچھا محمد بن حسن۔ کہا کہ وہ سب سے زیادہ استنباط کرنے والے ہیں۔ پوچھا، زفر۔ جواب دیا کہ وہ ان میں سب سے زیادہ قیاس کرنے والے ہیں۔

امام ابوحنیفہ سے عبداللہ بن عثمان اپنے باپ کے حوالے سے ایک مثال بیان کرتے ہیں:

امام ابوحنیفہؒ کہا کرتے تھے کہ وہ ایک پرندے کی مانند ہیں، جس کا جسم ابویوسفؒ، دایاں پَر محمد بن الحسنؒ اور بایاں پَر زفرؒ ہے، اور اس کا کوئی بال و پَر نہیں مگر وہ امت کا فقیہ ہے[41]

امام ابن القیم نے "اعلام الموقعین" میں آپ کو کوفہ کے ممتاز مفتیوں میں شمار کیا ہے[42]۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں:

---

[40] احمد امین: ضحی الاسلام: ۲: ۲۰۴، مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ

[41] کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۰۱، مطبوعہ حیدرآباد ہند

[42] ابن قیم: اعلام الموقعین: ۱: ۹، مطبوعہ دہلی ہند ۱۳۱۳ھ

زفر بن الہذیل ثم التمیمی فکان کبیرا من کبار اصحاب ابی حنیفۃ وافقھم کان یقول انہ کان احسنھم قیاسا۔[۴۳]

زفر بن الہذیل تمیمی، حضرت امام ابو حنیفہ کے بڑے بڑے شاگردوں میں سے ایک بڑے شاگرد اور سب سے زیادہ فقیہ تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ: ان میں سب سے زیادہ قیاس کرنے والے ہیں۔

فضل بن دکین کہتے ہیں جب حضرت امام ابوحنیفہ رحلت فرما گئے تو میں نے امام زفر کی صحبت کو اپنے اوپر لازم کر لیا، اس لیے کہ وہ امام ابوحنیفہ کے ساتھیوں میں سب سے زیادہ فقیہ اور پرہیزگار تھے۔ میں نے ان سے علم کا گراں قدر حصہ حاصل کیا۔[۴۴]

امام نسفی صاحب المنظومہ حسن بن زیاد کی ایک روایت نقل کرتے ہیں:

ان المقدم فی مجلس الامام کان زفر وقلوب الاصحاب الیہ امیل۔[۴۵]

امام ابوحنیفہ کی مجلس میں پہلے درجہ کے تھے اور تمام شاگردوں کے دل آپ کی طرف سب سے زیادہ مائل ہوتے تھے۔

وکیع ابن الجراح کے بارے آتا ہے:

قیل لوکیع تختلف الی زفر فقال غررتمونا بابی حنیفہ حتی مات تریدون ان تغررنا عن زفر حتی نحتاج الی اسعد واصحابہ۔[۴۶]

وکیع ابن الجراح سے کہا گیا کہ آپ امام زفر کی طرف بہت آتے جاتے ہیں۔ کہنے لگے کہ آپ لوگوں نے مجھے امام ابوحنیفہ کے بارے غلط فہمی میں رکھا، یہاں تک کہ وہ وفات پا گئے۔ اب تم امام زفر کے بارے میں مجھے غلط فہمی میں ڈالنا چاہتے ہو، یہاں تک کہ اسعد اور ان کے ساتھیوں کا محتاج ہونا پڑے۔

یحییٰ بن اکثم سے ایک روایت حضرت وکیع ابن الجراح کے بارے مروی ہے:

عن یحییٰ ابن اکثم قال رایت وکیعا فی اٰخر عمرہ یختلف الیہ بالغدوات والی ابی یوسف بالعشیات ثم ترک ابا یوسف وجعل کل اختلافہ الیہ لانہ کان افرغ وکان

---

[۴۳] ابن عبدالبر: انتقاء: ۱۷۳، مطبوعہ مصر ۱۳۵۰ھ

[۴۴] محی الدین ابی محمد عبدالقادر: الجواہر المضیہ: ۲: ۵۳۴: مطبوعہ ہند ۱۳۳۲ھ

[۴۵] کردری: مناقب امام اعظم: ۲، ۱۸۳: مطبوعہ حیدرآباد ہند [۴۶] ایضاً

يقول الحمد لله الذي جعلك خلفا لنا عن الامام ولكن لا يذهب عنی حسرة الامام[۴۷]

یحییٰ بن اکثم سے روایت ہے کہ میں نے وکیع ابن الجراح کو دیکھا کہ وہ آخر عمر میں صبح کو امام زفر کے ہاں اور شام کو ابو یوسف کے ہاں آنے جاتے۔ پھر انھوں نے امام ابو یوسف کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا اور صرف امام زفر کے ہاں آتے جاتے، اس لیے کہ آپ زیادہ فارغ ہوتے تھے، اور کہا کرتے الحمد للہ کہ جس نے آپ جیسا جانشین ہمیں عطا کیا۔ لیکن امام صاحب کی حسرت پھر بھی باقی رہے گی۔

شفیق بن ابراہیم کہتے ہیں:

اخذت العبادة عن عباد ابن كثير والفقه عن زفر[۴۸]

میں نے عبادت عباد ابن کثیر سے اور فقہ امام زفرؒ سے حاصل کیا۔

وکیع ابن الجراح فرماتے ہیں:

ما نفعني مجالسة احد مثل ما نفعني مجالسة زفر[۴۹]

مجھے کسی کی مجالس نے اتنا فائدہ نہیں دیا جتنا کہ امام زفر کی مجالس نے دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے حضرت امام ابو حنیفہ نے اپنی نیابت کا حق دار حضرت امام زفر کو قرار دیا اور پھر یہ بھی روایت گزر چکی ہے کہ امام ابو حنیفہ آپ کو صرف ایک فقیہ ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ آپ کو قاضیوں اور ارباب فتویٰ کا مربی قرار دیتے تھے۔ یہ بھی گزر چکا ہے کہ امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ میرا دل مکمل طور پر اگر کسی کے کلام کی طرف مائل ہوتا ہے تو امام زفر کی طرف مائل ہوتا ہے، جب وہ کلام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مشہور علما کے اقوال جو ذکر کیے جا چکے ہیں اس بات کی مکمل تائید کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے ہاں امام زفر کا جو مقام تھا وہ اس کے حق دار تھے۔ وہ ایک کامل مجتہد تھے جس کی وجہ سے آپ کی آرا کو کافی وزن حاصل ہے۔ آج تک ان کی آرا منفرد حیثیت میں فقہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں، بلکہ اس وقت کا جو نقشہ ابو عاصم النبیل[۵۰] کے اس رویے سے سامنے آتا ہے کہ وہ جب بھی کبھی مجلسِ مناظرہ میں بیٹھتے تو امام ابو حنیفہ اور امام زفرؒ

---

[۴۷] محی الدین ابی محمد عبد القادر: الجواہر المضیہ: ۲: ۵۳۴، مطبوعہ ہند

[۴۸] کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۵، مطبوعہ حیدر آباد ہند

[۴۹] ایضاً، ص ۱۸۵ [۵۰] ایضاً۔

کی آرا کو علیحدہ علیحدہ حیثیت میں ذکر کرتے، آپ کی اجتہادانہ حیثیت پر دال ہے۔

ابن خلکان نے معافا بن زکریا کی کتاب "الجلیس والانیس" سے عبدالرحمن بن معز کی ایک روایت جو کہ مختصر صورت میں الجواہر المضیہ میں یوں آئی ہے، نقل کی ہے:

ذکر الحافظ النیسابوری ان رجلا جاء الی الامام وقال لا ادری اطلقت امراتی ام لا قال لا علیک حتی تتیقن بالطلاق ثم سال الثوری فقال لا تضر بالرجعة فسال شریکاً فقال طلقها ثم راجعها۔ فجاء الی زفر فحکی له الاقاویل فقال الامام فقد افتی بالفقه والثوری بالورع واما شریک بالحزم فاضرب لکم مثلاً ان رجلا شك هل اصاب ثوبه نجس ام لا فقال الامام لا علیک قبل العلم بالنجاسة والثوری قال لو غسلته لا علیک واما شریک فقال بل علیه ثم اغسله ۵۱

حافظ عبداللہ الحاکم نیساپوری نے ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے ہاں ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے اپنی عورت کو طلاق دی ہے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا جب تک تجھے طلاق دینے کا یقین نہ آجائے تیری کوئی طلاق نہیں۔ پھر وہ سفیان ثوری کے پاس گیا، انھوں نے کہا رجعت کرلے، تجھے یہ کوئی ضرر نہیں دے گی۔ پھر وہ شریک بن عبداللہ کے پاس گیا، انھوں نے کہا طلاق دے دے اور پھر رجعت کرلے۔ پھر وہ امام زفر کے پاس گیا اور تمام بات سنائی تو امام زفر کہنے لگے کہ امام ابوحنیفہ نے فقہ سے، ثوری نے پرہیزگاری سے اور شریک نے احتیاط سے فتویٰ دیا ہے۔ میں تجھے ایک مثال دیتا ہوں کہ ایک شخص کو کپڑے پر گندگی لگنے کا شک ہوگیا، جب تک یقین نہ ہو کپڑا پاک ہے اور ثوری نے کہا کہ دھو ڈالو تو کوئی مضائقہ نہیں، اور شریک نے کہا کہ اسے پھر گندگی لگاؤ اور پھر دھو ڈالو۔

تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد ان الفاظ کے ساتھ تبصرہ کیا ہے:

وقد احسن زفر فی فضله بین هؤلاء الثلاثة فیما افتی به فی هذا المسئلة وفیما اضرب به لسائله من الامثلة ۵۲

امام زفر نے ان تینوں سے اپنا فتویٰ دینے اور مثال دے کر اپنے سائل کو سمجھانے میں زیادہ کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔

---

۵۱ محی الدین ابی محمد عبدالقادر: ذیل الجواہر المضیہ: ۲: ۵۳۴ مطبوعہ حیدر آباد۔

۵۲ ابن خلکان: وفیات الاعیان: ۱: ۲۵۸ مطبوعہ ایران (نسخہ سمرقند)

امام ابو حنیفہ اور امام زفر کے اختلافات باہمی تشریحی و تطبیقی بنا پر ہیں۔ اصول وہی تھے جو استاد محترم کے تھے، جس کی تصدیق الضحاک بن مخلد کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ :

سمعت زفر یقول ما خالفت ابا حنیفۃ فی قول الا وقد کان ابو حنیفۃ یقول بہ[۳۵]

میں نے امام زفر کو کہتے سنا ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہ کے قول کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہی قول اس سے پہلے امام صاحب سے مروی ہیں۔

(باقی آئندہ)

---

[۳۵] محی الدین ابی محمد عبدالقادر : الجواہر المضیہ : ۱ : ۲۴۳، مطبوعہ ہند

سطعات

از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ——— اردو ترجمہ : مولانا سید محمد متین ہاشمی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی برصغیر پاک و ہند کی وہ عظیم شخصیت ہیں، جنھیں پورے عالم اسلامی میں نہایت قابلِ فخر اور بلند مرتبت ہستی سمجھا جاتا ہے ——— وہ بہترین مصلح، بہت بڑے مصنف، جید عالم دین، نامور مفسر، جلیل القدر محدث، بہت بڑے فقیہ، بلند پایہ مفکر اور عظیم صوفی تھے۔ ان کی تصنیفات اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ ہر دور کے لیے مفید اور قابلِ عمل ہیں۔

شاہ صاحب کی گراں قدر تصنیفات میں "سطعات" کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس کے اردو ترجمے کی اشد ضرورت تھی۔ ملک کے مشہور عالم مولانا سید محمد متین ہاشمی نے اس کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے ——— فاضل مترجم نے حل طلب مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور جامع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے حالات اور ان کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

قیمت : -/۱۲ روپے

ملنے کا پتا :- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

پروفیسر محمد اجمل چشتی

المیہ تعلیم اور اس کا حل

تعلیم و تعلم سے مراد کیا ہے؟ تعلیم کی ضرورت کیا ہے؟ تعلیم کا مقصود کیا ہے؟ کیا چند ثقیل الفاظ کے استعمال کی صلاحیت غایتِ تعلیم ہے؟ کیا پاکستان میں رائج موجودہ نظامِ تعلیم غایتِ تعلیم کو پورا کرتا ہے۔ اگر نہیں تو پھر کون سا طریقۂ تعلیم اور کون سی تعلیم پاکستان اور اس کی نظریاتی اساس کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے؟ برطانوی دورِ اقتدار میں برصغیر پاک و ہند میں کس طرح کا نظامِ تعلیم رائج رہا ہے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ کیا سائنسی اور فنی مضامین کی تعلیم صرف انگریزی زبان ہی میں ممکن ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ مختلف سوالات ہیں جو ہر صاحب درد پاکستانی دل کو اضطراب کا شکار بنائے ہوئے ہیں اور ان کا تسلی بخش جواب نہ پا کر اکثر ذہن پراگندگی و انتشار میں مبتلا ہیں۔ یہ سوال بھی ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ پاکستان ایسی نظریاتی ریاست میں کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے، اور اس کے حصول کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کیوں ملتِ اسلامیہ اپنی نظریاتی اساس سے دور ہو کر انحطاط پذیر ہوتی چلی گئی؟ وہ کیا وجوہات ہیں جنہوں نے تمام معاشرتی اقدار کے ساتھ ساتھ تعلیم کو بطورِ خاص روبزوال کر دیا؟ انہی سوالات سے بحث کرنے کے لیے یہ چند سطور تحریر کی گئی ہیں۔

قرآن کا نظریہ تعلیم

تعلیم کی حقیقت و ضرورت کے باب میں اللہ رب العالمین کا آخری الہامی اور خطا و نسیان سے محفوظ و مامون کلام ---- قرآن مجید ---- نزولِ وحی کے لحاظ سے اپنے اوّلین خطاب میں بڑے فصیح اور وسیع انداز میں یوں فرمایا ہے:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۙ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (۹۶ : ۱ تا ۵)

پڑھیے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا (کل کائنات کو عموماً انسان کو) اس (اشرف المخلوقات) انسان کی اوّلین پرورش جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے کی۔ پڑھیے کہ آپ کے سب سے

زیادہ عزت و اکرام والے رب کی قسم ہے ۔ اس نے قلم کے واسطے سے علم سکھایا۔ اس انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ (اپنی جبلت اور فطرت کے لحاظ سے) نہ جانتا تھا۔

گویا اس پہلی ہی وحی میں تعلیم کے ضمن میں پیدا ہونے والے بہت سے اشکال کا حل موجود ہے ۔تعلیم کی غرض و غایت اور افادیت پر بڑے بلیغ انداز میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ :

۱۔ پڑھنا یعنی تحصیلِ علم انسان کا سب سے بڑا اعزاز ہے ۔ اسی سے یہ مستدرک ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ ہی کل کائنات کا خالق و رازق ہے ۔ (یہ آیت ہی اپنے اندر معانی کا اتنا وسیع سمندر سمیٹے ہوئے ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں) ۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسان کی اوّلین پرورش کے لیے ماں کے رحم میں موجود جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں سے کام لیا ۔

۳۔ ربوبیتِ کائنات کا اعزاز کے ساتھ ذکر فرماکر واضح کیا کہ اسی نے قلم کی وساطت سے علم سکھایا ۔ یعنی تحصیلِ علم کے لیے پڑھنا اور لکھنا دونوں لازم ہیں، تاکہ علم کے نتیجے میں غور و فکر کو کام میں لاکر انسان اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے قابل ہو۔

۴۔ یہ وضاحت کہ انسان کو تحصیلِ علم کی لگن میں مگن پاکر اسے وہ کچھ سکھا دیا جو وہ پہلے سے نہ جانتا تھا۔ یعنی تحصیلِ علم کی طرف راغب ہونے پر انسان کے فہم و ادراک پر اسرار و رموزِ علم کھلتے جاتے ہیں اور وہ ان مشاہدات سے ہم کنار ہوتا ہے جو اس کی فکر کو جلا بخش دیتے ہیں۔

سورۂ روم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : (اے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہیے کہ بھلا علم حاصل کرنے والے اور تحصیلِ علم کی طرف راغب نہ ہونے والے آپس میں مراتب کے لحاظ سے برابر ہو سکتے ہیں ؟ یقیناً نہیں ۔

نبی کریمؐ کا نظریۂ تعلیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ خالقِ کائنات کی صناعی پر ایک لمحہ بھر کے لیے غور ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے ۔ ایک مقام پر آپ نے فرمایا کہ جو تحصیلِ علم کے لیے گھر بار چھوڑتا ہے وہ راہِ خدا میں قدم بڑھاتا ہے ۔ ایک موقع پر آپؐ کا ارشاد ہے کہ علم حاصل کرنا، اس پر عمل کرنا اور اس کی اشاعت کرنا صدقہ ہے ۔ مزید آپ فرماتے ہیں: ماں کی گود سے قبر کی آغوش تک علم حاصل کرو ۔ ایک مرتبہ آپؐ نے تلقین فرمائی کہ علم حاصل کرو اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے ۔ طلبِ علم عبادت ہے اور مذاکرۂ علم تسبیح ہے ۔

آپؐ کا فرمان ہے کہ اللہ کو جس بندے کی بھلائی منظور ہوتی ہے وہ اس میں تین اوصاف پیدا کر دیتا ہے، دین کا فہم، دنیا سے بیزاری اور اپنے عیوب کی پرکھ۔

سطورِ بالا سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا حصولِ علم میں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہتر طور پر اتباع بھی تحصیلِ علم ہی سے ہو سکتی ہے۔ حصولِ علم کی غایت یہ ہے کہ انسان اپنی جبلی استعداد، قوتِ کارکردگی اور تخلیقی و تعمیری قوتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکے۔

مغربی نظریۂ تعلیم

انیسویں صدی عیسوی میں جب یورپ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معلوم دنیا کو مسخر کرنے کی طرف گامزن تھا تو ایک برطانوی مفکر مسٹر اے این وائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب "مقاصدِ تعلیم" میں تحریر کیا کہ (۱) تعلیم حاصل شدہ علم کو استعمال میں لانے کا فن سکھاتی ہے۔ (۲) تعلیم کا موضوع مطالعہ ایک ہی ہے۔ "حیات" (قوتِ متحرکہ) اپنے تمام تر اور ہمہ گیر مظاہر کے ساتھ۔ (۳) تعلیم تفصیلات و جزئیات پر مہارت حاصل کرنے کے جان گسل عمل سے عبارت ہے جو لمحہ بہ لمحہ اور ساعت بہ ساعت فزوں تر ہو۔ (۴) تعلیم انسان کو اس میں ودیعت کی گئی "قوت" کا ادراک کراتی ہے، تاکہ اس سے کام لے کر اپنے مسائل حل کیے جائیں۔ (۵) تعلیم کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ خدا کے اصول اور طریقے انسان کے ساتھ کیا ہیں؟ ان اصولوں کے جواز کا ادراک، ان کی اپنے دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے ٹھیک ٹھیک نشان دہی اور نگرانی اور جو (مشکلات؟) انسان کے سامنے آئیں انھیں (حل) کرنے کی کوشش کرنا۔ (۶) کامیاب تعلیم کے لیے لازمی ہے کہ جن معلومات پر بحث کی جائے، ان میں تازگی و جدّت برقرار رہے (محض تکرارِ لفظی نہ ہو)۔ (۷) وہ شخص قطعاً تعلیم یافتہ نہیں جو چند معلوماتی فقروں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھ کر بحث و تکرار کے وقت ان کو بیان کر سکتا ہو۔ بلکہ صحیح تعلیم یافتہ اور بہترین ثقافت کا حامل وہ ہے جو اپنی حاصل کردہ معلومات کو عملی زندگی میں صحیح طریقے سے استعمال کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہو۔

الفاظ کے تغیر سے بات انھی اصولوں کی گئی ہے جو خالقِ کائنات نے قرآن میں بیان فرمائے۔ یا معلمِ کائنات علیہ تحیۃ وسلام نے اسے تشریحِ کلامِ مجید کے طور پر بطورِ حدیث ہمیں بتائے۔ یعنی ماضی قریب میں مادی ترقی کے میدان کی اقوام نے ان ابدی اصولوں کو سمجھا، ان پر عمل پیرا ہوئے اور زندگی کی قوتِ متحرکہ کو روبہ عمل لا کر کائنات

ارضی کے وسیع و عریض حصے پر اپنی سلطنت و سطوت کے جھنڈے گاڑ دیے۔

فرمانِ خدا اور احکامِ پیغمبر پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں رائج موجودہ نظامِ تعلیم کے بعض حصے ناقص اور بے مقصد ہیں

برصغیر کے لیے انگریزی نظریۂ تعلیم

برطانوی استعمار نے اپنے مکر و فریب اور مکروہ سیاست کے فروغ کے لیے برصغیر میں اپنی گرفت مضبوط کرنے اور اپنے پنجۂ استبداد کو مضبوط تر کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان میں تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایجوکیشن انکوائری کمیٹی کے کنوینر مسٹر چارلس ٹریویلین نے ۱۸۳۸ء میں ایجوکیشن آف انڈین پیپل نامی کتاب میں "نظامِ تعلیم کے سیاسی رجحانات" کے تحت تحریر کیا ہے کہ "مسلمانوں کا نظامِ تعلیم طاقت، فخر و مباہات اور جوش و عزائم پر مبنی ہے۔ اقتدار کی طلب اور لذائذ جسمانی کے حصول کے لیے مذہب سے تائید لائی جاتی ہے۔ کرۂ ارض کو متبعین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی میراث قرار دیا جاتا ہے۔ مومنین (پیروانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ سب کو کافر یعنی غاصب، بے حق اور بے استقلال گردانا جاتا ہے، جن سے بجز سیاسی مقتضیات کے کوئی رابطہ مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔ تمام ممالک و امصار با اختیارِ الٰہی مسلمانوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ . . وغیرہ وغیرہ۔ مگر عربی (اسلامی) نظامِ تعلیم کے یہ میلانات ہماری خوش بختی سے ایسی مشکل لکھی ہوئی کتابوں اور بہت سے علما کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ یہ میلانات اب شاذ و نادر ہی لوگوں کے جذبات میں جھلکتے ہیں۔ تاہم اس نظامِ تعلیم سے متعلق بجا طور پر کہا جائے گا کہ یہ ان کو دوبارہ زندہ کر دے گا یا تازہ دم کر دے گا اور مسلمانوں کو مستقل طور پر یہ یاد دلاتا رہے گا کہ ہم (انگریز) ہی ہیں جنھوں نے مومنوں کو غاصبانہ طور پر اُن کی بہترین سلطنت سے محروم کیا ہے۔ جب تک یہ لوگ اپنی گزشتہ آزادی پر کُڑھتے رہیں گے، اپنے حالات کو بہتر بنانے کی سعی کرنے کی سوچتے رہیں گے۔ اپنے حالات کو بہتر بنانے کی ان کے پاس ایک ہی تدبیر ہوگی کہ وہ اس ملک سے ہم تمام (انگریزوں) کو "جبراً" نکال دیں۔ ان کے ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے ایک ہی تصور رکھتے ہیں۔ ان کا اعلیٰ طبقہ یہ توقع رکھتا ہے کہ اس طرح ان کو ان کی عظمتِ رفتہ مل جائے گی اور ادنیٰ طبقہ یہ امید رکھتا ہے کہ ان کے ملکی اقتدار کے دوبارہ قیام سے دولت و امتیاز کی راہیں ان پر کھل جائیں گی۔ حتیٰ کہ زیادہ باشعور اور نسبتاً اچھا اثر قبول کرنے والے مسلمان بھی اس کے علاوہ کوئی تصور نہیں رکھتے کہ ان کی موجودہ بدحالی رفع کرنے کا طریقہ انگریزوں کو

جبراً پوری طرح اس ملک سے نکال دینے کے علاوہ بھی کوئی اور ہو سکتا ہے ۔ ۔ ۔ "

اس تجزیے اور تشخیص کے علاوہ مسٹر ٹریویلین اس مسئلے کا یہ حل پیش کرتے ہیں کہ "صرف یورپی تصورات سے ان کو گرما کر ہی یہ ممکن ہے کہ ان کے قومی نظریات کو ایک نیا رخ دیا جا سکے۔ جو نوجوان ہمارے تعلیمی مراکز سے تربیت پائیں گے وہ نہایت تحقیر سے اپنے مطلق العنان اسلاف کو دیکھیں گے اور ہمارے قومی اداروں کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ ہمیں ناپسند کرنے کی بجائے وہ ہمارے ساتھ رہنا باعث فخر سمجھیں گے اور ہمیں اپنا محسن و محافظ سمجھنے لگیں گے۔ ان کی سب سے بڑی آرزو ہماری مشابہت کرنا ہوگی۔ ہماری رہنمائی میں اپنے ہم وطنوں کے کردار کو بلند کرنے، بتدریج (ہماری خواہشات کے عین مطابق) ان کو منظم کرنے اور ایک محفوظ و پُرمسرت آزادی کے حصول کی توقع کرنے میں اپنی تمام تر قوتوں کو صرف کرنے لگیں گے۔ ہمیں غیر سمجھنے کی بجائے وہ اس بات کی تمنا کریں گے کہ ہمارے ساتھ مجسٹریٹوں اور ججوں کی کرسیوں پر بیٹھ کر فیصلے کریں۔ پنجاب و بنگال کی سیاست پر سوچنے کی بجائے اپنی مجالس مذاکرہ میں مطبع کے فوائد اور آزادی کے ایسے موضوعات پر خطیبانہ انداز میں انگریزی زبان میں مباحثے کیا کریں گے۔ انگریزی ادب کی روح انگریزوں سے رابطہ پیدا کرنے میں انتہائی موافق اثرات کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ادب کے مطالعہ سے ان لوگوں کی ہم سے بے تکلف جان پہچان کا اثر یہ ہوگا کہ ایک تو ہمیں غیر سمجھنا چھوڑ دیں گے، دوسرے ہمارے اکابر کے تذکرے اسی جوش و خروش سے کریں گے (جو یقیناً ان کے اپنے اکابر کی غیر شعوری تکذیب ہوگی) جیسے ہم کرتے ہیں، ہمارے طریقے پر تعلیم پاکر اور ہمارے مشاغل میں دلچسپی لے کر ہمارے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر کے وہ ہندیوں سے زیادہ بالکل اسی طرح انگریز بن جائیں گے، جس طرح رومن صوبوں کے لوگ اطالویوں اور فرانسیسیوں وغیرہ سے زیادہ رومن بن گئے تھے۔ وہ متشدد دشمن کے بجائے ہمارے ذہین اور پرجوش معاون و مددگار بن جائیں گے ۔ ۔ ۔ انگلستان اور ہند ایسے دور دراز ممالک کے درمیان موجودہ تعلق کا دائمی یا مستقل ہونا حقیقت کے منافی ہے۔ کسی بھی کوشش اور تدبیر سے اور کسی بھی حکمتِ عملی سے ملکیوں کو انجام کار آزادی کے حصول سے روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن اسے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک انقلاب کے ذریعے اور دوسرے اصلاح کے طریقے سے۔ ایک طریقے میں ارتقائی حرکت فوری اور متشددانہ ہوگی اور دوسرے میں تدریجی اور پُرامن۔ ایک طریقہ لازمی طور پر ملکیوں اور ہمارے درمیان کامل ذہنی بیگانگی اور بیزاری پر منتج ہوگا، دوسرا دائمی دوستی، باہمی نفع بخشی اور خیر خواہی کا۔

ناپسندیدہ نتائج کو روکنے اور پسندیدہ نتائج حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ہم ملکیوں کو یورپی انداز کے ترقی کے حصول میں مبتلا کر دیں۔ ایسا کرتے ہی وہ قدیم ہندی (اسلامی) بنیادوں پر آزادی حاصل کرنے کی خواہش سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اس صورت میں تبدیلی بھی فوری طور پر ناممکن ہوگی اور ہند سے ہمارا تعلق بھی تادیر قائم رہے گا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو یورپی طرز کی "اپنی حکومت" (Self Govt) کے لیے ایک صدی بمشکل کافی ہوگی اور جب تک یہ مدعا پورا ہوگا، ہم بہ حد امکان تبدیلیٔ حکومت کے خطرے سے محفوظ رہیں گے۔ ہماری رعایا میں کوئی طبقہ ایسا نہ ہوگا جس کے لیے ہمارا وجود اتنا ضروری ہو، جتنا کہ اس طبقے کے لیے جس کے خیالات انگریزی نمونے میں ڈھل جائیں گے۔"

اسی مضمون میں مسٹر ٹریویلین آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ہندو مذہب ایسا نہیں جو اس آزمائش پر پورا اتر سکے، جسے شہادت یا دلیل کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ مذہب اس درجہ بے تعلق ہے اور اس حد تک خرابیوں سے مملو ہے کہ یورپی علوم کے سامنے یہ اپنا تشخص قائم نہیں رکھ سکتا۔ البتہ اسلام زیادہ سخت جان ہے۔ اس کے باوجود ایک مسلم نوجوان جس نے انگریزی طرز پر تعلیم پائی ہو، اس شخص سے جس نے اپنے باپ دادا کے طریقے پر تعلیم پائی ہو، مختلف قسم کا انسان ہوگا، اور اشتعال انگیز مذہبی جذبات کا نام بھی سننے میں نہیں آئے گا۔"

یہ بات از خود سمجھ میں آجاتی ہے کہ مندرجہ بالا رپورٹ کی روشنی میں نافذ کیا جانے والا نظامِ تعلیم وہی نتائج برآمد کر سکتا تھا، جن کے حصول کے لیے نظام نافذ کیا گیا تھا۔ اس اقتباس کا ایک ایک نقطہ قابل غور ہے اور انگریزی استبدادی نظامِ تعلیم کا منہ بولتا ثبوت۔ تاہم اس کے بہت سے الفاظ برطانوی استعماری ذہن کے بطورِ خاص ترجمان ہیں۔ یہی وہ طریق تھا جس پر عمل پیرا ہو کر اس استحصالی قوت نے اپنے زمانۂ اقتدار کے بعد جسمانی طور پر اپنا تسلط ختم کرنے کے باوجود اپنی تہذیبی ذریت ہم پر مسلط کر دی۔ یہ ذریت انگریز سے بڑھ کر انگریز نواز ہے۔ اس کے نزدیک ہر ایسا عمل جو ہمیں ہماری اصل تہذیب، طاقت، فخر و مباہات، جوش اور ولولے کی طرف لوٹانے کا سبب بن سکتا، ہمیں دورِ جدید سے منقطع کر کے قعرِ جہالت میں گرانے کا باعث ہو سکتا ہے۔ مسٹر ٹریویلین کا تجزیہ اور اس کی روشنی میں مسٹر میکالے کا تجویز کردہ اور نافذ کیا جانے والا نظامِ تعلیم بلاشبہ اس بات کا غماز ہے کہ اس سے برطانوی مفادات کی نگہداشت اور ہمارے تہذیبی و تمدنی ورثے کی نفی ہوئی۔ ہم واقعی انگریز سے بڑھ کر انگریز نواز بنے اور اس کی تہذیب و تمدن کے دل دادہ و شائق ثابت ہوئے۔ اس نظامِ تعلیم کا مقصد ہی ہمیں ذہنی و فکری تردلیدگی کا شکار بنانا تھا اور ہم اس افیون کے اس قدر خوگر ہو گئے

ہیں کہ اس سے منہ پھیرتے ہوئے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہمارے معاشی و معاشرتی سوتے ہی خشک ہو جائیں گے۔

اسلامی نظریہ تعلیم کا اجمالی نقشہ

یہاں ضروری ہے کہ اسلامی نظریہ تعلیم بیان کرتے ہوئے اس کی بنیاد اور اس پر استوار ہونے والے ڈھانچے کا پتا کیا جائے کہ آخر اسلامی نظریہ تعلیم کیا ہے اور اپنے پیروؤں سے کیا طلب کرتا ہے؟ اس نظریے کا مقصد مسلمانوں کی روحانی قوتوں کو جلا دینا، تحصیلِ علم کے نتیجے میں ان کے اس نظریے کو پختہ کرنا کہ اللہ ہی ان کا رب ہے اور وہ رب العالمین ہے اس لیے اس کی ذات پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے خود کو صرف اسی کا محتاج جانتے ہوئے بجا طور پر فخر و مباہات کے احساسات کو اپنے اندر پیدا کرنا، منزلِ حیات کی تعیین سمجھ لینے کے بعد حصولِ مقصد کے لیے پورے اخلاص اور یقینِ محکم کے ساتھ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانا، حلال و حرام میں امتیاز پیدا کرنا، اقتدار حاصل کر کے اللہ کی حدود کو اس کائناتِ ارضی میں نافذ کرنا اور اللہ کی راہ روکنے والے لوگوں کو غاصب و ظالم سمجھنا اور ان کو فساد فی الارض کا مرکزی محور جان کر اس دنیا سے ان کے تسلط کو ختم کرنے کی کوشش کرنا۔ اس طرح کی تعلیم کی تحصیل کے بعد افرادِ قوم غیر متزلزل قوتِ ارادی سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا جوہرِ اصلی تحصیلِ علم، تہذیبِ نفس اور اکتسابِ فن سے پوری طرح صیقل ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اسی جوہر سے کام لے کر ہر فردِ ملّت اپنی خداداد صلاحیتوں کو رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر وقف کر دیتا اور موت تک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسانیت کو گہوارۂ امن بنانے کی سعی میں مصروف رہتا ہے۔

انگریزی استعمار سے قبل اسلامی تدریسی دور (درسِ نظامی) صرف بارہ سال کے عرصے پر محیط تھا۔ (درسِ نظامی) کے فارغ التحصیل طلباء علومِ متداولہ منطق، طب، فلسفہ، نجوم، ہیئت، علم الکلام، تحقیق، تفسیر، حدیث، فقہ، انجینیرنگ، سائنس اور دیگر فنی علوم کے علاوہ فنِ سپہ گری سے بھی آگاہ ہوتے تھے۔ موجودہ نظامِ تعلیم کی تدریسی مدت قریباً اٹھارہ سال ہے اور اس کی تکمیل پر کسی ایک مضمون میں ماسٹر کی ڈگری مل جاتی ہے، تاہم اس کی پیداوار کی اکثریت بے نور چہروں، مفلوج ذہنوں اور مردہ دلوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص مضمون میں بھی خاطر خواہ دسترس نہیں رکھتے۔ ان کا فکر مغربیت سے اس قدر مرعوب ہوتا ہے کہ وہ اپنے حیات افروز خزانۂ علم و ادب کی طرف توجہ کرنا موت سے کم نہیں تصور کرتے۔ اس طریقۂ تعلیم نے صرف

حصولِ ڈگری کی تمنا بیدار کی ہے، حصولِ علم کی نہیں، خواہ اس کے لیے کتنے ہی غلط ذرائع استعمال کیوں نہ کرنے پڑیں۔ آج کے تعلیم یافتہ فرد کا مقصد حصولِ معاش ہے، رضائے الٰہی یا معرفتِ دینی بالکل نہیں۔

افسوس ہے قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس میں بہتر طور سے تبدیلی نہ کی گئی۔ اگر اس طرف توجہ کی بھی گئی تو تعلیم کو جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے نام سے ایسے نادر طریقوں پر عمل شروع ہوا کہ یہ ایک عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا۔ مختلف درجات کے لیے نصاب ایسے منصوبے سے مرتب کیا جا رہا ہے کہ ابتدائی تعلیم ثانوی تعلیم سے اور ثانوی تعلیم اعلیٰ تعلیم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس سے تخلیقی و تحقیقی ذہن پیدا نہیں ہو سکتا۔ بعض مضامین میں بڑی تکرار ہے۔ مسٹر وائیٹ ہیڈ (کہ ہمارے مفکرین انگریز فلاسفہ کے علاوہ کسی کی بات کو وزن ہی دینے کو تیار نہیں ہوتے) نے "مقاصدِ تعلیم" نامی اپنی کتاب میں ایک جگہ یہ وضاحت کی ہے کہ "بہت زیادہ مضامین کی تعلیم نہ دو بلکہ جتنے مضامین کی تعلیم دو، وہ جامع اور مکمل ہونی چاہیے۔" واقعی اسی اصول پر عمل پیرا ہو کر ذہنی و فکری بانجھ پن سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں یہ صورت نہیں ہے۔ یہاں تو ہر جماعت کے لیے مقرر کردہ نصاب میں مضامین (Subjects) کی بڑی بھرمار ہے، اور پہلی جماعت ہی کے ننھے منے معصوم بچوں کو نصابی کتب کی صورت میں علم کا تناظر بوجھل بستہ اٹھانا پڑتا ہے، جو شاید ان کے اپنے وزن سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ پھر ایسے طریں، تکراری ذریعے مقصد مضامین ہر کتاب میں موجود ہیں کہ اس کا تدریسی مدت میں ایک دفعہ سبقاً سبقاً پڑھانا تک ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی کی تعلیم بطور ادب (لٹریچر) ایک ایسا بنیادی بوجھ اور تکلیف دہ تعلیمی عنصر ہے کہ اس کی افادیت سمجھ سے بالاتر ہے۔ انگریزی زبان کی تدریس کا مروج طریقہ اپنے مقصد سے ... آخر ہم انگریزی لٹریچر اور وہ بھی آج سے دو سو سال پہلے کا پڑھا کر اپنی نئی نسل سے کن نتائج کی توقع کر سکتے ہیں۔ انگریزی ادب کی بنیاد ہی ان عوامل پر ہے جو ہمارے اپنے اسلامی ثقافتی سرمایہ کے لیے زہرِ قاتل سے کسی طور سے کم نہیں۔ وہاں کی تہذیبی روایات جن کو ادب کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے، ہماری تہذیبی روایات سے بالکل متضاد ہیں۔ ان کی تہذیب "وہ شاخ نازک" ہے، کہ اس پر بننے والا آشیانہ یقیناً ناپائیدار ہوگا۔ انگریزی ادب کے پودے کی کاشت کی کوشش میں ہم یہاں شیکسپیر، بائرن، شیلے، کیٹس تو پیدا نہیں کر سکے۔ البتہ اپنے ادب سے بے بہرہ ہو کر محمد علی جوہر، امیر علی، حکیم اجمل خاں، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، شبلی اور حالی ایسی قابلِ قدر ہستیاں پیدا کرنے سے کبھی

محروم ہو گئے۔ ہمارے ہی ملک میں فرانسیسی، جرمن، اطالوی، فارسی اور عربی زبانوں کی تدریس جز وقتی ادوار میں صرف چھ ماہ سے ایک سال کے عرصے میں کرا دی جاتی ہے اور ان سے استفادہ کرنے والے ان ممالک میں جا کر ان زبانوں کو سمجھتے ہیں، اس لیے انگریزی کی تدریس پر مڈل کے درجے سے آغاز کر کے گریجوایشن تک تعلیمی دور کا معتدبہ وقت اسی پر صرف کر دینا نامناسب ہے۔ البتہ وہ طلبا جن کے لیے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے انگریزی کی تعلیم لازمی ہے، وہ میٹرک، انٹر یا بی اے کے بعد جیسی بھی صورت حال ہو، چھ ماہ سے ایک سال کے عرصے میں اس زبان میں بہ قدر ضرورت مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب: " ہم انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کے خلاف نہیں، بلکہ اس کو بطور ادبی زبان پڑھائے جانے پر معترض ہیں۔ اس کی گرامر، قواعد، ادبیات وغیرہ سے کما حقہٗ آگاہی حاصل کرنے کی سعی لاحاصل اور اس میں ادیبانہ و خطیبانہ صلاحیت پیدا کرنے کی سعی ہر لحاظ سے محل نظر ہے۔"

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی غایت تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں کہ حصولِ تعلیم کا واضح مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبا کے ذہن میں :

۱۔ ایک حتمی نصب العین راسخ ہو : ۔ اور وہ ہے، اللہ کی صفات و کمالات (معرفتِ الٰہی) کا زیادہ سے زیادہ ادراک۔

۲۔ قرآنی تصورِ کائنات راسخ ہو : ۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ کائنات صرف اللہ ہی کی پیدا کردہ ہے جو بے مقصد نہیں۔ اس مقصد کا علم حاصل کر کے اس کی تکمیل کی جدوجہد۔

۳۔ اسلامی زاویۂ نگاہ پیدا ہو : ۔ یعنی وہ اپنے ہر مشاہدۂ کائنات پر اللہ کی قدرتوں اور قوتوں کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے فلاحِ انسانیت کا مواد حاصل کریں۔

۴۔ اسلامی معیار کا اجاگر کرنا : ۔ یعنی ہر چیز کو علم بالوحی کی بنیاد پر پرکھنے کی صلاحیت۔ جو اعمال احکام (اوامر) سے متعلق ہیں، ان کے نفاذ میں اس بات کی پڑتال کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (کہ آپ ہی نمونۂ اکمل ہیں) کی ہدایات کے مطابق ہیں اور نواہی کے سلسلے میں بھی آپ ہی کے فرامین کو حتمی اور آخری تسلیم کرنا اور ان کی جڑ کو معاشرے سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد۔

۵۔ جماعتِ دعوت و ارشاد کا قیام : ۔ طلبا کو ذہنی طور پر تیار کرنا کہ وہ اس جماعت میں شامل ہوں جو ملت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نفاذ کی خاطر اپنی خدمات پر ہر وقت ملت کے حوالے کرنے کو

تیار ہوں۔

۲۔ لائحہ عمل کی تیاری :۔ ایسا لائحہ عمل مرتب کرنا کہ انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی ذمہ داریوں سے رضائے الٰہی کے تحت عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ابھرے، تاکہ انسانیت نظامِ مصطفیٰ کے تحت گہوارۂ امن بن جائے۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ہمیں اس ملک میں فی الفور :

۱۔ انگریزی زبان کی تدریس بطور ادب (لٹریچر) تمام درجات میں ترک کرنا ہوگی۔ (یاد رہے کہ بطور علمی و ٹیکنیکی زبان اس کے پڑھانے پر اعتراض نہیں۔ یوں بھی دنیا میں اکثر اقوام اپنی قومی زبانوں میں سائنسی و فنی تعلیم دے کر نہ صرف زندہ ہیں، بلکہ کئی معاملات میں دعوتِ رشک دے رہی ہیں، جیسے چین، جاپان اور روس) حتیٰ کہ مقابلہ (سول سروسز) کے امتحانات میں بھی اس کا استعمال ترک کرنا تاکہ امیدواروں کی لسانی کی بجائے تخلیقی قوتوں کا صحیح جائزہ معلوم ہو سکے۔

۲۔ نصابِ تعلیم صرف اسی قدر ضروری مواد پر محیط ہونا چاہیے جو متعلقہ مضمون کے تمام اہم پہلوؤں پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ تدریسی مدت میں نہ صرف پڑھایا ہی جا سکے بلکہ اس میں طلبا میں تحقیقی و تخلیقی ذہن رکھنے کے لیے اس کی دہرائی بھی ممکن ہو۔

۳۔ ہر اگلے درجے میں صرف اسی قدر طلبا کو کسی خاص مضمون میں تعلیم دی جائے جو فی الواقع اس مضمون میں دلچسپی رکھتے ہوں اور اس مضمون کو بغرض تعلیم و تحقیق پڑھنا چاہیں نہ کہ بغرض معاش۔

۴۔ نصابِ تعلیم میں تخلیقی ذہن کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے والا مواد پیش کیا جائے تاکہ خوددار، غیرت مند، باحمیت، سخت کوش، باہمت، بلند کردار، صادق الوعد، امین اور اپنے اسلاف کی تابندہ روایات کے پاسبان شاہین تیار ہوں۔

جنابِ ثروت صولت

عثمانی دور میں ترکی کے رفاہی، دینی اور علمی اداروں کی عمارتیں

ترکی زبان میں ایک اصطلاح ہے جسے کلیہ کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح مختلف رفاہی کاموں کے لیے ایک ہی جگہ تعمیر کی جانے والی عمارتوں کے مجموعے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ عمارتوں کا یہ مجموعہ عام طور پر ایک مسجد، ایک مدرسہ اور ایک شفاخانے پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ تمام چیزیں یا تو ایک ہی عمارت میں ہوتی تھیں یا ایک ہی جگہ الگ الگ عمارتوں کی شکل میں تعمیر کی جاتی تھیں۔ اس طرز کی عمارتیں غالباً ترکی کے ساتھ مخصوص ہیں کیونکہ اس کی مثال دوسرے اسلامی ملکوں میں نظر نہیں آتی۔ کلیہ دراصل وہی چیز ہے جسے انگریزی میں کمپلیکس (COMPLEX) کہا جاتا ہے۔

سلطنتِ عثمانیہ میں قائم کیے جانے والے کلیے عثمانی سلاطین کی بڑھتی ہوئی احساسِ ذمہ داری کے مظہر تھے۔ ذمہ داری کا یہ احساس عثمانیوں سے قبل سلجوقی سلاطین میں بھی پوری قوت سے موجود تھا۔ بنیادی طور پر یہ وہ خصوصیت ہے جو اناطولیہ کے تمام ترک حکمرانوں میں پائی جاتی تھی۔ ان میں بیشتر حکمران ایسے تھے جو تخت نشین ہوتے ہی مدرسے، شفاخانے، کاروان سرائے بنانا شروع کر دیتے تھے۔ سلجوقی سلاطین نے جو خود بھی اعلیٰ ثقافتی سطح کے مالک ہوتے تھے، اناطولیہ کے طول و عرض میں اس قسم کی بے شمار رفاہی عمارتیں تعمیر کیں جن کے آثار آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سلطان محمد فاتح اور سلیمان قانونی کی سلطنت کی طرح سلجوقیوں کی کوئی طاقت ور مرکزی تنظیم نہیں تھی۔ صرف علاء الدین کیقباد اوّل کے تحت مختصر مدت کے لیے ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہوئی تھی، اس کے لیے سلجوقی دور میں عمارتوں کی تعمیر کا کام مرکزی حکومت سے زیادہ انفرادی نوعیت کا ہوتا تھا۔ سلطان کے علاوہ وزرا اور امرا بھی رفاہی مقاصد کے لیے عمارتیں تعمیر کراتے تھے۔ اس کی ایک مثال ۱۲۷۱ء میں سیواس میں تعمیر کی جانے والی تین عمارتیں ہیں: ۱۔ مدرسہ چفتہ منار، ۲۔ گوک مدرسہ، ۳۔ بروجیہ مدرسہ۔ ان میں گوک مدرسے کو مشہور

سلجوقی وزیر صاحب عطا فخر الدین علی نے، مدرسہ چفتہ منار کو منگول حکومت کے نمائندے نے اور بروجیہ مدرسے کو ایک دولت مند ایرانی مظفر الدین بروجردی نے بنوایا تھا۔ صاحب عطا کو اس میدان میں پیشرو کی حیثیت حاصل ہے، کیوں کہ اس نے قونیہ اور قیصری جیسے سلجوقی مرکزوں میں بھی اہم عمارتیں تعمیر کرائیں۔ سیواس ہیں چفتہ مدرسہ کے سامنے ۱۲۱۷ء میں ایک شفاخانہ اور اس کے قریب ایک طبی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ اگر سیواس کے ان مدرسوں کو اناطولیہ کی پہلی یونیورسٹی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

عثمانی دور کے عظیم کلیے اس طرز پہ بنائے جاتے تھے کہ مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی اور دوسرے ادارے مسجد کے چاروں طرف تعمیر کیے جاتے تھے۔ سلجوقی دور میں مرکز کو اس طرح کی مرکزی حیثیت حاصل نہیں تھی، نہ کلیے ہیں اور نہ کسی اور طرح سے۔ سلجوقیوں نے جس قدر عمارتیں بنوائیں اگر ان کو شمار کیا جائے تو ان میں مسجدوں کی تعداد دوسری عمارتوں کی نسبت کم ہوگی۔ عثمانیوں کے کلیئے میں مسجد کی یہ مرکزی حیثیت اس بات کی مظہر تھی کہ دنیوی طاقت کے اوپر ایک الٰہی طاقت بھی ہے۔ یہ بات عثمانیوں کے معاشرتی نظام میں مذہب کی اہمیت کا ثبوت ہے۔

اس طرز کی عمارتیں سلجوقی دور ہی میں بننا شروع ہو گئی تھیں، لیکن عثمانی ترکوں نے جس عمارت کو نمونے کے طور پر لیا وہ قرامان (قونیہ) کے حکمران ابراہیم بے کا "عمارت خانہ" تھا۔ عمارت خانہ بھی اپنے مخصوص معنوں میں ترکی اصطلاح ہے۔ اناطولیہ کے ترک اس عمارت کو جو غریبوں کو کھانا کھلانے لیے مخصوص ہوتی تھی، عمارت خانہ کہتے تھے اور بعض اوقات اس کے لیے صرف عمارت کا لفظ بھی استعمال کرتے تھے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہم برصغیر میں لنگر خانہ کہتے تھے۔ ابراہیم بے نے جو عمارت خانہ تعمیر کیا تھا وہ ایک مسجد، ایک مدرسے، ایک دار القراء (جہاں قرآن تلاوت کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی) اور ایک مطبخ پر مشتمل تھا۔ سلجوقی دور کے کلیوں کے مقابلے میں یہ عمارت خانہ زیادہ وسیع اور زیادہ عمارتوں کا مجموعہ تھا۔ سلجوقی دور کے کلیئے مسجد، مدرسہ اور مقبرہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ بعض کلیوں میں پہلو بہ پہلو دو مدرسے بھی ہوتے تھے جن کو "دو چفتہ مدرسے" بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال قیصری کا تاریخی چفتہ مدرسہ ہے جو ۱۲۰۴ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مسجد اور شفاخانے پر مشتمل کلیہ کی مثال دیوریک کی اولو جامع مسجد (بڑی مسجد) اور شفاخانہ ہے جو ۱۲۲۹ء کی تعمیر ہے۔ مسجد، مدرسہ اور مقبرہ پر مشتمل کلیہ کی مثال ۱۲۳۶ء میں تعمیر ہونے والا قیصری کا حونات خاتون کا کلیہ ہے۔ قیصری ہی میں ۱۲۷۳ء میں تعمیر کیا جانے والا حاجی قلیچ کا کلیہ بھی اسی طرح کا ہے۔

قونیہ کا سرچلی مدرسہ (۱۲۴۳ء)، سیواس کا شفاخانہ (۱۲۱۷ء) اور ارضِ روم کا چفتہ مینار مدرسہ (۱۲۵۲ء) اس قسم کے کلیوں کی دوسری مثالیں ہیں۔ سلجوقی دور کی بعض کارواں سراؤں میں بھی مسجد، حمام اور مقبرے یک جا ہوتے تھے۔

عثمانیوں کے ابتدائی دور میں سلجوقی روایات کے مطابق ایسے کلیے نظر آتے ہیں، جو مسجد، مدرسہ اور مقبرہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ بروصہ میں مراد اول (۱۳۶۰ء تا ۱۳۸۹ء) کی جامع خداوندگار کی نچلی منزل میں مسجد اور بالائی منزل میں مدرسہ ہے۔ اسی طرح بایزید یلدرم کی مسجد اور یشیل جامع (سبز مسجد) میں جو ۱۴۲۴ء کی تعمیر ہے، مسجد کے پہلو بہ پہلو مدرسے موجود ہیں۔ لیکن قرہ مان کے ابراہیم بے کے عمارت خانے میں پہلی مرتبہ کثیر المقاصد عمارتوں کی تعداد میں اضافہ نظر آتا ہے اور اس طرح کلیے سے دنیوی اور دینی استفادے کا دائرہ بڑھا دیا گیا۔

کلیہ محمد فاتح

عثمانی دور کا پہلا قابلِ ذکر کلیہ محمد فاتح کے زمانے میں بنایا گیا۔ یہ کلیہ استنبول میں ۱۴۶۳ء اور ۱۴۷۰ء کے درمیان تعمیر ہوا۔ اس میں اور اسماعیل بے کے کلیے میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے۔ فاتح کا کلیہ ایک ایسی عمارت ہے جس کا اس سے پہلے کوئی نمونہ نظر نہیں آتا۔ اس میں صرف عمارتوں کی تعداد ہی زیادہ نہیں ہے بلکہ اس کا بنیادی نقشہ اور طرزِ تعمیر بھی نیا اور مختلف ہے۔ یہ کلیہ جامع فاتح کے گرد تعمیر کیا گیا ہے، گویا مسجد کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے چاروں طرف کلیے کی بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ دو اطراف میں آٹھ مدرسوں کا ایک سلسلہ ہے جن سے متصل اور کئی چھوٹے چھوٹے مدرسے ہیں جن کو تتمہ مدرسے یعنی اضافی مدرسے کہا جاتا تھا۔ مسجد کے مشرق میں ایک مطبخ ہے جو غریب سیاحوں کے لیے مسافر خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ قریب ہی لنگر خانے کی عمارت ہے، جہاں سے غریبوں کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا۔ مدرسے کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بھی کھانا اسی جگہ تیار کیا جاتا تھا۔ ایک اور عمارت دارالشفا نام کی تھی جو استنبول کا پہلا عثمانی شفاخانہ تھا، لیکن جس کی عمارت اب موجود نہیں۔ مسجد بھی ۱۷۶۶ء کے زلزلے میں گر گئی تھی، جس کے بعد اسے از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔ مسجد سے ملحق باغیچے میں سلطان محمد فاتح کی قبر ہے۔ اس کے علاوہ کلیے میں ایک سرائے اور ایک حمام بھی موجود تھا، لیکن اب یہ موجود نہیں۔ ۱۷۵۵ء میں سلطان محمود اول نے ان عمارتوں میں ایک کتب خانے کا اور اضافہ کیا، جو غالباً فاتح کے کلیے میں پہلے سے موجود تھا۔

ان عمارتوں سے متعلق جو اوقاف نامے موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتح کا کلیہ ایک ایسے رفاہی مرکز کے طور پر قائم کیا گیا تھا جہاں مختلف قسم کی سماجی خدمات انجام دی جاتیں۔ جہاں تک فنِ تعمیر کا تعلق ہے وہ ایک منظم اور بڑھتی ہوئی سلطنت کے فن تعمیر سے ہم آہنگ تھا۔

ادرنہ کا کلیہ

ادرنہ جسے کبھی ایڈریانوپل کہا جاتا تھا اب ترکی کا معمولی قصبہ ہے، جس کی آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ لیکن عثمانی سلطنت کے عروج کے زمانے میں اس کی آبادی تین اور ساڑھے تین لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اور ۱۸۰۰ء تک یہ شہر استنبول اور قاہرہ کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ استنبول کے بعد عثمانی دور کی سب سے شاندار عمارتیں اسی شہر میں تعمیر کی گئیں۔ چنانچہ فاتح کے کلیے کے بعد دوسرا بڑا عثمانی کلیہ بھی ادرنہ ہی میں تعمیر کیا گیا۔ یہ کلیہ بایزید ثانی نے ۱۴۸۴ء اور ۱۴۸۸ء کے درمیان تعمیر کرایا تھا۔ اس کلیے میں مسجد کے اطراف میں عمارت خانہ (لنگر خانہ)، شفا خانہ، پاگل خانہ، مدرسہ، حمام، باورچی خانہ اور گودام تعمیر کیے گئے تھے۔ اپنے زمانے میں یہ کلیہ نہ صرف عثمانی سلطنت میں بلکہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ بڑے رفاہی ادارے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں عمارتوں کی ترتیب فاتح کے کلیے سے مختلف ہے۔ کلیے میں کل ایک سو گنبد ہیں۔ مسجد کے گنبد کا قطر ۲۲ ½ میٹر ہے۔ اس مسجد اور کلیے کو بایزید ثانی کے حکم سے معمار خیر الدین نے تعمیر کیا تھا۔ کلیے میں خادموں کی تعداد ایک سو سڑسٹھ (۱۶۷) تھی۔

سلطان بایزید ثانی نے اناطولیہ میں شہر اماسیہ میں بھی ایک کلیہ ۱۴۸۶ء میں تعمیر کرایا تھا جو دریائے ییشیل ارماق کے کنارے واقع ہے۔ یہ بھی اپنی وسعت میں استنبول اور ادرنہ کے بڑے کلیوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ بایزید شہزادگی کے زمانے میں یہاں کا والی تھا اور وہ پچیس سال اس شہر میں رہا تھا۔ یہ کلیہ مسجد، مدرسہ، کتب خانہ وغیرہ پر مشتمل تھا۔ زلزلوں سے یہاں کی عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا لیکن پھر بھی کئی عمارتیں اچھی حالت میں ہیں۔ یہاں کے کتب خانے میں آج کل بیس (۲۰) ہزار کتابیں موجود ہیں۔

کلیۂ سلیمانیہ

سلطان سلیمان قانونی نے جامع سلیمانیہ کے گرد جو کلیہ تعمیر کرایا اس میں فاتح کے کلیے کے طرز کو زیادہ وسیع پیمانے پر اور زیادہ شاندار طریقے سے اختیار کیا گیا۔ جامع سلیمانیہ اور کلیہ معمار سنان کی تعمیر ہیں جو عثمانی ترکوں کا سب سے بڑا معمار تھا اور جس کو بجا طور پر دنیا کے عظیم ترین معماروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

یہ کلیہ استنبول میں ۱۵۵۰ء اور ۱۵۵۷ء کے درمیان تعمیر کیا گیا تھا۔ مسجد کے جنوب میں سلیمان قانونی اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کی قبریں ہیں۔ مسجد کے مغرب اور مشرق میں مدرسوں کی دو عمارتیں ہیں۔ اس سمت میں حمام اور دارالحدیث تھا۔ مشرقی سمت میں مدرسے کے ساتھ طب کا ایک مدرسہ تھا جس کا اب صرف ایک حصہ شکستہ حالت میں باقی ہے۔ مسجد کے صحن کے شمالی کنارے پر دارالشفا، دارالضیافت اور مطبخ کی بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ اس کلیتے میں ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں اس وقت تقریباً ۴۸ ہزار قلمی کتابیں ہیں اور جو عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کا دنیا میں سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام میں جس قدر نیک کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان سب کی بجا آوری کا انتظام اس کلیے میں تھا۔ ہر ضرورت کے لیے یہاں ایک ایک عمارت موجود تھی اور ان عمارتوں کے درمیان بے مثل ترتیب اور ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ یہ کلیہ کیا تھا، چھوٹے پیمانے پر ایک شہر تھا، جو دینی، رفاہی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

کلیہ سلطان احمد

سلطنت عثمانیہ کا آخری، بڑا کلیہ سلطان احمد اوّل کا کلیہ ہے، جسے معمار اور صدف کار محمد آغا نے ۱۶۰۹ء اور ۱۶۱۷ء کے درمیان استنبول میں تعمیر کیا تھا۔ مسجد سلطان احمد جسے نیلی مسجد بھی کہا جاتا ہے، عثمانی فن تعمیر کا شاہ کار سمجھی جاتی ہے۔ یہ مسجد، ایک دارالشفا، ایک مسافر خانہ، ایک عمارت خانہ، ایک مکتب اور ایک مقبرے پر مشتمل کلیے کا مرکز ہے۔ بعد میں یہاں دو اور عمارتیں تعمیر کی گئیں، ان میں ایک عمارت جو آراستہ کہلاتی تھی دکانوں پر مشتمل تھی اور دوسری عمارت سبیل کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ آراستہ ترکی زبان میں ایسی سڑک کو کہتے ہیں جس کے دونوں طرف دکانیں ہوں۔ پانی کی فراہمی کار ثواب ہے اس لیے ترکوں نے اپنے دارالسلطنت کو ایسی سبیلوں سے سجا دیا جو بذات خود فن تعمیر کا حسین نمونہ ہیں۔ استنبول کی ان سبیلوں کا بیان ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے۔ بازار تعمیر کرانے کا مقصد یہ تھا کہ کلیے میں کام کرنے والوں کی ضرورت پوری کرنے کا انتظام اسی جگہ کر دیا جائے۔ آج کلیہ سلطان احمد کی بیشتر عمارتیں منہدم ہو چکی ہیں لیکن جامع سلطان احمد پوری شان و شوکت کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔

سلطان احمد اوّل کے بعد ایسے بڑے کلیے تعمیر نہیں کیے گئے جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سلطنتِ عثمانیہ کا زوال ہے۔ دورِ زوال میں بڑے بڑے کلیوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی عمارتیں تعمیر

کی جانے لگیں جن کی ترتیب بھی بڑے کلیوں سے مختلف ہے۔ مثلاً سلطان مصطفےٰ سوم نے ۱۷۵۹ء اور ۱۷۶۳ء کے درمیان جو جامع لالہ بنوائی اس کے گرد مدرسہ، مقبرہ، لنگرخانہ، سبیل اور بازار (آراستہ) پائے جاتے ہیں۔ لیکن اب عام طور پر کلیہ میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہی۔ سلجوقی دور کی طرح مدرسہ، مقبرہ اور مسجد ایک ہی عمارت میں تعمیر کیے گئے ہیں۔ بعض جگہ ان میں سبیل کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔ ان کلیوں میں سلجوقی دور سے دوسری مشابہت یہ پائی جاتی ہے کہ اس زمانے میں انفرادی مسابقت نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً علی پاشا حکیم اوغلو نے ۱۷۳۲ء اور ۱۷۳۴ء کے درمیان مسجد، مقبرہ اور کتب خانے پر مشتمل ایک کلیہ بنایا۔ سید حسن پاشا نے مدرسہ، مسجد، مکتب، سبیل اور سرائے پر مشتمل ۱۷۴۵ء میں ایک کلیہ تعمیر کروایا۔ یہ دونوں کلیے انفرادی کوششوں کی نمایاں مثالیں ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علمِ فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں کتبِ فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریقِ حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں، جن کو مسائل فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات: ۴۰۸ قیمت: -/۱۵ روپے

شیخ نذیر حسین

مولانا عبدالعزیز میمن

چند یادیں

عربی زبان کے مشہور محقق، ادیب اور انشا پرداز مولانا عبدالعزیز میمن نے ۹۰ برس کی عمر میں ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء کی درمیانی شب کو کراچی میں انتقال کیا۔ بلا ریب کہا جا سکتا ہے کہ علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی کے بعد اسلامی ہند نے اتنا بڑا عالمِ لغت اور ادب پیدا نہیں کیا۔ ان کی عظمت کا اعتراف عرب ممالک کے ادبا کو بھی تھا۔

مولانا میمن کا وطنِ مالوف راج کوٹ (کاٹھیاوار) تھا، جہاں وہ ۱۸۸۸ء میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ نو، دس برس کی عمر میں وہ تحصیلِ علم کی غرض سے دہلی چلے آئے۔ ان دنوں دہلی علومِ اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ شہر میں باکمال علما کے درس و تدریس کے حلقے بکثرت قائم تھے۔ میمن صاحب نے ابتدائی تعلیم مولانا عبدالرحمن پنجابی سے پائی جو مدرسۂ طبیہ (اب طبیہ کالج) میں استاد تھے، اور درسیات کی تکمیل مولانا محمد بشیر سہسوانی سے کی، جو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے زمانۂ عروج میں بھوپال میں قاضی رہ چکے تھے۔ ادب کی تعلیم کے لیے ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عربی علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ انھوں نے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند ڈپٹی صاحب سے پڑھیں۔ میمن صاحب بیان کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم ترجمہ اس قدر خوب صورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان ایک دفعہ دہلی تشریف لائے تو ڈپٹی صاحب امیر حبیب اللہ خان سے ملنے گئے۔ اتفاق سے عید کا دن تھا۔ ڈپٹی صاحب نے متنبی کا عید اور وجہ حبیب والا شعر پڑھا۔ عید کے دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے عجیب سماں پیدا کر دیا اور امیر صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ اس زمانے میں معقولات کا بڑا شہرہ تھا۔ قدیم فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان علوم کا سب سے بڑا مرکز مدرسہ عالیہ رام پور تھا۔ علامہ محمد طیب مکی صدر مدرس تھے، جو بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ ان کی علمی شہرت کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان

بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبا رام پور کھنچے چلے آتے تھے۔ میمن صاحب نے رام پور جا کر علامہ طیب صاحب سے استفادہ کیا اور فراغت کے بعد دہلی چلے آئے، جہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں پرائیویٹ طور پر پاس کیے اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔

اس وقت شہر دہلی مجمع الکمال بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے علما، ادبا اور صلحا وہاں موجود تھے، لیکن مولانا میمن افسوس سے ذکر کیا کرتے تھے کہ دہلی احناف اور اہل حدیث علما کے فقہی اختلافات کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ فریقین میں مناظرے ہوا کرتے تھے اور یہ مناظرے بسا اوقات مجادلے اور مقاتلے بن جایا کرتے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انتقال کیے ہوئے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزر چکا تھا، لیکن لوگوں کے دلوں میں بہادر شاہ کی یاد تازہ تھی۔ اس کی یہ غزل :

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

بچے بچے کی زبان پر تھی۔ دہلی کا خونی دروازہ، جہاں مغل شہزادوں کو سولی دی گئی تھی، زیارت گاہ عوام و خاص تھا۔ ارزانی کا یہ عالم تھا کہ مصر کی چھپی ہوئی صحیح بخاری اڑھائی تین روپے میں مل جاتی تھی۔

اسی اثنا میں ان کو ایڈورڈ مشن کالج پشاور میں عربی و فارسی کے لیکچرار کی جگہ مل گئی اور وہ پشاور چلے آئے۔ اس زمانے میں انھوں نے لاہور کے مشہور ادبی رسالہ مخزن میں عربی کے نصابِ تعلیم کی اصلاح پر مضامین لکھے، جن میں کافیہ اور شرح ملا جامی کے بجائے ابن ہشام کی کتابوں (شرح قطر الندی اور شرح شذور الذہب) اور الفیہ کی شروح کو اختیار کرنے اور منطق و فلسفہ کے بجائے علمِ حدیث کے اشتغال اور مزاولت پر زور دیا گیا تھا۔

اپریل ۱۹۲۱ء میں وہ مولوی محمد شفیع کی قدر دانی سے اورینٹل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے تشریف لے آئے۔ یہ زمانہ اورینٹل کالج کے شباب کا زمانہ تھا۔ شعبہ عربی میں مولوی محمد شفیع کے علاوہ مولوی نجم الدین اور مولانا سید محمد طلحہ (سید ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا) بھی تھے، جب کہ شعبہ فارسی میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (مترجم ایران بعہد ساسانیان) اور سید وجاہت حسین بلگرامی (رام پوری) تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان اساتذہ کے علم و فضل اور تدریسی مہارت کی شہرت سن کر یوپی، بہار، ریاست ہائے راجپوتانہ بلکہ حیدر آباد (دکن) تک سے بھی طلبا لاہور کا رخ کرتے تھے۔ مولانا میمن کالج میں عربی تدریس کے علاوہ اورینٹل کالج کے ہوسٹل کے بھی نگران تھے، جو حضوری باغ میں تھا۔ اس دور کے شاگردوں میں مولوی امتیاز علی عرشی

رام پوری، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم اور ڈاکٹر سید عبداللہ قابلِ ذکر ہیں۔ سید عبداللہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ مولانا میمن سبعہ معلقہ اس مہارت اور رنگی سے پڑھاتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مولوی محمد شفیع مرحوم کی تبلیغ اور شوق سے خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کا انڈکس اکلیل الخزانہ کے نام سے شائع کیا۔ مشہور عرب شاعر ابوالعلاء المعری کے حالات اور فلسفہ شاعری ہیں ابوالعلاء المعری وما الیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو دار المصنفین کی طرف سے قاہرہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابن رشیق کے حالات لکھے اور اس کے اشعار کا مجموعہ مختلف ادبی کتابوں کو کنگھال کر شائع کرایا۔ اورینٹل کالج میگزین کا اجرا ہوا تو مولوی محمد شفیع صاحب نے میمن صاحب کو بھی اردو میں لکھنے کی ترغیب دی اور ان کی ہر طرح سے علمی رہنمائی کی۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ میمن صاحب میں علمی لگن اور ذوقِ تحقیق و جستجو مولوی محمد شفیع مرحوم ہی نے پیدا کیا۔ حیرت ہے کہ میمن صاحب نے شفیع صاحب کے احسانات کا کبھی بھی اعتراف نہیں کیا۔

اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی آسامی خالی ہوئی تو میمن صاحب غالباً علامہ اقبال مرحوم کی سعی و سفارش سے علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۵۰ء میں صدر شعبہ عربی کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ اُن کی آمد سے قبل عربی شعبے کا صدر جرمن یا برطانوی مستشرق ہوا کرتا تھا، جس کی وجہ سے یہ شعبہ خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکا تھا۔ معیارِ تعلیم کی پستی کا یہ عالم تھا کہ ایم۔ اے (عربی) کے کورس میں بائبل کا عربی ترجمہ شامل تھا۔ میمن صاحب نے نصابِ تعلیم کی اصلاح کی، عربی ادب کی امہات کتب، مثلاً الکامل (المبرد) اور کتاب العمدۃ (ابن رشیق) نصاب میں داخل کیں، شعبہ عربی کا وقار ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں قائم کیا اور طلبا میں صحیح علمی ذوق اور ملکۂ تحقیق پیدا کیا۔ ان کے درس و تدریس سے بہت سے مستعد طلبا نے فائدہ اٹھایا، جن میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (حیدر آباد سندھ، اب اسلام آباد)، ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم (کراچی یونیورسٹی)، ڈاکٹر مختار الدین آرزو (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق (دہلی یونیورسٹی) قابلِ ذکر ہیں۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر محمد یوسف نے جن کو میمن صاحب بھی بہت مانتے تھے، ٹریفک کے حادثے میں گزشتہ ستمبر میں لندن میں انتقال کیا۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ان کا قابلِ ذکر کارنامہ امالی القالی کی شرح کی اشاعت ہے۔ اس کی شرح ایک اندلسی عالم ابوعبید البکری نے اللآلی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو نایاب تھی۔ میمن صاحب نے

اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، ان کے مقابلے اور تصحیح سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اس پر حواشی لکھے، شارح کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشاندہی کی اور ۱۹۳۵ء میں خود قاہرہ جاکر اس کو سمط اللآلی کے نام سے شائع کرایا۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی جو آئندہ چل کر عالم عرب میں ان کی شہرت اور تعارف کا ذریعہ بنی۔ امام عبدالقاہر الجرجانی نے ابوتمام، بحتری اور متنبی کے دواوین کا انتخاب الطرائف الادبیہ کے نام سے کیا تھا۔ یہ بھی اسی زمانے میں میمن صاحب کے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ شائع ہوا۔ الفتح کے فاضل مدیر محب الدین الخطیب کی فرمائش پر خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کی جدید اشاعت میں حصہ لیا۔ اس کی صرف چار جلدیں شائع ہوسکیں۔ یہ کتاب دیکھنے کو تو شیخ رضی استرآبادی کی شرح کافیہ کے شواہد کی شرح ہے، لیکن حقیقت میں عربی ادب کا خزانہ ہے، جس سے کوئی ادیب مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اب اس کو مصر کے مشہور محقق عالم استاذ عبدالسلام محمد ہارون جدید تحقیق، تصحیح اور تحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں اور اس کی چھ سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور بقیہ زیر طباعت ہیں۔ میمن صاحب نے مصری حکومت کے اصرار پر لسان العرب کی بھی تصحیح کی، لیکن اس کی صرف ایک جلد شائع ہو سکی۔ اس کاوش میں مسٹر کرینکو بھی ان کے شریک کار تھے۔

۱۹۵۵ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر بن کر پاکستان چلے آئے۔ اس دور کا علمی کارنامہ دیوان حمید بن ثور الہلالی اور الفاضل (المبرد) کی اشاعت ہے۔

دسمبر ۱۹۵۷ء میں راقم السطور کو ان کی زیارت اور ملاقات کا پہلی دفعہ شرف حاصل ہوا۔ اسلامی کلوکیم (مذاکرہ) لاہور میں بہت سے مستشرقین اور عرب کے متعدد فضلا مدعو تھے، جن میں نمایاں شخصیت شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد بہجت بیطار کی تھی[1]۔ اس سے قبل میں ان کے علمی مقالات اور نئی کتابوں پر متوازن تبصرے

---

[1] افسوس ہے کہ بیطار صاحب نے گزشتہ برس دمشق میں انتقال کیا۔ وہ عالم متبحر، زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ عمر بھر شام کی علمی مجلس مجمع العلمی العربی کے نائب صدر رہے۔ وہ پاکستان کے سچے بہی خواہ اور ہمدرد تھے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں انھوں نے دمشق میں پاکستان کی حمایت میں ایک جلوس کی قیادت بھی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے۔

مجمع العلمی العربی (دمشق) کے سہ ماہی مجلہ میں پڑھ چکا تھا اوران سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا، چنانچہ میں استادِ محترم شیخ محمد العربی المراکشی کی معیت میں فلیٹی ہوٹل پہنچا جہاں عرب مندوبین موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ شیخ محمد بہجت بیطار مولانا محمد ادریس کاندھلوی (شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ) کے ہاں چلے گئے ہیں۔ ان کی تلاش میں ایک اور صاحب بھی سرگرداں تھے، لمبا قد، چھریرا بدن، خشخشی داڑھی، اور ترکی ٹوپی، اچکن اور پاجامے میں ملبوس۔ مراکشی صاحب نے بتایا کہ یہی مولانا عبدالعزیز میمن ہیں۔ ہم سب مل کر مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے فضیلت کدے پہنچے، جہاں بیطار صاحب بلبل ہزار داستان بنے شیعوں کے متعلق لطائف وظرائف بیان کر رہے تھے اور ساری محفل کو کشتِ زعفران بنا رکھا تھا۔ ان کے ساتھ شام کے مشہور عالم استاد محمد المبارک بھی تھے۔ میمن صاحب کی آمد پر علمی مسائل چھڑ گئے جس میں میرے اندازے میں میمن صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ دوسرے روز سب مندوبین مدرسۃ البنات میں مدعو تھے۔ مدرسہ والوں کی خیر مقدمی تقریر کے بعد شیخ بہجت بیطار جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو پاکستان کے حوالے سے کشمیر کا ذکر کر دیا۔ اس پر حیدر آباد دکن کے مندوب مسٹر امیر علی[۵۲] بھڑک اٹھے اور کہا کہ اس تقریب کا سیاسی مسائل سے کیا تعلق؟ اس وقت بیطار صاحب نے جس دینی غیرت وحمیت کا ثبوت دیا، اس کی یاد آج بھی مسرت انگیز ہے۔ وہ جوش میں آکر کہنے لگے کہ میں ایک دفعہ نہیں سو دفعہ کہوں گا بلکہ ہزار بار کہوں گا کہ کشمیر پاکستان کا ہے اور پاکستان کو ملنا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم نے بیطار صاحب کو ایک طرف لے جا کر بمشکل چپ کرایا۔ بیس اکیس برس گزرنے کے باوجود اس محفل کی یاد شرکا کے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے۔

۱۹۶۰ء میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ (ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی) قائم ہوا، تو میمن صاحب اس سے متعلق ہو گئے۔ اس وقت سب سے مشکل کام کتب خانہ کی فراہمی تھا۔ اس کے لیے انھوں نے عراق، شام، مصر، ترکی اور تونس کا سفر کیا اور ضروری کتابیں خرید کر لائے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ جناب ممتاز حسن کی تحریک اور پروفیسر حمید احمد خان مرحوم (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) کی قدر دانی اور معارف پروری

---

[۵۲] غالباً یہ امیر علی وہی ہیں، جنھوں نے قرآنِ مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی عربی زبان سے ناواقفیت اور مشتعل مزاجی کی شکایت مصر کی مشہور ادیبہ عائشہ عبدالرحمان (بنت الشاطی) نے بھی کی ہے۔ اس کے لیے ان کی کتاب تراثنا (مطبوعہ دار المعارف، قاہرہ) ملاحظہ ہو۔

کی بہ دولت عربی زبان کے صدر شعبہ بن کر اورینٹل کالج میں تشریف لے آئے اور لاہور میں دو سال مقیم رہے۔ افسوس ہے کہ اس مرتبہ ان سے خاطر خواہ استفادہ نہ ہو سکا۔ اب وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے درس و تدریس کے بجائے علمی و تحقیقی کاموں میں رہنمائی کے لیے زیادہ سود مند ہو سکتے تھے۔

مولانا میمن کا معمول تھا کہ وہ ہر اتوار کو مولانا عبید الحق خان ندوی کے مکتبۃ العلمیہ میں آتے تھے۔ عربی زبان و ادب سے شغف رکھنے والے اصحاب بھی ان سے ملنے وہیں چلے آتے تھے۔ راقم بھی بالالتزام ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ یہ پُرلطف نشست دو ڈھائی گھنٹے جاری رہتی، جو علمائے سلف، ان کی نادر تصانیف، نواب صدیق حسن خان کی علمی خدمات اور ہندوستانی محدثین کے کارناموں کے ذکر سے معمور رہتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ گزشتہ صدی کے آخر میں مولانا اسمٰعیل شہید اور مشائخ دیو بند کے خلاف الزام تراشی اور سب و شتم کی جو تحریک اٹھی تھی، اس کے پس پردہ انگریز کا ہاتھ تھا۔ وہ یہ بھی بتلاتے تھے کہ لارڈ مونٹ بیٹن کے جانے کے بعد جو خفیہ کاغذات ایوانِ حکومت (دہلی) سے برآمد ہوئے تھے، ان میں اس تحریک کے بانیوں کو حکومتِ برطانیہ کے بہت بڑے خیر خواہ اور ہمدرد بتلایا گیا ہے۔ ان کی گفتگو کا دلچسپ موضوع نادر علمی کتابیں تھیں جن کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے دمشق، قاہرہ، قسطنطنیہ اور رباط کے کتب خانے چھان مارے تھے۔ قسطنطنیہ کے علمی خزائن، عجائب گھر اور سلاطین آلِ عثمان کے تاریخی آثار، وہ دلکش موضوع تھا جس پر وہ حاضرینِ مجلس کو گھنٹوں تک اپنی پُرلطف گفتگو سے لطف اندوز کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے سلطان ٹیپو کی سفارت کا حال سنایا جو سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں مدد و اعانت کے لیے قسطنطنیہ بھیجی تھی۔ اس سفارت کو زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اور اس کے ارکان قسطنطنیہ ہی میں مرکھپ گئے۔ میمن صاحب بتلاتے تھے کہ ان کا قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔ اس مجلس میں وہ کبھی دل لگی اور تفنن و مزاح کی باتیں بھی کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایک علمی آدمی کے لیے تھوڑا سا خود فراموش ہونا بھی ضروری ہے۔

عالمِ عرب کے بیشتر فضلا سے ان کے گہرے اور ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ عربوں میں وہ شامیوں کی مہمان نوازی، نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے بڑے معترف تھے۔ اسی طرح وہ اہلِ تونس کی تہذیب و شائستگی کے بڑے مداح تھے اور بتلاتے تھے کہ بیشتر تونسی ان مہاجروں کی اولاد ہیں جو اندلس کو خیر باد کہہ کر شمالی افریقہ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہ جامعہ زیتونہ کے شیخ الجامعہ طاہر بن عاشور کی بھی

تعریف کیا کرتے تھے، جو بڑھاپے میں بھی نواب صدیق حسن کی طرح خوب صورت اور دیدہ زیب دکھائی دیتے تھے ۔ شیخ طاہر بن عاشور نے قرآنِ مجید کی تفسیر التحریر والتنویر فی التفسیر کے نام سے لکھی ہے اور اس میں اعجاز القرآن سے خاص طور پر اعتنا کیا ہے ۔ وہ عرب قوم پرستی کو جس کا مقصد عربوں کو غیر عرب مسلمانوں سے دور رکھنا ہے، خود عربوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے ۔ وہ ترکوں کی علمی سرپرستی کے بے حد مداح تھے، جن کی علمی سرگرمیوں کی بدولت اسلاف کے علمی خزانے تباہ ہونے سے بچ گئے۔

لاہور سے سبکدوش ہو کر وہ کراچی چلے گئے اور وہاں خاموش زندگی گزارنے لگے۔ اس کے بعد بھی وہ ایک یا دو بار لاہور تشریف لائے اور ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے ابوتمام کے دیوان الحماسۃ الصغری اور علی حمزہ بصری کی التنبیہات علی اغالیط الرواۃ شائع کیں مجلہ مجمع اللغۃ العربی (سابق مجلہ مجمع العلمی العربی) دمشق میں انھوں نے معجم الادبا (یاقوت) پر نقد و تبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوتا رہا۔ وہ امام رضی الدین صاغانی کی العباب الزاخر کی اشاعت کی بڑی آرزو رکھتے تھے، چنانچہ اسی رسالے میں انھوں نے اس کا مقدمہ بھی شائع کیا تھا ۔ کراچی میں جناب ممتاز حسن مرحوم (سابق معتمد مالیات حکومتِ پاکستان) اور پیر حسام الدین راشدی ان کے بڑے مداح اور عقیدت مند تھے اور میمن صاحب کی ان کے ہاں آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ علمی حلقوں میں ان تینوں کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور باہمی طنز و مزاح مشہور تھی۔ ممتاز حسن مرحوم کی تحریک سے انھوں نے اردو بورڈ کے زیر اہتمام عربی لغت اور اس کی خصوصیات پر کئی خطبات دیے تھے، جو اردو بورڈ کے سہ ماہی مجلے میں کئی قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ پیر حسام الدین راشدی ان خطبوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں۔ میمن صاحب چند برس سے تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور لڑکے ملازمت کے سلسلے میں کہیں باہر مقیم تھے۔ ہمشیرہ کے علاوہ ایک پوتا ان کی خبر گیری کیا کرتا تھا۔ آخری عمر میں نہایت لاغر اور کمزور ہو گئے تھے، لیکن حافظہ برابر اپنا کام کرتا رہا اور کتابیں ان کی مونس و ہمدم بنی رہیں ۔ انھوں نے نوّے برس کی عمر میں، جو طویل تعلیمی اور علمی خدمات سے معمور تھی، ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء کی درمیانی شب کو اپنی ہمشیرہ کے ہاں انتقال کیا۔

مولانا عبدالعزیز میمن یادداشت میں علمائے سلف کا نمونہ تھے ۔ سیکڑوں عربی قصائد اور ہزاروں اشعار نوکِ زبان تھے۔ کتب دریسیہ میں دیوان المتنبی اور دیوان الحماسہ تقریباً مکمل حفظ تھے۔ مفضلیات، الکامل (للمبرد)

اور کتاب البیان والتبیین (جاحظ) کے بیشتر حصے ازبر تھے۔ وہ عرب ممالک میں ابوالعلا المعری پر اتھارٹی (سند) سمجھے جاتے تھے۔ نادر علمی کتابوں کی اشاعت اور انتخاب میں ان سے مشورہ ناگزیر تھا۔ وہ مجمع اللغۃ دمشق اور قاہرہ کے بھی رکن تھے۔ میمن صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن نہایت فراخ دل تھے اور جمود سے پاک ـــ! سیر و سیاحت اور مختلف الخیال اصحابِ فکر و نظر کی میل ملاقات نے ان کو وسیع النظر بنا دیا تھا۔ وہ امام شافعی کے بے حد عقیدت مند اور مداح تھے اور اصولِ فقہ میں ان کے الرسالہ کی عربیت کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جتنے علمی و ادبی مآخذ و مصادر عبدالقادر بغدادی (مصنف خزانۃ الادب) کی دسترس میں تھے، وہ آج تک کسی عالم یا ادیب کو حاصل نہیں ہو سکے۔ مستشرقین میں وہ مسٹر سالم کرینکو (KRENKOW) جو اُن کے ساتھ علی گڑھ میں کام کر چکے تھے، کی وسعتِ معلومات اور ژرف نگاہی کے ثنا خوان تھے۔

مولانا میمن درس نظامی کے نصابِ تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے۔ نحو میں کافیہ اور شرح ملا جامی جیسی کتابوں کے بجائے الفیہ کی بعض شروح اور ابنِ ہشام کی کتابیں پسند کرتے تھے۔ وہ بتلاتے تھے کہ کافیہ اور اس کی شروح وغیرہ عرب ممالک میں کہیں بھی نہیں پڑھائی جاتیں، جب کہ صدیوں سے ہمارے ہندوستانی علما کی ذہنی توانائیاں کافیہ وغیرہ کی عقدہ کشائیوں میں صرف ہو رہی ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لیے امام نووی کی ریاض الصالحین کی سفارش کرتے تھے جس میں نورِ نبوت کے علاوہ ادبی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ سنن ابی داؤد کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب الزہد والرقاق کے مطالعہ کی بھی تاکید کیا کرتے تھے۔ تفسیر میں جلالین کے بجائے جامع البیان کی افادیت کے قائل تھے۔ ابنِ خلدون نے جن کتابوں کو اصول فن ادب قرار دیا ہے، ان کے متعلق انھوں نے الندوہ (دورِ جدید) میں میری محسن کتابوں کے عنوان کے تحت بڑا دلچسپ تبصرہ لکھا تھا۔ ان کی یہ رائے تھی کہ الکامل (المبرد) ایک مبتدی کے لیے زیادہ مفید ہے، ادب الکاتب کو اقتصار کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے۔ کتاب البیان والتبیین (جاحظ) میں فصیح نظم و نثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں، اور نوادرِ لغت و شعر امالی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے نزدیک حماسیات میں ابوتمام کا دیوان الحماسہ سب سے بہتر ہے اور نقد الشعر کے لیے ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے۔ کہا کرتے تھے کہ الغریب المصنف (ابن سلام) اور اصلاح المنطق (ابن السکیت) وہ کتابیں ہیں، جن کا یاد ہونا ایک ادیب

کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اوّل الذکر شاید ابھی تک شائع نہیں ہو سکی جب کہ مؤخر الذکر کتاب استاذ عبدالسلام محمد ہارون کی علمی کاوش سے بڑی آب و تاب سے شائع ہو چکی ہے۔

اس علم و فضل کے باوجود ان میں غرور و تمکنت نام کو نہ تھا۔ ان کی طرزِ معاشرت سادہ اور درویشانہ تھی۔ وہ سودا سلف خود بازار سے خرید کر لاتے تھے اور بھاؤ چکاتے وقت دکان دار سے خوب بحث و تکرار کرتے تھے۔ ان کی درازیٔ عمر کا راز سادہ خوراک اور محنت و مشقت میں مضمر تھا۔ حقّے کے شوقین تھے۔ طالب علموں کے استفسارات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے، لیکن زیادہ سوالوں سے گھبراتے تھے۔ لاہور اور کراچی کے بعض احباب ان کی تنک مزاجی و بخل کے افسانے سناتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ دیر آشنا اور جزرس تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے نو جوان طلبا کے لیے لاکھوں روپوں کے عطیات کراچی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کو دیے۔ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کو تین لاکھ روپے عطا کیے اور کم و بیش اتنی رقم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دی۔ انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ حیدرآباد یونیورسٹی کو دے دیا۔ جب حدیث کی مشہور کتاب مصنّف عبدالرزاق شائع ہوئی تو پچاس ہزار روپے خرچ کر کے اس کے بہت سے نسخے خریدے اور عربی مدارس اور یونیورسٹیوں میں مفت تقسیم کیے۔

راقم السطور پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب سے ہٹا کر علم حدیث کی طرف متوجہ کیا۔ اس کی اہمیت اور افادیت واضح کی اور ہندوستانی محدثین کی عظمت اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علم کے شیدائی اور اپنے حبیب پاکؐ کی زبان کے خدمت گزار کے درجات بلند کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے۔ آمین۔

مجمع البحرین (شیعہ سنّی متفق علیہ احادیث) : مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب وحدتِ امت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ اس میں وہ احادیث و روایات جمع کی گئی ہیں جو شیعہ اور اہل سنت کے درمیان متفق علیہ حیثیت رکھتی ہیں۔ شروع میں علامہ مفتی جعفر حسین مجتہد کا تعارف و تبصرہ اور علامہ نصیر الاجتہادی کی تقریظ ہے۔

صفحات: ۲۸ + ۲۲۲ **قیمت:** -/۹ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

ص ۵۱ - ۹۶
المعارف
جلد ۱۲
مئی ۱۹۷۹ء شمارہ ۵

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی

سید جمال الدین کے حالات میں تصنیفات[1]

سید جمال الدین افغانی اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ایک مشہور مفکر گزرے ہیں۔ ان کی شخصیت اس قدر متحرک اور مؤثر تھی کہ انھیں مشرق و مغرب کے ممالک میں تحریک آزادی کے ایک پرجوش مجاہد مانا جاتا ہے۔ عربوں نے ان کو نابغۃ الشرق اور فیلسوف الشرق جیسے شاندار خطابات سے نوازا۔ وہ اتحاد عالم اسلامی یعنی پان اسلامزم کے بانی بھی سمجھے جاتے ہیں اور وہ سفیر اللہ کے نام سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی مسلمانان عالم کی خدمت کے لیے وقف رہی۔ ان کا بنیادی مقصد مسلمانان عالم کو استعمار کے پنجے سے چھڑانا اور ان میں بیداری کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔

مسلمانوں نے ان کے احسان کو فراموش نہیں کیا۔ بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے ان کو اپنی بساط کے مطابق خراج عقیدت پیش کیا۔ بعض نے ان پر مستقل کتابیں لکھیں اور بعض نے ضمناً اپنی اپنی تالیفات میں ان کا تذکرہ کیا۔ ان پر زیادہ تر کتابیں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ دوسرے درجے میں یورپی زبانیں آتی ہیں۔ اگرچہ یورپی مؤلفین نے اپنی تالیفات میں افغانی کے بارے میں اظہار خیال کرتے وقت ان کی بلند شخصیت کا خیال نہیں رکھا۔ تیسرے نمبر پر افغانستان کی وزارت اطلاعات و ثقافت نے سید صاحب کی اسیویں سالگرہ کے موقع پر بڑی قیمتی کتابیں شائع کی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ پشتون بھائیوں نے اس سلسلے میں بہت کم خدمات انجام دی ہیں۔ تاہم امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں پشتون ادیب سید صاحب پر قابل قدر کتابیں لکھنے کی طرف مناسب توجہ دیں گے اور جب مندرجہ ذیل فہرست ان کی نظر سے گزرے گی تو وہ اس تاریخ ساز بزرگ کو خراج عقیدت پیش کرنے پر کمر ہمت باندھیں گے۔

کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:

---

[1] یہ مقالہ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کے پشتو ماہنامہ "پښتو" (PUKHTO) کے افغانی نمبر میں شائع ہو چکا ہے اب اس کا اردو ترجمہ اردو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

سید جمال الدین کے حالات میں تصنیفات

۱۔ مولانا ابوالحسنات ندوی ۔ جمال الدین افغانی (مقالہ) طبع دہلی۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ جمال الدین افغانی ۔ طبع لکھنؤ

۳۔ احمد امین: فیض الخاطر ۔ مجموعہ مقالات ادبیہ و اجماعیہ چوتھی جلد

۴۔ احمد امین ۔ زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث ۔ قاہرہ ۱۹۵۶ء

۵۔ Iraj Afshar et Asghar Mahdavi, Documents Inédits Concernant Sayyid Jamaluddin Afghani (Documents), Tehran, 1963, P.S.

۶۔ اصمعی، آثار جمال الدین افغانی ۔ طبع مصر

۷۔ اللہ بخش یوسفی، جمال الدین افغانی ۔ طبع پشاور۔

۸۔ Elie Kedouri, Afghani and Abdul, London, 1966.

۹۔ امیر شکیب ارسلان، حاضر العالم الاسلامی، طبع مصر۔

۱۰۔ امیر شکیب ارسلان، اشہر مشاہیر الشرق، طبع مصر۔

۱۱۔ ایڈورڈ براؤن ۔ اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، کیمبرج ۱۹۵۹ء چوتھی جلد۔

۱۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف آرٹ سلاک لیگ رشین، جلد ۳۲، دوسری طبع ۔ بحوالہ محمد حسین الصاغر دار الشیوعیۃ مبداء ھدام بغداد، ۱۹۶۰ء

۱۳۔ انسائکلوپیڈیا آف اسلام، جمال الدین افغانی۔

۱۴۔ AL-Manach de Kabul, 1923 A.H.

۱۵۔ باقر خان لوہانی الملقب بابراہیم خان معطر ۔ شبسیۃ لندنیہ و ناسوتیہ ۔ طبع ایران۔

۱۶۔ براؤن ۔ ای جی ۔ دی پرشین ریولوشن آف ۱۹۰۵ ۔ ۱۹۰۹ء کیمبرج ۱۹۱۰ء۔

۱۷۔ BERliner Tageb. Latt, 23 June, 1896. ۔ طبع یونیک ۔

۱۸۔ برڈ کلمین ۔ جی ۔ ڈی ۔ ایل ۔ جمال الدین افغانی۔

۱۹۔ بشارہ ۔ سید جمال الدین افغانی ۔ مترجمہ از عربی ۔ بیہقی پبلشرز کابل۔

۲۰۔ بلنٹ الفریڈ سکیون ۔ التاریخ السری لاحتلال انجلترا مصر۔

۲۱۔ جنت۔ الفریڈ سکیون۔ ٹائی ڈائریز، لندن، ۱۹۱۹ء

۲۲۔ 〃 〃 〃 ۔ گارڈن یٹ خرطوم، لندن، ۱۹۱۹ء

۲۳۔ 〃 〃 〃 ۔ سیکریٹ ہسٹری آف دی انگلش اکوپیشن آف ایجپٹ، لندن، ۱۹۰۷ء

۲۴۔ انڈیا انڈر رپن، لندن ۱۹۰۹ء۔

۲۵۔ Beilage zur Algemeine Zeitung, Munichen, June 24, 1896

۲۶۔ پان انگلیکن پیپرز " دی محمڈن پروپیگنڈ ود سپیشل ریفرنس ٹو پان اسلامزم، مطبوعہ سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچن نالج، لندن، ۱۹۰۸ء

۲۷۔ الاتحاد الاسلامی۔ جمال الدین الافغانی، المرکز العام لجمعیات الشبان المسلمین المعروف به اتحاد جمعیات الثبین، دار العهد الجدید۔

۲۸۔ George Cotchy, Jamal Eddin Al Afghani et les mysteres de sa majeste Imperial Abdul Hamid II, Cairo, N.D

۲۹۔ جرجی زیدان۔ مشاهیر الشرق فی القرن التاسع عشر، دوسری جلد، طبع مصر ۱۹۱۱ء۔

۳۰۔ جمال الدین الافغانی۔ العروة الوثقیٰ۔ الثورة التحریریة الکبریٰ جمال الدین وعبده، دار العرب، قاہرہ، ۱۹۵۸ء۔

۳۱۔ جمال الدین افغانی۔ حقیقت مذہب نیچری و بیان حال نیچریان۔ اردو ترجمہ از عبدالغفور شہباز، کلکتہ، ۱۸۸۳ء

۳۲۔ جمال الدین افغانی۔ شرح حال اغوریان۔ معلم شفیق، حیدرآباد دکن، ستمبر، اکتوبر ۱۸۸۱ء۔

۳۳۔ جمال الدین افغانی۔ تاریخ افغانستان۔ بحوالہ فہرست کتب ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۳۴۔ جمال الدین افغانی۔ دو خطبے تعلیم اور تجارت پر، مصر، اسکندریہ، ۵ جمادی الاول، ۱۲۹۶ھ

۳۵۔ جمال الدین، سید الافغانی بن سید صفدر، تتمة البیان فی تاریخ الافغان۔ بحوالہ فہرست کتب ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

۳۶۔ جمال الدین افغانی۔ الرد علی الدهریین

۳۷۔ جمال الدین افغانی۔ القضاء والقدر واصول العقائد الاسلامیه و امهات المسائل

التوحیدیۃ مصدرۃ ، طبع مصر
۳۸۔ جولڈزیہر، جمال الدین افغانی، لیڈن، بار اول
۳۹۔ چارلس ڈمز ڈاکٹر، الاسلام والتجدید فی مصر، طبع مصر، ۱۹۳۵ء۔
۴۰۔ چارلس اڈمز ڈاکٹر۔ اسلام اینڈ ماڈرنزم ان ایجپٹ لندن، ۱۹۳۳ء۔
۴۱۔ حورانی۔ اے۔ ایچ۔ عربک تھاٹ ان دی لبرل ایج ۱۷۹۸ء - ۱۹۳۹ء، آکسفورڈ، ۱۹۶۲ء۔
۴۲۔ الحکیم الثائر۔ جمال الدین الافغانی۔ المجلس الاعلی للشئون الاسلامیۃ۔ قاہرہ۔
۴۳۔ حیات جمال الدین افغانی۔ گوشۂ ادب لاہور، ۱۹۶۲ء
۴۴۔ ہسٹری آف فریڈم مومنٹ۔ پہلی جلد۔
۴۵۔ حبیب الرحمان جدیبر۔ رسالہ ومقالات در بارۂ سید جمال الدین افغانی۔ بیہقی پبلشرز کابل۔
۴۶۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
۴۷۔ ریناں موسیو۔ *Islam et la science, Lecture delivered at Sarbonne University, March* 1883
۴۸۔ اس تقریر کا ترجمہ اور تردید حسن ندوی عظیم نے کی ہے۔ طبع قاہرہ۔
۴۹۔ روان فرہادی، مقالات محمود طرزی در سراج الاخبار افغانیہ کابل، بیہقی پبلشرز، کابل۔
۵۰۔ ڈاکٹر سعید اللہ قاضی۔ دی لائف اینڈ ورکس آف نواب صدیق حسن خان آف بھوپال، لاہور، ۱۹۷۳ء۔
۵۱۔ سمتھ پروفیسر والفریڈ کانتویل۔ اسلام ان ماڈرن ہسٹری۔
۵۲۔ سید سلیمان ندوی۔ جمال الدین افغانی، مقالہ، طبع لکھنؤ۔
۵۳۔ صاحب زادہ حمید اللہ۔ جمال الدین افغانی۔ کوئٹہ، ۱۹۷۰ء۔
۵۴۔ صدیق رہپو، سید جمال الدین افغانی در مطبوعات افغانستان۔ بیہقی پبلشرز کابل۔
۵۵۔ ضیاء الدین برنی۔ جمال الدین افغانی۔ مقالہ طبع بھوپال۔
۵۶۔ مولانا ظفر علی خان۔ جمال الدین افغانی۔ طبع لاہور۔
۵۷۔ عباس محمود العقاد۔ محمد عبدہٗ، طبع مصر۔

۵۸۔ عباس محمود العقاد، علی الاثیر (ریڈیو تقریر) قاہرہ، ۱۹۴۷
۵۹۔ عبدالحکیم طیبی ۔ دی پولیٹیکل سٹرگل آف جمال الدین افغانی، بیہقی پبلشرز کابل۔
۶۰۔ عبدالحکیم طیبی ۔ تلاش ہائے سیاسی سید جمال الدین افغانی، مبارز بزرگ سیاسی در قرن ۱۹۔ بیہقی پبلشرز، کابل۔
۶۱۔ عبدالحلیم اثر۔ تذکرہ سید افغانی (پشتو)، عظیم پبلشنگ ہاؤس پشاور۔
۶۲۔ عبدالحی حبیبی، نسب و زادگاہ سید جمال الدین افغانی۔ بیہقی پبلشرز کابل۔
۶۳۔ عبدالرحمن الخمیسی۔ المکافحون، طبع مصر۔
۶۴۔ عبدالرحمن الرافعی۔ تاریخ الحرکۃ القومیۃ، طبع مصر۔
۶۵۔ مولانا عبدالصمد صارم ۔ سیرت جمال الدین افغانی، اشرف پریس لاہور۔
۶۶۔ عبدالعزیز بدر۔ مصر لحدیثۃ قبل احتلال البریطانی و بعدہ۔ طبع مصر ۱۹۳۲ء۔
۶۷۔ قاضی عبدالغفار۔ مدیر پیام دکن، جمال الدین افغانی (مقالہ) طبع دکن ۔
۶۸۔ " " " المآثر و الآثار۔ طبع دکن۔
۶۹۔ " " " آثار جمال الدین افغانی، انجمن ترقی اردو، ہند۔
۷۰۔ " " " جمال الدین افغانی، جامعہ ملیہ، دہلی ۔۔
۷۱۔ عبدالغنی شمس ۔ سفیر اللہ جمال الدین الافغانی، قاہرہ ۱۹۶۹ء ۔
۷۲۔ عبدالقادر القینوی ۔ تحریر الامم من کلب العجم، طبع مصر
۷۳۔ عبدالقادر المغربی ۔ جمال الدین الافغانی ۔ دار المعارف مصر، ۱۹۶۷ء۔
۷۴۔ " " " جمال الدین ۔ مجموعہ اقرار عدد ۶۸، طبع قاہرہ
۷۵۔ مولانا عبدالقدوس قاسمی ۔ مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔
۷۶۔ " " " ۔ ارشادات جمال الدین افغانی۔ ترجمہ العروۃ الوثقیٰ (مقدمہ)
۷۷۔ عبدالقدوس ہاشمی و علامہ محمود حسن ٹونکی ۔ آثار جمال الدین ۔ یہ مقالہ معجم المصنفین نامی کتاب میں شائع ہو چکا ہے ۔
۷۸۔ عبداللہ سمندر۔ مترجم در فارسی عروۃ الوثقیٰ۔ سید جمال الدین افغانی۔ بیہقی پبلشرز کابل۔

۷۹۔ عبداللطیف حمزہ ۔ الصحافۃ المصریۃ فی مائۃ عام ۔ طبع قاہرہ ۔

۸۰۔ مولانا عبدالمجید سعدی افغانی ۔ حیاۃ صحابی ۔ طبع لاہور ۔

۸۱۔ " " " " " " ۔ سٹیم پریس آگرہ ۱۳۳۹ھ ۔

۸۲۔ عبدالمجید سالک ۔ اسلام اور تجدد مصر میں ۔ اردو ترجمہ چارلس آدمز کی کتاب اسلام اینڈ ماڈرنزم ان ایجپٹ ؛ مجلس ترقی ادب اردو، لاہور ۔

۸۳۔ عبدالمجید محمد سعید ۔ نابغۃ الشرق السید جمال الدین افغانی، دار الکاتب العربی، قاہرہ ۱۹۶۷ء ۔

۸۴۔ عزیز احمد ۔ سٹڈیز ان اسلامک کلچر ان دی انڈین انوائرنمنٹ، اکسفورڈ ۱۹۶۴ ۔

۸۵۔ " ۔ افغانیز انڈین کنٹیلیکٹس، جرنل آف دی امریکن اورینٹل سوسائٹی، ۱۹۶۹ - ۷۹(III)

۸۶۔ " ۔ سید احمد خان، جمال الدین افغانی اینڈ مسلم انڈیا، سٹڈیا اسلامکہ، ۱۳ (۱۹۶۰ء) ص ۵۵ - ۷۸ ۔

۸۷۔ عثمان امین ۔ رواد الوعی الانسانی فی الشرق الاسلامی، ۱۹۰۵ء

۸۸۔ العطیہ عنان ۔ معالم الفکر العربی الاصلاحی السلفی (بغداد مطبع)

۸۹۔ علی اکبر دھخدا ۔ لغت نامہ ۔ مطبوعہ تہران ۔

۹۰۔ علی عبداللہ العمادی، جمال الدین افغانی (مقالہ) طبع دکن ۔

۹۱۔ علی پاشا صالح ۔ تاریخ ادبی ایران (پہلی جلد)، نشریات کتابخانہ ابن سینا، دوسرا ایڈیشن ۔ تہران ۔ ۱۳۳۵ھ

۹۲۔ غلام حسین الافغانی ۔ الرد علی الدکتور الوردی ۔ طبع بغداد

۹۳۔ سید فارغ بخاری ۔ جمال الدین افغانی ۔ طبع لاہور ۔

۹۴۔ فتحی الرمی ۔ البرہان الثائر ۔ جمال الدین افغانی ۔ قاہرہ ۱۹۶۶ ۔

۹۵۔ فرخ زادہ ۔ مدلان نامئی شرق ۔ طبع بیروت ۔

۹۶۔ فرصت شیرازی ۔ دبستان الفرصۃ ۔ طبع ایران ۔

۹۷۔ فضل حق شیدا ۔ سید جمال الدین افغانی ۔ طبع پشاور

۹۸۔ فلپ دی ترازی ۔ الصحافۃ العربیۃ ۔ طبع بیروت

۱۴۱۔ محمود البوریۃ ۔ جمال الدین افغانی، تاریخہ ورسالتہ ۔ قاہرہ ۱۹۶۶ء۔
۱۴۲۔ 〃 〃 ۔ جمال الدین افغانی، تقدیم ومراجعہ، عبدالرحمان الرافعی، قاہرہ ۱۹۵۸ء ۔
۱۴۳۔ 〃 〃 ۔ جمال الدین افغانی، مصر ۱۹۷۱ء ۔
۱۴۴۔ ڈاکٹر محمود حسین ۔ عرب دنیا اردو ترجمہ بحلا عزالدین کی کتاب "عرب ورلڈ" طبع لاہور۔
۱۴۵۔ محمود قاسم ۔ جمال الدین افغانی، حیاتہ وفلسفتہ، طبع قاہرہ
۱۴۶۔ ڈاکٹر سید محمود رہین ۔ گزیدۂ آثار جمال الدین افغانی، بیہقی پبلشرز کابل
۱۴۷۔ مرتضیٰ مدرسی چہار دھی، زندگانی، فلسفۂ اجتماعی وسیاسی سید جمال الدین افغانی ۔ تہران ۱۳۳۴ھ ۔
۱۴۸۔ مرزا ادیب ۔ حیات جمال الدین افغانی، لاہور ۱۹۵۹ء
۱۴۹۔ مرزا لطف اللہ خان اسد آبادی ۔ شرح حال وآثار جمال الدین اسد آبادی معروف بافغانی، طبع برلن ۱۹۲۶ء
۱۵۰۔ مرزا محمد علی ۔ مختصر تاریخ ایران ۔ طبع ایران
۱۵۱۔ میکنان ۔ آر، ایم ایم، ۱۹۱۰ء (REI) ۱۹۲۷ء
۱۵۲۔ مصطفیٰ عبدالرزاق ۔ مقدمۃ العروۃ الوثقیٰ، مصر ۱۹۲۸ء۔
۱۵۳۔ 〃 〃 ۔ مقالات جمالیہ، کلکتہ ۱۸۸۴ء
۱۵۴۔ مقام جمال الدین افغانی (مجموعہ مضامین) نفیس اکیڈیمی کراچی ۱۹۴۹ء
۱۵۵۔ ناظم الاسلام کرمانی ۔ تاریخ بیداری ایرانیان، ضمیمہ دامروز وخواہر، ۱۳۲۶ء
۱۵۶۔ بحلا عزالدین ۔ دی عرب ورلڈ، ہنری ریجنری کمپنی ۱۹۵۳ء
۱۵۷۔ انکی کیڈی ۔ سید جمال للدین الافغانیز، فرسٹ ٹونٹی فایو ایرز ۔
۱۵۸۔ 〃 ۔ زیں اسلامک رسپانس ٹو امپریلزم ۔ برکلی، ۱۹۶۸ء۔
۱۵۹۔ 〃 ۔ دی ڈارکسٹ پیریڈ، مڈل ایسٹ جرنل، ۲۰/۳، ۱۹۶۶ء ۔ ۵۳۲-۵۱۷
۱۶۰۔ 〃 ۔ ریلجن اینڈ آمر ریلجن ان اہلی ایرانین نیشلزم، کمپیریٹیو
۱۶۱۔ 〃 ۔ سٹڈیز ان سوسائٹی اینڈ ہسٹری، ۳/۴ (۱۹۶۲)، ۲۶۵، ۲۹۵

۱۶۲۔ نواب بہادر یار جنگ ۔ جمال الدین، طبع دکن۔

۱۶۳۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر ۔ جمال الدین افغانی دکن میں ۔ (مقالہ) طبع دکن۔

۱۶۴۔ یوسف بن اسمٰعیل النبہانی ۔ جمال الدین افغانی ۱۸۴۹ ۔ ۱۹۳۲ء

۱۶۵۔ شاہد حسین رزاقی ۔ جمال الدین ، حیات وافکار، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ ،لاہور۔

یہ ہیں وہ کتابیں جو راقم الحروف کو معلوم ہیں ۔ ان کے بارے میں تلاشِ کتب کی یہ کوشش کوئی آخری کوشش نہیں ہے ، اور ہو سکتا ہے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہوں، یا ان میں افغانی کا تذکرہ ہوا ہو اور مجھے معلوم نہ ہو۔

ان کتابوں میں بعض میں نے قاضی عبدالحلیم افغانی کی کتاب "تذکرہ د سید افغانی" سے نقل کی ہیں، بعض کی توثیق تو ہو چکی ہے اور بعض اندراج سے رہ گئی ہیں ۔ اگر ان میں کسی قسم کی غلطی ہو تو اس کی تصحیح کا خیر مقدم کروں گا ۔ واللہ اعلم بالصواب وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

یادگارِ شبلی

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

اس کتاب میں شبلی نعمانی کے مفصل حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کو ہمارے ادب اور تاریخ میں جو بلند مقام حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں ۔ ان کے احوال زندگی سید سلیمان ندوی مرحوم نے حیاتِ شبلی میں جمع کیے تھے ۔ تصانیف کے متعلق وہ ایک علیحدہ کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا ۔ ڈاکٹر اکرام صاحب کی اس کتاب یادگار شبلی میں نہ صرف مکمل حیاتِ زندگی ہیں اور اس کے ساتھ وہ مواد بھی سمیٹ لیا گیا ہے جو سید سلیمان ندوی کی تصنیف حیاتِ شبلی کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوا ہے، بلکہ علامہ شبلی کی ایک ایک کتاب پر علیحدہ تفصیلی تبصرہ بھی ہے۔

صفحات : ۵۰۰ قیمت : -/۲۲ روپے

ملنے کا پتا : ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاھور

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن خارجة بن زيد بن ثابت قال دخل نفرٌ على زيد بن ثابتٍ فقالوا له حدثنا احاديث رسول الله صلى الله عليه وسلم قال كنت جاره فكان اذا نزل عليه الوحي بعث الى فكتبته له فكان اذا ذكرنا الدنيا ذكرها معنا واذا ذكرنا الآخرة ذكرها معنا واذا ذكرنا الطعام ذكره معنا فكلُّ هذا احدثكم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ (ترمذی)

خارجہ روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ باتیں سنائیے۔ انھوں نے کہا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوسی تھا۔ جب آپ پر وحی آتی تو مجھے بلا بھیجتے، میں جاکر لکھ دیتا۔ پھر جب ہم دنیا کا تذکرہ کرتے تو آپ بھی اس میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر فرمانے لگتے۔ پھر جب ہم کھانے پینے کا ذکر کرتے تو آپ اس میں بھی شریک رہتے۔ (حضرت زید نے کہا) یہ ساری باتیں میں تم لوگوں سے آں حضرت ہی کی بیان کر رہا ہوں۔

آں حضرت اللہ کے محبوب پیغمبر تھے، خاتم الانبیا اور افضل الرسل تھے، لوگوں سے ملتے جلتے تھے، پڑوسیوں سے بہتر مراسم رکھتے تھے، گھر والوں سے عمدہ تعلقات رکھتے تھے اور ہر ایک سے اس کی ذہنی اور فکری سطح کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔ اس ضمن میں متعدد واقعات احادیث کی کتابوں میں مرقوم ہیں، جن میں ایک واقعہ مسطورہ بالا حدیث میں بیان ہوا ہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ رسول اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، ساتھ ہی انھیں یہ شرف بھی حاصل تھا کہ ان کا شمار کاتبینِ وحی کی برگزیدہ جماعت میں ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ آں حضرت کے شرفِ ہمسائیگی سے بھی بہرہ مند تھے۔ صحابیت، کتابتِ وحی اور ہمسائیگی، یہ تین خصوصیات جس شخص کو میسّر ہوں، ظاہر ہے اس کا درجہ بہت ہی بلند ہوگا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ

کے کئی پہلوؤں سے آگاہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ واضح کرتے ہیں کہ آپ خود زندگی کے بہت سے گوشوں سے باخبر تھے۔

پیغمبر کے بارے میں یہ اصول ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی زندگی دنیا کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے لیل و نہار کا ہر گوشہ لوگوں کے سامنے ہوتا ہے۔ پیغمبر کوئی راہب یا گوشہ گیر عبادت گزار نہیں ہوتا کہ لوگوں سے قطعِ تعلق کرکے بیٹھ جائے اور اپنے شب و روز کا مشغلہ صرف ایک خاص قسم کی عبادت اور تسبیح و تہلیل کو قرار دے لے۔ پیغمبر کی زندگی کا ہر پہلو وضیح و درنمایاں ہوتا ہے۔ اس پر اللہ کی طرف سے وحی بھی نازل ہوتی ہے۔ وحی کی روشنی میں وہ خود بھی لوگوں کو احکام جاری کرتا اور انھیں راہِ ہدایت دکھاتا ہے۔ وہ خود بھی عبادت کرتا اور لوگوں کو بھی عبادت کی تلقین کرتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ دنیا کے معاملات کے بارے میں بھی باتیں کرتا ہے۔ عقبیٰ و آخرت کے مسائل بھی اس کی مجلس میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ کھانے پینے اور اکل و شرب کی باتیں بھی مجلسِ نبوت میں ہوتی ہیں۔ یعنی پیغمبر کی شخصیت کسی ایک معاملے میں محدود ہو کر نہیں رہ جاتی۔ جیسا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ ہر ضروری مسئلے پر بحث فرماتے، اس پر غور و فکر کرتے اور لوگوں کو اس کے متعلق مفید مشوروں سے نوازتے۔

غور کیا جائے تو رسول کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ لوگوں کی گفتگو میں شریک ہو اور ان کے درپیش مسائل کو موضوعِ بحث ٹھہرائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریق تھا، آپ کی مجلس میں ہر قسم کے مسائل پر بحث ہوتی اور آپ اس میں باقاعدہ حصہ لیتے، اور یہی نبوت کا درجہ کمال ہے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوتی کہ ہر نیک اور بڑے آدمی کو لوگوں کے معاملات میں دلچسپی لینی چاہیے اور ان کی غمی خوشی میں شریک ہونا چاہیے۔ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے دنیا و آخرت کی باتیں کرتے اور کھانے پینے کے مسائل پر گفتگو فرماتے تھے تو آپ کے اطاعت گزاروں کو تو بالخصوص اس کا خیال رکھنا چاہیے اور اپنے محلے، علاقے، شہر اور ملک کے لوگوں سے باہمی مسائل کے بارے میں تبادلِ خیالات کرنا اور ان کی ضروریات کا پتا کرتے رہنا چاہیے۔

نقد و نظر

قادیان سے اسرائیل تک

ناشر : مؤتمر المصنفین، دار العلوم حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک (پشاور)

صفحات : ۲۲۴ - قیمت پندرہ روپے

قادیان سے اسرائیل تک، ایک نئی کتاب ہے جو مؤتمر المصنفین اکوڑہ خٹک کے ایک فاضل محقق نے ترتیب دی ہے اور ماہ نامہ "الحق" کے مدیر شہیر مولانا سمیع الحق کی سعی و اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب جس اہم موضوع پر مشتمل ہے وہ نام سے ظاہر ہے۔

قادیانی فتنہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے اور اس کے عزائم نہایت خطرناک اور مہیب ہیں۔ کتاب میں ان سب امور کی تفصیل سے نقاب کشائی کی گئی ہے۔ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں: سیاسی تحریک ـــ مذہبی روپ، یہودی مسیح موعود، سامراجی صہیونی آلہ کار، حکیم نور الدین کا دور، سیاسیات دورِ ثانی، مرزا محمود کی لندن یاترا، لندن منصوبے کی تکمیل، نئے مبلغ نئے فتنے، عالمی استعمار کے گماشتے، جنگ عظیم اور قادیانی تخریب کار، تحریک پاکستان اور قادیان، اقوامِ متحدہ اور مسئلہ فلسطین، یہودی ریاست کے سائے میں ـــ ان عنوانات سے کتاب کے مندرجات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

فاضل مصنف نے بڑی عرق ریزی اور کمال محنت سے ایسی معلومات جمع کی ہیں جو قادیانیت کے سلسلے میں سیاسی اعتبار سے بین الاقوامی نوعیت کی حامل ہیں اور جو اب تک اکثر لوگوں کے دائرۂ علم سے باہر تھیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ ان تمام معلومات و مندرجات کا تعلق سیاسیات سے ہے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ سیاسی لحاظ سے قادیانیت کا نقطۂ نظر دنیا بھر کے مسلمانوں کو گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا رکھنا ہے۔ ہمارے خیال میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ کثرتِ معلومات کے علاوہ مشمولات میں ربط و تسلسل نے اس کو بڑا دلچسپ بنا دیا ہے۔ پھر زبان اور اندازِ بیان بھی سلجھا ہوا ہے ـــ کتابت، طباعت اور کاغذ بھی عمدہ ہے۔

برگِ گل (اقبال نمبر)

مدیرِ اعلیٰ - پروفیسر امتیاز حسین مفتی
ناشر :- شعبہ تصنیف و تالیف، وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج۔ بابائے اردو روڈ، کراچی۔
صفحات : ۵۴۴ - بہترین کتابت، عمدہ طباعت، شاندار کاغذ۔

پاکستان کے متعدد رسائل و جرائد نے علامہ اقبال کے بارے میں خاص نمبر شائع کیے ہیں، جن میں وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی کا مجلہ "برگِ گل" بھی شامل ہے۔ اس کا اقبال نمبر ہمارے سامنے ہے۔ یہ نمبر ہر لحاظ سے شاندار ہے۔ اقبال کے بارے میں اس نے اپنے قارئین کے لیے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کی ترتیب میں ملک کی بلند پایہ شخصیتوں نے حصہ لیا ہے، جن میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، چوہدری عبدالحمید، پروفیسر آفتاب احمد نقوی، پروفیسر محمد صدیق، پروفیسر اختر راہی، مولانا حامد علی خاں، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، جسٹس ایس اے رحمٰن، ڈاکٹر محمد ریاض، قاضی افضل حق قرشی، سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید، ڈاکٹر محمد معزالدین، پروفیسر محمد ایوب قادری، بشیر احمد ڈار، مرزا ادیب اور اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مضامین کے تنوع نے اس نمبر کو بڑا دلچسپ اور لائق مطالعہ بنا دیا ہے۔ اقبالیات سے تعلق رکھنے والے حضرات کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

گلستانِ حدیث

از مولانا محمد جعفر پھلواروی

یہ چالیس منتخب احادیثِ نبوی کی تشریح ہے۔ ہر حدیث کے مضمون کی تائید میں دوسری احادیث اور قرآن کریم کی آیات سے ان کی مطابقت بہت دلنشین انداز میں بیان کی گئی ہے۔

صفحات : ۲۰۸ قیمت : -/۱۲ روپے

ملنے کا پتا : ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاهور

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی - اپریل ۱۹۷۹ء

مضمون	مصنف
شیخ عبدالرحمٰن چشتی (مسلسل)	ڈاکٹر محمد عمر
کیا علما انگریزی کے مخالف تھے؟	جناب رفیع احمد بستوی
مخطوطات کے اختتامیے اور ان کے کاتب	ڈاکٹر شعیب اعظمی
ادبیاتِ فارسی میں تیر کا درجہ	ڈاکٹر نظام الدین

البلاغ، کراچی - مارچ ۱۹۷۹ء

مضمون	مصنف
اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کے اصول اور طریقہ	مولانا مفتی صباح الدین کاکاخیل
مکارمِ اخلاق	مولانا عبدالرؤف
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے ثمرات و برکات	مولانا شمس الحق
مولانا مفتی محمد حسن امرتسری مرحوم	محمد اکبر شاہ بخاری

بینات، کراچی - اپریل ۱۹۷۹ء

مضمون	مصنف
تفہیم القرآن پر ایک نظر	مولانا محمد اسحاق صدیقی
مصر میں اسلامی تعلیم کا آغاز	محمود عارف
مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی	حافظ محمد اکبر شاہ بخاری
قائدینِ جماعت کے اوصاف و خصائص	محمد طیب کشمیری

الحق، اکوڑہ خٹک، مارچ ۱۹۷۹ء

مضمون	مصنف
کلیاتِ دین کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ	مولانا قاری محمد طیب صاحب
تعلیم [illegible]	جناب مظفر عباسی

الفرقان، لکھنؤ - اپریل ۱۹۷۹ء

مضمون	مصنف
حضرت ابراہیم بن ادہم اور ان کے مدفن کی تحقیق	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
[illegible] تھانوی کے چند غیر مطبوعہ خطوط۔	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

جون ۱۹۶۹

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمہ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون : ۵۳۹۰۸

المعارف لاهور

جلد ۱۲ | جون ۱۹۷۹ رجب ۱۳۹۹ | شمارہ ۶

ترتیب

تاثرات

یہ ایک مسرت انگیز حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ملک میں بڑا علمی کام ہوا ہے۔ اس میں ہمارے اسلاف کا وہ ذخیرۂ علم بھی ہے جو عربی، فارسی اور اُردو زبان پر مشتمل ہے، لیکن عرصے سے نایاب تھا، اس کا بیشتر حصہ آب و تاب کے ساتھ طباعت و اشاعت کی منزلوں سے گزر چکا ہے، اس کے علاوہ تحقیق و کاوش کے پرانے میدانوں میں نئے انداز سے بے حد پیش قدمی ہوئی ہے۔ پھر اہلِ علم کے رواں دواں قافلوں نے تدقیق و تحقیق کی نئی راہوں کا سراغ بھی لگایا ہے —— قرآنِ مجید سے متعلق بہترین خدمات سامنے آئی ہیں جو قلب و روح کے لیے انتہائی طور پر سامانِ فرحت اور موجبِ نشاط ہیں۔ حدیث اور علومِ حدیث کے مختلف گوشوں پر عمدہ کتابیں معرضِ تصنیف میں آئی ہیں۔ علمِ فقہ، تاریخ فقہ اور اس کی ضرورت و اہمیت کے متعدد پہلوؤں کو ہمارے اصحابِ علم نے خوب صورتی کے ساتھ نکھار کر پیش کیا ہے۔ اسلامی قانون کے بہت سے نکات پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مورخین نے اسلامی تاریخ کی بے شمار سمتوں کو اجاگر کیا ہے۔ متعدد مصنفین نے اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت کی شاندار اسلوب میں وضاحت کی ہے۔ مفکرینِ ملک نے اسلامی فکر اور اسلامی فلسفے کو خوب نمایاں کیا ہے۔ پاکستان کے ادیبوں نے ادبیات کے چہرۂ روشن کو مزید تابناک بنایا ہے اور ملک کی نظریاتی اساس سے ہم آہنگ ہو کر اپنے قارئین کے قلب و نظر کو نئی توانائیاں بخشی ہیں —— غرض ان تمام عنوانات پر انفرادی طور سے بھی کام ہو رہا ہے اور مختلف ادارے بھی اس راہ میں سرگرمِ عمل ہیں۔

اسی طرح ہندوستان کے معزز اہلِ علم اور اربابِ تحقیق نے بھی بہت سی مشکلات سے دوچار ہونے کے باوجود قابلِ ستائش اور لائقِ تحسین خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ وہاں بھی بعض حضرات انفرادی طور پر تگ و تازِ علمی میں منہمک ہیں اور بعض مختلف اداروں کے ذریعے سے مصروفِ عمل ہیں —— اللہ ان سب حضرات اہلِ علم کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

علم ایک عالم گیر نعمت اور ہمہ گیر سچائی ہے۔ ایک شخص کا دوسرے شخص سے اور ایک ملک کے شائقینِ علم کا دوسرے ملک کے اصحاب فضل و کمال سے خذ و قبول اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرے کے دروازے پر دستک دینا اور ان کی طرف رجوع کرنا لازمی امر ہے —— اسلام اور اسلامی علوم تو بالخصوص نشر و اشاعت

(باقی بر صفحہ ۱۲)

مولانا نصرت علی آثیر

امام زفر بن الہذیل

(۲)

مسئلہ فقہ سے علیحدگی کا ؟

حافظ ابن حجر نے حکم بن ایوب اور نعمان بن عبدالسلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے رائے یعنی فقہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ اس روایت سے پیدا ہونے والے شبہات دیگر اقوال اور آثار کی وجہ سے قرینِ صحت نہیں ہیں۔ امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد آپ نے مکتبِ حنفی کی تدریسی ذمہ داریاں سنبھالیں اور بصرہ جانے تک یہ ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔ بصرہ گئے تو وہاں مسجد میں حلقہ درس قائم کیا اور وفات سے پہلے کے چند لمحوں میں آپ کی زبان پر "لہا مہر و فی حال ثلثا مہر" کے الفاظ تھے۔ وہ روایات ملاحظہ ہوں جن کو میں نے اشاراتی صورت میں اوپر ذکر کیا ہے:

كان زفر قد خلف ابا حنيفة في حلقته اذ مات وبعده ابو يوسف وبعدهما محمد بن الحسن [1]

امام زفر اپنے استاذ امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد ان کی جانشین ہوئے۔ ان کے بعد امام ابو یوسف اور ان دونوں کے بعد امام محمد بن حسن ہوئے۔

عن مليح بن وكيع عن ابيه قال لما مات ابو حنيفة اقبل الناس على زفر وما كان ياتي ابا يوسف الا نفر يسير، النفسان والثلاثة [2]

ملیح بن وکیع سے روایت ہے، وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے باپ نے کہا جب امام ابو حنیفہ فوت ہو گئے تو لوگ امام زفرؒ کی طرف متوجہ ہونے لگے اور امام ابو یوسف کے ہاں کوئی اکا دکا آدمی آتا۔

---

[1] کردری : مناقب امام اعظم : ۲ ، ۱۸۵ - مطبوعہ حیدر آباد دہند

[2] زاہد الکوثری: لمحات النظر: ۲۸ مطبوعہ مصر ۱۳۶۸ھ

ثم رحل البصرة بمناسبة اخیه بعد وفاة ابی حنیفة فتمسک اهل البصرة به فاقام هنالك ینشر العلم الی ان مات بالبصرة۔[3]

پھر اپنے بھائی کی مناسبت سے امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد بصرہ گئے۔ اہلِ بصرہ نے انھیں پکڑ لیا۔ پھر وہ وہاں رہے اور علم پھیلاتے رہے، یہاں تک کہ بصرہ میں ہی وفات پاگئے۔

قال الفضل بن دکین دخلت علی زفر وقد احتضر وهو یقول "فی حال لها مهر و فی حال لها ثلثا مهر"[4]

فضل بن دکین کہتے ہیں کہ میں امام زفر کے ہاں اس وقت گیا کہ جب ان پر موت کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے اور آپ کہہ رہے تھے۔ لها مهر و فی حال لها ثلثا مهر۔

صیمری نے عبداللہ بن محمد الاسدی سے اور انھوں نے ابوبکر الافغانی سے اور انھوں نے طحاوی سے اور انھوں نے ابن ابی ثور سے اور انھوں نے سلیمان بن عمران سے اور انھوں نے اسد سے یہ روایت نقل کی ہے۔

قدم زفر البصرة فدخل مسجدها فانفضت الیه حلق اصحاب التابعین[5]

امام زفر بصرہ آئے اور وہاں کی مسجد میں داخل ہوگئے، جس سے وہاں کے تابعین کے حلقے ان کی طرف بڑھ گئے۔

محی الدین نووی لکھتے ہیں:

قال ابونعیم کان زفر ثقة ماموناً دخل البصرة فی میراث اخیه فتشبث به اهل البصرة فمنعوه الخروج منها، قال یحیی بن معین زفر صاحب الرای ثقة ماموناً قال ابن قتیبة توفی بالبصرة[6]

ابونعیم کہتے ہیں کہ زفر حدیث میں ثقہ اور غلطی سے مامون تھے۔ بصرہ گئے تاکہ وہ اپنے بھائی کا ورثہ لے سکیں لیکن اہلِ بصرہ نے انھیں پکڑ لیا اور نکلنے نہ دیا۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ زفر صاحب الرائے، ثقہ اور مامون تھے۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ آپ نے بصرہ میں وفات پائی۔

---

[3] زاہد الکوثری: لمحات النظر: ۲۸ مطبوعہ مصر ۱۳۶۸ [4] ایضاً

[5] ایضاً: ۲۰

[6] محی الدین نووی، تہذیب الاسماء واللغات: ۱: ۱۹۷، مطبوعہ مصر

ذہبی "العبر" میں لکھتے ہیں:

زفر بن الہذیل العنبری الفقیہ صاحب ابی حنیفۃ ولہ ثمان و اربعون سنۃ و کان ثقۃ فی الحدیث موصوفًا بالعبادۃ نزل البصرۃ و تفقہوا علیہ[۷]

زفر بن ہذیل عنبری فقیہ اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے۔ آپ نے اڑتالیس سال کی عمر پائی۔ حدیث میں ثقہ تھے اور عبادت گزاری سے متصف تھے۔ بصرہ آئے تو لوگوں نے ان سے فقہ حاصل کرنا شروع کر دی۔

خضری "تاریخ التشریع الاسلامی" میں لکھتے ہیں:

لم یخض الغمرات الی الدنیا بل ظل حیاتہ مشتغلاً بالعلم والتعلیم حتی مات ۱۵۸ھ فھو اقدم اصحاب ابی حنیفۃ موتا[۸]

مال و متاعِ دنیا کی طرف آپ منہمک نہ ہوئے بلکہ پوری زندگی تعلیم و تعلم کے اشتغال میں گزری۔ یہاں تک کہ ۱۵۸ھ میں وفات پا گئے۔ آپ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سب سے پہلے فوت ہونے والے ہیں۔

ان تصریحاتِ بالا سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام زفر کی پوری زندگی تعلیم و تدریس سے وابستہ رہی اور آپ کے بارے میں جو نعمان بن عبد السلام اور حکم بن ایوب کی روایت ہے وہ آپ کی عبادت میں زیادہ رغبت کا ہی پتا دے سکتی ہے۔ عبادت سے دلچسپی امام صاحب کی رحلت کے بعد اور زیادہ بڑھ گئی اور آخرت کا خوف آپ پر غالب آ گیا۔ جس کی وجہ سے آپ نے ایک تو امام صاحب کے اقوال سے اختلاف تک کرنا چھوڑ دیا جیسا کہ یحیی ابن اکثم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اور دوسرا عبادت میں زیادہ راغب ہو گئے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ فقہ سے مکمل علیحدہ ہو گئے۔

لم اجترأن اخالف الامام بعد وفاتہ لانی اذا خالفتہ فی حیاتہ دابرزت وانبیت بالدلیل الزمنی بالحق الظاھر من ساعتہ وردنی الی قولہ فاما بعد وفاتہ فکیف اخالفہ وبما لو کان حیا لردنی الی قولہ۔[۹]

---

[۷] ذہبی: العبر: ۱: ۲۲۹، مطبوعہ کویت ۱۹۶۰ء

[۸] خضری: تاریخ التشریع الاسلامی: ۲۳۴، مطبوعہ مصر ۱۹۶۰

[۹] کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۵ مطبوعہ ہند

میں اس بات کی کیوں کر جرأت کر سکتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ کی مخالفت کروں، اس لیے کہ جب ان کی زندگی میں میں ان کی مخالفت کرتا تھا اور انھیں دلیل دیتا تھا تو وہ مجھے ظاہر حق کو قبول کرنے پر مجبور کر دیتے۔ یہ ان کی وسعت علمی کی وجہ سے تھا اور وہ اپنے قول کی طرف موڑ لیتے، لیکن ان کی وفات کے بعد اب کیسے ان کی مخالفت کروں۔ شاید کہ وہ اگر زندہ ہوتے تو مجھے اپنے قول کی طرف موڑ لیتے۔

عن بشر بن القاسم قال سمعته يقول لا اخالف بعد موتي شيئًا اخاف عليه الحساب[10]

بشر بن قاسم سے روایت ہے کہ انھوں نے سنا کہ امام زفر کہتے تھے کہ میں کوئی چیز اپنے بعد کیسے چھوڑ دوں جب کہ میں حساب سے ڈرتا ہوں۔

امام زفر بحیثیت مدرس

امام زفر کی ساری زندگی تعلیم و تعلم میں گزری[11]۔ جہاں وہ ایک مثالی اور مشہور فقیہ الحنفی[12] کی حیثیت سے ممتاز ہیں وہاں ایک نامور مدرس بھی تھے۔ آپ کے استاذ محترم اور مردم شناس فقیہ حضرت نعمان ابن ثابت نے اپنے شاگردوں کی اہلیت دیکھ کر جو جو منصب تجویز کیے تھے ان میں امام زفر کے لیے قاضیوں اور مفتیوں کی تربیت تھی۔ اسمٰعیل بن حماد روایت کرتے ہیں:

عن اسمٰعيل بن حماد بن ابي حنيفة يقول قال ابو حنيفة يومًا لاصحابه هؤلاء ستة وثلاثون رجلا منهم ثمانية وعشرون يصلحون للقضاء وستة يصلحون للفتوى واثنان ابو يوسف وزفر يصلحان لتاديب القضاة وارباب الفتوى[13]

اسمٰعیل بن حماد سے روایت ہے کہ امام ابوحنیفہ ایک دن اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ یہ چھتیس افراد ہیں جن میں سے اٹھائیس قاضی اور چھ مفتی ہونے کے قابل ہیں۔ جبکہ یہ دو امام ابو یوسف اور امام زفر اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ قاضیوں اور مفتیوں کی تربیت کریں۔

---

[10] ایضاً، ص ۸۳ [11] خضری: تاریخ التشریع الاسلامی: ۲۳۴: مطبوعہ مصر ۱۹۶۰ء

[12] فرید وجدی: دائرۃ المعارف: ۴: ۵۶۷: مطبوعہ مصر ۱۳۸۶ھ

[13] موفق: مناقب امام اعظمؒ: ۲: ۲۴۶: مطبوعہ ہند

اپنی مدرسانہ صلاحیتوں اور علمی تبحر ہی کی وجہ سے آپ امام ابوحنیفہ کے جانشین بنے بلکہ امام نے لوگوں کے استفسار کے بعد آپ ہی کو جانشین نامزد کیا۔[۱۱۴] آپ صد درجہ باریک بیں اور نکتہ آفریں تھے۔ مشکل سے مشکل مسئلے کو نہایت آسان صورت دے کر حل کر دیتے تھے، جس کی وجہ سے آپ کا حلقۂ درس نمایاں صورت اختیار کر گیا تھا۔ عبداللہ بن ابی رزمہ روایت کرتے ہیں:

كنا نختلف الى ابى يوسف والى زفر غدوة وعشية وكان ابو يوسف يطول المسئلة و يبسط فتلتبس علينا المسئلة وكنا اذا جلسنا الى زفر يختصر المسئلة اختصارا و يأتى بدليل من غير حشو[۱۱۵]

ہم صبح اور شام کو امام ابو یوسف اور امام زفر کے ہاں آیا جایا کرتے۔ امام ابو یوسف مسائل کو اس قدر طول دیتے کہ مسئلہ ہم پر ملتبس ہو جاتا، اور جب ہم امام زفر کے ہاں بیٹھتے تو وہ مسئلے کو مختصر کر دیتے اور بغیر کسی زائد چیز کے دلیل دیتے۔

بصرہ میں امام ابوحنیفہ کے خلاف فضا صد درجہ خراب تھی جس کی وجہ سے آپ کی آرا سے اتفاق کرنے والے کسی عالم کا وہاں جانا ناممکن تھا۔ لیکن امام زفر نے اس مخالفت کے طوفان کو اس خوبی سے ختم کیا کہ وہی مخالف بصرہ امام ابوحنیفہ کی علمی عظمت کا قائل ہو گیا۔ عثمان بن مسلم البتی کا پورا حلقۂ درس آپ کے ہاں بیٹھا اور اس طرح عثمان البتی کا حلقہ بالکل ختم ہو گیا۔ احمد بن محمد قاضی مصر روایت کرتے ہیں:

قال احمد بن محمد بن ابى العوام قاضى مصر فى مناقب ابى حنيفة قال لى ابو جعفر الطحاوى سمعت ابا حازم عبد الحميد بن عبد العزيز القاضى يقول سمعت احمد بن عمرو هو الضبى البصرى يقول قدم زفر بن الهذيل البصرة فكان يأتى حلقة عثمان البتى فيناظرهم و يتتبع اصولهم و يسألهم عن فروعهم فاذا رأى شيئا خرجوا فيه من الاصل ثم يقول فى هذا جواب احسن من هذا فاذا استحسنوه قال هذا قول ابى حنيفة فلم يلبث ان تحولت الحلقة اليه و بقى عثمان البتى وحده[۱۱۶]

---

[۱۱۴] کردری: مناقب امام اعظم ۲: ۱۸۵، مطبوعہ حیدرآباد (ہند) [۱۱۵] ایضاً: ۲: ۱۸۴

[۱۱۶] ابن حجر: لسان المیزان ۲: ۴۷۶، دائرۃ معارف نظامیہ حیدرآباد ہند ۱۳۳۰ھ

احمد بن محمد بن ابی العوام قاضی مصر امام ابو حنیفہ کے مناقب میں کہتے ہیں کہ مجھے ابو طحاوی کہتے ہیں کہ میں نے ابو حازم عبد الحمید بن عبد العزیز القاضی سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے احمد بن عبدہٗ بصری سے سنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ جب امام زفر بصرہ آئے تو وہ عثمان البتی کے حلقے میں آتے، ان سے مناظرہ کرتے، انہی کے اصولوں کی اتباع کرتے اور ان سے انہی کے فروعات کے بارے میں سوالات کرتے اور جب دیکھتے کہ اصل سے وہ کوئی چیز نکالتے ہیں۔ تو کہتے کہ کیا یہ جواب ٹھیک ہے۔ جب وہ کہتے کہ ٹھیک ہے تو پھر امام زفر کہتے کہ یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ یہ حال رہا یہاں تک کہ عثمان البتی کا پورا حلقہ آپ کی طرف آگیا اور عثمان البتی اکیلے رہ گئے۔

امام زفر کی تبحر علمی کا سب کو اعتراف تھا۔ امام ابو حنیفہ نے آپ کی اسی وسعتِ علم اور دیگر نمایاں صلاحیتوں کو دیکھ کر اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ عمر بن الزجاج سے روایت ہے:

عن عمر بن الزجاج عن الامام قال اذا حضرنا زفر نا زفر اجتہدنا الی انہ ننخص ونتسلح واذا حضرنا ابا یوسف حضرنا مع وعاء کثیر علما سألناہ عن شیٔ فاجابنا کانہ یخرج لنا من الوعاء فقلنا الی من نختلف بعدک قال الی زفر[۱۷]

عمر بن الزجاج امام ابو حنیفہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب امام زفر ہمارے ہاں آتے تو ہم قلعہ بند اور مکمل طور پر تیار ہو جاتے لیکن جب امام ابو یوسف آتے تو گویا کہ ایک برتن کے ساتھ آتے، جب کبھی ہم ان سے سوال کرتے تو ہمیں یوں جواب دیتے جیسے کہ برتن سے نکال کر دیتے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ آپ کے بعد کہاں جائیں؟ تو آپ نے فرمایا امام زفر کے ہاں۔

زفر ایک نامور مدرس تھے اس لیے اس میدان کی ہمواری اور ناہمواری کا مکمل تجربہ رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ ایک مدرس کے لیے ضروری قرار دیتے تھے کہ وہ جملہ علوم سے مکمل آگاہی رکھے، ورنہ ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا ہوگا۔

الضحاک بن مخلد آپ کا ایک قول نقل کرتے ہیں:

قال زفر من قعد قبل وقتہ ذل[۱۸]

امام زفر عام لوگوں کو کلامی مسائل میں گفتگو کرنے سے روکتے تھے۔ حسن بن زیاد سے روایت ہے:

---

۱۷ کردری: مناقب امام ابو حنیفہ: ۲: ۱۸۵: مطبوعہ حیدر آباد ہند

۱۸ زاہد الکوثری: لمحات النظر: ۱۴: مطبوعہ مصر ۱۳۶۸ھ

سمعت زفر بن الھذیل و سألہ رجل فقال لہ "القرآن کلام اللہ" فقال لہ الرجل - أمخلوق ھو ؟ فقال لہ زفرؒ - لو شغلک فکر فی مسألۃ ان فیھا ارجو ان ینفعنی اللہ بعلمھا لشغلک ذلک عن ذلک الذی فکرت فیہ - والذی فکرت فیہ بلا شک یضرلک - سلم اللہ عزوجل ما رضی بہ منک ولا تکلف نفسک ما لا تکلف۔ [19]

میں نے زفر بن الہذیل سے سنا کہ جب ان سے کسی آدمی نے سوال کیا تو آپ نے کہا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، تو اس آدمی نے کہا، کیا مخلوق ہے ؟ امام زفر نے کہا، اگر تجھے یہ فکر ہو اس مسئلہ میں مشغول جس میں کہیں ہوں تو امید کی جا سکتی ہے کہ نفع پہنچائے اللہ کے دربارے اس کا علم۔ بہ نسبت اس علم کے جس کے شغل نے تجھے فکر میں ڈالا ہوا ہے۔ جس میں تم فکر کر رہے ہو یہ ضرور تجھے نقصان پہنچائے گا۔ اللہ تجھے وہ کچھ بخشے رکھے جس کی وجہ سے وہ تجھ سے راضی ہو۔ اور تو اپنی جان کو اس جھنجھٹ میں نہ ڈال جس میں تو ڈالا نہیں گیا۔

امام زفرؒ اور قدرت کلام

امام زفرؒ ایک عظیم فقیہ، کامل مجتہد اور رجید اللسان متکلم تھے۔ لیکن دین فہمی اور تقویٰ کی وجہ سے یہ خصوصیات اور زیادہ نمایاں مقام رکھتی تھیں۔ مشکل سے مشکل مرحلے میں آپ کا دماغ نہایت خود اعتمادی سے کام کرتا رہتا، جس کی وجہ سے کئی ہم عصر علما آپ سے کلام کرنے کا خطرہ مول نہ لیتے۔ حارث بن مالک سے روایت ہے کہ حنفی فقہ سے تعلق رکھنے والا سب سے پہلے شخص جو بصرہ آئے وہ زفر بن الہذیل تھے جب کہ سوار بن عبداللہ ان دنوں بصرہ کے قاضی تھے۔ امام زفر نے ملنے کی خواہش کی۔ سوار بن عبداللہ مان گئے۔ امام زفر جب میرے ساتھ چلے اور میں نے کہا کہ اہلِ علم میں سے اور آپ کے قریبی رشتہ داروں میں سے ایک آدمی تجھ سے ملاقات کر رہا ہے۔ اللہ تجھے تندرست و توانا رکھے۔ سوار بن عبداللہ کہنے لگا کہ میرے اقربا سے تو ٹھیک لیکن اہلِ علم میں سے نہیں۔ وہ تو امام ابوحنیفہ کی رائے جیسی بدعت کے ساتھ آیا ہے۔ حارث بن مالک نے کہا کہ ان کی خواہش ہے کہ قاضی کی مجالس سے فیض یاب ہو لیں تو سوار کہنے لگا۔ اسے اجازت تو دے دیں لیکن اس شرط پر کہ وہ کسی علمی مسئلے میں گفتگو نہیں کریں گے۔ [20]

---

[19] زاہد الکوثری: لمحات النظر : ١٧ : مطبوعہ مصر ١٣٦٨ھ

[20] ابن حجر: لسان المیزان : ٢ : ٧٧٤ ـ مطبوعہ دائرہ معارف نظامیہ حیدرآباد ہند ١٣٣٠ھ

ایک دفعہ حجاج بن ارطاۃ سے امام ابو یوسف اور امام زفرؒ دونوں کی بحث ہو گئی۔ جب حجاج کو کوئی جوابی دلیل نہ ملی تو اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا اور امام زفر کے نسب پر طنز کرنے لگا، جس سے امام زفر کو کافی ملال ہوا اور کہنے لگے کہ میری قوم تو مجھے قبول کرتی ہے جو بنی تمیم سے عنبری ہے۔ امام ابو یوسف نے حجاج کو دلائل سے زیر کر دیا۔ جب دونوں اٹھے تو حجاج نے حاجب سے کہا کہ آئندہ ان دونوں کو نہ آنے دینا۔[۲۱]

امام زفر کی قدرت کلام سے امام ابو یوسف بھی مضطرب ہو جاتے تھے۔ ابو نعیم الفضل بن دکین نے داؤد الطائی کے حوالے سے ایک روایت ہے:

قال کان زفر یجلس الی اسطوانۃ و ابو یوسف بحذاہ وکان زفر یلبس قلنسوۃ فکانا یتناظران فی الفقہ وکان زفر جید اللسان وکان ابو یوسف مضطربا فی مناظرتہ فربما سمعت زفر یقول لابی یوسف این تفر ھذہ ابواب کثیرۃ مفتحۃ خذ فی ایھا شئت[۲۲]

امام زفر ستون کی ٹیک لگا کر بیٹھتے اور ابو یوسف آپ کے مقابل بیٹھتے۔ امام زفر ٹوپی پہنے ہوئے ہوتے تھے۔ فقہ پر باہم مناظرہ کرتے۔ زفر چونکہ جید اللسان تھے جس سے امام ابو یوسف اس کے مناظرہ سے مضطرب ہو جاتے کبھی کبھی امام زفر کو یہ کہتے بھی سنا کہ ابو یوسف کہاں نکلو گے، یہ تمام دروازے کثرت تعداد میں کھلے ہیں۔ جون سا چاہو اختیار کر لو۔

آپ چونکہ تیز فہم اور عالی دماغ تھے، جس کی وجہ سے آپ کی بحث علمی مسائل کی تمام ممکن باریکیوں کو کھول کر رکھ دیتی۔ آپ قرآنی تعلیمات، احادیث و آثار سے مسائل کو مستخرج کرنے کا بہت ملکہ رکھتے تھے، اور یہی فقہ حنفی میں قیاس کہلاتا ہے۔ اسی لیے تمام تذکرہ نویسوں نے آپ کی اس خصوصیت کو خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ آپ کو "اقیس اصحابی" کا اعزاز بخشتے تھے۔ لیکن اس زمانے کے لوگوں میں ہم عصر علماء نے رقابت کی وجہ سے قیاس کو غلط رنگ دیا کہ قیاس احادیث و آثار پر ذاتی آرا کو فوقیت دینے کا نام ہے۔ حالانکہ فقہ حنفی میں سب سے پہلے قرآن، پھر حدیث، پھر اجماع صحابہ اور پھر مذکورہ تین علوم کی روشنی میں کسی مسئلے کا ادراک ہے جو کہ فقہ حنفی میں قیاس کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ حسن بن زیاد سے اہل بغداد میں سے کسی آدمی نے

۲۱۔ زاہد الکوثری، لمحات النظر ۱، ۸، مطبوعہ مصر ۱۳۶۸ھ

۲۲۔ محی الدین ابی محمد عبد القادر القرشی، الجواہر المضیئہ ۱: ۲۴۳، مطبوعہ ہند

اسی صورتِ حال سے مغلوب ہو کر پوچھا تو آپ نے جواب جو دیا وہ یوں روایت ہے :

سأله رجل أكان زفر قياسًا ؟ فقال له الحسن وما قولك قياسًا ؟ هذا كلام الجهال - كان عالما فقال الرجل - اكان زفر نظر في الكلام فقال سبحان الله ! ما اسخفك ! تقول لاصحابنا انهم نظروا في الكلام وهم بيوت العلم والفقه انما يقال نظر في الكلام فيمن لاعقل له وهؤلاء كانوا اعلم بحدود الله عز وجل و بالله من ان يتكلموا في الكلام الذي تعني وما كان يهمهم غير الفقه والاقتداء بمن تقدمهم - ۲۳ ؎

کسی آدمی نے پوچھا کہ زفر کیا قیاس کرتے تھے ؟ حسن نے اسے کہا، قیاس سے تیری کیا مراد ہے ؟ یہ تو جہلا کا کلام ہے - وہ تو عالم تھے - وہ آدمی کہنے لگا کہ کیا امام زفر علم کلام میں گہری نظر رکھتے تھے - تو آپ کہنے لگے، سبحان اللہ کیسی کم درجے کی بات کہتے ہو - ہمارے اکابر کے بارے کہتے ہو کہ وہ علم کلام میں نظر رکھتے تھے - وہ تو علم کے گھر تھے اور وہ حدود اللہ کا سب سے زیادہ علم رکھتے تھے، جب کہ کسی کو کلام سے واسطہ رکھنے والا اس وقت کہا جاتا ہے جس کو عقل نہ ہو اور خدا کی قسم! وہ کون ہے جو تیرے خیال کے مطابق کلام میں نظر رکھتا ہے اور جب کہ وہ فقہ کے بغیر کسی چیز کا ارادہ تک نہیں رکھتے تھے، اور وہ انہی کی پیروی کرتے ہیں جو اُن سے پہلے (صحابہ کرام) گزر چکے ہیں -

امام زفر اور ان کے اصحاب نے مروج موشگافیوں کا طلسم دلائل سے توڑ دیا جس کی وجہ سے فقہ حنفی کی بعض حضرات اس وجہ سے بھی مخالفت کرتے تھے، لیکن تمام باتوں کے باوجود آپ اور آپ کے احباب نے دلائل کے ساتھ گفتگو کی --- خالد بن زید العمری کہتے ہیں :

كان ابوحنيفة وابويوسف ومحمد وزفر وحماد بن ابي حنيفة قومًا قد خصموا بالكلام الناس وهم ائمة العلم ۲۴ ؎

امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد، امام زفر اور حماد بن ابو حنیفہ جیسے لوگوں کا ایک ایسا طبقہ تھا جنھوں نے لوگوں کی موشگافیوں سے جنگ کی اور یہ لوگ علوم کے امام تھے -

---

۲۳ ؎ زاہد الکوثری : لمحات النظر : ۱۷ : مطبوعہ مصر

۲۴ ؎ کردری : مناقب امام اعظم : ۱ : ۳۸ : مطبوعہ ہند

امام زفر کو قدرتِ نظامی کے اس وہبی عطیہ پر بڑا ناز تھا اور آپ کہا کرتے تھے۔

لست اناظر احدا حتی یقول اخطأت انا اناظرہ حتی یجن قیل لہ کیف یجن قال یقول بما لم یقل بہ احد[۲۵]

میں کسی سے بھی مناظرہ نہیں کرتا، یہاں تک کہ وہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے غلطی کی ہے۔ میں مناظرہ کرتا ہوں حتیٰ کہ وہ بہکا لگنے لگتا ہے۔ پوچھا گیا کہ بہکانا کیا ہے، فرمانے لگے، ایسی بات جو کہ کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔

---

۲۵ کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۶، مطبوعہ حیدرآباد ہند۔

(بقیہ تاثرات)

کے طالب اور ترویج و تبلیغ کے متمنی ہوتے ہیں اور قدرتی طور پر چاہتے ہیں کہ ان کا حلقۂ اثر و نفوذ وسیع ہو اور وہ ہر جگہ پہنچیں اور پھیلیں۔

پاکستان اور ہندوستان کے ارباب بست و کشاد اگر اس طرف عنانِ توجہ مبذول کریں اور ایسی سہولتیں مہیا کریں کہ دونوں ملکوں کی علمی و تحقیقی مطبوعات آسانی سے اصحابِ علم کے مطالعہ میں آسکیں تو یہ ایک احسان ہوگا اور جو لوگ برصغیر میں تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں وہ ان سے مستفید ہو سکیں گے۔

(محمد اسحاق بھٹی)

انتخابِ حدیث

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب ان احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی چیدہ چیدہ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے۔

صفحات: ۲۰ + ۶۶۴ قیمت: ۲۷/۵۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

پروفیسر محمد ایوب قادری

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

نجیب آباد (ضلع بجنور، صوبہ یوپی) کا مشہور قصبہ ہے۔ اس کو نواب نجیب الدولہ نے آباد کیا تھا۔ اس زمانے کی کئی تاریخی عمارتوں کے کھنڈر آج بھی بے ثباتیٔ عالم کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ نواب نجیب الدولہ نے دہلی کی سیاست میں مثبت کردار ادا کیا اور ۱۷۶۱ء کی پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ نجیب الدولہ کے دورِ اقبال میں تیرہ، سوات و باجوڑ وغیرہ کے بہت سے قسمت آزما روہیل کھنڈ میں آ گئے۔ ان ہی میں ایک صاحب سید شاہ خاں بھی تھے۔ وہ ہندوستان پہنچ کر نواب نجیب الدولہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے۔ حسبِ ضرورت فوجی و انتظامی خدمات انجام دیں۔ نہ معلوم کیا اسباب ہوئے کہ سید شاہ خاں اپنے دو خورد سال بچوں احمد شاہ خاں اور ضامن شاہ خاں کو ہندوستان میں چھوڑ کر تیرہ واپس چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے ماموں احمد خاں کی سرپرستی میں پرورش و تربیت پائی۔ اپنے باپ کی طرح نواب نجیب الدولہ کے جانشینوں کی سرکار میں خدمات انجام دینے لگے اور اکثر مواقع پر بہادری و جواں مردی کا مظاہرہ کیا۔

ضامن شاہ خاں کے بیٹے مظفر شاہ خاں ہوئے جنھوں نے عہدِ انگریزی کی کفر سامانیاں دیکھیں۔ خاندانِ نجیب الدولہ کی بربادی اور زبوں حالی ان کی نظروں سے گزری۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہائلہ اُن کے سامنے رونما ہوا جس میں انھوں نے مردانہ وار حصہ لیا۔ نواب محمود خاں نے مظفر شاہ خاں کو نجیب آباد کے حدود شمالی (ہلدو کھاتہ) کا نگران مقرر کیا تھا۔

انگریزوں نے کامیاب ہونے کے بعد سخت انتقام لیا۔ بعد از خرابی بسیار مظفر شاہ خاں کی رہائی عمل میں آئی مگر جائداد ضبط ہو گئی اور مکانات ڈھا دیے گئے۔ ان ہی مظفر شاہ خاں کے بیٹے مولوی نادر شاہ خاں ہوئے جو تقریباً ۱۸۴۶ء میں نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ نادر شاہ خاں نہایت جری و بہادر تھے۔ ان کی تعلیمی کیفیت اور تحصیلِ علم کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی مگر فارسی میں انھیں اعلیٰ دسترس حاصل تھی اور عربی سے بھی واقف تھے۔ وہ جنگلات کے ٹھیکے لیتے تھے۔ فکر و نظر کے اعتبار سے ولی اللہی خاندان سے وابستہ تھے اور اسی فکری ماحول

میں ان کی تربیت ہوئی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں مولوی نادر خاں شاہ کا انتقال ہوا۔

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، مولوی نادر شاہ خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں قصبہ نجیب آباد محلہ پٹھان پورہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور فارسی ادب کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ مڈل سکول کا امتحان پاس کیا۔ عربی کی تعلیم متوسطات تک ہوئی مگر مطالعہ نے اس نصابی کمی کو پورا کر دیا۔ قرآن پر بڑا عبور حاصل تھا۔ حسبِ ضرورت علمِ طب بھی پڑھا۔ انگریزی میں خط و کتابت کر لیتے تھے، ان کی طبیعت کو شعر گوئی سے بھی مناسبت تھی۔ حکیم جمشید علی خاں اختر دہلوی سے مشورۂ سخن کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

سچ ہے اکبر تیری اصلاحِ غزل کے واسطے اخترِ شیریں سخن جیسا سخنور چاہیے

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دورِ شباب میں شعر و سخن کا اکثر مشغلہ رہا اور مجلسِ شعر و ادب میں ان کی مرکزی حیثیت ہوتی تھی۔ چنانچہ کہتے ہیں:

کہاں پھر شعر گوئی اور کہاں لطفِ سخن سنجی نجیب آباد میں چرچا یہ اکبر شاہ خاں تک ہے

اکبر شاہ خاں کی نظمیں اور غزلیں ان کے رسالہ عبرت میں شائع ہوئی ہیں جن سے ان کی پختگیِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، اسی شعری ذوق کی وجہ سے اکبر شاہ صاحب کے تعلقات مولانا حسرت موہانی سے بھی ہو گئے۔

تعلیم سے فارغ حاصل کرنے کے بعد مولانا اکبر شاہ خاں تقریباً ۹۸، ۱۸۹۷ء میں صیغہ تعلیم میں منسلک ہو گئے۔ پہلے وہ نجیب آباد کے مڈل اسکول میں ٹیچر رہے پھر وہیں ہائی سکول میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے خلاف آریہ سماج تحریک زوروں پر تھی، شدھی اور سنگھٹن کا ہنگامہ برپا تھا۔ مولانا اکبر شاہ جوشیلے نوجوان تھے، ان کے دل میں مذہب و ملت کا درد تھا۔ ایک آریہ سماجی اپدیشک قصبہ نجیب آباد میں آدھمکا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی شروع کر دی۔ مولانا اکبر شاہ خاں کی حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی جوش میں آئی۔ انھوں نے آریہ اپدیشک سے ٹکر لی۔ مباحثہ و مناظرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ آریہ ایک گرگ باراں دیدہ اور مولانا ایک ناتجربہ کار نوجوان، بات بنتی نظر نہ آئی۔ اتفاق سے اسی دوران میں ان کو اس زیرِ موضوع پر مرزا صاحب قادیان کی کوئی کتاب ہاتھ لگ گئی، انھوں نے اس کتاب کے مطالب ذہن نشین کر لیے، آریہ سماجی کو مباحثہ میں مات دے دی اور اسے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

اگرچہ اس معرکے میں مولانا اکبر شاہ خاں کو کامیابی نصیب ہوئی مگر وہ خود ایک جال میں پھنس گئے۔ اس زمانے

میں قادیانی تحریک زوروں پر تھی، ممکن ہے کوئی مبلغ بھی محرک ہوا ہو۔ غرض مولانا اکبر شاہ خاں قادیان پہنچ گئے۔ مرزائیت کے زمرے میں شامل ہوگئے اور حکیم نورالدین سے متاثر ہوکر اس کے گرویدہ ہوگئے، وہیں ملازمت کرلی۔ ب اکبر شاہ خاں نجیب آبادی سے قادیانی ہوگئے۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء تک وہ قادیان میں رہے۔ تقریباً پانچ سال تک مدرسہ تعلیم الاسلام قادیان میں مڈل اور انٹر کی جماعتوں کو اردو اور فارسی پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد مدرسہ تعلیم الاسلام کے بورڈنگ سپرنٹنڈنٹ ہوگئے۔ مولانا اکبر شاہ خاں اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے بعد زیادہ وقت حکیم نورالدین کے درس یا مطب میں گزارتے تھے یا پھر سیالو قرآن کریم کا درس دیتے تھے۔

چونکہ مولانا اکبر شاہ خاں کی وابستگی بڑی حد تک حکیم نورالدین سے تھی لہٰذا حکیم صاحب کے فوت ہوجانے کے بعد ان کا قادیان میں رہنا مشکل ہوگیا اور وہ وہاں کے نظام سے کشیدہ خاطر ہوکر "لاہوری جماعت" سے وابستہ ہوگئے۔ انھوں نے قادیان کے ناخوشگوار ماحول اور مرزا بشیرالدین محمود کے نامناسب رویہ کی شکایت اپنے اکثر خطوں میں مولوی محمد علی ایم۔ اے اور ڈاکٹر بشارت احمد سے کی ہے۔

قادیانی جماعت سے انقطاع کرکے مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آباد چلے آئے مگر لاہوری جماعت نے ان کو پھر بلا لیا اور وہ وسط ۱۹۱۵ء تک لاہور میں رہے۔ اس دوران میں وہ اشاعت اسلام کالج لاہور میں تاریخ کے استاد اور "پیغام صلح" لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں مولانا نجیب آبادی کا تعلق لاہوری جماعت سے بھی ختم ہوگیا اور انھوں نے اپنے آبائی مذہب اہل سنت کی طرف رجوع کرلیا اور ان لوگوں سے کوئی رابطہ و واسطہ نہ رکھا۔ اور وہ بھی مولانا اکبر شاہ خاں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول گئے۔ اس سلسلے میں مولانا اکبر شاہ خاں کا ایک مختصر سا بیان یکم نومبر ۱۹۳۵ء کو "مدینہ" بجنور میں شائع ہوا ہے جسے یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

"میرے ایک دوست کو حال ہی میں کسی قادیانی صاحب کی صحبت کا موقع ملا۔ وہ قادیانی علم کلام اور قادیانی دلائل سے بہت کچھ متاثر اور قادیانی مخصوص عقائد کو غالباً قبول کرچکے ہیں۔ میرے پاس انھوں نے چند سوالات لکھ کر بھیجے ہیں، جن کی زبان اور لہجے میں تعریضات بھی نشتر زن ہیں۔ میں شاید ان کے نشتر کی نسبت اپنی تلوار کی نوک سے زیادہ سلیقہ سے کام لے سکتا ہوں، لیکن اس جراحی اور فصادی سے میرا جی متلاتا ہے، صرف نفس مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ان کے پہلے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ "تو قادیان میں کئی سال تک قادیانی بن کر رہا۔ اب قادیانیت سے کیوں منحرف ہے۔ کیا یہ متلون مزاجی اور رائے کی کمزوری نہیں۔" اس قسم کا سوال مجھ سے مولانا حکیم اللہ صاحب بجنوری مرحوم نے بھی کیا تھا۔ میں نے ان کے پاس جواب میں یہ مشہور شعر

لکھ کر بھیج دیا تھا :

زنقص تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز — دلت فریب گر از جلوہ سراب نخورد

اتفاق سے ۱۹۱۵ء میں آگرہ اور اس کے نواح میں آریوں کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ نومسلم راجپوتوں میں آریوں نے ایک منصوبے کے تحت کام شروع کر دیا۔ ان سرگرمیوں کا حال سن کر مولانا اکبر شاہ خاں کا خون کھول گیا۔ اور انھوں نے چار ماہ کا ایک تبلیغی پروگرام بنایا۔ مولانا نے نجیب آباد، منڈاور، بجنور، نگینہ، مرادآباد، علی گڑھ، شکوہ آباد، مین پوری، فتح گڑھ، فرخ آباد، قنوج، کانپور اور مضافات کا دورہ کیا۔ حالات کا جائزہ لیا۔ آریوں کا رد تبلیغ کیا۔ اس وقت کے رسائل صحیفہ (بجنور)، المشیر (مرادآباد)، المیزان (علی گڑھ) وغیرہ نے مولانا اکبر شاہ خاں کی ان تبلیغی خدمات کو سراہا اور ان کی تبلیغی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

جب مولانا اکبر شاہ خاں تبلیغی دوروں سے واپس آئے تو انھوں نے نجیب آباد سے ایک تاریخی ماہ نامہ "عبرت" جنوری ۱۹۱۶ء میں جاری کیا اور مارچ ۱۹۱۷ء تک یہ رسالہ نکلتا رہا۔ اس میں علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں مولانا نجیب آبادی پھر لاہور آ گئے اور ۱۹۲۱ء کے وسط تک وہاں ان کا قیام رہا۔ اس مرتبہ وہ دیال سنگھ کالج، مسلم ہائی اسکول اور میسنیز لوکل کیمبرج کالج میں اردو اور فارسی کے استاد رہے۔ ہوسٹل کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔ ہوسٹل میں وہ پانچوں وقت نہایت باقاعدگی سے باجماعت نماز پڑھتے تھے اور امامت خود کرتے تھے۔ نماز فجر کے بعد نصف گھنٹہ قرآن مجید کا درس، نماز عشا کے بعد امام غزالی کی احیاء علوم الدین کا درس دیتے تھے۔ طلبا کو ہمیشہ ورزش کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں وہ ایک اخبار "منصور" لاہور کے مدیر بھی رہے۔

ان ہی دنوں مولانا ظفر علی خاں گرفتار ہوگئے۔ انھوں نے اپنے صاحبزادے اختر علی خاں کی معرفت مولانا اکبر شاہ خاں کو پیغام بھیجا۔

"میں پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں اور اب بھی ایک قیدی کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ آپ دفتر زمیندار میں تشریف لے جائیں اور اس کام کو سنبھالیں۔"

یہ پیغام سنتے ہی مولانا اکبر شاہ خاں نے کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور اخبار زمیندار کو سنبھال لیا۔ تقریباً ایک سال تک زمیندار سے وابستہ رہے۔ اس زمانے کے کثیر واقعات پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم (متوفی ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء) نے راقم الحروف کو سنائے، جن سے مولانا نجیب آبادی کی فرض شناسی، احساس ذمہ داری، صاف

معیشت اور چھوٹوں سے شفقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کے وسط میں وہ زمیندار کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر نجیب آباد آگئے اور اپنا رسالہ "عبرت" دوبارہ نومبر ۱۹۲۱ء میں جاری کر دیا جو دسمبر ۱۹۲۲ء تک چلتا رہا۔

مولانا اکبر شاہ خاں کا رسالہ "عبرت"، علمی و تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ تھا اگرچہ رسالے میں زیادہ تر مضامین خود مولانا اکبر شاہ خاں کے ہوتے تھے مگر اس دور کے نامور اہل قلم اور دانشور مثلاً مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا اسلم جے راج پوری، آغا رفیق بلند شہری، پروفیسر جمیل الرحمٰن، خلیل الرحمٰن، مولوی ابوالحسن بدایونی، مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی بھی "عبرت" میں لکھتے تھے۔ کبھی کبھی علامہ اقبال بھی توجہ فرماتے تھے اور اپنا کلام اشاعت کے لیے بھیجتے تھے۔ وہ "عبرت"، کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ اپنے ایک خط مورخہ ۱۷ مئی ۲۲ء میں لکھتے ہیں:

"عبرت بڑا مفید کام کر رہا ہے۔ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں، انشاء اللہ آپ کا پرچہ ضرور چمکے گا۔"

علامہ اقبال ایک اور خط مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں:

"امیر خاں پر آپ نے خوب مضمون لکھا، خدا تعالیٰ اس کے جانشینوں کو بھی ہدایت دے کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے دست کش ہو جائیں حضرت ابوبکر صدیق پر بھی خوب مضمون لکھا گیا ہے، میں نے ان کی زندگی کے تمام واقعات ایک شعر میں جمع کر دیے ہیں۔

ہمتِ او کشتِ ملت را چو ابر ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر

مولانا نجیب آبادی کے ایک مضمون پر علامہ نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۵ء میں اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

"میں دو سال سے بیمار ہوں۔ بہت کم لکھتا پڑھتا ہوں مگر آج آپ کا مضمون جو "احسان" میں شائع ہوا ہے، دیکھ کر بے اختیار دل چاہا کہ آپ کو اس مضمون پر مبارک باد لکھوں۔ نہایت عمدہ مضمون ہے۔ مجھ سے بے شمار لوگوں نے اس کی تعریف کی ہے۔ اب آپ کے لیے ایک مضمون لکھنا باقی ہے یعنی مسئلہ جہاد کی تاریخ ہندوستان میں، اس کو صرف آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔"

رسالہ "عبرت" میں کتابوں اور رسالوں پر تبصرے توجہ اور محنت سے لکھے جاتے تھے۔ مولانا نجیب آبادی "عبرت" کا آغاز بالعموم خطبہ ماثورہ اور دعا کے ساتھ کرتے تھے۔ "عبرت"، میں شائع شدہ کئی مضمون اپنی مقبولیت و افادیت کی وجہ سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

عبرت ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا لوگ اس کے مشتاق رہتے تھے، اس زمانے کے رسائل و جرائد نے

"عبرت" کا خیر مقدم کیا اور پسندیدہ تبصرے کیے، یہاں تک کہ شتسو دھک کے نام سے "عبرت" کے گجراتی میں ترجمہ کرنے کی تحریک ہوئی مگر افسوس کہ "عبرت" ایک شعلہ مستعجل ثابت ہوا۔

اس زمانے میں شدھی اور سنگھٹن کی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئیں۔ مشہور آریہ لیڈر شردھانند کی قید سے رہائی وائسرائے سے ملاقات کے بعد عمل میں آئی اور ہر طرف شدھی کا نرسنگھا بجنے لگا۔ ہندوستان کی فضا مکدر ہو گئی۔ ان حالات کو دیکھ کر مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی بے چین ہو گئے اور آریوں کے توڑ کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑے۔ چھ ماہ مسلسل (جنوری ۱۹۲۳ء تا جون ۱۹۲۳ء) تبلیغی دوروں میں رہے۔ اس مرتبہ ان کے ہمراہ نجیب آباد کے چند ہم خیال رفقا ڈاکٹر عبدالحمید خاں، مولوی محمد اسماعیل خاں اور حافظ عبدالخالق بھی تھے۔ ان لوگوں نے تبلیغ کا کام خوب کیا اور اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ جب مولانا اکبر شاہ خاں تبلیغی دوروں سے واپس آئے تو انھوں نے نجیب آباد میں مستقل قیام رکھا اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے طے کیا کہ مسلمانوں کو ان کے شاندار تاریخی کارناموں اور تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔ اس طرح تاریخ سے روشناسی اور آگاہی ان کی بیداری اور تعمیرِ ملت میں بڑی مددگار ثابت ہوگی۔ اگرچہ اس موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے لاہور، مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ اور جنرل نادر خاں (والی افغانستان) نے کابل بلانا چاہا مگر مولانا اکبر شاہ خاں نے نجیب آباد میں رہ کر تصنیف و تالیف کے کام کو ترجیح دی۔ ان کے بعض احباب نے جن میں سر راس مسعود، علامہ اقبال اور نواب اکبر خاں آف ہوتی شامل تھے، کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ نجیب آباد سے نکل کر لاہور، بھوپال، حیدرآباد یا علی گڑھ آ جائیں مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایک مرتبہ ریاست حیدرآباد نے بھی انھیں اپنے یہاں بلایا لیکن وہ نہیں گئے۔

مولانا اکبر شاہ خاں نے تیرہ چودہ سال جم کر کام کیا اور اُردو زبان کے تاریخی و علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ جو کام علمی اداروں اور انجمنوں کے کرنے کا تھا وہ مولانا نے تن تنہا کر دکھایا۔ جون ۱۹۳۷ء میں ان کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دست اور سوء ہضمی کا عارضہ لاحق ہوا۔ علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں وہ تبدیلیِ آب و ہوا کی غرض سے جوالاپور گئے مگر بے سود، وقتِ موعود آ چکا تھا۔ ۱۰ مئی ۱۹۳۸ء کو عظیم مؤرخ و مصنف مولانا اکبر شاہ خاں نے عالمِ آخرت کی راہ لی۔ نعش جوالاپور سے نجیب آباد لائی گئی اور محلہ ضابطہ گنج کی سرور والی مسجد کے جانبِ غرب تدفین عمل میں آئی۔

مولانا اکبر شاہ خاں کی سپاہیانہ زندگی تھی۔ کھدر کا لباس ہوتا تھا۔ عام طور سے قمیص، شلوار اور شیروانی پہنتے

تھے، کبھی کبھی پگڑی بھی باندھتے تھے۔ جہاد کی آرزو اور شوق رہتا تھا۔ گدر، لاٹھی، تلوار، کمان، تیر، غلیل اور کتابیں ان کی محبوب اشیا تھیں۔ مولانا کے پاس ایک اچھا کتب خانہ تھا۔

قد لمبا، جسم بھرا ہوا، سر صاف، چوڑی پیشانی، آنکھیں بڑی بڑی، گھنی داڑھی، متین چہرہ، آواز بلند، چال تیز، صبح کو دو میل بھاگتے تھے، لاہور سے جہانگیر کے مقبرے تک پا پیادہ جانا اور واپس آنا ان کا معمول تھا۔ تیراکی بھی بہت اچھے تھے۔ نبوٹ اور گتکے میں اچھی خاصی مہارت تھی۔ کبھی کبھی شوق میں اسکول کے میدان میں خود اپنے ہاتھ سے اس فن کے کرتب دکھاتے تھے۔ مولانا کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ مکان کچا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے مکان کی دیوار اونچی کرنے کو کہا تو مولانا نے فرمایا کہ مسلمان کی حفاظت خدا کرتا ہے۔

مولانا اکبر شاہ خاں کی سادہ زندگی کا یہ انداز تھا کہ جب امام شاہ لعل شاہ ایڈیٹر شنسودھک (گجراتی) نے مولانا سے سوانح عمری لکھنے کی درخواست کی تو انھوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں جواب دیا۔

"مکمل سوانح عمری یہ ہے کہ مشت خاک یا قطرۂ ناپاک سے پیدا ہوا ہوں۔ مرنے کے بعد گل سڑ کر کھاد، کیڑوں کی غذا، خاک کے ذرات، ہوا کا غبار بننے والا ہوں۔ اب تک زندگی کا اکثر حصہ غفلت میں گزرا۔ بقیہ ایام کی نسبت کچھ نہیں جانتا۔ خاتمہ کے بخیر ہونے کی آرزو رکھتا ہوں۔ اپنے گناہوں کو دیکھتا ہوں تو ڈرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کے رحم و فضل و کرم و مغفرت و ستاری پر نظر کرتا ہوں، تو امید و حسرت سے لبریز ہو کر بہشت بریں کو اپنی جاگیر یقین کرتا ہوں، اگر خدا نخواستہ مجھ کو میری غفلتوں اور گناہوں کی سزا دی گئی تو چیونٹے اور حشرات الارض مجھ سے اچھے ہیں لیکن اگر مجھ سے عفو و عطا کا سلوک ہوا اور جنت مل گئی تو میں دنیا کے ہزارہا بادشاہوں سے زیادہ ذی عزت اور بلند مرتبہ ہوں۔ میرے مورث اعلیٰ کا نام آدم تھا، جس کو فرشتے سجدہ کرتے تھے اور میرے روحانی باپ کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو خیر البشر، سید الرسل، خاتم النبیین رحمۃ للعالمین ہیں، باقی اس سے زیادہ تفصیل کے لیے گزارش ہے کہ:

اے روزگار دیدہ گزار زچون و چند | ہیچم و ہیچ را نخرد ہیچ کس بہیچ

اب ہم مولانا اکبر شاہ خاں کے تصنیفی و تالیفی کام کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ تاریخ نجیب آباد: ۱۹۰۱ء میں ایک مختصر سی کتاب نجیب آباد، نواب نجیب الدولہ اور ان کی اولاد کے حالات میں لکھی۔ یہ مولانا نجیب آبادی کی پہلی تالیف ہے اور گوہر ہند پریس نجیب آباد ہی سے شائع ہوئی۔ اس

مضمون کو مولانا نے نظر ثانی کے بعد "مد عبرت" کی چار اشاعتوں فروری ۱۹۱۶ء تا مئی ۱۹۱۶ء میں دوبارہ شائع کیا۔

۲۔ ورزش جسمانی : ورزش جسمانی کے موضوع پر انھوں نے یہ کتاب دل چسپ انداز میں لکھی ہے۔ اس میں بعض ورزشوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے اور ہلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نور الدین : حکیم نورالدین نے اپنے حالات مولانا نجیب آبادی کو خود املا کرائے، ان کی ترتیب و تہذیب کے بعد یہ کتاب پہلی مرتبہ میگزین پریس قادیان سے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ بعد کو لاہوری پارٹی شائع کرتی رہی۔

۴۔ اردو زبان دانی : اردو زبان دانی کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ لکھا جس میں اردو زبان کے قواعد لکھے ہیں۔ یہ کتاب طلبا کی نصابی ضرورت سے تالیف کی۔ حمیدیہ سٹیم پریس لاہور سے اپریل ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ اکابر قوم : اس چھوٹے سے رسالے میں انھوں نے علما، امرا اور فقرا کے پوست کندہ حالات بیان کیے ہیں، پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔ یہ رسالہ صوفی اینڈ کمپنی پنڈی بہاالدین سے کئی مرتبہ شائع ہوا۔

۶۔ مذہب اور تلوار : مولوی محمد علی ایم اے کی تحریک پر یہ کتاب تالیف کی، انھوں نے تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اسلام کی سیدھی سادی تعلیم کا یہ اعجاز تھا کہ اسلام دنیا میں پھیلا۔ محمد علی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرکے گاندھی جی کو پیش کیا۔ فروری ۱۹۱۹ء میں پنڈی بہاالدین سے یہ کتاب شائع ہوئی۔

۷۔ غنی کشمیری : محمد طاہر غنی کشمیری کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر ایک مختصر سی کتاب لکھی جسے فوق کشمیری نے رجب ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء میں جارج اسٹیم پریس میں طبع کرا کے شائع کیا۔

۸۔ سپاہیانہ زندگی : مولانا نجیب آبادی ایک سپاہی قبیلے کے فرد تھے، بہادری و جانبازی ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ انھوں نے اپریل ۱۹۲۳ء میں ایک تبلیغی سفر کے دوران یہ کتاب لکھی۔

۹۔ تاریخ اسلام (تین حصے) : تاریخِ اسلام کی تالیف مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے نہایت محنت اور تحقیق سے تاریخِ اسلام تین حصوں میں لکھی۔ پہلے حصے میں عہدِ جاہلیت سے لے کر خلافتِ راشدہ تک کا بیان ہے۔ دوسرا حصہ عہدِ بنو اُمیہ اور بنو عباس پر مشتمل ہے، اس میں مسلمانوں کے عہدِ کشور کشائی، تمدن آفرینی اور قیادتِ علمی کے عروج کی مکمل داستان بیان کی ہے۔ تیسرے حصے میں اندلس مراکش، افریقہ، مصر، ایران، شام وغیرہ کی اسلامی سلطنتوں کے حالات شرح و بسط سے بیان ہوئے ہیں، اس میں

بنو امیہ (اندلس)، دولتِ صفاریہ، سلجوقیہ، عثمانیہ، مغولانِ چنگیز اور خوارزم شاہیہ کا تذکرہ بھی تفصیل سے ملتا ہے۔
یہ کتاب محرم ۱۳۴۳ھ میں مکمل ہوئی۔ "تاریخ اسلام" تاریخی نام ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن بنڈت ہارالدین سے شائع ہوا۔ اب نفیس اکیڈیمی کراچی نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

۱۰۔ حجۃ الاسلام : اس کتاب میں اسلام کی بنیادی تعلیم بیان کی گئی ہے اور تبلیغ اسلام کے بہترین طریقے بتائے گئے ہیں۔ یہ کتاب خاص مقبول ہوئی۔ حجۃ الاسلام پڑھ کر علامہ اقبال نے سو روپیہ مولانا نجیب آبادی کو بھیجے کہ حجۃ الاسلام کے نسخے مستحق لوگوں کی خدمت میں بلا قیمت بھیجے جائیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

۱۱۔ آئینہ حقیقت نما : یہ کتاب تاریخ تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے مسلمان بادشاہوں پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں اس کتاب میں ان کے محققانہ و مجتہدانہ جواب دیے گئے ہیں۔ محمد تغلق کے دور پر نہایت وضاحت و صراحت سے لکھا گیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۲۸-۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں نفیس اکیڈیمی کراچی نے دوبارہ شائع کیا۔ ڈاکٹر سید محمود (بہار) نے جیل میں اس کتاب کے کچھ حصے کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا مولانا محمد علی جوہر نے یہ کتاب تحفۃً گاندھی جی کو پیش کی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے اسے پڑھنے کے بعد فرمایا کہ اگر میں صاحبِ استطاعت ہوتا تو مولانا اکبر شاہ خاں کو موتیوں میں تول دیتا۔

۱۲۔ پردہ پر ایک نظر : یہ رسالہ انھوں نے اس وقت لکھا تھا جب امیر امان اللہ خاں یورپ کی سیاحت کر کے افغانستان آئے تھے اور اخباروں میں پردہ کے متعلق بکثرت مضامین لکھے جا رہے تھے۔

۱۳۔ خان جہاں لودھی : اس کتاب میں فاضل مؤلف نے عہدِ جہاں گیری کے بہادر سپہ سالار خان جہاں لودھی کی زندگی کے حالات دلچسپ اور بصیرت افروز انداز میں لکھے ہیں۔

۱۴۔ خواص خاں ولی : شیر شاہ سوری کے مشہور سپہ سالار خواص خاں ولی کے حالات محنت اور تحقیق سے لکھے ہیں۔ یہ رسالہ جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

۱۵۔ قولِ حق : اس کتاب میں ملتِ اسلامیہ کے زوال کی مجمل تاریخ بیان کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ کن کن فرقوں نے ملتِ اسلامیہ کی بیخ کنی میں کیا کیا کردار ادا کیا ہے، اور مسلمانوں کی قائم شدہ سلطنتوں اور حکومتوں کو مٹانے میں مجوسیوں اور عجمیوں نے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں۔ قولِ حق کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۹ء میں نجیب آباد سے اور ۱۹۴۹ء میں دوسرا ایڈیشن نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن حافظ محمد اکیڈیمی

کراچی کی طرف سے راقم الحروف کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

۱۶۔ جنگِ انگورہ : اس کتاب میں تیمور اور سلطان بایزید یلدرم کی مشہور جنگِ عظیم کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایشیائے کوچک اور متصلہ ممالک کا جغرافیہ، تیمور اور اس کے خاندان کے حالات، بایزید یلدرم اور خاندانِ عثمانیہ کی ابتدائی تاریخ، سلاجقہ روم کے حالات اور سلطنتِ عثمانیہ کے سامنے یورپ کے حکمرانوں کے بے حیثیت ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ مضمون عبرت میں لکھا گیا بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۱۷۔ نواب امیر خاں : ریاست ٹونک کے بانی نواب امیر خاں کے حالات اختصار سے قلم بند کیے ہیں۔ پہلے یہ مضمون ماہنامہ "عبرت" میں نکلا تھا۔ پھر اپریل ۱۹۳۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا

۱۸۔ مسلمانانِ اندلس : اس مختصر سی کتاب میں اندلس میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۔ باطل شکن : ایک پادری نے تاویل القرآن کے نام سے ایک کتاب لکھ کر مسلمانوں میں تقسیم کی اور ان کو ورغلایا۔ مولانا نجیب آبادی نے اس کتاب کا مسکت جواب باطل شکن کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔

۲۰۔ مقدمہ تاریخِ ہندِ قدیم : یہ کتاب علمِ تاریخ پر مختصر مقدمہ ہے۔ اس میں ہندوستان کے عہدِ قدیم کی تاریخ کے علمی اصول اور آریہ قوم کی تحقیق پر عالمانہ اور محققانہ بحثیں ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

۲۱۔ معیار العلما : اس کتاب میں بتایا ہے کہ علمائے سُو اور پیشہ ور پیروں سے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔ یہ کتاب دسمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔

۲۲۔ نظامِ سلطنت : یہ نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس میں ناقابلِ انکار دلیلوں اور تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ دنیا کے تمام حکومتی نظام انسان کو حقیقی امن و راحت اور عدل و مساوات دینے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ یہ برکات صرف اسلامی نظام ہی دے سکتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔

۲۳۔ اسلام اور اچھوت اقوام : ہندو معاشرے میں اچھوتوں کی حالت جانوروں سے بدتر رہی ہے۔ مولانا نجیب آبادی نے اس رسالے میں بتایا ہے کہ اسلام میں ان کا مستقبل کتنا درخشاں ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

۲۴۔ فصل الخطاب : مولانا اکبر شاہ خاں کچھ دنوں تک خاکسار تحریک سے وابستہ رہے۔ لیکن جب خاکسار لیڈر عنایت اللہ مشرقی کے افکار و اعمال اور اندرونی نظام سے واقف ہوئے تو انھوں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی

اور مشرقی کی کتاب "قولِ فیصل" کا جواب "فصل الخطاب" کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب مئی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔

۲۵۔ حجِ بیت اللہ : ترغیبِ حج کی غرض سے یہ رسالہ لکھا گیا ہے تاکہ وہ لوگ جو حج کی استطاعت کے باوجود اس فریضہ سے محروم رہتے ہیں، حج کی سعادت حاصل کرسکیں۔ مدینہ پریس بجنور میں یہ رسالہ طبع ہوا۔

۲۶۔ گائے اور اس کی تاریخی عظمت : گائے ہندوستان میں ایک مابہ النزاع مسئلہ رہی ہے، اس کے نام پر مذہبی و سیاسی ہنگامے ہوتے ہیں۔ مولانا نجیب آبادی نے "عبرت" میں ایک مضمون لکھا اور تاریخ کی روشنی میں اس مسئلے کا تجزیہ کیا۔ بعد ازاں یہ مضمون کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۲۷۔ وید اور اس کی قدامت : مولانا نجیب آبادی نے اس موضوع پر ایک تاریخی مضمون "عبرت" میں کئی قسطوں میں لکھا تھا جو بعد کو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے وید کی قدامت پر محققانہ تبصرہ کیا ہے اور ویدوں کی قدامت کا راز علمی دلائل کی روشنی میں منکشف کرکے دکھایا ہے۔ یہ کتاب یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپی ہے۔

۲۸۔ ہندو مسلمانوں کا اتفاق : اس عنوان سے مولانا نجیب آبادی نے ایک مفصل مضمون پیغام صلح (لاہور) میں کئی قسطوں میں لکھا تھا۔ اپریل ۱۹۱۶ء کے عبرت میں ایک اعلان چھپا کہ یہ مضمون نظرثانی و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شائع ہورہا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ اعلان عملی صورت اختیار نہ کرسکا۔

۲۹۔ مسلمانانِ ہند کی تعلیم و ترقی : آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) کے آنریری سکریٹری نے مسلمانانِ ہند کی تعلیم و ترقی کے بارے میں ایک سوال نامہ شائع کیا تھا۔ مولانا نجیب آبادی نے اس کے جواب ایک رسالے کی صورت میں لکھے۔

مولانا اکبر شاہ خاں نے چند رسالے بعض مصالح کے تحت اپنے اعزہ کے نام شائع کیے ہیں اگرچہ وہ رسالے تمام تر مولانا کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ (۱) احقاقِ حق (گاندھی جی کی سوانح عمری "تلاشِ حق" پر تبصرہ)۔ (۲) تاریخِ مرہٹہ۔ (۳) لا الہ الا اللہ۔ محمد ادریس خاں کے نام سے اور (۴) اورنگ زیب عالم گیر دوسروں کی نظر میں" محمد ایوب خاں کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تصنیفات سے اردو زبان میں قابل قدر اضافہ ہوا، علامہ اقبال اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۳۵ء میں "نظامِ سلطنت" کی رسید دیتے ہوئے مولانا نجیب آبادی کی تصانیف پر مندرجہ ذیل مختصر مگر جامع تبصرہ فرمایا ہے:

"بڑی مدت کے بعد آپ کی خیریت معلوم ہوئی اور کتاب بھی ملی۔ بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ایک سال سے صاحبِ فراش ہوں۔ تمام مشاغل ترک ہیں تاہم آپ کی کتاب کی ورق گردانی کی اور اسے مفید پایا۔ آپ کی تصانیف اردو لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس سے تمام پڑھنے والوں کے نقطۂ نگاہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہی اس ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر امان اللہ خاں

محسنِ انسانیت اور تعمیرِ شخصیت

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتب و الحکمۃ ج و ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (۳ : ۱۶۴)

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر احسان کیا جب کہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے رسول کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور انھیں پاکیزہ بناتے ہیں، انھیں کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور دانائی کی باتیں سکھاتے ہیں، اور وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں سے تھے۔

بقول سید ابوالحسن علی ندوی: انسانیت کے مسائل اور مشکلات کا حل نہ لباس کی یکسانی ہے، نہ زبان اور تہذیب کا اشتراک، نہ ملک و وطن کی وحدت، نہ علم و دولت، نہ تہذیب و تنظیم، نہ وسائل و ذرائع کی کثرت، ان سب میں کوئی ایک بھی ایسی طاقت نہیں جو دنیا کو بدل دے۔ جب تک دل کی دنیا نہیں بدلتی باہر کی دنیا نہیں بدل سکتی، پوری دنیا کی باگ ڈور دل کے ہاتھ میں ہے، زندگی کا سارا بگاڑ دل کے بگاڑ سے شروع ہوا ہے، لوگ کہتے ہیں، مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے، میں کہتا ہوں، انسان دل کی طرف سے سڑتا ہے۔ یہاں سے بگاڑ شروع ہوتا ہے اور ساری زندگی میں پھیل جاتا ہے۔ پیغمبر یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ سب دل کا قصور ہے، انسان کا دل بگڑ گیا ہے، اس کے اندر چوری، ظلم، دغابازی کا جذبہ اور ہوس پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے اندر خواہش کا عفریت ہے جو ہر وقت اس کو نچا رہا ہے، اور وہ بچے کی طرح اس کے اشارے پر حرکت کر رہا ہے۔ پیغمبر کہتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ انسان پاپی ہوگیا ہے، اس لیے سب سے ضروری اور مقدم کام یہ ہے کہ اس کے دل کی اصلاح کی جائے اور اس کے من کو مانجھا جائے۔[1]

پروفیسر وائٹ ہیڈ نے بھی اسی بات کو ایک دوسرے انداز میں یوں بیان کیا ہے: "تہذیب و شائستگی

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی، تعمیرِ انسانیت (کراچی، تاریخ نامعلوم) صفحات ۱۹، ۲۰۔

فکر کی ریاضت و حسن اور انسان دوستی کے جذب و قبول کی صلاحیت سے عبارت ہے۔ معلومات کے بے کار طوماروں سے اُسے کچھ سروکار نہیں ہے۔ خدا کی خدائی میں اس شخص سے زیادہ مغز چٹ کوئی نہیں ہوگا جسے محض معلومات کا پلندہ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ ایسے انسان تیار کیے جائیں جو ایک طرف تو تہذیب و ثقافت کے پُتلے ہوں اور دوسری طرف علم کے کسی مخصوص شعبے میں ان کی معلومات ماہرانہ ہوں۔ یہ ماہرانہ علم ان کی مزید ترقی کا نقطۂ آغاز بنے گا اور ان کی ثقافت ان میں فلسفہ کی سی گہرائی اور فن کی سی بلندی پیدا کر دے گی۔[۲]

"طالب علم زندہ مخلوق ہیں اور تعلیم کی غرض و غایت یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی نشو و نما کو تحریک میں لا کر اس کی رہنمائی کی جائے۔ اس قضیے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اساتذہ کو بھی زندہ اور جاندار افکار کا حامل ہونا چاہیے۔"[۳]

تعمیرِ شخصیت کے لیے جن بنیادی باتوں کی ضرورت تھی انھیں قرآنِ حکیم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوی فرائض میں داخل کر دیا اور واضح طور پر یہ بیان کر دیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم افرادِ نسلِ انسانی کے نفوس کو پاکیزہ بناتے، اخلاق کو سنوارتے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ دل کی صفائی اور پاکیزگی کی اہمیت اس قدر ہے کہ ایک طرف تو اُسے نبوی فریضہ قرار دیا گیا ہے، دوسری طرف خود اللہ تعالیٰ نے اس کی عظمت و افادیت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

ونفس وما سوٰها ۝ فالهمها فجورها وتقوٰها ۝ قد افلح من زكها ۝ وقد خاب من دسها۔ (۹۱: ۷-۱۰)

اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اسے ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دی (یا سوجھ دی) اس کی نیکی اور بدی۔ جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ بنا لیا، وہ کامیاب ہوا اور جس نے اُسے مٹی میں ملا دیا وہ ناکام ہوا۔

انسانی شخصیت کی اصلاح اور اس کی تعمیر کے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا:

اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ[۴]

۲۔ اے۔ این۔ وائیٹ ہیڈ، تعلیم کے مقاصد (لاہور ۱۹۶۸)، ص ۱۹ ۳۔ ایضاً، ص ۱۷

۴۔ امام محمد بن اسماعیل البخاری۔ صحیح البخاری (مصر ۱۳۴۵ھ)، کتاب الایمان۔ ج ۱، ص ۲۰

بلاشبہ جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ جب وہ درست ہو جاتا ہے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جاتا ہے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے اور یاد رکھیے یہ انسان کا دل ہے۔

دل کے لیے قرآن حکیم نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ قلب، فؤاد اور نفس وغیرہ، انسان کا دل ایمان کامل اور یقین محکم سے ہی پاکیزہ ہوتا ہے۔

ایمان کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان رجلا سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما الایمان؟ قال اذا سرتك حسنتك وساءتك سیئتك فانت مؤمن، قال: یا رسول اللہ فما الاثم؟ قال اذا حاك فی نفسك شیئ فدعہ [۵۵]

ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے ایمان کی حقیقت کے بارے میں سوال پوچھا۔ حضور نے جواب دیا کہ جب تمھیں نیکی کرنے سے مسرت حاصل ہو اور برائی سے نفرت ہو تو تم مومن ہو۔ سائل نے گناہ کی حقیقت کے بارے میں استفسار کیا تو آنحضرت نے جواب دیا کہ جو شئی تمھارے دل میں چبھن پیدا کرے اسے چھوڑ دو۔

تہذیب نفس اور تحسین اخلاق حقیقت میں ایک ہی چیز ہے۔ اسی لیے آنحضرت نے اپنی بعثت کا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل قرار دیا۔

بعثت لاتمم حسن الاخلاق [۵۶]

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق [۵۷]

امام غزالی نے اپنی مشہور کتاب احیاء علوم الدین نے خلق کی تعریف میں اسی حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔[۵۸]
یوں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی شخصیت کے نشوونما اور انسانیت کی تعمیر کے لیے موثر ترین طریق کار اختیار کیا۔ آپ نے تعلیم کتاب و حکمت سے بھی انسان کی شخصیت کو نشوونما اور ارتقا بخشا اور اپنی

---

۵۵ امام احمد بن حنبل، مسند؛ ولی الدین الخطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح (دمشق ۱۳۸۰ھ)، ج ۱، ص ۲۰

۵۶ امام مالک، الموطا ۵۷ کنز العمال، ج ۱، ص ۵ ۔ مسند احمد ۔ بیہقی

۵۸ حوالے کے لیے دیکھیے: امام غزالی: احیاء علوم الدین (مصر ۱۹۳۹) ج ۳، ص ۵۲

ذاتی عملی مثال بھی اس کے سامنے رکھی۔ "وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" اور "کان خلقه القرآن" کے ذریعے پیغامبر ہادی نے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کا نمونۂ کامل انسانیت کے سامنے رکھا۔ آپ نے دنیا سے بھوک، بیماری اور جہالت کو دور کرنے کا نعرہ بلند کیے بغیر دنیا سے بھوک اور جہالت ختم کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی بے راہ روی کو بھی ختم کر دیا اور اسے ختم کر دینا ہی اپنی رسالت کا مقصود قرار نہیں دیا بلکہ انسانیت کو زیورِ اخلاق و تہذیب اور حسن شرافت سے مزین و آراستہ کرنا اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا۔

اگر تعمیرِ شخصیت اور تعمیرِ انسانیت کے لیے حضور کے ارشادات کی روشنی میں کردار سازی کی طرف توجہ دی جائے تو ہمارے اخلاقی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر ملک

محدثین اور جہمیہ

اسلام کے ابتدائی اعتقادی فرقوں میں سے ایک فرقہ جہمیہ ہے جس کی نسبت اس کے بانی جہم بن صفوان (م ۱۲۸ھ) کی طرف ہے۔ ابتدا ہی سے اس فرقے کے عقائد اس حد تک گمراہ کن سمجھے گئے کہ بقول ابن القیم (م ۷۵۱ھ) اس فرقے کو اسلام کا داخلی دشمن قرار دیا گیا اور اس کے خلاف نبرد آزمائی کو جہاد کہا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ محدثین نے فرقہ جہمیہ کے عقائد کا سختی سے نوٹس لیا اور ہر ممکن طور سے اپنی تحریروں میں ان عقائد کی تردید کی۔ بقول ابن القیم تمام محدثین جہمیہ کے متعلق ایک ہی رائے رکھتے ہیں یعنی یہ کہ ایک گمراہ فرقہ ہے اور اس کی تردید میں حصہ لینا اپنا فرضِ منصبی ہے، لیکن ان عقائد کی تردید میں مختلف طریقے استعمال کیے، جس کی تین صورتیں تھیں، ان میں ایک صورت یہ تھی کہ محدثین عقیدہ جہمیہ کی تردید میں صرف روایتِ حدیث کی تحریر پر اکتفا کرتے تھے[1]

بہر حال اس بارے میں کہ سب سے پہلے وہ کون محدث ہیں جنھوں نے جہمیہ عقائد کی تردید میں کتاب لکھی، یہ کہا جاتا ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) ہیں[2] دوسری بات جو اس سلسلے میں کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جہم بن صفوان صرف ایک عقیدے کا بانی تھا، جو وجودِ باری سے متعلق ہے۔ باقی عقائد جہمیہ کا جہم بن صفوان سے کوئی تعلق نہیں، بعد کے لوگوں نے اس کو وضع کیا اور جہم بن صفوان کی طرف اس کو منسوب کر دیا[3]

اس بات کی خارجی شہادتیں تو بہت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جہم بن صفوان ہی تمام عقائد کا بانی تھا، جس کی تردید احمد بن حنبل سے پہلے کے محدثین کرتے رہے ہیں لیکن نہ تو اس کی کوئی قطعی اور داخلی شہادت پیش کی جا سکی ہے اور نہ اس بات کی کہ احمد بن حنبل سے پہلے کسی محدث نے کوئی مستقل کتاب جہمیہ عقائد کی تردید میں تحریر کی ہے۔ لیکن اب ایک ایسی کتاب دستیاب ہو چکی ہے جو نہ صرف یہ بات

---

[1] ابن القیم: اجتماع الجیوش الاسلامیہ، مطبع ا، م، قاہرہ، ص ۱۱۷

[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، طبع دوم، جلد اوّل۔ ص ۳۸۸

[3] نفس مصدر

ثابت کرتی ہے کہ احمد بن حنبل سے پہلے بھی ایک محدث نے ایک کتاب جہمیہ عقائد کی تردید میں لکھی ہے بلکہ یہ بات بھی ثابت کرتی ہے کہ جہم بن صفوان خود تمام عقائد کا بانی تھا۔

قبل اس کے کہ نفس موضوع سے بحث کی جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے مختصر حالات بیان کر دیے جائیں۔

ابراہیم بن طہمان الخراسانی تقریباً ۱۰۰ھ میں خراسان میں پیدا ہوئے[۵۴]۔ طلب علم کے لیے مختلف علمی مراکز مثلاً کوفہ، بصرہ، شام، بغداد، مکہ اور مدینہ گئے۔ فراغت کے بعد واپس لوٹے اور باشان[۵۵] میں مقیم ہوگئے۔ ابراہیم بن طہمان اپنے وقت کے زبردست محدث تھے[۵۶]، مرجئہ عقیدہ کے قائل اور جہمیوں کے سخت مخالف[۵۷] تھے، ان کی مخالفت کی کیفیت کا اندازہ خطیب بغدادی کے بیان کیا جا سکتا ہے، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ ابراہیم بن طہمان ایک دفعہ حج کے ارادے سے وطن سے روانہ ہوئے اور نیشاپور آئے لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ نیشاپور جہمیوں کا مرکز ہے، اس لیے ابراہیم بن طہمان نے یہ کہتے ہوئے کہ جہمیوں کا مقابلہ کرنا حج سے افضل ہے، سفر حج کو ملتوی کر دیا اور اپنی تمام کوششیں جہمیوں کی تردید کے لیے وقف کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیشاپور سے جہمیوں کا خاتمہ ہوگیا اور تمام لوگ مرجئہ عقیدے کے قائل ہوگئے[۵۸]۔ یہ واقعہ زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ھ کا ہو سکتا ہے۔ اس مرحلے سے فارغ ہو کر حج کے لیے روانہ ہوئے جہاں ۱۶۳ھ میں مکہ مکرمہ میں ان کا انتقال ہوگیا[۵۹]۔

ابراہیم بن طہمان کی تصانیف

ابراہیم بن طہمان مندرجہ ذیل چار کتابوں کے مصنف تھے:

۱۔ کتاب السنن فی الفقہ ۲۔ کتاب المناقب

---

۵۴ الاعظمی، محمد مصطفیٰ: دراسات فی الحدیث النبوی، بیروت ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۸

۵۵ ہرات کے قرب و جوار میں ایک قصبہ ہے، یاقوت الحموی، معجم البلدان، بیروت ۱۹۵۵، جلد ۱، ص ۳۲۲

۵۶ الخطیب البغدادی، تاریخ بغداد، بیروت، جلد ۶، ص ۱۱۰ ۵۷ نفس مصدر: ص ۱۱۰

۵۸ نفس مصدر، ص ۱۰۷۔ فخرج یرید الحج، فقدم نیساپور، فوجدهم علی قوم جهم، فقال: الاقامة علی هولاء افضل من الحج، فاقام، فنقلهم من قول جهمة الی الارجاء۔

۵۹ ابن حجر، تہذیب التہذیب، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۷ھ جلد ۱، ص ۱۳۱۔

(۳) کتاب العیدین (۴) کتاب التفسیر[۱۰]

پروفیسر Sezgin کا بیان ہے کہ ان چاروں کتابوں میں سے کوئی کتاب نہیں پائی جاتی مگر یہ کہ اُن کی ایک اور کتاب ظاہریہ لائبریری دمشق میں پائی جاتی ہے اور جس کا عنوان ہے: الجزء الاوّل والثانی من مشیخة ابراهیم بن طهمان[۱۱]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم بن طہمان مندرجہ بالا چار کتابوں کے علاوہ ایک اور کتاب (یعنی مشیخۃ) کے مصنف تھے جس کا تذکرہ کسی نے نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ابراہیم بن طہمان نے ایک کتاب "کتاب السنن فی الفقه" تصنیف کی تھی تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ کتاب ابراہیم بن طہمان کی "مشیخۃ" اور پانچویں کتاب نہیں ہے بلکہ یہ کتاب "کتاب السنن فی الفقه" ہے جو ابراہیم بن طہمان کی چار تصانیف میں سے ایک ہے۔

مندرجہ دعویٰ کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دلیلیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ "مشیخة" کی خصوصیات کی عدم موجودگی

"مشیخة" اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں مصنف اپنے ان اساتذہ کی فہرست بیان کرتا ہے جن سے وہ بالمشافہ مل چکا ہے اور اُن سے جو جو کتابیں پڑھی ہیں یا پھر ایسے اساتذہ کا بھی ذکر کرتا ہے جن سے مصنف ملا تو نہیں لیکن اُن سے مصنف کو اس بات کی اجازت ملی ہے کہ وہ اس کی فلاں فلاں کتاب کی روایت کر سکتا ہے[۱۲]

مختلف لوگوں نے "مشیخہ" لکھا ہے اور اس میں جو نہج استعمال کیا گیا ہے وہ مختلف ہے لیکن بقول "الاهوانی" مشیخہ لکھنے کے چار ہی طریقے رائج ہیں[۱۳]

---

۱۰ ابن الندیم، الفہرست، بیروت ۱۹۶۴ء، ص ۲۲۸ — البغدادی، اسماعیل پاشا، استنبول (۵۵-۱۹۵۱ء) جلد ۱، ص ۱ — التونکی، محمود حسن، معجم المصنفین، بیروت ۱۹۳۵ء، جلد ۱، ص ۱۶۷، — Sezgin Gas جلد ۱، ص ۹۲

۱۱ Sezgin Gas, Vol. 1, P 92.

۱۲ الکتانی، محمد بن جعفر، الرسالۃ المستطرفۃ، دمشق طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ص ۱۴۰-۱۴۲ - ایضاً ملاحظہ ہو ڈاکٹر اسپرنگر کا مضمون Under des Traditionwesen bei der Arabern ZDMG, X (1856) P. 16.

۱۳ مجلۃ معهد مخطوطات العربیۃ، قاہرہ ۱۹۵۵ء، جلد اوّل ص ۹۲ - ۹۰۸ - برنامج العینی مقدمة

ابراہیم بن طہمان کی موجودہ کتاب پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ اس میں "مشیخہ" کی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی ہے۔

۲۔ "سنن" کی خصوصیات کی موجودگی

نہ یہ کہ ابراہیم بن طہمان کی کتاب "مشیخہ" کی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے بلکہ یہ کہ تمام اعتبار سے اس میں "سنن" کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ السنن کا اطلاق حدیث کی ان کتابوں پر ہوتا ہے جو شرعی احکام اور اعتقادات سے متعلق احادیث پر مشتمل ہوں۔ شرعی احکام، مختلف ابواب کے ماتحت دینی مسائل مثلاً طہارت، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ کے اعتبار سے لکھے جاتے ہیں۔ ابواب کی تقسیم، احادیث کی تعداد وغیرہ کا تعین مؤلفین کی صواب دید پر ہوتا ہے جسے جہاں چاہیں رکھیں[۱۴] ان اختلافات کا بیان چونکہ موضوع سے باہر ہے اس لیے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے اور صرف دو "سنن" کی کتابوں کے درمیان تقابل پیش کیا جاتا ہے یعنی "سنن ابی داؤد" اور "سنن ابن ماجہ"

ابو داؤد، اعتقادات سے متعلق احادیث اپنی کتاب کے دوسرے حصے میں "کتاب السنۃ" کے تحت ذکر کرتے ہیں جب کہ ابن ماجہ ان ہی امور سے متعلق احادیث اپنی کتاب میں "المقدمۃ" کے تحت لکھتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ابراہیم بن طہمان کی کتاب سنن کی خصوصیات پر اترتی ہے یا نہیں۔

قبل اس کے کہ بات آگے بڑھے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابراہیم بن طہمان کی کتاب نہ صرف یہ کہ "ابو داؤد" اور ابن ماجہ سے بہت پرانی کتاب ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ کتاب اپنی اصلی شکل میں نہیں ہے اس لیے کہ کم از کم اصل کتاب کو دو بار مختصر کیا گیا ہے[۱۵] اس لیے اس میں بعد کی لکھی ہوئی "سنن" کی تمام خصوصیات کا تلاش کرنا بیکار ہے لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابراہیم بن طہمان میں "سنن" کی عمومی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

احکام شرعی سے متعلق احادیث

موجودہ کتاب جو مختصر شدہ ہے صرف ۲۱۰ احادیث پر مشتمل ہے، ۸۵ احادیث مختلف شرعی مسائل سے متعلق ہیں جن میں سے ۵۰ احادیث مختلف مقامات پر مذکور ہیں لیکن باقی ۳۵ حدیثیں اس طرح

---

[۱۴] الرسالۃ المستطرفۃ، ص ۳۲ [۱۵] مخطوطہ کتاب، ق ۲۵۵ ب

سے بیان کی گئیں ہیں جو بعد کے لکھے ہوئے "سنن" کی کتابوں کے دو ابواب نظر آتے ہیں۔ ۲۲ حدیثیں (۱۵۱ - ۱۷۲) سلسلہ وار لکھی گئی ہیں جو "حج" سے متعلق ہیں اور اس کے بعد ۱۳ حدیثیں (۱۷۳ تا ۱۸۵) جو سلسلہ وار حدیثیں لکھی گئی ہیں ان کا تعلق "البیوع" سے ہے۔

اعتقادات سے متعلق احادیث

جیساکہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ "سنن" کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چند ابواب کے ماتحت "اعتقادات" سے متعلق حدیثیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان اعتقادی مسائل میں سے ایک کا تعلق "قضا و قدر" سے ہے۔ چنانچہ ابوداؤد اور ابن ماجہ دونوں کتابوں میں ایک باب "باب القدر" ہے۔ ایک اور بات جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ "القدر" کے ماتحت بیان کردہ حدیثیں اکثر و بیشتر دونوں کتابوں میں مشترک ہیں۔

ابراہیم بن طہمان کی مجموعہ کتاب میں ۲۴ حدیثیں ایسی ہیں جو اعتقادی مسائل سے متعلق ہیں ان ۲۴ حدیثوں میں سے ۱۱ حدیثیں مختلف مقامات پر مذکور ہیں لیکن ۱۳ حدیثیں ایسی ہیں جو سلسلہ وار بیان کی گئی ہیں۔ ان کی تفصیل دو جدولوں میں دی جاتی ہے، پہلے جدول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ۱۱ حدیثیں وہ ہیں جو ابوداؤد اور ابن ماجہ میں مختلف اعتقادی مسائل کے سلسلے میں مذکور ہیں اور دوسرے جدول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ۱۳ سلسلہ وار حدیثیں وہ ہیں جو ابوداؤد اور ابن ماجہ میں "القدر" کے ماتحت لکھی گئی ہیں۔

جدول نمبر ۱

حدیث نمبر	ابوداؤد / کتاب السنن	ابن ماجہ / المقدمہ
۱۶	—	۱۹۵
۱۸	۱۶۹۵	۹۲
۲۱	۱۶۹۵	—
۶۷	۱۶۸۴	۱۳۳، ۱۳۴ (دو روایت)
۱۰۰	—	۹۶
۱۱۵	۱۶۹۴	۲۳۴، ۲۳۵ (دو روایت)
۱۴۰، ۱۴۱ (دو مختلف اسناد)	—	۱۵۸
۱۴۴	—	۱۵۶

۱۴۵	۱۶۸۷	۱۶۱
۱۴۸	—	۱۰۷

جدول نمبر ۲

حدیث نمبر	ابوداؤد القدر - حدیث نمبر	ابن ماجہ القدر ، حدیث نمبر
۸۲	۴۷۰۸	۷۶
۸۳	۴۶۹۶	۷۸
۸۴	۴۶۹۵	[16]
۸۵	[17]	۸۶
۸۶	—	[18]
۸۷ [19]	۴۷۰۸	۷۶
۸۸	[20]	[21]
۸۹	۴۷۰۱	۸۰
۹۰	(حدیث ۸۰ کی دوسری روایت)	
۹۱	۴۶۹۶ [22]	۹۱ [23]
۹۲	[24]	۸۹ [25]

---

[16] سنن ابن ماجہ ، کتاب الایمان ، ص ۹

[17] سنن ابی داؤد ، الطب ، حدیث ۳۸۹۳   [18] ابن ماجہ ، الطب ۱

[19] موجودہ کتاب میں مستقل حدیث کی حیثیت سے مذکور ہے جبکہ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں حدیث ۴۷۰۸ اور ۷۶ بالترتیب جزء حدیث کی حیثیت سے مذکور ہے ، جدول ۲ ملاحظہ ہو ۔

[20] ابوداؤد ، الایمان ۱۲۲۵   [21] ابن ماجہ ، الکفارات ۲۱۲۲

[22] موجودہ کتاب میں مذکور حدیث سے معنوی مماثلت رکھتا ہے   [23] ایضاً

[24] ابوداؤد ، النکاح ۲۰۶   [25] صرف معنوی مشابہت رکھتا ہے ۔

۹۳	(حدیث ۸۹ کی دوسری روایت)
۹۴	۲۶

۳۔ لفظ "مشیخۃ" لفظ "سنن" کی تحریف ہے۔

سرورق پر اگر ایک طائرانہ نظر بھی ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ لفظ "مشیخۃ" کی تحریر دوسرے الفاظ کے مقابلے میں بالکل نئی ہے جو غالباً اس وقت لکھی گئی جب ظاہریہ (الاسبہری) کی فہرست مخطوطات تیار کی گئی اور یہ لفظ "سنن" کی سراسر تحریف ہے جو غلط فہمی کی بنیاد پر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ نسخے کے اصل نمبر جز ۲-۶ میں نقل کیا گیا تھا، کتاب کا عنوان یہ لکھا تھا:

"الجزء الاول والثانی من سنن ابراهیم بن طهمان ..."

لیکن اس عرصے میں لفظ "سنن" کی سیاہی اس حد تک پھیکی پڑ گئی اور یہ لفظ اتنا غیر واضح ہو گیا کہ اس کا پڑھنا مشکل ہو گیا، چنانچہ متن کی مدد سے اس غیر واضح لفظ کو پڑھنے کی کوشش کی گئی اور جب مرتب فہرست نے متن کتاب کو دیکھا تو اسے حاشیہ پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی نظر آئی

"من هنا شیوخ موسیٰ بن عقبة" "الی هنا شیوخ موسیٰ بن عقبة"

(ق ۲۳۹ الف، ۲۴۰ الف)

بس مرتب فہرست نے غیر واضح لفظ "سنن" کو "مشیخہ" سمجھا اور ایسا سمجھنا کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ لفظ "السنن"، لفظ "مشیخہ" سے بدل گیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اوپر کے بیانات کی روشنی میں بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ابراہیم بن طہمان کی موجودہ کتاب "کتاب السنن فی الفقہ" ہے، نہ کہ مشیخہ ابراہیم بن طہمان، جیسا کہ سزگین کا خیال ہے۔

اب ہم اس موضوع کی طرف آتے ہیں۔ یعنی یہ کہ کیا موجودہ کتاب جہمیہ عقائد کی تردید میں لکھی ہوئی پہلی کتاب ہے، اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جہمیہ کے وہ کیا عقائد تھے جن کی تردید محدثین نے کی ہے۔

جہمیہ فرقہ کے عقائد یہ ہیں:

---

۵۳۶ ابوداؤد، النکاح ۲۰۷۔

۱۔ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ یا کسی پیغمبر سے ہم کلام نہیں ہوا۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی جسم نہیں اس لیے اس کے مختلف جوارح مثلاً کان، آنکھ، پیر، ہاتھ وغیرہ نہیں ہو سکتے۔
۳۔ خدا کی نہ کرسی ہے اور نہ عرش اور نہ اس کا تخت جس پر وہ متمکن ہوتا ہے۔
۴۔ عذابِ قبر کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔
۵۔ جنت اور جہنم ابھی پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔
۶۔ پیدا ہونے کے بعد جنت و جہنم فنا کر دیے جائیں گے۔
۷۔ دنیا میں جتنی چیزیں پیدا ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کو ان کا علم ان کے پیدا ہونے کے بعد ہوتا ہے۔
۸۔ انسان مجبورِ محض ہے۔
۹۔ خدا تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، نہ بہشت والے نہ دوزخ والے وغیرہ وغیرہ۔

جہمیہ کے اعتقادات کی پوری فہرست الملطی نے دی ہے۔ یوں تو ابراہیم بن طہمان کی موجودہ کتاب میں جہمیہ فرقہ کے تقریباً سارے عقاید کی تردید کی گئی لیکن یہاں صرف ان میں سے چھ کو بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ہم کلام ہونا

جہمیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرتا، نہ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا اور نہ کسی دوسرے پیغمبر سے[۵۲۷]، اور اس عقیدے کی تردید میں الدارمی نے "الایمان بکلام اللہ" کے عنوان کے تحت تین حدیثیں بیان کی ہیں۔

۱۔ احتج آدم و موسیٰ ... قال موسیٰ ارنا آدم ...
۲۔ ثلثۃ لا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ
۳۔ وقی احدکم وجھہ ... ما منکم احد الا سیکلمہ اللہ ...[۵۲۸]

---

۵۲۷ الملطی، محمد بن احمد بن عبد الرحمن، التنبیہ والرد علی اھل الاھواء والبدع (التنبیہ) قاہرہ ۱۹۴۹، ص ۷۰؛
الجیلانی عبد القادر، الغنیہ لطالب طریق الحق (غنیہ) قاہرہ، طبع دوم، ۱۹۵۶ء جلد اول، ص ۹۰۔
۵۲۸ الدارمی، عثمان بن سعید ابو عثمان، کتاب الرد علی الجہمیۃ، ۱۹۶۰ء، ص ۳۲۸۔ حدیث مختلف اسناد سے مذکور ہے۔

امام بخاری اس بات کے ثبوت میں کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ سے ہم کلام ہوا مختلف حدیثیں پیش کرتے ہیں، جن میں سے ایک حدیث مندرجہ بالا حدیث نمبر ۲ ہے[۲۹] اور اسی حدیث کو ابن خزیمہ "ان اللہ یکلم عبادہ یوم القیامۃ" کے تحت بیان کرتے ہیں[۳۰]۔

ابراہیم بن طہمان نے مندرجہ بالا تینوں حدیثوں کو اپنی کتاب میں بیان کیا ہے[۳۱]۔

امام بخاری اس بات کے ثبوت میں کہ اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے، باب "ما کان یذکر و یرویہ عن ربہ عزوجل" کے تحت مندرجہ ذیل ۴ حدیثِ قدسی بیان کرتے ہیں[۳۲]۔

۱- یرویہ عن ربہ من تقرب الی شبراً . . .[۳۳]

۲- یرویہ عن ربکم لکل عمل کفارۃ . . .[۳۴]

۳- یرویہ عن ربہ انہ تاتینی بقراب الارض . . .[۳۵]

۴- یحکی عن ربہ استقررت من بنی آدم . . .[۳۶]

ابراہیم بن طہمان نہ صرف یہ کہ مندرجہ بالا حدیثِ قدسی کو بیان کرتے ہیں[۳۷] بلکہ اس کے علاوہ بھی تین احادیثِ قدسی بیان کرتے ہیں[۳۸]۔

مزید برآں الملطی نے جہمیہ کے اس عقیدے کی تردید میں حدیث در تحاج آدم وموسیٰ . . قال موسیٰ یا رب ارنا . . . فا راہ اللہ" بیان کی ہے[۳۹] اور اسی حدیث کو ابن خزیمہ نے "ان اللہ سبحانہ

---

[۲۹] البخاری، محمد بن اسماعیل البخاری کتاب خلق افعال العباد (عقاید السلف کے ساتھ شائع شدہ) اسکندریہ، ۱۹۷۱ء ص ۱۴۳-

[۳۰] ابن خزیمہ، محمد بن اسحاق، کتاب التوحید، قاہرہ ۱۹۶۸ء، ص ۱۵۰

[۳۱] حدیث نمبر ۸۹، ۲۲، اور ۱۶

[۳۲] حدیث قدسی حدیث کی اس قسم کو کہتے ہیں جس میں حدیث کے الفاظ گویا الفاظ خداوندی ہوتے ہیں۔

[۳۳] کتاب خلق افعال العباد، ص ۱۸۸

[۳۴] ایضاً

[۳۵] ایضاً، ص ۱۸۹

[۳۶] ایضاً

[۳۷] حدیث نمبر ۱۲۷، ۱۰۷، ۱۱۶، اور ۱۰۲ علی الترتیب

[۳۸] حدیث نمبر ۸، ۱۰۳، اور ۱۴۳

[۳۹] الملطی، کتاب التنبیہ، ص ۱۲۷

کلم موسیٰ من وراء حجاب" کے تحت بیان کیا ہے۔[۴۴۰]

ابراہیم بن طہمان نے اس حدیث کو دو سندوں سے بیان کیا ہے۔[۴۴۱] امام احمد بن حنبل نے جہمیہ فرقے کی پر زور تردید کی ہے اور اس سلسلے میں حدیث "وفی احد کم وجھہ" بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ لوگ (جہمیہ) اس حدیث کا کیوں کر انکار کر سکتے ہیں۔[۴۴۲]

ابراہیم بن طہمان نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔[۴۴۳]

۲۔ خدا تعالیٰ کا علم

صفتِ علم کے متعلق جہمیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں پیدا ہوتی ہیں خدا تعالیٰ کو ان کے متعلق ان کی پیدائش کے بعد علم ہوتا ہے، پیدائش سے پہلے نہیں۔[۴۴۴] محدثین نے اس عقیدے کی تردید کی ہے۔ چنانچہ الدارمی نے اس کی تردید میں مندرجہ ذیل تین حدیثیں "باب ذکر علم اللہ تعالیٰ" کے تحت بیان کی ہیں:

۱۔ ان خلق احد کم یجمع فی بطن امہ ... فیقول اکتب رزقہ واجلہ ...[۴۴۵]

۲۔ خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ ... الا وقد کتب مکانہا ...[۴۴۶]

۳۔ ارایت عملنا ھذا ... قال بل لما فرغ منہ ...[۴۴۷]

ابراہیم بن طہمان نے یہ تینوں حدیثیں بیان کی ہیں۔[۴۴۸]

۳۔ عرش، خدا تعالیٰ کا اس پر متمکن ہونا

جہمیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ نہ عرش کا کوئی وجود ہے اور نہ کرسی کا، اس لیے خدا کا عرش و کرسی پر متمکن ہونے

---

۴۴۰ ابن خزیمہ، کتاب التوحید، ص ۱۴۳ ۴۴۱ حدیث ۸۹، ۹۳

۴۴۲ احمد بن حنبل، الرد علی الزنادقۃ والجہمیۃ (عقاید السلف، مرتبہ علی السامی النشار کے ساتھ مطبوع) اسکندریہ ۱۹۷۱ء، ص ۸۸

۴۴۳ حدیث نمبر ۱۲

۴۴۴ البغدادی، عبدالقاہر، الفرق بین الفرق (الفرق) قاہرہ، ص ۱۹۹ — البزدوی، محمد بن محمد بن عبدالکریم، کتاب اصول الدین، قاہرہ ۱۹۶۳ء، ص ۹۰

۴۴۵ الدارمی، الرد علی الجہمیۃ، ص ۳۲۱ ۴۴۶ نفس مصدر، ص ۳۲۲

۴۴۷ ایضاً ۴۴۸ حدیث ۸۲، ۸۳ اور ۹۱

اس عقیدے کی تردید کی ہے اور اس با

ال ہی نہیں پیدا ہوتا[49] محدثین نے مندرجہ ذیل دو حدیثیں پیش کی ہیں :

دہ ہے اور خدا تعالیٰ اس پر متمکن ہوتا ہے ،

۱- مرت سحابة على رسول الله صلى الله عليه وسلم ... وفوق ذلك العرش[50]

۲- اهتز العرش لموت سعد بن معاذ -[51]

ابراہیم بن طہمان نہ صرف یہ کہ انہی دو حدیثوں کو بیان کرتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں مزید ایک حدیث اور بیان کرتے ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ عرش موجود ہے -

۴- جنت اور جہنم اور ان کی تخلیق

جہمیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت اور جہنم کی ابھی تک پیدائش نہیں ہوئی ہے[52] محدثین اس عقیدے

[illegible]

باطل قرار دیتے ہیں ، اس کو ثابت کرنے کے لیے کہ دونوں پیدا کر دیے گئے ہیں ، الملطی نے حدیث

لنا یا رسول اللہ عن الجنة ما بناؤها ... بیان کی ہے[53] ابراہیم بن طہمان اس سلسلے میں اس

حدیث کو بیان کرنے کے[54] علاوہ دوسری حدیث کا بھی ذکر کرتے ہیں[55]

۵- جنت وجہنم کا خلود

جہمیہ کا عقیدہ ہے کہ جنت وجہنم پیدا کیے جائیں گے لیکن پھر فنا کر دیے جائیں گے -[56] محدثین بالاتفاق اس عقیدے کی تردید کرتے ہیں اور جنت وجہنم کے خلود کے سلسلے میں الملطی حدیث[57] فی الجنة شجرة

---

[49] ابن حنبل، الرد علی الزنادقہ ۹۲ - الدارمی الرد علی الجہمیہ ۲۶۳، ۲۶۴ - ابن خزیمہ، کتاب التوحید ۱۰۱ - الملطی، التنبیہ ۹۶ .

[50] الدارمی : الرد علی الجہمیہ ۲۷۳ - ابن خزیمہ، کتاب التوحید ۱۰۱، ۱۰۲ - الملطی ، التنبیہ ، ۹۸

[51] الملطی ، التنبیہ ، ۹۸

[52] الملطی ، التنبیہ ، ۹۵، ۱۳۰ - البغدادی، عبد القاہر، اصول الدین ۲۳۷ - الجیلانی، غنیہ، جلد اول، ص ۹۰

[53] الملطی : التنبیہ ۱۳۰

[54] حدیث ۳۳

[55] حدیث ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۸

[56] الملطی : التنبیہ ۹۵ - البغدادی، عبد القاہر، الفرق ص ۳۳۳ - اصول الدین ۲۳۸ - الخیاط، عبد الرحیم بن محمد بن عثمان، کتاب الانتصار والرد علی ابن الراوندی، قاہرہ ۱۹۲۵ء ص ۱۲ - الجیلانی، غنیہ، جلد اول، ص ۹۰ -

سیر الراکب . . . بیان کی ہے[۵۵۷] ابراہیم بن طہمان نے اس حدیث[۵۵۸] کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور حدیث بیان کی ہے۔

۱۔ مسئلہ جبر

فرقہ جہمیہ کی شہرت جن عقیدوں کی بنیاد پر ہے ان میں سب سے اہم عقیدہ جبر ہے[۵۵۹] اس سے مراد یہ ہے کہ جو اعمال و افعال انسان سے ظاہر ہوتے ہیں وہ انسان سے منسوب نہیں کیے جا سکتے اس لیے کہ ان کا فاعل اور موجد انسان نہیں ہے۔ انسان مجبور محض ہے۔ انسان سے اعمال کی نسبت مجازی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ دریا جاری ہے یا درخت حرکت کرتا ہے۔

ابن حجر العسقلانی حدیث " احتج آدم و موسیٰ " کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابن عبد البر کا قول ہے کہ حدیث مذکور سے اگرچہ ظاہری طور پر جبریہ کی تائید ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قدریوں کی سب سے اہم دلیل ہے[۵۶۰] اسی طرح الخطابی نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ اکثر لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ " قضا و قدر " کو مان لینے سے یہ مان لینا ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے[۵۶۱] لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے اور حدیث مذکور سے ایسی کوئی بات ثابت نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک محدثین کا تعلق ہے وہ کتب حدیث میں " القدر " سے متعلق احادیث ضرور بیان کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد ایک طرف دو متضاد عقیدوں ۔ جبریہ اور قدریہ ۔ کی تردید ہے تو دوسری جانب ان کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ اصل اور صحیح عقیدہ ان دونوں عقیدوں کے درمیان ہے جس کے محدثین اور عامۃ المسلمین قائل ہیں۔

بحیثیت محدث ابراہیم بن طہمان کا قدر سے متعلق ۱۳ احادیث کا مسلسل بیان اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بھی جبریہ یعنی جہمیہ اور قدریہ کی تردید کیا کرتے ہیں[۵۶۲]

---

۵۵۷ الملطی، التنبیہ، ۱۳۴ ۵۵۸ حدیث ۱۳۰

۵۵۹ البغدادی، عبد القاہر، الفرق، ۲۱۲ ۔ البزدوی، اصول الدین ۲۵۲ ۔ Tritton, A. S. Muslim Theology, London, 1947, p. 90, W.M. Watt, Free will and predestination, London, 1948

۵۶۰ ابن حجر، فتح الباری، قاہرہ ۱۹۵۹ء، جلد ۱۴، ص ۳۱۲

۵۶۱ ابن حجر، فتح الباری، جلد ۱۴، ص ۳۱۲ ۔ شمس الحق، عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد، المدینۃ المنورۃ ۱۹۶۹ء، جلد ۱۲، ص ۴۵۲ ۔

۵۶۲ حدیث ۸۲ ۔ ۹۴ ۔ ملاحظہ ہو اوپر جدول ۲ ۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ (۱) ابراہیم بن طہمان جہمیوں کے سخت مخالف تھے۔ (۲) آپ نے نیشاپور میں سفرِ حج صرف اس لیے ملتوی کیا تھا تاکہ جہمیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ (۳) آپ نے احمد بن حنبل سے تقریباً ۸۰ سال پہلے اکثر جہمیہ عقائد کی تردید کی جو آپ کی کتاب میں موجود ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ابراہیم بن طہمان پہلے محدث ہیں جنھوں نے ردِ جہمیہ میں پہلی کتاب لکھی جو بقول ابن القیم اُن محدثین میں سے تھے جنھوں نے جہمیہ عقائد کی تردید میں صرف احادیث متعلقہ کا ذکر کرنے پر اکتفا کی۔

جہم بن صفوان کا انتقال ۱۲۸ھ میں ہوا اور ابراہیم بن طہمان نے اپنی کتاب "کتاب السنن فی الفقہ" میں اکثر عقائدِ جہمیہ کی تردید کی ہے۔ کتاب کی تاریخ تالیف زیادہ سے زیادہ ۱۵۸ھ ہو سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اکثر عقائدِ جہمیہ کی تردید صرف ۳۰ سال کے اندر ہو گئی۔

جہم بن صفوان خود ایک ادیب[63] تھے اور مختلف عقیدوں کے خلاف نبرد آزما تھے[64]، اس لیے انھوں نے اپنے خیالات کو ضرور قلم بند کیا ہوگا، اس کی تصدیق ابن بطہ کے اس بیان سے ہوتی ہے "میں کچھ ان لوگوں کا ذکر کرتا ہوں جو صاحبِ تصانیف ہیں۔ جہم بن صفوان بھی انہی میں سے ایک ہے جس نے ایک "مقالہ" لکھا تھا اور اس میں لکھے ہوئے عقائد کی پیروی کچھ گمراہ لوگوں نے کی ..."[65]

یہ تو معلوم نہیں کہ ابراہیم بن طہمان نے اس "مقالے" کو دیکھا تھا لیکن ابراہیم بن طہمان کے جواب کی نوعیت کے پیشِ نظر یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کو عقائدِ جہمیہ کا علم تھا، جس کی تردید اس نے اپنی موجودہ کتاب میں کی ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جہم بن صفوان ہی تمام اہم عقائدِ جہمیہ کا بانی تھا۔

---

٦٣ ابوداؤد: مسائل احمد بن حنبل، بیروت، تاریخ طبع ندارد، ص ۲۶۰۔

٦٤ قدریہ کے خلاف (ابن عساکر، تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی الحسن الاشعری دمشق ۱۳۴۷ھ، ص ۱۱) - (۲) فرقہ سمانیہ کے خلاف (ابن حنبل: الرد علی الزنادقہ، ص ۶۵ — (۳) شیدوسیر، الخمیس الفرید (۱۹۴۰ - ۱۹۵۳ء) جلد ۲، ص ۴۰۳)، ۔ E I, Second Ed. Vol. II, P 338۔ مقاتل بن سلیمان کے خلاف (البغدادی، تاریخ بغداد، جلد ۱۳، ص ۱۶۴۔ الذہبی، میزان الاعتدال، جلد ۴، ص ۱۷۳، حفص بن سالم المعتزلی کے خلاف (ابن المرتضیٰ، احمد بن یحییٰ، کتاب المعتزلہ، بیروت ۱۹۶۰ء، عبدالجبار بن احمد القاضی فرق وطبقات المعتزلہ، قاہرہ ۱۹۷۲ء، ص ۴۳، ۵۳۶ھ، اموی حکومت کے خلاف حارث بن سریج کی سیکرٹری کی حیثیت سے (الطبری، تاریخ جلد دوم، ص ۱۹۱۹)۔

٦٥ ابن بطہ، عبیداللہ بن محمد بن محمد بن حمدان العکبری، کتاب الشرح والابانۃ علی اصول السنۃ والدیانۃ، دمشق ۱۹۵۸ء، ص ۹۰

سید احمد سعید ہمدانی

شیخ ابوالحسن المغربی الشاذلیؒ

تاریخِ اسلام کے اکثر ادوار میں فقہا و صوفیا کی آویزش کا ذکر ملتا ہے۔ اگر دونوں گروہوں کو اپنے اپنے حلقوں میں محدود کر کے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ فقہا ظواہرِ شریعت کی تعلیم دیتے تھے اور انھی کے مطابق فیصلے صادر فرماتے تھے جبکہ صوفیا باطنی تزکیے کو اولیت دیتے تھے اور قلبی واردات و تجلیات اور مواجید و کیفیات کے ذکر سے اپنے اور دوسروں کے ایمان کو پختہ کرتے تھے۔ فقہا کو اکثر ان کی باتوں پر شک گزرتا تھا اور وہ انھیں دین میں رخنہ ڈالنے والی باتیں سمجھ کر مخالفت کرتے تھے۔ حسنِ ظن سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے نیت دونوں طبقوں کی نیک تھی مگر اپنے اپنے شعبے میں شدتِ شغف یا شدید غلو کی بنا پر جب ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکتے تھے تو کشمکش اور مخالفت کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا کی کتب جلا دینے کے فتوے بھی صادر ہوتے رہے۔

چھٹی صدی ہجری کی بات ہے کہ مغرب کے مالکی علما کے فتوے پر امام غزالی کی کتابیں جلائی گئیں اور علومِ تصوف کی اشاعت اور صوفیا کی سرگرمیوں کی شد و مد سے مخالفت کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود صوفیا اپنے مسلک پر قائم رہے۔ ایسا بھی ہوتا رہا کہ علما کے ایک طبقے کو جب صوفیا کے اخلاص کا یقین ہو گیا تو انھوں نے مسلکِ تصوف کی حمایت بھی کی۔ چنانچہ اسی صدی میں بلادِ مغرب میں ابو مدین، سید احمد بدوی اور محی الدین ابن العربیؒ جیسے مشائخ و صوفیا پیدا ہوئے اور حمایت و مخالفت کی فضا میں ان کے طرق و افکار نے تصوف کو تقویت دی۔

ساتویں صدی ہجری میں مغرب میں مقامِ ارشاد پر فائز مشائخ کبار کے حلقے میں شاید سب سے زیادہ بااثر صوفی شیخ ابوالحسن شاذلی تھے، جن کی عظیم روحانی شخصیت کے زیرِ اثر دینی حلقوں میں تصوف کو بھی فقہ کے برابر درجہ ملا۔

بلادِ مغرب میں بڑے بڑے صوفیا ہوئے ہیں، لیکن دور ہونے کی وجہ سے عرب دنیا سے باہر زیادہ شہرت نہیں حاصل کر سکے۔ لیکن ان میں شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی کے بعد شیخ ابوالحسن شاذلیؒ ہی

وہ بزرگ تر ہستی ہیں، جن کا اثر مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ برصغیر پاک و ہند بلکہ تمام عالمِ اسلام نے اس حد تک قبول کیا کہ ان کی الہامی دعا "حزب البحر" ہر سلسلے کے صوفیا نے اپنے اوراد میں شامل کر لی اور انہی کے سلسلہ (شاذلیہ) کے ایک بزرگ امام محمد بن سلیمان الجزولیؒ کا مرتب کردہ درود شریف کا مجموعہ "دلائل الخیرات" بہت زیادہ مقبول ہوا۔

شیخ ابو الحسن شاذلی کا نام علی بن عبداللہ ہے اور حسب و نسب کے لحاظ سے سادات حسینی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نفحات الانس میں مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے ان کے حالات قلم بند کرتے ہوئے ان تمہیدی جملوں سے ابتدا کی ہے: "نام وے علی بن عبداللہ است۔ شریف است حسینی۔ ساکن اسکندریہ بودہ است و جمع کثیر آنجا بصحبت وے پیوستہ اند۔ از کبائر اولیاء اللہ و عظماء مشائخ است۔"[۱]

آپ مغرب اقصیٰ کے ایک گاؤں غمارہ میں ۵۹۳ھ/ ۱۱۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ جب سلوک کی دنیا میں قدم رکھا تو سب سے پہلے مغرب کے مشہور صوفی ابو مدینؒ کے شاگرد ابو عبداللہ بن حرازم سے خرقہ حاصل کیا لیکن اس سے پہلے آپ نے اپنی ظاہری تعلیم مکمل کر لی تھی، جیسا کہ علامہ شعرانی نے لکھا ہے: "ابو الحسن شاذلی رضی اللہ عنہ جب تک علومِ ظاہری کے مناظرے کے لیے مستعد نہ ہوئے، اس گروہ کی راہ میں داخل نہ ہوئے۔" ۶۱۵ھ میں مشرق کا سفر اختیار کیا اور رفاعی طریقے کے شیخ ابو الفتح واسطیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، تقریباً تین سال وہاں رہے، مگر انہی دنوں آپ کو شوق پیدا ہوا کہ قطب العالم والزماں سے ملیں[۲]۔ شیخ سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے مغرب کی طرف مراجعت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جب آپ لوٹے تو آپ کی ملاقات مراکش کے شہر فاس میں شیخ عبدالسلام ابن مشیش سے ہوئی، جو وقت کے قطب تھے، پھر انہی کی زیرِ نگرانی آپ نے ولایت کے مراتب طے کیے۔ شیخ عبدالسلام ہی نے ہدایت کی کہ افریقیہ کے ایک گاؤں شاذلہ کے نزدیک غار میں کچھ مدت تک معتکف رہیں، چنانچہ اسی کی نسبت سے آپ شاذلی کے لقب سے معروف ہوئے۔

---

[۱] نفحات الانس مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، ص ۳۷۱

[۲] علومِ صوفیا میں قطب کا مرتبہ اس صاحبِ روحانیت شخصیت کے لیے مخصوص ہے جو صالحین و صدیقینِ اُمت میں اثر و نفوذِ روحانی کے لحاظ سے مرکزی حیثیت رکھتا ہو، خواہ وہ کسی پر ظاہر ہو یا نہ ہو۔ تصوف کی کتب میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ عام معلومات کے لیے دیکھیے: کشف المحجوب (ترجمہ نکلسن)، ص ۲۱۴ اور خزینۃ المعارف ترجمہ الابریز، ص ۳۸۳

معلوم ہوتا ہے، ان دنوں آپ مجاہدہ کی خاطر ریاضاتِ شاقہ میں سے گزرے۔ آپ کے ملفوظات میں سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ایک بار اسّی دن آپ بھوکے رہے۔ دل میں خیال آیا کہ اس سے مقصود حاصل ہوگیا۔ ناگاہ ایک عورت کو دیکھا جو ایک غار سے باہر نکلی۔ وہ اس قدر خوب صورت تھی کہ گویا اس کا چہرہ نورِ آفتاب کی طرح تھا۔ کہنے لگی: "ایک نحوسی اسّی دن بھوکا رہا اور اپنے عمل پر اللہ کے سامنے ناز کرنے لگا۔ مجھ پر چھ ماہ گزر گئے ہیں کہ میں نے طعام چکھا تک نہیں"۔

اسی دوران میں آپ کو ایسے مشاہداتِ روحانی سے بھی نوازا گیا جن سے آپ کی رہنمائی ہوتی رہی۔ خود انھی سے مروی ہے کہ میں غار میں تھا، میں نے کہا "الٰہی، تیرا بندۂ شاکر کیسے بنوں؟" میں نے سنا کہ مجھے کہا جا رہا ہے "جب اپنے علاوہ کسی کو منعم علیہ نہیں دیکھوگے"۔ میں نے کہا "الٰہی میں اپنے علاوہ منعم علیہ کیسے نہ دیکھوں، حالانکہ تو نے انبیا پر انعام کیا ہے، علما پر انعام کیا ہے اور بادشاہوں پر انعام کیا ہے"۔ میں نے سنا کہ کہا گیا، "اگر انبیا نہ ہوتے تو سیدھی راہ تجھے نہ ملتی، اگر علما نہ ہوتے تو کس کی پیروی کرتا؟ اور اگر بادشاہ نہ ہوتے تو امن میں نہ رہتا۔ یہ سب نعمتیں ہیں جو تجھے میں نے دی ہیں"۔

اسی طرح انھوں نے بیان کیا کہ ایک دوست کے ساتھ غار میں وصول الی اللہ کی توقع میں رہنے لگے۔ آپس میں کہنے لگے کہ کل ہمارے لیے فتح کی راہ کھل جائے گی۔ اچانک ایک بارعب شخص سامنے آگیا، پوچھا "تو کون ہے؟" اس نے کہا "عبدالملک"۔ کہتے ہیں میں جان گیا کہ یہ اولیا اللہ میں سے ہے۔ میں نے کہا "کیا حال ہے؟" کہنے لگا "اس شخص کا حال کیا ہوگا جو کہتا ہے کہ کل۔۔۔ کھل جائے گا۔ یہ نہ ولایت ہے نہ کامیابی، اے نفس! کیوں خدا کی خدا کے لیے ہی پرستش نہیں کرتا"۔ ہم جان گئے کہ اس شخص کو ہمارے لیے تنبیہ کی خاطر ہی بھیجا گیا ہے، پس توبہ کی، استغفار کیا اور پھر واقعی راہ کھل گئی[۳۵]

وقتاً فوقتاً آپ وعظ یا تعلیم و تبلیغ کی خاطر بلادِ مغرب میں دورے کرنے لگے۔ آپ کی مجلسوں میں چونکہ تصوف کے نکات کا بیان ہوتا تھا، اور آپ سلوک کی تعلیم بھی دیتے تھے اس لیے تیونس کے علما نے آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ اس مخالفت نے اس حد تک شدت اختیار کر لی کہ سلطان ابوزکریا حفصی کی حمایت کے باوجود آپ کو مصر میں پناہ لینا پڑی۔ یہاں آپ اسکندریہ میں قیام پذیر ہوئے اور نہ صرف یہاں کے عوام

---

[۳۵] نفحات الانس، ص ۳۷۲

میں آپ نے مقبولیت حاصل کر لی بلکہ علما بھی آپ کی تعظیم کرنے لگے[۴]

اسکندریہ میں آپ ہر سال اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ حج پر جایا کرتے تھے۔ یہیں سے ایک بار ایسا ہوا کہ آپ وقت پر روانہ نہ ہو سکے اور کچھ دنوں کے بعد جب حج کے لیے جہاز پر چلے تو بادِ مخالف کی وجہ سے قاہرہ کے آس پاس ہی جہاز رکا رہا۔ اس پریشانی کے عالم میں دعا حزب البحر آپ کو الہام ہوئی۔ آپ نے پڑھنا شروع کی تو معاً بادِ موافق چلی، جہاز روانہ ہو گیا اور عین وقت پر آپ اور آپ کے ہمراہی مناسکِ حج میں شریک ہو گئے۔ یہ آپ کی ایسی کرامت تھی کہ جہاز کا عیسائی مالک اور اس کے لڑکے سب مسلمان ہو گئے۔

آپ اس قدر کثرت سے تبلیغی و تدریسی دوروں پر رہتے تھے کہ تذکروں میں آپ کو "فقیر سائح" کہا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار کسی جنگل میں سے گزرتے ہوئے آپ پر قہوہ کی تاثیر منکشف ہوئی اور اس کے بعد انہی سے اس کا رواج چلا[۵]

حضرت ابوالحسن شاذلیؒ نے نہ کوئی کتاب تصنیف کی، نہ شیخ الاکبر محی الدین ابن العربیؒ کی طرح آپ کسی مدرسہ فکر کے بانی تھے۔ آپ کے خلیفہ اعظم احمد ابوالعباس مرسیؒ جب کہتے تھے "میری کتابیں میرے اصحاب ہیں" تو وہ اپنے مرشد ہی کی روایت کے مطابق عمل پیرا تھے۔ اپنے زمانے میں مرشد کی حیثیت سے آپ نے بے شمار لوگوں کے دلوں میں اللہ کے لیے محبت کا جذبہ پیدا کیا اور قربِ خداوندی کے طریقوں سے انھیں آگاہ کیا۔ ان کے بارے میں ایک صوفی بزرگ کی رائے تھی کہ اور لوگ تو اللہ تعالےٰ کے دروازے کی طرف بلاتے ہیں اور ابوالحسن شاذلیؒ لوگوں کو اللہ کے پاس داخل کر دیتے ہیں۔"

آپ کے پاس جو عقیدت مند آتے تھے، آپ نے بعض دیگر مشائخ کی طرح اُن کو کبھی اپنے طریقے کا پابند بھی نہ بنایا۔ طلبِ حق کی استعداد میں وسعت و اختلاف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھیں آزاد رکھا کہ اگر ذوقِ طلب زیادہ ہو تو جہاں سے چاہیں فیض حاصل کریں۔ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ تم میری صحبت میں رہو اور میں تمھیں کسی اور کی صحبت میں رہنے سے منع نہیں کرتا اور اگر تم کو اس سے زیادہ شیریں اور خوش گوار کوئی

---

[۴] The Sufi Orders in Islam by J. S Trimingham.

[۵] سفینۃ الاولیا از دارا شکوہ، ص ۲۱۵

چشمہ مل جائے تو اسی پر اُتر پڑو۔

اسی طرح شیخ ابوالحسن شاذلیؒ اور آپ کے اوّلین خلفا نے خرقہ یا گدڑی پہننے کا تقید نہ کیا، بلکہ اس کو فقیر کا ادعا جانتے ہوئے ایک لحاظ سے معیوب خیال کیا۔ اس کی بجائے آپ اخلاصِ نیت، تزکیۂ نفس اور متابعتِ سنت پر زور دیتے تھے۔

تربیتِ روحانی میں تکمیل کا ایک وہ درجہ بھی آتا ہے جب ولی اس مقام پر متمکن ہو جاتا ہے جو اس کی ہمت و استعداد کے لیے مخصوص تھا۔ اس وقت وہ خود اپنے طریقے کا بانی ہوتا ہے۔ اصطلاحاتِ علومِ صوفیا میں ایسے بلند ہمت افراد کے لیے مختلف القاب معروف ہیں۔ مثلاً قلندر، قطبِ طریقت، قطبِ وحدت، فرد اور ولی خواص الاخص وغیرہ۔ شیخ ابوالحسن شاذلیؒ کو یہ مرتبہ حاصل تھا۔ ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے پیر کون ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ پہلے میں اپنے آپ کو شیخ عبدالسلام ابن مشیشؒ کی طرف منسوب کیا کرتا تھا۔ مگر اب کسی کی منسوب نہیں کرتا بلکہ دس دریاؤں میں تیرا کرتا ہوں: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، جبریل، میکائیل، عزرائیل، اسرافیل اور روحِ اکبر۔

۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء میں آپ سفرِ حج سے واپس آ رہے تھے کہ بحرِ احمر کے ساحل کے قریب صحرائے عیذاب میں حمیثرہ کے مقام پر انتقال فرمایا اور وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔

آپ کے خلفا نے آپ کی تعلیمات کی اشاعت کا کام جاری رکھا۔ آپ کے تربیت یافتہ گروہ میں احمد ابوالعباسؒ مرسیؒ کو بلند مقام حاصل ہے جو اپنے شیخ کے زاویے میں بیٹھ کر طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کے ایک شاگرد تاج الدین ابن عطاء اللہ عباس نے اپنی کتاب "لطائف المنن فی مناقب ابی العباس و شیخہ ابو الحسن" میں ان دونوں بزرگوں کے حالاتِ زندگی، ان سے منقول اوراد اور ان کے پُرحکمت اقوال لکھے۔

یہاں "الطبقات الکبریٰ" (مرتبہ امام عبدالوہاب شعرانیؒ) کے حوالے سے حضرت ابوالحسن شاذلیؒ کے چند اقوال نقل کیے جا رہے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شریعت و طریقت کے معاملات میں اس نورِ بصیرت کے وارث تھے جو صرف علمائے باعمل کو ملتا ہے

فرماتے ہیں:

۱۔ چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے علم کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ دنیا کی محبت، آخرت سے غفلت، افلاس کی دہشت، آدمی کی ہیبت۔

- دلوں میں علوم اسی طرح ہیں جس طرح روپے پیسے ہاتھوں میں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس سے تم کو نفع پہنچائے اور اگر چاہے تو ضرر پہنچائے۔
- پیر وہ ہے جو تم کو راحت کی راہ دکھائے نہ کہ وہ جو مصیبت کی۔
- جو فقیر پنج وقتی نمازوں میں حضور جماعت کا برابر پابند نہ ہو، اس کا اعتبار نہ کرو۔
- دیکھو، اپنے آپ کو بار بار گناہوں میں پڑنے سے بچاؤ کیوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہی ظالم ہے اور ظالم امام نہیں ہوتا، اور جس نے گناہ ترک کیے، جس ابتلا میں اللہ تعالیٰ نے اُسے مبتلا کیا ہے، اس پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ و وعید پر یقین کیا، وہی امام ہے گو اس کے پیرو تھوڑے ہوں۔
- ایک ہی مرید جس میں تمہارے اسرار کی حفاظت کی صلاحیت ہو، ایسے ہزار مریدوں سے بہتر ہے، جس میں یہ صلاحیت نہ ہو۔
- یہ راہ نہ رہبانیت کی راہ ہے اور نہ جو اور بھوسا کھانے کی، یہ تو اوامر پر صبر اور ہدایت کی نسبت یقین سے طے ہوتی ہے۔
- جب تمہارا کشف کتاب و سنت کا معارض ہو تو کتاب و سنت پر جمے رہو اور کشف کو ترک کر دو، اور اپنے نفس سے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت میں میرے لیے بچنے کی ضمانت فرمائی ہے اور کشف و الہام اور نیز مشاہدہ کی جانب سے اس کی ضمانت نہیں فرمائی ہے، علاوہ بریں اس پر اجماع ہے کہ کشف یا الہام یا مشاہدہ پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے مگر کتاب و سنت سے ملا لینے کے بعد۔[۵۶]

---

۵۶ "الطبقات الکبریٰ" اردو ترجمہ عبدالغنی وارثی، ص ۳۸۹ تا ۴۰۷۔

ڈاکٹر ظہور الدین احمد

سلسلۂ "فقہائے ہند" پر تبصرہ

علومِ اسلامی مثلاً قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ پر بے شمار تالیفات موجود ہیں موضوعات کے علاوہ مفسرین، محدثین اور علما و فقہا پر جداگانہ مبسوط، معجم اور تذکرے تالیف ہو چکے ہیں۔ برِ صغیر پاک و ہند میں حضرت عمرِ فاروق کے زمانے میں اسلام کی روشنی آ پہنچی تھی۔ پھر صدیوں تک اسلام کی تدریس و تبلیغ کے لیے مدرس و مبلغ آتے رہے۔ اور خود اس سرزمین میں علما، فقہا اور مفسرین نے اسلامی علوم پر کتابیں تالیف کر کے قابلِ صد تحسین خدمات انجام دیں۔

مسلمانوں کو ارکانِ دین کی عملی تعلیم کے لیے علمِ فقہ دین کا ایک بنیادی جزو شمار ہوتا ہے اسلامی قوانین کے اجرا کے لیے بھی فقہا و قضاۃ کی حیثیت مسلّم تھی، اس لیے ہر عہد میں جیّد علما کا ظہور رہا۔ ان بزرگانِ دین کے احوال و کوائف محفوظ کرنے اور ان کا نام زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے عربی میں طبقات الشافعیہ، طبقات الحنابلہ اور طبقات الحنفیہ جیسے عنوانات سے فقہائے عالی مقام کے تذکرے مرتب ہو گئے۔ برِ صغیر میں اولیا، شعرا اور علما کے تذکرے تو مرتب ہوئے ہیں لیکن خصوصی طور پر فقہا کا تذکرہ مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔

علمی دنیا مولانا محمد اسحاق بھٹی کی ممنون ہے کہ انھوں نے بڑی کاوش و کوشش سے یہ کام شروع کیا اور "فقہائے ہند" کے نام سے کتاب کا آغاز کیا۔ انھوں نے ہمت و استقلال سے اس کام کو جاری رکھا اور ۱۹۷۴ سے لے کر اب تک اس تالیف کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ سامعین گرامی کے لیے ہم اس کتاب کا تعارف پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

فقہائے ہند کی پہلی جلد ۱۹۷۴ میں شائع ہوئی۔ یہ ۴۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلی صدی سے آٹھویں صدی ہجری تک کے ۲۹۵ فقہا کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی صدی کے ۳۶، دوسری کے ۱۷، تیسری کے ۷، چوتھی کے ۷، پانچویں کے ۴، چھٹی کے ۹، ساتویں کے ۵۵، آٹھویں کے ۱۶۰ فقہا کے احوال و کوائف بیان ہوئے ہیں۔ مصنّف نے بڑی تحقیق و تلاش سے یہ ثابت کیا ہے کہ ۱۵ھ میں اسلام سرزمینِ ہند میں

داخل ہو چکا تھا، اور مختلف خلفا کے عہد میں پچیس صحابہ کرام یہاں تشریف لائے، بعد میں تابعین اور تبع تابعین میں ۳۵ اصحاب نے اپنے مبارک قدموں سے اس سرزمین کو شرف بخشا۔ کتاب کے شروع میں بیالیس صفحات کا مبسوط مقدمہ ہے، جس میں خلفائے اُمت اور برعظیم میں نامور سلاطین کا نام بنام ذکر کیا ہے۔ اسلامی علوم کے لیے ان کی خدمات جلیلہ کا تذکرہ کیا ہے اور علما کے ساتھ ان کے روابط کی تفصیل بتائی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سلاطین کے نزدیک علمائے کرام اور فقہائے عظام کا کیا مرتبہ و مقام تھا۔

فقہائے ہند کی دوسری جلد جون ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اور ۲۸۰ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں نویں صدی ہجری کے ۱۰۵ فقہا کا ذکر ہے۔ اس جلد کے آغاز میں ۸۰ صفحات کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں تیمور کے حملۂ ہند کی غایت اور اس کے اثرات پر بحث کی ہے اور تیمور کی علم پروری اور علما و مشائخ کی قدردانی کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ اس صدی میں سرزمین ہند کے مختلف علاقوں کے سلاطین مثلاً سلاطینِ شرقی، سلاطینِ گجرات اور سلاطینِ بہمنی کا ذکر کیا ہے۔ ان کے عہد میں علوم اسلامی کی تدریس کی کیا صورتیں تھیں۔ علما و فقہا کی کیا حیثیت تھی۔ شاہانِ عالی مرتبت ان سے کس قدر استفادہ کرتے تھے اور ان کا کس قدر احترام کرتے تھے ـــــ ان تمام امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے علمی تاریخ کے کئی گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔

فقہائے ہند کی تیسری جلد ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ ۴۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دسویں صدی ہجری کے ۲۵۲ فقہا کا تذکرہ موجود ہے۔ شروع میں ۸۰ صفحات کا مفصل مقدمہ شامل ہے جس میں سلاطین لودھی، سلاطینِ تیموری میں سے بابر، ہمایوں، خاندانِ سوری میں سے شیر شاہ سوری اور گجرات، سندھ، کشمیر، بنگال اور ملتان کے ملوک و سلاطین میں سے نامور اشخاص کا ذکر کیا ہے۔ دینی علوم کے متعلق ان کی خدمات اور علما و فقہا سے ان کے روابط کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تحقیق سے برعظیم کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ علمی و معاشرتی تاریخ کے نمایاں پہلو سامنے آ گئے ہیں۔

فقہائے ہند کی چوتھی جلد کا پہلا حصہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا جو ۲۰۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں گیارھویں صدی ہجری کے ۱۲۰ فقہا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۔۔۔ ۴۰ صفحات کا مفصل مقدمہ شامل ہے، جس میں دورِ اکبری کی سیاسی، علمی اور مذہبی فضا کو اجاگر کیا گیا ہے، اور اکبر کی زندگی میں جو مذہبی تحول و تغیر رونما ہوا اس کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اس کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھی جلد کا دوسرا حصہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا، جو ۴۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی گیارھویں صدی ہجری کے ۱۷۶ فقہا کا ذکر آگیا ہے۔ ۴۸ صفحات کے مبسوط مقدمے میں جہانگیر اور شاہ جہان کے ذاتی احوال و اوصاف بیان کرکے ان کی سیاسی زندگی کے واقعات و حوادث پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی علمی و دینی خدمات کا تذکرہ کرکے ان کے عہد کے علما و مشائخ کی قدردانی و قدر افزائی کی تفصیل بتائی ہے۔

فقہائے ہند کے مصنف جناب محمد اسحاق بھٹی صاحب ہمت و حوصلہ رکھتے ہیں کہ اس سلسلۂ تالیف کو جاری رکھیں اور بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی کے فقہا کا مفصل تذکرہ تدوین و تالیف کریں۔ ہماری دعا ہے کہ انھیں اس مفید اور اہم تالیف کے مکمل کرنے کی توفیق نصیب ہو۔ مصنف نے جس محنت، دلسوزی اور دلچسپی سے اس کتاب کی تالیف پر وقت صرف کیا ہے، اس کے شواہد وہ مصادر و منابع ہیں جن سے انھوں نے فقہا کے احوال و کوائف مرتب کرنے میں استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے ہر جلد کے آخر میں ان منابع کی فہرست دی ہے جس میں مندرجہ ذیل تعداد کتب کے پیش نظر مصنف کی وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

جلد اول میں ۸۰، جلد دوم میں ۵۵، جلد سوم میں ۸۲، جلد چہارم حصہ اول میں ۶۷، جلد چہارم حصہ دوم میں ۱۳۰ کتابیں مذکور ہیں۔

مصنف نے مقدور بھر دستیاب کتبِ مآخذ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے باوجود بعض فقہا کی علمی خدمات کے لیے معلومات میسر نہیں آسکیں۔ حالاں کہ ان کی زندگی فقہی علوم کے درس و تدریس میں گزری۔ بعض مشائخ کو فقہا کی صف میں دیکھ کر بظاہر تعجب ہوتا ہے لیکن تذکرہ نگاروں نے انھیں علمائے فقہ میں بھی شمار کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے زمانے میں علم فقہ کا حصول کرنا متداول دروس میں شامل تھا اور پیر طریقت کے لیے عالم شریعت ہونا بھی لازم سمجھا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے ارادت مندوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے قابل ہو سکے۔

مصنف نے ہر جلد میں فقہا کو حروف تہجی کی ترتیب سے درج کیا ہے تاکہ مطلوبہ شخص کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے آسانی سے رجوع کیا جاسکے۔ تمام جلدوں کی تکمیل کے بعد یہ ضروری ہوگا کہ اشخاص مندرجہ کا ایک جامع اشاریہ مرتب کیا جائے تاکہ تمام جلدوں میں مطلوبہ اشخاص کی کیفیت معلوم کرنے میں سہولت ہو۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور تعریف و تحسین کا مستحق ہے کہ اس نے ایسی علمی و تحقیقی کتاب شائع کرنے کے لیے وسائل فراہم کیے۔ امید ہے ادارہ لائق مصنف کی اس علمی کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گا اور باقی ماندہ جلدوں کی اشاعت کے لیے وسائل فراہم کرے گا۔

یہ کتاب معلومات کا مخزن ہے اور طلبۂ علومِ اسلامی کے لیے ماخذ اور مرجع کا درجہ رکھتی ہے۔

مصنف بہرطور تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

(بقیہ صفحہ ۴۵)

معلومات حاصل ہو سکیں۔

فاران — ماہر القادری نمبر

ملنے کا پتا: دفتر ماہ نامہ فاران، ای ۴/۲ ناظم آباد نمبر ۴، کراچی ۱۸۔

صفحات ۴۱۶ - قیمت ۱۵ روپے

ماہ نامہ "فاران" کراچی، پاکستان کا مشہور رسالہ ہے جو آج سے کم و بیش تیس سال پہلے برصغیر پاک و ہند کے معروف ادیب و شاعر جناب ماہر القادری مرحوم نے کراچی سے جاری کیا تھا۔ "فاران" کو بعض امور میں ہمیشہ ایک خصوصیت حاصل رہی ہے اور جو انداز و اسلوب پہلے دن ہی سے اس نے اختیار کیا، اس پر بہرحالت میں یہ قائم رہا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں یہ بہت بڑی بات ہے۔
افسوس ہے اس کے بانی و مدیر ماہر القادری گزشتہ سال اچانک جدہ میں انتقال کر گئے اور سارا بوجھ اُن کے بھائی جناب مسرور حسین صاحب پر آ پڑا۔ مسرور حسین صاحب نے دسمبر ۱۹۷۸ء میں "فاران" کا ماہر القادری نمبر شائع کیا ہے جو بڑا ضخیم نمبر ہے اور ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ماہر القادری صاحب ہمہ صفات موصوف شخص تھے۔ ادیب، شاعر، مصنف، صحافی، مبلغ، ناقد، علوم دینی کے حامل اور خاص جذبہ و جوش کے مالک تھے۔ زیرِ تبصرہ نمبر میں ان کی تمام خوبیوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اور ملک و بیرونِ ملک کے متعدد حضرات نے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ خاص نمبر بڑا دلچسپ اور بہت سے معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کے مطالعہ سے بہت سی پرانی داستانیں سامنے آجاتی ہیں۔ ہمارے معزز قارئین کو یہ نمبر ضرور خریدنا چاہیے اور سالانہ خریداری کی صورت میں اس رسالے کو زندہ رکھنے میں بھی جناب مسرور حسین صاحب سے تعاون کرنا چاہیے۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا عطس غطی وجھہ بیدہ او بثوبہ وغض بھا صوتہ۔ (ترمذی - ابواب الآداب - باب ما جاء فی خفض الصوت وتخمیر الوجہ عند العطاس)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ جب جمائی لیتے تو ہاتھ یا کپڑا منہ پر رکھ لیتے اور آواز آہستہ کر لیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہمہ گیر اور آپ کے اقوال و اعمال کا دائرہ وسعت پذیر ہے۔ آپ نے لوگوں کی ہر لحاظ سے تربیت کی۔ ان کو عبادات کی تفصیلات بھی بتائیں اور معاملات کے تمام گوشوں سے بھی آگاہ فرمایا اور اس کے متعلق ضروری ہدایات دیں۔ اس کے علاوہ تہذیب و شائستگی کا درس بھی دیا اور آدابِ مجلس سے بھی بہرہ ور کیا اور خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا۔ مندرجہ بالا حدیث اسی سلسلۂ حسین کی ایک زریں کڑی ہے۔

اس حدیث پاک میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب جمائی آتی تو آپ اپنا مبارک منہ کھلا نہیں چھوڑتے تھے، بلکہ اس پر ہاتھ یا رومال اور کپڑا رکھ لیتے اور آواز یا تو بالکل نہ نکالتے یا بہت ہی آہستہ کر لیتے۔ یہ تو آنحضرت کا عمل تھا۔ ایک حدیث میں آپ نے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ جمائی آئے تو منہ بند کرنے کی کوشش کرو کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ اگر ایسا نہ کر سکو تو منہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لو یعنی اس پر قابو پانے کی سعی کرو۔

جمائی درحقیقت سستی اور کاہلی کی علامت ہے۔ مجلس میں یہ عمل بڑا معیوب معلوم ہوتا ہے اور اسے آدابِ مجلس کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ بعض لوگ بالکل کھلا منہ چھوڑ کر اور بلند آواز نکال کر جمائی لیتے ہیں، قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس سے وحشت سی محسوس ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس شخص پر غنودگی یا نیند کا غلبہ طاری ہو گیا ہے۔ اس کے پاس بیٹھنا مناسب نہیں، یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔

آنحضرت کے اس عمل اور فرمان کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت چوکس رہنا چاہیے اور ہر مجلس کسل یا کاہلی کے اظہار سے بچنا چاہیے۔ آنحضرت مسلمان کو ہر معاملے میں مہذب اور شائستہ دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ آپ کی مقدس تعلیمات کا بنیادی حصہ ہے۔

نقد و نظر

اسلامی حدود

مصنف : مولانا سید محمد متین ہاشمی

ناشر : شعبۂ تصنیف و تالیف انجمن اصلاح المسلمین، پنڈی بھٹیاں، ضلع گوجرانوالہ

ملنے کا پتا : کتب خانہ شانِ اسلام، راحت مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، عمدہ۔ صفحات ۲۴۴ ۔ قیمت ۳۵ روپے۔

مولانا سید محمد متین ہاشمی ملک کی جانی پہچانی شخصیت ہیں اور اہلِ علم میں ان کی حیثیت بڑی بلند ہے۔ وہ کتاب و سنت اور علمِ فقہ پر عبور رکھتے ہیں۔ "المعارف" کے عزیز قارئین کو ان کے افکارِ عالیہ سے مستفید ہونے کا اکثر موقع ملتا رہتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب "اسلامی حدود" ان کی تازہ تصنیف ہے جس میں فاضل مصنف نے اسلامی حدود کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے اور ان جرائم کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جن پر حدود کا نفاذ عمل میں آتا ہے۔

ابتدا میں لائق مصنف نے حد کی تعریف، تعزیر، حدود و تعزیرات کی ضرورت، قابلِ حد جرائم، اجرائے حد میں احتیاط وغیرہ امور پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد سات ابواب قائم کر کے ہر باب میں مختلف حدود کی وضاحت کی ہے۔ باب اوّل میں زنا، باب دوم میں قذف، باب سوم میں شراب نوشی، باب چہارم میں سرقہ، باب پنجم میں حرابہ (یعنی رہزنی)، باب ششم میں بغاوت اور باب ہفتم میں ارتداد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہر موضوع کو کتاب و سنت اور فقہ کے نقطہ نظر سے منقح کیا ہے۔

کتاب اپنے موضوع میں بڑی مفصل ہے۔ عام اہلِ علم کے علاوہ ان حضرات کو بالخصوص اس کا مطالعہ کرنا چاہیے جو عدل و انصاف کے ذمہ دارانہ منصب پر فائز ہیں یا وکالت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اس موضوع سے متعلق کتاب کی سخت ضرورت تھی جو کافی حد تک پوری کر دی گئی ہے ـــــ کتاب کے مسودے کا مطالعہ جناب جسٹس شمیم حسین قادری صاحب نے بھی کیا ہے اور ابتدا

میں ان کی رائے بھی درج کی گئی ہے جو پچے تلے الفاظ میں انھوں نے کتاب کے بارے میں ظاہر کی ہے۔

مواد کی تلاش اور کتاب کی ترتیب میں مولانا سید محمد متین ہاشمی نے جو محنت کی ہے اور جس انداز سے اُسے جمع کیا ہے، اس پر ہم انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اپنے قارئین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سے استفادہ کریں گے۔

دامنِ خواب

جناب راسخ عرفانی

ناشر۔ مکتبہ نورِ ادب، چوک نیائیں گوجرانوالہ۔

بہترین کتابت، عمدہ طباعت، شاندار کاغذ، اچھی جلد، دیدہ زیب سرورق۔

صفحات ۱۱۲۔ قیمت ۲۰ روپے

جناب راسخ عرفانی صاحب پنجاب کے مردم آفرین شہر گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں۔ وہاں کے ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور مشہور عالم و مبلغ مولانا نور حسین گرجاکھی مرحوم کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ ذوقِ شعری اُن کو وراثت میں ملا ہے۔ باپ اگر پنجابی کے اچھے شاعر تھے تو بیٹے نے اُردو کو ذریعۂ اظہار بنایا اور اس میں کامیاب رہے۔ اسلوبِ بیان نکھرا ہوا ہے اور عمدہ شعر کہتے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے چھپ کر اربابِ ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ چکے اور مستحق تحسین قرار دیے جا چکے ہیں۔ "دامنِ خواب" ان کا تازہ مجموعہ کلام ہے۔ جو بہترین اشعار کا دلآویز مجموعہ ہے۔ ملک کے نامور اہلِ قلم اور مشہور ادیب میرزا ادیب نے اس پر ابتدائیہ تحریر کیا ہے جس میں راسخ عرفانی کی شاعری پر عمدہ الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔ پھر "میرا ادبی سفر" کے عنوان سے خود راسخ نے بھی گوجرانوالہ کی چند پرانی یادوں اور قدیم ادبی محفلوں کی بعض تہوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے:

زیرِ تبصرہ مجموعے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

آخرِ شب ہے کشتِ سحر میں خون کے موتی بونے دو ۔۔۔ حسن کے رنگیں پیراہن میں غم کی باس سمونے دو
بادِ صبا کے دوش پہ برہم زلفِ بہاراں ہونے دو ۔۔۔ ارمانوں کو ماضی کی پُرکیف فضا میں کھونے دو

چپ سے بیٹھے ہیں کہ محفل سے ٹھنی ہو جیسے ۔۔۔ رنگ چہرے کا ہے وہ جاں پہ بنی ہو جیسے
ظلمتِ یاس میں امید کی مدھم سی کرن ۔۔۔ تپتے صحرا میں کہیں چھاؤں گھنی ہو جیسے

مقامِ افسوس ہے کہ رازِ نہاں کھلا ہے بیاں سے پہلے ۔۔۔ برستی آنکھوں نے قصۂ غم سنا دیا ہے زباں سے پہلے

غضب کیا ہے ستم کیا ہے دبا کے سینے میں رازِ غم کو — ہمارا جوشِ جنوں نمایاں نہیں تھا ضبطِ فغاں سے پہلے

وہی ہے شمس و قمر کی گردش، نجومِ شب کا چلن وہی ہے — غمِ جہاں سے ہو کیسے فرصت کہ سر پہ چرخِ کہن وہی ہے

ہزار فصلِ بہار آئے ہزار پھولوں پہ نور برسے — ہماری قسمت میں ہمصفیرو وہی قفس ہے وہی چمن ہے

خموشی سے کسی کے سامنے شرحِ بیان رکھ دی — سجا کر آنسوؤں سے بیکسی کی داستاں رکھ دی

یہ ایوانِ وفا ہے یا کسی کا آستانہ ہے — دفورِ شوق میں جانے جبیں اپنی کہاں رکھ دی

بڑھا جھگڑا تمھارے نام پر شیخ و برہمن میں — تو ہم نے بڑھ کر تصویرِ محبت درمیاں رکھ دی

جبینِ عجز کو اعزازِ کہکشاں نہ ملا — مرے سجود کو وہ سنگِ آستاں نہ ملا

اس غزل کا آخری شعر ہے:

خلوص و مہر کے قصے تو عام ہیں راسخ — کہیں بھی ان کا جہاں میں مگر نشاں نہ ملا

غرض راسخ کا یہ مجموعۂ شعری اہلِ ذوق کے لیے لائق مطالعہ ہے۔

مشاہدات و تاثرات ـــــ سفرنامۂ حج

از۔ ڈاکٹر شبیر بہادر خاں پنی

ملنے کا پتا: ڈاکٹر شبیر بہادر خاں پنی۔ دار الشفا، ایبٹ آباد

صفحات ۱۴۸ ـ قیمت درج نہیں۔

ڈاکٹر شبیر بہادر خاں پنی ضلع ہزارہ کے علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے زمانۂ طالب علمی سے لے کر اب تک کہ اسّی سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، ہمیشہ علماء و فضلا کی مجالس کو ترجیح دی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کا سفرنامۂ حج ہے اور اس میں انھوں نے اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کیے ہیں۔ یہ مبارک سفر انھیں ۱۳۹۷، ۱۳۹۸ھ (۱۹۷۷، ۱۹۷۸ء) میں پیش آیا۔ اس کی تمام روداد موصوف نے تفصیل سے قلم بند کی ہے اور مقاماتِ مقدسہ، مناسکِ حج اور دیگر امور کی وضاحت کی ہے۔ عازمینِ حج کو جن جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور جو جو معاملات ان کے سامنے آتے ہیں وہ اچھی طرح تحریر کر دیے ہیں ـــ اس کے علاوہ بیت اللہ شریف، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، مسجد قبا اور دیگر مقدس مقامات کی گزشتہ تاریخ بھی بیان کر دی ہے۔ پھر کون سا مقام کہاں واقع ہے اور اس کی کیا روحانی اور تاریخی اہمیت ہے، یہ سب باتیں مناسب الفاظ میں درج کر دی ہیں ـــ حج کے لیے جانے والوں اور دیگر حضرات کو اس قسم کی کتابیں پڑھنی چاہئیں تاکہ انھیں وہاں کے حالات و کوائف اور مختلف ملکوں سے آنے والے حجاجِ کرام کے بارے میں

(باقی بر صفحہ ۵۰)

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی - مئی ۱۹۷۹ء

شیخ عبدالرحمٰن چشتی	ڈاکٹر محمد عمر
کیا علما انگریزی تعلیم کے مخالف تھے؟	مولوی رفیع احمد بستوی
اسلام اور سامانِ تعیش	سید جلال الدین عمری
حالات نجم الدین کبریٰؒ	مولوی سید محمد فاروق بخاری

البلاغ، بمبئی - اپریل ۱۹۷۹ء

مطالعات و تعلیقات	قاضی اطہر مبارک پوری
زائرین حرمین	قاضی اطہر مبارک پوری
مطبوعات کی خریداری اور مخطوطات کی فراہمی	قاضی اطہر مبارک پوری

البلاغ، کراچی - اپریل ۱۹۷۹ء

اسلامی مملکت میں غیر مسلم شہری کے حقوق (مسلسل)	مولانا انیس الرحمٰن لدھیانوی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے اثرات	مولانا شمس الحق

بینات، کراچی - مئی ۱۹۷۹ء

سیرتِ مبارکہ صلی اللہ علیہ وسلم	جناب عبرت صدیقی
مدینہ منورہ کے دس محدث تابعین اور ان کی خدمات	جناب محمود عارف

ترجمان الحدیث، لاہور - مئی ۱۹۷۹ء

نظامِ زکوٰۃ و عشر اور ٹیکس ـ جائزہ اور تجاویز	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

ترجمان القرآن، لاہور - مئی ۱۹۷۹ء

تعزیرات اسلام (مسلسل)	مولانا بشیر احمد قاضی
علامہ ابن قیم (مسلسل)	پروفیسر طیب شاہین لودھی

شراب کے مادی اثرات و نتائج (مسلسل)	ریاض الحسن نوری
الحق، اکوڑہ خٹک ـ اپریل ۱۹۷۹ء	
فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ (مسلسل)	مولانا قاری محمد طیب
ریاض کی اسلامی جغرافیائی کانفرنس	مولانا بدر الحسن قاسمی
اولاد کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ	شیخ مصطفیٰ سباعی
سماجی اور معاشی انشورنس کی اسلامی تنظیم (مسلسل)	جناب نور محمد غفاری
مکتوبات و مواعظ مولانا رومی	پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض
فاران، کراچی ـ اپریل ۱۹۷۹ء	
حضرت عتاب بن اسید اموی	طالب ہاشمی
رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اور صوبہ سرحد	شریفہ فاروق
فاران، کراچی ـ مئی ۱۹۷۹ء	
حضرت بشیر بن سعد انصاری	طالب ہاشمی
مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن ـ چند گزارشات	عبد الستار غوری ایم اے
یہ انداز گفتگو کیا ہے؟	علامہ عرشی امرتسری
تقدیر اقبال کی نظر میں	طارق سعید
الفرقان، لکھنؤ ـ مئی ۱۹۷۹ء	
اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کے اصول اور طریقے	مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل
حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا ایک غیر مطبوعہ خط	مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی
خاندانِ نبوی [illegible]	مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی
معارف، اعظم گڑھ ـ مئی ۱۹۷۹ء	
قاضی [illegible] رومی مصنف شرح چغمینی ـ حالات و آثار	جناب شبیر احمد خاں غوری
[illegible] غزنوی (مسلسل)	سید صباح الدین عبد الرحمن
[illegible] اور مغل دور کا [illegible] (مسلسل)	ڈاکٹر ظفر الہدیٰ ـ ترجمہ سلطان احمد

جولائی ۱۹۵۹

المُعَارِف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

ماہ نامہ المعارف ـ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ـ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقام اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون نمبر: ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۲ | جولائی ۱۹۷۹ شعبان ۱۳۹۹ | شمارہ ۷

ترتیب

مجلسِ ادارت

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون نمبر: ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۲ | جولائی ۱۹۷۹ شعبان ۱۳۹۹ | شمارہ ۷

ترتیب

تاثرات

سال بھر کی گردشِ لیل و نہار کے بعد رمضان کا مہینہ پھر آ گیا ہے۔ یہ نہایت مبارک و مقدس مہینہ ہے اور انتہائی فضائل و برکات کا حامل ہے۔ اس میں اللہ کے نیک بندے دن کو روزے رکھتے اور رات کو قیام کرتے ہیں۔ یہ وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں قرآنِ مجید کے نزول کا آغاز ہوا اور اختتام کی منزل کو بھی اسی میں پہنچا۔ اس کتابِ ہدیٰ نے پوری دنیا کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا، بڑے بڑے سرکش لوگوں کے ضمیروں کو جھنجھوڑ ڈالا اور واقعات و حالات کی رفتار میں وہ انقلابِ عظیم پیدا کیا جو کبھی احاطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

اسی مہینے میں وہ معرکۂ کارزار گرم ہوا جسے تاریخ میں جنگِ بدر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس جنگ نے کفر اور اسلام کے درمیان فرق و امتیاز کی حقیقت واضح کر دی۔ مسلمانوں کو بے سروسامان اور بہت کم تعداد میں ہونے کے باوجود فتحِ مبین حاصل ہوئی اور مخالفین کی بہت بڑی مسلح طاقت کو شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا۔

اسی مہینے میں وہ شبِ اقدس آتی ہے، جو اپنی جلالت اور عظمت کی بنا پر قرآن کے الفاظ میں لیلۃ القدر کہلاتی ہے اور جس میں خیرات و حسنات کی تگ و تاز کا درجہ ہزار مہینے کی عبادت سے بھی فائق تر ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝

یہ وہ ماہِ مبارک ہے جس میں ایک ایک نیکی کا اجر و ثواب مقدار و تعداد کے لحاظ سے سیکڑوں گنے تک پہنچ جاتا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو پیکرِ طہارت، مجسمہ خیر اور رحمۃ للعالمین تھے، اس مہینے میں کثرت سے تلاوتِ قرآن کرتے اور عملِ خیر میں ہمہ تن مشغول ہو جاتے۔ اپنے اہل و عیال کو بھی اس کی تلقین فرماتے۔

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنی حیاتِ مستعار میں اس مہینے کی آمد کو غنیمت جانے اور جہاں تک ہو سکے اس میں اپنے آپ کو عبادت و نیکی کے لیے وقف کر دے تاکہ تقویٰ اور خوفِ خدا کی نعمتِ بے بہا سے بہرہ یاب ہو سکے۔ رمضان کی آمد اور روزے کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

پروفیسر علم الدین سالک
مرتبہ - پروفیسر احسان الٰہی سالک

حج کی اسلامی قدریں

آج سے ہزاروں سال پہلے کا واقعہ ہے کہ دنیا میں کفر و شرک کے طوفان اٹھ رہے تھے - اسلام کا نام و نشان باقی نہ تھا - توحید سے دنیا نا آشنا ہو چکی تھی - ہر طرف بت پرستی کا چرچا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک محبوب بندے کو ان باتوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے مامور کیا - یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو اسلام کی عالمگیر دعوت کے داعی تھے - مکہ مکرمہ ان کے اس مشن کا صدر مقام تھا اور کعبہ اس کا مرکز تھا جہاں سے یہ پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں نشر ہوا - اس مقصد کے لیے حج کا حکم دیا گیا تاکہ ایک خاص وقت میں وہ تمام لوگ جو اس پیغام پر ایمان رکھتے ہوں اور دنیا کے گوشے گوشے سے چل کر یہاں جمع ہوں - اس مرکز کے گرد طواف کر کے اپنے قول و فعل سے خداوند تعالیٰ کی عبودیت کا اقرار کریں اور دنیا والوں پر یہ حقیقت واضح کر دیں کہ ہم اختلاف ملک و قوم اور رنگ و نسل کے باوجود ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں اور اس سے علیحدہ ہونا اس مشن سے کٹ کر الگ ہو جانا ہے -

حضرت ابراہیم نے اپنے سب سے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس مشن کی خاطر مکہ میں اپنا جانشین مقرر کیا تاکہ وہ اپنے جلیل القدر باپ کے بعد اس تحریک کو جاری رکھیں - انھوں نے ایسا ہی کیا - اس فریضے کو بڑے جوش اور پیغمبرانہ ولولے سے ادا کیا - دنیا کا ہر گوشہ اس پیغام سے گونج اٹھا - ان کے بعد یہ سلسلہ کب تک قائم رہا اور ان کی اولاد کتنے عرصے تک اس دین پر کاربند رہی، تواریخ کے صفحے اس بارے میں بالکل خاموش ہیں - ہاں یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ چند صدیوں کے بعد یہ لوگ ملت ابراہیمی سے الگ ہو گئے، ان کی تعلیمات کو بھول گئے - ان کے مسلک سے بہت دور جا پڑے، اور ان میں آہستہ آہستہ بہت سی وہ برائیاں پیدا ہو گئیں جو حضرت ابراہیم کی بعثت سے پہلے تمام قوموں میں موجود تھیں -

ان حالات میں کعبہ جو خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا تھا، سینکڑوں بتوں کا گھر بن گیا اور سب سے عجیب تر بات یہ ہوئی کہ خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے بت بنے اور ان کی پوجا ہونے لگی۔ بتوں کے ساتھ ساتھ ستاروں، درختوں اور دیگر اشیا کی پرستش بھی شروع ہو گئی۔ کعبہ اب اہلِ عرب کے لیے ایک تیرتھ تھا اور اس کے متولی اب پروہتوں اور مہنتوں کے روپ میں جلوہ گر تھے۔ حج کی غرض و غایت تیرتھ یاترا سے زیادہ نہ تھی اور جس گھر سے توحید کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر عالم کو منور کرتی تھیں، وہ اب بت پرستی کی تبلیغ کا مرکز بن گیا۔ گویا حج کی حقیقی روح کا گلا گھونٹ کر اسے ایک میلے کی صورت دے دی جو ہر سال کے سال ہوتا تھا جہاں عرب کے بڑے بڑے قبیلے اپنی شان و شوکت دکھانے کے لیے شریک ہوتے۔ شراب خوری، زنا اور ہر قسم کی فحش کاری کھلے بندوں ہوتی۔ شعر و شاعری کے مقابلے ہوتے۔ اپنی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے اور اپنی فحش کاریوں کے افسانے بڑے شوق سے سناتے۔ مرد و زن برہنہ ہو کر طواف کرتے، سیٹیاں بجاتے، تالیاں پیٹتے، سنکھ پھونکتے اور اسے عبادت کہتے۔ قربانیاں کرتے مگر اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر مل دیتے۔ گوشت دروازوں پر ڈالتے اور یہ کہتے کہ یہ خون اور گوشت خدا کو درکار ہے۔

یہ ان لوگوں کی حالت تھی جن کی طبیعت میں شیخی بگھارنا تھا جو ذرا متین اور نیک نیت تھے، انھوں نے کئی عجیب و غریب رسوم و رواج اختیار کر رکھے تھے۔ ان میں بعض زادِ راہ کے بغیر گھر سے نکلتے۔ مانگتے کھاتے حج کرتے اور اسے توکل سمجھتے تھے۔ بہت سے لوگ حج کے ایام میں کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ بعض بات چیت ترک کر دیتے۔ اس قسم کی بے شمار رسوم حج میں داخل ہو چکی تھیں اور ان کا سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہا۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا پوری ہوئی:

"پروردگارِ عالم! ان کے درمیان ایک پیغمبر خود ان ہی کی قوم سے بھیجیو، جو انھیں تیری آیات سنائے اور کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق درست کرے۔"

چنانچہ رحمۃ للعالمینؐ دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کا خاندان صدیوں سے کعبہ کا متولی چلا آتا تھا مگر وہ اس زمانے کے دوسرے پروہتوں اور مہنتوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے کعبہ کو

تیرتھ بنا رکھا تھا اور خود پروہت تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنی تعلیمات سے اس نظام پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ پھر نہ اُبھر سکا۔ آپؐ نے ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی۔ جھوٹے خداؤں کی غلامی سے اہلِ عرب کو نجات دی۔ اسلام جو حضرت ابراہیمؑ لے کر آئے تھے اسے از سرِ نو زندہ کیا۔ اس میں اکیس سال صرف ہوئے۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو اب حضرت ابراہیمؑ کی طرح تمام دنیا کے خدا پرستوں اور موحدوں میں اعلان کیا کہ کعبہ تمھارا مرکز ہے۔ سب اطراف سے اہلِ اسلام حج کی خاطر اس مرکز کی جانب آئیں:

وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ط ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین ۰ (آل عمران: ۹۷)

اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو کوئی اس گھر تک آنے کی قدرت رکھتا ہو، وہ حج کے لیے آئے پھر جو کفر کرے (یعنی قدرت رکھتے ہوئے نہ آئے) تو اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

جب حج کا یہ اعلان ہوا تو اس کے ساتھ ہزاروں برس سے جو رسوم چلی آتی تھیں ان کو بالکل ملیامیٹ کر دیا۔ میلے، تماشے، شعر و شاعری، لڑائی جھگڑے، شہ زوری کے کرتب، فحش اور بد اخلاقی سب ختم ہو گئے۔ حکم ہوا کہ عبادت کا وہی طریقہ اختیار کرو جس کا ہم حکم دیتے ہیں:

واذکروہ کما ھدٰکم وان کنتم من قبلہ لمن الضالین ۰

اللہ کو یاد کرو اسی طرح جیسے تمھیں اللہ نے ہدایت کی ورنہ اس سے پہلے تم گمراہ تھے۔ (البقرۃ: ۱۹۸)

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج ۔ (البقرۃ: ۱۹۷)

حج میں نہ شہوانی افعال کیے جائیں، نہ فسق و فجور ہو اور نہ لڑائی جھگڑے ہوں۔

فخر پرستی کو بند کیا اور حکم کیا کہ:

جب اپنے مناسکِ حج ادا کر چکو تو جس طرح تم اپنے باپ دادا کا ذکر کیا کرتے تھے، اب اللہ کو یاد کیا کرو، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ (البقرہ: ۲۰۰)

نام و نمود کے لیے فیاضی سے روکا اور فرمایا کہ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے قربانی کرو، تاکہ وہ غریب حاجی اس سے مستفیض ہوں:

"اور جانوروں کو خاص اللہ کے لیے اسی کے نام پر قربان کرو۔ پھر جب ان کی پیٹھیں زمین پر ٹھہر جائیں (یعنی جب جان پوری نکل جائے اور حرکت باقی نہ رہے) تو خود بھی ان میں سے کھاؤ، اور قانع کو بھی کھلاؤ اور حاجت مند سائل کو بھی"۔ (الحج : ۳۶)

برہنہ ہو کر طواف کرنے سے بالکل روک دیا :

"قل من حرم زينة الله التى اخرج لعباده"۔ (اعراف : ۳۲)

اے نبی ان سے کہو کہ کس نے اللہ کی زینت کو حرام کیا جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی تھی۔ (یعنی لباس)

زادِ راہ کے بغیر سفر حج اختیار کرنا اور اسے توکل سمجھنا ایام جاہلیت میں دستور عام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے روکا اور سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ زاد راہ ضرور لو کیونکہ (دنیا میں زادِ راہ نہ لینا زادِ آخرت نہیں ہے) بہترین زادِ راہ آخرت کا تقویٰ ہے۔

سفر حج میں کمائی سے پرہیز کرنا بلکہ روزی کمانے کو سرے سے جائز ہی نہ سمجھنا بہت بڑی نیکی خیال کی جاتی تھی۔ مگر اللہ نے اسے جائز قرار دیا اور فرمایا کہ :

"کوئی مضائقہ نہیں اگر تم کاروبار کے ذریعے سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتے جاؤ"۔ (بقرہ : ۱۹۸)

گونگے حج اور بھوکے پیاسے حج سے منع کیا اور اسے تقویٰ کے منافی قرار دیا۔ اسی طرح جاہلیت کی تمام رسموں کو مٹا کر حج کو پرہیزگاری، خدا ترسی، پاکیزگی، سادگی اور درویشی کا مکمل نمونہ بنایا۔ حاجی جب حج کے ارادے سے اپنے گھر سے روانہ ہو تو وہ اس دنیا کی ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک صاف ہو۔ گالی گلوچ اور تمام بے ہودہ باتوں سے پرہیز کرے۔ یہ حج کی جانب پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد وہ اس حد پر پہنچے جہاں احرام باندھا جاتا ہے۔ وہاں پر لباس تبدیل کرے۔ احرام باندھے۔ احرام فقیرانہ لباس ہے جو امیر و غریب کے لیے یکساں ہوتا ہے تاکہ وہ اس فقیرانہ لباس میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو۔ احرام کی حالت میں انسانی خون تو در کنار جانوروں تک کا شکار حرام ہوتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ حاجی میں امن پسندی پیدا ہو، درندگی دور ہو اور وہ روحانیت کی منزل پر پہنچ جائے۔

اسلام نے امن پر بڑا زور دیا ہے - اس لیے حج کے چار مہینے حرام قرار دیے کہ اس مدت میں جنگ وجدل نہ ہو - راستے پُرامن ہوں - زائرین کعبہ سے کسی قسم کا تعرض نہ ہو - ان حالات سے گزر کر جب حاجی منزل مقصود پر پہنچے گا تو اسے قدم قدم پر ذکر، نماز، عبادت طواف کعبہ اور قربانی کے مناظر پیش آئیں گے - وہ ان سے متاثر ہو کر خود بھی اسی رنگ میں رنگا جاتے گا اور بے اختیار ہو کر پکار اٹھے گا :

لبیك - اللّٰهم لبیك - لبیك لا شریك لك لبیك - ان الحمد والنعمة لك، والملك لا شریك لك -

حاضر ہوں میرے مالک تیری طلب پر حاضر ہوں - میرے اللہ میں حاضر ہوں - تیرا کوئی شریک نہیں - میں حاضر ہوں - یقیناً تیری ہی حمد ہے - سب نعمت تیری ہی ہے - ساری نعمت تیری ہی ہے - تیرا کوئی شریک نہیں -

حج جب ان شرائط کے ساتھ ہو تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "ایسا حاجی حج کر کے اس طرح پلٹا جیسے وہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔"

حج ایک فریضہ ہے جو ہر اس شخص پر عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے جو کعبہ تک آنے جانے کا خرچ رکھتا ہو - ہاتھ پاؤں سے معذور نہ ہو - جب یہ دونوں شرائط پوری ہوں تو پھر خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں ہو اسے حج بیت اللہ پہنچنا ہوگا - کوئی عذر یا بہانہ اسے اس فرض کی بجاآوری سے روک نہیں سکتا - اگر وہ استطاعت رکھتے ہوئے حج نہیں کرتا تو وہ اپنے اللہ کے ساتھ کفر کرتا ہے -

حج اپنے اندر بہت سے فائدے رکھتا ہے - حضرت امام ابو حنیفہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب تک انھوں نے حج نہیں کیا تھا ، انھیں اس بات میں تردد تھا کہ سب سے افضل عبادت کون سی ہے - مگر جب انھوں نے حج کی سعادت حاصل کر لی اور اس کے فوائد کا بنفس نفیس اندازہ لگایا تو آپ بے تامل پکار اُٹھے کہ یقیناً حج سب سے افضل عبادت ہے -

حج کا سفر محض اللہ کے لیے ہوتا ہے ، اس سفر کے لیے ولولہ اور شوق اس وقت تک پیدا نہ ہوگا جب تک اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا جذبہ غالب نہ ہوگا - وہ فرض کی پکار کو سننے اور اسے ادا کرنے کے لیے بے قرار نہ ہوگا اور اس صورت میں جب اسے یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ ایک

لمبی مدت کے لیے اپنے گھر بار۔ خویش و اقارب اور کاروبار سے علیحدہ ہو رہا ہوں۔ مجھے اس سفر میں مال بھی خرچ کرنا ہوگا۔ سفر کی سختیاں بھی جھیلنی ہوں گی۔ وہ ان سب باتوں کو جان کر آمادہ ہوتا ہے، سفر کے لیے تیاریاں شروع کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل خدا کی محبت میں گداز ہونا شروع ہوتا ہے۔ نیک خیالات دل میں اُبھرتے ہیں۔ وہ اپنے گناہوں پر نادم ہو کر توبہ کرتا ہے۔ دوسروں کے پاس جاتا ہے۔ گناہ بخشواتا ہے۔ پھر سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ جوں جوں منزل نزدیک آتی ہے نیکی کا جذبہ بڑھتا جاتا ہے۔ وہ ہر بُری بات سے بچتا ہے۔ نیکی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اس طرح یہ سارا سفر اس کی عبادت بن جاتا ہے۔

جب وہ احرام باندھتا ہے تو اس کی ہر نقل و حرکت اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے۔ اس کا باطن یہاں کی پابندیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ دل کا کھوٹ دُور ہوتا ہے تمام باطنی آلائشیں دُور ہوتی ہیں اور اس کی روح نورِ حقیقی سے چمک اُٹھتی ہے۔

احرام باندھنے کے ساتھ جو کلمات حاجی کی زبان سے نکلتے ہیں وہ ہر نماز کے بعد۔ ہر بلندی پر چڑھتے وقت، ہر پستی میں اُترتے وقت، ہر قافلے کی پذیرائی کے وقت نیند سے بیدار ہوتے ہوئے۔ بلند آواز سے پکار پکار کر کہتا ہے۔

لبیک۔ اللھم لبیک۔ لبیک لا شریک لک۔ لبیک۔ ان الحمد والنعمۃ لک و الملک لا شریک لک۔

حاضر ہوں میرے مالک تیری جناب پر حاضر ہوں۔ میرے اللہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، یقیناً تیری ہی حمد ہے۔ سب نعمت تیری ہی ہے۔ ساری بادشاہی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ کلمات نہیں بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعوت کا جواب ہے جو انہوں نے خدا کے حکم سے دنیا کے ہر انسان کو دی تھی۔

"اے اللہ کے بندو! اللہ کے گھر کی طرف آؤ۔ زمین کے ہر گوشے سے، خواہ پیدل آؤ خواہ سواری پر آؤ"

یہ سلسلہ اس وقت سے چلا آتا ہے اور جب تک دنیا ہے آخری انسان تک جاری رہے گا۔ دنیا کے ہر گوشے سے انسان اللھم لبیک۔ کہتے ہوئے کعبہ کے آستانے پر حاضر ہوتے رہیں گے۔

حاجی مکہ پہنچتا ہے۔ مناسکِ حج ادا کرتا ہے اور اس سے فارغ ہو چکنے کے بعد اپنے وطن مالوف کو واپس آتا ہے۔ اس کا یہ سفر چند در چند وجوہ کی بنا پر بے حد اہم ہے۔ اسے اس حج کی بدولت عزم و ہمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق ملتا ہے۔ طوافِ کعبہ سے مرکزِ زمین سے وابستگی حاصل ہوتی ہے۔ مناسکِ حج میں تگ و دو کرنے سے اسے مجاہدانہ زندگی کے تمام مراحل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سفر میں جو سختیاں وہ جھیلتا ہے اس سے اس کی طبیعت میں استقلال اور تحمل پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حج ایک اجتماعی فریضہ ہے جسے اکیلا اکیلا مسلمان ادا نہیں کر سکتا بلکہ تمام مسلمان ایک ہی وقت یک جا ہو کر یہ فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ اجتماع دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک خاص موسم کے ایک خاص دن میدانِ عرفات میں جمع ہو کر ایک خاص لباس میں ملبوس ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی عبودیت کا اقرار کرتے ہوئے اس کی راہ میں اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ اس وقت ان میں اتحاد اور یک دلی ہوتی ہے۔ ہم آہنگی و ہم خیالی پائی جاتی ہے۔ ان کے خیالات میں پاکیزگی، تصورات میں نیکی، جذبات میں طہارت، دلوں میں خیر اندیشی اور خیر سگالی کا بے پناہ جوش اور ایثار و قربانی کے جذبات کا ابھرتا ہوا طوفان ہوتا ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ نعمت حاصل ہو سکے۔ انسانی دماغ لاکھ غور کرے، ہزار بار سوچے، وہ بنی نوعِ انسان کو یہ دولت عطا نہیں کر سکتا۔

حج ہر سال ہوتا ہے۔ ملک ملک کے مسلمان اس میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ دور و نزدیک سے راستے کی مشکلات اور سختیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے مکہ مکرمہ آتے ہیں۔ اس کی خاطر راستوں کا پُرامن ہونا لازمی ہے۔ اس کے لیے اسلام نے چار ماہ کو ماہِ حرام قرار دیا ہے، ان میں کسی قسم کی لڑائی بھڑائی نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ ہی مکہ مکرمہ اور حرم میں کسی جان دار کا خون گرانا حرام ہے۔ آج دنیا اسی امن و سلامتی کی متلاشی ہے۔ وہ صلح کانفرنسیں کرتی ہے مگر اس گوہرِ مقصود سے محروم ہے، جو حج کی بدولت صدیوں سے انسانیت کو حاصل ہے۔

حج کے موقعہ پر انسانوں میں خلوص و محبت کی دولت تقسیم ہوتی ہے۔ اس کی بدولت قلبی و روحانی اتحاد کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ اتحاد جو اس طرح میسر آئے گا، یقیناً دیرپا اور دائمی ہوگا جو کسی کے مٹائے نہ مٹے گا۔ یہ عالم گیر ہوگا، کیوں کہ حج کا اجتماع بھی ایک عالم گیر اجتماع ہے، جس کی بدولت

روحانی واخلاقی دولت کے علاوہ ہر قسم کے مادی و تعلیمی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں - ترقی کے لیے منصوبہ بندی ہو سکتی ہے - اس پر سال بسال ریویو کر کے اور غور و فکر سے کام لے کر دنیائے اسلام ترقی کی تمام منازل طے کر سکتی ہے - یہ ایک پہلو ہے، جس پر بہت کم غور ہوا ہے - حالانکہ یہ حج کا ایک نہایت اہم پہلو ہے جسے کسی صورت بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیے - کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو حج مکمل ہو سکتا ہے نہ اس کے روحانی اور مادی فوائد ہی پورے طور پر مرتب ہو سکتے ہیں - حج کی بدولت عالم اسلام کا مستقبل تابناک ہو گا - دکھوں سے تڑپتی دنیا کو اس کے ذریعہ سکون و اطمینان میسر آئے گا - انسانیت امن و سلامتی سے ہم کنار ہو گی - ہمارے باہمی جھگڑے اور اختلاف اسی عالم گیر روحانی اجتماع کے ذریعے طے ہوں گے -

---

ظفراللہ بیگ ایم اے

حضرت ابوبکر صدیقؓ بحیثیت ایک عظیم مدبّر

مسلمان کی پہچان تین باتوں سے ہوتی ہے۔ اس میں پہلی منزل ضرورت پڑنے پر ہجرت کی ہے یعنی دین کی خاطر اپنے اعزہ و اقارب و وطن چھوڑنے میں کس حد تک ثابت قدم رہا۔ دوسری منزل ترکِ مال کی ہے یعنی اس نے اللہ کی راہ میں کیا خرچ کیا۔ تیسری منزل جانی قربانی کی ہے۔ یعنی دین حق کی تبلیغ کے لیے کس حد تک جہاد کیا۔

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان تینوں باتوں میں اولیت حاصل کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حیاتِ طیبہ ایک ایسا شفاف آئینہ ہے کہ اسے دیکھا جائے تو اس میں ایک ایسے انسان کی صورت نظر آتی ہے جو ہر حیثیت اور ہر لحاظ سے مکمل ہے جن میں وہ تمام اوصاف جو ایک مکمل انسان کے لیے ضروری ہیں بہ یک وقت سمٹ کر جمع ہو گئے تھے۔

ایک انسان کی تکمیل کا دارو مدار اس کی ان دو باطنی قوتوں کی تکمیل و تربیت پر موقوف ہے جو قدرت نے اس کے اندر پیدا کر دی ہوں ۔۔ قوت نظری اور قوت عملی۔

قوتِ نظری: اس میں ذکاوت، تدبّر، حُسنِ فہم اور شہامت وغیرہ شامل ہیں۔

قوتِ عملی: اس سے جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں وہ شجاعت، سخاوت، عفت، غیرت، حلم اور خودداری وغیرہ ہیں۔

کسی انسان میں بہ یک وقت ان تمام اوصاف کا جمع ہو جانا انسانی سعادت اور خوش نصیبی کا عروج ہے۔

اگرچہ عمومی طور پر اس وصف میں دوسرے صحابہ کرام بھی شریک تھے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقام سب سے بڑھا ہوا تھا اور وہ حکمت و سعادت کے اس نقطۂ عروج پر فائز تھے جو نبوت سے نیچے اور باقی سب باتوں سے اونچا ہے۔ خلفائے راشدین میں حضرت

عمر فاروق رضؓ کو وسعتِ فتوحات نظم و نسق اور حکومت کے داخلی و خارجی انتظامات کی وجہ سے تاریخ اسلام میں جو عظمت حاصل ہے وہ ظاہر ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی مدتِ حکومت دس برس ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی کل سوا دو برس، اور اس مختصر مدت میں آپ نے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ فاروقی کارناموں کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ ہوتے تو مسلمانوں بلکہ خود اسلام پر ایک پُر آشوب دَور آگیا تھا۔ چاروں طرف سے خطرات و فتن کی تاریک گھٹائیں اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ انصار جن کے اسلام کے بارے میں شک کرنا بھی معصیت ہے۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہو کر نیابتِ رسولؐ کا فیصلہ کرنے میں مصروف تھے۔ مہاجرین بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے حالانکہ ان کا ایمان زیادہ راسخ اور ان کی دینی حمیت اور غیرت سب سے زیادہ قوی تھی مکہ مکرمہ میں منافقین کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جو بغاوت کے لیے پَر تول رہی تھی۔ ان مختلف گروہوں کے علاوہ متعدد قبائل بھی ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوتے تھے۔ کوئی مرکزِ حکومت سے قریب تھا اور کوئی دور، کوئی اسلام سے وابستگی رکھتا تھا اور کوئی منحرف ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ زکوٰۃ کو دینی فریضہ تو سمجھتے تھے مگر ادا کرنے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ ان ہی پُر فتن اور خطرناک حالات میں اسود عنسی، مسیلمہ کذاب، سجاع اور طلیحہ اسدی جیسے نابکار لوگوں نے اپنی مطلب برآری کے لیے مختلف راستے نکالنے شروع کر دیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اس قسم کے فتنوں نے کہیں کہیں سر اٹھانا شروع کر دیا تھا مگر اس وقت انھیں کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

یہ واقعات عین قوانین فطرت کے مطابق تھے، سورج غروب ہو جاتے تو تاریکی پھیلا ہی کرتی ہے۔ فصلِ بہار رخصت ہو جاتے تو پت جھڑ کا موسم آیا ہی کرتا ہے اور جب کسی خاندان کا سربراہ اٹھ جائے تو اس خاندان کے سنبھلنے میں کچھ دیر لگتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے مسلمانوں کا معاشرہ متاثر نہ ہوتا تو یہ ایک

عجیب سی بات ہوتی۔ چنانچہ عین انسانی فطرت کے مطابق اس وقت کا معاشرہ اس سانحہ جانکاہ سے ہل گیا تھا اور مسلمان مسائل کے خارستان میں الجھ گئے تھے۔ یہ ابوبکر ہی تھے جنھوں نے وفاتِ رسولِ اکرم کے سانحۂ عظیم کے باوجود اپنے فہم و فراست کو متوازن رکھا اور دوسروں کے لیے رہنمائی کا باعث بنے۔

یہ قومی وحدت کس نے پیدا کی؟ پورے عرب کو کس نے متحد کیا؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد بغاوت کا سیلاب جس زور شور سے اٹھا تھا اس کا خاتمہ کس نے کیا؟

اکابر صحابہ بلکہ خود حضرت عمر کی جبینِ استقلال پر اضطراب و تشویش کی شکن پڑ گئی تھی چنانچہ انھوں نے مشورہ دیا کہ جیشِ اسامہؓ کو شام کے سرحدی قبائل کی طرف بھیجنا ملتوی کر دیا جائے۔ مانعین زکوٰۃ سے جہاد نہ کیا جائے، لیکن خلیفۂ رسول نے جس ہمت اور تدبر و سیاست اور عالی حوصلگی کے ساتھ ان سب حالات و حوادث کا مقابلہ کیا وہ انسانی عزم کی تاریخ کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ بڑے بڑے مصنفین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان حالات میں جیشِ اسامہؓ کا بھیجنا ایسا نقطۂ نظر تھا جس نے قبائل عرب کو اور ایران و روم کی طاقتوں کو نفسیاتی طور پر مرعوب کر دیا تھا۔

ابوبکر نے اسلام کی راہ میں جنگ کی، اس لیے کہ ایسا کرنا ہی حق تھا اور حق آخر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ یہ وہی صدیق تھے جو اتباعِ رسول کے معاملے میں اپنی مثال آپ تھے۔ جہاں رسول کریمؐ کی کوئی سنت نظر آئی، اسے حرزِ جاں بنایا اور مانعین زکوٰۃ کا قلع قمع کر دیا۔ حضرت صدیق نے فتنہ ارتداد کے زمانے میں مرتدین کو جو سبق دیا وہ آپ کے مزاج اور دینِ حق کے عین مطابق تھا۔ مشہور مصری مصنف عباس محمود العقاد لکھتے ہیں:

"قدرت کو یہ منظور تھا کہ مرتدین کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ اکیلے ہیرو کا کردار ادا کریں۔ اس مسئلے میں تمام لوگوں نے اپنی رائے اور عمل کے مطابق حصہ لیا، مگر جو مقام صدیقؓ کے لیے متعین ہو چکا تھا وہ کسی کو میسر نہ آسکا۔" [۵]

---

[۵] عباس محمود العقاد۔ صدیق کامل ترجمہ منہاج الدین اصلاحی، ص ۲۱۴۔ الشاہ پریس لاہور

کی حرارت، یقین کے جوش، مروت و وقار اور محبت رسولؐ میں کوئی فرق نہ آیا۔ بوڑھے ہو گئے اور ہر فضیلت بڑی ہو کر اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ نبیؐ پاک کے بعد ہر چیز میں ثانی رہے، قبول اسلام میں ثانی، خلافت سنبھالنے میں ثانی مگر اتباع اور لبیک کہنے میں اوّل رہے۔[۲]

شرعی اور دینی امور میں انھوں نے جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہے، ان کی بنا پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی حضرت صدیق کی خلافت کو "خلافت خاصہ"[۳] کا عہد قرار دیتے ہیں۔

محمد حسین ہیکل مشہور مصری مورخ لکھتے ہیں:

"حضرت ابو بکرؓ کی اختیار کردہ سیاست کامیابی اور ظفر مندی کی ضامن تھی۔ ان کا عہد جہاں عدل و انصاف اور رعایا پر شفقت کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا، وہاں اس اولوالعزمی کا بھی جواب نہیں، جس کا نمونہ انھوں نے اپنے مختصر عہد حکومت میں پیش کیا۔"[۴]

صدیق اکبر دنیا سے رخصت ہو گئے مگر اس شان کے ساتھ کہ آخری لمحوں تک محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و احترام ملحوظ خاطر رہی۔ سکرات موت میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں دفن کیا گیا تھا، جواب ملا تین کپڑوں میں، آپؐ دو بوسیدہ کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ کہنے لگے، دو تو یہ ہیں، ایک نیا کپڑا خرید کر مجھے کفن دے دینا۔ حضورؐ کے کفن کے استفسار کے بعد ایک اور خیال بھی دامن گیر تھا۔ آرزو یہ تھی، کہ میرا انتقال بھی اس دن ہو جس دن رسول کریمؐ کا ہوا، اور پھر وصیت بھی یہ کی کہ مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

۲؎ عباس محمود العقاد: صدیق کامل: مترجم منہاج الدین اصلاحی، ص ۳۰۲۔ الشاپرس لاہور۔

۳؎ حضرت شاہ ولی اللہ۔ ازالۃ الخفاء، جلد ۱، ص ۹۔

۴؎ محمد حسین ہیکل: ابو بکر صدیق اکبرؓ: مترجم شیخ محمد احمد پانی پتی، ص ۳۳۵۔ نقوش پریس لاہور۔

ڈاکٹر محمد ریاض

شبلی اور معاصر سیاسی حالات

علامہ شبلی نعمانی کی شاعری، مکتوبات اور مقالات میں معاصر سیاسی حالات کے بارے میں دلچسپ تبصرے اور تجزیے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مکتوبات، مقالات اور فارسی اشعار کی تعداد زیادہ نہیں۔ مگر ان کی اردو شاعری کا نصف سے زیادہ حصہ سیاسی موضوعات سے ہی مربوط ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی تالیف "شبلی نامہ"[۱] اور کوئی ۲۵ سال بعد شائع ہونے والے اس کے نقشِ ثانی "یادگارِ شبلی"[۲] میں اس موضوع کو بالاجمال چھیڑا ہے۔ مگر شبلی کی اردو سیاسی شاعری کے کئی مضامین پر انھوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ راقم الحروف اس فرصت میں شبلی کے مکتوبات، مقالات اور کلیات[۳] (اردو اور فارسی) پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بعض نکات سے بحث کرے گا۔

عالمِ اسلام

عالمِ اسلام کے جن معاصر واقعات پر شبلی نے طبع آزمائی کی ان کا تعلق بلقان اور طرابلس کی جنگوں، خلافتِ عثمانی کی حمایت اور مسلمانانِ عالم کے اضمحلال سے ہے۔ شبلی کی اس شاعری کا تعلق ان کی زندگی کے آخری چند سالوں سے ہے (وفات ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء) مگر ترکوں کی حمایت اور معاصر عثمانی خلیفہ عبدالحمید خان ثانی کی مدح میں وہ اس سے پہلے بھی لکھتے رہے ہیں[۴]۔ ۱۸۹۲ء میں شبلی نے کوئی چھ ماہ تک ترکی اور بعض عرب ممالک میں قیام کیا اور اپنے مشاہدات کو "سفرنامہ روم و مصر و شام" نام کی کتاب میں منضبط فرمایا۔ اس کتاب میں بھی وہ ترکوں اور معاصر خلیفہ و امرا کی خوبیاں بیان کرنے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

۱؎ مطبوعہ شیخ نذیر مالک کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳۔ سال طباعت درج نہیں (بظاہر ۱۹۴۶ء؟) اور صفحات ۱۷۶ ہیں۔

۲؎ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ۱۹۷۱ء صفحات ۴۵۶ (بڑی تقطیع)

۳؎ کلیاتِ شبلی (اردو) طبع سوم اعظم گڑھ ۱۹۴۰ء — کلیاتِ شبلی (فارسی) کان پور ۱۹۱۶ء

۴؎ کلیاتِ شبلی (اردو) قطعہ صفحہ ۱۲۰ نوشتہ بظاہر ۱۸۷۸ء ملاحظہ ہو۔

کہتے ہیں کہ سر آغا خان سوم مرحوم نے ریاست ہائے بلقان کی جنگ کے زمانے میں ایک مضمون لکھا جس میں منجملہ دیگر امور کے ایک بات انھوں نے یہ لکھی کہ ترکوں سے یورپ والے اس لیے رقابت اور دشمنی رکھتے ہیں کہ یہ ایشیائی بھی ہیں اور یورپی بھی، اور یورپ والے ترکوں کی سابقہ تاخت و تاراج کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ لہذا اگر ترک اپنے یورپی علاقوں سے دست بردار ہو جائیں اور مکمل طور پر ایشیائی بن جائیں تو یورپ کے ممالک ان کے ساتھ مناقشت کرنا چھوڑ دیں گے۔ سر آغا خان سوم کی اصل تحریر ہمارے سامنے نہیں، مگر اس کے خلاف کئی مسلمانوں کی تحریریں موجود ہیں۔ علامہ شبلی نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں اس قول کا استہزا کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یورپ کے علاقوں سے دست کشی، ہر قسم کی علمی اور فنی ترقی سے بھی دست کشی ہے۔ جناب آغا خان خوب مشورہ دیتے ہیں کہ ترک مکمل طور پر ایشیائی بن جائیں اور دنیا کی ہر قسم کی ترقی کے ہنگامے سے بھی کان بند رکھیں :

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہوئے فائدہ یورپ میں گرفتارِ الم؟
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا ابد — پاؤں پھیلا کے پڑے چین سے سوؤ گے بچشم؟
نظر آجائے گی بے کاریِ آلاتِ جدید — جب کہ تم وادیِ تاتار میں رکھو گے قدم
ریل یا تار کی پھر ہوگی نہ حاجت تم کو — ڈاک پہنچانے کو آجائیں گے مرغانِ حرم
فیصلہ بیٹھ کے پیر پال ہیں کر دے گا ہو پنچ — ہوگا یورپ کے خوانین سے بڑھ کر محکم
اور مانا بھی کہ فردوس بریں ہے یورپ — حضرتِ خواجہ شیراز یہ کہتے ہیں رقم
"پدرم روضۂ رضوان بدو گندم بفروخت — ناخلف باشم اگر من بہ جوے نفروشم"

گفت با ترک حضرتِ آغا — آنچہ گویم بگوش در گیرید
بگذارید خاکِ یورپ را — دل ازین مرز و بوم برگیرید
ایشیا مسکنِ قدیمِ شماست — باز آن خاک را مقر گیرید
"کارِ دنیا کسے تمام نکرد — ہر چہ گیرید، مختصر گیرید"

ان قطعات کے صرف چند اشعار نقل کیے گئے ہیں، مگر دونوں کا مفاد یکساں نوعیت کا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ترکوں نے ایڈریانوپل کو فتح کیا تھا۔ شبلی نے اس موقع پر ایک پانچ شعری قطعہ لکھا اور ترکوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اے ترک، اے مجسمۂ کبریائے حق — اے وہ کہ جس پہ عالمِ ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملّتِ ختم الامم ہے تو — تو آج زورِ بازوئے شاہِ حجاز ہے

جنگِ بلقان کے زمانے میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں کا ایک طبی وفد ترکی گیا تھا۔ اس وفد نے ترک زخمیوں کی مدد کی۔ یہ وفد جب بمبئی پہنچا تو اس کے استقبال کرنے والوں میں شبلی بھی تھے — اس موقع پر انھوں نے ایک خیر مقدمانہ ترکیب بند پڑھا۔ دونوں بندوں کے ۲۷ اشعار ہیں اور ان میں شاعر وفد کے ممبروں کے لیے سراپا تحسین و آفرین ہے کہ انھوں نے شہیدوں اور غازیوں کی خدمت کی ہے۔ آخر میں شبلی ترکوں کی مزید کامیابی کی امید کرتے ہیں، اور ان کے لیے دست بدعا بھی ہوتے ہیں:

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی — تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے — کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں
دعا کے لفظ سائل سے اگر مقبولِ یزدانی — تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

جنگِ بلقان کے دوران وزرائے برطانیہ نے برصغیر کے مسلمانوں کے احساسات کے بارے میں ایک بحث کی تھی، مگر انھوں نے اس بات پر اظہارِ تعجب کیا کہ جنگ میں ترک ملوّث ہیں، اور برصغیر میں اس قدر بے چینی ہے۔ شبلی فرماتے ہیں کہ دینِ اسلام کی عالم گیریت کا یہی تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے دنیا بھر کے دینی بھائیوں کے غم خوار ہوں، مگر وزرائے برطانیہ کو اس کا کیا پاس ہوگا؟ ان حالات میں شبلی فرماتے ہیں:

مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالم گیریٔ ملّت — عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے
پڑا سوتا ہے کوئی گنبدِ خضرائے یثرب میں — کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے
کوئی جا کر کہہ دے ہم گنہگاروں کی جانب سے — کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطافِ نہاں تک ہے

ان دنوں برصغیر کے مسلمان وزرائے برطانیہ کے انتقادات پر برہم تھے، مگر بمبئی کی ایک گم نام سی اسلامی انجمن نے برطانیہ والوں کی ہم نوائی شروع کی۔ شبلی نے اس انجمن کے بارے میں بھی ایک طنزیہ قطعہ لکھا ہے۔

ہو مبارک [illegible] — کہ ترے تاج میں ہے طرّۂ سلطانی بھی

تیرے بازار میں وہ یوسفِ گم گشتہ ملا — جس کا مشتاق تھا خود یوسفِ کنعانی بھی
یہ الگ بات ہے، اندھوں کو وہ آئے نہ نظر — گو اسی زمرہ میں ہے یوسفِ ثانی بھی

مگر اس ضمن میں شبلی کی سب سے زوردار نظم وہ ہے جو بلقان اور طرابلس کی مُسلم کُش جنگوں سے متاثر ہو کر انھوں نے لکھی اور اس کا عنوان "شہر آشوب اسلام" رکھا۔ اس کے کوئی دو درجن اشعار ہیں اور سب عجیب سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس نظم کو شبلی نے لکھنؤ کے ایک جلسہ عام میں پڑھا تھا اور [illegible] کا سماں پیدا کیا تھا، مگر مجموعی حیثیت سے اس نظم پر یاس ہی کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور بلقان اور طرابلس کی جنگوں کے لیے ترکوں، عربوں اور دوسرے مسلمانانِ عالم کے بچاؤ کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو — یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں، زوالِ شرع و ملت ہے — عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اُٹھے — تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
کہیں اُڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے — غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں — تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے جائیں، تو شبلی اب کہاں جائیں — کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

مسجد کان پور کا حادثہ

مئی ۱۹۱۲ء میں کان پور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد کے وضو خانے کے انہدام کا حادثہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ایک نئی سڑک نکالنے کے سلسلے میں حکام کے حکم سے اس وضو خانے کو گرا دیا گیا۔ مسلمان انگریزوں کی ترک دشمن پالیسی پر پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چنانچہ ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو ہر سن و سال کے مسلمانوں کا ایک جمِ غفیر مسجد کے گرد جمع ہو گیا اور اس نے منہدم شدہ مسجد کی دیوار اور وضو خانے کو دوبارہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ مگر انگریزی حکومت کی پولیس اور فوج نے

مسلمانوں کے مجمع پر اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر دی، جس سے متعدد بچے، جوان اور بوڑھے شہید اور زخمی ہو گئے۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر کئی شاعروں اور اہل قلم نے ماتم کیا جن میں شبلی بھی شامل ہیں۔ علامہ شبلی نے شہدائے کان پور کے بارے میں چھوٹی بڑی ایک درجن سے زیادہ اردو اور فارسی نظمیں اور قطعے لکھے ہیں اور ان کی کئی نظمیں اور قطعے بے حد معروف و مقبول رہے ہیں۔ حادثۂ کان پور کا ہنگامہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وائسرائے ہند کو صلح و آشتی کی کوشش کرنا پڑی تھی۔ اس کے نتیجے میں نیچے سڑک بنائی گئی اور اوپر مسجد کی چھت۔

ایک قطعے میں شبلی فرماتے ہیں کہ حکام کے نزدیک مسجد کا وضو خانہ معمولی چیز سہی، مگر مسلمانوں کے نزدیک وہ بھی مسجد کا ایک اہم جزو اور محترم و عزیز ہے۔

گفتی کہ وضو خانہ بہ تعظیم نیرزد[۵۵] زاں رو کہ آں خانہ نہ مسجد نہ کنشت است

ما بندۂ فرمان تو ہستیم ولیکن "معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت است" (سعدی)

ذیل کے دو دو شعری تین قطعے دیکھیے اور حادثۂ کان پور پر شبلی کے احساسات کا اندازہ لگائیے۔ مگر وطن میں اس دردناک حادثے کے پیش آنے کے باوجود، شاعر ریاست ہائے بلقان کے مسلمانوں کے دکھ درد کو بھی نہیں بھولا۔ تیسرے قطعے میں شبلی اپنے پاؤں کے کٹ جانے کے حادثے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انھیں افسوس ہے کہ ہنگامۂ کان پور میں شرکت نہ کر سکے ورنہ اسیری کا فخر تو شاید حاصل کر ہی لیتے۔

کیا پوچھتے ہو کہ رسولِ عربؐ کی قوم کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں

سُن لو وہ گنجہائے گراں مایہ دفن ہیں کچھ بلقان کی خاک میں، کچھ کان پور میں

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے

بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خون کہ کان پور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں

---

[۵۵] اردو میں بھی انھوں نے یہ باتیں لکھی ہیں، جیسے

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح یہ اگر سچ ہے تو جز خوبیِ تقدیر نہیں

جزوِ مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں

آپ کہتے ہیں وضو خانہ تھا مسجد سے الگ یہ تو اک مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں

پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ — یعنی اب موسم میں زنجیر کے قابل بھی نہیں

ایک قطعے میں شبلی عالمانِ دین کی گرفتاری کو حضرت زین العابدینؒ کی اسیری کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور نابالغ بچوں کی شہادت پر عجیب دل گداز اور رقت آمیز انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔

پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں — یہ زیور سید سجادؒ عالی کی وراثت ہے

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے — اگر اس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں — کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

دوسرے شعر کے دو نادر قطعوں میں شبلی نے مسجد کے سانحے کو بنگال کی تنسیخ تقسیم کے حوالے سے منسلک کیا اور انگریزی کی دو گونہ پالیسی پر انتقاد ملیح کیا ہے۔ یو پی کے گورنر جیمس مسٹن کو اپنے محکم فیصلے پر بڑا ناز تھا کہ مسجد کے متوضی کے انہدام کا جو فیصلہ کر دیا گیا اسے کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شبلی کہتے ہیں کہ وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں جب تقسیم بنگال کا اعلان کیا تو غیر مسلموں کی مخالفت کے رونما ہونے پر برطانیہ کے وزیر اعظم نے یہی کہا تھا کہ یہ فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا مگر ۱۹۱۱ء میں جب برطانیہ کے تاجدار نے دہلی میں دربار لگایا اور تاجپوشی کی تو تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر کے غیر مسلموں کی مسرت کا سامان بہم پہنچا دیا۔ (لات، انگریزی لفظ لاٹ کا مفرس ہے)

جنابِ 'لات' از فرمودہ خود برنمی گردد — کہ تمکین حکومت را سیاست بیشتر باید

ولے در قسمت بنگالہ این اندیشہ می بایست — کہ گر برگشتن اول بندہ می باید اگر باید

حضرت 'لات' بفرمود کہ فرمان فرمائے — نیست ممکن کہ دگر بگذرد از گفتۂ خود

صدرِ اعظم بسوئے قسمت بنگالہ شرقی — نگہے کرد و بفرمود کہ 'من کردم و شما'

وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے جب مسجد کانپور کے تنازعے کا فیصلہ کروایا اور قیدیوں کی آزادی کا اعلان کیا تو اس وقت شبلی نے تشکر آمیز جذبات پر مشتمل ایک نظم لکھی تھی کہ:

تو نے ظاہر میں عنایات تو فرمائی ہے شکست — پر حقیقت میں ظفرمندی سلطانی ہے

[illegible] تری تقریر نے [illegible] — گرچہ لازم [illegible] باقی ہے

گرچہ [illegible] سے [illegible] — شکر احسان [illegible] فطرت انسانی ہے

مگر اس مضمون پر شبلی کا [illegible] ہے۔ اس کا آخری مصرع مثل کی طرح

مشہور ہے اور پوری نظم شاعر کے دردِ دل کی مظہر ہے :

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے — دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خرد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر — بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر — نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ نوجوان ہیں بے خبر نشۂ شباب — ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اُٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ — مجرم کوئی نہیں ہے، مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار — از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر — لذت شناسِ ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا — جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا — ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

شبلی کی سیاسی شاعری کے تین چار موضوعات اور ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا قیام، ندوۃ العلما، احرار اور مسلم لیگ۔ اس کے علاوہ پہلی عالمی جنگِ عظیم کے دوران اگست ۱۹۱۴ء میں شبلی نے ایک نظم لکھی تھی اور جرمنوں اور ان کے حلیفوں کا پلہ بھاری ہونا بتایا تھا، مگر بعد میں نتیجہ بھی یہی نکلا :

اک جرمنی[۵۵] نے مجھ سے کہا از رہِ غرور — آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم — اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس، تو وہ رندِ لم یزل — آئیں شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا، غلط ہے ترا دعویٔ غرور — دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے — تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور — پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" (غالب)

شبلی کی ندوۃ العلما لکھنؤ کے کاموں میں شرکت، اگست ۱۹۰۴ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک "الندوہ" نام

---

۵۵ [illegible] اور آگے جرمن بجائے جرمنی۔

کے علمی اور دینی مجلے کی ادارت اور آخر میں اختلافات کی بنا پر اس ادارے سے ان کی علیحدگی کے بارے میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کافی لکھ چکے۔ علی گڑھ تحریک سے شبلی کے ائتلاف و اختلاف کے بارے میں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں مکاتیبِ شبلی جلد دوم اور مقالاتِ شبلی جلد ہشتم (ہر دو مطبوعہ اعظم گڑھ) میں مندرج کئی تحریریں بھی گرہ کشا ہیں۔ کلیاتِ شبلی (اُردو اور فارسی دونوں) میں ان موضوعات پر کافی منظومات اور ابیات موجود ہیں۔ بعد کے اختلافات سے قطع نظر شبلی مدتوں علی گڑھ کالج اور ندوۃ العلما دونوں کے ہمدرد اور بہی خواہ رہے ہیں۔ انھوں نے کالج میں کوئی سولہ برس تک تدریس بھی کی اور دیگر نظموں کے علاوہ، ان کی مثنوی 'صبح امید' ہی اس کالج اور اس کے بانی سر سید احمد خان کا آج بھی ایک گراں قدر توصیف نامہ قرار پاسکتی ہے۔ سر سید احمد خان مرحوم (وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) کے دورِ حیات میں شبلی نے علی گڑھ کالج کی توصیف اور اس کے لیے مالی اعانت جمع کرنے کے سلسلے میں کئی نظمیں لکھی اور پڑھی تھیں، مگر اس دور کے بعد کی ان کی نظمیں تعریضی اور طنزیہ ہیں:

مسلم یونیورسٹی

شبلی کے اشعار میں مندرجہ ذیل امور کی طرف اشارے ہیں:

۱۔ کالج کے یونیورسٹی بن جانے کی صورت میں اس کے نام کے بارے میں، حکومت علی گڑھ یونیورسٹی کے نام پر اصرار کرتی تھی جبکہ مسلمان لفظ مسلم کا اضافہ چاہتے تھے (مسلم یونیورسٹی)

۲۔ یونیورسٹی کے ساتھ برصغیر کے تعلیمی اداروں کا مسئلہ۔ حکومت اس یونیورسٹی کے منطقہ الحاق کو دیگر یونیورسٹیوں کی طرح رکھنا چاہتی تھی مگر مسلمانوں کا اصرار تھا کہ برصغیر بھر کے کالج اور سکول اس سے الحاق رکھنے کے مجاز ہوں۔

۳۔ مسلمان مجوزہ یونیورسٹی کے عمل دخل میں آزادی کے قائل تھے، مگر حکام چاہتے تھے کہ سرکار کے نامزد افراد کو قوتِ فیصل حاصل ہو۔

۲۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کو انہی مسائل پر غور کرنے کے لیے راجا صاحب محمود آباد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد ایسے زعما کا ایک اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں جوہر اور ابوالکلام ایک طرف تھے اور اربابِ علی گڑھ (راجا صاحب محمود آباد کی قیادت میں) ایک طرف، مگر ایک دن کے وقفے کے بعد جوہر علی گڑھ والوں کے ہم نوا ہو گئے اور ابوالکلام تنہا رہ گئے۔ دونوں سردارانِ احرار، مولانا جوہر اور مولانا آزاد، شبلی کے بمنزلہ

تلامیذ تھے مگر استاد نے ان "احرار" کے عدمِ استقامت پر ایک پوری نظم لکھی اور آخر میں فرمایا:

احرار کا طریق عمل ہے اگر یہی — پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

سر آغا خان سوم مرحوم نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کے لیے بے حد کوشش کی تھی۔ انھوں نے سر سید احمد خاں کی طرح برِصغیر کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور مختصر مدت میں تیس لاکھ روپے کی خطیر رقم اکٹھی کی تھی۔ وہ جب لاہور آئے، تو شبلی بھی ان کے ساتھ تھے اور مولانا ئے موصوف نے یونیورسٹی فنڈ میں لوگوں کو مدد دینے کی تحریک کرنے کے ضمن میں فارسی میں ایک زوردار نظم بھی پڑھی تھی۔ مگر شبلی کے نزدیک نصاب تدریس اہم تھا۔ "مسلم" نام اور مسئلہ الحاق کو وہ چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس قسم کی مساعی کا استہزا کیا ہے جو نام یا الحاق کے سلسلے میں کی جا رہی تھیں۔ دو نظموں میں انھوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے رویے پر طنز کی ہے۔ خواجہ صاحب اس تحریک کے خلاف تھے جو کالج کے مسائل حل کرنے کے لیے وائسرائے سے ملاقات کے لیے ایک وفد بھیجنے کے سلسلے میں چلائی جا رہی تھی، مگر جب خود ان کا نام وفد کے ارکان میں شامل کیا گیا تو وہ اس وفد کی افادیت کی باتیں کرنے لگے۔ شبلی نے دو نظمیں اسی سلسلے میں لکھی ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے نصاب کے بارے میں انھوں نے اس زمانے میں درج ذیل نظم لکھی اور اس کے ذریعے غیر نصابی سرگرمیوں کا استخفاف کیا ہے:

ہمارے لیڈروں کے مشغلے اب بڑھتے جاتے ہیں — کہ اب سازش کی بھی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے
ہماری مجلسِ قومی کے جب اجلاس ہوتے ہیں — تو اخلاقی قواعد میں بھی کچھ ترمیم ہوتی ہے
بٹھائے جاتے ہیں کالج کے لڑکے صدر و پائیں میں — سکھائی جاتی ہے جو کچھ نئی اسکیم ہوتی ہے
ادھر اسٹیج پر سرگوشیاں ہوتی ہیں آپس میں — اشاروں میں ادھر فردِ عمل تقسیم ہوتی ہے
طلسمِ چشم و ابرو کے جو اسرارِ نہانی ہیں — نو آموزوں کو ان کی رمز کی تعلیم ہوتی ہے
کسی پر تالیاں بجتی ہیں تحقیر و اہانت کی — کسی کی ہر ادا پر عزت و تکریم ہوتی ہے
کسی آزاد گو کے کان میں کچھ پھونک دیتے ہیں — کہ جس سے کچھ امیدِ شیوۂ تسلیم ہوتی ہے
شکایت ہوتی ہے جب تشنۂ کامانِ تفاخر کو — تو پھر جامِ سفارت میں بھی کچھ تعمیم ہوتی ہے
یہاں تک تو خدا کے فضل سے ہم نے ترقی کی — اب آگے دیکھیے اس فن میں کیا ترمیم ہوتی ہے

ندوۃ العلما لکھنؤ کے بارے میں شبلی کی سیاسی نظمیں اُن کے آخری سالِ حیات (۱۹۱۴ء) سے مربوط

ہیں۔ شبلی اس دینی ادارے کے معتمد تھے۔ مگر ان کی مجوزہ بعض اصلاحات کی مخالفت ہوئی اور بات یہاں تک بڑھی کہ شبلی کو استعفیٰ دینا پڑا۔ لیکن طلبائے ندوہ نے شبلی کی حمایت میں اور انھیں واپس لانے کی خاطر تین ماہ تک ہڑتال کی اور برصغیر کی بعض ریاستوں نے بھی شبلی کے موقف کی حمایت کی۔ شبلی کے حامی "حزب الاحرار" گروہ کی اگرچہ بڑی حمایت تھی، مگر داخلی اختلافات کی شدت کی بنا پر شبلی ندوۃ العلما میں واپس نہ آسکے۔ ان دنوں اربابِ علی گڑھ بھی ندوۃ العلما کی حمایت کرکے شبلی سے اپنے اختلافات کا بدلہ لے رہے تھے، حالاں کہ اس سے قبل ندوۃ العلما اور علی گڑھ کالج میں مکمل مغائرت رہی تھی۔ شبلی نے ان حالات سے اثر پذیر ہوکر کئی نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ اربابِ علی گڑھ کا یہ عمل بغضِ معاویہؓ ہے، اسے حُبِ علیؓ نہیں کہہ سکتے۔

کیا لطف ہے کہ حامیٔ ندوہ ہیں اب وہ لوگ   جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا
وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوہ غریب   اک بیہودہ خیال تھا یا آنکہ خواب تھا
حیرت یہ ہے کہ مجمعِ دہلی میں یہ گروہ   ندوہ کے حل و عقد کا نائب مناب تھا
سرشار ہے حمایتِ ندوہ میں وہ گروہ   جس کو کہ اس کے ذکر سے بھی اجتناب تھا
بغضِ معاویہؓ ہے، یہ حبِ علیؓ نہیں   اک ایک کی زباں پہ یہ فصل الخطاب تھا

ایک دوسری نظم میں شبلی ندوۃ العلما کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ اس کی خدمات کو برصغیر کے علمی اور دینی حلقوں کے علاوہ عالمِ عرب میں بھی سراہا جاتا رہا اور ایڈیٹر مجلہ "المنار" (قاہرہ) سید رشید رضا بھی اس ادارے کی دعوت پر برصغیر تشریف لائے، مگر افسوس کہ ان دنوں یہ عالم تاب ادارہ نشانۂ تضحیک بنا ہوا ہے۔ اس نظم کے آغاز میں اربابِ علی گڑھ کے ایک وفد کے معائنۂ ندوۃ العلما پر اعتراض کیا گیا ہے بعض والیانِ ریاست کی تحریک پر یہ وفد ندوۃ العلما کے حالات کا جائزہ لینے لکھنؤ گیا تھا اور شبلی کو اس پر دکھ ہوا:

آتا ہے اب معائنۂ ندوہ کا مشن   جو اختراعِ مجمعِ حکمت شعار ہے
خود کوزہ گر ہے خود گلِ کوزہ بھی ہے وہی   جو مصلح ہے وہی روشِ کارزار ہے
کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوۂ علوم   جو مدعیٔ رہبریٔ روزگار ہے
جس پر یہ حسنِ ظن ہے کہ ہے مجمعِ کرام   جس کا کہ مصر و شام میں اب تک وقار ہے

۵۷ ۱۰ مئی ۱۹۱۴ء کے اجلاس کی طرف اشارہ ہے جس نے ندوۃ العلما میں ہڑتال سے پیدا شدہ صورتِ حال پر غور کیا تھا۔

آیا تھا جس کے شوق میں وہ فاضلِ عرب — جس کا مرقعِ ادبی "المنار" ہے
جس نے بدل دیا روش و شیوۂ قدیم — یہ انقلابِ گردشِ لیل و نہار ہے
آتے ہیں اس کی جانچ کو ناآشنائے فن — جو رہبرِ طریقۂ اصلاحِ کار ہے
اربابِ ریش و جبۂ اقدس کا وہ گروہ — اب چند منشیوں کا اطاعت گزار ہے

"مذہب الاحرار" شبلی کا ہم نوا سہی، مگر شاعر نے کئی موقعوں پر اس کی بھی خبر لی ہے۔ ہوا یہ کہ احرار کے بھی دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک حکومت کا ... ہم نوا تھا اور دوسرا مخالف۔ ۲۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو جس وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی اور کان پور کی مسجد کے قضیے کو حل کروانے پر اس کا شکریہ ادا کیا، شبلی نے "الہلال" کلکتہ میں ان کے بارے میں لکھا:

احرار اور مدّعیانِ وفا ہیں اور — دونوں کا ہے طریقۂ سود و زیاں الگ
دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اٹھا دیا — قائم ہوا جو معرکۂ امتحاں الگ
جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار — کھولیں گے اب وہ ملک میں اپنی دکاں الگ
یہ مختصر فسانۂ بزمِ شبینہ ہے — سنیے گا "الہلال" میں یہ داستاں الگ

"دار وفد" کے سپاسنامے (ایڈریس) کا بھی شبلی نے استخفاف کیا ہے اور اس ضمن میں دو دو ابیات پر مشتمل دو قطعے لکھے ہیں، مگر انھیں نقل کرنے سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔

شبلی کے سیاسی اشعار زمیندار (لاہور)، مسلم گزٹ (لکھنؤ)، ہمدرد (دہلی) اور الہلال (کلکتہ) میں شائع ہوتے رہے۔ شاعر کا فرضی نام کشاف یا وصاف لکھا جاتا رہا۔ مگر بعد میں انھوں نے اپنا نام بھی لکھنا شروع کر دیا۔ شبلی کے سیاسی اشعار ابتذال سے پاک ہیں مگر تعجب ہوتا ہے کہ سنجیدہ علمی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے والا یہ عجیب الاذواق شخص روزانہ یا ہفتگی ملکی سیاسی موضوعات پر اس طرح لکھتا رہا جس طرح آج کل کے صحافیوں کا معمول ہے:

تندی و سیہ کاری مستی و نظر بازی — زینگونہ اگر خواہی بسیار رمز دارم
اے شبلی نعمانی این پردہ دری از چیست؟ — اینہا کہ ز خود گفتی من نیز خبر دارم

خواجہ عبدالحمید یزدانی

مثنوی رومی میں ذکر خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

دفتر سوم کے شروع میں "قصہ خورندگان پیل بچگان از حرص . . ." میں دو تین مرتبہ حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سعادت اثر آیا ہے۔ اس قصے میں مولانا رومی نے بچگان فیل کے شکاریوں کی، جو کسی دانا کی نصیحت سے اغماض برتتے اور بعد میں نقصان اٹھاتے ہیں، تمثیل کے ذریعے اولیاء اللہ کی دل آزاری کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔ اس حصے میں ایک جگہ رقص کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے ایسے رقص کی تحریض کی ہے جس سے انسان حرص و شہوت سے پاک ہو کر اپنی ذات کو فنا کر دے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ مردانِ خدا اپنے خون میں رقص کرتے ہیں اور یہ کہ فطرت کے رقص کو سمجھنے کے لیے گوشِ دل کی ضرورت ہے۔ ان ظاہری کانوں کو بند کر کے ہی فروغ جاں حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ظاہر سے گریز کر کے صرف اسی ذاتِ اقدس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ یہاں لفظ "گوش" آجانے کے سبب مولانا سورہ التوبہ کی ایک آیت کے حوالے سے سرورِ کائنات کو سراپا گوشِ (باطن) کہتے ہیں۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم باتوں ہی باتوں میں اسرار کو بھانپ جاتے تھے۔ اس کے بعد پھر حضورؐ کی ذات پاک کو سراپا چشم و گوش کہہ کر حضور کی رحمت و نوازش کو دایہ اور عام انسان کو شیر خوار بچے سے تشبیہ دی ہے۔ اور پھر رجوع بقصۂ مذکور ہے:

رقص و جولان بر سر میدان کنند رقص اندر خون خود مردان کنند
چون رہند از دست خود دستی زنند چون جہند از نقص خود رقصی کنند
مطربانشان از درون دف میزنند بحرہا در شورشان کف می زنند
تو نہ بینی برگہا با شاخ ہا کف زنان رقصان ز تحریک صبا
تو نہ بینی لیک بہر گوششان برگہا با شاخہا ہم کف زنان
تو نہ بینی برگہا را کف زدن گوش دل باید نہ این گوش بدن
گوش سر بر بند از ہزل و دروغ تا بہ بینی شہر جان را با فروغ

ہین دہان بربند از ہزل ای عمو | جز حدیث روی دلبر چیزی مگو
پیش گشتہ گوش محمد در سخن | کش نگوید در بنی ہو اذن ۵۱
سر بسر گوش ست و چشم ست آن نبی | رحمت او مرضعت و ما صبی ۵۲

مذکورہ شکاری ہاتھی کا بچہ بھون بھان کر کھا جاتے ہیں ، مگر ہاتھی سونگھ کر پہچان لیتا ہے۔ صرف ایک شکاری اس سے اجتناب برتتا ہے۔ اتنے میں ہتھنی آپہنچی اور شکاریوں کے منہ سونگھنے لگتی ہے ۔ جس شکاری نے ہاتھی کا بچہ نہیں کھایا تھا اس سے اس نے تعرض نہیں کیا اور وہ بچ جاتا ہے لیکن جس کے منہ سے کباب کی بو آتی ہے ہتھنی اسے ہوا میں اچھال کر زمین پر پٹخ دیتی اور ہلاک کر ڈالتی ہے ۔ یہاں مولانا نے بو کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ اہل دل بو کی بنا پر ، جو ایک قسم کی لہروں یا ارتعاشات کی صورت میں ہوتی ہے ، صاحب بو کے سیرت و کردار کی خوبی یا خرابی کو جان لیتے ہیں۔ لیکن جس طرح اللہ اپنے بندوں کے عیوب چھپاتا ہے اسی طرح اللہ کے خاص بندے بھی کہ "تخلقوا باخلاق اللہ" کے آئینہ دار ہوتے ہیں ، عوام الناس کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں ۔ اس ضمن میں مولانا رومی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کر کے حضور کی سیرت طیبہ کے اس پہلو کو پیش کیا ہے کہ حضور جاننے کے باوجود بھی کسی کی برائیوں کو اچھالتے نہیں تھے بلکہ پردہ پوشی اور اغماض سے کام لیتے تھے تاکہ وہ شخص شرمسار نہ ہو اور اس کی دل آزاری نہ ہونے پائے ۔ اس کے بعد مولانا نے بتایا ہے کہ انسان کی اچھائی اور برائی کی بو ہر صورت میں ، خواہ وہ بیدار ہو یا محو خواب ، دوسروں تک پہنچتی رہتی ہے ۵۳ اور حق بین اس کو محسوس کر لیتے ہیں۔

---

۵۱ سورہ التوبہ ، آیہ ٦١ : ان (منافقین) میں سے بعضے ایسے ہیں کہ نبی کو ایذائیں پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ہر بات کان دے کر سن لیتے ہیں ۔ آپ فرما دیجیے کہ وہ نبی کان دے کر تو وہی بات سنتے ہیں جو تمہارے حق میں خیر (ہی خیر) ہے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنین کا یقین کرتے ہیں اور آپ ان لوگوں کے حال پر مہربانی فرماتے ہیں جو تم میں ایمان کا اظہار کرتے ہیں ۔

۵۲ کتاب مثنوی ، ص ۲۰۴ ، ۲۰۵ ۔ مثنوی رومی دفتر ۳ ، ص ۵

۵۳ اس ضمن میں تشبیہات رومی سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو : "اکثر صوفیا اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص کے جسم سے بھی مخصوص قسم کی لہریں یا ارتعاشات صادر ہوتے ہیں ۔ ہر شخص کے گرد ان ارتعاشات کا ایک ہالہ ہوتا ہے جو حساس نفوس کے لیے مرئی و محسوس ہوتا ہے ۔ اکثر اوقات ایسے لوگ جن کی حس خاص طور پر تیز نہیں ہوتی کسی اجنبی شخص کو دیکھتے ہی یا کچھ کشش محسوس کرتے ہیں یا کم و بیش منافرت ۔ عام نفسیات نے بھی اس کی توجیہ کی کوشش کی ہے ، مگر یہ نفسیات اہل دل کے تجربات تک نہیں پہنچی ۔" (ص ٢٩٨ ، ٢٩٩)

طرف لے جاتا ہے، حالاں کہ اس کی خوراک دیدارِ محبوبِ ازلی ہے۔ یہ روح انسان کے ہاتھوں اس شکنجہ اور آزمائش و ابتلا میں پڑنے کے خلاف خدا کے حضور داد و فریاد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ مجھے اس ظالم جیلر سے نجات دلا۔ اللہ تعالیٰ اسے صبر کی تلقین فرماتا ہے۔ لیکن وہ اپنے مرکز سے دوری اور اپنے پیمانہ صبر لبریز ہونے کا رونا روتے ہوئے کہتی ہے کہ میری کیفیت ایسے ہے جیسے حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کے نرغے میں ہوں، یا حضرت صالح ثمود کی مجلس میں پڑے ہوں۔ اس کے بعد پھر روح کے اس ظلم کے خلاف اپنی بے تابی اور بے قراری کا اظہار کرتے ہوئے، واپس بلانے کے لیے اللہ سے التجا کرتی ہے:

حسرت یوسف آن دل حق جوی تو چون اسیری بسته اندر کوی تو
جبرئیلی را بر استن لبسته ای پرّ و بالش را بعمدا خسته ای
پیش او گوساله بریان آوری که کشی او را بکهدان آوری
که بخور اینست مارا لوت پوت نیست او را جز لقای الله قوت
زین شکنجه و امتحان آن مبتلا میکند از تو شکایت با خدا
کای خدا افغان ازین گرگ کهن گویدش نک وقت آمد صبر کن
داد تو وا خواهم از هر بی خبر داد که دهد جز خدای داد گر
او همی گوید که صبرم شد فنا در فراق روی تو یا ربّنا
احمدم در مانده در دست یهود صالحم افتاده در حبس ثمود
ای سعادت بخش جان انبیا یا بکُش یا باز خوانم یا بیا
با فراقت کافران را تاب نیست کاین فراق اندر خور اصحاب نیست[۵۶]

ان اشعار کے بعد پھر قصۂ مذکور کی طرف رجوع ہے، جس میں حضور اکرم کا ذکر سعادت اثر نبی، پیغمبر اور رسول کے الفاظ سے ہوا ہے۔ اس حصے میں مولانا نے ایسے کاموں اور اشغال کو، جو انسان کو حق تعالیٰ سے دور کرنے کا سبب بنتے ہیں، حیلہ و مکر کہہ کر ان سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ ایسے اشغال سراسر حاملِ زیاں ہیں،

---

۵۶ مثنوی، ص ۳/۱۲، ۱۳

لیکن اگر ان میں صد در صد نفع بھی ہو جب بھی اس معمولی سے زر کی خاطر گنجور سے قطع تعلق کر لینا اچھا نہیں۔

اس ضمن میں مولانا نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے صحابہ کرامؓ کو بعض مواقع پر کی گئی زجر و توبیخ کی طرف اشارہ کر کے حضورِ نبی اکرمؐ کے عہد کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس کی طرف قرآنِ کریم کی سورۃ الجمعہ میں بھی اشارہ ہوا ہے[۵] ایک موقع پر قحط سالی کے دوران کسی تاجر نے نماز جمعہ کے وقت ڈھول کی آواز پر غلہ ارزاں فروخت کرنے کا اعلان کرایا۔ سرورِ کائناتؐ اس وقت خطبہ فرما رہے تھے۔ اکثر صحابہ کرامؓ خطبہ چھوڑ کر اس تاجر کی طرف لپکے تاکہ دوسرے لوگ سستا غلہ خریدنے میں ان سے سبقت نہ لے جائیں، جس کے نتیجے میں صرف چند ایک صحابہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں رہ گئے۔ اس طرح اس تاجر نے گویا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ذرا سا لالچ دے کر لوگوں کو خدا سے دور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان صحابہ کو ڈانٹا گیا ہے کہ محض گندم کی خاطر تم کفر و باطل کی طرف جھک گئے اور حضورِ نبی اکرمؐ کو تنہا چھوڑ گئے۔ حضور کی صحبت و قربت ان باتوں، چیزوں اور مال سے کہیں افضل و اَخیر ہے۔ ذرا سوچو کہ تم نے کس اعلیٰ و افضل چیز کو چھوڑ دیا۔ تم کو حرص میں آ کر میرے خیر الرازقین ہونے کا بھی یقین نہ رہا۔ مولانا حریص لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ جو ذاتِ اقدس خود گندم کو روزی پہنچاتی ہے وہ تمہارے توکل کو کیوں کر نہیں پہنچائے گی۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ تم ایک معمولی سی شی کے لیے اس سے اپنا رابطہ توڑ لینے پر آمادہ ہو جاتے ہو، جو حقیقت میں سب کا روزی رساں ہے۔

ہر چہ از یارت جدا اندازد آن	مشنو آن را کآن زیان دارد زیان
گر بود آن سود صد در صد بگیر	بہر زر مگسل ز گنجور ای فقیر
این شنو کہ چند یزدان زجر کرد	گفت اصحابِ نبیؐ را گرم و سرد
زآنکہ بر بانگِ دُہل در سال تنگ	جمعہ را کردند باطل بی درنگ

---

۵ اور (بعض لوگوں) کا یہ حال ہے کہ وہ لوگ جب کسی تجارت یا مشغولی کی چیز کو دیکھتے ہیں تو وہ اس کی طرف دوڑ لے کے لیے بکھر جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ جو چیز (از قسم ثواب و قرب) خدا کے پاس ہے وہ ایسے مشغلے اور تجارت سے بدرجہا بہتر ہے (اور اللہ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے۔ (الجمعۃ : ۱۱)

تا نیابید بی گمان ازدان فروخورند	[illegible] تا ایشان نمی‌خورند
ماند پیغمبر بخلوت در فغان	باد و گندم [illegible] تا بیخ غیاث
گفت قبل هو بازرگانی	چو نتان [illegible] وا ندر ما فی
قد فضعتم نحو فج ناعما	ثم علیکم تبینا فاعلما
بغر گندم تخم باطل کاشتید	وآن رسول حق را بگزید شتید
صحبت او خیر من لهو بست و مال	بین کجا نگذاشتی بنشی بمال
خود نشد حرص شما را این یقین	که منم رزاق خیر الرازقین
آنکه گندم را ز خود روزی دهد	کی توکلهات را ضایع کند
از پی گندم جدا گشتی از آن	که فرستاد است گندم [illegible]

اسی شہری اور دیہاتی کی داستان میں یہ بتایا ہے کہ شہری اس دیہاتی کے مجبور کرنے پر اپنے بال بچوں کو لے کر آمادہ بہ سفر ہوتا ہے، اور اس کے پیچھے بے پایاں مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ مولانا نے خوشی اور خوش گزرانی [illegible] نعلی [illegible] رہتے ہوئے اس سے محروم رہتے اور [illegible] کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ ان کے نزدیک غم خوشی سے بہتر اور ایک نعمت [illegible] ہے جس سے ارتقا اور [illegible] میسر ہے۔ چنانچہ مولانا گاؤں کی بجائے ذہن کی تفریح [illegible] کرتے ہیں۔ سحرائے دل کی طرف توجہ ہوتے ہیں کہ جس [illegible] آباد اور روشن عالم ہے [illegible] فطرت کی طرف رجوع کرنے اور شہر کی نسبت گاؤں کو کالی [illegible] ہے

ع۔ کتاب مثنوی، ص ۲۱۴ نسبت مثنوی، ص ۲۰، ۲۱۱

[illegible] میں کی وضاحت [illegible] کے تحت [illegible] ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ "مثنوی میں جب انسان پر رنج و غم طاری ہوتا ہے تو ایک طرح کا ہیجان محسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر رنج و غم پیدا نہ ہوتا [illegible] اگر [illegible] روح کی گہرائیوں میں غوطہ لگاتا، نہ اس میں دوسروں کے لئے دردمندی پیدا ہوتی، نہ اسے صبر سے تکمیل نفس کی مشق ہوتی۔ جن لوگوں کو مادی اسباب حیات کی فراوانی اور [illegible] سے ہمیشہ مسرت و خوشی حاصل ہوتی ہے ان لوگوں کا شعور [illegible] اور [illegible] حیات سے بیگانہ ہوتے ہیں [illegible] محرومی اور ناکامی [illegible] جو چشم بصیرت کو وا کرتی ہے [illegible] بصیر و علیم ہو جاتے ہیں" [illegible] (ص ۲۰۶، ۲۰۷)

گزرانتے ہوئے اس طرف جانے سے منع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں، گاؤں کی عادت سمجھو کہ گاؤں انسان کو احمق بنا دیتا ہے۔ اس سے عقل بے نور اور بے رونق ہو جاتی ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ روزی، رزق وغیرہ اسے گاؤں سے حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ رزق اور روزی رساں تو صفت ذاتِ خداوندی ہے۔ یہاں مولانا اپنے شاگردی کو مخاطب کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قولِ مبارک نقل کرتے ہیں کہ عقل کے اندھے کا ٹھکانہ گاؤں میں ہے۔ اس کے بعد اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک روز گاؤں میں قیام کرلے تو ایک ماہ تک اس کی عقل ٹھکانے نہ آئے گی، اور اگر کوئی ایک دن رات وہاں ٹھہر جائے تو سمجھو ایک ماہ تک وہ عقل سے بالکل ہی بے بہرہ رہا۔ حماقت و جہالت اس کے دامن گیر ہو گئی کہ گاؤں کی حشیش کی فصل ہی کچھ ہے پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ماہ تک گاؤں میں مقیم رہا تو جان لو کہ مدت مدید تک بے عقلی و بے بصیرتی اس کا مقدر بن گئی ..... گاؤں سے مولانا کی مراد اناڑی مرشد ہے جو صرف تقلید و جہت کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ شہرِ عقل کلی کے بیلے۱ ان چیلوں کی حالت بعینہ ان گدھوں کی سی ہے جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوں اور وہ چکی کے آگے جتے ہوئے بس ایک ہی ڈگر پر مسلسل چل رہے ہوں، نہ ان کی کوئی منزل ہو اور نہ نئے راستوں کی تلاش و جستجو سے انھیں کوئی رغبت:

تنها از غم شو که غم دام بقاست	اندرین ره سوی پستی ارتقا ست
غم مکن گنجینه ده رنج تو چو کان	لیک کی در گیرد این در کودکان
کودکان چون نام بازی بشنوند	جمله با خر گور هم تگ می شوند
گام در صحرای دل باید نهاد	زانکه در صحرای گل نبود گشاد
ایمن آبادست دل ای دوستان	حصن محکم موضع امن و امان
گلشن خرم بکام دوستان	چشمه ها و گلستان در گلستان
ده مرو ده مرد را احمق کند	عقل را بی نور و بی رونق کند
خواجه پندارد که روزی [illegible]	این نمی داند که روزی ده [illegible]

۱ چیلا بمعنی مرید۔ [illegible] کو مولانا نے [illegible] گاؤں کہا ہے [illegible] کی وہاں [illegible] تقلید و تحکم پر قید ہے۔ تو جو کچھ انھوں نے گاؤں کے بارے میں کہا ہے ہر جگہ انطباق ایسے ہی مرید پر کرتے ہوئے [illegible] سے [illegible] کے حق میں [illegible] اس کی نا سمجھی در حقیقت باعث [illegible] گمراہی ہے۔

قولِ پیغمبرؐ شنو ای مجتبیٰ | گورِ عقل آمد وطن در روستا
ہر کہ روزی باشد اندر روستا | تا بماہی عقل او ناید بجا
تا بماہی احمقی با او بود | از حشیش دہ جز اینہا چہ درود
آنکہ ماہی باشد اندر روستا | روزگاری باشدش جہل و عمیٰ
دہ چہ باشد شیخِ واصل ناشدہ | دست در تقلید و در حجت زدہ
پیشِ شہرِ عقلِ کلّی این حواس | چون خران چشم بستہ در خراس[۱۱۵]

ایک سپیرے کی داستان میں، جو سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ایک زندہ اژدہا کو مردہ سمجھ کر بغداد لے آتا ہے تاکہ اپنی بہادری کی ڈینگ مار سکے، مولانا نے پہلے اس عالمِ جمادات کو مذکورہ اژدہا سے تشبیہ دی اور آگے چل کر انسان کے بہانہ جو نفس کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ پہلے حصے میں بعض انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات کے ساتھ ساتھ نبی مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین معجزوں کا بھی ذکر آیا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ کائنات جو تمھیں اس ٹھٹھرے ہوئے اژدہا کی مانند بظاہر مردہ نظر آتی ہے، ایک خاص زندگی کی حامل ہے۔ آفتابِ حشر طلوع ہو لینے دو پھر تم پر اس کائنات کی زندگی کے آثار و اسرار ہویدا ہوں گے۔ پھر مولانا حضرت موسیٰ کے معجزۂ عصا کا ذکر کرنے کے بعد انسان کی مثال لائے ہیں، جس کے اجزا کا تعلق خاک سے ہوتے ہوئے بھی وہ زندگی و حرکت کا پیکر ہے۔ لہذا جب خاک، آدمی کی صورت میں مظہرِ زندگی بن سکتی ہے تو کیا یہ بات اس امر کی روشن دلیل نہیں ہے کہ اس خاک کی اپنی ایک حیات پنہاں ہے۔ خاک کی اس صورت کو پورے طور پر سمجھنا چاہیے، وہ الگ بات کہ بصیرت و دانش سے عاری انسان اس خاک و کائنات کو جمادات ہی سمجھنے پر مصر ہے۔ مولانا ایسے انسانوں (بندہ ہائے دنیا) کو مردہ اور برگزیدگانِ الٰہی اور عاملانِ روحانیت و مردانِ خدا کو زندہ قرار دیتے ہیں۔ اوّل الذکر جمادات کی مانند خاموش اور مؤخر الذکر جیتے جاگتے انسانوں کی طرح گویا ہیں۔ جب ذاتِ باری اپنی جانب سے کسی برگزیدہ اور زندہ و جاوید ہستی کو ہماری طرف بھیجتی ہے تو اس کے ہاتھوں عصا ایسی جامد شے بھی سراپا زندگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پہاڑ جیسی ساکت چیز بھی نغمے الاپنے لگتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں لوہا موم صفت پگھل جاتا ہے۔ ہوا اس کا

۱۱۵۔ کتاب مثنوی، ص ۲۱۴، ۲۱۵ — مثنوی، ص ۳/ ۱۴، ۱۵

تخت اٹھائے پھرتی ہے اور سمندر ان سے محو تکلم ہو جاتا ہے۔ اور یہی برگزیدہ ہستی جب فخر موجودات احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت اقدس بابر ظہور پذیر ہوتی ہے تو محض اشارۂ انگشت مبارک پر چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ستون حنانہ ایسی بے جان شے بھی اس ہستی سے دوری کے سبب محو گریہ وزاری ہو جاتی ہے، اور پتھر اس ذات ارجمند و گرامی پر درود و سلام بھیجنے لگتے ہیں۔

اس نے بعد مولانا نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ اس کائنات کے پوشیدہ ذرات اپنے زندہ ہونے اور انسان کی طرح سمیع و بصیر ہونے کا ہر ہر لمحہ اعلان کرتے رہتے ہیں لیکن انھیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے چشم بصیرت کی ضرورت ہے، کیوں کہ چشم ظاہر کے نزدیک تو وہ محض جمادات ہیں۔ مولانا کے مطابق ظاہر سے ہٹ کر باطن کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ ان جمادات کو تسبیح خوانی کی حالت میں دیکھا اور وسوسوں سے چھٹکارا پایا جا سکے :

عالم افسردہ است و نام او جماد	جامد افسردہ بودہ ای اوستاد
باش تا خورشید حشر آید عیان	تا ببینی جنبش جسم جہان
پارۂ خاک ترا چون زندہ ساخت	خاکہا را جملگی باید شناخت
مردہ زین سو یند و زآن سو زندہ اند	خامش اینجا و آنطرف گویندہ اند
چون از آن سوشان فرستد سوی ما	آن عصا گردد سوی ما اژدہا
کوہ ہا ہم لحن داؤدی شود	جوہر آہن بکف مومی بود
باد، حمال سلیمانی شود	بحر با موسیٰ سخندانی شود
ماہ با احمد اشارت بین شود	نار ابراہیم را نسرین شود
خاک، قارون را چو ماری درکشد	اُستن حنانہ اید در رشد
سنگ، احمد را سلامی میکند	کوہ، یحییٰ را پیامی میکند
جملۂ ذرات عالم در نہان	با تو میگویند روزان و شبان
ما سمیعیم و بصیریم و خوشیم	با شما نامحرمان ما خامشیم
چون شما سوی جمادی می روید	محرم جان جمادان کی شوید [۱۲]

---

[۱۲] کتاب مثنوی، ص ۲۲۷ — مثنوی، جس ۳/ ۲۶، ۲۷

[illegible]

[illegible] حضرت موسیٰ [illegible]
قرآن مجید میں [illegible] فرعون [illegible] جنہوں نے حضرت موسیٰ کو قید
میں پالنے والوں کا بھی ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بیان درحقیقت حضور نبی کریم کے لیے قیامت تک کے خطاب و
[illegible] اللہ تعالیٰ حضور پر [illegible] کہ آپ کے وصال کے بعد دین اسلام اور
قرآن کریم کی حفاظت میں خود کروں گا۔ مجھ سے بڑھ کر ان دونوں کا محافظ کوئی نہیں۔ میں روحانی اور مادی
دونوں عالموں میں آپ کی عظمت و رونق میں روز افزوں اضافہ کروں گا۔

ایک زمانہ [illegible] بند کر اذان دینا اور نماز پڑھنا گویا اپنے اوپر کفار کے
ظلم و ستم کو دعوت [illegible] مسلمان چھپ چھپ کر نمازیں ادا کرتے تھے اور نبی اکرم کا [illegible] مبارک بھی [illegible]
[illegible] یوں ایک عرصہ تک دین متین کی تبلیغ و اشاعت کا حلقہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اللہ جل شانہ
[illegible] انہی حالات کا تذکرہ فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی و خوشخبری دیتا ہے کہ وہ وقت
جلد آنے والا ہے جب آپ کا نام اور دین اسلام چہار دانگ عالم میں پھیل جائے گا۔ [illegible] خزانوں کو
[illegible] کی کمی نہ ہوگی۔ آپ کے امتی [illegible] جہاں [illegible] میں پھیل جائیں گے تاکہ حکومت اور سلطنت و غلبہ ان
کے [illegible] ہوں گے۔ دین اسلام تا قیامت دائم و قائم رہے گا، اس لیے آپ اس کے بارے میں قطعاً
پریشان نہ ہوں۔ آپ کوئی شاعر نہیں ہیں، آپ صادق ہیں اور حضرت موسیٰ کے ہم [illegible]۔ یہاں مولانا مذکور بالا
[illegible] ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن کریم آپ کے لیے عصائے موسیٰ کی مانند ہے جو ہر قسم کے کفر کو
اژدہا کی طرح نگل جائے گا۔ اور اگر آپ کا وصال ہو جائے تو جو کچھ آپ نے کہا ہے ایسے عصا ہی کی مثل
جانیے گا۔ [illegible] کا نام پاک عصا کی مانند باخبر ہوگا، اور دشمن اور سرکش اس کا
کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ لہٰذا آپ مرنے کی [illegible] آپ کا [illegible]
[illegible] آپ کی خاطر دشمنوں [illegible] لینے کے لیے [illegible] ہوں گے۔ اس کے بعد مولانا نے
اللہ کی جانب سے فلسفی اور دین کے [illegible] بنایا ہے۔

اللہ جل شانہ کے اس فرمان کی صداقت کسی دلیل کی محتاج نہیں [illegible]
[illegible] نہ صرف قائم و دائم ہے اور اس کے [illegible] میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے بلکہ

[illegible] دورِ اقتدار و اتفاق ہیں، [illegible] اہلِ عالم [illegible] کا [illegible] ہو چکے [illegible]
[illegible] شکلیں [illegible] ہو چکی ہیں، اُن کی [illegible] کو [illegible] اور کوئی [illegible]
[illegible] بفضلہٖ تعالیٰ دنیا کی [illegible] دین [illegible] خود [illegible]
[illegible] کی زندگی [illegible] بلکہ تمام دنیا کو امن و آسائش کا گہوارہ بنا دے گی۔

آخر میں مولانا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے [illegible] کی حفاظت [illegible]
[illegible] اقبال و تعلیم [illegible]
[illegible] کا ایسے ہوتے ہے؟

مصطفیٰ را وعده کرد الطاف حق	گر بمیری تو، نمیرد این سبق
من کتاب و حجت او را حافظم	[illegible] قرآن را [illegible]
من [illegible] عالم را [illegible]	[illegible] را [illegible]
کس [illegible] کردن [illegible]	[illegible] از من حافظی دیگر [illegible]
[illegible]	نام [illegible]
[illegible] تو	[illegible] تو
نام تو از [illegible] می کنند	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
من [illegible] آفاق را	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

ای رسولِ ما تو جادو نیستی — صادقی ، ہم خرقۂ موسیستی
ہست قرآن مر ترا ہمچون عصا — کفرہا را درکشد چون اژدہا
تو اگر در زیرِ خاکی خفتہ ای — چون عصایش دان تو آنچہ گفتہ ای
گرچہ باشی خفتہ تو در زیرِ خاک — چون عصا آگہ بود آن گفت پاک
قاصدان را بر عصایت دست نی — تو بخسپ ای شہ مبارک خفتنی
تن بخفتہ ، نورِ جان در آسمان — بہرِ پیکار تو زہ کردہ کمان
فلسفی و آنچہ پوزش می کند — قوسِ نورت تیر دوزش میکند
آنچنان کرد و از آن افزون گفت — او بخفت و بخت و اقبالش نخفت [۱۷]

اس کے بعد دو ساحر لڑکوں کا قصہ بیان ہوا ہے کہ کس طرح انھوں نے حضرت موسیٰ کو محوِ خواب پاکر ان کا عصا چرانے کی کوشش کی، لیکن چونکہ باہمہ خواب حضرت موسیٰ کا دل بیدار تھا، اس لیے لڑکے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یعنی عصا اژدہا بن کر اُن پر لپکا اور وہ بھاگ گئے لیکن بعد میں تائب ہو گئے۔ اس حصے میں مولانا نے دلِ بیدار کا طالب بننے کی تلقین کرتے ہوئے فخرِ موجودات کا یہ قولِ مبارک دہرایا ہے کہ ہر چند بظاہر میری آنکھیں نیند میں ہوتی ہیں لیکن میرا دل بیدار ہی رہتا ہے۔ مولانا رومی صاحبِ دلِ بیدار پر اپنی جان تک فدا کرنے کو تیار ہیں۔ ان کے مطابق بیداریٔ دل کے اوصاف اس قدر بے شمار اور بے حد ہیں کہ ایسی ہزاروں مثنویوں میں بھی ان کا سمانا مشکل ہے۔ بقول حکیم الامت :

دل بیدار فاروقی دل بیدار کراری — مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری [۱۸]

مولانا فرماتے ہیں :

ای بسا بیدار چشم و خفتہ دل — خود چہ بیند چشم اہلِ آب و گل
وانکہ دل بیدار دارد ، چشم سر — گر بخسپد ، برگشاید صد بصر
گر تو اہل نئی بیدار باش — طالبِ دل باش و در پیکار باش
ور دلت بیدار شد میخسپ خوش — نیست غایب ناظرت از ہفت و شش

---

۱۷ کتاب مثنوی ، ص ۲۳۱ ، ۲۳۲ — مثنوی ، ص ۳۱/۳   ۱۸ بالِ جبریل ، ص ۵۰

گفت پیغمبر کہ خسبد چشمِ من — لیک کی خسبد دلم اندر وسن

شاہ بیدار است حارسِ خفتہ گیر — جان فدای خفتگانِ دل بصیر

وصف بیداری دل ای معنوی — در نگنجد در ہزاران مثنوی[۱۷۶]

حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے موقع پر اپنے بیٹے کو کشتی میں بیٹھنے کی دعوت دی، لیکن بیٹے نے سرکشی کرتے ہوئے اس دعوت کو رد کر دیا۔ مولانا نے یہ قرآنی قصہ بیان کرنے کے بعد حضور اکرمؐ کی دو احادیث مبارکہ "الرضاء بالکفر کفرٌ" اور "من لم یرض بقضائی ولم یصبر علیٰ بلائی فلیطلب ربًا سوائی" (ترجمہ: میرے فیصلے پر راضی نہ ہوا اور جس نے میری آزمائش پر صبر اختیار نہ کیا اسے چاہیے کہ وہ کوئی اور رب ڈھونڈ لے) میں بطریقِ تمثیل توافق پیدا کیا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ صنع اور مصنوعِ خداوندی میں معمولی سا فرق ہے جس سے صرف اہلِ روحانیت و معنویت ہی باخبر ہیں اور یہی اصحاب درحقیقت عظمت و شکوہ کے حامل اور قربِ خداوندی سے سرشار ہیں اور جو صرف مصنوع (مادیت) کے دلدادہ ہیں وہ حضورِ حق سے بہت دور یا دوسرے لفظوں میں گبر و کافر ہیں، اور یہ کہ کفر اگر از روئے قضا ہو تو وہ کفر نہیں، ورنہ حق کو کافر ٹھہراؤ گے اور یہ انتہائے گستاخی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے فلسفیوں منطقیوں اور متکلمین وغیرہ کو ہدفِ تنقید و مذمت بنایا ہے جو منطقیانہ دلائل کے چکر میں پڑ کر بال کی کھال اتارنے لگتے ہیں اور یوں کسی مسئلے کی اصل روح سے دور ہٹ جاتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ کل ایک ماجرا جو شخص مجھ سے کہنے لگا کہ حضورِ اکرمؐ کی حدیثِ مبارک ہے کہ کفر کے ساتھ موافقت بھی کفر ہے، اور ظاہر ہے سید البشر کا فرمایا ہوا عین صدق ہے۔ پھر نبی کریم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمان کو ہر قضا میں راضی برضائے الٰہی ہونا چاہیے ... تو یہ کفر و نفاق بھی تو آخر قضائے الٰہی ہی سے ہے لیکن اگر میں اس پر راضی ہوتا ہوں تو یہ بہت بڑی گمراہی ہوگی، اور اگر راضی برضا نہیں ہوتا تو یہ بھی سراسر زیان و خرابی کا سبب بنے گا۔ اس صورتِ حال میں مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ مولانا نے اسے بتایا کہ یہ کفر مقضی ہے قضا نہیں۔ (نتیجۂ حکم ہے خود حکم نہیں) اور سیدھے سادے لفظوں میں یہ کفر آثارِ قضا میں سے ہے، لہٰذا قضا اور مقضی میں جو فرق ہے اسے پہچانو تاکہ تمھاری یہ الجھن دور ہو۔ مولانا قضا کی صورت میں کفر پر بھی راضی ہیں لیکن بصورتِ دیگر وہ اس سے بہت دور ہیں، بقول ان کے کفر اگر قضا کی بنا پر ہو تو وہ کفر نہیں رہتا۔ اگر اس صورت میں کفر کو کفرِ واقعی

---

[۱۷۶] کتاب مثنوی، ص ۲۳۴

کہا جائے گا تو ایسا کہنے والا گو یا حق کو، نعوذ باللہ، کافر قرار دے گا اور یہ گستاخی کی انتہا ہو گی، جس سے حذر لازم ہے۔ یہاں مولانا کفر کو جہل اور قضائے کفر کو علم قرار دیتے ہوئے دونوں میں جو بُعد ہے، اسے حِلم (بردباری) اور غلم (غیظ و غضب) کے الفاظ سے واضح کرتے ہیں۔ پھر نقش اور نقاش کے حوالے سے انھوں نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ نقاش ازل کا نقش زشت بھی اپنی جگہ اس کے کمال ہی کا مظہر ہے کہ وہ عمدہ نقش بھی بنا سکتا ہے تو بُرا نقش[۵۷] بنانے پر بھی قادر ہے :

دی سؤالی کرد سائل مر مرا — زانکہ عاشق بود او بر ماجرا
گفت نکتہ "الرضاء بالکفر کفر" — این پیمبر گفت و گفت اوست مُہر
باز فرمود اُو کہ "اندر ہر قضا — مر مسلمان را رضا باید رضا"
نی قضای حق بود کفر و نفاق ؟ — گر بدین راضی شوم باشد شقاق
ور نیم راضی بود آن ہم زیان — پس چہ چارہ باشدم اندر میان ؟
گفتمش این کفر مقتضی نی قضاست — ہست آثار قضا این کفر راست
پس قضا را خواجہ از مقضی بدان — تا شکالت حل شود اندر جہان
راضیم بر کفر زآن رو کہ قضاست — نی از آن رو کہ نزاع و کفر ماست
کفر از روی قضا خود کفر نیست — حق را کافر مخوان اینجا مایست
کفر جہل است و قضای کفر علم — ہر دو یک کی باشد آخر حلم و غلم
زشتی خط زشتی نقاش نیست — بلکہ از وی زشت را بنمودنیست
قوت نقاش باشد آنکہ او — ہم تواند زشت کردن ہم نکو
گر کشایم بحث این را من بساز — تا سؤال و تا جواب آید دراز
ذوق نکتہ عشق از من میرود — نقش خدمت نقش دیگر میشود[۵۸]

(باقی آئندہ)

---

[۵۷] خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "زیادہ یقین آمد یہ عقیدہ معلوم ہوتا ہے کہ جسے ہم زشتی کہتے ہیں وہ ہمارا ایک ذاتی اور جزوی زاویہ نگاہ ہے۔ اگر ہستی کو بحیثیت کل اور مشیت ایزدی کو بحیثیت کل دیکھ سکیں تو اس تصویر کل میں ہر رنگ کا مقام اور ہر خط کی کشش ویسی ہی دکھائی دے گی جیسی کہ ہونی چاہیے۔ نغمے میں اتار بھی ہوتا ہے اور چڑھاؤ بھی۔ اونچے سُر بھی ہوتے ہیں اور مدھم سُر بھی، مگر بحیثیت مجموعی ہر راگ دلکش ہوتا ہے۔ ہستی کے کسی ایک پہلو کو جزوی نظر سے دیکھ کر اس کے حسن و قبح پر فتوے نہیں لگا سکتے۔" (تشبیہات رومی، ص ۲۴۳)

[۵۸] کتاب مثنوی، ص ۲۳۶

مولانا نصرت علی اثیر

امام زفر بن الہذیل

(تیسری اور آخری قسط)

امام زفرؒ اور عہدۂ قضا

امام زفرؒ کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ آپ بصرہ کے قاضی رہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ کو پیش کش کی گئی لیکن آپ نے قبول نہیں کی۔ ان مختلف اور متضاد روایات کی بنا پر یہ مسئلہ ذرا مشتبہ صورت اختیار کر جاتا ہے۔ محمد بن عبداللہ الصاری سے روایت ہے کہ آپ کو قضا کے عہدے کی پیش کش کی گئی مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہیں جا کر چھپ گئے۔ آپ کا مکان گرا دیا گیا۔ آپ نے آ کر پھر مرمت کیا تو پھر پیش کش ہوئی۔ آپ نے ذرا تردد کیا تو آپ کا مکان پھر گرا دیا گیا۔ لیکن آپ نے یہ منصب قبول پھر بھی نہ کیا۔ آخر آپ کو معاف کر دیا گیا۔

یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ درج ذیل کتب میں آئی ہے:

۱۔ عبدالحی لکھنوی: فوائد البہیہ: ۷۵: مطبوعہ مصر۔

۲۔ محی الدین ابی محمد عبدالقادر: ذیل الجواہر المضیہ: ۲: ۳۴۱ مطبوعہ ہند ۱۳۳۲ھ۔

۳۔ کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۳ مطبوعہ ہند ۱۳۲۱ھ۔

آپ کے قضا کے بارے میں یہ روایت آئی ہے:

ولی القضاء البصرۃ فقال لہ ابوحنیفۃ قد علمت ما بیننا و بین اھل البصرۃ من العداوۃ و الحسد و المنافسۃ ما اظنک تسلم منھم فلما قدم البصرۃ قاضیا اجتمع اھل العلم[1]

---

[1] ابن عبدالبر: انتقاء: ۱۸۳: مطبوعہ مصر ۱۳۵۰ھ

ذمیاطی نے تعالیق الانوار علی الدرالمختار میں لکھا ہے کہ آپ بصرہ کے دارالقضا کے متولی رہے۔ اس کے علاوہ "الجواہر المضیہ" اور "الاعلام" میں آپ کے قاضی ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ ابن عبدالبر اور قرشی وغیرہ تذکرہ نگار کو اشتباہ ہوگیا ہے۔ اس لیے کہ ۱۳۸ھ سے ذی القعدہ ۱۵۶ھ تک یعنی اپنی وفات تک سوار بن عبداللہ العنبری قاضی رہا ہے ان کی وفات کے بعد ان کا بیٹا عبداللہ بن سوار قاضی ہوا، اور یہی ابن حبان نے لکھا ہے۔ امام زفر کے رشتے دار بصرہ میں تھے جن سے ملاقات کے لیے آپ بصرہ گئے۔ ایک بار تو عثمان البتی (المتوفی ۱۴۳ھ) کے عہد میں گئے۔ جب ان کے درمیان مناظرہ ہوا اور امام زفر کامیاب رہے پھر دوسری بار اپنے بھائی کی وفات اور امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد بصرہ گئے۔ اہلِ بصرہ نے آپ کو گھیر لیا اور وہیں رہنے پر مجبور کیا۔ آپ تاوفات وہیں رہ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ قاضیوں کی فہرست میں کہیں بھی آپ کا نام نہیں ملتا۔ ایک اہلِ حلقہ اور عالم دین ہونے کی وجہ سے آپ کے اختلافی اقوال ضرور ملتے ہیں۔ آپ کی بصرہ میں جس قدر علمی شہرت تھی اس کی وجہ سے آپ لوگوں کا مرکز تھے۔ اسی بناپر غالباً ابن عبدالبر وغیرہ کو مغالطہ ہوا ہے۔

یہ بات زیادہ قرینِ یقین ہے کہ آپ نے ساری عمر تعلیم و تعلم میں گذاری اور قضا کا عہدہ قبول نہیں کیا۔ بلکہ اس کے لیے معتوب ہوئے لیکن پھر بھی اپنے استاذِ محترم جناب امام ابوحنیفہ کے موقف پر قائم رہے۔

امام زفرؒ بحیثیت زاہد و عابد

امام زفرؒ کی زندگی جہاں علمی کمالات کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے، وہاں زہد و پرہیزگاری اور عبادت گزاری کی خصوصیات آپ کے کردار کو اور اجاگر کرتی ہیں۔ آپ کے ہاں جس قدر مال و دولت تھا وہ آپ کی قناعت کی وجہ سے غریب لوگوں کی دلجوئی کا سامان بنتا۔ آپ کو لوگ مال و دولت پیش کرتے لیکن آپ انکار کر دیتے۔

داؤد بن یزید بن مہلب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ امام زفرؒ یزید بن مہلب

سے ملنے آتے جب کہ وہ حجاج کے حکم سے محبوس تھا۔ امام زفرؒ نے ان کے بیٹے مخلد کو بھیجا کہ جاؤ ان سے ملنے کی اجازت مانگو۔ اجازت ملنے کے بعد امام زفر گئے اور کہا کہ امیر تیری شان اس سے بھی بلند ہے کہ کوئی آپ کی طاقت سے بڑھ کر یا برابر کا سوال کرے۔ پچاس لدے ہوئے اونٹ آئے ہیں جس کی وجہ سے میں آپ کو ملنے آیا۔ یزید بن مہلب نے کہا کہ پچاس اونٹ میرے حکم سے بھیجے گئے ہیں اور اتنی ہی تعداد کی مزید سفارش بھی کردی ہے۔ امام زفرؒ نے کہا، خدا کی قسم! میں ان میں سے کچھ بھی نہ لوں گا۔ امیر نے کہا یہ کیوں؟ امام زفرؒ نے کہا کہ گویا میں نے اپنی عزت تیرے لیے جو اس سے زیادہ حیثیت رکھتی ہے قربان کردی ہے۔ جتنا کہ تو نے میرا مال مجھ پہ بخشش کیا۔ آپ نکل آئے اور ایک کوڑی تک مال میں سے لینا گوارا نہ کیا۔[۲]

امام زفرؒ عزتِ نفس کا بہت خیال کرتے تھے، جس کی وجہ سے ہر اس کام سے اجتناب کرتے جس سے ان کی عزت، ایمان اور آزادی پر حملہ ہوسکتا ہو۔ آپ ایک جید عالم تھے اس کی وجہ سے امرا نے آپ کو اپنے دام میں لانے کے لیے کئی حربے استعمال کیے۔ لیکن آپ ہمیشہ بچ جاتے۔

عصمہ آپ کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو آپ کی عظمتِ کردار کا ثبوت ہے:

عن عصمة قال قال ما تمنيت البقاء قط وما مال قلبي الى الدنيا۔[۳]

عصمہ سے روایت ہے کہ امام زفر نے فرمایا کہ میں نے کبھی بقائے زندگی کی تمنا نہیں کی اور نہ کبھی میرا دل دنیا کی طرف مائل ہوا ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت بشر بن القاسم روایت کرتے ہیں جس سے آپ کی اس نمایاں خوبی کی مزید تصدیق ہوجاتی ہے:

عن بشر بن القاسم قال سمعته يقول لا اخلف بعد موتي شيئا اخاف عليه الحساب فلما مات زفر قوم ما في بيته فلم يبلغ ثلاثة دراهم۔[۴]

۲ـ زاہد الکوثری، لمحات النظر: ۵: مطبوعہ مصر ۱۳۶۸ھ

۳ـ محی الدین ابو محمد عبد القادر: ذیل الجواہر المضیہ: ۲: ۵۳۴، مطبوعہ ۱۳۳۲ھ)

۴ـ کردری، مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۳، مطبوعہ ۱۳۲۱ھ

بشر بن القاسم فرماتے ہیں کہ میں نے امام زفرؒ کو کہتے سنا کہ اپنی موت کے بعد کوئی چیز نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیے کہ مجھے اس کے محاسبے کا خوف ہے۔ پس جب امام زفر فوت ہوئے اور ان کی پونجی گھر سے کلی طور جمع کر کے گنی گئی تو وہ تین درہم کی ملکیت سے زیادہ نہ نکلی۔

آپ پر گھریلو ذمہ داریوں کی بجا آوری کا احساس بھی بڑا شدید تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موت کے قریب پورے اثاثے کو حقوق کے مطابق تقسیم کر دیا۔ ملیح بن وکیع سے روایت ہے کہ امام زفر جب قریب الموت تھے تو اس وقت امام ابویوسف اور چند دیگر علما موجود تھے، انھوں نے آپ سے آخری وصیت کے بارے میں استفسار کیا، تو آپ کہنے لگے کہ یہ سارا اثاثہ میری بیوی کا ہے اور یہ تین ہزار درہم میرے بھائی کے بیٹے کے لیے ہے اور اب اس کے بعد نہ کچھ میرا لوگوں کے ذمے ہے اور نہ کچھ لوگوں کا میرے ذمے ہے[۵]

آپ دنیا کے جھگڑوں جھمیلوں سے حد درجہ نفرت کرتے تھے۔ دین کے علاوہ کسی قسم کا کوئی تذکرہ سننا تک گوارا نہ کرتے۔ اسی لیے آپ کے ساتھی آپ کی موجودگی میں دنیاوی باتوں سے احتراز کرتے۔ ابراہیم بن سلیمان سے روایت ہے کہ جب ہم آپ کی مجلس میں بیٹھتے تو ہمیں اس وقت جرأت نہ ہوتی کہ ہم کسی دنیاوی امر کا تذکرہ کریں۔ ایک دن ایک ساتھی نے بھولے سے کوئی بات چھیڑ دی تو آپ مجلس سے اٹھ گئے۔ ہم انہی باتوں میں آپ کا حال دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ آخرت کے خوف نے انھیں ہلاک کر دیا ہے[۶]

تمام تذکرہ نگاروں نے صراحت کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ آپ نے علم اور عبادت کو باہم ملا دیا ہے[۷] جہاں آپ بہت بڑے عالم اور مجتہد تھے، اور علمی مسائل پر کلی دسترس رکھتے تھے، وہاں عبادت میں اس سے کہیں زیادہ انہماک رکھتے یہاں تک کہ آخری عمر میں تو آپ اس قدر عبادت میں مشغول رہتے کہ لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ آپ صرف

---

۵ کردری۔ مناقب امام اعظم۔ ۱: ۱۸۳ مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ

۶ طاش کبریٰ زادہ: مفتاح السعادۃ: ۲: ۱۱۳ : مطبوعہ حیدرآباد ہند۔

۷ ابواسحٰق شیرازی: طبقات الفقہاء: ۱۱۳ : مطبوعہ بغداد ۱۳۵۶ھ

عبادت ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں[۸]

آپ نہایت سادہ مزاج تھے۔ کسی قسم کا تکلف اور تصنع نہ کرتے تھے۔ بلال بن یحییٰ روایت کرتے ہیں کہ داؤد الطائیؒ اور امام زفرؒ منہ بولے بھائی تھے ایک دوسرے کے آگے پیچھے رہا کرتے تھے۔ ایک روز طائی کوڑا کرکٹ کی جگہ آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد امام زفر آئے تو وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے[۹]

"شذرات الذہب" میں ہے:

کان ثقة فی الحدیث موصوفا بالعبادة[۱۰]

آپ حدیث میں ثقہ اور عبادت گزاری سے متصف تھے۔

حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں آپ کو "احد الفقہاء الزہاد صدوق[۱۱]" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ شداد سے روایت ہے کہ میں نے اسد بن عمرو سے پوچھا کہ حضرت امام ابو یوسفؒ زیادہ ماہر فقہ ہیں یا امام زفرؒ، تو وہ کہنے لگے کہ امام زفرؒ اورع یعنی سب سے زیادہ پرہیزگار ہیں۔ شداد کہتے ہیں کہ میں نے سوال دہراتے ہوتے پوچھا کہ فقہ میں کون آگے ہے تو وہ کہنے لگے۔ اے شداد پرہیزگاری ہی سے آدمی کا مرتبہ بلند ہوتا ہے[۱۲] امام ذہبی نے آپ کو ایک بہت ہی سچا اور بہت بڑا زاہد کہا ہے[۱۳]

ابو مطیع کا قول ہے: زفر حجة علی الناس و اما ابو یوسف غرته الدنیا بعد الغرور[۱۴]

---

[۸] ذہبی: العبر: ۱: ۲۱ مطبوعہ کویت ۱۹۶۰ء

[۹] کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۵: مطبوعہ ہند ۱۳۲۱ھ

[۱۰] ابوالفلاح عبدالحی: شذرات الذہب: ۱: ۲۴۲

[۱۱] ابن حجر: لسان المیزان، ۲: ۴۷۶: مطبوعہ ہند ۱۳۳۰ھ

[۱۲] عبدالحی لکھنوی۔ فوائد البہیہ: ۷۵ مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ

[۱۳] ذہبی: میزان الاعتدال، ۲: ۷۱ مطبوعہ دار الاحیاء الکتب العلمی البابی وشرکاہ ۱۳۸۲ھ

[۱۴] مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۵ مطبوعہ ہند۔

زفرؒ لوگوں پر حجت ہیں لیکن ابو یوسفؒ کو دنیا کی کثرت نے بعض غلط فہمیوں میں ڈال دیا۔

حسن بن زیاد سے روایت ہے کہ داؤد الطائی اور امام زفر منہ بولے بھائی تھے۔ داؤد نے نقہ سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن امام زفر نے دونوں کو باہم سموئے رکھا۔[۱۵]

یحییٰ بن معین سے مروی ہے کہ میں نے ابونعیم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ امام زفر سب سے اچھے لوگوں میں سے تھے اور مجھے انھوں نے امام زفر کا کوفے کا وہ مکان دکھایا جو حیانہ میں جبان کے وسط میں کھدا ہوا تھا۔ ابونعیم اس پر امام زفر کی دیر تک کھڑے ہو کر تعریف کرتے رہے۔[۱۶]

امام زفر کی ازدواجی زندگی

امام زفرؒ کی دو شادیاں ہوئیں۔ ایک خالد بن حارث[۱۷] کی بہن سے جس کا خطبہ حضرت امام ابو حنیفہ نے پڑھا۔ آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

عن سلیمان العطار قال تزوج زفر ودعی الی عرسہ الامام فالتمس منہ ان یخطب فقال فی خطبتہ ھذا زفر من ائمۃ المسلمین وعلم من اعلامھم فی شرافہ وحسبہ ونسبہ[۱۸]

سلیمان العطار سے مروی ہے کہ امام زفر کی شادی ہوئی تو انھوں نے شادی پر امام ابو حنیفہؒ کو دعوت دی پھر ان سے خطبہ نکاح پڑھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ نے خطبہ میں کہا۔ یہ زفر مسلمانوں کے امام اور شرافت، حسب اور نسب میں سرداروں کے سردار ہیں۔

یہی خطبہ تھا کہ جس پر آپ کے رشتہ دار جز بز ہوئے کہ امام ابو حنیفہ کی بجائے اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو خطبہ پڑھنے کے لیے کچھ نہیں کہا۔ تو آپ نے کہا کہ خدا کی قسم! اگر میرے والد بھی زندہ

---

[۱۵] فقیر محمد جہلمی۔ حدائق الحنفیہ: ۱۰۹، مطبوعہ نول کشور ہند۔

[۱۶] زاہد الکوثری: لمحات النظر: ۸ مطبوعہ مصر ۱۳۶۸ھ

[۱۷] ایضاً

[۱۸] عبدالحی لکھنوی: الفوائد البہیہ: ۷۵ مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ

یہاں ہوتے تو تب بھی میں حضرت امام ابوحنیفہ سے خطبہ پڑھواتا۔[۱۹]

آپ کا دوسرا نکاح آپ کے مرحوم بھائی کی بیوہ[۲۰] سے ہوا۔ یہ نکاح امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد ہوا، جب آپ بھائی کی وفات کے بعد ان کی میراث سے حصہ بانٹنے گئے۔ اسی موقع پر اہل بصرہ نے آپ کو وہیں رہنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ آپ پھر آخر عمر تک یہیں درس و تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔[۲۱]

اولاد

تذکروں میں آپ کی اولاد کے بارے میں بہت کم ذکر کیا گیا ہے۔ ابن سعد نے صرف آپ کے ایک بیٹے عثمان[۲۲] کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مامون کے دورِ خلافت میں کوفہ کے اندر ربیع الثانی یا جمادی الاولی ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔ آپ سے کئی ایک کتب میں روایات بھی منقول ہیں۔

تصانیف و تالیفات

ملیح بن وکیع بن الجراح سے روایت ہے کہ آپ بہت کم لکھا کرتے تھے[۲۳] لیکن پھر بھی آپ نے اس میدان میں بہت کام کیا ہے۔ فقہ حنفیہ کی تدوین میں جس قدر آپ کا حصہ ہے وہ دوسروں کا نہیں۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے آپ اس دس رکنی کمیٹی کے فرد تھے جس نے تدوین فقہ پر کام کیا۔ زرکلی لکھتے ہیں: وهو احد العشرة الذين دوّنوا الكتب[۲۴]

---

[۱۹] کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۴: مطبوعہ ہند۔

[۲۰] طاش کبری زادہ: مفتاح السعادۃ: ۲: ۱۱۳: مطبوعہ ہند۔

[۲۱] محی الدین نووی: تہذیب الاسماء واللغات، ۱: ۱۹۷: مطبوعہ مصر۔

[۲۲] ابن سعد: طبقات الکبریٰ: ۶: ۲۸۰ مطبوعہ لیدن ۱۳۲۵ھ

[۲۳] کردری: مناقب امام اعظم: ۲: ۱۸۵: مطبوعہ ہند

[۲۴] زرکلی: الاعلام: ۳: ۷۸

موفق نے عطیہ بن اسباط سے ایک روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن المبارک جب کوفہ آتے
امام زفر انھیں امام ابوحنیفہ سے روایت کرکے اپنی کتابیں لکھواتے تھے۔ عبداللہ بن المبارک
باعتبار فقہ تھے۔ انھوں نے کئی بار یہ کتابیں لکھیں۔ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ امام ابوحنیفہ زیادہ
فقیہ تھے یا امام مالک؟ تو عبداللہ بن المبارک نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ امام مالک کی طرح پورے
کرۂ ارض میں سب سے زیادہ فقیہ ہیں[۲۵]

تذکروں میں امام زفر کی جن کتابوں کا ذکر آیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الآثار[۲۶]

یہ کتاب ان روایات پر مبنی ہے جو آپ نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیں۔ آپ سے آپ
کے تین شاگردوں ابو وہب محمد بن مزاحم، شداد بن حکیم اور حکم بن ایوب نے روایت کی۔
محمد بن مزاحم اور شداد بن حکیم سے مروی کتاب الآثار کے دونوں نسخوں کا تذکرہ مشہور محدث
عبداللہ الحاکم النیساپوری نے اپنی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" کے صفحہ ۱۶۲ پر کیا ہے۔
اس کے علاوہ اس کا ذکر امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی کتاب قیام اللیل و قیام رمضان و
کتاب الوتر میں جس امام اعظم کی کتاب کا ذکر "زعم النعمان فی کتابہ" کے پیرائے میں کیا
ہے، وہ بھی یہی ابو وہب محمد بن مزاحم والی کتاب الآثار ہے جو امام مروزی کو ان کے شاگرد
ابو النصر محمد بن محمد کے حوالہ سے ملی ہے۔

یہ نیشاپور کے نامی گرامی قاضی ہیں۔ ان سے عبداللہ الحاکم نے حدیث پڑھی ہے۔
امام حاکم نے تاریخ نیساپور میں لکھا ہے کہ ان کے لیے ۳۲۵ھ میں باقاعدہ مجلس درس
لگی تھی۔ ان کی وفات ۳۳۸ھ میں ہوئی۔ حافظ سمعانی نے "الانساب" میں ابو وہب
محمد بن مزاحم کو احمد بن بکر بن یوسف کا استاد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔ "یروی عن ابی
وہب محمد بن مزاحم المروزی عن زفر عن ابی حنیفہ۔"

۲۵ھ موفق: مناقب امام اعظم، ۱: ۸۶ مطبوعہ ہند۔

۲۶ھ صدیقی محمد علی کاندھلوی: امام اعظم اور علم الحدیث: ۶۲: مطبوعہ سیالکوٹ۔

حکیم بن ایوب کی کتاب الآثار کا ذکر حافظ ابو الشیخ ابن حبان نے اپنی کتاب طبقات المحدثین میں احمد بن رستہ کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"احمد بن رستہ بن بنت محمد بن المغیرۃ کان عندہ السنن عن محمد بن الحکیم عن زفر عن ابی حنیفۃ۔

احمد بن رستہ کے پاس بحوالہ محمد از حکیم از زفر از ابی حنیفہ کتاب السنن تھی۔ امام طبرانی نے معجم صغیر میں اس نسخہ کی ایک حدیث روایت کی ہے:

حدثنا احمد بن رستہ بن عمر الاصفہانی ثنا المغیرۃ الحکم بن ایوب عن زفر بن الہذیل عن ابی حنیفہ (معجم صغیر طبرانی ص۳۳)

حافظ ابن ماکولا نے بھی "الاکمال" میں احمد بن بکر کے تذکرے میں لکھا ہے:

احمد بن بکر بن یوسف ابو بکر الحصینی ثقۃ یمیل میل اہل النظر روی عن ابی وہب عن زفر بن الہذیل عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار (اکمال ص۱۴۲)

ان تصریحات کی موجودگی میں شیخ محمد ابو زہرہ کا "ابو حنیفہ" نامی کتاب میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ:

زفر لم یؤثر عنہ کتب و لم تعرف لہ روایۃ لمذہب شیخہ[۵۲۷]

۲: مجرد فی الفروع الحنفیہ:

یہ کتاب حنفی فروعات پر مبنی ہے۔ اس کا ذکر حاجی خلیفہ نے اپنی تصنیف کشف الظنون کی دوسری جلد کے صفحہ ۱۵۹۳ مطبوعہ تہران ۱۳۷۸ھ میں "بدائع الحنفی" نام کی ایک تصنیف کا حوالہ دیتے ہوئے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بغدادی کی تصنیف "ہدیۃ العارفین" کی پہلی جلد کے صفحہ ۳۷۳ مطبوعہ ایران ۱۹۵۱ میں بھی اس کا تذکرہ آیا ہے۔

۳: مقالات

اس کتاب کا ذکر بھی بغدادی نے اپنی کتاب "ہدیۃ العارفین" کے مذکورہ بالا صفحے پر

---

۵۲۷ ابو زہرہ: ابو حنیفہ: ۲۱۷ مطبوعہ مصر۔

امام زفر کے باب میں کیا ہے۔ کتاب کے مضمون کے بارے میں فی الحال تو کچھ نہیں کیا جا سکتا البتہ کچھ دنوں کی محنت کے بعد ہی اس کے بارے میں کچھ کہا جا سکے گا۔

سفرِ آخرت

شعبان ۱۵۸ھ[۲۸] کا مقدس مہینہ تھا۔ امام ابو یوسف، خالد بن حارث اور فضل بن دکین وغیرہ اکابر علما جمع تھے۔ علما نے آخری وصیت کے بارے استفسار کیا۔ آپ نے وضاحت کی یہ مال میری بیوی کا ہے اور یہ تین ہزار درہم میرے بھائی کے بیٹے کے ہیں فیضل بن دکین فرماتے ہیں کہ آپ پر نزع کا عالم طاری تھا اور آپ کے ہونٹوں پر "لھا مھرت فی حال لھا ثلثا مھر" کے الفاظ تھے۔ اس روایت سے آپ کی علم دوستی اور فقاہت کا ثبوت ملتا ہے۔

علم و عبادت کا یہ چراغ جس سے کئی چراغوں کو روشنی ملی، آخر اپنی یادیں اور علمی کارناموں کا انمول تحفہ دے کر شعبان ۱۵۸ھ میں[۲۹] اس دنیا سے روشنیاں سمیٹتا ہوا نورِ حقیقی کے حضور جا پہنچا۔ آپ امام ابو حنیفہ کے سب سے پہلے وفات پانے والے شاگرد ہیں،

اللّٰھم اغفر لہ و لجمیع المسلمین۔

۲۸ھ صدیق حسن خاں: اتحاف النبلا: ۲۵۱، مطبوعہ کانپور ۱۲۸۸ھ

۲۹ھ ذہبی: دول الاسلام: ۸۲ مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۳۷ھ۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تشربوا واحدا کشرب البعیر ولکن اشربوا مثنیٰ وثلاث وسموا اذا انتم شربتم واحمدوا اذا انتم رفعتم۔

(جامع ترمذی۔ ابواب الاشربہ: باب ماجاء فی التنفس فی الاناء)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب کوئی چیز پینے لگو تو اونٹ کی طرح ایک ہی سانس میں نہ پی جاؤ، بلکہ دو یا تین دفعہ سانس لے کر پیو۔ اور (یہ بھی یاد رکھو کہ) پینا شروع کرو تو بسم اللہ پڑھو، اور فارغ ہو جاؤ تو الحمد للہ کہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہر قسم کی دینی، مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی و ثقافتی ہدایات سے بہرہ مند کیا ہے اور وہ تمام باتیں ایک ایک کر کے تفصیلاً یا اجمالاً بتا دی ہیں، جو ان کی اصلاح و تربیت کے لیے ضروری ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ہر لحاظ سے مکمل مذہب ہے اور اس کے اتمام و تکمیل کا یہ بنیادی تقاضا ہے کہ اس میں ہر ایسی چیز کی نشان دہی کر دی جائے جو انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی حدیث کو لیجیے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ یہ حدیث محدثین کے نزدیک اگرچہ درجۂ صحت کو نہیں پہنچتی۔ امام ترمذی اسے "ھٰذا حدیث غریب" سے تعبیر کرتے ہیں، تاہم اس کا مضمون اپنی جگہ بڑا اہم ہے، اور اس قسم کی دیگر احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حدیث کے ان الفاظ سے صاف پتا چلتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی اُمت کے ہر چھوٹے بڑے عمل پر نگاہ رکھتے تھے اور امت کے ہر فرد کو ہر لحاظ سے کامل و مکمل اور شائستہ و مہذب دیکھنا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ کھانے پینے کے معاملے میں بھی جسے ہم معمولی معاملہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، ان کی پوری رہنمائی فرماتے تھے۔ آپ نے وضاحت سے فرمایا کہ کوئی چیز پینے لگو تو تین باتوں کا خیال رکھو۔

ایک یہ کہ برتن منہ کو لگا کر ایک ہی سانس میں نہ پی جاؤ۔ پینے کا یہ انداز اونٹ کا انداز ہے۔ وہ جب پانی کو منہ لگاتا ہے تو ایک ہی سانس میں پی جاتا ہے اور اس وقت منہ اُٹھاتا ہے، جب پیٹ بھر جاتا ہے۔ یہ

طریقہ قطعی غلط ہے۔ یہ حیوان کا طریقہ تو ہو سکتا ہے، مگر انسان کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ برتن کو منہ لگائے تو آرام اور شائستگی سے پیئے اور اس میں دو یا تین سانس لے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ سانس بھی پیتے پیتے برتن ہی میں نہ لے، بلکہ برتن سے منہ الگ کر کے سانس لے۔

دوسرے یہ کہ کوئی چیز پینا شروع کرو تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر شروع کرو۔ تاکہ اس موقع پر انسان اللہ کی یاد سے غافل نہ رہے۔ عام طور پر لوگ کھانے پینے کے موقع پر اللہ کو یاد نہیں رکھتے اور سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جو کچھ انھیں ملا ہے، وہ محض ان کی قابلیت اور تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ بتانا چاہتا ہے کہ انسان کے وسائل بہرحال محدود ہیں، تمھیں جو کچھ دیا جاتا ہے، وہ اللہ کے فضل و کرم اور اس کی بے پایاں مہربانیوں کا نتیجہ ہے

تیسرے یہ کہ کوئی چیز پینے سے فارغ ہو جاؤ تو تب بھی اللہ کی نوازش ہائے پیہم کو یاد رکھو اور الحمد للہ پڑھو۔ پوری دعا جو دوسری حدیث میں مذکور ہے، یہ ہے:

الحمد للہ الذی اطعمنا و سقانا وجعلنا من المسلمین (یعنی سب تعریفیں اور تمام ستائشیں اس اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ہیں، جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا)۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی موقع پر کبھی بھولنا نہیں چاہیے، بلکہ ہر آن اس کو یاد رکھنا چاہیے اور یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہم اس کے عاجز و درماندہ اور مسکین بندے ہیں۔ ہمارا اصل سہارا اللہ کی مدد اور اس کی ذاتِ گرامی ہے۔ ہم اپنے طور سے کچھ نہیں کر سکتے، ہر چیز میں اسی کے محتاج ہیں۔ وہ تمام اسباب جو ہمارے رزق اور روزی مہیا کرنے کا باعث ہیں، اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر وہ ہماری دستگیری اور رہنمائی نہ کرے تو ہم اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے۔

اسی نے ہم کو عقل و فہم، فکر و فراست اور جسمانی و بدنی طاقت سے نوازا اور ہم اس لائق ہو پائے کہ اپنی ضروریات کا تکفل کر سکیں اور سامانِ اکل و شرب سے بہرہ یاب ہو سکیں۔

نقد و نظر

اصلاحِ انقلابِ اُمت

تصنیف : مولانا اشرف علی تھانوی

ناشر : ادارۃ المعارف، دارالعلوم، کراچی ۱۴

صفحات : ۲۳۲ - کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ - جلد مضبوط - قیمت ۲۴ روپے

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم، برصغیر پاک و ہند کے جلیل القدر عالم اور عظیم المرتبت مصنف تھے۔ ان کی زیرِ نظر کتاب "اصلاحِ انقلابِ اُمت" اپنے موضوع میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انھوں نے ان خرابیوں اور قباحتوں کا جائزہ لیا ہے جو ہماری گھریلو اور معاشرتی زندگی میں پھیل گئی ہیں اور جن کی وجہ سے معاشرہ کئی قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ حضرت مصنف نے نکاح، مہر، نفقہ، عدت، رضاعت، طلاق، لقطہ اور دیگر حقوق العباد سے متعلق شرعی احکام کی صراحت کی ہے اور اس کی عمدگی سے وضاحت کی ہے کہ مسلم معاشرے میں کیا کیا غلط رسوم و عوائد پائی جاتی ہیں اور ان کے نتائج کس درجہ نقصان دہ ہیں۔ پھر یہ بتایا ہے کہ شریعت کی روشنی میں انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

تذکرہ مصنفینِ درسِ نظامی

تصنیف : پروفیسر اختر راہی

ناشر : مکتبہ رحمانیہ۔ اُردو بازار، لاہور

صفحات : ۲۰۰ - کتابت، طباعت، کاغذ، جلد عمدہ - قیمت درج نہیں

پروفیسر اختر راہی صاحب، ملک کے مشہور اہلِ علم اور نامور مصنف ہیں۔ "تذکرہ مصنفینِ درسِ نظامی" ان کی بہترین تصنیف ہے۔ اصحابِ علم میں اس کتاب نے اس درجہ قبولیت حاصل کی کہ تھوڑے ہی عرصے میں پہلی اشاعت ختم ہو گئی اور اب مناسب اضافوں کے ساتھ دوسری اشاعت سامنے آگئی ہے۔ یہ کتاب اپنے مندرجات کے اعتبار سے بڑی اہم ہے۔ اس میں ان حضراتِ مصنفین اور شارحین کے حالات بیان کیے

گئے ہیں، جن کی تصنیفات با شروح برِ صغیر پاک و ہند کے دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں داخل ہیں۔ یہ انتخاب آغا صاحب کی بہت بڑی خدمتِ علم ہے، ورنہ مختلف مضامین کی جو کتابیں ہمارے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، ان کے مصنفین کے حالات و سوانح سے نہ ہمارے مدرسین واقف ہیں نہ طلبا۔! وہ اصل کتابیں اور ان کے شروح و حواشی تو پڑھ جاتے ہیں مگر ان کے مصنفین اور شارحین کے حالات کا انھیں قطعاً کوئی علم نہیں ہوتا۔ فاضل مصنف نے انتہائی محنت اور بہترین ترتیب سے ان کے حالات بیان کر دیے ہیں اور ان کی علمی و تحقیقی خدمات سے اپنے قارئین کو باخبر کر دیا ہے۔ اس کتاب کا یوں تو سرا اہلِ علم کو مطالعہ کرنا چاہیے، لیکن علمائے دین، مدرسین اور طلبائے علم کو بالخصوص اس سے مستفید ہونا چاہیے۔

معارفِ اقبال

تصنیف : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

مترجمہ : جناب سید حسین امام

ناشر : اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ناظم آباد، بی روڈ، کراچی۔

صفحات، ۱۶۰۔ کتابت، کاغذ، طباعت، جلد، سرورق بہترین۔ قیمت ۱۲ روپے۔

علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن میں زیرِ نظر کتاب "معارفِ اقبال" ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقدمہ کتاب، ملک کی مشہور شخصیت جناب سید حسین امام صاحب نے سپردِ قلم کیا ہے۔ اس کتاب میں کلامِ اقبال کے تاریخی اور سیاسی پس منظر، اقبال کے نظریۂ شعر و ادب، اقبال اور حدیث، اقبال اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اقبال کے دینی عقائد، اقبال اور ترک، اقبال اور برگساں، اقبال اور تصوف وغیرہ مسائل کو موضوعِ بحث ٹھہرایا گیا ہے۔ اقبال شناسی کے سلسلے میں یہ کتاب اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

۴۷ء کے آنسو

تصنیف : سید مصطفیٰ علی بریلوی

ناشر : آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ناظم آباد، کراچی ـــ صفحات ۲۳۲ ـ قیمت ۸ روپے

سید مصطفیٰ علی بریلوی، ملک کی معروف علمی شخصیت اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب "۴۷ء کے آنسو" ان کی ۱۹۷۸ء کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں ان حوادث کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن سے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے مسلمان دوچار ہوئے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں، صوبوں اور ریاستوں کی مسلم آبادی کے اعداد و شمار بھی بتائے گئے ہیں۔ اپنے موضوع میں کتاب بہت سے معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اگست ۱۹۷۲

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

مجلس ادارت

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکار نمبر
S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971
جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقام اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون : ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۲ | اگست ۱۹۷۹ | رمضان ۱۳۹۹ | شمارہ ۸

ترتیب

تاثرات

نہایت افسوس ہے کہ ۱۲ اور ۱۳ جون ۱۹۷۹ء کی درمیانی شب میں مولانا سید محمد الحسنی نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مولانا مرحوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے سابق ناظم ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی مرحوم کے اکلوتے صاحب زادے اور مشہور محقق و مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بھتیجے تھے۔ وفات کے وقت عمر صرف ۴۴ سال تھی۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ انگریزی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ مشہور نومسلم جرمن علامہ محمد اسد کی انگریزی کتاب "روڈ ٹو مکہ" کا "طوفان سے ساحل تک" نہایت شاندار اردو ترجمہ کیا۔ ندوۃ العلما کے بانی مولانا سید محمد علی مونگیری کی مفصل و مبسوط سوانح عمری لکھی، اسی طرح اور بھی متعدد علمی خدمات انجام دیں۔

مولانا سید محمد الحسنی کی ایک بہترین خدمت وہ تھی جو "البعث الاسلامی" کے نام سے وہ ہر مہینے انجام دیتے تھے۔ عربی کا یہ ماہانہ رسالہ ان کی ادارت میں کئی سال سے جاری تھا اور زبان، انداز اور معلومات کے اعتبار سے بڑا کامیاب تھا۔

مرحوم کی وفات سے جہاں برصغیر پاک و ہند کے علمی حلقوں کو نقصان پہنچا ہے، وہاں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو شدید صدمہ ہوا ہے۔ مرحوم ان کے دستِ راست تھے اور تمام علمی اور تحقیقی کاموں میں ان کی اعانت کرتے تھے۔ ان کی خدماتِ گوناگوں سے علی میاں بہت خوش تھے۔

مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ سید محمد الحسنی کی وفات سے ٹھیک ایک مہینہ بعد ۱۱ جولائی ۱۹۷۹ء کی شام کو ندوہ ہی کے ایک اور عالم و صحافی مولانا محمد اسحاق جلیس بھی مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے۔ اتفاق سے یہ بھی ۴۴ سال کی عمر کو پہنچے تھے، ندوہ کے اخبار سہ روزہ "تعمیر حیات" کے ایڈیٹر تھے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی علمی لحاظ سے ان پر بھی بہت اعتماد کرتے تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے ورثا و متعلقین کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

راسخ عرفانی

حمد باری تعالیٰ

لب پہ ہے حمدِ ربِّ ودود ساتھ سر کے ہے دل بھی محوِ سجود

محض بخشش کے یہ بہانے ہیں تیرے کس کام ہیں قیام و قعود

کبریائی کے یہ حسین مظہر کہسار و زمین و چرخِ کبود

صرف اظہارِ شکر کرتا ہوں میرا مقصد نہیں ہے نام و نمود

مہر و ماہ و نجوم و ارض و سما تُو ہے سارے جہان کا مقصود

تیری رحمت سے جی رہا ہوں میں ورنہ مجھ پہ گراں ہے اپنا وجود

اس کی تعریف کیا ہو اے راسخ

علم جس ذات کا ہے لامحدود

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک*

ظہور قدسی

آج سے چودہ سو سال کی اُلٹی زقند لگا کر زمانے کے واقعات کو تخیل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو دنیا میں جہالت، بداخلاقی اور بداعمالی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ اس ظلمت کدہ میں باشندگانِ عالم غفلت و جمود کی نیند میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے فلاکت و ادبار کی کروٹیں بدل رہے تھے۔ خدا کے بندوں نے اپنی صورتوں کو اس قدر مسخ کر لیا تھا کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ تمدن و معاشرت کا دفتر گاؤ خورد ہو چکا تھا، کفر کی کالی گھٹائیں ہر طرف تلی کھڑی تھیں، عصیاں کی بجلیاں کوند رہی تھیں، خطہ عرب میں ہر طرف جنگ و جدل اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا، جوا اور شراب ان کا جزوِ زندگی تھا، لوگ ہمدردی سے قطعاً نا آشنا، حق و باطل اور حلال و حرام کے امتیاز سے کوسوں دور تھے، گویا بہائم تھے کہ بدترین رسم و رواج کی بھیانک تاریکی میں دن گزار رہے تھے۔ ایسے حالات میں بے کسوں، بے بسوں، عاجزوں، مظلوموں اور یتیموں کی دنیا زبانِ حال سے، الغیاث الغیاث پکار رہی تھی کہ جذبۂ رحمتِ حق کو حرکت ہوئی اور آن کی آن میں فاران کی چوٹیوں سے اس بھیانک ظلمت کو دور کرنے والا مہربان فضائے مشرق و مغرب پر ضیا بار ہو گیا۔ یعنی ماہ ربیع الاول میں رب العالمین نے رحمۃ للعالمین حضرت محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کل عالموں کی ہدایت و سعادت کا سامان دے کر بھیجا۔ یہ واقعۂ ولادت ہوئی ہے، جو دعوتِ اسلامی کے ظہور کا پہلا دن تھا۔ یہ دن محض ریگستانِ حجاز کی بادشاہت کا پہلا دن نہ تھا۔ یہ محض عرب کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش نہ تھی۔ یہ محض قوموں کی طاقت کا اعلان نہ تھا۔ اس میں صرف نسلوں اور ملکوں کی بزرگی کی دعوت نہ تھی، بلکہ یہ تمام عالم کی ربانی بادشاہت کا یوم میلاد تھا۔ یہ تمام دنیا کی ترقی و عروج کے بانی کی پیدائش تھی۔ یہ تمام کرۂ ارضی کی سعادت کا ظہور تھا۔ یہ نوعِ انسانی کے شرف و احترام کے قیام کا دن تھا۔ یہ قوموں کی برائیوں اور ملکوں کی فتوحات کا نہیں بلکہ خدا کے عرشِ جلال و جبروت کی آخری اور دائمی نمود تھی۔ بس یہی دن سب سے

بڑا ہے۔ کیونکہ اسی کے اندر دنیا کی سب سے بڑی برائی ظاہر ہوئی، یہ ہدایت الٰہی کی تکمیل تھی۔ شریعتِ ربانی کے ارتقا کا مرتبۂ آخری تھا۔ یہ سلسلۂ ترسیلِ رسل و نزولِ صحف کا اختتام تھا۔ یہ سعادتِ بشری کا آخری پیام تھا۔ یہ وراثتِ ارضی کی آخری بخشش تھی۔ اسی دن کو دنیا کا وہ سب سے بڑا ہادی اور خدا کا وہ سب سے برگزیدہ انسان مبعوث ہوا جس کی جبینِ تابناک سے نورِ حقیقت کی شعاعیں نکل رہی تھیں جس کے جاہ و جلال کو دیکھ کر قیصر و کسریٰ کے تخت لرز گئے۔ جس کے فیضانِ آشعہ ولامعہ نے ظلمت آبادِ ارضی کو نور کا بقعہ بنا دیا۔ غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں۔ تمیزِ رنگ و نسل مٹ گئی۔ انسانیت کا کھویا ہوا وقار قائم ہوا۔ مخلوق خداوندوں کی خداوندی کا خاتمہ ہو گیا۔ حضور نے فاران کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ایک پیغام دیا۔ جن روحوں نے اس پیغام پر لبیک کہا انھیں خلافتِ الٰہیہ عطا ہوئی۔ قیاصرہ اکاسرہ کے تاج ان کے قدموں پر نثار ہوئے اور جب تک آفتاب عالم تاب مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوتا رہے گا، دنیا اس یتیم مکہ کے اس اعجاز کو نہ بھولے گی کہ اس نے شتربانوں کو جہاں بانی کے وہ گر سکھائے کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ربع مسکون پر چھا گئے اور مشرق و مغرب پر اُن کے جھنڈے لہرانے لگے۔ خود اُمّی ہونے کے باوجود علم و معرفت کے وہ انوار بتلائے کہ وہ محفل علوم کے صدر کہلائے اور تمام دنیا نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ انسانیت کے اس کمال کا عالمِ وجود میں آنا انسانوں کے لیے کس قدر باعثِ برکت ہوا۔ اس کا حال دنیا میں پھیلی ہوئی روشنی اور تہذیب سے پوچھو۔

شرک اور ظلمت کی آفت کافور ہو گئی، لوگ اپنے پروردگار کو ماننے لگے، نسل و خون کی لعنت مٹ گئی، غلام اور آقا ایک ہو گئے، انسانیت کی تعمیر، اخوت و مساوات کی بنیادوں پر شروع ہوئی۔ متلاشیانِ حق کو ایسا عرفانِ الٰہی حاصل ہوا کہ ماسوا اللہ کا خوف خود بخود دل سے جاتا رہا۔

ذاتِ قدسی کی سیرت کے مختلف پہلو

سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں اور زندگی کے مختلف شعبوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہر شعبہ ہماری راہنمائی و رہبری کے لیے مشعلِ راہ اور زندگی کا ہر حصہ ایک ایسا عظیم الشان معجزہ ہے، جس کی مثال ناممکن ہے۔

آپ کی ذات بابرکات ایک ایسا مرتب و منتظم اور جامع نمونۂ زندگی پیش کرتی ہے جس کی مثالیں معمولی سے معمولی مزدور اور کسان سے لے کر بڑے بڑے اصحابِ سیاست اور حکمران کو کامرانی کی منزل تک لے جا سکتی ہیں۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر اور کامیاب بنانے کے لیے آپ کے اعمال و افعال میں بہترین نظیر اور عملی نمونہ موجود ہے۔

آدابِ خورش و رہائش اور سلوک عزیزان و ہمسائیگاں سے لے کر آدابِ جنگ و سفارت اور آدابِ حکومت و عدالت تک نہایت افراط، عمدگی اور حسنِ ترتیب کے ساتھ ایک منضبط اور وابستہ لائحۂ عمل نظر آتا ہے۔ پھر اس کمال کے اندر کمال یہ ہے کہ کسی شعبۂ زندگی کے انہماک و مظاہرہ کے موقع پر دوسرے شعبوں کے عمل میں ذرہ برابر خامی یا پہلو تہی نظر نہیں آتی۔ یعنی یہ کمال صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں نظر آئے گا کہ ایک پہلو کی رفعت و بلندی کے وقت دوسرے پہلوؤں کو اپنے نقطۂ کمال سے بقدر رمق بھی نہ ہٹایا، اور یہی وہ عظیم الشان معجزہ ہے جس نے آپ کی سیرت کو جلیل القدر انسانوں کی سیرت سے بلند و ممتاز بنا دیا ہے کہ جس کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ تاریخ عالم مشاہیر و زعما کے تذکروں سے بھری پڑی ہے، ہر ایک کی زندگی کا مطالعہ یہی بتاتا ہے کہ ان کی عظمت و بزرگی کا سبب مسائلِ حیات کے دو ایک یا چند پہلوؤں کے متعلق راہِ ثواب کی دریافت و تبلیغ تک محدود تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نظر آئے گا کہ یہ بزرگ اپنے خصوصی گوہرِ مقصود کی تلاش و حصول کے سلسلے میں دیگر متعلقات سے یا تو بے تعلق رہے یا کم از کم ان کی انجام دہی میں اس انتہا تک نہ رہ سکے جو ان مسائل میں عام انسانوں کے لیے بہترین نظیر قرار دی جا سکے۔ اربابِ عقل و ہوش کی ہزار سالہ تحقیق اور اصحاب دین و فکر کی لامحدود کاوشیں انسانی زندگی کے نظم و انصرام کے سلسلے میں کوئی ایسا اصول وضع کرنے پر قادر نہ ہو سکیں جو معمولی سے معمولی اور اہم سے اہم مسائل حیات و تمدن کی راہنمائی کے لیے کافی ہو۔

عالمِ انسانیت میں ایک حیرت انگیز انقلاب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام قبیلوں کے درمیان جو سالہا سال سے ایک دوسرے کے خلاف مقابلے میں تلواریں سونتے ہوئے تھے، الفت و محبت کا پیوند لگا دیا۔ عرب کی جنگِ بعاث جو اوس و خزرج کے درمیان بڑی مدت سے جاری تھی، یک قلم موقوف ہو گئی۔ اس مصالحت کے لیے

اگر کوئی شخص پوری دنیا خرچ کر دیتا تو بھی اس کی طاقت سے باہر تھا۔ مکی مدنی سب گھل مل گئے۔ نبی کریم نے انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ قائم کرا دیا۔ ایسا بھائی چارہ جس کے سامنے سگے بھائیوں کی محبت اور دنیا کی ساری دوستیاں شرمندہ تھیں۔ تاریخ میں ایسی محبت و خلوص کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے درمیان کی کڑی جو اُن کے دلوں کو پیوست کر رہی تھی، صرف اسلام کی محبت تھی۔ یہ نئی جماعت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ تھی اس جماعت کا ظہور ایسی کٹھن گھڑی میں ہوا جب کہ دنیا موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف نبی کریم اس جماعت کی تربیت فرما رہے تھے، دوسری طرف قرآنِ پاک برابر اُن کے قلوب کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا۔ رسول کریم کی مجالس سے ان کو دینی استحکام، خواہشاتِ نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے آپ کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتسابِ نفس کی دولت حاصل ہوئی۔ لوگ جس حال میں ہوتے، ارشادِ نبوت سنتے ہی خدا کی راہ میں اُٹھ کھڑے ہوتے، یہ لوگ رسولِ کریم کی معیت میں دس سال کے اندر ۲۷ بار جہاد کے لیے نکلے اور آپ کے حکم سے سو مرتبہ سے زائد مرتبہ کمر بستہ ہو کر میدانِ جنگ کی طرف گئے۔ ان کے لیے دنیا سے بے تعلقی آسان ہو گئی۔ اہل و عیال کے مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے۔ یہ لوگ اس طرح دامنِ رسالت سے وابستہ ہوئے کہ جس بات کا آپ فیصلہ فرما دیتے ان کے نزدیک اس میں اختلاف کی ذرہ گنجائش باقی نہ رہتی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اپنے چھپے گناہوں کا اقرار کیا۔ اگر کسی گناہ میں مبتلا ہو گئے تو اپنے آپ کو حدود اور سزاؤں کے لیے پیش کر دیا۔ شراب کی حرمت کا نزول ہوا، تو چھلکتے ہوئے جام ہتھیلیوں پر تھے، اللہ کا حکم ان کے اور شراب کے درمیان حائل ہو گیا۔ ہاتھ کو ہمت نہ تھی کہ اوپر اُٹھ سکے۔ اور لبوں کی تمنائیں وہیں خشک ہو گئیں۔ شراب کے برتن توڑ دیے گئے اور شراب مدینے کی گلیوں اور نالیوں میں بہہ رہی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو نہ کسی مصیبت سے گھبراتے نہ کسی نعمت پر اتراتے۔ فقر ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکتا۔ دولت سرکشی پیدا نہ کر سکتی۔ تجارت غافل نہ کرتی۔ کسی طاقت سے نہ دبتے۔ اللہ کی زمین پر اکڑنے کا خیال بھی نہ آتا۔ لوگوں کے لیے وہ سراپا عدل تھے۔ وہ انصاف کے علمبردار اللہ کے گواہ تھے۔ خواہ اپنے نفسوں کے خلاف گواہی دینی پڑے۔ خواہ والدین اور اعزہ کے خلاف جانا پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی

زمین کو ان کے قدموں میں ڈال دیا اور ان کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ وہ اس وقت عالم کے محافظ اور اللہ کے دین کے داعی بن گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا جانشین بنایا اور آپ خود ٹھنڈی آنکھوں کے ساتھ رسالت اور امت کی طرف سے اطمینان کی دولت لے کر رفیقِ اعلیٰ کی طرف سفر کر گئے۔ انسانی طبیعت کا یہ زبردست انقلاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر انجام پایا انسانی تاریخ میں یہ حیرت انگیز انقلاب ہے۔

فتح پانے کے وقت آپ اتنے متواضع تھے کہ فرطِ تواضع سے اپنے مفتوح شہر میں داخلے کے وقت گردن مبارک نیچی کیے ہوئے ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ گردن اتنی جھکی ہوئی تھی کہ اونٹ کے پاؤں سے سر قریب ہو گیا تھا۔ لاکھوں روپیہ کا ڈھیر آپ کی ملکیت ہے، مگر چند گھنٹوں میں اسے تقسیم فرما کر گھر جاتے ہیں اور صرف چند سیر جو پر قناعت کرتے ہیں۔ ایک فاتح جرنیل کے لیے اس واقعہ میں بہترین نمونہ موجود ہے۔

لونڈی غلام تقسیم ہو رہے ہیں مگر جگر گوشہ اور چہیتی بیٹی شکایت کرتی ہے کہ چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں اور مشکیزہ اٹھاتے اٹھاتے جسم پر داغ پڑ گئے ہیں، ایک لونڈی کے لیے درخواست کرتی ہیں مگر آنحضرتؐ اس کے جواب میں یادِ الٰہی کے چند الفاظ سکھاتے ہیں اور کوئی لونڈی عطا نہیں فرماتے۔ کیا اس میں حکمرانوں اور بادشاہوں کے لیے نمونہ نہیں ہے۔

ایسا سلطان عالی ظرف سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کون ہے جو ایک وقت تختِ حکومت سے احکام تدبیرِ سیاست، قوانین جہانگیری و جہانبانی، دفعاتِ دیوانی و فوجداری کا بھی نفاذ کرتا ہو اور دوسرے وقت معمولی مزدور کی حیثیت سے قوتِ لایموت کے حصول میں کوشاں ہو۔ دنیا کا کوئی ایسا فاتح جرنیل نہیں ہوا ہے جس نے کم فوج کے ساتھ مختصر سپاہیوں کو لیے ہوئے جن میں نوجوان بھی ہیں، بوڑھے بھی ہیں، جن کے پاس نہ اسلحہ ہے، نہ سامانِ خوراک، نہ سردی کے زمانے میں گرم ملبوس، نہ گرمی میں سایہ، نہ سواری کو شاندار گھوڑے اور نہ مسافت کا سامان۔ کھجوروں کے پتوں کا کیمپ لیکن ہر جنگ میں فاتحانہ انداز کے ساتھ غنیم کی فوج کو پارہ پارہ کر دیا ہو۔ یہ صرف اس ربانی جرنیل کی شان تھی۔ دنیا میں کوئی ایسا مقنن ہوا ہے جس نے آج تک کوئی یکساں اور غیر متزلزل قانون مرتب کیا ہو جس میں تبدیلی و ترمیم نہ ہوئی ہو۔ قابلِ اعتراض نہ ٹھہرا ہو، جو بدلا نہ گیا ہو۔ مرورِ ایام سے

بیکار اور غلط ثابت نہ ہو چکا ہو ـــــ سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ انسانی کے لیے ایک مکمل و غیر متبدل قانون کوئی دوسرا نہ پیش کر سکا۔ ان کے قوانین میں بنی نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ قیامت تک ان میں ترمیم و تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوگی اور وہ نسلِ انسانی کے لیے ہمیشہ واجب العمل ہوں گے، زمان و مکان اور نسل و ملک کا اختلاف ان قوانین پر اثر انداز نہ ہوگا۔ تمام جماعتوں اور طبقوں کے لیے یکساں قابلِ عمل ہوں گے۔

اللھم صل وسلم و بارک علی سیدنا محمد و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین۔

جناب رحمت فرخ آبادی ایم۔ اے

مقدمۂ بغاوت کراچی اور مولانا محمد علی جوہر

بیسویں صدی کا ابتدائی چوتھائی عرصہ وہ ہے، جب سامراجی ممالک اپنی نوآبادیوں پر سیاسی اور معاشی تسلط رکھتے تھے۔ یہ سامراج کے انتہائی عروج یا زوال کی ابتدا کا دور ہے۔ سامراج کے مختلف گروہوں کو اپنی تجارتی منڈیوں کے تحفظ کے لیے ایک طویل اور تباہ کن جنگ لڑنی پڑی۔ یہ جنگ جو آزادی، جمہوریت اور تہذیب کے نام پر لڑی گئی درحقیقت ایشیا میں پیغامِ بیداری کا باعث بنی۔

جنگِ عظیم کے لیے سپاہیوں کی ضرورت سامراج کی مجبوری تھی۔ نوآبادیوں میں سے جو لوگ فوج میں بھرتی ہو کر مختلف ممالک میں گئے، وہ اپنے ساتھ وہاں سے نئے خیالات بھی لائے۔ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے جب سامراج نے آزادی اور جمہوریت کا نام لیا تو نوآبادیوں کے باشندے ان نعروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ نعرے ان کے لیے اپنے وطن میں آزادی کی جدوجہد کا باعث بنے۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں سے قبل مسلمانوں کی عظیم الشان حکومت قائم تھی اور انھوں نے اس زمین کو اپنا وطن بنا کر صدیوں اس کے تحفظ کی لڑائی لڑی اور حکومت کی، اور آخری دور میں تو مغل تاجداروں کو ایک تقدس کا مرتبہ بھی حاصل ہو گیا تھا اور یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ تختِ دہلی پر آلِ تیمور کے علاوہ کوئی اور بھی بیٹھ سکتا ہے، لیکن تاریخی تقاضے اس سے مختلف تھے۔ برصغیر کا سیاسی انتشار، یورپی اقوام کی تجارت میں برتری اور یہاں کی مقامی سیاست میں مسلسل دخل اندازی آخرکار انگریزی حکومت کے قیام کا باعث بنی۔ لیکن برطانوی اقتدار کے خلاف آغاز ہی سے مسلمانوں میں جتنی تحریکیں چلیں وہ سب مذہب کے نام پر لڑی گئیں۔ تحریکِ مجاہدین اسلامی نشوونما کے نام پر لڑی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا بڑا فوری سبب سور کی چربی والے کارتوس تھے اور اس کے بعد منظرِ عام پر کوئی سیاسی تحریک نہیں ابھری۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی نے مسلمانوں میں مایوسی پیدا کر دی تھی اور بعض دوراندیش رہنماؤں نے سیاست میں عدم مداخلت اور انگریزی حکومت سے تعاون کی راہ

کو مسلمانوں کے لیے مناسب خیال کیا۔ ان افکار و خیالات کی قیادت سر سید احمد خاں اور نواب محسن الملک نے کی۔ اس مکتبِ فکر نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب دورِ شاہی ختم ہوا اور یہ کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ملک میں جمہوری حکومت قائم ہوگی جو اکثریت کے نام پر ہندو حکومت کا روپ دھار لے گی۔ اس اکثریت کی جمہوری حکومت سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ غیر ملکی حکومت سے تعاون کیا جائے۔ اس مکتبِ فکر نے علمی، ادبی اور تہذیبی دوائر میں نہایت نمایاں خدمات انجام دیں، اور اسی تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں میں ملازمتوں کا مقابلہ اور شوق اور جدید علوم کے حصول کا ذوق پیدا ہوا۔ دوسری طرف یہ امر بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ مختلف انقلابی تنظیمیں بڑے پیمانے پر ملک میں کام کرتی رہیں۔ یہ تنظیمیں انتہائی خفیہ اور جانثاری کے کارناموں سے مسلح ہوتی تھیں۔ عام طور پر ان تمام تحریکوں میں برصغیر کی تمام قوموں کے نمائندے جن میں مسلمان بھی شامل تھے شریک ہوتے تھے۔ آخری خفیہ تحریک جو قدرت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے اپنی تمام خفیہ تحریکوں سے زیادہ مضبوط تھی وہ تحریک ریشمی رومال ہے جس کی قیادت مسلمان علما کر رہے تھے اور جس کے روابط نہ صرف تمام عالمِ اسلام کے سربراہوں سے تھے بلکہ روس کے انقلابیوں سے بھی ان کا رابطہ تھا۔ گویا تحریک ریشمی رومال برصغیر میں عالمی انقلابی تحریک کا ایک حصہ تھی جو وقت سے پہلے راز افشا ہونے کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد تمام دنیا میں انقلابی تحریکوں کو خفیہ رکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور آزادی اور جمہوریت کے نام پر اب تمام تحریکیں سیاسی میدان ہی میں چلنا شروع ہوئیں۔

جنگِ عظیم اول میں اہلِ ہندوستان عمومی طور پر اور مسلمان خصوصی طور پر اس وعدے پر شریک ہوتے تھے کہ خلیفۂ ترکی کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور مسلمانوں کے مقدس مقامات محفوظ رہیں گے۔ یہ ضمانت اس لیے ضروری تھی کہ عام مسلمان یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خلیفۂ ترکی جس کا نام جمعہ کے خطبے میں لیا جاتا تھا، اس کے خلاف انگریز لڑیں۔ انگریز مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے واقف تھا اس لیے اس نے ترکی اور جرمنی کے اتحاد کے باوجود یہ باور کرا دیا کہ انگریز کی جنگ ترکوں سے ہے خلیفۂ اسلام سے نہیں۔ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ وعدوں کو وفا نہ کر سکیں گے چنانچہ رولٹ ایکٹ جیسے کالے قوانین بنائے گئے تاکہ جنگ کے بعد چلنے والی تحریکوں سے آسانی کے ساتھ نپٹا جا سکے۔ رولٹ ایکٹ دراصل تحریک ریشمی رومال کو ختم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا،

جناب رحمت فرخ آبادی ایم۔ اے

مقدمۂ بغاوت کراچی اور مولانا محمد علی جوہر

بیسویں صدی کا ابتدائی چوتھائی عرصہ وہ ہے، جب سامراجی ممالک اپنی نوآبادیوں پر سیاسی اور معاشی تسلط رکھتے تھے۔ یہ سامراج کے انتہائی عروج یا زوال کی ابتدا کا دور ہے۔ سامراج کے مختلف گروہوں کو اپنی تجارتی منڈیوں کے تحفظ کے لیے ایک طویل اور تباہ کن جنگ لڑنی پڑی۔ یہ جنگ جو آزادی، جمہوریت اور تہذیب کے نام پر لڑی گئی درحقیقت ایشیا میں پیغامِ بیداری کا باعث بنی۔

جنگِ عظیم کے لیے سپاہیوں کی ضرورت سامراج کی مجبوری تھی۔ نوآبادیوں میں سے جو لوگ فوج میں بھرتی ہو کر مختلف ممالک میں گئے، وہ اپنے ساتھ وہاں سے نئے خیالات بھی لائے۔ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے جب سامراج نے آزادی اور جمہوریت کا نام لیا تو نوآبادیوں کے باشندے ان نعروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ نعرے ان کے لیے اپنے وطن میں آزادی کی جدوجہد کا باعث بنے۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں سے قبل مسلمانوں کی عظیم الشان حکومت قائم تھی اور انھوں نے اس زمین کو اپنا وطن بنا کر صدیوں اس کے تحفظ کی لڑائی لڑی اور حکومت کی، اور آخری دور میں تو مغل تاجداروں کو ایک تقدس کا مرتبہ بھی حاصل ہو گیا تھا اور یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ تختِ دہلی پر آلِ تیمور کے علاوہ کوئی اور بھی بیٹھ سکتا ہے، لیکن تاریخی تقاضے اس سے مختلف تھے۔ برصغیر کا سیاسی انتشار، یورپی اقوام کی تجارت میں برتری اور یہاں کی مقامی سیاست میں مسلسل دخل اندازی آخرکار انگریزی حکومت کے قیام کا باعث بنی۔ لیکن برطانوی اقتدار کے خلاف آغاز ہی سے مسلمانوں میں جتنی تحریکیں چلیں وہ سب مذہب کے نام پر لڑی گئیں۔ تحریکِ مجاہدین اسلامی نشوونما کے نام پر لڑی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا بڑا فوری سبب سور کی چربی والے کارتوس تھے اور اس کے بعد منظرِ عام پر کوئی سیاسی تحریک نہیں ابھری۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی نے مسلمانوں میں مایوسی پیدا کر دی تھی اور بعض دور اندیش رہنماؤں نے سیاست میں عدم مداخلت اور انگریزی حکومت سے تعاون کی راہ

کو مسلمانوں کے لیے مناسب خیال کیا۔ ان افکار و خیالات کی قیادت سر سید احمد خاں اور نواب محسن الملک نے کی۔ اس مکتبِ فکر نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب دورِ شاہی ختم ہوا اور یہ کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ملک میں جمہوری حکومت قائم ہوگی جو اکثریت کے نام پر ہندو حکومت کا روپ دھار لے گی۔ اس اکثریت کی جمہوری حکومت سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ غیر ملکی حکومت سے تعاون کیا جائے۔ اس مکتبِ فکر نے علمی، ادبی اور تہذیبی دوائر میں نہایت نمایاں خدمات انجام دیں، اور اسی تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں میں ملازمتوں کا مقابلہ اور شوق اور جدید علوم کے حصول کا ذوق پیدا ہوا۔ دوسری طرف یہ امر بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ مختلف انقلابی تنظیمیں بڑے پیمانے پر ملک میں کام کرتی رہیں۔ یہ تنظیمیں انتہائی خفیہ اور جاں نثاری کے کارناموں سے مسلح ہوتی تھیں۔ عام طور پر ان تمام تحریکوں میں برصغیر کی تمام قوموں کے نمائندے جن میں مسلمان بھی شامل تھے شریک ہوتے تھے۔ آخری خفیہ تحریک جو قوت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے اپنی تمام خفیہ تحریکوں سے زیادہ مضبوط تھی وہ تحریک ریشمی رومال ہے جس کی قیادت مسلمان علما کر رہے تھے اور جس کے روابط نہ صرف تمام عالمِ اسلام کے سربراہوں سے تھے بلکہ روس کے انقلابیوں سے بھی ان کا رابطہ تھا۔ گویا تحریک ریشمی رومال برصغیر میں عالمی انقلابی تحریک کا ایک حصہ تھی جو وقت سے پہلے راز افشا ہونے کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد تمام دنیا میں انقلابی تحریکوں کو خفیہ رکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور آزادی اور جمہوریت کے نام پر اب تمام تحریکیں سیاسی میدان ہی میں چلنا شروع ہوئیں۔

جنگِ عظیم اوّل میں اہلِ ہندوستان عمومی طور پر اور مسلمان خصوصی طور پر اس وعدے پر شریک ہوتے تھے کہ خلیفۂ ترکی کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور مسلمانوں کے مقدس مقامات محفوظ رہیں گے۔ یہ ضمانت اس لیے ضروری تھی کہ عام مسلمان یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خلیفۂ ترکی جس کا نام جمعہ کے خطبے میں لیا جاتا تھا، اس کے خلاف انگریز لڑیں۔ انگریز مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے واقف تھا اس لیے اس نے ترکی اور جرمنی کے اتحاد کے باوجود یہ باور کرا دیا کہ انگریز کی جنگ ترکوں سے ہے خلیفۂ اسلام سے نہیں۔ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ وعدوں کو وفا نہ کر سکیں گے چنانچہ رولٹ ایکٹ جیسے کالے قوانین بنائے گئے تاکہ جنگ کے بعد چلنے والی تحریکوں سے آسانی کے ساتھ نپٹا جا سکے۔ رولٹ ایکٹ دراصل تحریک ریشمی رومال کو ختم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا،

اس تحریک میں چونکہ برصغیر کے تمام برسرآوردہ افراد شریک تھے، اس لیے اس بل کی شدت کو ہر علاقے میں محسوس کیا گیا، جس کے خلاف تحریک اور مظاہروں کے نتیجے میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا جس نے برصغیر میں آگ لگادی اور اب آزادی اور جمہوریت کے نعرے ہر طرف گونجنے لگے۔ مسجد کان پور کے واقعہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ انگریزی حکومت کے نزدیک مسجد اور اس کا انہدام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ گویا کہ ۱۹۲۰ء میں سامراج اپنے ظلم و ستم میں انتہا پر تھا اور برصغیر کا ماحول نئے خیالات، نئے نعروں اور آزادی اور جمہوریت سے گونج رہا تھا۔

جنگ عظیم اول کے خاتمے پر برصغیر کے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان سے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کیے جا رہے۔ نہ ہی خلافت کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور نہ ہی مقامات مقدسہ بے حرمتی سے بچ سکے۔ نتیجے کے طور پر مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ اس اضطراب کو آغاز ہی سے انگریز اور برصغیر کے قائدین نے محسوس کر لیا تھا۔ قائدین نے انتہائی کوشش کی کہ سامراج مسئلے کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھے، اس کے لیے مختلف وفود نے برطانوی ارباب اقتدار سے لندن جا کر ملاقاتیں کیں اور برطانوی رائے عامہ کو بھی متاثر کرنا چاہا لیکن انگریز اپنے تمام تدبر کے باوجود، اس مسئلے کو نہ سمجھ سکے اور ہندوستان میں پہلی عوامی تحریک، تحریک خلافت کے عنوان سے شروع ہو گئی۔ اس تحریک کا جوش و خروش، جذبۂ حریت، جرأت ایمانی اور جد و جہد کا نقشہ جو لوگوں نے دیکھا، ان کا بیان ہے کہ برصغیر میں دوبارہ ایسی ہمہ گیر تحریک پھر شروع نہ ہوئی۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، اس دور میں مختلف عوامل کے تحت آزادی اور جمہوریت کی تحریکیں پروان چڑھ رہی تھیں۔ اگرچہ رولٹ ایکٹ کے خلاف گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون شروع ہو گئی تھی۔ انگریزی تدبر کا تقاضا تھا کہ وہ دو محاذوں پر لڑنے کے بجائے کسی ایک سے صلح کر لیتا۔ لیکن یا تو اس کو اپنی قوت پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا اور یا وہ ان جذبات کی قوت کا اندازہ نہ کر سکا جو محکوم قوموں کے دل و دماغ میں پروان چڑھ رہے تھے۔ چنانچہ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریک خلافت کا ایک متحدہ محاذ بن گیا جس کا مشترکہ نصب العین انگریز دشمنی تھا۔ اس اتحاد نے ہندو مسلم اتحاد کی وہ صورت اختیار کی کہ ماضی قریب کے واقعات بھی نئی نسل کو افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ ایک مختصر سے دور میں ہندو نے مسلمان کا جھوٹا پانی پیا اور مسلمان نے ہندو کی ارتھی کو کندھا دیا۔ بندے ماترم اور

اللہ اکبر کے نعرے مشترکہ طور پر لگتے اور مساجد کے منبر سے ہندو خطاب کرتے۔ یہ اتحاد اور جوش و خروش زیادہ عرصے تک قائم نہ رہا لیکن اپنے مستقل اثرات بھی چھوڑ گیا۔

اگرچہ گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریکوں کا بظاہر مقصد انگریز دشمنی ہی معلوم ہوتا ہے لیکن ایک فرق بھی نمایاں ہے۔ گاندھی کے نزدیک عدم تعاون اور عدم تشدد ایک سیاسی ضرورت تھی جو سوراج کے حصول کے لیے لازم تھی جبکہ محمد علی جوہر کے نزدیک انگریزی حکومت سے عدم تعاون مذہبی فریضہ تھا اور مسلمانوں کے ایمان کا تقاضا تھا۔ اس فرق نے آگے چل کر نتائج دکھائے۔ مثلاً گاندھی جی کی سیاست نے جب مناسب خیال کیا تحریک بند کر دی یا بنارس یونیورسٹی کو عدم تعاون کی تحریک کا شکار نہ ہونے دیا، چونکہ سیاست میں انتہائی اصول پسندی کبھی نافذ نہیں ہوتی اور ایک سیاست دان کا سب سے بڑا فن اصولوں کا عملی نفاذ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت کو مذہبی روپ دیا۔ انگریز سے عدم تعاون کو شرعاً فرض قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی علی گڑھ کو محفوظ نہ رکھ سکے اور نہ ہی تحریک کو اپنی مرضی سے ختم کرنے کی پوزیشن میں رہے کیونکہ مذہب کے اصول وقت اور جگہ سے تبدیل نہیں ہوتے۔

مولانا محمد علی جوہر کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ بوریا نشین علما کو مدرسہ اور خانقاہ سے نکال کر سیاست میں لے آئے۔ اس کے مابعد منفی اور مثبت اثرات سے بحث کیے بغیر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر تحریک خلافت کی حمایت میں علما کا مشہور فتویٰ نہ ہوتا تو مسلمان اس جوش و خروش سے حصہ نہ لیتے۔ محمد علی جوہر علما سے یہ فتویٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ انگریزی حکومت سے تعاون، اس کی فوجی یا سول ملازمت میں شامل ہونا، عدالتوں میں انصاف کے لیے رجوع کرنا، تعلیمی اداروں میں پڑھنا یا پڑھانا سب حرام ہے۔ علما کے سیاسی اثرات کا ثبوت یہ ہے کہ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی مسلمانوں نے انگریز سے عدم تعاون کی راہ اختیار کر لی۔ اس فتویٰ کو ایک قرارداد کی صورت میں کراچی کی آل انڈیا خلافت کانفرنس میں پیش کیا گیا اور اس کی پورے ملک میں اشاعت کی گئی۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں مشہور مقدمہ بغاوت کراچی چلا، جس میں مندرجہ ذیل افراد پر فرد جرم عاید کی گئی۔

۱۔ مولانا محمد علی جوہر ۲۔ مولانا حسین احمد مدنی ۳۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو
۴۔ پیر غلام مجدد سرہندی ۵۔ مولوی نثار احمد کانپوری ۶۔ شری شنکر اچاریہ ۷۔ مولانا شوکت علی۔

لیکن یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے انگریزی حکومت نے علی برادران پر سندھ میں مقدمہ بغاوت قائم کیا۔ ہمیں اس بات کو اس تاریخی پس منظر میں دیکھنا ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے باضابطہ طور پر شمالی ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے ۱۸۴۳ء میں سندھ پر اپنے قبضہ و اقتدار کو ضروری سمجھا اور اس طرح انھیں ایک اہم فوجی مرکز حاصل ہوگیا جس سے انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ جس عرصے میں آزادی کی یہ جنگ لڑی جا رہی تھی اس دوران کراچی کی بندرگاہ میں اسلحہ سے لد کر آنے والے بحری جہازوں کی تعداد مجموعی طور پر برصغیر کی تمام بندرگاہوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ پھر یہ کہ انگریز یہ بھی سمجھتے تھے کہ سندھ میں مسلمان اسلامی تہذیب و روایات کے سب سے زیادہ امین ہیں، اور وہ دینِ اسلام اور خلافت کے نام پر اپنا تن، من اور دھن سب کچھ قربان کر دیں گے۔ اسی طرح یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہی وہ علاقہ ہے جو تحریک مجاہدین کا بھی ایک اہم مرکز تھا اور تحریک ریشمی رومال میں بھی جس نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۲۰ء سے تحریکِ خلافت کی وجہ سے یہاں کے شہری عوام کے سیاسی شعور میں بھی ایک نمایاں ترقی ہوئی تھی۔

چنانچہ اہلِ سندھ نے تحریکِ خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ سندھ میں تحریک خلافت کے رہنماؤں میں مولوی محمد صادق، شیخ محمد ابراہیم، مولوی عبداللہ لغاری، پیر تراب علی شاہ، پیر انور علی، رئیس جان محمد جونیجو، پیر رشد اللہ شاہ جھنڈے والے، سر عبداللہ ہارون، شیخ عبدالمجید سندھی، جی۔ ایم۔ سید، سید حاجی عبدالحکیم ٹکھڑائی اور ان کے بھائی حاجی اسد اللہ شاہ، سید حاجی علی اصغر شاہ، سید حاجی غلام شاہ اور سید محمد حاجی حافظ شاہ، مولانا تاج محمد امروٹی، مولانا دین محمد وفائی، ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی، حکیم فتح محمد سیوہانی، مخدوم محمد معین الدین تھاردی، خلیفہ میاں ولی محمد، شیخ عبدالعزیز، حکیم شمس الدین۔ ڈاکٹر نور محمد، رئیس میاں غلام محمد بھرگڑی، بیگم نصرت عبداللہ ہارون، مولانا عبدالکریم چشتی۔ نعمت اللہ قریشی، ڈاکٹر محمد یامین، ابو شوکت حمزو، حکیم عبدالحق، میاں محبوب علی شاہ، محمد امین کھوسو، قاضی فضل اللہ، مولوی محمد معاذ، قاضی فیض محمد صدیقی، مولوی محمد سلیمان، مولوی عبدالحق ربانی، محمد ہاشم مخلص، سید حاجی محمد شاہ جاموٹ، عبدالجبار وکیل، ڈاکٹر حاجی قاسم خواجہ، سیٹھ طیب علی علوی، قاضی عبدالرحمٰن نے بھرپور حصہ لیا۔

اسی طرح تحریک ترکِ موالات میں بھی اہلِ سندھ نے مقدور بھر حصہ لیا اور اس سلسلے میں علمائے کرام نے جو ایک فتویٰ شائع کیا تھا، جس پر فرنگی محل اور دوسرے مقامات کے پانچ سو علما کے دستخط تھے، اس فتویٰ پر سندھی علما کے بھی دستخط تھے۔ تحریک ترک موالات اور عدم تعاون کے تحت جن لوگوں نے اپنے خطابات اور اعزازات ترک کیے اور ملازمت کو چھوڑا، ان میں ایک بڑی تعداد اہلِ سندھ کی تھی۔ اسی طرح تحریک ترک موالات کی اپیل پر جن لوگوں نے تعلیم ترک کی، ان میں تین نام قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے بعد میں یہاں کی سیاست پر اپنے اثرات مرتب کیے، ان میں میر اللہ بخش تالپور، پیر الٰہی بخش اور قاضی فضل اللہ شامل ہیں۔

اور اسی طرح تحریکِ ہجرت کے سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی پہلی اسپیشل ٹرین سندھ سے روانہ ہوئی تھی اور اس قافلے کی قیادت یہاں کی مشہور سیاسی شخصیت بیرسٹر جان محمد جونیجو نے کی تھی۔ سندھ کے علی حسن گھانگھڑو پہلے اور آخری شخص تھے جن پر تحریکِ ہجرت کے سلسلے میں باقاعدہ فوجداری مقدمہ چلا اور نتیجے کے طور پر علی حسن گھانگھڑو کو باعزت طور پر بری کیا گیا۔ درحقیقت تحریکِ ہجرت کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ حصہ اہلِ سندھ نے لیا تھا اور انھیں اس تحریک میں بہت زیادہ جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

تحریکِ خلافت اور اس کی دو ذیلی تحریکوں یعنی تحریکِ ترکِ موالات اور تحریک ہجرت کے ایک غائر مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس زمانے کے مسلمان رہنماؤں میں سندھ کے سیاسی مدبر بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ان عوامل ہی کے پیشِ نظر اس وقت کے انگریز حکمران موقع کی تلاش میں تھے کہ ایک تیر سے دو شکار کھیلیں اور انھیں یہ موقع آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی منعقدہ جولائی ۱۹۲۱ء نے فراہم کیا۔

آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی ۸، ۹، اور ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو منعقد ہوئی، اس کی صدارت مولانا محمد علی جوہر نے کی تھی۔ خطبہ استقبالیہ مولانا محمد صادق نے پیش کیا۔ اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں تیرہ قراردادیں منظور کی گئیں [۱۵] جو یہ ہیں:

Indian Khilafat Movement. by K.K. Aziz. Karachi-1972, Page 183-84 [۱۵]

۱۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا یہ اجلاس سلطان ترکی کی مسلمان آبادی سے اپنی وفاداری کا اعلان کرتا ہے اور انھیں یقین دلاتا ہے کہ جب تک خلافت کا مطالبہ پورے طور پر حاصل نہیں ہو جاتا وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

۲۔ یہ اجلاس جناب میاں محمد کی وفات پر جنھوں نے تحریکِ ہجرت کی قیادت کی تھی، انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کے لواحقین سے دلی ہمدردی رکھتا ہے۔

۳۔ یہ اجلاس سندھ کے ان تمام کارکنوں کو جو اپنے مذہب کی خاطر قید و بند کی مشقتیں جھیل رہے ہیں، مبارک باد دیتا ہے اور امید کرتا ہے کہ انھیں اپنے مقصد میں جلد کامیابی ہوگی۔

۴۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ جب تک ہندوستانی مسلمانوں کا مطالبہ برائے خلافت پورا نہیں ہوتا جو کہ ان کے مذہبی عقائد پر مبنی ہے اور جب تک جزیرۃ العرب اور تمام اماکن مقدسہ کے تقدس کو قائم نہیں کیا جاتا وہ چین سے نہ بیٹھیں گے اور ان مقامات کو کسی بھی حالت میں دشمنانِ اسلام کے ہاتھ میں نہ چھوڑیں گے اور یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ تھریس اور سمرنا کے مکمل صوبے سلطنتِ عثمانیہ کے جزوِ لاینفک ہیں جیسے کہ وہ جنگ سے پہلے تھے۔ مسلمان ان کے کسی بھی حصے پر یونان یا کسی دوسری طاقت کا اقتدار، اثر و رسوخ یا مداخلت برداشت نہیں کریں گے۔ مسلمان اتحادی طاقتوں کی وہ تمام شرائط و پابندیاں جو انھوں نے ترک حکومت، یا فوج، بحریہ اور ہوائی افواج پر لگائی ہیں یا وہ تمام شرائط جو مالی، اقتصادی اور عدلیہ کے نظام پر لگائی ہیں، تسلیم نہیں کریں گے کیونکہ یہ تمام شرائط خلافتِ عثمانیہ کی آزادی اور سلطان کی حکمرانی کے اندر ناجائز مداخلت ہیں۔ یہ کانفرنس تمام مقامی کمیٹیوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اسی قسم کے اعلان کا اعادہ کریں تاکہ یہ مذہبی ذمہ داری پوری ہو سکے۔

۵۔ میسوپوٹامیہ کا علاقہ ایسی سرزمین ہے جہاں رسولِ اکرم کے اقارب اور بہت سے صوفیا اور بزرگ مدفون ہیں اور پھر یہ کہ سرزمین جزیرۃ العرب کا خاص حصہ ہے، لہٰذا کسی غیر مسلم کا داخلہ، رہائش یا اثر و رسوخ اسلامی طاقتوں کی مرضی کے بغیر جائز نہیں اور نہ ہی دین اس کی اجازت دیتا ہے۔ اگر یہ علاقہ غیر مسلموں کے قبضے میں آجائے تو یہ شریعت کے خلاف ہوگا۔ مسلمانوں کو یہ یقین ہے کہ آرمینی لوگ ان مقامات مقدسہ کی قربت سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنی اسلام دشمنی کا ضرور بھرپور مظاہرہ کریں گے۔ لہٰذا

یہ کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ ان تمام علاقوں سے غیر مذہب لوگوں کو نکال دیا جائے۔

۶۔ یہ کانفرنس مرکزی خلافت کانفرنس کو اجازت دیتی ہے کہ تمام مسلمان ملکوں میں اپنے سفیر اور کارکن بھیجے تاکہ وہ موجودہ حالات سے تمام مسلمانوں کو واقفیت دلائیں اور ساتھ ہی اسلامی اتحاد کو فروغ دیں۔

۷۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا یہ اجلاس غازی مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کی حکومت کو مبارک باد دیتا ہے کہ انھوں نے بڑی مصیبتیں اٹھاکر اسلام کا دفاع کیا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دشمنانِ اسلام کو ترکی کی سرزمین سے نکالنے میں مدد فرمائے۔ یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ آج سے کوئی مسلمان اگر انگریزی فوج میں بھرتی ہوگا، مدد کرے گا یا ان کا ساتھ دے گا تو وہ غیر قانونی سمجھا جائے گا۔ یہ بھی فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اگر حکومتِ برطانیہ بالواسطہ یا بلا واسطہ، کھلے بندوں یا خفیہ طور پر انقرہ کی حکومت سے لڑے گی تو ہندوستان کے تمام مسلمان ترک موالات کی تحریک شروع کر دیں گے اور انڈین نیشنل کانگریس کے آئندہ اجلاس میں جو احمد آباد میں ہونے والا ہے اپنی مکمل آزادی کا اعلان کر دیں گے اور ہندوستانی جمہوریہ کا جھنڈا لہرا دیں گے۔

۸۔ خلافت کانفرنس کا یہ اجلاس تمام مقامی خلافت کمیٹیوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں شراب نوشی پر مکمل پابندی کے طریقے بتائیں اور ان تمام کارکنوں اور رضاکاروں کو مبارک باد دیتا ہے جہاں کہ شراب کے کاروبار میں کمی آگئی ہے اور سفارش کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے مقصد میں زیادہ تن دہی سے کام کریں۔

۹۔ یہ اجلاس تمام صوبائی، ضلعی اور دیہی کمیٹیوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ تقریباً ایک کروڑ افراد کو تحریکِ خلافت کا کارکن بنائیں اور چالیس لاکھ روپیہ سمرنا کے مصیبت زدہ لوگوں اور مہاجرین اور امدادی فنڈ کے لیے جمع کریں۔

۱۰۔ یہ کانفرنس سندھ کے تمام پیروں اور زمینداروں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ خلافت کے کام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں جیسا کہ انھوں نے اب تک کیا ہے اور اپنے تمام مذہبی رہنماؤں کو اس طرف راغب کریں۔

۱۱۔ یہ کانفرنس سرحدی صوبے کی حکومت کی پرزور مذمت کرتی ہے کہ اس نے کوہاٹ، بنوں اور دیگر علاقوں میں ظلم و تشدد کا دور دورہ رکھا اور خلافت کے کارکنوں اور منتظمین کو جیل میں ڈالا اور جامعہ ملیہ

کے طلبا کو چندہ جمع کرنے سے روکا۔

۱۲۔ یہ کانفرنس لاہور کے سردار سردول سنگھ کویشر کو ان کے جذبۂ بہادری اور مصائب پر جو انھوں نے اپنے مذہب اور ملک کی خاطر خندہ پیشانی سے برداشت کیے مبارک باد دیتی ہے اور حکومت کی ان بے جا حرکتوں کی پرزور مذمت کرتی ہے جن سے وہ سکھ برادری میں تفرقہ ڈالنا چاہتی ہے۔

۱۳۔ یہ کانفرنس تمام افراد سے اپیل کرتی ہے کہ چرخے کو اپنائیں اور کھدر پہنیں اور ملّوں کا تیار کردہ کپڑا غریبوں کے لیے رہنے دیں اور بیرونِ ملک کی تیار شدہ اشیا اور کپڑے سمرنا کے مصیبت زدہ لوگوں کے لیے روانہ کریں۔ یہ بھی درخواست کی جاتی ہے کہ تحریکِ ترکِ موالات کے اس نئے اقدام پر خوش اسلوبی سے عمل کیا جائے اور اس کے علاوہ خواتین سے بھی یہ درخواست ہے کہ وہ غیر ملکی کپڑے کا استعمال کریں۔ اس طرح قوم کی غربت کے اسباب کو ختم کریں۔

ساتویں قرارداد صدارت کی طرف سے ایک تقریر کے ساتھ پیش کی گئی جس میں مولانا محمد علی جوہر نے بتایا کہ اس تجویز کی اہمیت کیا ہے اور نصیحت کی گئی کہ جو لوگ اس کانفرنس میں شریک ہیں انھیں غور و فکر اور سنجیدگی کے ساتھ بغیر کسی جوش و خروش کے اسے منظور کرنا چاہیے اور اگر وہ منظور کرلیں تو اس کے کامیاب بنانے میں اور فوج والوں کو نوکری سے مستعفی کرنے میں انھیں اپنی ساری طاقت صرف کر دینا چاہیے [۲۵] مولانا حسین احمد مدنی نے اصل قرارداد کو کانفرنس میں پیش کیا۔ ڈاکٹر کچلو اور مولانا نثار احمد کان پوری نے اس کی تائید کی۔ سوامی شنکر اچاریہ اور پیر غلام مجدد سرہندی نے اس کے حق میں کانفرنس میں تقریریں کیں اور مولانا شوکت علی نے بعد میں مرکزی خلافت کمیٹی کا سکریٹری ہونے کی حیثیت سے کانفرنس کی قراردادوں کو طبع کرا کے ان کی اشاعت کی۔

اس طرح آل انڈیا خلافت کانفرنس ختم ہوگئی، لیکن گورنمنٹ تو علی برادران کے درپے آزار تھی، چنانچہ اس نے اس قرارداد کی بنیاد پر علی برادران اور اُن کے رفقا پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا محمد علی جوہر گاندھی جی کے ہمراہ سیاسی دورے پر تھے کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انھیں والٹیر کے اسٹیشن پر گرفتار کرلیا گیا۔ چوبیس گھنٹے گرفتاری کی خبر کو حکومت نے دبائے رکھا۔ تمام ملک میں سیاسی تاروں کی ترسیل کا سلسلہ بند رہا۔ کئی روز

---

[۲۵] سیرت محمد علی۔ رئیس احمد جعفری، لاہور ۱۹۵۰ء، ص ۳۸۰

مولانا کو حوالات میں بند رکھا گیا۔ پھر ایک روز رہائی کا حکم سنا کر فوراً ہی گرفتار کرلیا گیا اور کراچی پہنچا دیا گیا۔[۵۳]
لیکن علی برادران اور دیگر رفقائے کار کی گرفتاری کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پورے برصغیر میں پھیل گئی۔
چنانچہ گاندھی جی نے ترچنا پلی سے مولانا جوہر کی کراچی کی تقریر کا اعادہ کیا اور اپیل کی کہ جلسوں میں خلافت کانفرنس کراچی کی قرارداد کو دہرایا جائے اور کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو بمبئی سے اس سلسلے میں بیان دیا اور علی برادران کو اس پر مبارک باد دی کہ ان پر مقدمہ چلایا جارہا ہے اور یہ اعلان کیا کہ مقدمہ چلانے کا جو سبب بیان کیا گیا ہے وہ مذہبی آزادی میں مداخلت ہے[۵۴] اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد پنجاب کے دورے سے واپس جاتے ہوئے ہر بڑے شہر میں تقریر کرتے ہوئے کلکتہ جارہے تھے کہ علی برادران کی گرفتاری کی خبر ملی۔ اس پر انھوں نے اپنی گرفتاری کے لیے یکے بعد دیگرے ایسے شجاعانہ بیانات دیے جس کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جس قرارداد کی بنا پر علی برادران گرفتار کیے گئے ہیں، وہ اسلام کا مانا ہوا مشہور و معروف مسئلہ ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا اعلان کرے۔ وہ قرارداد میری ہی تیار کی ہوئی ہیں اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے انھیں کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منظور کیا گیا تھا۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا۔[۵۵] اسی زمانے میں حکیم محمد اجمل خان نے علی برادران اور اُن کے رفقا کی گرفتاری پر بیان شائع کرایا۔ پھر خلافت کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے عیدالاضحیٰ کے موقع پر ایک بیان میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ عدم تعاون کے پروگرام پر پوری طرح عمل کریں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ اور کھدر کے استعمال پر زور دیا[۵۶] اسی دوران جب آل انڈیا خلافت کمیٹی کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا تو وہاں بھی چھپیس ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اس فتویٰ کے مطابق ایک اعلان پر دستخط کرکے اسے شائع کر دیا اور گورنمنٹ کو چیلنج کیا کہ وہ ان سب لیڈروں کو بھی گرفتار کرلے۔ اعلان پر دستخط کرنے والوں میں صفِ اوّل کے تقریباً تمام لیڈر

---

[۵۳] پاکستان ناگزیر تھا، سید حسن ریاض۔ کراچی ۱۹۷۰ء بار دوم، ص ۱۱۴
[۵۴] ایضاً، ص ۱۱۴-۱۱۵
[۵۵] ابوالکلام آزاد، عبداللہ بٹ، لاہور ۱۹۴۲ء، ص ۳۳-۳۴
[۵۶] حیاتِ اجمل - قاضی عبدالغفار، علی گڑھ ۱۹۵۰ - ص ۲۵۰، ۲۵۱

شامل تھے ۔ مثلاً گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، لالہ لاجپت رائے، موتی لال نہرو، مسز سروجنی نیڈو، عباس طیب جی، ولبھ بھائی پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو، سیٹھ جمنا داس بزاز، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عبدالباری، راجندر پرشاد، مولانا حسرت موہانی، سیٹھ چھوٹانی وغیرہ ۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تاریخ میں اور خصوصاً ہندو مسلم اتحاد کی تاریخ میں یہ دستاویز ایک بہت اہم دستاویز ہے اور ایک بہت بڑا چیلنج تھا جس کا حکومت کوئی جواب نہ دے سکی[۵۷]

اس سلسلے میں جی، ایم سید لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی کی خلافت کانفرنس کی تقریر نے ملک میں ایسا اثر کیا کہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہزاروں کی تعداد میں جلسوں میں اسے دہرایا گیا[۵۸] اسی طرح دسمبر ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس احمد آباد میں منعقد ہوئی جس کی صدارت حکیم محمد اجمل خاں نے کی ۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو آنے والے امتحان کے لیے تیار کیا اور کہا کہ اس سے بھی زیادہ سخت وقت ہمارے سامنے آنے والا ہے، جس قدر بھی سختی ہو ہمیں اسی قدر زیادہ استقلال کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے ۔ اس جنگ کا نتیجہ یقیناً ملک کی فتح ہے[۵۹] ۔ لیکن علی برادران کی گرفتاری سے آل انڈیا مجلس خلافت کے اثرات عوام پر مزید بڑھے ۔ چنانچہ حکومت نے ۱۹ دسمبر ۱۹۲۱ کو رضا کاروں کی بھرتی کو غیر قانونی قرار دیا، چنانچہ حسرت موہانی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے چودھویں سالانہ اجلاس الہ آباد منعقدہ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو صدارتی خطبے میں فرمایا کہ حکومت کے اس اقدام کا مقصد صرف تحریک ترک موالات کی بنیادوں کی بیخ کنی کرنا تھا[۶۰]

(باقی آئندہ)

---

۵۷ حیاتِ اجمل ۔ قاضی عبدالغفار ۔ ص ۲۴۵ - ۲۴۶

۵۸ میری کہانی میری زبانی، جلد اول سندھی ۔ جی، ایم، سید کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۵۶

۵۹ حیاتِ اجمل ۔ قاضی عبدالغفار ۔ ص ۲۶۰

۶۰ Foundation of Pakistan vol 1 Editor by Sharifuddin - Pirzada Karachi - 1969 - P.561

شبیر محمد گریوال

برِّصغیر کے مسلمان حکمران اور بحری طاقت

ماضی کے حالات کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ "بحری طاقت" اکثر قوموں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔ جو قومیں، بحری طاقت کے لحاظ سے مضبوط رہی ہیں وہ دنیا کی سیاسی بساط پر نمایاں ہو کر ابھری ہیں۔ اس کے برعکس جو قومیں بحری طاقت میں کمزور تھیں، ان کی سالمیت اور بقا خطرے میں رہی۔ سرد جنگوں کے جدید دور میں تو بحری طاقت کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

مسلمانوں کو بحری طاقت کی اہمیت کا شروع ہی سے احساس تھا۔ ساحلی علاقوں کے عرب مسلمان پیدائشی طور پر سمندروں سے مانوس تھے۔ وہ قبل از اسلام یعنی زمانہ قدیم سے جہازرانی کرتے چلے آئے تھے۔ بحیرۂ قلزم، خلیج عدن، خلیج فارس، بحیرہ عرب، بحرِ ہند، خلیج بنگال، آبنائے ملکا اور بحرالکاہل کے اکثر حصوں پر ان کو تجارتی فوقیت حاصل تھی۔ ان سمندروں اور خلیجوں کے اہم ٹھکانوں، راستوں اور جزیروں سے واقف تھے۔ اسلام سے پہلے ان کی جہازرانی کے مقاصد اگرچہ زیادہ تر تجارتی نوعیت کے تھے، لیکن بعد از اسلام، تبلیغِ اسلام بھی ان کے مقاصد میں شامل ہوئی اور اس طرح بحری مہموں کا آغاز بھی جلد ہو گیا۔

بحری مہموں کے لیے تحریک دراصل عمر فاروقؓ کے ہی زمانے میں پیدا ہو گئی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بحری مہموں کے لیے دربارِ خلافت سے اجازت چاہی تھی۔ اس اثنا میں بحرین کے گورنر نے سندھ اور بمبئی کے ساحلوں کی طرف، فوجی مہمیں بھیجی تھیں جو کامیاب رہیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے بعض اسباب کی بنا پر بحری جنگوں کی ممانعت کر دی تھی۔ لیکن حضرت عثمان کے زمانے میں امیر معاویہؓ کی قیادت میں باقاعدہ بحری مہموں کا آغاز ہو گیا، اسلامی بحری بیڑے کی تنظیم شروع ہوئی، قسطنطنیہ پر کامیاب بحری حملہ کیا گیا، بحیرہ روم میں قبرس کے جزیرے رومیوں سے فتح کر لیے گئے۔ رومیوں کے ساتھ ابتدائی بحری مہموں کے دوران مسلمانوں کے جہازوں کی تعداد ۵۰۰ کے مقابلے میں تقریباً ۲۰۰ تھی۔ یہ تعداد امیر معاویہ کے آخری زمانے تک ۱۷۰۰ تک پہنچ چکی تھی۔ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں اسلامی

بحری بیڑے میں مزید ترقی ہوئی۔ بحری بیڑے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ طرابلس (ساحل لبنان پر) تیونس (افریقہ)، اسکندریہ (مصر) بڑے بڑے بحری اڈے تھے، جہاں بحری فوج رہتی تھی اور بحری جہاز بھی بنتے تھے۔ اندازہ کیجیے کہ موسیٰ بن نصیر کی گورنری کے دوران صرف تیونس کی بندرگاہ پر ایک سو جہاز بن کر تیار ہوئے تھے۔ اس شاندار بحری بیڑے کی مدد سے شاندار فتوحات حاصل کی گئیں۔ بحیرہ روم کے اکثر جزیرے فتح کر لیے گئے۔ رومیوں کو بحیرۂ روم کے پانیوں سے نکال دیا گیا۔ سارے سمندر پر مسلمانوں کو مکمل فوقیت حاصل ہو گئی۔ سپین اور سندھ پر کامیاب بحری حملے کیے گئے۔

امویوں کے بعد عباسیوں نے بھی اپنی بحری طاقت کا خیال رکھا۔ اگرچہ اب اسلامی ریاست تین مرکزوں، دمشق، قرطبہ اور قاہرہ میں تقسیم ہو چکی تھی، اور شمالی افریقہ اور سپین مرکزی حکومت سے آزاد ہو چکے تھے لیکن ہارون الرشید نے بحیرہ روم میں کامیاب مہمیں بھیجیں اور بحیرہ روم کے جزیرہ قبرص کو دوبارہ فتح کر لیا۔ فاتحین مصر اور سپین کے امویوں کے پاس بھی مضبوط بحری بیڑے موجود تھے۔ یہ حکومتیں اپنی اپنی بندرگاہوں پر حکماً بحری کشتیاں اور بحری جہاز تیار کرواتی تھیں۔

الغرض ابتدائی صدیوں میں مسلمان حکمران جہاں کہیں بھی گئے، اپنے حلقۂ اثر کے سمندروں پر پورا کنٹرول رکھتے تھے۔ وہ بحیرۂ روم، بحرِ اوقیانوس کے بعض حصوں، بحیرۂ قلزم، بحیرہ عرب، خلیج فارس پر چھائے رہے اور بحرِ ہند کے پانیوں پر بھی ان کا کنٹرول تھا۔ بعد کی صدیوں میں عثمانی ترکوں نے اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر بحیرۂ روم پر مکمل کنٹرول حاصل کیا۔ ترکی بیڑا خیرالدین باربروسہ کی نگرانی اور قیادت میں عروج پر پہنچا۔ خیرالدین دنیائے اسلام کا مایہ ناز بحری ہیرو تھا۔ وہ مشہور ترک سلطان سلیمان اعظم کا دوست اور بحری معاملات کا مشیر تھا۔ بحیرۂ روم کے جزائر اور اٹلی و سپین کے علاقوں کو اس نے فتح کیا تھا۔

ترکوں کی توجہ کا مرکز زیادہ تر بحیرۂ روم ہی رہا۔ خلیج فارس، بحیرۂ قلزم اور بحیرہ عرب پر زیادہ توجہ نہ دی۔ حالانکہ سلیمان اعظم کے دورِ حکومت میں کالی کٹ کے حکمران زمورن نے پرتگیزوں کے خلاف بحری اتحاد کے لیے ہاتھ بڑھائے تھے۔ وقتی طور پر زمورن کی مدد کے لیے مصر سے ترکی بحری بیڑہ آیا بھی تھا۔ لیکن بعد میں ترکوں نے بحیرۂ عرب اور بحرِ ہند کو نظر انداز ہی کیے رکھا۔ حالانکہ وہ خلیج فارس اور بحیرۂ قلزم کے ذریعے بحرِ ہند کے پانیوں پر آسانی سے اپنی فوقیت قائم کر سکتے تھے، اور نہ سویز والے راستے کے علاوہ راس اُمید

کا راستہ بھی یورپین اقوام کے لیے بند کر سکتے تھے۔

ترکوں کا مرکزِ سیاست بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ہند سے دور تھا۔ غالباً اسی لیے وہ ان سمندروں کو نظر انداز کرتے رہے۔ لیکن برصغیر کے مسلمان حکمران، جن کا سیاسی مرکز اُن کے قریب تھا، اس ضمن میں کچھ نہ کر سکے۔ حالانکہ محمد بن قاسم کے حملے سے لے کر اورنگ زیب کی وفات تک خلیج فارس، بحیرۂ عرب، بحرِ ہند، خلیج بنگال کے سواحل پر اُن کا سیاسی غلبہ رہا۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں سارا برصغیر فتح ہو گیا تھا۔ اس سے سلطنتِ دہلی کا برصغیر کے مغربی، جنوبی اور مشرقی ساحلوں پر اثر و رسوخ بڑھ گیا تھا۔ تغلقوں کے زمانے میں یہ اثر و رسوخ قائم رہا۔ تغلقوں کے آخری زمانے میں جنوبی ہندوستان کے اکثر حصے بہمنی سلطنت کی حیثیت سے مرکز سے آزاد ہو گئے۔ اور پھر بہمنی سلطنت خود مزید کئی حصوں میں بٹ گئی۔ سلطنتِ دہلی اور بہمنی سلطنت کی جنوبی ہند کی دوسری مسلمان ریاستیں، ان سب کے ہاں ہر قسم کی ترقی کے تذکرے تو ملتے ہیں، لیکن ان میں کوئی ریاست بھی ایسی نہ تھی جو بحری بیڑہ رکھتی ہو۔ خاص کر احمد نگر اور بیجاپور کی مسلمان ریاستیں جو عین ساحلِ سمندر پر واقع تھیں، توپ و تفنگ کی ترقی میں تو مشہور ہوئیں، لیکن ان کے ہاں کسی مضبوط بحری بیڑے کا ذکر نہیں ملتا۔

سلاطینِ دہلی کے علاوہ مغلوں نے بھی بحری بیڑے کی مضبوطی پر کوئی توجہ دی۔ حالانکہ اکبر کے زمانے تک مغلوں کو گجرات اور احمد نگر کے ساحلوں تک سیاسی رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں علاؤ الدین خلجی کے عہد کی طرح شمالی ہندوستان کے علاوہ سارا جنوبی ہندوستان مغلوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور برصغیر کے سارے ساحل ان کے سیاسی حلقہ اثر میں تھے۔ لیکن عظیم مغلوں نے بحری طاقت کے استحکام پر کوئی توجہ نہ دی۔ باوجود اس کے کہ اب یہ حالات و واقعات کا تقاضا بھی تھا۔

سلاطینِ دہلی کے زمانے میں سمندر کی طرف سے کوئی غیر ملکی خطرہ موجود نہیں تھا اس لیے اگر سلاطینِ دہلی نے بحری طاقت کے استحکام پر کوئی توجہ نہ دی تو وہ اتنی قابلِ اعتراض نہیں جتنا کہ مغل قابلِ اعتراض ہیں۔ کیونکہ مغلوں کے زمانے میں پرتگیز ایک بہت بڑا خطرہ بن گئے تھے۔

پرتگیزوں کا ورود مئی ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما کی آمد سے ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ واسکوڈے گاما محض سمندر میں سیر کرتے کرتے کالی کٹ کے مقام پر پہنچا تھا۔ یہ خیال آرائی بالکل غلط ہے۔ وہ خاص مقاصد کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ پرتگیز حکمرانوں کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ بلاشرکت غیرے تمام

سمندروں پر حکمرانی کریں۔ واسکوڈے گاما کا برصغیر کی طرف بحری سفر اس سلسلے کی ایک اہم کڑی تھا۔ وہ ایک مسلح بیڑے کے ساتھ کالی کٹ کے ساحل پر اترا تھا۔ اس کے بیڑے میں تین جہاز تھے اور ان میں اسلحہ تھا۔ جھنڈا بردار جہاز میں ۲۰ کے قریب بندوقیں تھیں۔

کالی کٹ کے حکمران زامورن نے واسکوڈے گاما کی آمد کو خطرے کی گھنٹی سمجھا اور جلد ہی زاموری اور پرتگیزوں کے درمیان طاقت آزمائی شروع ہو گئی۔ پرتگیز گوا میں اپنے پاؤں جمانے میں کامیاب ہو گئے اور جلد ہی ایک ریاست کی حیثیت اختیار کر گئے۔

ادھر ہم عصر مسلمان حکمران اکبر اعظم کا حال دیکھیے کہ باوجود ایک عظیم طاقت ہونے کے پرتگیزوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا، بلکہ الٹا پرتگیزوں سے اپنی صلح کی پالیسی کے تحت پیار کی پینگیں بڑھاتا ہے۔ اسلام اور اسلامی تہذیب کے کٹر دشمن عیسائی پادریوں کو اپنے دربار میں عزت و توقیر بخشتا ہے، ان کو "عبادت خانے" کی بحثوں میں شریک کرتا ہے۔

پرتگیز مغلوں کے لیے خطرے کی گھنٹی تھے۔ اکبر کو خبردار ہونا چاہیے تھا اور اسے پرتگیزوں کے خلاف ایک عظیم بحری بیڑا تیار کرنا چاہیے تھا لیکن اکبر نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس سے پرتگیزوں کو ہندوستان کے ساحلوں پر من مانیاں کرنے کا موقع مل گیا۔

پرتگیزوں کی دیکھا دیکھی ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزوں کو بھی یکے بعد دیگرے ہندوستان کے ساحلوں پر پاؤں جمانے کا موقع ہاتھ آ گیا اور ان نام نہاد یورپین تجارتی اقوام نے جلد ہی ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور اپنی بحری طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو گئیں۔

مغلوں کی تباہی میں یوں تو اور بھی بے شمار عوامل مصروفِ کار رہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو مغلوں کی تباہی و بربادی کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ ان کے پاس مضبوط بحری بیڑا نہ تھا۔ یہاں یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ مغلوں کے ہاں سرے سے بحری بیڑا موجود ہی نہ تھا۔ بحری بیڑا موجود ضرور تھا اور بحری امور کے لیے ایک شعبہ بھی موجود تھا۔ جس کا سربراہ امیر بحر کہلاتا تھا۔ لیکن یہ بیڑا بادبانی کشتیوں اور چھوٹے چھوٹے جہازوں پر مشتمل تھا۔ اندرونِ ملک دریاؤں میں آمد و رفت کے لیے کشتیوں سے ہی کام لیا جاتا تھا و بعض اوقات دریائی کشتیوں ہی سے جنگیں جیتی جاتی تھیں، اور کشتیاں شہنشاہوں کی سفارش پر بنائی جاتی

تھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اندرونِ ملک دریاؤں میں استعمال ہونے والی دریائی کشتیاں "بحری طاقت" کیسے ہو سکتی تھیں؟ اور ساحل سمندر پر بھی جو جہاز موجود تھے، وہ تجارتی نوعیت کے تھے، جنگی نوعیت کے نہ تھے۔ البتہ جنجیرا کے بحری بیڑے کی طاقت سے انکار نہیں۔ اس کی بنیاد ملک عنبر نے رکھی تھی۔ گجرات اور کھمبایت کے مغل بحری حملے نے اس بحری بیڑے سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن یہ عظیم مغلوں کے شایانِ شان نہیں تھا کہ وہ اپنے طویل ساحلوں پر ایک مختصر سے بیڑے پر قناعت کرتے۔ اورنگ زیب کو بحری بیڑے کی کمزوری کا احساس ہو گیا تھا اور اس نے بحری بیڑے کو مضبوط کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن اس اکیلے کی کوشش کیا کر سکتی تھی۔

بحیثیت مجموعی مغلوں کے بحری بیڑے کی نوعیت تجارتی تھی اور اس میں کام کرنے والا بحری عملہ صرف دریاؤں یا دریاؤں کے دہانوں میں جہاز رانی کی مہارت رکھتا تھا۔ سمندر کے گہرے پانیوں سے اس عملے کو مہارت حاصل نہ تھی۔

مغل ایک بحری طاقت کیوں نہ بن سکے۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مغل سنٹرل ایشیا کی روایات کے حامل تھے۔ سنٹرل ایشیا کی روایات میں بحری امور میں دلچسپی مفقود تھی۔ دوسرے مغلوں کو یہی خیال تھا کہ ہندوستان پر بیرونی حملہ شمال مغربی پہاڑوں ہی کی طرف سے ہو سکتا ہے چنانچہ اس پر اُن کی توجہ مرکوز رہی اور اس سلسلے میں انھوں نے "فارورڈ" پالیسی بھی اختیار کی۔ تیسرے وہ یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ سمندر کی طرف سے ہندوستان پر بیرونی قبضہ ہو سکتا ہے، اس لیے یورپین اقوام کی آمد کو انھوں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ مگر ان کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا، اور مغل بالآخر ان ہی یورپین اقوام کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔

اگر مغل شروع ہی سے اس خطرے کو بھانپ لیتے اور اپنی بحری طاقت کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے تو یقیناً اس میں کامیاب ہو جاتے، کیونکہ ہندوستان کے تمام تر وسائل ان کے قبضہ میں تھے جہاں عظیم الشان عمارات، مساجد، مقابر اور قلعے کروڑوں روپے خرچ کر کے تعمیر کرا سکتے تھے، وہاں ایک بحری بیڑا بھی بنا سکتے تھے۔ جس سے وہ اپنے ساحلوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہوتے، لیکن مغل بحری طاقت نہ بن سکے اور زوال سے ہم کنار ہوئے، اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک سبق چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر امان اللہ خاں

حضرت علی بن عثمان الہجویریؒ کی تعلیمات

وَنَفْسٍ وَّ ما سوّٰھا ہ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ہ قد افلح من زکّٰھا ہ وَ قَدْ خاب من دَسّٰھَا ہ۔ (الشمس : ۷ تا ۱۰)

اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اُسے ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دی (یا سوجھادی) اس کی نیکی اور بدی۔ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے مٹی میں ملا دیا وہ ناکام ہوا۔

خالقِ کائنات تزکیۂ نفس کو نبوت کے فرائضِ چہارگانہ میں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیٰتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ۔ (آل عمران : ۱۶۴)

بلا شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر احسان کیا کہ انہی میں سے رسول مبعوث فرمایا جو انھیں اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں۔ ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں اور انھیں کتاب وحکمت سکھلاتے ہیں۔

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

أَلا وان فی الجسد مضغۃً إِذا صلحت صلح الجسد کُلُّہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب[۱]

بلا شک جسم انسانی میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب وہ درست ہو جاتا ہے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جاتا ہے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ اور بلا شبہ یہ انسان کا دل ہے۔

ایمان کی حقیقت بیان کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان رجلا سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما الایمان ؟ قال اذا سرّتک حسنتک وساءتک سیئتک، فانت مومن" قال : یا رسول اللہ فما الاثم؟ قال اذا حاک

---

[۱] امام محمد بن اسمٰعیل البخاری، صحیح البخاری (مصر ۱۳۴۵ھ)، کتاب الایمان، ج ۱، ص ۲۰

فی نفسك شیٔ فدعه [۵۲]

ایک شخص آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایمان کی حقیقت کے بارے میں سوال پوچھا۔ سرورِ دو عالمؐ نے جواب دیا کہ جب تمھیں نیک کام کرتے ہوئے مسرت حاصل ہو اور برائی سے نفرت ہو تو تم مومن ہو۔ سائل نے گناہ کی حقیقت کے بارے میں پوچھا تو آپ نے جواب دیا کہ جو شئے تمھارے دل میں کھٹکے اسے چھوڑ دو۔

قرآنِ حکیم نے نفسِ انسانی کی تین حالتوں کا بیان کیا ہے۔ (۱) نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ اور نفسِ مطمئنہ کے حصول کی تلقین کی ہے:

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیۃً مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ٥ (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)

اے اطمینان پائے ہوئے نفس تو پوری رضا سے اپنے اللہ کی طرف متوجہ ہو جا اور میرے بندوں اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

اسی سلسلے میں سید علی ہجویریؒ ارشاد فرماتے ہیں:

وکلید درِ بہشت بجز منع نفس از اغراض وے نیست چنانچہ خداوند تعالیٰ گفت ونہی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی۔ واغراضِ نفسانی اندر امور آن بود کہ بندہ اندر کاری کہ می کند بجز خوشنودی خداوند تعالیٰ باشد و نجات نفس از عقوبت طلب نکند [۵۳]

درحقیقت نفسانی اغراض کو ختم کر دینا ہی بہشت کے دروازے کی چابی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جس نے اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے روکا ضرور جنت اس کی جائے رہائش ہوگی ۔ نفسانی خواہشات کی کارفرمائی یہ ہے کہ نہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا مدِ نظر ہو، اور نہ اپنے نفس کو عذاب سے بچانے کی خواہش ہو۔

پس مخالفت نفس سرِ ہمہ عبادتہا است و کمال ہمہ مجاہدتہا و بندہ جز بداں بحق راہ نیابد از آنچہ موافقت وی ہلاک بندہ است و مخالفت وی نجات بندہ و خداوند تعالیٰ امر کرد بخلاف کردن آن و مدح کرد مرآن کسان را کہ بخلاف نفس کوشیدند و ذم کرد مرآنان را کہ بر موافقت نفس رفتند چنانکہ گفت

---

۵۲ امام احمد بن حنبل، مسند بحوالہ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح (دمشق ۱۹۶۱)، ج ۱، ص ۲۰

۵۳ سید علی ہجویری۔ کشف المحجوب (لاہور ۱۹۶۷)، ص ۳

خدائے عزوجل و نہی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی ۔ و نیز گفت افکلما جاءکم رسول بما لا تھوی انفسکم استکبرتم ۔ و از یوسف صدیق علیہ السلام ما را خبر داد کہ گفت ۔ وما ابری نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی ـــ و پیغمبر گفت صلی اللہ علیہ وسلم اذا اراد اللہ بعبد خیراً بصرہ بعیوب نفسہ[۵۴]

نفس کے خلاف چلنا سب عادتوں سے بالاتر ہے اور سب مجاہدوں کا نقطۂ کمال ہے ۔ مخالفتِ نفس کے بغیر راہِ حق دستیاب نہیں ہوتی، نفس کی موافقت باعثِ ہلاکت اور اس کی مخالفت وجہِ نجات ہے ۔ باری تعالیٰ نے مخالفتِ نفس کا حکم دیا ہے ۔ نفس کے خلاف چلنے والوں کی تعریف اور موافقت کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے جس نے نفسانی خواہش کو رد کیا اس کے لیے بہشت جائے آرام ہے اور جب تمھارے پاس کوئی رسول آیا اور اس نے تمھاری خواہش پر صاد نہ کیا اور تم اس کے خلاف متکبرانہ روش پر اتر آئے ۔ حضرت یوسف صدیق علیہ السلام نے فرمایا میں اپنے نفس کو بری الذمہ نہیں سمجھتا کیونکہ نفس برائی پر آمادہ کرتا ہے، جب تک میرے رب کا رحم شامل حال نہ ہو، پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ۔ جب باری تعالیٰ کو کسی بندے کی بہبودی منظور ہوتی ہے، تو وہ اس کو نفس کے عیوب سے آگاہ کر دیتا ہے ۔

حضرت علی ہجویری نے مجاہدہ نفس کی بہت فضیلت بیان کی ہے ۔ "کشف المحجوب" میں الگ عنوان کے تحت اسے بیان کیا، جس میں قرآنی آیات، احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم درج کی ہیں، نیز مشہور صوفیا اور علما کی آرا بیان کی ہیں اور خود اپنی تحقیق بھی پیش کی ہے[۵۵]

حضرت ہجویری کے عظیم ہم عصر امام غزالی نے (۴۵۰ تا ۵۰۵ھ) جو تصوف کی افادیت کے حد درجہ قائل ہیں، تہذیبِ نفس کو ہی تہذیبِ اخلاق کا نام دیا ہے اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل وہ شئی ہے جس کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے ۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق[۵۶]

بے شک میں اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں ۔

---

[۵۴] سید علی ہجویری، کشف المحجوب (لاہور ۱۹۶۷) ، ص ۲۰۸

[۵۵] ملاحظہ کیجیے، "کشف المحجوب" صفحات ۲۱۳ تا ۲۲۰

[۵۶] امام مالک، الموطا، (مصر ۱۹۵۱ء) ۔ ج ۲، ص ۹۰۴

امام غزالی اپنی مشہور تصنیف "احیاء علوم الدین" میں اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فالخلق عبارة عن هيئة فی النفس راسخة عنها تصدر الافعال بسهولة ويسر من غير حاجة الی فکر وروية فان کانت الهيئة بحيث تصدر عنها الافعال الجميلة المحمودة عقلاً و شرعاً سميت تلک الهيئة خلقاً حسناً و ان کان الصادر عنها الافعال القبيحة سميت الهيئة التی هی المصدر خلقا سيئاً ۵۷

خلق نفسِ انسانی کی اس ہیئت کا نام ہے جس سے افعال بلا تکلف صادر ہوں، اگر یہ افعال عقلاً و شرعاً پسندیدہ ہوں تو اس کی کیفیت کو خلق حسن کہا جائے گا، اور اگر یہ افعال ناپسندیدہ ہوں تو ایسی حالت کو خلق بد کہا جائے گا۔

علامہ اقبال اپنے "لیکچر خودی" میں متکلمین سے شکوہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ فی انفسکم افلا تبصرون (کہ تم اپنے نفوس میں غور کیوں نہیں کرتے) قرآنی تعلیم کے باوجود انھوں نے نفس انسانی کی حقیقت کو سمجھنے میں غور و فکر نہیں کیا، نفس انسانی میں غوطہ زنی صوفیہ نے کی ہے ۵۸

اس ساری بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نفس کی پہچان، اس کی حقیقت و ماہیت کو جاننا اور اس کا تزکیہ و اصلاح بڑے اہم اور بنیادی امور ہیں۔ نفسِ انسانی کی پاکیزگی اور تہذیب ہی وہ شے ہے جو انسانی زندگی کو حقیقی حسن، نکھار، نفاست، نظم اور وقار عطا کرتی ہے، جب تک انسان کا ضمیر اور نفس پاکیزہ نہیں ہوگا، نسلِ انسانی کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور بین الاقوامی معاملات میں پاکیزگی، انصاف اور عمدگی پیدا نہیں ہوگی۔ قرآن وسنت اور اہلِ تصوف نے تہذیبِ نفس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر بہت زیادہ توجہ اور زور دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تصوف کا نچوڑ اور عطر ہی تہذیبِ نفس ہے، تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

حضرت علی ہجویری نے "کشف المحجوب" میں تصوف کی حقیقت و ماہیت پر بڑی طویل گفتگو کی ہے اور اس سلسلے میں اکابر صوفیائے کرام کے اقوال بھی نقل کیے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ چند اقتباسات

---

۵۷ امام غزالی، احیاء علوم الدین (مصر ۱۹۳۹ء)، ج ۳، ص ۵۲۔

۵۸ C.F. Allama Muhammad Iqbal The Reconstruction of Religion in Islam (Lahore, 1965), PP 95-96

کا اُردو ترجمہ ملاحظہ ہو :

امام محمد بن علی بن حسین کا قول ہے کہ تصوف نیک خوئی اور خوش اخلاقی ہے، جو زیادہ نیک خُو ہو وہ زیادہ صوفی ہوتا ہے۔ نیک خوئی کی دو صورتیں ہیں؛ خدا کے ساتھ اور بندوں کے ساتھ۔ خدا کے ساتھ نیک خوئی اس کے احکام کی پابندی ہے، بندوں کے ساتھ نیک خوئی یہ ہے کہ صرف خدا کے لیے اُن سے میل جول برقرار رکھا جائے [۹ه]

حضرت مرتعش کہتے ہیں: تصوف حسنِ خلق ہے۔ یہ تین طرح کا ہے، پہلے یہ کہ احکامِ خداوندی کو بغیر ریا اور نمائش کے پورا کرنا۔ دوسرا انسانوں میں بڑوں کی عزت کرنا اور چھوٹوں پر شفقت کرنا اور اپنے برابر کے لوگوں سے انصاف کرنا اور کسی سے عوض اور معاوضہ کی توقع نہ رکھنا۔ تیسرا یہ کہ ہوا وہوس اور شیطانی رجحانات سے بچنا۔ پس جس کسی نے ان تین امور کو درست کر لیا وہ نیک خصلت لوگوں میں شمار ہو گا [۱۰ه]

ابوعلی قزوینی فرماتے ہیں، تصوف اخلاقِ پسندیدہ کا نام ہے۔ پسندیدہ عمل انسان وہ ہے جو ہر حال میں حق تعالیٰ کی پسند پر گامزن ہو، اسی کو راضی برضائے الٰہی کہتے ہیں [۱۱ه]

ابوالحسن بوشنجہ کہتے ہیں آج تصوف محض نام ہے بغیر حقیقت کے اور دراصل یہ حقیقت تھا بغیر نام کے، صحابہ کرام اور سلف صالحینؒ کے زمانے میں نام نہیں تھا، ایک حقیقت تھی جو سب پر ساری و طاری تھی۔ آج کل صرف نام ہی نام ہے بجز حقیقت [۱۲ه]

تصوف کی انادیت کے بارے میں مشہور صوفیا و مشائخ کے اقوال نقل کرنے کے بعد حضرت علی ہجویریؒ اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

الکنون درین مقدار تحقیق مقالات مشائخ اندرین باب بیاوردم دریاب تصوف تا بر تو اسعدک اللہ طریق این کشادہ گردد و مر منکران دین را بگوئی کہ مراد تاں چیست بانکار تصوف اگر اسم مجرد را انکار کنند باک نیست کہ معانی اندر حق سمیات بیگانہ باشد اگر عین این معانی را انکار کنند انکار کلِّ شریعت

۹ه کشف المحجوب، ص ۳۸

۱۰ه ایضاً، ص ۴۱

۱۱ه ایضاً، ص ۴۲

۱۲ه ایضاً، ص ۴۲

پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم و خصال ستودہ باشد[۱۳۱]

میں نے یہ سب کچھ مشائخ کے اقوال سے تصوف کی تحقیق کے بارے میں بیان کیا تاکہ خدا تجھے سعادت دے اور راہِ طریقت تیرے لیے کھل جائے اور تو منکرینِ طریقت سے پوچھ سکے کہ انکارِ تصوف سے ان کی مراد کیا ہے۔ اگر صرف اسم سے انکار ہے تو خیر اور اگر معنی سے انکار ہے تو اس کا مطلب مکمل شریعتِ پیغامبر علیہ السلام اور تمام اخلاقِ حسنہ سے انکار ہے۔

حضرت علی ہجویری شریعت و طریقت کی ہم آہنگی کے شدت سے قائل تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ احکامِ شریعت کا علم اور ان پر خلوصِ نیت سے عمل لازم و ملزوم ہیں۔ طریقت ان کے نزدیک انسان کے اندر خلوص پیدا کرنے اور اس کی نیت کو درست کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

"کشف المحجوب" میں آپ نے مختلف جگہوں پر شریعت و طریقت کے باہمی رشتے اور شریعت و حقیقت کی ماہیت و افادیت پر گفتگو کی ہے۔ "اثباتِ علم" کے باب میں آپ نے علم کو ظاہری اور باطنی دو قسموں پر تقسیم کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ علمِ ظاہر سے مراد معاملات کا علم ہے اور علمِ باطن سے مقصدیت کا صحیح کرنا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ ان دو میں سے صرف ایک کو حاصل کرے تو وہ قطعی طور پر ناکام رہے گا، کیونکہ ان دونوں کو حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔ اگر علمِ ظاہر حاصل کر لیا اور باطن کی پروا نہ کی تو یہ منافقت ہوگی اور اگر صرف باطن کے درپے ہوا اور علمِ ظاہر سے بے نیاز رہا تو یہ الحاد و زندقہ ٹھہرا۔ باطن کے بغیر صرف ظاہری شریعت نقص ہے اور ظاہری شریعت کے احکام کو سمجھے اور ان پر عمل کیے بغیر صرف باطن پر قناعت ہوا و ہوس ہے[۱۳۲]

شریعت و حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت علی ہجویری لکھتے ہیں:

شریعت سے مراد حالِ ظاہر کی صحت اور حقیقت سے مراد حالِ باطن کی درستی ہے۔ ... شریعت کی اقامت، حفاظتِ حقیقت پر منحصر ہے، اسی طرح حقیقت کی اقامت کا انحصار شریعت پر ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ جسم میں جب تک جان ہے، انسان زندہ ہے، جب جان نکل جائے تو تنِ مردہ ہے اور جان کی حیثیت ہوا سے زیادہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ جسم و جان کی اہمیت باہم ملاپ سے ہے۔ بالکل

---

۱۳۱ حوالہ کے لیے دیکھو "کشف المحجوب"، ص ۴۲ ۱۳۲ ایضاً، ص ۱۳، ۱۵

یہی عالم شریعت و حقیقت کا ہے۔ شریعت بغیر حقیقت ریا اور حقیقت بغیر شریعت منافقت ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبلنا۔ (جو لوگ ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں)۔

"مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت حقیقت۔ شریعت احکامِ ظاہر کی حفاظت ہے بندے کے لیے اور حقیقت بندے کے احوالِ باطن کی حفاظت ہے حق تعالیٰ کی طرف سے شریعت کسبِ انسانی ہے اور حقیقت انعامِ خداوندی[۱۵]

مضمون زیرِ نظر میں حضرت ہجویری کی تعلیمات کے صرف ایک پہلو کی تشریح کی ہے، ورنہ آپ کی کتاب "کشف المحجوب" وہ کتاب ہے جس کے بارے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے یہ ارشاد فرمایا:

"کتب تصوف میں شیخ علی ہجویری کی کتاب "کشف المحجوب" کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ اگر کسی طالبِ صادق کو مرشدِ کامل نہ مل سکے تو اسی کتاب کا مطالعہ کرے اس کی مراد پوری ہو جائے گی۔ میں نے خود اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھا ہے[۱۶]

کشف المحجوب حضرت ہجویری کا وہ عظیم علمی خزانہ ہے جسے فارسی زبان میں تصوف کی سب سے پہلی اور شاہکار تصنیف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ کتاب اصل فارسی زبان میں بھی دستیاب ہے اور دنیا میں اس کے مختلف نسخے موجود ہیں۔

خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی سے منقول نسخہ ۱۹۶۸ء میں لاہور سے چھپا، پروفیسر نکلسن نے ۱۹۶۷ء میں کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اردو زبان میں اس گراں قدر کتاب کے بہت سے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ خواجہ موصوف کے نسخے میں کشف المحجوب کو انتالیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مختلف ابواب کے بعض عنوان یہ ہیں: علم، فقر، تصوف، اختلافِ فقر و غنا، صحابہ کرامؓ، اہل بیت، ائمہ اہلِ بیت، اہلِ صفہ، تابعین، تبع تابعین، متاخرین، تصوف کے مختلف مکاتبِ فکر، کشف حجابات، کشف اول تا یازدہم۔ انہی ابواب میں معرفتِ حق، توحید، ایمان، توبہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، جود و سخا،

---

۱۵ کشف المحجوب، ص ۴۲۲، ۴۲۳

۱۶ محمد عبدالماجد، تصوفِ اسلام (اعظم گڑھ ۱۹۳۰ء)

روزے کی حقیقت، حج، مشاہدہ، آدابِ صحبت، آدابِ طعام، شریعت و طریقت اور سماع کا ذکر ہے۔
حضرت شیخ نے ہر موضوع کو کمال علمی مہارت اور دینی و روحانی بصیرت سے بیان کیا ہے۔
کتاب کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت ہجویری، کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، فقہ، تاریخ اسلامی فلسفہ، منطق اور دیگر بنیادی علوم میں کامل مہارت رکھتے تھے، ہر معاملے کو کتاب و سنت کی کسوٹی پہ پرکھنا آپ کی کتاب میں صاف صاف نظر آتا ہے۔
افسوس ہے، اتنے عظیم آدمی کی تاریخِ پیدائش کا پتا نہ چل سکا، یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ آپ لاہور کب آئے، کتنا عرصہ رہے اور صحیح تاریخ وفات کیا ہے؟ کشف المحجوب کے علاوہ آپ کی وہ کتابیں کہاں ہیں جن کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے۔ پھر نہایت افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ آپ کی صحیح تعلیمات کو بھی عام فہم انداز سے کبھی پیش نہیں کیا گیا۔

سطعات

از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ——— اردو ترجمہ: مولانا سید محمد متین ہاشمی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی برصغیر پاک و ہند کی وہ عظیم شخصیت ہیں جنھیں پورے عالمِ اسلامی میں نہایت قابلِ فخر اور بلند مرتبت ہستی سمجھا جاتا ہے ——— وہ بہترین مصلح، بہت بڑے مصنف، مجتہد عالمِ دین، نامور مفسر، جلیل القدر محدث، بہت بڑے فقیہ، بلند پایہ مفکر اور عظیم صوفی تھے۔ ان کی تصنیفات اہلِ علم کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ ہر دور کے لیے مفید اور قابلِ عمل ہیں۔
شاہ صاحب کی گراں قدر تصنیفات میں "سطعات" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے اردو ترجمے کی اشد ضرورت تھی۔ ملک کے مشہور عالم مولانا سید محمد متین ہاشمی نے اس کو اردو کے قالب میں ڈال دیا ہے ——— فاضل مترجم نے حلِ طلب مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور جامع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے حالات اور ان کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت: -/۱۳ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

خواجہ عبدالحمید یزدانی

مثنوی رومی میں ذکرِ خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

(۲)

عہد حضرت داؤد علیہ السلام سے ایک شخص کی داستان بیان کی گئی ہے جو نہایت عجز و انکسار کے ساتھ بغیر محنت و مشقت کے حلال روزی کی دعا کرتا تھا ---- سرورِ کائنات کی اس حدیثِ مبارکہ کو زینتِ عنوان بنایا ہے "ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء" (اللہ تعالیٰ دعا میں عجز و الحاح کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) ۔ اور اس کی کسی قدر تشریح عنوان ہی میں اس طرح کردی گئی ہے "زیرا کہ دعا کنندہ عین خواستن است از حق تعالیٰ و الحاح خواہندہ را بہست از آنچہ می خواہد آن را از وی"[لہ]

اگرچہ اس داستان میں، جو وقفوں کے ساتھ بیان ہونے کے باعث دور جا کر ختم ہوتی ہے، اس حدیث کا بظاہر کوئی اشارہ نہیں ملتا، تاہم پوری داستان کو اس حدیثِ مبارکہ کی کامل تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ اس داستان کے دوسرے حصے کے آخر میں، جس کا عنوان حدیثِ مذکورہ ہے، نسلی اور حیزی کے حوالے سے مسلمانوں میں فرقہ پرستی کو درخورِ ذم ٹھہرایا گیا ہے۔ داستان کا ملخص یہ ہے کہ حضرت داؤد کے زمانے میں کوئی شخص اللہ کے حضور بڑے عجز و انکسار کے ساتھ مسلسل یہ دعا کرتا ہے کہ مجھے بغیر محنت کے روزی حلال عطا فرما۔ اتفاق سے ایک روز ایک گائے اس کے گھر میں آگھستی ہے، جسے وہ فوراً ذبح کر کے قصاب کے پاس کھال اتروانے کے لیے لے جاتا ہے۔ اسی اثنا میں گائے کا مالک اسے آپکڑتا اور گائے ذبح کرنے کا سبب پوچھتا ہے۔ وہ اسے اپنی مسلسل دعا کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ لیکن مالک اس کی اس دلیل کو غلط بتاتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مدعا علیہ پھر اللہ کے حضور رسوائی سے بچنے کے لیے عاجزانہ دعا کرتا ہے۔ اسے حضرت داؤد کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی بات

لہ کیونکہ دعا کنندہ جو کوئی بھی گراں بہا چیز اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اس (چیز) کی نسبت اس کا اللہ کے حضور الحاح خود اس کے لیے کہیں بہتر ہے۔

سائل مسلسل دعا کا حوالہ دیتا ہے، جسے رد کیا جاتا اور اُسے گائے کی قیمت چکانے کو کہا جاتا ہے۔ مدعا علیہ پھر اسی انداز میں دعا کرتا ہے۔ اسے ایک روز کی مہلت دی جاتی ہے۔ اسی دوران میں حضرت داؤد کو اللہ جل شانہ کی طرف سے سزا و انتقام کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ دوسرے روز حضرت داؤد مدعی سے کہتے ہیں کہ وہ مدعا علیہ کو معاف کر دے، وہ اس فیصلے کو ظلم قرار دیتا ہے، جس پر حضرت داؤد اسے اپنا سارا مال و متاع دعا کنندہ کو دے دینے کو کہتے ہیں۔ یہ فیصلہ مدعی اور حاضرین کی تنقید کا سبب بنتا ہے۔ آخر حضرت داؤد راز سے پردہ اٹھاتے اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ مدعی، مدعا علیہ کے باپ کا غلام تھا۔ مدعا علیہ ابھی بچہ تھا، جب مدعی نے اس کے باپ کو قتل کر دیا، اس کی لاش فلاں درخت کے نیچے چھپا دی اور سارا مال ہتھیا لیا۔ اللہ نے اپنے حلم کے سبب اس کا یہ گناہ چھپا رکھا تھا، لیکن اب اس نے اپنی ناشکری کے باعث — کہ اس نے آقا کے بچوں کی خبر گیری نہ کی، بے نواؤں کو کبھی کھانا نہ کھلایا اور اب اپنے آقا کے لڑکے کو ایک گائے کی خاطر بُری طرح مارا پیٹا — خود ہی اس گناہ سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔ بعد میں مذکورہ درخت کے نیچے مدفون وہ لاش نکالی جاتی ہے اور قاتل یعنی مدعی اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جاتا ہے۔

داستان کے دوسرے حصے سے جو مذکورہ حدیث کے عنوان سے مزین ہے، چند شعر فرقہ بندی کی مذمت میں ملاحظہ ہوں:

آدمی منکر ز تسبیح جماد   وآن جماد اندر عبادت اوستاد
بلکہ ہفتاد و دو ملت ہر یکی   بی خبر از یکدگر اندر شکی
چون دو ناطق را ز حال ہمدگر   نیست آگہ، چون بود دیوار و در
چون من از تسبیح ناطق غافلم   چون بداند سبحہ صامت دلم
ہست سُنی را یکی تسبیح خاص   ہست جبری را ضدِ آن در مناص
سُنی از تسبیح جبری بیخبر   جبری از تسبیح سُنی بی اثر
این ہمی گوید کہ آن ضالست و گم   بے خبر از حالِ او وز امرِ قم
وآن ہمی گوید کہ این را چہ خبر   جنگشان افگند یزدان از قدر
گوہرِ ہر یک ہویدا می کند   جنس از ناجنس پیدا میکند

قہر را از لطف داند ہر کسی   خواہ نادان خواہ دانا یا خسی[۵۵]

معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ اصلِ فطرت میں عقولِ انسانی برابر و یکساں ہیں، اور اگر ان میں کوئی فرق آتا ہے تو وہ تحصیلِ علم کے سبب ہے۔ مولانا اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانوں کی عقلوں میں فطری طور پر ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ حسینوں کی صورتوں میں۔ اس ضمن میں انھوں نے حضور اکرمؐ کی اس حدیث "جمال الرجل فصاحۃ لسانہ" (انسان کا حسن اس کی فصاحتِ زبان میں پوشیدہ ہے) کا ذکر کیا اور مزید وضاحت کے لیے ایک استاد اور اس کے شاگردوں کی تمثیل پیش کی ہے کہ کس طرح جابر استاد سے نجات پانے کے لیے ایک زیرک بچے کی تجویز پر چند بچوں نے باری باری استاد سے کہا کہ آپ کا رنگ زرد کیوں ہے، اور اس طرح اسے وہم میں ڈال دیا کہ وہ بیمار ہو گیا ہے، اسے آرام کرنا چاہیے۔ مولانا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر عقولِ انسانی مساوی ہوتیں اور حصولِ تعلیم سے ان میں کوئی فرق پڑتا تو وہ بچہ جس کا کوئی تجربہ نہ تھا اور جو علم سے بھی بہرہ ور نہ تھا، کبھی ایسی چال نہ سوچ سکتا جو مردانِ کار کی عقل سے بھی بڑھ کر تھی، اور جس سے ایک "پیرِ باصد تجربہ" بھی بالکل بے خبر اور عاجز رہا۔ لہٰذا جہد و فکر کے نتیجے میں حاصل شدہ عقل کی نسبت فطرت کی طرف سے ودیعت کردہ عقل بہتر اور افزوں ہے۔ اول الذکر عقل کو مولانا لنگڑی بتاتے ہیں، جس کے لیے راستہ چلنا دشوار ہوتا ہے۔

رای آن کودک بچربید از ہمہ   عقل او در پیش میرفت از رمہ
آن تفاوت ہست در عقل بشر   کہ میان شاہدان اندر صور
زین قبل فرمود احمدؐ در قال   در زبان پنہان بود حسن رجال
اختلاف عقلہا در اصل بود   بہر وفاقِ سُنّیان باید شنود
برخلاف قول اہلِ اعتزال   کہ عقول از اصل دارند اعتدال
تجربہ و تعلیم بیش و کم کند   تا یکی را از یکی اعلم کند
باطلست این زانکہ رای کودکی   کہ ندارد تجربہ در مسلکی
بگذرد زاندیشۂ مردانِ کار   عاجز آید کارشان در اضطرار

---

[۵۵] کتاب مثنوی، ص ۲۳۹

بر دمید اندیشۂ زآن طفلِ خُرد — پیر با صد تجربہ بوئی نبُرد
خود فزون آن بہ کہ آن اَز فطرتست — تا زِ افزونی کہ جہد و فکرت است
تو بگو دادۂ خدا بہتر بود — یا کہ لنگی راہوانہ رَوَد [۴۳]

استاد اور شاگردوں کی اسی داستان کے تیسرے حصے میں مولانا نے سید البشر کی اس حدیث سے استفادہ کیا ہے کہ اگر مرض کو خود پر طاری کر لوگے تو واقعی بیمار پڑ جاؤ گے [۴۴]

جب لڑکوں نے استاد کو اس وہم میں ڈال دیا کہ اس کا رنگ زرد ہے اور وہ بیمار ہے تو وہ ہائے مر گیا وائے مر گیا کرتا گھر پہنچا۔ بیوی نے خلافِ معمول جلد آنے کا سبب پوچھا۔ وہ جھنجھلا کر بولا، اندھی ہو؟ لوگوں کو میری بیماری نظر آرہی ہے اور تمھیں پتا ہی نہیں چل رہا۔ بیوی نے اُسے وہم قرار دیا۔ اُستاد کو غصہ آگیا اور اول فول بکتے ہوئے کہنے لگا: اے دشمنِ جاں فوراً میرا بستر بچھادے۔ بیوی بڑی پریشان ہوئی، دل میں کہنے لگی اگر صحیح بات کہتی ہوں تو یہ مجھے تہمت تراش سمجھے گا اور اگر خاموش رہتی ہوں تو یہ معاملہ خطرناک صورت اختیار کرلے گا، اس لیے کہ جس انسان کو کوئی بھی مرض و غم نہ ہو، محض فالِ بد کی بنا پر وہ بھی خود کو مریض سمجھنے لگتا ہے۔ یہاں مولانا فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ حدیث لائے ہیں۔ اس کے بعد اس عورت کی ذہنی کشمکش کا بیان ہے کہ اگر میں اُسے یہ حدیث بتاتی ہوں تو خدا جانے وہ میرے بارے میں کیا خیال کرے، مجھے بُرا بھلا کہے اور میرے اس عمل کو میرے سوءِ قصد یعنی خواہشِ تخلیہ پر محمول کر کے مجھے گھر سے نکال باہر کرے۔ آخر اسی گو مگو کی حالت میں اس عورت نے بستر بچھادیا اور حضرتِ استاد اس پر دھڑام سے گر کر زور زور سے ہائے وائے کرنے لگے ؛

زن توقف کرد مردش بانگ زد — "کای عدو زُود تر، ترا این می سزد؟"
جامہ خواب آورد وگسترد آن عجوز — گفت امکان نی و باطن پُر زسوز
گر بگویم مُتّہم دارد مرا — ور نگویم جد شود این ماجرا
فالِ بد، رنجور گرداند ہمی — آدمی را کہ نبود ستش غمی
قولِ پیغمبرؐ قبولہ یفرضُ — اِن تمارضتم لدَینا تمرضوا

---

[۴۳] کتاب مثنوی، ص ۲۴۰ [۴۴] اِن تمارضتم لدَینا تمرضوا

گر بگویم او خیالی برزند | فعل دارد زن که خلوت می کند
مر مرا از خانه بیرون میکند | بہر فسقی فعل و افسون میکند
جامہ خواب افکند و استاد اوفتاد | آہ آہ و نالہ از وی می بزاد[۵۵]

ایک امیرزادے کی داستان میں، جو کسی نابکار کے عشق میں مبتلا ہو کر کنگال ہو چکا ہے اور گدڑی پہن کر بازاروں میں گھومتا پھرتا اور خاص و عام سے دعا کرنے کو کہتا ہے تاکہ اس بدبختی سے اُسے نجات حاصل ہو، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سعادت اثر احمدؐ کے لقب سے آیا ہے۔ اس حصے میں مولانا نے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ قضا کا پھندا ظاہری طور پر نظر نہیں آتا، البتہ اثر کے لحاظ سے وہ آشکار و ظاہر ہوتا ہے، اور اس پوشیدہ بندِ تقدیر و قضا کو جو زندان اور بندِ آہن سے بھی بدتر ہے، صرف اللہ والے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا بندِ آہن وغیرہ سے سخت تر و بدتر ہونا اس لحاظ سے ہے کہ نقب زن زندان کی دیوار میں سوراخ کر کے نکل سکتا ہے اور بیڑیوں کو لوہار کاٹ سکتا ہے، لیکن اُسے (بندِ قضا کو) توڑنے میں بڑے بڑے لوہار بھی عاجز ہیں۔ مولانا نے یہاں اس قول کی کہ اس بندِ قضا و تقدیر کو حضورِ اکرمؐ ہی کی ذات والا صفات دیکھ سکتی ہے، قرآنی حوالے سے تصدیق کی ہے۔

سورہ اللہب میں ابی لہب کے علاوہ اس کی بیوی کا بھی ذکر آیا ہے جو عناد و دشمنی کے باعث حضورؐ کے راستے میں خاردار لکڑیاں بچھایا کرتی تھی، اور اسی بنا پر اُسے حمالۃ الحطب[۵۶] کہا گیا ہے اور یہ کہ (دوزخ میں پہنچ کر) اس کے گلے میں خوب بٹی ہوئی ایک رسی ہوگی۔ اس عورت کا انجام عبرت ناک ہوا، یعنی ایک روایت کے مطابق لکڑیوں کے گٹھے کی رسی سے گلا گھٹ جانے سے اس کی موت واقع ہوئی[۵۷]۔ مولانا فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی لہب کی بیوی کی گردن میں کھجور کی کھال سے بٹی ہوئی

---

۵۵ کتاب مثنوی، ص ۱۴۲

۵۶ بعض کے نزدیک حمالۃ الحطب کے معنی چغل خور کے بھی ہیں۔ وہ عورت چغل خور بھی تھی۔ (اللہب۔ حاشیہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

۵۷ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد اوّل، ص ۹۰۳

رسی دیکھ لی تھی اور اس کی پشت پر لکڑیوں کا گٹھا دیکھ کر اسے حمالۃ الحطب کہا تھا۔ یہ رسی اور ہیزم صرف حضورؐ ہی کی ذاتِ اقدس دیکھ سکتی تھی۔ یہ معاملہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہ تو صرف تاویلوں سے کام لیتے ہیں، حالانکہ بندِ قضا میں جکڑا ہوا انسان عالمِ ناتوانی و پریشانی میں، اس بند سے رہائی کے لیے ایک ایک سے دعا کرنے کو کہتا پھرتا ہے۔ اس کے بعد مولانا کہتے ہیں کہ وہ ذاتِ ستودہ صفاتؐ جو ان علامات کو واشگاف اور کھلے طور پر جانتی ہے، بھلا یہ کیونکر نہ جان سکے گی کہ بدبخت کون ہے اور خوش بخت کون ہے؟ وہ ذاتِ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ جانتی ہے۔

اس حصے کے شروع میں مولانا نے امیرزادے کی دعا طلبی کا ذکر کرتے ہوئے بندِ قضا کی پنہانی کی بڑے پیارے اور اچھوتے انداز میں تصویرکشی کی ہے۔ فرماتے ہیں ہاتھ بھی کھلے ہیں، پاؤں بھی کھلے ہیں جن میں کوئی بیڑی نہیں، نہ کوئی سر پہ نگران و محافظ ہے اور نہ کوئی لوہے کی زنجیر، پھر میاں تو کس پھندے سے نجات کا طالب اور کس قید سے رہائی کا خواہاں ہے:

این دعا میخواهد او از خاص و عام — کالخلاص و الخلاص و الخلاص
دست باز و پای باز و بند نی — نی موکل بر سرش نی آهنی
از کدامین بند می‌جویی خلاص — وز کدامین قید میخواهی مناص
بند تقدیر و قضای مختفی — کان نبیند آن بجز جان صفی
گرچه پیدا نیست آن در مکمن است — بتر از زندان و بند آهن است
زانکه آهنگر مر آن را بشکند — حفره‌گر هم خشت زندان برکند
وین عجب این بند پنهان گران — عاجز از تکسیرش آهنگران
دیدن آن بند احمد را رسد — بر گلوی بسته حبل من مسد
دید بر پشت عیال بولهب — تنگ هیزم گفت حمالة الحطب
حبل و هیزم را احمد دید و بس — که پدید آید بر او هر ناپدید
باقیانش حمل تاویلی کنند — کین ز بیهوشیست و ایشان هوشمند
لیک از تاثیر آن پشتش دوتو — گشته و نالان شده او پیش تو
که دعای همتی تا وا رهم — تا ازین بند نهان بیرون جهم

آنکہ داند این علامتہا پدید　　چون نداند اُو شقی را از سعید
داند و پوشید ز امر ذو الجلال　　کہ نداند کشفِ رازِ حق، حلال[۵۸]

"سبب جرأت ساحران فرعون بقطع دست و پای خود" کے عنوان کے تحت ایک جگہ خواب اور حقیقت پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں دنیوی زندگی کو سونے والے کے خواب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مولانا پہلے حضرت موسیٰ اور ساحرانِ فرعون سے متعلق وہ قرآنی قصہ مختصراً پیش کرتے ہیں جس کے متعلق دربارِ فرعون میں حضرت موسیٰ کے معجزے سے متاثر ہو کر ساحر، خدائے واحد کے حضور سربسجود ہو گئے اور فرعون کی جان سے مار دینے کی دھمکی سے ڈرے بغیر انھوں نے خود کو اب صحیح راہ پر جانا[۵۹]۔ مولانا فرماتے ہیں کہ فرعون کو اس کی خبر نہ تھی کہ انھوں نے اپنی حقیقت کو جان لیا ہے، اور اصل حقیقت (صحیح زندگی بعد از موت) سے آگاہ ہونے کے بعد وہ وہم و ظن (جسمانی موت) سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد مولانا "ظن" اور "خواب" کی طرف رجوع کر کے دنیوی زندگی کو خواب قرار دیتے اور ظن سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے مختلف امثال سے اس نکتے کو واضح کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص خواب میں اپنا سر کٹتا دیکھے تو اس سے کیا فرق پڑے گا کہ سر تو اسی طرح اپنی جگہ قائم رہے گا، البتہ تعبیر کے لحاظ سے یہ درازیٔ عمر کی علامت ہے۔ یا اگر کوئی شخص خواب میں خود کو دو ٹکڑے ہوتا دیکھے تو بیدار ہونے پر وہ ویسا ہی صحیح و سالم ہوگا جیسا وہ سویا تھا۔ گویا خواب میں جسم کے سیکڑوں ٹکڑے ہو جانے پر بھی جسم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ چنانچہ بظاہر زندہ و بیدار نظر آنے والی اس دنیا کو حضورِ اکرم نے سونے والے کے خواب سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا عام لوگوں کی اس حقیقت سے بے خبری اور سالکانِ راہِ حق کی باخبری کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ تم لوگ دن کے وقت بھی نیند ہی کے عالم میں ہو، لیکن اس حقیقت کو صرف دن کی روشنی کی بنا پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو، حالانکہ یہ روشنی تو محض عکس یعنی جزو ہے، مہتاب یعنی حقیقتِ ابدی کا۔ اس لحاظ سے تمھارا خوابِ بیداری اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ وہ فلاں فلاں کام کر کے

---

[۵۸] کتاب مثنوی، ص ۴۴۲ — مثنوی، ص ۳/۴۳

[۵۹] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ الاعراف، آیات ۱۰۴ - ۱۲۶

سوگیا ہے ف۱۰ گویا بقول غالب :

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

این جہان خواب است اندر ظن مایست	گر رود در خواب دستی باک نیست
گر بخواب اندر سرت ببرید گاز	ہم سرت بر جاست ہم عمرت دراز
گر ببینی خواب در خود را دو نیم	تندرستی چون بخیزی نی سقیم
حاصل اندر خواب نقصان بدن	نیست باکی از دو صد پارہ شدن
این جہان را کہ بصورت قائم است	گفت پیغمبر کہ حلم نائم است
از رہ تقلید تو کردی قبول	سالکان این دیدہ پیدا بی رسول
روز در خوابی مگو کاین خواب نیست	سایہ فرع است اصل جز مہتاب نیست
خواب بیداریست آن دان ای عضد	کہ ببیند خفتہ کو در خواب شد
او گمان بردہ کہ این دم خفتہ ام	بی خبر زان کوست در خواب دوم ف۱۱

ایک ولی اللہ کی داستان میں جس نے اپنے بیٹوں کی وفات پر آہ و زاری نہ کی، سرورِ کائنات صلی اللہ

ف۱۰ مزید وضاحت کے لیے تشبیہات رومی سے چند سطور ملاحظہ ہوں، " خواب اور حقیقت کا فرق باہمی مقابلے سے ہی ہوتا ہے۔ جب تک انسان خواب دیکھ رہا ہے اس کے حقیقی ہونے میں اس کو کوئی شک نہیں ہوتا لیکن بیدار ہونے کے بعد جب ایک منظر پر مقابلتاً استوار دنیا کا عالم ہے عالم خواب کا مقابلہ کرتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ خواب کا عالم محض تخیلی تھا۔ حیات و کائنات میں بھی حقیقت کے کئی مدارج ہیں [illegible] کے مقابلے میں کم حقیقی دکھائی دیتی ہے۔ بعض اوقات ہمارا عالم خواب بھی مُردوں کی بیداری سے زیادہ حقیقی ہوتا ہے۔ [illegible] حیات میں ہر درجہ [illegible] پیچھے چھوڑ آیا ہے مقابلتاً غیر اصلی اور وہمی معلوم ہوگا۔ رسول کریمؐ نے جو اس دنیوی زندگی کو حلم النائم یعنی سونے والے کا خواب کہا تو اس کے یہی معنی ہیں۔ مرنے کے بعد جب اس پر حقائق کا زیادہ انکشاف ہوگا تو وہ اپنی گزشتہ دنیا کی زندگی کو ایک خواب کی طرح بے حقیقت سمجھے گا اور کہے گا کہ کتنی چیزوں کو میں اصلی اور قائم و دائم سمجھتا تھا جنھیں اب [illegible] موجود البصیرت نے [illegible]" (ص ۳۵۶، ۳۵۷)

ف۱۱ کتاب مثنوی، [illegible]

علیہ وسلم کی دو احادیثِ مبارکہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ ایک خدا رسیدہ بزرگ کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے کسی قوم میں نبی کی ہو۔ دوم یہ کہ حضورؐ نے فرمایا میں شفیع عاصیاں ہوں، روزِ قیامت گنہگاروں کو مایوس و آزردہ نہ ہونے دوں گا۔ اس حصے میں ایک جگہ لفظ "شفیع" آگیا ہے جس سے استفادہ کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں کہ فخرِ موجوداتؐ نے فرمایا ہے میں قیامت کے روز گناہ گاروں کو اشک ریز نہ ہونے دوں گا۔ میں دل و جان سے عاصیوں کی شفاعت کرنے والا ہوں تاکہ انھیں شدید عذاب سے نجات دلا دُوں۔ عام گناہ گاروں اور گناہ ہائے کبیرہ کے مرتکبین کو اس عذاب سے رہائی دلاؤں گا جو نقضِ عہد کے سبب ان پر نازل ہوگا۔ جہاں تک میری امت کے صالحین کا تعلق ہے وہ نہ صرف میری شفاعت سے فارغ و بری ہیں بلکہ خود اُن کو شفاعت کرنے کا حق ہوگا کیونکہ ان کی بات کو "حکم نافذ" کی حیثیت حاصل ہوگی:

بود شیخی رہنمائی پیش از این	آسمانی شمع بر روی زمین
چون پیمبر درمیان اُمتان	در گشای روضۂ دار الجنان
گفت پیغمبرؐ کہ شیخ رفتہ پیش	چون نبی باشد میان قوم خویش
گفت پیغمبرؐ کہ روز رستخیز	کی گذارم مجرمان را اشک ریز
من شفیع عاصیان باشم بجان	تا رہا نمشان ز اشکنجہ گران
عاصیان و اہل کبائر را بجہد	وا رہانم از عتاب نقض عہد
صالحانِ اُمتم خود فارغند	از شفاعتہای من روز گزند
بلکہ ایشانرا شفاعتہا بود	گفتشان چون حکم نافذ میرود[۱۲۵]

"قصہ دقوقی و کراماتش" میں ایک جگہ جزو و کل کی بحث کے دوران حضور سرورِ کائنات کا یہ قولِ مبارک پیش کیا گیا ہے کہ میں تمھارے لیے باپ کی طرح شفیق و مہربان ہوں، اس لیے کہ تم سب میرے اجزا ہو، لہٰذا جزو کو کُل سے کیوں الگ کرتے ہو۔ اس کے بعد مولانا نے جزو و کُل کے باہمی ربط وغیرہ سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں، جب کوئی جزو اپنے کُل سے کٹ جائے تو وہ بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس کی مثال جسم کے کسی حصے سے دی جا سکتی ہے کہ اگر اُسے جسم سے کاٹ دیا جائے تو اس کی صورت بے جان

---

۱۲۵ کتاب مثنوی، ص ۲۴۷

اور مُردار شے کی سی ہو جاتی ہے ۔ تو گویا جب تک جزو کو اس کے کُل سے دوبارہ نہ ملایا جائے وہ حرکت اور جان سے دُور ہی رہے گا ۔ پھر مولانا فرماتے ہیں کہ اگر ایسے حصّے یا جُزو میں زندگی کے کچھ آثار پائے بھی جاتے ہوں تو اس کی یہ زندگی اور جان قابلِ تسلیم و استناد نہ ہوگی ، کیونکہ تازہ کٹے ہوئے عضو میں بھی تھوڑی بہت اور وہ بھی وقتی حرکت و زندگی موجود ہوتی ہے ۔ اس دنیوی جزو و کُل سے ، جسے اوّل و آخر فنا ہے ، بحث کرتے ہوئے مولانا حقیقتِ ابدی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ ان کے مطابق جزو و کُل کے اس باہمی ربط کا ، جو ہمیں عالمِ مادی میں نظر آتا ہے ، اطلاق عالمِ روحانی پر نہیں ہوتا ۔ " ارواح کو ذاتِ الٰہی کے اجزا محض تشبیہاً کہہ سکتے ہیں ۔ انسان ایک عضوی وجود ہے ، لیکن حیات و کائنات کے اجزا خدا کے جسم کے اجزا نہیں ، کیونکہ خدا کا کوئی جسم نہیں ۔ انسان کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اس کُل سے وابستہ ہو جا جس کو خدا کہتے ہیں ۔ لیکن ہم اگر مردار اور بے کار ہو کر خدا سے کٹ جائیں تو کیا خدا کی ذات میں کچھ خلل آتا ہے ، ہرگز نہیں ۔ لہٰذا روحِ انسانی اور خدا کا معاملہ مادی جزو و کُل کا سا نہیں ، یہ ایک ناقص سی تشبیہ ہے "[۱۳]

آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں کہ خدا کے متعلق مثالیں ہی بیان کی جا سکتی ہیں ، مگر مثل اور مثال میں فرق ہے ۔ اس کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں کہ یہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شیرِ خدا کہا جاتا ہے تو اس سے وہ مذکورہ درندہ تو نہیں بن جاتے :

گفت پیغمبر شما را ای مہان	چون پدر ہستم شفیق و مہربان
زآن سبب کہ جملہ اجزائے منید	جُزو را از کل چرا بر می کنید
جزو از کل قطع شد بیکار شد	عضو از تن قطع شد مردار شد
تا نپیوندد بکلّ بارِ دگر	مُردہ باشد نبودش از جان خبر
ور بجنبد نیست خود او رانند	عضوِ نو بُبریدہ ہم جنبش کند
جزو ازین کُل گر برد یکسو رود	این نہ آن کُل است کو ناقص شود
قطع و وصل او نیاید در مقال	چیز ناقص گفتہ شد بہر مثال

---

۱۳ تشبیہاتِ رومی ، ص ۳۶۰

مرعلی ابر مثال شیر خواند شیر مثل دنباشد گرچہ راند[۱۲۵]

اسی "دقوقی" کے قصے میں ایک جگہ حضور سید البشر کی ایک حدیث مبارک کا ترجمہ پیش کیا گیا اور حضور کو مصطفیٰ، قطب، شہنشاہ اور دریائے صفا کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔

اس حصے میں مولانا نے ایک کشتی کے غرق ہوتے وقت اہل کشتی کی داد و فریاد اور عبادت کی رقت انگیز تصویر کشی کی ہے، کہ کس طرح زاہد و فاسق اور کافر و مومن سب دینی و دنیوی جھگڑے بھول کر اس خالق و مالک کے حضور پورے عجز و خلوص کے ساتھ سربسجود اور گڑگڑا کر نجات کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایسے مواقع پر جب انسان کی تمام کوشش و چارہ جوئی بے کار اور رائیگاں جاتی ہے تو اسے خدا یاد آتا ہے اور وہ مائل بہ دعا ہوتا ہے۔ لیکن جب اسے اس مصیبت سے نجات مل جاتی ہے تو وہ اللہ کے حضور اپنی وہ ساری گریہ زاری اور خلوص نیت اور اس کے جواب میں اللہ کا احسان و کرم بھول جاتا اور حسب سابق حرص و آز کے دلدل میں تیز تر گرنے لگتا ہے۔ مولانا کے مطابق انسان کو اس کی اس حرکت پر ہر وقت آگاہ کیا جاتا ہے، لیکن صرف ندائے غیبی کو صرف دنیوی حرص اور جھنجھٹوں سے آزاد بندۂ خاص خدا ہی سن سکتا ہے۔ اس کے بعد مولانا فخر کائنات کو قطب، شاہنشاہ اور دریائے صفا کے القاب سے یاد کرتے ہوئے حضور کے اس قول مبارک کی تصدیق کرتے ہیں کہ جو کچھ جاہل آخر میں دیکھتا ہے عاقل اسے آغاز ہی سے دیکھ لیتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ حوادث اور موہبات غیب کی طرف سے ازل ہی میں موجود ہوتے ہیں جنھیں عاقل شروع ہی میں دیکھ لیتا ہے۔ لیکن نافرمان اور اپنے کفر پر اڑنے والا آخر میں دیکھتا ہے۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہوگی کہ حوادث و تقدیرات غیب کی طرف سے ازل ہی سے متعین کر دی گئی ہیں، جیسا کہ سورۃ الحدید میں ایک جگہ آیا ہے: "کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمھاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہے، قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں..." تو انھیں وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی دیکھ لینا انسان کی معراج ہے۔ ورنہ ان کے ظاہر یا وقوع پذیر ہونے پر تو ہر کس و ناکس دیکھ لیتا ہے۔ سو اگر کوئی انھیں صورت اول ہی میں نہ دیکھ پائے تو یہ اس کے لیے سراسر زیان و نقصان کا سبب بنتا ہے جبکہ پیش بینی و دور اندیشی سیلاب حوادث کے لیے سد راہ بن سکتی ہے۔

---

۱۲۵ کتاب مثنوی، ص ۲۵۱ ــ مثنوی، ۳/۵۰

اس کے بعد مولانا نے حزم پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے بدگمانی اور ہر لحظہ بلائے ناگہانی دیکھنے سے تعبیر کیا ہے :

در دعا ایشان بدند و زاری و آہ   بر فلک زایشان شدہ دود سیاہ

دیو اندر عداوت تیز بین   بانگ زد کای سگ پرستان عین

مرگ و جنگ ای اہل انکار و نفاق   عاقبت خواہد بدن این اتفاق

چشمتان تر باشد از بعد فراق   کہ شوید از بہر شہوت دیو خاص

یارتان باید کہ روزی در خطر   دستتان بگرفت یزدان از قدر

این ہمی آمد ندا از دیو لیک   این سخن را نشنود جز گوش نیک

راست فرمودہ است با ما مصطفی   قطب و شاہنشاہ و دریای صفا

کانچہ جاہل دید خواہد عاقبت   عاقلان بینند ز اول مرتبت

کارہا ز آغاز اگر غیب است و سر   عاقل اول دید و آخر آن مصر

اولش پوشیدہ باشد و آخر آن   عاقل و جاہل ببینند در عیان

گر نبینی واقعہ غیب ای عنود   حزم را سیلاب کی اندر ربود

یک جگہ دکان داری اور کاروبار میں نفع و نقصان کی تمثیل پیش کر کے مولانا نے مقلدین کے ایمان کو خوف و رجا کا مجموعہ بتایا ہے۔ اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "ان اللہ تعالیٰ اولیاء اخفیاء" کے معنی بیان کیے ہیں۔

مولانا کے مطابق دین کے معاملے میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک قسم محققین کی ہے جو تھوڑی تعداد میں ہیں۔ یہ لوگ اپنی تحقیقات اور تجربات و مشاہدات کی بنا پر دینی زندگی کی راہوں پر بے کھٹکا گامزن رہتے ہیں۔ اس راہ میں انھیں نفع ہی نفع محسوس ہوتا ہے، اور وہ خوف و تذبذب سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ مقلدین ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی دین میں اس لیے شامل ہیں کہ اس دین والی جماعت میں پیدا ہوئے اور اس کے بعد دین کی باتیں سن سنا کر کچھ عمل کرنے لگے۔ مولانا موخرالذکر کو مخاطب کر کے انھیں یقین کامل کے ساتھ راہ دین پر چلنے کی تلقین کرتے اور اس تجارت کو دنیاوی تجارت کی نسبت، جس میں نفع بھی ہے اور نقصان کا احتمال بھی، سراسر سودمند بتلاتے ہیں، اور یہ کہ

اس معاملے میں سستی کی بجائے کچھ نہ کچھ کرنا بہتر ہے کہ سستی میں زیادہ خوفِ نقصان ہے۔

پھر مولانا محققین و عارفین (اولیا و انبیا) کے عملِ پیہم اور یقینِ محکم کے نتائج بیان کرتے ہیں کہ کس طرح لوہا ان کے آگے موم، ہوا ان کی محکوم اور عنکبوت ان کی پردہ دار ہوتی ہے۔ مذکورہ حدیث کی تشریح میں ایسے ہی برگزیدگان الٰہی کے متعلق مولانا کہتے ہیں کہ یہ ہستیاں عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں اور دنیا پرستوں کے سامنے کم ہی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان بندگانِ خاص کے پردۂ اخفا میں رہنے کا یہ عالم ہے کہ اتنا کچھ رکھتے ہوئے بھی ایک لمحہ کے لیے عام نگاہ ان کی عفت و بزرگی پر نہیں پڑتی۔ ان کی کرامت ان کا وجود سب گویا چار دیواری میں پنہاں رہتا ہے۔ مولانا یہاں کرامت کی رعایت سے کہتے ہیں کہ اس کائنات کا چپہ چپہ اللہ جلّ جلالہ کے اکرامات و نوازشات کا مظہر ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس طرف بلاتا اور اپنی ان نوازشات سے آگاہ کرتا ہے، لیکن تم شاید اس کا شعور و بصیرت نہیں رکھتے۔

اس کے بعد مولانا کسی بندۂ خاصِ خدا کا دامن تھام لینے کی تحریض کرتے ہیں۔ ان کے بقول اگر ایسی ہستی آگ میں بھی کود جانے کو کہے تو کسی قسم کے خوف کے بغیر فوراً اس پر عمل پیرا ہو جاؤ، کیونکہ اس کے حکم سے آگ، نرگس و نسرین میں بدل جاتی ہے، اور اس میں شعلوں کی بجائے غنچے پھوٹنے لگتے ہیں۔ حقیقت میں جس طرح ظاہر پرست آگ سے خوف زدہ رہتے ہیں، اسی طرح خود آتش ایسی ہستی کے آگے خوف اور ہیبت سے لرزاں رہتی ہے۔ گویا آگ انبیا کے دسترخوان کو پاک کرنے والی شے ہے۔ اس ضمن میں (یعنی دسترخوان کے حوالے سے) مولانا نے حضرت انس بن مالک کے حکم سے دسترخوان کو تنور میں ڈالنے اور اس کے آگ سے محفوظ رہنے کی داستان بیان کی ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے حکم کے تحت ہوتی ہے اور وہ انھیں یا ان کے پیروکاروں کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکتی۔ اس حصے میں بھی حضور اکرم کا ذکر آیا ہے۔

ایک موقع پر حضرت انس نے چند مہمانوں کی دعوت کی۔ دعوت سے فارغ ہونے پر جب انھوں نے دسترخوان کو گندہ پایا تو خادمہ سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے اُسے تنور میں ڈال دو۔ خادمہ نے حکم کی تعمیل کی۔ تھوڑی دیر بعد جب اسے نکالا گیا تو یہ دیکھ کر مہمانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دسترخوان جلنے کی بجائے صاف ستھرا اور اُجلا ہو گیا ہے۔ انھوں نے حضرت انس سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ حضور نبی کریم نے اس دسترخوان سے کئی مرتبہ اپنے دست و دہان مبارک پونچھے ہیں۔ اس پر مولانا

آتش وعذاب سے ڈرنے والوں کو ایسی ہی برگزیدہ ہستی کے دست ولب کا قرب ڈھونڈھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو ذاتِ مبارک جمادات کو ایسی عزت سے نوازتی ہے وہ اپنے عشاق پر کیا کیا نوازشات نہ فرمائے گی۔ جس ہستی نے خاکِ کعبہ کو قبلہ بنا دیا، اس کی خاکِ پا بننے ہی میں ہر طرح کی نجات ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کے اشعار نہایت عمدہ ہیں[۵۱]

اس حصے کے بعد سرورِ کائنات کے دو ایک معجزوں کا ذکر کرتے ہوئے حضور کو کئی جگہ مختلف القاب — مغیثِ دوعالم، سرور، نورِ جاں، شفیعِ مجرماں، عزیز، مہترؐ، بہترؐ، ماہرو، قند خو، خیر البشر، خیر الوریٰ، مصطفیٰ اور بحر خو — سے یاد کیا گیا ہے۔ جس انداز میں یہ القاب استعمال کیے گئے ہیں وہ مولانا کے فخرِ انبیا کے ساتھ انتہائی عشق اور والہانہ عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ اس حصے میں ایسے لوگوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے جو اپنی جہالت و نادانی کی بنا پر "مسبّب" کی بجائے صرف "سبب" پر نظر رکھتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

۵۱۔ ملاحظہ ہو: کتاب مثنوی، ص ۲۸۰ — مثنوی، ص ۳۰۷

برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علمِ فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں کتبِ فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریقِ حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے، پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، ان کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں، اور جن کو مسائلِ فقہ کے اصل مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات ۴۰۴ ۔ قیمت ۱۵/- روپے ۔ ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن معاذ بن جبل قال بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الیمن فلما سرت ارسل فی اثری فرددت فقال اتدری لم بعثت الیک ؟ قال لا تصیبن شیئا بغیر اذنی ، فانہ غلول ومن یغلل یات بما غل یوم القیامۃ ، لھذا دعوتک فامض لعملک ۔

(جامع ترمذی ۔ ابواب الاحکام ۔ باب ماجاء فی ہدایا الامراء)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ، وہ کہتے ہیں ، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا (امیر بناکر) بھیجا ، جب میں آپ کے ہاں سے رخصت ہوا تو میرے پیچھے ایک آدمی بھیجا اور مجھے واپس بلا لیا ۔ فرمایا تمھیں معلوم ہے ، تمھارے پیچھے آدمی کیوں بھیجا ؟ فرمایا ، (دیکھو) میری اجازت کے بغیر کوئی چیز نہ لو (یاد رکھو) وہ خیانت ہے اور جو خیانت کرتا ہے وہ قیامت کے روز خیانت کی ہوئی چیز لے کر (اللہ کے دربار میں) حاضر ہوگا ۔ میں نے تم کو یہی بات کہنے کے لیے بلایا تھا ، جاؤ ، اپنے کام میں مصروف ہو جاؤ ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی اگرچہ بہت مختصر اور چند الفاظ پر مشتمل ہے ، لیکن نہایت اہم ہے ۔ یہ ارشاد حضور نے اس وقت فرمایا جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو آپ یمن کا امیر بناکر بھیج رہے تھے ۔ یہ حکم اگرچہ ایک شخص کو دیا گیا ہے ، لیکن اس کا اطلاق تمام امرا اور اپنے اپنے محکمے کے ذمہ دار افراد پر ہوتا ہے ۔ اس میں ہر امیر اور حکمران کو ہر اس چیز کے قبول کرنے سے منع فرمایا ہے ، جو ناجائز طریقے سے لی جائے اور کسی سلسلے میں کی خدمت میں پیش کریں کہ وہ ان کا امیر ، حاکم یا ان کے علاقے کے ذمہ دار ہیں ۔ مثلاً از راہ عقیدت کوئی تحفہ دیں ، سواری کے لیے گھوڑا ، اونٹ ، موٹر وغیرہ پیش کریں ، ان کے بچوں کو کپڑے یا مٹھائی اور پھل وغیرہ دیں ۔ یا عام لوگوں کی نسبت تاجر لوگ ان کو سستی چیزیں مہیا کریں ، یا اس کو سکونت کے لیے مفت مکان دیں ۔ یا کوئی اور ایسی سہولت مہیا کریں جو عام حالات میں ممکن نہ ہو ، یہ سب خیانت اور رشوت میں داخل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو ایک

حکم جاری کر کے تمام امرائے مملکت اور عمالِ حکومت کو اس سے روک دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی حرکتوں کو "غلول" یعنی خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ جو شخص ایسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کو بغیر اس منصب پر متمکن ہونے کے حاصل نہ ہو سکتی، وہ مسلمانوں کے مال میں خیانت کرتا ہے اور قیامت کو لازماً اس کی سزا پائے گا۔

حضور نے خاص طور پر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بلا کر اس سے روکا اور تاکید فرمائی کہ جن چیزوں کا حصول شریعت کے خلاف ہے، اس سے بہر صورت اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ اس عمل کو معمولی سمجھو اور جو جی میں آئے کرتے رہو۔ یاد رکھو، ان تمام چیزوں کو قیامت کے روز لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اُن کے غلط اعمال کی وجہ سے انھیں اس کی سزا دی جائے گی ـــ اس قسم کے غلط امور کا ارتکاب خیانت، بددیانتی اور رشوت کی ذیل میں آتا ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو الواب الاحکام کے "باب ماجاء فی ھدایا الامراء" میں درج کیا ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا تعلق ان تحائف و ہدایا سے ہے جو لوگ امرا و عمال کو پیش کرتے اور پھر انھیں اپنے جائز و ناجائز مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو اس وقت یہ حکم دیا جب آپ انھیں یمن کا امیر مقرر کر کے بھیج رہے تھے ـــ مطلب یہ کہ لوگ حکومت کے اہل کاروں اور حاکموں کو کسی نہ کسی بہانے سے تحائف دینے کی کوشش کرتے ہیں، اس سے بہر حال بچنا چاہیے۔

فی نفسہٖ نہ تحفہ دینے میں کوئی قباحت ہے اور نہ اُسے قبول کرنے میں کوئی بُرائی ـ بُرائی اور قباحت اس ذہنیت میں ہے جو عام طور پر عمالِ حکومت اور امرائے مملکت کو کوئی چیز پیش کرتے وقت کارفرما ہوتی ہے۔ اور یہ ذہنیت اس دَور کی پیداوار نہیں شروع ہی سے موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو ختم کرنے کے لیے حضرت معاذ کو کوئی چیز قبول نہ کرنے کی تاکید فرمائی۔

نقد و نظر

فتاویٰ علمائے حدیث (جلد ہشتم)

مرتب : مولانا ابوالحسنات علی محمد سعیدی

ملنے کا پتا : مکتبہ سعیدیہ، خانیوال، ضلع ملتان

صفحات ۱۱۲ - کتابت، طباعت، جلد عمدہ - قیمت ۱۵ روپے

مولانا علی محمد سعیدی (مہتمم جامعہ سعیدیہ، خانیوال) مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے "فتاویٰ علمائے حدیث" کے نام سے خاص فقہی انداز کے ساتھ فتاوے کی جمع و ترتیب کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ "المعارف" میں اس سے قبل پانچ جلدوں پر تبصرہ شائع ہوچکا ہے۔ چھٹی اور ساتویں جلدیں ہمیں نہیں پہنچیں، زیر نظر اشاعت میں کتاب کی آٹھویں جلد کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

یہ جلد کتاب الحج پر مشتمل ہے اور اس موضوع کے معلومات افزا مضامین کو اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی، مولانا عبدالحی لکھنوی، نواب صدیق حسن خاں، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد بشیر سہسوانی اور مولانا حافظ عبداللہ روپڑی وغیرہ بہت سے علماء و فقہا کے فتاوے مندرج ہیں۔

سب سے پہلے حج کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے افکار عالیہ درج ہوئے ہیں، اس کے بعد "حج کی تاریخ اور اس کی اہمیت" کے عنوان سے مولانا سید داؤد غزنوی کا سیر حاصل مضمون شامل کیا ہے۔ پھر "تشریحات مناسکِ حج" کے عنوان سے مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کا مضمون ہے۔ پھر "احکامِ حج" کے عنوان سے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون ہے، جو حج کے تمام پہلوؤں کا بہترین اسلوب سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بعدازاں حج کے بارے میں مختلف سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔ مثلاً کیا حج کا روپیہ کسی دوسرے مصرف میں آسکتا ہے؟ حج کی رقم فی سبیل اللہ،

مالِ زکوٰۃ سے حج، حج سے پہلے مدینہ منورہ کی زیارت، حج سے پہلے مرنے والے کے حج کا حکم، قرضِ حسنہ سے حج کرنے کا مسئلہ، باپ نے حج نہیں کیا، بیٹا اس کی زندگی میں حج کر سکتا ہے، حج تمتع، عمرہ کے اوقات، حرام کی کمائی سے حج، باب الاحرام، آبِ زمزم، عید کے دن صفا و مروہ کی سعی، حج بدل، حج بدل کرنے والے کو حج کا ثواب، کمزور اور بوڑھا حج بدل کرا سکتا ہے، حج بدل پر علمی اعتبار سے تبصرہ، عورتوں پر حج، ذی محرم کے سوا حج کو جانا، نابالغ کا حج —— غرض اس کتاب میں حج بیت اللہ کے بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور ہر مسئلے کو قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں باحوالہ بیان کیا گیا ہے۔

مولانا علی محمد سعیدی یہ بہت بڑی علمی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اس کے مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دیوانِ یقین

مرتب : ثناء الحق صدیقی

ملنے کا پتا : مہران اکیڈمی، ۸/۷۰ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹

صفحات ۸۰ — قیمت ۳ روپے

انعام اللہ خاں یقین، اردو کے مشہور شاعر تھے۔ وہ ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۶ء) میں عین عالم جوانی میں یعنی چھبیس سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ کہتے ہیں ان کے والد شیخ محمد اظہر نے ان کو قتل کرا دیا تھا۔ قتل کی وجہ کیا تھی؟ اس کے متعلق لوگوں نے کئی قسم کی باتیں کی ہیں۔ کسی نے باپ کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے، کسی نے بیٹے کے دامن کو آلودہ کیا ہے، لیکن صحیح بات کا کسی کو علم نہیں۔ ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ یقین اپنے والد کی ایک کنیز پر عاشق ہو گئے تھے، لہٰذا باپ نے ان کو قتل کرا دیا۔

بہرحال اٹھارھویں صدی عیسوی میں یقین اُردو کے نامور شاعر گزرے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "دیوانِ یقین" میں فاضل مرتب نے شروع میں اُن کے حالات و کوائف تحریر کیے ہیں جو ۲۶ صفحات پر مشتمل ہیں پھر ردیف الف سے ردیف ی تک ان کا کلام درج کیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

یقین سوز و گداز اپنے کو گر اظہار میں کرتا ۔۔۔ خدا شاہد ہے، آتش کا بھی زہرہ آب ہو جاتا

گر مر کر نہ میں اس شوخ کی خاطر نشاں کرتا ۔۔۔ خدا جانے وفا میری کے حق میں کیا کیا گماں کرتا

نہیں معلوم اب کی سال میخانہ پر کیا گزرا ۔۔۔ ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانہ پہ کیا گزرا

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے ـــــ خدا جانے تیری صورت سے بت خانہ پر کیا گزرا
شکوہ جفا کا یار سے کرنا، وفا نہیں ـــــ بندوں کو، اعتراض خدا پر بجا نہیں
زنجیر میں بالوں کی پھنس جانے کو کیا کہیے ـــــ کیا کام کیا دل نے، دیوانہ کو کیا کہیے

یقین کے زمانے میں سلطنتِ مغلیہ مدبہ انحطاط اور مسلمانوں کی سیاسی قوت رو بہ زوال تھی لیکن دہلی میں علم و تحقیق، ادب و شاعری اور علوم و فنون کا بڑا زور تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ بھی زیادہ تر دہلی ہی میں قیام فرما رہتے اور ان کے ہاں علمی مجلسیں اور تصوف کی محفلیں قائم رہتیں۔ یقین بھی ان کے ساتھ خاص تعلق و عقیدت رکھتے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اس طرح گویا یقین کو تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔

اس کتاب سے یقین کے حالات اور ان کے عہد کا پتا بھی چل جاتا ہے اور ان کا کلام بھی قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

قاصمۃ الظہر فی بلند شہر

مولفہ : جناب عبدالغنی صاحب خورجوی

ناشر : انجمن ارشاد المسلمین ـ ۶، بی شاداب کالونی، حمید نظامی روڈ، لاہور

کاغذ، کتابت، طباعت بہترین ـ صفحات ۴۸ ـ قیمت -/۳ روپے

یہ کتاب ایک واقعہ پر مشتمل ہے جو ۱۹۱۱ء میں پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک مقام بلند شہر میں دیوبندی اور بریلوی حضرات کے درمیان بعض مسائل کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا۔ اختلاف نے اتنی شدت اختیار کی کہ ایک فرقے نے دوسرے کی تکفیر شروع کر دی۔ نتیجتاً دیوبندی حضرات اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے درمیان مناظرے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ مگر زیرِ نظر کتاب کے مصنف کے بیان کے مطابق مولانا احمد رضا خاں صاحب مناظرے کے لیے نہیں آئے، جب کہ دیوبندی حضرات موجود تھے۔ اس سلسلے میں دونوں فریقوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی، وہ بھی شائع کی گئی ہے اور اہلِ بلند شہر کا بیان بھی شائع کیا گیا ہے۔

کتاب کے ناشر سے ہم معذرت کے ساتھ عرض کریں گے کہ کتاب کا نام ایسا ہونا چاہیے جسے لوگ پڑھ اور سمجھ سکیں۔ یہ نام جو آپ نے تجویز فرمایا ہے، اوّل تو عام آدمی کے لیے اس کا پڑھنا مشکل ہے، اگر کسی طرح پڑھ لیا جائے تو اس کو سمجھنے کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی - جون ۱۹۷۹

ایک عہد آفریں شخصیت ـــ مولانا سید جعفر علی بستوی	مولانا عتیق احمد بستوی
حالات شیخ نجم الدین کبریٰ	سید محمد فاروق بخاری
شیخ عبدالعزیز جون پوری	محمد ارشد اعظمی
شاہ عبدالحی احقر بنگلوری اور ان کی خدمات	سید قدرت اللہ

برہان، دہلی - جولائی ۱۹۷۹

ایک عہد آفریں شخصیت ـــ مولانا سید جعفر علی بستوی	مولانا عتیق احمد بستوی
شیخ حسام الدین مانک پوری اور ان کی تصنیفات	مولانا نظام الدین احمد کاظمی رام پوری
انڈین ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی کا خطبۂ صدارت	پروفیسر خلیق احمد نظامی / ترجمہ: محمد یٰسین مظہر صدیقی
عورت اسلامی خاندان میں	مولانا سید جلال الدین عمری

البلاغ، بمبئی - جون ۱۹۷۹

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی	مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی
پندرھویں صدی ہجری کا استقبال	جناب تسلیم احمد
زائرینِ حرم	قاضی اطہر مبارک پوری

بیّنات، کراچی - جون، جولائی ۱۹۷۹

اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم۔ خاص اشاعت	مرتبہ، مولانا محمد یوسف لدھیانوی۔

ترجمان الحدیث، لاہور - جولائی ۱۹۷۹

اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلے میں	عبدالرشید عراقی
اموال تجارت اور زکوٰۃ	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

ترجمان الحدیث، لاہور۔ اگست ۱۹۷۹ء

مایوسی، ناامیدی اور دیگر امراضِ نفس کا علاج	ترجمہ: مولانا سیف الرحمٰن
روزہ اور رمضان	اکرام اللہ ساجد کیلانی
رؤیتِ ہلال اور علمِ ہیئت	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

ترجمان القرآن، لاہور۔ جون ۱۹۷۹

علامہ ابنِ قیم	پروفیسر طیب شاہین لودھی
شراب کے مادی مضرات و نتائج	ریاض الحسن نوری

ترجمان القرآن، لاہور۔ جولائی ۱۹۷۹

حضور اکرم۔ سراپا رحمت	سید اسعد گیلانی
شراب اور اقتصادیات	ریاض الحسن نوری
قرآن کی مختصر ترین سورت	محمد رفیق گجراتی

جامعہ، دہلی۔ جون ۱۹۷۹

قدیم اردو کا سرمایۂ الفاظ	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
جدید مشرقی تنقید کا دبستانِ شبلی	ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی
عربی کا دیگر عالمی زبانوں پر عمل اور ردِ عمل	ترجمہ: ڈاکٹر سید محمد اجتبا ندوی
صبر۔ اصلاحِ معاشرہ کا ذریعہ	ڈاکٹر رشید الوحیدی

الحق، اکوڑہ خٹک۔ مئی ۱۹۷۹

پروگریسو یعنی حقیقت پسند کون؟	مولانا سید محمد الحسنی
ڈاکٹر عبدالحلیم محمود۔ زندگی کے مراحل	مولانا محمد ولی رحمانی
اسلامی دستور اور اسلامی حکومت۔ چند بنیادی اصول و فرائض	قاضی مظہر حسین

الحق، اکوڑہ خٹک۔ جون ۱۹۷۹

موجودہ حالات اور قادیانیوں کے خفیہ منصوبے	چوہدری رستم علی
اسلامی سزائیں اور ان کی حکمت	مولانا سید محمد الحسنی

قطع ید کی سزا اور اس کی حکمت	محمد انیس الرحمٰن قاسمی
اسلام میں خلافت کا تصور اور مقامِ خلافتِ راشدہ	اخوندزادہ عبدالقیوم

الحق، اکوڑہ خٹک — جولائی ۱۹۷۹

طٰہٰ حسین بحیثیت ادیب و نقاد	مولانا محمد یوسف خاں
ابوبکر رازی جصاص — سوانح اور افکار	ڈاکٹر سعید اللہ قاضی
مسلمان حکمرانوں کی علم دوستی و علم پروری	مولانا عبداللہ

الرشید، ساہیوال — اگست ۱۹۷۹

مولانا سید مناظر احسن گیلانی	سید محمد اکبر شاہ بخاری
اہل تصوف اور دینی جدوجہد	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سب رس، کراچی — جون، جولائی ۱۹۷۹

ساغر صدیقی مرحوم	مالک رام
مجاز کی شاعری	باقر مہدی
اسلامی ریاست اور اس کا پس منظر	ڈاکٹر خواجہ معین الدین جمیل
بہادر یار جنگ کی قومی خدمات	خواجہ حمید الدین شاہد

فاران، کراچی — جولائی ۱۹۷۹

حضرت شفا بنت عبداللہ	طالب ہاشمی
علامہ اقبال اور سید راس مسعود	سہیل احمد زیدی
خوشحال خاں خٹک — ایک بلند پایہ اور مقبول عام پشتو شاعر	شاہ فرزند شاہ آذر گیلانی

الفرقان، لکھنؤ — جولائی ۱۹۷۹

رسول کریم کے فضل خاص کے تین پہلو	مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے ثمرات و نتائج	مولانا شمس الحق
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے میرا مراسلہ	مولانا محمد عارف سنبھلی

الفرقان، لکھنؤ — اگست ۱۹۷۹

ایک عجیب و غریب تضاد جس کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی	مولانا سید محمد الحسنی مرحوم/ترجمہ مولانا سید عبداللہ الحسنی
کیا برطانیہ کی قسمت میں کچھ لکھا ہے ؟	عتیق الرحمٰن سنبھلی (مقیم لندن)
"تحریک خلافت" میری نظر میں	مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

فکر و نظر، اسلام آباد — جون ۱۹۷۹

انڈونیشی اور ملائی زبانوں میں اسلامی ادب	ڈاکٹر عفان سلجوق
اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق	آیت اللہ روح اللہ خمینی/ترجمہ سید علی رضا نقوی
موافقیتِ حج اور اہلِ پاکستان کے لیے احرام کی میقات	حافظ محمد یونس
ایک عالم اور ایک انسان — علامہ عبدالعزیز میمن	پروفیسر محمد محمود میمن

معارف، اعظم گڑھ — جون ۱۹۷۹

قاضی زادہ رومی مصنف شرح چغمینی۔ احوال و آثار (مسلسل)	مولانا شبیر احمد خاں غوری
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے غیر مطبوعہ فتاوے اور ایک دستاویز	مولوی نور الحسن راشد کاندھلوی
گجرات کے ایک نامور محدث و مورخ	محمد منصور نعمانی ندوی
اقبال کی معنویتِ آج	مرزا سعید الظفر چغتائی
عریش کی بازیابی	عبدالسلام قدوائی ندوی

معارف، اعظم گڑھ — جولائی ۱۹۷۹

قاضی زادہ — احوال و آثار (مسلسل)	مولانا شبیر احمد خاں غوری
امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
گجرات کے ایک نامور محدث و مورخ	محمد منصور نعمانی
آسٹریلیا میں اسلام	سید شہاب الدین دسنوی

ستمبر ۱۹۷۹

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

مجلسِ ادارت

صدر

پروفیسر محمد سعید شیخ

مدیر مسئول

محمد اسحاق بھٹی

ارکان

مولانا محمد حنیف ندوی — محمد اشرف ڈار ، معتمد مجلس

ماہ نامہ المعارف - قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے - بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون : ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۲	ستمبر ۱۹۷۹	شوال ۱۳۹۹	شمارہ ۹

ترتیب

تاثرات

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ تیس سال سے علم و تحقیق کی خدمت میں مصروف ہے اور اب تک اردو اور انگریزی کی کم و بیش ایک سو چالیس کتابیں شائع کر چکا ہے اور یہ کتابیں اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس سال ادارے کی طرف سے پندرہ کتابیں شائع ہوئی ہیں، جن میں نو کتابیں اُردو کی ہیں اور چھ انگریزی کی۔ اُردو کتابوں میں حسب ذیل چار کتابیں نئی ہیں۔

۱۔ مطالعہ حدیث : یہ مولانا محمد حنیف ندوی کی تصنیف ہے۔

۲۔ مولانا رومی — حیات و افکار : یہ ڈاکٹر افضل اقبال کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے، جو جناب بشیر محمود اختر نے کیا ہے۔

۳۔ جمال الدین افغانی — حیات و افکار : یہ جناب شاہد حسین رزاقی صاحب کی تصنیف ہے۔

۴۔ فقہائے ہند جلد پنجم — حصہ اول : یہ ایک سلسلہ وار تصنیف ہے جو بارھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر کے حالات پر مشتمل ہے اور ان سطور کے راقم کی تالیف ہے۔

باقی گیارہ کتابیں دوسری یا تیسری مرتبہ چھپی ہیں۔ ان میں پانچ کتابیں اردو کی ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) آبِ کوثر (۲) رودِ کوثر اور (۳) موجِ کوثر ؛ یہ تینوں کتابیں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی مشہور تصانیف ہیں جو برصغیر پاک و ہند کی علمی، تحقیقی، مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کا شاندار مرقع ہے۔ علاوہ ازیں (۴) ملفوظاتِ رومی، ترجمہ جناب عبدالرشید تبسم اور جناب مظہر الدین صدیقی صاحب کی تصنیف (۵) "اسلام کا نظریۂ تاریخ" اپنے موضوع میں لائق مطالعہ کتابیں ہیں۔

اس سال جو انگریزی کتابیں دوبارہ یا سہ بارہ طبع ہوئی ہیں، وہ حسب ذیل چھ کتابیں ہیں۔

۱۔ وومن ان اسلام : از جناب مظہر الدین صدیقی صاحب
۲۔ اسلام اینڈ تھیاکریسی : جناب مظہر الدین صدیقی
۳۔ فیلسی آف مارکسزم : ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم
۴۔ قرآنک اتھیکس : بشیر احمد ڈار مرحوم
۵۔ سوشل جسٹس ان اسلام : پروفیسر شیخ محمود احمد صاحب
۶۔ لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی : از ڈاکٹر افضل اقبال صاحب

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے کرم فرماؤں نے ہمیشہ ادارے سے تعاون کیا اور اس کی علمی و تحقیقی مطبوعات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی ان کا تعاون جاری رہے گا اور وہ ادارے کو مزید خدمت کے مواقع فراہم کرتے رہیں گے۔

راسخ عرفانی

نعت

جلوے روضے کے یاد آنے لگے　　اشک پلکوں پہ جھلملانے لگے

نام آیا حضورؐ کا لب پر　　غم کے لمحے بھی مسکرانے لگے

خاکِ طیبہ رکھی ہے سینے پر　　دل وطن میں کسی بہانے لگے

وہ تقدس نبیؐ کی گلیوں کا　　گھر تھے جتنے بھی آستانے لگے

مدحِ خیر البشرؐ کا عزم کیا　　لفظ بن بن کے پھول آنے لگے

ذکر سن کر ریاضِ طیبہ کا　　گل بھی شاخوں پہ لہلہانے لگے

کیا مدینے کے لوگ تھے راسخ
اجنبی تھے مگر یگانے لگے

جناب رحمت فرخ آبادی ایم۔ اے

مقدمۂ بغاوت کراچی اور مولانا محمد علی جوہر

(۲)

مقدمۂ بغاوت کراچی کے مجرموں کو الگ الگ گرفتار کیا گیا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کو والٹیر کے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا اور پھر ۷ ستمبر کو صبح چھ بجے اسپیشل ریل کے ذریعے کراچی روانہ کیا گیا۔ والٹیر سے کھر داڑو، کھرک پور، گوموہ، سہسرام، مغل سرائے، دہلی، الہ آباد، کانپور، علی گڑھ غازی آباد، بٹھنڈا، سمہ سٹہ، روہڑی اور حیدرآباد کے راستے کراچی لائے گئے اور اس طرح والٹیر سے دو ہزار دو سو باون (۲۲۵۲) میل کا سفر پورے تین دن تین رات میں پورا کیا[۱] مولانا محمد علی جوہر کے ایک خط سے جو ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی کے نام لکھا گیا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ والٹیر کے اسٹیشن سے روانگی کے وقت ان کی اہلیہ بھی موجود تھیں[۲]

اس سلسلے میں جہاں تک مقدمۂ بغاوت کراچی کے ماخوذ دیگر سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری کا تعلق ہے، مندرجہ ذیل تفصیلات معلوم ہوتی ہیں[۳]:

مولانا شوکت علی کو بمبئی میں ۱۵ ستمبر کی رات کو ۲ بجے گرفتار کر کے بحری جہاز کے ذریعے کراچی بھیجا گیا۔ ڈرگ روڈ اسٹیشن پر لا کر وہاں سے داخلِ زندان کیا گیا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو شملہ سے گرفتار کر کے ڈرگ روڈ لایا گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی کو دیو بند میں گرفتار کیا گیا، ان کی گرفتاری کے وقت ہنگامہ بھی ہوا۔ مولانا نثار احمد کانپوری پہلے ہی سے قید تھے، انھیں کراچی منتقل کر دیا گیا۔ پیر غلام مجدد سرہندی کو ۱۵ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ٹنڈو الہ یار کے اسٹیشن پر ٹرین سے گرفتار کیا گیا اور ڈسٹرکٹ کے

---

[۱] علی برادران مرتبہ رئیس احمد جعفری لاہور ۱۹۶۳ء۔ ص ۵۴۳، ۵۴۶

[۲] ایضاً۔ ص ۵۵۰

[۳] مقدمہ متن شیرین جو (سندھی) حصہ اول۔ پیر الٰہی بخش، سکھر ۱۹۲۱ء، ص ۲-۳

ریلوے اسٹیشن سے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعے کراچی بھیجا گیا اور جگت گورو شری شنکر اچاریہ کو گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک شہر میں دورانِ عبادت ۱۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو شام کے وقت گرفتار کر کے حیدرآباد سندھ بھیجا گیا، جہاں سے انھیں ڈرگ روڈ لا کر جیل میں منتقل کیا گیا۔

اس مقدمے[۵۷] کی بنیاد آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی کی ساتویں قرارداد کا مندرجہ ذیل حصہ تھی کہ "یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ آج سے کوئی مسلمان اگر انگریز کی فوج میں داخل ہوگا، مدد کرے گا یا ان کا ساتھ دے گا تو وہ غیر قانونی سمجھا جائے گا۔"

چنانچہ مندرجہ بالا رہنماؤں پر زیرِ دفعہ ۱۲۰ (ب)۔ زیرِ دفعہ ۱۳۱، اور ۵۰۵ مقدمہ قائم کیا گیا۔ ان میں (الف) دفعہ ۱۳۱ (ب) کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بھی شخص جو فوج یا خلاصیوں کو بلوے کے لیے اُکسائے گا یا ان کو اپنے فرائض کی ادائیگی سے روکے گا تو اس کی سزا عمر قید یا دس سال کے لیے عبور دریائے شور یا جرمانہ اور سزا ہے۔ (ب) دفعہ ۱۲۱ (ب) کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی بدترین منصوبے یا گفتگو میں شریک ہوگا تو اس کی سزا موت یا کالا پانی ہے۔ (ج) دفعہ ۵۰۵ کا مطلب ہے کہ اگر کوئی شخص فوج کو اپنے فرض سے ورغلانے یا ان میں بلوہ کرانے کی غرض سے کچھ ہینڈبل چھپوا کر تقسیم کرے گا تو اس کی سزا دو سال، جرمانہ اور قید ہے۔

بہرحال ابتدائی سماعت کی عدالت میں مقدمے کی سماعت ۲۶ ستمبر، ۲۷ ستمبر، ۲۸ ستمبر، ۲۹ ستمبر

---

[۵۷] اس مقدمے کی روداد مرتب کرتے وقت مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱۔ مسلمان اور غیر مسلم حکومت۔ مولانا محمد علی۔ لاہور ۱۹۴۷ء

۲۔ مقدمہ ستن شیرن جو (سندھی) حصہ اول۔ پیر الٰہی بخش۔ سکھر ۱۹۲۲ء

3. Historic Trial Mulana Muhammad Ali and others. Edited by Rafique Akhtar. Karachi 1971.

4. The Historic Trial of Ali brothers and others. Vol I. Karachi-1921.

5. The Historic stat trial of Ali brothers and five others Compiled by R. V. Thadani Pleader. Karachi - 1921.

یکم اکتوبر، ۱۲ر اکتوبر کو خالق دینا ہال اور ۲۲ر اکتوبر کو سنٹرل جیل کراچی میں ہوئی۔ اس مقدمے کی سماعت مسٹر طلاٹی (S.M. TALATI) قائم مقام سٹی مجسٹریٹ کراچی نے کی تھی۔ مقدمے میں استغاثے نے تیس گواہ پیش کیے، جن کے نام یہ ہیں :

۱۔ زماں شاہ ہاشمی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کراچی۔ اس مقدمے کا فریادی

۲۔ محمد بخش الٰہی بخش شیخ ڈپٹی کمشنر بالا ڈویژن، ضلع حیدرآباد۔

۳۔ کیشولال مدھوداس گوسائی۔ ہیڈ کانسٹیبل کراچی پولیس۔

۴۔ فتح بہادر لچھمن کانستھ۔ ہیڈ کانسٹیبل کراچی۔ سی، آئی، ڈی، پولیس۔

۵۔ محمد عثمان غنی شیخ۔ ہیڈ کانسٹیبل کراچی، سی، آئی، ڈی پولیس۔

۶۔ عبدالغفور لدھڑ خاں۔ سب انسپکٹر، سی، آئی، ڈی پولیس کراچی۔

۷۔ لخت حسنین، تصدق حسنین۔ سب انسپکٹر سی، آئی، ڈی پولیس، الہ آباد۔

۸۔ شان بہادر خاں پٹھان۔ سب انسپکٹر سی آئی، ڈی پولیس، الہ آباد۔

۹۔ ولیم رونزیرن۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ ڈیلی گزٹ۔ کراچی۔

۱۰۔ کرم چند، رام لال۔ انسپکٹر سی، آئی، ڈی، پولیس کراچی۔

۱۱۔ کرنل گوائر۔ ویسٹرن آرمی کمانڈ۔ کراچی۔

۱۲۔ صوبیدار میجر جیرام۔ ۹۸۔ انفنٹری بڑودہ۔

۱۳۔ صوبیدار انفنٹری عزیزالدین شریف الدین جاٹ چمن۔

۱۴۔ صوبیدار محمد ہاشم۔ ۱۰۶۔ پائینیر۔ کوئٹہ۔

۱۵۔ ٹی، کے جسوانی، ایڈیٹر نیو ٹائمز کراچی۔

۱۶۔ مسٹر پی، اے۔ کیلی۔ ڈپٹی کمشنر پولیس، بمبئی۔

۱۷۔ ٹیک چند، ہنیداس میر چندانی، ہیڈ ماسٹر نیو ہائی اسکول و پریس رپورٹر ڈیلی گزٹ، برائے خلافت کانفرنس کراچی۔

۱۸۔ سید محمود شاہ، ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس، تھرپارکر۔

۱۹۔ نرائن گنیش جوشی انسپکٹر پولیس سی، آئی، ڈی، پونا۔

۲۰۔ ڈھولارام نروان مارواڑی۔ سب انسپکٹر، سی، آئی، ڈی، پونا۔
۲۱۔ وٹھل رام چند، سب انسپکٹر سی، آئی، ڈی، پونا۔
۲۲۔ مسٹر مٹوانی، نمائندہ اخبار ڈیلی نیوٹائمز کراچی۔
۲۳۔ سید عبدالکریم۔ انسپکٹر سی، آئی، ڈی پولیس مدراس۔
۲۴۔ ڈبلیو، ڈبلیو، اسمارٹ، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، کراچی۔
۲۵۔ ہری رام شیوارام، نمائندہ نیوٹائمز، کراچی۔
۲۶۔ مسٹر نریمان، ہرمزجی، پارسی، ڈپٹی جیلر۔ کراچی۔
۲۷۔ عبدالغنی راجپوت۔ سپرنٹنڈنٹ مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی۔
۲۸۔ محمد احمد شیخ۔ پرنٹر۔ مصطفائی پریس، بمبئی۔
۲۹۔ لیسرمل جواہرمل۔ شارٹ ہینڈ کلرک کمشنر آفس۔ کراچی۔
۳۰۔ ڈبلیو، ڈبلیو، شنکر، عیسائی۔ جیلر والٹیر سنٹرل جیل۔

مقدمے کی سماعت کے تیسرے روز مولانا محمد علی جوہر نے اپنا بیان شروع کیا۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا کہ:

"ایک تارک موالات ہونے کی حیثیت سے میں نے عدالت کی کارروائی میں اس کے سوا اور کوئی حصہ نہیں لیا کہ جس صورت میں یہ مقدمہ ہر روز پیش ہوتا رہا ہے، اس کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ استغاثے کی طرف سے جو شہادتیں ہمارے خلاف گزری ہیں، میں نے ان پر کبھی کوئی اعتراض نہ کیا اور نہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آیا جو شہادتیں ہمارے خلاف پیش کی جا رہی ہیں، وہ واقعی مقدمے سے تعلق بھی رکھتی ہیں یا نہیں اور یہ کہ عدالت ان کو سننے کی مجاز بھی ہے یا نہیں اور پھر آپ کا اپنا جو قانونِ شہادت ہے، اس کی رو سے جو کارروائی ہوتی رہی اور جب سرکاری وکیل گواہوں سے اپنی حسبِ مرضی بیان نہ لے سکا اور اس کے لیے اس نے گواہوں پر مزید سوالات کیے تو میں نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔"

اس موقع پر مولانا محمد علی جوہر نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ حامل ترکِ موالات ہوتے کی حیثیت سے وہ کس حد تک عدالتی کارروائی میں حصہ لینا جائز سمجھتے ہیں، کہا کہ

"تارک موالات ہونے کی حیثیت سے اپنے خلاف کسی عدالتی کارروائی میں جو تھوڑا بہت حصہ لینا ہم اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں، وہ صرف اسی حد تک ہے کہ اصل معاملہ جو زیر سماعت ہے، اس کے بارے میں عدالت میں ایک بیان پیش کردیں اور وہ بھی اپنی صفائی کی غرض سے نہیں بلکہ محض زیر بحث واقعات کی تشریح کے خیال سے، تاکہ جو شخص ان واقعات سے پوری طرح واقف نہیں وہ کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جائے، لیکن جہاں تک اس مقدمے کا تعلق ہے مجھے اپنا بیان دینے کی ضرورت صرف اسی لیے پڑی کہ عدالت کو بعض بے ضرورت گواہوں کو بلانے کی تکلیف نہ اُٹھانا پڑے۔ بے ضرورت اس لیے کہ ان گواہوں کو ایک واضح بات ثابت کرنے کے لیے طلب کیا جا رہا ہے اور ڈر ہے کہ ان کی کوششوں کا نتیجہ کہیں یہ نہ ہو کہ ایک بات جو واضح تھی، ان گواہوں کی وجہ سے غیر واضح ہو جائے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنے بیان سے ان بے ضرورت گواہوں کی کوششوں کا جن سے اکثر جرم پر پردہ پڑنے کا امکان ہوتا ہے، نعم البدل پیش کردوں"۔

سازش کے الزام کی آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی کی قرارداد کی روشنی میں وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر نے کہا کہ :

" آپ یقین کریں ہمارا مقصد دفعہ ۱۲۰ (ب) توڑنے کا نہیں تھا۔ ہم نے جو بھی سازش کی وہ روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ خلافت کانفرنس کراچی کی میں نے صدارت کی اور وہ قرارداد جس میں ترکی کی انقرہ حکومت کے خلاف برطانیہ کی طرف سے عداوت پیدا ہونے کے اندیشے کا اظہار کیا گیا تھا، اسی کانفرنس میں پیش ہوئی اور اسی مضمون کی ایک قرارداد بلگام کی ڈسٹرکٹ خلافت کانفرنس میں بھی پیش ہو چکی ہے۔ مجھے اقرار ہے کہ اس قرارداد کو میں نے پڑھ کر سنایا اور میں نے ہی ان صاحب کی تجویز کو جن کو میں اپنا آقا، سردار اور بزرگ کہنا اپنے لیے فخر سمجھتا ہوں، کانفرنس کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ بزرگ مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدنی ہیں۔ میں نے اس تجویز کو سناتے وقت بیچ بیچ میں کچھ کلمات بھی کہے تھے اور میں نے باآواز بلند حاضرین سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ کون کون اس تجویز کی تائید کرتے ہیں اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو لوگ سچے دل سے اس قرارداد کی تائید کرتے ہیں، وہ کھڑے ہو جائیں اور اس کا اقرار کریں، لیکن یہ بات بالکل غلط ہے اور ہر گواہ نے جھوٹ بولا ہے کہ صرف اسی قرارداد پر لوگوں کو کھڑے ہونے کو کہا

گیا تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام قراردادیں جن کا اعلان اخبارات میں ہوا ہے، سب کی سب اسی طرح حاضرین سے منظور کروائی گئیں۔ معلوم نہیں گواہوں نے یہ بے فائدہ جھوٹ کیوں بولا۔ یوں عمداً جھوٹ گھڑنا اور اس پر حکومت کا انصافِ شاہانہ کا دعویٰ۔ اس گھڑی ہوئی شہادت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا مقصد یہ ہے کہ جان بوجھ کر ایسی غلط فہمیاں پیدا کرے اور اس قسم کی قرارداد کی اشاعت کر کے خود اپنی فوج پر اس کا بُرا اثر ڈالے تاکہ اس طرح وہ میرے خلاف مقدمہ دائر کر سکے، اس سے پہلے بھی کئی بار اس طرح کی کوشش میرے خلاف وائسرائے کو ورغلانے کے سلسلے میں کی جا چکی ہیں جس سے کہ غرض مجھ پر مقدمہ چلانے کے لیے زمین ہموار کرنا تھا۔"

مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اس بیان میں اس بات کی بھی وضاحت کی کہ آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی کی جس قرارداد کی بنیاد پر مقدمہ قائم کیا گیا ہے، اس کی اہمیت کیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں کہا کہ :

"اس حکومت کی طرف سے اپنے مذہبی فرائض اور خلافت کے تحفظ کے سلسلے میں شکایت کرنا بے فائدہ ہے۔ مسلمان پریشان تھے اور بے صبر۔ ہم نے یہ کیا کہ اس پریشانی اور بے صبری میں تمام مسلمانوں کو خدا کی مدد پر بھروسہ کرنے کو کہا اور حکومت کے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ ہم نے حکومت کو متنبہ کر دیا ہے کہ اگر وہ اپنی اسلام دشمن پالیسی سے باز نہیں آئے گی، تو اوّل تو ہم کانگریس کے تحت سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں گے اور دوسرے آئندہ دسمبر میں کانگریس کے سالانہ اجتماع کے موقع پر ہندوستان کی آزادی اور جمہوریت کا اعلان کر دیں گے۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن سے واقعی حکومت سے اعلانیہ دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اب ہم ان باتوں کو اعلانیہ کہیں یا خفیہ طور پر، براہِ راست برطانیہ کو سنائیں یا جس طرح برطانیہ یونان کے ذریعہ ترکوں کی مخالفت کر رہا ہے، ہم بھی کسی واسطے سے کام لیں۔ آج ملک کا ہر اخبار خواہ وہ موالاتی ہو یا غیر موالاتی، ہندوستان کی مجوزہ جمہوریت سے بحث کر رہا ہے۔ البتہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ ان میں سے کسی نے ہندوستانی فوج کے متعلق کوئی بات اس طرح لکھی ہے جس کا ذکر اس کانفرنس کی قرارداد میں تھا اور جس کو آج بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ کئی ماہ ہوئے ہندوستان کے بڑے بڑے علمائے اسلام نے ترکِ موالات کی مذہبی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے صاف طور پر اعلان کر دیا تھا کہ حکومت کی قانون ساز کونسلوں میں شرکت کرنا، اس

کی عدالت میں وکالت کرنا، سرکاری مدرسوں میں تعلیم پانا، حکومت کے خطابات حاصل کرنا، اس کی نوکری کرنا، خواہ وہ فوجی ہوں یا سول سب ناجائز ہیں - علما کے اس فتوے کے بعد اگر ہم نے کراچی کانفرنس میں خطابات پانے والوں کو لتاڑا، جنھوں نے اپنی عزت بیچ کر خطابات خریدے ہیں تو ہمارے خلاف یہ الزام کس قدر مضحکہ خیز ہے، کہ ہم نے خطاب یافتوں کے خلاف سازش کی۔"

اس سلسلے میں مولانا جوہر نے مزید کہا کہ

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے خلاف الزام کیا ہے - اگر الزام اس قرار داد کا ہے جو خلافت کانفرنس کراچی میں منظور کی گئی تو میں یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اس قرارداد کا منظور کرنا ہمارا عین مذہبی فرض تھا- میرا یہ دعویٰ ہے کہ ہر مسلمان کو خدا کے احکام کو مقدم اور اپنے بادشاہ کو اس سے دوسرے درجے پر سمجھنا چاہیے - کیا یہ وہ جرم ہے جس کا الزام مجھ پر لگایا گیا ہے - میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں، میں یہاں کوئی لیکچر نہیں دے رہا بلکہ شریعت کا حکم بیان کر رہا ہوں جس پر عمل کرنا ہمارے اوپر فرض کیا گیا ہے -"

اس کے بعد مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجدد سرہندی سے مجسٹریٹ نے بیان دینے کو کہا- دوسرے دن اس نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو، شری شنکر اچاریہ، مولانا شوکت علیؒ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا نثار احمد کانپوری سے کچھ سوالات کے جواب دینے کو کہا لیکن سب نے کہا کہ وہ اپنے بیان میں تمام باتوں پر روشنی ڈالیں گے- اسی دن یعنی ۲۹ ستمبر کو وکیل استغاثہ نے مقدمے میں اپنے دلائل دیے اور اس کے دلائل ختم ہوتے ہی مجسٹریٹ نے فرد جرم عائد کر دی -

خالق دینا ہال میں یکم اکتوبر ۱۹۲۱ء عدالتی کارروائی کا پانچواں دن تھا- سماعت شروع ہونے کے بعد مولانا محمد علی نے عدالت کی توجہ ڈیلی گزٹ کراچی کے شمارہ ۳۰ ستمبر کی ایک خبر کی طرف مبذول کرائی جس میں بتایا گیا تھا کہ " مسٹر کینیڈی جوڈیشل کمشنر سندھ نے اپنے رجسٹرار کے ہمراہ خالق دینا ہال کا پونے گیارہ بجے معائنہ کیا اور اس بات کا جائزہ لیا کہ آیا یہ ہال مقدمے کی سشن کارروائی کے لیے موزوں رہے گا اور یہ کہ انھوں نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ یہ جگہ سشن کارروائی کے لیے موزوں ہے، سشن کارروائی کے لیے ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ہے - البتہ قیاس ہے کہ اس کا آغاز ۱۱ یا ۱۲ اکتوبر سے ہوگا اور یہ کہ اس کی سماعت جوڈیشل کمشنر خود کریں گے۔" مولانا محمد علی نے کہا کہ " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ مقدمہ سیشن عدالت میں چلے گا جب کہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ ابتدائی سماعت کی عدالت میں اس کی کارروائی ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی ہے اور مقدمہ ابھی تک سیشن سپرد بھی نہیں کیا گیا ہے۔ یہ عدالتی نظام پر ایک بدنما داغ ہے۔"

اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے کہا کہ اس مقدمے کی تمام کارروائی چار وجوہات کی بنا پر غیر قانونی ہے:

اوّل یہ کہ وکیل استغاثہ نے جیسے ہی دلائل ختم کیے، فردِ جرم جو پہلے ہی سے تیار تھی، پڑھ کر سنا دی گئی۔

دوم یہ کہ موجودہ عدالت نے گواہوں کے بیانات سے قبل ہی مقدمے کو سیشن سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سوم یہ کہ استغاثہ نے صفائی سے اپنے دفاع کے بارے میں کبھی کوئی بات نہ کی۔

چہارم یہ کہ مقدمہ کی کارروائی ختم ہونے سے پہلے ہی مقدمے کو سیشن سپرد کرنے کے انتظامات کیے گئے۔

یہ سب بکواس ہے اور قانون کے مطابق مقدمے کی کارروائی غیر قانونی ہے۔ اس طرح اس مقدمے کو دوبارہ چلایا جانا چاہیے اور یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں ہے کہ عدالتی کارروائی کا یہ طریق کار صحیح نہیں بلکہ ایک فاش غلطی ہے۔

بعد ازاں مجسٹریٹ نے اس اعتراض کو نوٹ کر لیا اور اس کے بعد مقدمے کے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے مقدمے کو سیشن سپرد کر دیا۔

یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ مقدمے کے فیصلے کا اعلان ہونے اور مقدمے کے سیشن سپرد کرنے کے بعد عدالت نے چار مزید گواہوں کے بیانات لیے جن کے نام گواہوں کی فہرست کے آخر میں درج ہیں۔ ان چاروں کو مقدمے کی کارروائی کے چھٹے اور ساتویں دن یعنی ۲۱ اور ۲۲ راکتوبر کو استغاثے نے پیش کیا تھا۔

اس طرح مقدمے کی ابتدائی سماعت مکمل ہو گئی اور مقدمہ سیشن سپرد ہو گیا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی پر زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) الگ الگ مقدمے تھے اور ان میں ان دونوں نے بیانات بھی دیے تھے لیکن سیشن عدالت سے سزا پانے کے بعد حکومت نے ان دونوں مقدمات کو واپس لے لیا تھا، اس لیے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہوئے سیشن سماعت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

۲۴ راکتوبر ۱۹۲۱ء کو بی، سی، کنیڈی جوڈیشنل کمشنر سندھ کی عدالت میں علی برادران اور ان کے رفقا

کے خلاف نئے سرے سے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی اور جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ جوڈیشل کمشنر نے خالق دینا ہال کا اسی غرض سے معائنہ کیا تھا، اس لیے سشن مقدمے کی سماعت بھی اسی ہال میں ہوئی۔

اس دن جب عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا تو وکیل استغاثہ نے فردِ جرم میں معمولی سا اضافہ کرنے کی اجازت چاہتے ہوئے کہا کہ پہلے جرم میں الفاظ "آپ ساتوں ملزم کے بعد" الفاظ "کسی وقت یا اوقات پر فروری تا ستمبر ۱۹۲۱ء کے بجائے فروری ۱۹۱۹ تا ستمبر ۱۹۲۱ء درج ہونا چاہیے"۔ چنانچہ اس بارے میں عدالت کے استفسار پر مولانا محمد علی نے کہا کہ "تارکانِ موالات کی حیثیت سے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جو چاہیں لکھیں، ہم صرف اس مقدمے کو سمجھنا چاہتے ہیں۔" اس کے بعد وکیل استغاثہ نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ دفعہ ۱۲۰ کے بعد دفعہ ۱۱۵ بھی لکھی جائے۔ دفعہ ۱۲۰ میں درج ہے کہ سازش کنندہ جماعت کو سزا دی جائے، لیکن چونکہ اس جماعت نے اعانتِ جرم کی ہے اس لیے جرم کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ یعنی

(الف) انفرادی طور پر جرم کا ارتکاب کرنا۔

(ب) سپاہیوں کو فرض کی ادائیگی سے باز رکھنے کی سازش میں شریک ہونا۔

وکیل استغاثہ نے اس سلسلے میں مزید کہا کہ ملزم سازش کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے واقعی بعض سپاہیوں کو ورغلانے کی کوشش کی ہے، میں چاہتا ہوں کہ دوسرے پیراگراف میں بھی تبدیلیاں کی جائیں۔ چنانچہ اس تمام کارروائی پر مولانا محمد علی نے کہا کہ

" فردِ جرم میں پہلے ہی حسبِ مرضی تبدیلیاں کی جا چکی ہیں، میرا خیال ہے کہ عدالت نے جرم کی نوعیت کے بارے میں ابتدا ہی میں اچھی طرح صراحت کر دی تھی کہ اس کا زمانۂ ارتکاب از فروری ۱۹۲۰ تا ستمبر ۱۹۲۱ء نہیں بلکہ از فروری ۱۹۲۱ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء ہے۔ اس تبدیلی کے بارے میں ہمیں اس سے قبل معلوم ہونا چاہیے تھا، اور خاص طور پر جب کہ اس کے متعلق ہمارے خلاف کسی قسم کی شہادت بھی نہیں ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات کہ فروری ۱۹۲۱ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء نہیں بلکہ فروری ۱۹۲۰ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء ہے، مجسٹریٹ کے دماغ میں تھی یا سرکاری وکیل کے دل میں۔ اب جس طرح ماتحت عدالت کی کارروائی کو غلط اور فضول سمجھا جا رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر مجسٹریٹ درجۂ اول کی عدالت میں مقدمے کی سماعت کرانے سے کیا حاصل تھا، جب کہ یہاں اس کی کارروائی پر پانی پھیرا جا رہا ہے۔ وکیلِ استغاثہ

نے کہا کہ وہ فردِ جرم میں محض معمولی سی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ تو معمولی سی تبدیلی نہیں ہے۔ اگر انھیں فردِ جرم کو اس طرح بدلنا تھا تو مجسٹریٹ درجۂ اوّل کی عدالت سے ہم پر جو جرم عائد کیے گئے ہیں، ان کے لیے ہمیں جیل میں تیاری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے خیال میں اس بات کی مطلق پروا نہیں کی گئی۔" (باقی آئندہ)

الفہرست

از محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق اردو ترجمہ: مولانا محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب، چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآنِ مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علم نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیونکر عالمِ وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۳۶ مع اشاریہ قیمت -/۳۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

ایم۔ شاکر الکوتاشر
ترجمہ: ثروت صولت

عثمانی ترکوں کے زمانے میں بچوں کے مدرسے

بچوں کے مدرسے جن کو ترکی میں صبیان مکتب لری کہا جاتا تھا، ترکی میں سب سے پہلے سلطان محمد فاتح (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) کے زمانے میں قائم کیے گئے۔ یہ مدرسے شروع میں استنبول میں قائم ہوئے۔ اس کے بعد پوری عثمانی سلطنت کے شہروں اور قصبوں میں پھیل گئے۔ فاتح کے بعد کے دور میں ان مدرسوں کو دار العلم، معلم خانہ، مکتب اور مکتب خانہ بھی کہا جاتا تھا۔

یہ مدرسے اسلامی تعلیمی روایات کا ایک حصہ تھے۔ اسلامی احکام کے مطابق ایک بچہ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، سات سال کی عمر کے بعد دینی فرائض پر عمل کرنا شروع کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس وقت تک بچے کے لیے لکھنے پڑھنے کا انتظام کر دیا جاتا تھا، بلکہ ان کو چار سال کی عمر ہی سے محلے کے مدرسوں میں تعلیم کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ ترکی میں اس کی ایک مثال سیواس کے حکمران قاضی برہان الدین[۵] (۱۳۴۴ء تا ۱۳۹۹ء) کی ہے، جن کو چار سال کی عمر میں پڑھانا شروع کر دیا گیا تھا۔

---

۵ قاضی برہان الدین ترکی کے ایک صاحبِ سیف و قلم شخص تھے۔ ان کا تعلق عثمانیوں سے قبل کے دور سے ہے جبکہ اناطولیہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ قاضی برہان الدین کے والد شہر قیصری کے قاضی تھے۔ قاضی برہان الدین نہایت ذہین تھے، چودہ سال کی عمر تک عربی، فارسی، منطق اور حکمت کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے مصر، حجاز اور حلب میں مزید تعلیم حاصل کی۔ باپ کے انتقال کے بعد ۱۳۶۴ء میں قیصری کے قاضی ہوئے۔ اسی سال وہ قیصری کے حکمران کے وزیر ہو گئے۔ ۱۳۸۱ء میں قاضی برہان الدین سیواس کے حکمران ہو گئے اور اٹھارہ سال حکومت کی یہاں تک کہ سیواس کے ایک محاصرے کے دوران لڑائی میں مارے گئے۔ قاضی برہان الدین کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ حکومت کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے ساتھ انھوں نے نظم و نثر میں بکثرت کتابیں لکھیں۔ عربی میں ان کی کتابیں علم فقہ سے متعلق ہیں۔ وہ عربی، فارسی اور ترکی کے شاعر بھی تھے۔ ان کا ترکی دیوان پندرہ سو غزلوں پر مشتمل ہے، رباعی وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ اس دیوان کا واحد نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔ ترکی کی لسانی انجمن نے اس دیوان کو ۱۹۴۳ء میں شائع کر دیا ہے۔

محمد فاتح سے پہلے ترکی میں مکاتبِ صبیان کی کیا شکل تھی، اس کے بارے میں ہمیں واضح معلومات نہیں ہیں۔ اگرچہ بعض تاریخوں میں بتایا گیا ہے کہ ابتدائی دور کے عثمانی سلاطین کے زمانے میں بھی ازنیق، بروصہ، ادرنہ اور منیسہ (MANISA) وغیرہ میں ہر مسجد کے ساتھ ساتھ ایک ایک مدرسۂ صبیان بھی ہوتا تھا، لیکن ان مدرسوں کی ماہیت، اصولِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کے بارے میں ہمیں معلومات نہیں۔ اس قسم کی معلومات صرف محمد فاتح کے دَور میں اور اس کے بعد قائم ہونے والے مدرسوں تک محدود ہیں۔

مدارسِ صبیان میں پانچ تا دس سال کی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔ ان بچوں کو دینی تعلیم دلانے کے یہ اوّلین ادارے تھے۔ پہلا مدرسۂ صبیان استنبول کی مشہور جامع فاتح اور اس کے مدرسے کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ان کے پاس ہی مسجد کے غربی دروازے سے ملحق قائم کیا گیا۔ یہ مدرسہ ۱۹۱۸ء کی آتش زنی میں جل گیا۔ سلطان محمد فاتح کے وقف نامہ میں جو ترکی زبان میں ہے، اس عمارت کے لیے ترکی میں دارالتعلیم اور عربی میں مکتب کے نام سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس مدرسے میں صرف یتیم بچے تعلیم پاتے تھے۔ اگر یتیم بچے نہیں ملتے تھے تو پھر دوسرے غریب بچوں کو داخل کیا جا سکتا تھا۔

فاتح کے بعد اس کے بیٹے بایزید ثانی (۱۴۸۱ تا ۱۵۱۲ء) کے زمانے میں جامع بایزید ثانی کے جنوبی حصے میں صبیان مکتب قائم کیا گیا تھا۔ وقف نامہ کے مطابق یہ بھی یتیم اور غریب بچوں کی تعلیم کے لیے مخصوص تھا۔ اس مدرسے میں بچوں کو روزانہ صبح اور شام روٹی اور گوشت دیا جاتا تھا۔ قلفہ[۵] (KALFA) کو ہدایت تھی کہ وہ جمعہ کو چھوڑ کر روزانہ تیس بچوں کو قرآن پڑھائے، نماز کے طریقے سکھائے اور نماز میں پڑھی جانے والی سورتوں اور دعاؤں کو یاد کرائے۔

مکاتبِ صبیان کا یہ طرزِ تعلیم کافی عرصے تک اسی طرح چلتا رہا، حتیٰ کہ عبدالحمید اوّل (۱۷۷۴ تا ۱۷۸۹ء) کے دور میں بعض اضافے کیے گئے۔ عبدالحمید اوّل کے ایک وقف نامہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

---

۵ قلفہ یا قلفا ترکی میں نائب مدرس کو کہا جاتا تھا۔ اس کے لیے کبھی کبھی خلیفہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔ قلفہ دراصل خلیفہ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

بچوں کو عربی کے علاوہ فارسی زبان کی تعلیم بھی دلائی جاتی - چنانچہ اس کے بعد سے ہمیں تحفہ، سخبہ اور صبحۂ صبیان کے نام سے عربی اور فارسی زبانیں سکھانے والی منظوم کتابیں مدارسِ صبیان کے نصابِ تعلیم میں شامل نظر آتی ہیں۔ یہ کتابیں پڑھائی بھی جاتی تھیں اور حفظ بھی کرائی جاتی تھیں۔ عبدالحمید اوّل کا یہ مدرسہ باغیچہ کاپی (باب باغیچہ) میں تربتِ حمیدیہ کے سامنے واقع تھا۔ ۱۹۱۴ء میں اس کے گرد چار سرائیں بنا دی گئیں۔ تحفہ نامی کتاب فارسی اور ترکی میں اور سخبہ نامی کتاب عربی اور ترکی میں تھی۔ یہ کتابیں مرعش کے مشہور ترک شاعر سنبل زادہ وہبی (۱۷۱۹ تا ۱۸۰۹ء) کی لکھی ہوئی تھیں۔ صبحۂ صبیان بھی فارسی، عربی اور ترکی میں منظوم لغت ہے۔

مدارس صبیان میں تعلیم کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔ طلبا کو یومیہ وظیفہ دیا جاتا تھا اور سال میں ایک مرتبہ کپڑے دیے جاتے تھے۔ اگر مکتب کسی بادشاہ کا تعمیر کیا ہوتا تھا تو بچوں کو ہر صبح یخنی پلائی جاتی تھی اور ایک ایک روٹی دی جاتی تھی۔ جمعرات کے دن بچوں کو پلاؤ اور زردہ دیا جاتا تھا۔

بعض وقف ناموں سے (جیسے شیخ الاسلام اسد آفندی[۵۳] اور سلطان محمود اوّل کی والدہ صالحہ سلطان کا وقف نامہ ہے)۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال بچوں کو جو کپڑے دیے جاتے تھے وہ ایک قسم کے سوتی کپڑے ہوتے تھے جس کو ترکی میں بوغاسی کہا جاتا تھا۔ کپڑے سلے سلائے ہوتے تھے اور ٹوپی، قمیص، صدری، پیٹی اور جوتے وغیرہ پر مشتمل ہوتے تھے۔

سلیمان قانونی کے وقف نامے کے مطابق غریب بچوں کو ملبوسات کے بدلے یومیہ دیا جاتا تھا اور عید اور بقرہ عید کے موقعوں پر کپڑے بھی دیے جاتے تھے۔ جامعہ سلیمانیہ کے پاس سلیمانیہ عمارت خانے میں غریبوں کے لیے جو کھانا پکایا جاتا تھا، اس میں سے مکتب کے بچوں کو بھی کھانا دیا جاتا تھا۔

مدارسِ صبیان کے بچوں کو استاد اور قلفہ کی نگرانی میں سال میں ایک دفعہ گرد و نواح کے تفریحی مقامات میں سے کسی ایک مقام پر تفریح کے لیے بھی لے جایا جاتا تھا۔ اس قسم کی تفریح کے لیے

---

۵۳ اسد آفندی (۱۶۸۴ تا ۱۷۵۲ء) سلطنتِ عثمانیہ کے ۶۷ ویں شیخ الاسلام تھے۔ وہ کئی سال رومیلی میں قاضی عسکر رہے اور ۱۷۴۸ اور ۱۷۴۹ء میں ایک سال ۲۲ دن کے لیے شیخ الاسلام بھی رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں دو لغت کی کتابیں، ایک تذکرہ عرفائے ادوار نامی ماہرینِ موسیقی کی سوانح عمریوں پر مشتمل اور ایک گلزارِ ابراہیم نامی کتاب پھولوں

علیحدہ وقف ہوتا تھا، جیسا کہ شیخ الاسلام اسد آفندی اور ایک دولت مند رئیس رامی قادان (۱۷۵۱ء) کے وقف کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کے پروگراموں کو "مکتب سیری"، یعنی مکتب کی سیر و تفریح کا پروگرام کہا جاتا تھا۔

مدارسِ صبیان زیادہ تر مسجدوں سے ملحق یا ان کے قریب واقع ہوتے تھے۔ عثمانی سلاطین اور شاہی خاندان کی عورتیں ان مدرسوں کے قیام میں سب سے زیادہ حصہ لیتی تھیں، لیکن دولت مند اور علم دوست افراد بھی مسجدوں، مدرسوں اور عمارت خانوں[۵۴] کو بنواتے وقت ان عمارتوں کے ساتھ مدارسِ صبیان قائم کرنا بھی ایک نیک کام سمجھتے تھے۔ اس طرح استنبول میں کئی سو اور اناطولیہ اور رومیلی[۵۵] میں بچوں کے ہزاروں مدرسے قائم ہو گئے تھے۔ یہ مدرسے چونکہ حکومت کی طرف سے بنائے ہوئے عمارت خانوں سے ملحق یا قریب ہوتے تھے، اس لیے ان عمارت خانوں سے طالب علموں کو روزانہ روٹی اور سالن بھی دیا جاتا تھا اور جمعرات کو پلاؤ اور زردہ دیا جاتا تھا۔ لیکن دوسرے لوگوں کے مدرسوں کے لیے یہ سہولتیں نہیں تھیں، لیکن روزینے ان مدرسوں میں بھی دیے جاتے تھے، اس کے علاوہ بعض دولت مندوں کی طرف سے سال میں ایک مرتبہ کپڑے بھی دیے جاتے تھے اور اس کے لیے وہ علیحدہ وقف قائم کر دیتے تھے۔

بادشاہوں کے اوقاف اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ایک خوجہ یعنی استاد اور ایک قلفہ یعنی نائب مدرس کا خرچ بھی ان سے پورا کیا جاتا تھا۔ جن مدرسوں میں بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی، ان میں طلبا ہی میں سے ایک ذہین طالب علم کو قلفہ چن لیا جاتا تھا۔ قلفہ کا کام بچوں کو پڑھانا، ان کا پچھلا سبق سننا اور مدرسے میں نظم و نسق قائم رکھنے میں استاد کی مدد کرنا ہوتا تھا۔ بعد میں بوّاب کے نام سے عملے میں ایک خادم کا اور اضافہ کر دیا گیا۔ خوجہ آفندی یعنی استاد کو پانچ آقچے اور قلفہ کو دو آقچے یومیہ مشاہرہ ملتا تھا۔ بعض مدرسوں میں استاد کو عمارت خانوں سے روزانہ کھانا بھی دیا جاتا تھا۔

---

[۵۴] عثمانی دور میں غریبوں کو کھانا کھلانے کے لیے جو عمارت تعمیر کی جاتی تھی، اس کو عمارت خانہ کہا جاتا تھا۔

[۵۵] ترکوں نے بازنطینیوں سے یورپ کا جو علاقہ لیا تھا اس کو رومیلی کا نام دیا تھا۔ عام طور پر یہ علاقہ شمالی یونان، جنوبی بلغاریہ، البانیہ اور یوگوسلاویہ کے جنوبی حصہ پر مشتمل تھا۔

مشہور سیاح اولیا چلبی[۵۷] نے اپنے سیاحت نامہ میں جہاں مسجدوں، مدرسوں اور دوسرے دینی اور علمی اداروں کا ذکر کیا ہے وہاں اس نے شہروں اور قصبوں کے مدارسِ صبیان کا بھی تذکرہ کیا ہے اور بہت سے مدرسوں کے ناموں اور ان میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد بھی لکھی ہے۔ وہ ان مدرسوں کو کبھی ابجد خانہ بھی کہتا ہے اور بعض مقامات پر ان مدرسوں کی کیفیت بھی لکھی ہے۔ مثلاً ترابزون کے بیان میں وہ لکھتا ہے:

"اور اندرون حصار میں ابوالفتح مکتب یعنی جامع مکتب اور خاتونیہ مکتب ہیں۔ یہ آخر الذکر مدرسہ جامع خاتونیہ کے مغربی جانب اینٹ اور پتھر کی بنی ہوئی شاندار عمارت ہے جس کا گنبد بڑا خوبصورت ہے۔ ان مدرسوں میں غریب بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ یتیم بچوں کو دن میں دو دفعہ کھانا اور عید اور بقرعید کے موقع پر لباس، ٹوپی اور رقم دی جاتی ہے۔ اسکندر پاشا مکتب بھی جو ۹۲۰ھ میں قائم ہوا تھا شہر کا مشہور مکتب ہے۔"

گیارھویں صدی ہجری کے شروع میں استنبول میں ایک ہزار چھ سو ترپن (۱۶۵۳) مدارسِ صبیان تھے جن کو معلم خانے بھی کہا جاتا تھا۔ یہ تعداد عثمان آفندی کی تاریخ جدید میں درج ہے۔ اولیا چلبی کے سیاحت نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں ان کی تعداد بارہ سو ننانوے تھی۔ مدرسوں کے نام عام طور پر ان کے بانیوں کے نام پر ہوتے تھے، جیسے فاتح، بایزید، سلیمیہ، حمیدیہ، والدہ سلطان، گلفام خاتون، غضنفر آغا اور یاقوت آغا وغیرہ۔

صبیان مدرسوں کا ایک خاص طرزِ تعمیر ہوتا تھا۔ ان میں بعض مدرسے ایسے تھے، جن کو اس دور کے منتخب معماروں نے تعمیر کیا تھا۔ مدرسے کا اندازِ تعمیر کم و بیش ایسا ہوتا تھا: پتھروں کی یک منزلہ یا دو منزلہ عمارت۔ بالائی حصے میں ایک کشادہ کمرہ، جس میں درس دیا جاتا تھا۔ اس کمرے کے اوپر گنبد ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ استاد اور خلیفہ کے بیٹھنے کا چھوٹا کمرہ ہوتا تھا۔ سلطان سلیم ثانی کے دور میں مشہور قزلر

---

[۵۷] اولیا چلبی (۱۶۱۱ تا ۱۶۸۲) مشہور ترک سیاح نے جسے ہم اسلامی دنیا کا آخری بڑا سیاح کہہ سکتے ہیں، جزیرہ نما بلقان، وسطی یورپ، روس، قفقاز، مغربی ایران، ترکی، عراق، شام، مصر، حبش، حجاز اور یمن کی سیاحت کی۔ اس کا سفرنامہ تقریباً پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

آغاسی یاقوت آغا نے ۱۱ دسمبر ۲، ۱۵ء کو منیسا میں جو مدرسہ صبیان بنوایا تھا وہ اس زمانے کے ضلعی مدرسوں کے فنِ تعمیر کا خوب صورت نمونہ تھا۔

مدرسوں میں صبح ہونے ہی پڑھائی شروع ہو جاتی تھی جو ظہر کے وقت تک جاری رہتی تھی اور پھر مختصر وقفے کے بعد عصر کی نماز پر ختم ہو جاتی تھی۔ بچے چند حصوں میں تقسیم ہوتے تھے اور ایک وقت میں ایک ایک حصے کو پڑھایا جاتا تھا، لیکن سب بچے اسی ایک بڑے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ بچے زمین پر فرش کے اوپر دو زانو بیٹھتے تھے اور ان کے آگے ایک لمبی میز رکھی ہوتی تھی جس پر وہ کتاب اور سیپارہ رکھتے تھے۔

بعض مدرسوں میں لڑکے اور لڑکیوں کو مخلوط تعلیم دی جاتی تھی۔ ایسی صورت میں درس خانے کے بڑے کمرے کے طرف لڑکیاں (جن کے سروں پر چھینٹ کے رومال بندھے ہوتے تھے) اور دوسری طرف ٹوپیاں پہنے ہوتے لڑکے بیٹھتے تھے۔ ایک دوسرے گوشے میں چھوٹے چھوٹے بچے قرآن حفظ کرتے تھے۔ درس خانے کے ایک نمایاں گوشے میں ایک چبوترے پر جس پر موٹا گدا یا لمبے بالوں والی بھیڑ کی کھال بچھی ہوتی تھی اور سامنے ایک میز ہوتی تھی، خواجہ آفندی (یعنی جناب استاد) بیٹھتے تھے۔ عام طور پر ان کی داڑھی گھنی اور آواز رعب دار ہوتی تھی اور وہ بچوں کو کڑی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن کبھی کبھی اونگھ بھی جاتے تھے۔

بچوں کے ان مدرسوں میں تعلیم بہت سخت ہوتی تھی جو بچوں کے مزاج سے موافقت نہیں رکھتی تھی۔ نظم وضبط کو قائم رکھنے کے لیے جسمانی سزا دی جاتی تھی، جس کی تائید مذہبی طور پر کی جاتی تھی۔ بچوں کے پاؤں فلقہ[۵] میں باندھے جاتے تھے اور ان کے کان کھینچے جاتے تھے۔ سر پر چھڑی مارنا، طمانچہ مارنا، گھنٹوں ایک پاؤں پر کھڑا رکھنا اور ایڑی کی کھال کاٹ کر اس میں نمک رکھنا وہ سزائیں تھیں جو ان مدرسوں میں دی

---

[۵] فلقہ (FALAKA) ایک طرح کا شکنجہ ہوتا تھا طالب علم کو لٹا کر اس میں پیر باندھ دیے جاتے تھے اور پھر تلووں پر ڈنڈے سے ضرب لگائی جاتی تھی۔ تنظیمات کے دور میں جب ترکی میں اصطلاحات ہوئیں تو فلقہ ترک ادیبوں کا دلچسپ موضوع بن گیا۔ احمد راسم نے اپنے زمانۂ طالب علمی کی سرگزشت فلقہ کے نام سے لکھی اور عمر سیف الدین کے ایک مشہور افسانہ کا عنوان فلقہ ہے، اور جس کتاب میں وہ افسانہ ہے اس کا نام بھی فلقہ رکھا گیا ہے۔

جاتی تھیں۔ پرانی کتابوں میں مکتب کی تعلیم کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے ڈنڈے کی ہمیشہ سفارش کی جاتی تھی اور ان کتابوں میں ڈنڈے کے اصلاحی اثرات اور صفات سے بحث کی جاتی تھی۔ لیکن لڑکیوں کو نہ تو فلقہ پر لٹایا جاتا تھا اور نہ ان کو ڈنڈے کی سزا دی جاتی تھی۔ ہاں ان کی ہتھیلیوں پر چھڑی ضرور ماری جاتی تھی۔

مدارس صبیان میں جو استاد مقرر کیے جاتے تھے ان کو شرفا، صاحب حیثیت اور نیک لوگوں میں سے منتخب کیا جاتا تھا۔ سلطان احمد سوم (۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء) کے دور میں ایک شخص عبداللطیف آفندی نے ایک کتاب میں ان سزاؤں کا ذکر کیا ہے جو مدارس صبیان میں دی جاتی تھیں۔

زیادہ قدیم مدرسوں میں کن اصولوں کے تحت تعلیم دی جاتی تھی، اس کے متعلق ہمیں واضح معلومات نہیں۔ لیکن آخری دور کے متعلق تحریری شہادتیں موجود ہیں کہ حروف تہجی کس طرح پڑھائے جاتے تھے اور ہجے کس طرح کرائے جاتے تھے۔ غالباً قدیم زمانے میں بھی ان ہی اصولوں پر عمل کیا جاتا ہوگا۔ سترھویں صدی کے وسط میں ایک معلم محمد آفندی نے نوحۃ العشاق نامی ایک منظوم کتاب لکھی تھی۔ اگرچہ اس کتاب کا موضوع عشقیہ ہے لیکن اس سے مکاتب صبیان کے بارے میں بعض دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حرف کو اس کی ہم شکل کسی چیز کے مشابہ بتایا جاتا تھا تاکہ بچہ اس کو آسانی سے پہچان سکے۔ مثلاً یہ کہ الف چھڑی کی طرح ہوتا ہے اور ب بھکاری کے کاسے کی طرح ہوتا ہے، ایسے کاسے کی طرح جس کے آمنے سامنے کے کنارے اٹھے ہوئے ہوں، ج کان کی طرح ہوتا ہے یا جس کا پیٹ پھٹا ہو اور د کبڑے کی کمر کی طرح ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح لفظوں کو اس انداز سے پڑھایا جاتا تھا، الف خالی ب کے نیچے ایک نقطہ، پ کے نیچے تین نقطے اور ج کے پیٹ میں ایک نقطہ۔ حروف شناسی کے لیے ابجد، ہوز یاد کرائی جاتی تھی۔

جب بچہ ہجے کرنے لگ جاتا تو اس کو قرآن شروع کرا دیا جاتا۔ قرآن پڑھانے کا آغاز آخری پارے عم سے کرایا جاتا تھا، پھر بالترتیب تبارک الذی اور قد سمع اللہ۔ اس کے بعد پورا قرآن پڑھایا جاتا تھا۔

زیر، زبر اور پیش سے آوازیں سکھائی جاتی تھی۔ مثلاً اس طرح: الف زبر آ، الف زیر اے اور الف پیش او۔

قرآن کے ساتھ دینی مسائل بھی پڑھائے جاتے اور قرآن کی صحیح تلاوت کے لیے علم تجوید بھی

پڑھایا جاتا تھا۔ آخری زمانے میں اس موضوع پر سب سے اچھی کتاب "قرہ باش تجوید" تھی۔

قرآن ختم کرانے کے بعد اس کو کئی مرتبہ دھرایا جاتا تھا۔ طلبا کو مشق کے لیے تحریری کام دیا جاتا تھا۔ خوش خطی بھی سکھائی جاتی تھی اور جن طلبا میں صلاحیت ہوتی تھی ان کو خط ثلث، خط رقعہ[۵۵]، خطِ دیوانی اور خطِ تعلیق وغیرہ بھی سکھائے جاتے تھے۔

(ترجمہ از ماہنامہ "ترک کلتورو" انقرہ جولائی ۱۹۶۵ء)
TÜRK KÜLTÜRÜ

---

۵۵ خط رقعہ ایسے خط کو کہا جاتا تھا جو زود نویسی کے لیے استعمال ہوتا تھا، اس میں دائرے اور نقطے وغیرہ حذف کر دیے جاتے تھے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے یہاں خط شکستہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ رقعہ نویسی میں کام کرتا تھا، اس لیے اس کو خط رقعہ کہا جاتا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۵۴) غیر مطبوعہ ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے سابق لائبریرین جناب عبدالرحیم نے ان مخطوطات کی فہرست سازی کی مختصر تاریخ ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

۳۱ر جولائی ـــ "پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مخطوطات کا شعبہ ۱۹۲۰ء کو قائم ہوا۔ نومبر ۱۹۴۱ء تک لائبریری میں ۲۳۷۱ (اس تعداد میں سنسکرت کے مخطوطات شامل نہیں) قلمی نسخے جمع کیے گئے۔ مخطوطات کی فہرست نگاری کا کام، مرحوم ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی نگرانی میں، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے شروع کیا۔ ان کی مرتبہ پہلی جلد یونیورسٹی نے ۱۹۴۲ میں شائع کی۔ جس میں تاریخ سے متعلق ۱۰۸ فارسی مخطوطات کی تفصیلات مندرج ہیں۔ اور دوسری جلد ۱۹۴۸ میں شائع ہوئی جو فارسی نظم کے ۱۱۷ مخطوطات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد فہرست نگاری کے کام پر مختلف اوقات میں، مرحوم مولوی عبداللہ الوالخیر، جناب فضل اللہ فاروقی، جناب ذوالقرنین اور مولوی رشید احمد مامور رہے۔"

مولانا کی ذات اقبالیات کے سلسلے میں ایک بہترین دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی۔ افسوس انھوں نے اقبال سے اپنی ملاقاتوں اور صحبتوں کو قلم بند نہیں کیا۔ کاش وہ ایسا کر گئے ہوتے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

پروفیسر مولانا علم الدین سالک
مرتب: پروفیسر احسان الٰہی سالک

مُراد بیگم عُرف مُغلانی بیگم

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب کے صوبے میں بہت سی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ناموری حاصل کر کے پنجاب کے نام کو چار چاند لگا دیے۔ ان ہی نامور ہستیوں میں ایک مراد بیگم عرف "مغلانی بیگم" ہے۔ اس نے نسوانی کمزوریوں اور مجبوریوں کے باوجود سیاست، سپاہ گری، تدبر اور حکومت کی گرتی ہوئی دیواروں کو کچھ مدت کے لیے سنبھالا دیا اور انھیں گرنے اور منہدم ہونے سے بچا لیا۔

یہ نامور خاتون عبدالصمد خان، ناظم پنجاب (۱۷۱۳ - ۲۶ء) کی نواسی اور دُردانہ بیگم خواہر نواب زکریا خان ناظم پنجاب (۱۷۲۶ - ۴۵ء) اور جانی خان نظامت پنجاب کے ایک زبردست رکن کی بیٹی تھی۔ اس کا خاوند معین الملک عرف میر منو ناظم پنجاب (۱۷۴۸ - ۵۳ء) تھا جو دہلی کے وکیل السلطنت نواب قمر الدین خان کا بیٹا تھا۔ نواب قمر الدین خان وکالت اور نقابت کے عہدۂ جلیلہ پر چوبیس برس تک (۱۷۲۴ - ۴۸ء) فائز رہا۔

جب وہ پیدا ہوئی تو خاندان والوں نے اس کا نام ثریا بیگم رکھا اور شادی کے بعد سسرال والوں نے اُسے مراد بیگم کے نام سے پکارا۔ مگر تاریخ کے اوراق مغلانی بیگم کے نام سے شہرت دیتے ہیں، اور آج بھی وہ مورخوں کے وسیع حلقے میں اسی نام سے یاد کی جاتی ہے۔

اس کی زندگی کے ابتدائی واقعات کسی مورخ نے قلم بند نہیں کیے۔ کیونکہ ہمارے مورخوں کی عام روش یہ ہے کہ ان کی تاریخ درباری سازشوں کے واقعات سے بھرپور ہوتی ہے۔ وہ بادشاہوں کی ذات کو مرکز بنا کر صرف انہی واقعات کو بیان کرتے ہیں، جن میں ان کے جاہ و جلال اور عظمت و شوکت کا افسانہ مضمر ہوتا ہے۔ اس لیے عام تحریکات کا ذکر بہت کم ہوتا ہے اور یہ بھی کسے علم تھا کہ آج کی ایک ناتواں اور بے کس لڑکی کل کلاں تاریخ میں اتنا اہم کردار ادا کرے گی کہ تین چار برس تک کی تاریخ اور تاریخی واقعات اسی کی نقل و حرکت کا نام ہوگا۔ جہاں اس کی ذات میں سکون و جمود پیدا ہوگا وہاں واقعات

کے دھارے خود بخود رک جائیں گے۔

اس اہم اور نازک دور کے واقعات پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اگرچہ وہ غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی مالک تھی پھر بھی ان جوہروں کو چمکانے اور بروئے کار لانے کے لیے اعلی التعلیم و تربیت کی ضرورت تھی جو اُسے حاصل ہوئی، اور اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس وقت ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج تھا جس میں تربیت کا پہلو غالب تھا اور تعلیم اصلی معنوں میں تعلیم تھی۔ تعلیم پانے کے بعد انسان اپنی فطری صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ ذاتی جوہر دبائے نہیں جاتے تھے بلکہ اُن کو جلا دے کر ان میں مزید چمک دمک پیدا کر دی جاتی تھی۔ اسی واسطے ہم دیکھتے ہیں کہ متوسط بلکہ طبقہ غربا کے لوگ ترقی کرتے کرتے عروج و اقبال کے انتہائی زینے تک جا پہنچتے تھے۔ یہ اس وقت کی تعلیم اور تربیت کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ نیز تعلیم و تربیت کے مواقع امیر و غریب، شاہ و گدا کے لیے یکساں موجود تھے۔ ہر شخص خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ان سے متمتع ہو سکتا تھا۔ کسی جماعت و فریق پر اعلی التعلیم کے دروازے محض اس لیے بند نہ ہوتے تھے کہ اس کے معاشی حالات خراب اور اقتصادی ذرائع محدود ہیں۔ تعلیم مفت ہوتی تھی۔ اس لیے ہر شخص خاطر خواہ تعلیم حاصل کر لیتا تھا۔

مغلانی بیگم نے ابتدائی ایام حیات میں اس وقت کے رسم و رواج کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ اُسے وہ تمام فنون سکھائے گئے جو اس وقت طبقہ شرفا میں متداول اور رائج تھے، کیونکہ ہر باپ اور خاندان کا بزرگ اپنا فرض خیال کرتا تھا کہ اس کے خاندان کے تمام افراد ان خوبیوں سے متصف ہوں جو انھیں ادب و اخلاق اور سیرت و کردار میں دوسروں سے ممتاز کر سکیں۔ لڑکیوں کے معاملے میں خاص احتیاط سے کام لیا جاتا تھا۔ کیونکہ آئندہ نسلوں کی فلاح اور خاندانوں کی تعمیر ان ہی کے دم سے وابستہ ہوتی ہے۔

مغلانی بیگم کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اس بات کی رہنمائی کرتا ہے کہ اُسے کس قسم کی تعلیم و تربیت دی گئی تھی اور اس نے کس طرح اپنے آپ کو ان کے اعتماد کا اہل ثابت کیا۔ اس کی شادی کب ہوئی اور کس طرح سے ہوئی، اس کے متعلق ہمیں اس دور کی تاریخ سے کوئی اطلاع میسر نہیں آتی ہے۔

معین الملک ایک بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ اس نے زندگی کی تگ و دو میں قدم رکھتے ہی اپنے خاندانی وقار کو چار چاند لگا دیے۔ اس کا باپ سلطنتِ تیموریہ کا وزیر اعظم تھا، اس لیے سلطنت کی بقا و حفاظت کی ذمہ داری سب سے زیادہ اسی پر عائد ہوتی تھی۔ گو نادر شاہ کے حملے نے تیموریوں کی

عظیم الشان سلطنت کے وقار پر کاری ضرب لگا کر اس کی ساکھ بگاڑ دی تھی اور اس کے حریف جو اب تک اس کے جاہ و جلال سے دبکے بیٹھے تھے اب للچائی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے تھے۔ مگر یہ گرتی ہوئی عمارت کچھ عرصے کے لیے اور تھم جاتی اگر دہلی کے تخت پر کوئی قابل، مستقل مزاج، مدبر اور جفاکش شہنشاہ متمکن ہوتا۔ لیکن اس وقت تیموریوں کا تخت محمد شاہ کے قدم چوم رہا تھا۔ اس کی آرام طلبی اور عیش پسندی کی وجہ سے چاروں طرف سے خودسری کے آثار نمایاں ہوئے اور سلطنت ایک عظیم الشان خطرے میں گھر گئی۔ نادر شاہ کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنی حوصلہ مندی کی جولانگاہ کے لیے تاکا اور بار بار حملے کر کے اس کی رہی سہی ساکھ بھی مٹا دی۔ اس کے علاوہ پنجاب میں سکھوں کی شورش روز بروز بڑھ رہی تھی، ان کی غارت گری کی وجہ سے پنجاب تباہی اور بربادی کے سر پنجے میں گرفتار تھا۔ ان حالات میں بیرونی حملے کی مدافعت کے ساتھ ساتھ اندرونی دشمنوں کا قلع قمع کرنا بھی لازمی تھا اور پنجاب کے لیے ایک ایسے ناظم کی ضرورت تھی جو ان ہر دو خطرات پر بیک وقت قابو پا سکے۔

محمد شاہ کے آخری ایام حکومت میں قمر الدین خان وزیر اعظم نے بہت حد تک سلطنت دہلی کی شیرازہ بندی کی کوشش کی اور اس کے وقار اور اقتدار کو بحال کرنے کے لیے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ ۱۷۴۸ء میں سرہند کے مقام پر اس نے جان سے ہاتھ دھو کر احمد شاہ ابدالی کو شکست دی۔ اس شکست میں اس کے خلف الرشید معین الملک عرف میر منو کی شجاعت و بسالت کو بہت دخل تھا۔ شہنشاہ دہلی کی مایوس نگاہوں کو اس کی ذات میں امید کی سنہری کرن نظر آئی۔ اس لیے اس نے معین الملک کا پنجاب کی نظامت کے لیے انتخاب کیا تاکہ وہ سکھوں پر قابو پا کر داخلی شورش کو ختم کرے اور اس کے ساتھ ہی افغانی حملہ آوروں کو پنجاب سے آگے بڑھنے سے روک رہے۔ وہ بہادر، بے باک، بلند ہمت اور متحمل مزاج تھا۔ یہی اوصاف اسے ہر معرکے میں کامیاب کر سکتے تھے۔ محمد شاہ نے جو اندازہ اس کے متعلق لگایا تھا وہ درست نکلا، اور غالباً سارے ایام حکومت میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے دوراندیشی اور مدبر کا ثبوت دیا۔ اور معین الملک جیسے سپاہی آدمی کو سلطنت کی سرحد پر نامزد کر کے بہت حد تک ملک کو غیر ملکی حملہ آوروں کی دست برد سے بچا لیا۔ مگر افسوس کہ معین الملک کی نظامت کی مدت بہت ہی قلیل ثابت ہوئی۔ یعنی ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۳ء تک زمام اختیار اس کے قبضے میں رہی۔ اس تھوڑے سے

عرصے میں بھی دو مرتبہ احمد شاہ پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ پہلا حملہ ۱۷۴۹ء میں اور دوسرا ۱۷۵۱ء میں ہوا۔ ان ہر دو مواقع پر جبکہ سلطنت کا وقار اور اقتدار خطرے میں تھا اور ہر خیر خواہ نتائج کے سلسلے میں ہراساں اور پریشان تھا، اور جب حکومت کے مفاد اور سلطنت کے استحکام کے نام پر ملک کے ہر قسم کے ذرائع معین الملک کے اختیار میں دے دینے چاہئیں تھے تاکہ وہ دل جمعی کے ساتھ ابدالی کے حملوں کا سدِ باب کرے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خود غرض اور مطلب پرست امیروں نے ایسا نہیں ہونے دیا میر منو کو دونوں مرتبہ تنِ تنہا مرکز کی اعانت کے بغیر اپنی قوت کے بھروسے پر ہی اس زبردست حریف کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسرا حملہ نہایت خطرناک تھا۔ ابدالی نے چھ مہینے تک لاہور کو محصور رکھا۔ تمام ذرائع رسل و رسائل کاٹ دیے۔ رسد کی راہیں بند کر دیں۔ آخر مجبور ہو کر معین الملک (میر منو) کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ابدالی اور میر منو کی ملاقات شالامار باغ میں ہوئی جہاں اور باتوں کے علاوہ جب ابدالی نے فاتحانہ انداز سے معین الملک سے سوال کیا کہ اگر میں شکست کھا کر اس طرح تمہارے سامنے پیش ہوتا تو تم کیا کرتے۔ میر منو نے نڈر ہو کر جواب دیا کہ میں تمہارا سر کاٹ کر شہنشاہ دہلی کے حضور میں بطور نذر پیش کرتا۔ ابدالی اس غیر متوقع جواب سے کھسیانہ سا ہو کر بولا کہ اس وقت تم مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟ معین الملک نے بلا جھجک کہا کہ اگر قصاب ہو تو سر حاضر ہے، اسے کاٹ لو۔ اور اگر بادشاہ ہو تو بادشاہوں جیسا سلوک کرو۔ ابدالی اس کی حاضر جوابی، دلیری اور صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوا اور اس کی شجاعت کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے نہ صرف معین الملک کو آزاد کر دیا بلکہ اسے نظامتِ پنجاب پر بحال کر کے خود افغانستان چلا گیا۔

اس طرح پنجاب کے اس ناظم کی بدولت تمام ہندوستان ایک زبردست حملہ آور کی مسلسل یورشوں سے محفوظ ہو گیا۔ اب اس نے داخلی معاملات کی طرف توجہ دی۔ اس وقت پنجاب میں سکھ بے حد تکلیف کا موجب بنے ہوئے تھے۔ وہ گروہ در گروہ ادھر اُدھر پھرتے تھے۔ لوٹ مار اور غارت کرتے اور مخلوقِ خدا کو تنگ کرتے تھے۔ اہلِ پنجاب ان کی وجہ سے سخت پریشانی میں مبتلا تھے اور ایک عذابِ الیم ان پر مسلط تھا اور صوبے بھر کا امن و امان مختل ہو چکا تھا۔ رعایا ہر وقت خوف و ہراس میں مبتلا رہتی۔ معین الملک نے اس غارت گری کو روکنے کا تہیہ کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنے عزائم میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ اس قسم کے تمام گروہوں اور جماعتوں کی بیخ کنی

اور امن سوز کارروائیوں کو ضرور ختم کر دیتا اور پنجاب کو گہوارۂ امن و امان بنا کر اس کے لیے ترقی اور فلاح کی راہیں کھول دیتا۔

اس عالی حوصلہ ناظم کی وفات عجیب و غریب حالات میں واقع ہوئی اور یہ معمہ اب تک حل نہیں ہو سکا کہ اس کی موت کا موجب کیا تھا۔ آیا وہ کسی سازش کا شکار ہوا تھا اور اس سازش میں کون کون شامل تھے۔ یا کسی دشمن نے اُسے زہر دے دیا، اور وہ کون سا ایسا دشمن تھا جس نے ذاتی انتقام کو ملک اور صوبے کے مفاد پر ترجیح دی اور پنجاب کو ایک لائق، مدبر اور منتظم کی خدمات سے محروم کر دیا۔ اس کی وفات کی جو تفصیلات معاصر اور قریب العہد مورخین نے پیش کی ہیں، ان سے مغلانی بیگم کی دانائی اور تدبر کا ایک ایسا پہلو بخوبی نمایاں ہوتا ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک باحوصلہ خاتون جب پیچیدہ اور الجھے ہوئے حالات کی عقدہ کشائی کے لیے کمربستہ ہوتی ہے تو اس کا ناخنِ تدبیر کس طرح کام کرتا ہے اور اس کی توجہ ذہنی سے نہایت خطرناک حالات کیسے درست ہو جاتے ہیں۔ فتنہ و فساد، بغاوت و شورش کا بحرِ متلاطم کس طرح سکون پذیر ہو جاتا ہے۔

نواب معین الملک لاہور سے آٹھ کوس پر دریائے راوی کے کنارے موضع تلک پور میں کچھ عرصے سے خیمہ زن تھا۔ یہ محرم کا مہینہ تھا۔ ایک دن نواب نے شکار کا ارادہ کیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا۔ شکار پر روانہ ہونے سے پیشتر اس نے خواجہ مرزا خان اور دوسرے فوجی جمعداروں کو سکھوں کا تعاقب کرنے کے لیے روانہ کیا۔ شکار سے واپس آنے پر اس نے اپنی تعمیر کردہ گڑھی میں جو موضع آوان (اعوان) میں تھی، پڑاؤ کیا۔ خاصہ نوش کیا، قیلولہ کیا۔ سورج کو آغوشِ شب میں جانے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے کہ وہ خواب سے بیدار ہوا اور اس وقت ایسا اتفاق ہوا کہ اس کا بازوبند ٹوٹ گیا۔ اس میں نہایت قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے، وہ سب فرش پر گر پڑے۔ مسکین اس کا غلام اس موقع پر موجود تھا۔ اس نے یہ بات نواب کے گوش گزار کی۔ نواب نے ایک ایک کر کے تمام نگینے اُٹھائے اور پاس کھڑے ہوئے ایک افسر کے حوالے کیے۔ پھر وہ بیت الراحت (غسل خانے) گیا۔ غسل کیا۔ نمازِ ظہر ادا کی۔ اس کے بعد سبز ولایتی ساٹن کا لباس زیب تن کیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا۔ گڑھی سے باہر آیا۔ اس وقت خواجہ مرزا حاضر ہوا اور اپنی کارگزاری کی کیفیت پیش کی۔ معین الملک نے اس کی بات کو بڑے غور سے سنا۔ اس کے بعد اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑایا تاکہ وہ اپنی سپاہ کو جا ملے، جو وہاں سے کچھ فاصلے پر خیمہ زن تھی۔ اس نقل و حرکت کے دوران میں

یکایک اس کی طبیعت خراب ہوئی اور لحظہ بہ لحظہ بگڑتی ہی گئی اور آناً فاناً وہ خطرناک طور سے بیمار ہوگیا۔ اطبا کو طلب کیا گیا۔ انھوں نے پوری توجہ سے علاج شروع کیا۔ مگر ان کی حذاقت اور تجربہ کسی کام نہ آیا۔ نواب معین الملک سب کو اپنے گرد روتے اور چیختے چلاتے چھوڑ کر آدھی رات کے بعد ابدی نیند سو گیا۔ اس حادثے کی اطلاع جب فوج کو ملی تو تمام فوج میں کہرام مچ گیا اور صف ماتم بچھ گئی، ہر طرف واویلا اور واحسرتا کا شور برپا ہوگیا۔

مغلانی بیگم اس وقت خاوند کے ہمراہ تھی۔ اس نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اس صدمۂ جانکاہ میں ہوش و حواس بجا رکھے اور ان خطرناک واقعات کے پیش نظر جو ایسے حالات میں ناگزیر ہوتے ہیں اس نے اختیار اپنے ہاتھ میں لیے اور اپنے خاوند کی نعش چند معتبر بندوں کے سپرد کی اور خود سپاہ کو تنخواہ تقسیم کرنے میں مصروف ہوگئی۔ تین دن اور تین راتیں وہ اس کام میں مشغول رہی۔ لالہ خوشونت رائے کا بیان ہے کہ "سپاہ اس (معین الملک) کے خورد سال لڑکے اور اس کی بیوی سے باغی ہوگئی تھی اور اپنی تنخواہ کی رقم مانگتی تھی۔ ان کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ وہ اس حد تک شورہ پشت تھے کہ انھوں نے مغلانی بیگم کی مزاحمت نواب کی نعش کے دفن کرنے میں بھی کی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ تنخواہ کا حساب پہلے بے باق اور نواب کے تجہیز و تکفین کا انتظام بعد میں ہو۔ اس طرح دو دن تک جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر مغلانی بیگم نے اپنے ذاتی خزانے سے سپاہ میں تین لاکھ روپیہ تقسیم کیا۔ اور پھر اپنے خاوند کی نعش کو گھوڑا نخاس کے پاس نواب عبدالصمد کے داماد عبدالرحیم کی عمارت میں دفن کیا۔"[۵] یہ لالہ خوشونت رائے کا بیان ہے مگر دوسرے مورخ کہتے ہیں کہ نواب کی وفات کے چوتھے روز نواب بھکاری خان نے کہا کہ وہ اپنے آقا کی لاش دہلی لے جا کر دفن کرنا چاہتے ہیں مگر بیگم مصر تھی کہ اسے لاہور میں دفن کیا جائے۔ اس پر دونوں میں شدید اختلاف پیدا ہوا۔ نواب بھکاری خان نے پانچ سو سپاہی لاش کی حفاظت کے لیے مقرر کیے اور خود اس نے علم بغاوت بلند کیا۔ مغلانی بیگم نے اس کے رویے پر نہایت تعجب اور حیرت کا اظہار کیا۔ مگر اوسان قائم رکھے اور اپنے تیوروں سے خوف و ہراس کا شائبہ تک ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس نے تمام سرداروں کو اپنے ہاں طلب کیا اور سب واقعات ان کے سامنے

---

[۵] تاریخ پنجاب از لالہ خوشونت رائے مخطوطہ پنجاب پبلک لائبریری نمبر ۸۸

رکھے۔ ہندوستانی سرداروں نے بیگم کے بیان سے متاثر ہو کر سر تسلیم خم کر دیا۔ مگر مغل سردار ابھی تک بھکاری خان کے زیر اثر تھے۔ وہ بھکاری خان کے ہم نوا تھے اور اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ مغلانی بیگم بڑی مستقل مزاج اور مستعد عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ زبانی باتوں سے کام نکلنا مشکل ہے۔ اس نے قاسم خان کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ مغل سرداروں کا اعتماد ہر قیمت پر حاصل کرے۔ اس نے بیگم کو یقین دلایا کہ وہ تعمیل ارشاد میں پوری کوشش کرے گا۔ بیگم سے رخصت ہوتے وقت اس نے کہا کہ تمام باغی سرداروں کو اعزاز و اکرام کا وعدہ دے کر واپس لاتا ہوں مگر میری غیر حاضری میں لاش کی حفاظت کی جائے تاکہ فریق مخالف لاش کو لے کر دہلی نہ چلا جائے۔ مغلانی بیگم نے مسکین اور ان کے ساتھ ایک اور سردار کو مقرر کیا کہ لاش کی حفاظت کریں۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچ گئے تو بھکاری خان کے ملازم لاش چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گئے۔ ادھر قاسم خان کی سعی مشکور ہوئی اور مغل سرداروں کو بہلا پھسلا کر اپنے ہمراہ بیگم کی خدمت میں لے آیا۔ انھوں نے بیگم کے سامنے سر جھکا دیا اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ مگر اس کشمکش کے دوران خواجہ مرزا اپنے تین سو سپاہیوں کے ہمراہ بھکاری خان کے ساتھ ہی رہا۔ اب بیگم نعش لے کر لاہور روانہ ہوئی [۵۲]

میر منو (معین الملک) کو شہید گنج کے پاس دفن کیا گیا، جہاں اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ سکھ کے ایام حکومت میں سکھوں نے مذہبی دیوانگی کے تحت اس کی قبر کو مسمار کر دیا۔ قبر کھود دی، اس کی ہڈیوں کو نکالا اور ادھر ادھر پھینک دیا [۵۳]

مغلانی بیگم کے عروج کی ابتدا

قاعدہ اور دستور کے مطابق نظامت کے تقرر کے لیے بادشاہ کی سند کا ہونا لازمی امر تھا، اس لیے نواب معین الملک کی وفات کی اطلاع دہلی بھیج دی گئی۔ احمد شاہ نے خاندانی خدمات کی بنا پر معین الملک کے تین سال کے لڑکے (جس کے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی تھی) محمود خان کو پنجاب اور ملتان کی نیابت کا عہدہ عطا کیا۔

---

۵۲ خزانہ عامرہ، ص ۹۷، جادو ناتھ سرکار جلد اول، ص ۳۴۴ ۔ احوال آدینہ بیگ، ورق ۴۳ ۔ تاریخ احمد ص ۹ ۔ تاریخ سلاطین افغانان، ص ۱۵۶ ۔ خوشونت رائے، ص ۸۸ ۔ فرخ بخش ۳۳ ۔

۵۳ لاہور گزیٹیر، ص ۲۸ ۔ ایڈیشن ۱۸۸۳ء

میر جمال الدین خان، سندِ خلعت، جواہرات اور دیگر انعامات لے کر لاہور پہنچا۔ دیوانِ خاص میں دربار ہوا۔ جہاں تقرر کی تمام رسوم باقاعدہ ادا ہوئیں اور منعم کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ گویا انتظامی امور اس کے قبضۂ اختیار میں تھے۔ لیکن اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو تمام قوت و شوکت کا مرکز مغلانی بیگم کی ذات تھی۔ وہ دونوں صوبوں کی مختارِ مطلق تھی، جو چاہتی کرتی۔ کسی امیر یا فوجی سردار کو دَم مارنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ایک یورپی سیاح بیرن ہیگل دہلی اور پنجاب کے حالات سے متاثر ہو کر لکھتا ہے کہ :

" دہلی دربار میں ملکی معاملات کی ابتری کا یہ صحیح ثبوت ہے کہ ان مصائب و مشکلات کے ایام میں خورد سال بچوں اور مستورات کو اہم مقامات کی نظامت کے لیے نامزد کیا جاتا ہے "[۵۴]

دہلی سے سند لے لینا کافی نہ تھا۔ پنجاب درحقیقت ابدالی کے ماتحت تھا۔ تیموریوں کا تعلق برائے نام ہی تھا، اس لیے مغلانی بیگم جانتی تھی کہ جب تک ابدالی کی جانب سے سند عطا نہ ہوگی اس وقت تک نہ وہ خود محفوظ ہے اور نہ اس کی اولاد کے حقوق محفوظ ہیں، اس لیے اس نے کوشش شروع کی کہ اُسے دربارِ قندھار سے نظامت پنجاب کی سند مل جائے۔ بیگم نے منعم خان کو اپنا رازدار بنایا۔ وہ بھی اس حقیقت سے واقف تھا کہ اس کا عہدہ بھی اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک ابدالی اس سے تعرض نہیں کرتا ہے۔ اس لیے بہتر اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ وہ بیگم کے ساتھ مل کر کوشش کرے اور اگر کامیابی حاصل ہوگئی تو پھر اُسے کوئی بھی موجودہ عہدے سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ اس فیصلے کے بعد انھوں نے جہان خان ناظم پشاور سے درخواست کی کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاکر انھیں پنجاب و ملتان کی نظامت دلوا دے۔ خان موصوف نے وعدہ کیا اور دربارِ قندھار سے سلسلۂ جنبانی شروع کیا، جو بہت جلد بار آور ثابت ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے امین خان کو ناظم اور منعم خان کو اس کا نائب مقرر کیا۔ اس موقع پر بے حد خوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا۔ شہر میں آئینہ بندی کی گئی اور جشنِ عظیم منعقد ہوا۔ یہ واقعہ جنوری ۱۷۵۴ء میں پیش آیا۔[۵۵]

(باقی آئندہ)

---

۵۴ بیرن ہیگل کا سفرنامہ، ص ۲۶۵ ـــ سرکار، ۱، ص ۳۲۹۔

۵۵ خزانۂ عامرہ، ص ۹۸ ـــ تاریخ شاہ عالم، ص ۵

پروفیسر اختر راہی

ایک اقبال شناس۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا ابوالحسن علی ندوی، جو علمی حلقوں میں علی میاں کے مختصر نام سے معروف ہیں، ۶ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) کو تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی پیدا ہوئے۔ ان کا نسبی تعلق شہید بالاکوٹ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادے سے ہے۔ ان کے والدِ ماجد سید عبدالحی مرحوم سے اُردو ادب کا ہر طالب علم "گلِ رعنا" کی نسبت سے اور عربی داں حلقہ "نزہت الخواطر" کے حوالے سے متعارف ہے۔

علی میاں کی عمر نو سال کے لگ بھگ تھی کہ والدِ ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کی پرورش اور تربیت بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی ناظم ندوۃ العلماء کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم سے استفادہ کیا اور قرآنِ مجید کا خصوصی مطالعہ مولانا احمد علی لاہوری کے حلقۂ درس میں کیا۔

۱۹۳۴ء میں ندوۃ العلماء میں مدرس مقرر ہوئے اور آج کل "ناظم" کی حیثیت سے اپنی مادرِ علمی کی خدمت کر رہے ہیں۔ مولانا علی میاں کہنہ مشق ادیب، باشعور مؤرخ اور متبحر عالمِ دین ہیں۔ ان کے قلم سے بیسیوں کتابیں نکل چکی ہیں۔ ان کی عربی کتب عالمِ عرب میں زبان و بیان اور فکر و فلسفہ ہر دو اعتبار وقیع سمجھی جاتی ہیں۔ تاریخ دعوت و عزیمت، سیرت سید احمد شہید، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، قادیانیت (مطالعہ و جائزہ)، ارکانِ اربعہ، پرانے چراغ اور نقوشِ اقبال ان کی چند اہم اور معروف تصنیفات ہیں۔

مولانا علی میاں علمائے سلف کا زندہ نمونہ ہیں۔ وہ خلیق، ملنسار اور اپنے علم و فضل کو سادگی کی ردا سے چھپائے ہوئے ہیں۔ ممتاز اقبال شناس یوسف حسین خان مرحوم مؤلف "روحِ اقبال" کے الفاظ میں "اس زمانے میں علما کی آبرو ہیں۔"[1]

---

[1] یادوں کی دنیا، ص ۳۶۸

علامہ اقبال سے دلچسپی

علامہ اقبال سے مولانا کی دلچسپی سنِ شعور سے ہے اور علامہ کے افکار سے وہ بہت متاثر ہیں ۔ لکھتے ہیں :

"زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا جتنا علامہ اقبال کے کلام کا ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان خیالات اور تمناؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست ہو چکی ہیں"[۵۲]

علی میاں ابھی زیرِ تعلیم تھے کہ علامہ کی بعض منظومات کا عربی نثر میں ترجمہ شروع کیا ۔

علامہ اقبال سے ملاقاتیں

۱۹۲۹ء میں ان کی عمر تقریباً ۱۵ سال تھی اور لاہور میں بسلسلۂ تعلیم مقیم تھے ۔ اُن دنوں اورینٹل کالج میں ان کے پھوپھا مولانا سید طلحہ (م ۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء) مدرس تھے ۔ مولانا سید طلحہ نے علی میاں کو لاہور کی ممتاز شخصیات سے ملایا ۔ جون ۱۹۲۹ء میں پہلی بار علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ علامہ سے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ۔ "یہ مصنفِ گُلِ رعنا کے فرزند ہیں اور انھوں نے آپ کی بعض نظموں کا عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے"[۵۳]

اس مجلس میں علی میاں نے علامہ کو ان کی نظم "چاند" کا عربی ترجمہ دکھایا ۔ علامہ نے اسے دیکھ کر ان سے بعض عرب شعراء کے متعلق کچھ سوالات کیے جن سے ان کی معلومات کا اندازہ مقصود تھا ۔[۵۴]

دوسری اور آخری بار علامہ سے ۲۲ نومبر ۱۹۳۷ء کو ملاقات ہوئی ۔ مولانا سید محمد طلحہ ان کے ساتھ تھے[۵۵] اس یادگار ملاقات کی روداد علی میاں نے "عارفِ ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" کے زیرِ عنوان لکھی جو بعد میں "نقوشِ اقبال" کے دیباچے میں شامل کر لی گئی ۔ مولانا علی میاں لکھتے ہیں :

"اس صحبت میں ہر طرح کے موضوعات زیرِ بحث آتے رہے ۔ سلسلۂ گفتگو میں شعرِ جاہلیت کا ذکر آیا تو اقبال نے اس کی صداقت و واقعیت، اس کے جوش و خروش کا پسندیدگی کے ساتھ ذکر کیا اور حماسہ کے بعض اشعار پڑھے ۔

---

۵۲ ماہنامہ "الحق" (اکوڑہ خٹک) شمارہ مئی ۱۹۷۲ء ۔ ص ۴۴

۵۳ پرانے چراغ، ص ۲۴۱ — ۵۴ ایضاً — نقوشِ اقبال، ص ۱۰۴

وہ کہنے لگے کہ اسلام اپنے پیروؤں میں عملیت اور حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے اور ادھر آج کی سائنس بھی اپنی حقیقت پسندی اور تخیلات سے گریز میں اسلام کے قریب نظر آتی ہے۔ اسلام کی دو صدیوں میں مسلمانوں میں یہ روح زندہ رہی جس کے نتیجے میں وہ عقیدہ و عمل، سیرت و اخلاق کے جادۂ استوار پر گامزن رہے لیکن یونانی فلسفۂ الٰہیات نے مشرق کو مردِ بیمار اور بیکار بنا دیا ـــــ یورپ کی نشاۃ ثانیہ بھی اسی وقت ہوئی جب اس نے اپنے کندھوں سے فلسفہ مابعد الطبیعات کا جوا اتار پھینکا اور مفید نتیجہ خیز علوم کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس عہد میں وہ مسائل پیدا ہونے لگے جنھوں نے یورپ کو بھی رجعت پسندی کی لائن پر ڈال دیا۔ انھوں نے کہا کہ عربی دماغ اسلام کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا لیکن عجمی تخیلات نے اسلام پر وہی ظلم کیا جو کلیسا نے یورپ پر کیا تھا۔ مجموعی طور پر آریائی فکر نے دونوں مذہبوں کو کم و بیش اپنی گرفت میں لے لیا۔ آپ نے تصوف کے ذکر میں بعض صوفیا کے فکری غلو پر تنقید کی اور وجد و سماع کے بارے میں کہنے لگے کہ صحابۂ کرام کو بجائے ان خیال آرائیوں کے شہسواری اور جاں سپاری میں طرب و اہتزاز اور راحت و مسرت محسوس ہوتی تھی۔

ہندوستان میں اسلام کی تجدید و احیا کی بات نکلی تو شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ دہلوی، سلطان محی الدین عالمگیر کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جد و جہد نہ ہوتی تو ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ اسلام کو نگل جاتا ـــــ پاکستان[۵۵] کے بارے میں فرمایا کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب و تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین و تہذیب حکومت و شوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں، اس لیے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے اور یہی اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے۔ ضمناً انھوں نے اسلام کے نظامِ زکوٰۃ اور بیت المال کا بھی ذکر کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں فرمایا کہ میں نے بعض مسلم والیانِ ریاست و حکومت کو غیر مسلموں میں تبلیغ کی طرف توجہ دلائی ـــــ اور مسلمانوں میں بھی دعوت کے کام پر زور دیا۔ اور عربی زبان کی ترقی اور ایک عالمی بنک کے قیام کے بارے میں بھی بات چیت کی . . . میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے معاملات کی وکالت کے لیے ایک بلند پایہ انگریزی اخبار بھی ضروری ہے جس سے ملت کی آواز میں طاقت اور اثر پیدا ہو لیکن افسوس ہے کہ مسلم والیانِ ریاست نے مسئلہ کی اہمیت نہیں سمجھی اور نہ انھیں خطرات کا احساس ہوا۔ ان کی تنگ نظری، پست خیالی اور خود غرضی

---

[۵۵] یہ پاکستان بننے کے وجود میں آنے سے پورے دس برس پہلے کی بات ہے۔ (علی میاں)

کے وہ بہت شاکی تھے۔"[۵۶]

اس ملاقات میں مولانا علی میاں نے علامہ سے اُن کے کلام کے عربی ترجمہ کی اجازت بھی حاصل کی جو علامہ نے خوشی کے ساتھ دے دی۔

علامہ کے فن و شخصیت پر کام کرنے کا عزم

اس ملاقات کے پانچ ماہ بعد علامہ وفات پا گئے تو اُن کے فن و شخصیت پر کام کرنے کا عزم پختہ ہو گیا۔ مولانا علی میاں نے اپنے عزیز دوست مولانا مسعود عالم ندوی کو پٹنہ میں خط لکھا جہاں وہ خدا بخش لائبریری میں کیٹلاگر تھے۔ ایک دوسرے سے تعزیت کی اور علامہ پر کام کرنے کا پروگرام بنایا۔ مسعود عالم ندوی کے علامہ سے تعلقات اُن کے نام خطوط سے معلوم ہوتے ہیں[۵۷]۔ مولانا مسعود عالم علامہ اقبال کے بڑے پُرجوش مبلغ تھے اور ان کی حمایت، حمیت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں علامہ کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر "برصغیر ہند و پاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ" کے مختصر مضمون میں علامہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ اس دور (بعد از ۱۸۵۷ء) میں اقبال کے فکر و نظر اور اُن کی تصنیفات سے اسلامی فکر کی تشکیل و پرداخت میں بڑی مدد ملی ہے اور اپنی عمر کے آخری سالوں میں قادیانیت کے خلاف ان کا جہاد تو اسلامی ہند کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔"[۵۸]

دونوں دوستوں۔ علی میاں اور مولانا مسعود عالم ندوی۔ کے درمیان طے پایا کہ مولانا مسعود عالم ندوی عربی میں علامہ کی حیات اور پیغام پر لکھیں اور ان کے کلام کو علی میاں عربی کا جامہ پہنائیں۔ چنانچہ مولانا مسعود عالم نے قاہرہ کے وقیع مجلّہ "الفتح" میں علامہ کے بارے میں ایک موثر مضمون لکھا۔ مولانا علی میاں نے بھی ان کی زندگی پر ایک مقالہ لکھا:

اس کے بعد تقریباً دس سال تک علی میاں اپنے تصنیفی اور تعلیمی اشتغال کی وجہ سے علامہ پر کچھ نہ لکھ سکے۔

---

۵۶ نقوشِ اقبال، ص ۳۴ - ۳۶

۵۷ اقبال نامہ، حصہ اوّل، ص ۴۰۰ - ۴۰۸

۵۸ رودادِ جماعتِ اسلامی، حصہ ششم، ص ۱۹۷

تجدید کار

۱۹۵۰ء میں مولانا علی میاں کو حجاز اور مصر و شام کے سفر کا اتفاق ہوا اور تقریباً ایک سال سے زائد قیام کا موقع ملا تو انھوں نے علامہ کے فکر و فلسفہ پر چند مقالات لکھے جو دار العلوم اور جامعہ قاہرہ میں پڑھے گئے - اسی طرح ۱۹۵۶ء میں دمشق ریڈیو کے لیے ایک مقالہ "محمد اقبال فی مدینۃ الرسول" کے زیرِ عنوان لکھا - علی میاں کی مشرقِ وسطیٰ میں جو قدر دانی ہے اور اُن کے علم و فہم پر جس قدر اعتماد کیا جاتا ہے، اس کا تقاضا تھا کہ اُن سے علامہ اقبال پر لکھنے کا مطالبہ کیا جاتا - عالمِ عرب کے مشہور ادیب علی طنطاوی نے "المسلمون" (دمشق) میں ان کے نام ایک کھلا خط لکھا اور درخواست کی کہ مولانا علی میاں، علامہ اقبال کے کلام کو عربی کا جامہ پہنائیں۔

علی طنطاوی کی فرمائش نے ایک بار پھر علی میاں کی بجھی اور سوئی ہوئی طبیعت کو آمادہ بہ عمل کر دیا اور ایک ہی نشست میں "مسجدِ قرطبہ" کا ترجمہ ہو گیا - اس کے بعد علامہ پر مسلسل کئی مقالات بھی لکھے گئے۔

روائع اقبال / نقوش اقبال

ان مقالات اور نشری تقاریر کو "روائع اقبال" کے نام سے دمشق اور بیروت میں شائع کیا گیا۔ بعد میں مولوی شمس تبریز خان نے "روائع اقبال" کو اردو میں منتقل کیا اور "نقوش اقبال" نام رکھا۔ نقوشِ اقبال کے جائزہ سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مولانا علی میاں کے اندازِ فکر پر چند باتیں ہو جائیں -

علامہ کے بارے میں اندازِ فکر

"نقوشِ اقبال" کے دیباچے میں مولانا علی میاں نے علامہ کے بارے میں اپنے اندازِ فکر پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے -

"میں اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حدِ افراط کو پہنچا ہوا ہوں جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے - میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائی، عطار اور عارف رومی آدابِ شریعت کے پاس اور لحاظ اور ظاہر و باطن کی یک رنگی اور دعوت و عمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں - اسلام کے یہاں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے - میں بعض پُرجوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر دور

ہیں اس کا قائل رہا کہ وہ اسلامیات کے ایک مخلص طالب علم رہے اور اپنے مقتدر معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ پیغام محمدی کے بقائے دوام، اُمتِ مسلمہ کے استحکام اور اس کی قائدانہ صلاحیت نیز عصری نظریات و فلسفہ کی بے مائگی پر ان کے پختہ عقیدے سے ان کی فکر میں وضاحت اور پختگی آئی ہے اور خود ان کی خودی تعمیر ہوئی ہے۔ اس معاملے میں خاص کر دینی علوم کے اُن فضلا سے بھی آگے ہیں جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انھیں اس کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔"[۵۹]

مولانا علی میاں اپنی علمی و مطالعاتی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابتدائی استغراق و انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں۔ اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآنِ مجید کی شکل میں محفوظ ہے اور جس کو جو کچھ ملا ہے، اسی سے ملا ہے لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں اور عالمِ اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اب بھی ان کو طاقت اور خود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔"[۶۰]

نقوشِ اقبال۔ مختصر جائزہ

"نقوشِ اقبال" کا انداز وضاحتی اور تحریکی ہے۔ مولانا علی میاں نے ان نظموں کو منتخب کیا ہے جن سے علامہ کے پیغام کو بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور مخاطبین کو متحرک کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"، مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق، طارق کی دعا اور ساقی نامہ پر لکھے گئے مضامین اسی انداز میں ہیں۔

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ پر لکھتے ہوئے علامہ کی دوسری ہم مضمون نظموں سے استشہاد کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا، شرارِ بولہبی، چراغِ مصطفوی کے درپے ہے۔ دین داروں میں دینی روح کا فقدان ہو گیا

---

۵۹ نقوشِ اقبال، ص ۳۹-۴۰

۶۰ ماہنامہ "الحق" شمارہ مئی ۱۹۷۲، ص ۴۴

ہے لیکن مغربی تہذیب بھی اپنا رول ادا کر چکی ہے۔ اس کا وقت پورا اور اس کا ترکش خالی ہو چکا ہے۔ تہذیبِ مغربی مٹنے والی ہے اور ایک نیا عالم انگڑائی لے رہا ہے اور اس عالم کی تعمیر وہی کر سکتا ہے جس نے انسانیت کے لیے دنیا میں بیت الحرام بنایا تھا اور دنیا کی قیادت کا علم سنبھالا تھا۔

تقریباً یہی انداز دوسری نظموں کی تشریح و توضیح میں اختیار کیا گیا، چوں کہ یہ مضامین عربوں کو مخاطب کر کے لکھے گئے تھے اس لیے "ملتِ عربی" کی گونج زیادہ ہے۔ نظموں کی تشریح و توضیح کے ساتھ ساتھ کچھ فکری مضامین ہیں۔ مثلاً "اقبال اور مغربی تہذیب و ثقافت، اقبال کا نظریہ علم و فن، اقبال اور عصری نظامِ تعلیم، اقبال اور قومیت و وطنیت وغیرہ۔

ان مضامین میں مؤلف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اقبال مغربی تہذیب کے باغی ہیں اور انھوں نے اس تہذیب کو بغور پڑھا ہے۔ انھوں نے اپنے فکر میں اسلامی نظامِ حیات کو پیش کیا ہے۔ "نقوشِ اقبال" میں اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ان کی روح، امتِ مسلمہ کی تجدید و اصلاح، مغربی تہذیب اور اس کے علوم کے متعلق علامہ اقبال کے افکار کا خلاصہ آ گیا ہے۔ اس کتاب سے علامہ کے پیام اور فکر کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

ماخذ

پرانے چراغ — ابوالحسن علی ندوی — مکتبہ فردوس۔ لکھنؤ (۱۹۷۵ء)

نقوشِ اقبال — ابوالحسن علی ندوی — مجلس نشریاتِ اسلام۔ کراچی (۱۹۷۳ء)

یادوں کی دنیا — یوسف حسین خان — مطبع معارف۔ اعظم گڑھ (۱۹۶۷ء)

اقبال نامہ حصہ اوّل — عطاء اللہ ایم اے — شیخ محمد اشرف لاہور (س۔ن)

روداد جماعتِ اسلامی حصہ ششم — — مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی لاہور

ماہنامہ "الحق" (اکوڑہ خٹک) بابت ماہ مئی ۱۹۷۲ء

پروفیسر خواجہ عبدالحمید یزدانی

مثنوی رومی میں ذکر خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

(تیسری اور آخری قسط)

عرب کے کسی بیابان میں کوئی وادی نشین قبیلہ قحط باراں کے سبب حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اچانک حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوا۔ حضور نے جب دیکھا کہ بہت سے لوگ ادھر اُدھر ریت پر پڑے انتہائی کرب سے دو چار ہیں اور تشنگی کے باعث ان کے اونٹوں کی زبانیں لٹک گئی ہیں تو حضورِ اکرم کو ان کی اس حالت پر رحم آیا اور حضورؐ نے کسی سے فرمایا کہ فوراً چند لوگ اس ٹیلے کی طرف جاؤ، وہاں اونٹ پر سوار ایک حبشی غلام اپنے آقا کے لیے پانی کی مشک لے کر جا رہا ہے، اسے میری طرف بلا لاؤ۔ لوگ اس طرف دوڑے۔ تھوڑی ہی دیر بعد انھوں نے ایک حبشی شتربان کو پانی کی مشک اٹھائے ادھر سے گزرتے دیکھا۔ لوگ اس سے کہنے لگے کہ فخر البشر صلی اللہ علیہ وسلم بلا رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا وہ کون ہیں؟ لوگوں نے حضور کے تعارف کے لیے کئی ایک القاب استعمال کیے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور بولا گویا وہ کوئی (نعوذ باللہ) ساحر ہیں اور انھوں نے اپنے سحر سے کسی گروہ کو بے بس کر دیا ہے۔ میں تو ان کی طرف ایک قدم بھی نہیں جاؤں گا۔ لوگ اسے دھکم پیل کرتے حضور کی خدمت میں لے گئے۔ وہ اول فول بکتا رہا۔ جب وہ حضور اکرم کی خدمت میں پہنچا تو حضورؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم پانی پیو بھی اور ساتھ بھی لے جاؤ۔ غرض تمام آفت زدہ لوگوں اور ان کے اونٹوں نے بھی سیر ہو کر پانی پیا اور مشکیں بھر بھر ساتھ بھی لیا، اور یہ ایسی صورتِ حال تھی جس نے برسنے والے بادل کو بھی حیران کر دیا تھا۔ مولانا کہتے ہیں کہ کیا کبھی کسی نے ایسا منظر دیکھا ہے کہ ایک مشک سے اس قدر انسان اور حیوان بھی سیر ہوئے ہوں اور کئی مشکیں بھی اس سے بھری گئی ہوں۔ یہ سب مشک کا کمال نہیں تھا کہ وہ تو خود زرد پوش تھی، حقیقت میں یہ فضلِ ربی کی لہر تھی جو حکم محبوب یزدانی سے "بحر اصل" سے آ رہی تھی۔ یہاں مولانا نے یہ سائنسی نکتہ بیان کیا ہے کہ گرمی اور تپش سے پانی ہوا بن کر اُڑ جاتا ہے اور پھر یہی ہوا سردی سے پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس

کے بعد مولانا مسبب کی بجائے سبب پر نظر رکھنے والوں کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کوئی سبب سامنے نہیں ہوتا تو اس وقت کیوں سر پیٹتے اور "یارب، یارب" پکارتے ہو۔ مولانا "سبب" تک محدود رہنے والوں کو معذور قرار دیتے ہیں کہ ان کی نظر اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔

قصہ کوتاہ، اہلِ قافلہ پانی کی اس فراوانی اور حبشی غلام کی مشک کے اسی طرح بھرے رہنے کے باعث بے حد حیران ہوئے۔ غلام پر بھی حیرانی طاری ہوگئی۔ اسی عالم میں جہاں اس کے دل میں لامکاں سے ایمان کی لہر دوڑتی چلی گئی وہاں عالمِ بالا سے اُسے ایک پانی کا چشمہ بھی گرتا ہوا نظر آیا۔ یہ سارا فیض اسی چشمے کا تھا اور غلام کی مشک اس کا محض روپوش تھی۔ اس منظر نے اسے بے تاب و مضطرب کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہوگئے اور وہ سرورِ کونین کے دست ہائے مبارک اپنے چہرے پر رکھ کر دیوانہ وار انھیں چومنے لگا۔ حضورِ اکرمؐ نے اپنے دستِ مبارک اس کے چہرے پر مَلے اور اُسے مسرت و شادمانی سے ہم کنار کر دیا۔ حضورؐ کے اس عمل سے حبشی کا رنگ سرخ و سفید ہوگیا۔ غلام پر وارفتگی و سرمستی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ اسی حالت میں اپنے آقا کی طرف روانہ ہوگیا . . . کہانی آگے چلتی ہے۔ تاہم اس کے آخر میں تن شناسوں پر جان شناسوں کی برتری بیان کی گئی ہے۔

اندر آن وادی گروہی از عرب — خشک شد از قحطِ باران شان قِرَب
درمیانِ آن بیابان ماندہ — کاروانی مرگ برخود خواندہ
ناگہانی آن مغیثِ ہر دو کون — مصطفیٰ پیدا شد از رہ بہرِ عون
دید آنجا کاروانی بس بزرگ — بر تفِ ریگ و رہِ صعب و سترگ
اشتران شانرا زبان آویختہ — خلق اندر ریگ ہر سو ریختہ
رحمش آمد گفت ہین زوتر دوید — چند یاری سوی آن کثبان روید
کہ سیاہی بر شتر مشک آورد — سوی میر خود بزودی می برد
آن شتربان سیہ را با شتر — سوی من آرید با فرمان مُر
سوی کثبان آمدند آن طالبان — بعد یکساعت بدیدند آنچنان
بندۂ می شد سیہ با اشتری — راویۂ پُر آب چون ہدیہ بری

پس بدو گفتند" می خواند ترا — این طرف فخر البشر خیر الوری"
گفت "من نشناسم او را کیست او؟" — گفت او "آن ماہروی قند خو
سید و سرور، محمد نور جان — بہتر و بہتر شفیع مجرمان"
نو عہا تعریف کردندش کہ ہست — گفت ما نا او مگر آن ساحر ست
کشکشانش آورید ند آن طرف — او نغان برداشت بر تشفیع تف

اس سے آگے مولانا فرماتے ہیں :

با سببہا از مسبب غافلی — سوی این روپوشہا زآن مایلی
حاصل آنکہ در سبب پیچیدہ ای — لیک معذوری ہمین را دیدہ ای
قافلہ حیران شدند از کار او — یا محمد چیست این ای بحر خو
کردہ ای روپوش مشک خرد را — غرقہ کردی ہم عرب را ہم کرد را
ای غلام اکنون تو پُر بین مشک خود — تا نگوئی در شکایت نیک و بد
آن سیہ حیران شد از برہان او — میدمید از لامکان ایمان او
چشمہ دید، از ہوا ریزان شدہ — مشک او روپوش فیض آن شدہ
زآن نظر روپوشہا ہم بر درید — تا معین چشمہ غیبی بدید

اس سے آگے اور بھی کئی شعر ہیں ۔

ایک جگہ فلسفہ احتیاج پر اظہار خیال کرنے کے بعد مولانا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزے بیان کیے ہیں - اس حصے میں آنحضرت کا ذکر سعادت اثر پیغمبر، رسول، مصطفیٰ اور خوش خطاب کے القاب سے آیا ہے ۔

کوئی کافر عورت، سرور کائنات کو آزمانے کی خاطر ایک شیر خوار بچہ لے کر حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی ۔ بچے نے وہاں پہنچتے ہی" یا رسول اللہ سلام علیک" کہا اور عرض کیا کہ ہم آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں - اس کی ماں نے غصے میں اسے ڈانٹتے ہوئے خاموش رہنے کو کہا، پھر اس سے پوچھنے لگی کہ کس نے تمہارے کانوں میں یہ شہادت رسول ڈالی ہے، اور کس نے تجھے یہ سب کچھ سکھایا ہے کہ تم اس صغر سنی ہی میں بولنے لگے ہو ۔ بچے نے جواب دیا کہ خدا نے مجھے اس کی تعلیم دی

ہے۔ پھر حضرت جبرئیل بھی اس معاملے میں میرے ہم زبان ہیں۔ ماں بڑی حیران ہو کر اس سے پوچھنے لگی کہ حضرت جبرئیل کہاں ہیں؟ وہ بولا، کیا وہ تمھیں نظر نہیں آ رہے؟ ذرا سر اٹھا کر تو دیکھو، تمھارے سر سے کچھ اوپر وہ کھڑے ہیں، اور کئی طریق سے میری راہنمائی فرما رہے ہیں۔ ماں نے پھر پوچھا کہ آیا وہ تمھیں نظر آ رہے ہیں؟ بچے نے پھر اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ بدرِ کامل کی طرح درخشاں تمھارے سر کے اوپر کھڑے ہیں۔ وہ رسولِ خداؐ کے اوصاف مجھ سے بیان کر رہے اور مجھے پستی سے بلندیوں پر پہنچا رہے ہیں۔ اس کے بعد حضور نبی کریم نے بچے سے اس کا نام پوچھا اور اُسے اسلام لانے کو کہا۔ بچہ بولا کہ اللہ کے حضور میرا نام "عبدالعزیز" (علام صاحب غلبہ) اور یہاں اس دنیا میں عبدعزّیٰ ہے۔ میں عزّیٰ وغیرہ ہر طرح کے بتوں سے دور اور بے زار ہوں، اور صرف اسی کو اپنا رب تسلیم کرتا ہوں جس نے حضورؐ کو پیغمبری عطا کی ہے۔ غرض ماہِ کامل کی طرح درخشاں یہ دو ماہہ بچہ بڑے بڑے باشعور اور اصحابِ دانش و بینش کی طرح پختہ اور منجھی ہوئی گفتگو کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں بہشت کی طرف سے حنوط کا نزول ہوا۔ یہ خوشبو جب دونو ماں بیٹے کے دماغوں تک پہنچی تو وہ کہنے لگے کہ خوفِ سقوط سے بہتر ہے اس بوئے حنوط پر جان فدا کر دی جائے —— داستان یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اب مولانا فرماتے ہیں کہ جس ذاتِ گرامی کی تعریف و توصیف اور جس ہستیِ اقدس کا تعارف خود خدائے بزرگ و برتر فرمائے اس کے صادق ہونے کی گواہی جمادات و نباتات بھی دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جس ذاتِ ارجمند کا تعلق اس ہستیِ مطلق و لم یزل سے ہوگا، اس کائنات کا ہر ہر ذرہ اس کا مطیع و منقاد ہوگا:

ہم از آن دہ یک زنی از کافران	سوی پیغمبرؐ دوان شد ز امتحان
پیش پیغمبر در آمد با خمار	کودکی دو ماہہ زن را در کنار
گفت کودک "سلم اللہ علیک	یا رسول اللہ قد جئنا الیک"
مادرش از خشم گفتش در ہین خموش	کیت افکند این شہادت را بگوش
این کیت آموخت ای طفل صغیر	کہ زبانت گشت در طفلی جرجیر
گفت "حق آموخت وانگہ جبرئیل	در بیان با جبرئیلم من رسیل"
گفت "کو" گفتا کہ "بالای سرت	می نبینی؟ کن ببالا منظرت

مولانا یہ کہہ کر کہ جس ذاتِ گرامی کا محافظ و نگہبان ربِ جلیل ہو اس کی حفاظت ہر مخلوقِ عالم کرتی ہے، اس موضوع کو آگے بڑھاتے ہیں اور سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آمدہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کا سایہ بھی سراپا نور ہوتا ہے، جبکہ عبدِ دنیا کا سایہ، تاریکی و ظلمات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مولانا ان دونوں سایوں میں پہچان کرنے کی تلقین فرماتے ہیں، تاکہ اس پہچان کے طفیل صحیح معنوں میں راہِ ہدایت حاصل اور محبوبِ حقیقی تک رسائی ہو سکے۔ آخر میں مولانا اس واقعہ کو "راضی برضائے دوست" ہونے کے لیے ایک سبق قرار دیتے ہیں۔

دفترِ سوم کے آخر میں چند ایک احادیثِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور آیاتِ قرآنی کے علاوہ بعض نکات کی تشریح کے دوران حضور نبی کریم کا ذکرِ خیر پیغمبر، رسول، محمد، احمد، آگاہ، شیر، رحمتِ عالم اور شاہ کے الفاظ و اسما و القاب سے آیا ہے۔ اس حصے میں سب سے پہلے حدیث "عجبت من قوم یجرون الی الجنۃ بالسلاسل[ا]" کے ذیل میں بعض پابند سلاسل اسیروں کے گزرنے اور سید البشر کے انھیں دیکھ کر تبسم فرمانے کا قصہ بیان ہوا ہے، جس کے دوران مولانا نے اپنے ایک محبوب موضوع یعنی تحقیق و تقلید سے بحث کی ہے۔

چند ایک مضامین ایسے ہیں جنھیں مولانا نے بتکرار دہرایا ہے، تحقیق و تقلید یا "محقق و مقلد" ایسے ہی موضوعات میں سے ایک ہے، جیساکہ اس سے پیشتر بیان ہوا۔ مقلدین سے مولانا کی مراد وہ لوگ ہیں جو روایتی دین پر چل رہے ہیں۔ یعنی دین کے بارے میں انھوں نے اپنے آبا و اجداد، ماں باپ اور اپنی جماعت وغیرہ کو جو کچھ کرتے دیکھا، یا بعض عقائد کے متعلق ان سے جو کچھ سنا اس پر یقین کر لیا اور پھر اس یقین پر ہی کاربند رہے۔ یقین و عمل کا یہ انداز انتہائی بودا اور بے اعتبار ہے۔ اور محققین سے مولانا کا مقصود اولیاء اللہ، عرفا اور برگزیدگانِ الٰہی ہیں، جو اپنے تحقیق و تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر صحیح معنوں میں حقیقتِ دین سے آگاہ ہوتے ہیں۔ بہرحال مولانا اپنی رواداری کے سبب اوّل الذکر کو بھی، جو اکثریت میں ہیں، ہدایت اور نجات سے مطلقاً محروم نہیں سمجھتے۔ فرماتے ہیں کہ مقلد بھی اگر

ا مجھے اس قوم پر تعجب ہے جسے زنجیروں کے ساتھ جنت کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔

روایت اور جماعت کے جبر سے اچھے راستے پر چل رہا ہے تو اس کی بھی نجات ہو جائے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ محقق کو منزلِ مقصود کی خوبیوں کا علم ہے، اس لیے وہ بخوشی اس کی طرف گامزن ہے، لیکن مقلد کو اندرونی اور بیرونی جبر منزل کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔[۵۲]

اب آئیے قصے کی طرف۔ ایک موقع پر خاتم النبیینؐ نے چند اسیروں کو دیکھا جنھیں داد و فریاد کرنے اور رونے پیٹنے کی حالت میں لے جایا جا رہا تھا۔ یہ قیدی حضورِ اکرمؐ کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتے اور عالمِ غیظ میں اپنے دانت اور ہونٹ چباتے جاتے۔ لیکن چونکہ وہ پابند سلاسل تھے، اس لیے حضور کے خلاف اپنے اس قہر و غضب کا برملا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ ان پر مقرر گماشتے انھیں بڑی سختی کے ساتھ شہر کی جانب لے جا رہے تھے۔ نہ تو وہ ان سے کوئی فدیہ لینے کو تیار تھے اور نہ کوئی زر و مال، اور نہ کسی سردار کی سفارش ہی بروئے کار آ رہی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ سمائی تھی کہ یہ ذاتِ گرامیؐ کو کہتے تو رحمت عالمؐ ہیں لیکن یہ رحمت (نعوذ باللہ) ایک دنیا کا حلق و گلو کٹوا رہی ہے۔ غرض وہ قیدی بڑے ہی انکار و تکرار کے ساتھ اور زیرِ لب بڑبڑاتے، طعنے تشنے دیتے اور بُرا بھلا کہتے چل رہے تھے، اور یہ کہ ہم تو ہر طرح سے کوشش و چارہ کر بیٹھے لیکن ہماری بات ہی نہیں بن رہی۔ یہاں تو سینے میں دل نہیں سنگِ خارا ہے۔ ہم ہزاروں جنگ دل شیروں کو یہ چند نیم جاں اور رعریاں انسان ہانکے لیے جا رہے ہیں۔ خدا جانے ہماری اس قدر درماندگی ہماری کجروی کے باعث ہے، یا یہ ہمارے مقدر کی ہار ہے، یا پھر کسی سحر و افسوں کے سبب ہے۔ ہمارے تو بخت ہی جل گئے۔ ہماری شاہی کو تباہی آ گئی۔ اگر یہ ساری جادو کی کارستانی تھی تو ہم نے بھی تو جواب میں اپنی سی کر دیکھی، پھر ہمارے سحر و افسوں اور تعویذ گنڈے کو کون سی بلا چاٹ گئی۔

یہاں اسیروں کے اس غیظ و غضب، طعن و تشنیع اور اظہارِ مایوسی و بدبختی وغیرہ کا رُخ ان کی خدا سے بجانبِ حق راہنمائی کرنے کی خواہش کی طرف مڑتا ہے۔ مولانا ان کفار کی اس دعا و عبادت کا ذکر کرتے ہوئے داستان کو وقتی طور پر ملتوی کر دیتے اور اس آیۂ قرآنی کی تفسیر بیان کرنے لگتے ہیں، ان تستفتحوا فقد جاءکم الفتح[۵۳] کفار حضور اکرمؐ کے مقابلے میں خود کو گویا راہِ راست پر سمجھتے تھے۔[۵۴]

---

۵۲ تشبیہاتِ رومی، ص ۴۴۷ ۵۳ سورہ الانفال: آیہ ۱۹ = (اور) اگر تم لوگ فیصلہ چاہتے ہو تو (باقی اگلے صفحے پر)

چنانچہ ان کی یہ ذہنی کیفیت ان کی اس گفتار سے ظاہر ہے کہ ہم نے اپنے بتوں اور خدا سے یہ عرض و گزارش کی کہ اگر ہم غلط راستے پر ہیں تو ہمیں تباہ کر دے اور ہم میں سے جو کوئی بھی حق و راستی پر ہے اسے فتح و نصرت سے نواز۔ ہم نے لات و منات اور عزیٰ کے حضور بار ہا یہ دعا کی ہے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حق پر ہیں تو وہ اور زیادہ نمایاں ہوں۔ بصورتِ دیگر ہمارے دستِ نگر و مطیع ہوں ... اگلے اشعار میں کفار کی مذکورہ غلط فہمی — کہ وہ حق پر ہیں — کے کسی قدر دور ہونے لیکن ضلالت و گمراہی کے سبب ان کے پھر اپنی اسی سوچ پر اڑے رہنے کا ذکر ہے۔ یعنی وہ اپنی شکست کا سبب حضور کے برحق ہونے کو نہیں بلکہ اپنی کسی بدبختی کو قرار دیتے تھے۔ مولانا ان کی اسی گمراہی اور ذہنی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کے اس قول کا، کہ اگر آج ہمیں شکست ہوئی تو کیا ہوا، ہم بھی تو فاتح بنے ہیں، جواب اپنے خاص اور اچھوتے انداز میں یعنی عام فہم تمثیل کے ذریعے دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر تم عنبر و مشک کو توڑو گے تو دنیا اس کی خوشبو سے مہک اُٹھے گی لیکن اگر اتفاقاً سرگیں کو توڑو گے تو بدبو سے لوگوں کے دماغ پھٹ پھٹ جائیں گے۔ تو کیا مشک اور سرگین، یا آب اور بول یا اطلس اور پلاس برابر ہو سکتے ہیں:

دید پیغمبرؐ یکی جوقِ اسیر	کہ ہمی بُردند و ایشان در نفیر
دیدشان در بندآن آگاہ شیرؐ	می نظر کردند در وی زیر زیر
تا ہمی خائید سر یک از غضب	بر رسولِ صدق دندانہا و لب
زہرہ نی با آن غضب کہ دم زنند	زانکہ در زنجیر قہر دہ مَنند
میکشدشان مرموکل سوی شہر	می بَرَد از کافرستانشان بقہر

وہ تو تمہارے سامنے آموجود ہوا، اور اگر باز آجاؤ تو یہ تمہارے لیے نہایت خوب ہے۔ اور اگر تم پھر وہی کام کرو گے تو ہم بھی پھر (وہی) کام کریں گے اور تمہاری جمعیت تمہارے ذرا بھی کام نہ آوے گی گو کتنی زیادہ ہو، اور واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔ (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)

کہ ملاحظہ سورۃ التطفیف آیات ۲۹ بعد "... اور جب (یہ کافر ایمان والوں کو) دیکھتے تو یوں کہا کرتے کہ یہ لوگ (ایمان والے) یقیناً غلطی میں ہیں (کیونکہ کفار اسلام کو غلطی سمجھتے تھے) ... الخ" (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)

نی فدائی می نتانند نی زری | نی شفاعت میرسد از سروری
رحمت عالم ہمی گویند و اوؐ | عالمی را می بُرد حلق و گلو
با ہزار انکار می رفتند راہ | زیر لب طعنہ زنان بر کار شاہؐ
چارہ ہا کردیم و اینجا چارہ نیست | خود دل این مرد کم از خارہ نیست

اسی مضمون (شکستن نافہ وغیرہ) کو آگے بڑھاتے ہوئے مولانا نے سید البشرؐ کے حدیبیہ سے ناکام لوٹنے اور غمگین و ملول ہونے اور پھر خدا کی جانب سے "انّا فتحنا لك فتحاً"[۵۵] کے الفاظ میں حضور اکرم کو آئندہ فتح و نصرت و کامرانی کی بہت بڑی نوید سنائے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اس حصے میں مولانا نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ جو کوئی ذات باری جل شانہٗ کا ہو کر رہ گیا، درحقیقت وہ عظمتوں اور بلندیوں کو پہنچ گیا۔

وقت واگشت حدیبیہ رسولؐ | در تفکر بود غمگین و ملول
ناگہان اندر حق شمع رُسلؐ | دولت "انّا فتحنا" زد دُہل
آمدش پیغام از دولت کہ رو | تو زمنع این ظفر غمگین مشو

اس کے بعد نبی کریمؐ کی حدیث "لا تفضّلونی علیٰ یونس بن متی ..." (مجھے حضرت یونس پر فضیلت نہ دو) کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ دو ایک شعروں میں حدیث مذکور کا ترجمہ ہے، اور اس کے بعد تفسیر کے ذیل میں حبس ہستی سے نجات پانے کو قرب حق کا وسیلہ قرار دے کر مولانا پھر داستان اسیراں کی طرف رجوع اور اُن کے طعنوں تشنوں کا ذکر کرتے ہیں۔

تیسرے دفتر کے اختتام پر "ومن یعمل مثقال ذرّة خیراً یرہ ..."[۵۶] کی تفسیر کے ضمن میں حضور اکرمؐ کا ذکر سعادت اثر پیغمبر کے لفظ سے آیا ہے۔

اس حصے میں اس نکتے کی وضاحت کی گئی ہے کہ "زندگی کا مدار اسباب و علل پر ہے" صاحب

---

۵۵ سورۃ الفتح آیہ ا ببعد۔ بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی۔

۵۶ سورۃ زلزال آیات ۷-۸، سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

دانش و بینش" زندگی میں عام اور مجرب قواعد پر عمل کرتا ہے اور نادرات سے استدلال نہیں کرتا لیکن کاہلوں اور نادانوں کی نظریں نادر امور پر جمی رہتی ہیں۔ وہ جد و جہد و سعی کو لغو سمجھتے اور یوں زندگی کو بیکار ضائع کرتے ہیں۔ جبکہ" خدا اور اس کے رسول نے یہ تلقین کی ہے کہ اپنے فرائض تن دہی سے انجام دو۔ عام طور پر اچھی کوشش سے اچھا ہی نتیجہ نکلے گا، لیکن کبھی نتیجہ خلافِ توقع نکلے تو زندگی کے عام قانون سے راہِ گریز اختیار نہ کرو۔" مولانا کا کہنا ہے کہ "جس کی تقدیر میں خوش بختی اور نجات نہیں وہ مردِ کاہل نادرات میں پناہ لیتا ہے۔ حالانکہ زندگی میں نادرات بہت کم ہیں۔ پتھر کو لوہے سے ٹکراؤ گے تو چنگاری نکلے گی۔ یہ ایک طبعی قانون ہے، لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت چنگاری نہ نکلے۔"[۵۷]

سایۂ حق بر سرِ بندہ بود — عاقبت جوینده یابنده بود
گفت پیغمبر کہ چون کوبی دری — عاقبت زآن در برون آید سری
چون نشینی بر سرِ کوی کسی — عاقبت بینی تو ہم روی کسی
چون ز چاہی میکنی ہر روز خاک — عاقبت اندر رسی در آبِ پاک
جملہ دانند این اگر تو نگروی — ہر چہ می کاریش روزی بدروی
سنگ بر آہن زدی آتش بجست — این بباشد ورنہ باشد نادرست
آنکہ روزی نیستش بخت و نجات — ننگرد عقلش مگر در نادرات[۵۸]

نیز مثنوی جلد ۳ صفحہ ۸۶ پر حضرت حمزہؓ کے بارے میں اشعار ہیں۔ جن میں حضور نبی کریم کو مصطفیٰؐ، رسولؐ اور محمدؐ کے اسما سے یاد کیا گیا ہے۔

---

۵۷ واوین والی چاروں عبارتیں تشبیہاتِ رومی (ص ۴۳۴، ۴۳۵) سے ماخوذ ہیں۔
۵۸ مثنوی۔ ص ۳/ ۱۱۷: ۱۱۸۔

پروفیسر محمد صدیق

اقبال اور ابوالخیر عبداللہ

علامہ اقبال کو برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی، مذہبی اور تعلیمی تحریکوں سے گہری اور پُرخلوص دلچسپی رہی ہے۔ آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بہتری اور ترقی کے لیے یہاں کی سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں عملی حصہ بھی لیا۔ اقبال ہر اس ادارے کی ترقی اور فروغ کے خواہاں تھے جو مسلمانانِ ہند کی تعلیمی اور سماجی فلاح و بہبود کے لیے کوئی بہتر کام کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی زبوں حالی اور تعلیمی پس ماندگی کے خلاف جہاد جاری تھا۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں مسلمانانِ برصغیر نے بڑی بڑی تحریکیں چلائیں، جن کا تعلق برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد تھا۔ تحریکِ خلافت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو جذباتی وابستگی تھی اور اس کے اثرات کے بعد ان میں مایوسی اور ناامیدی چھا چکی تھی۔ ۱۹۲۵ میں ہندوستان کے مختلف شہروں اور طبقوں کے حساس مسلمانوں نے احیائے اسلام کے لیے سوچ بچار شروع کر دی۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر ظفر الحسن صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی اور مشرقی پنجاب میں میر غلام بھیک نیرنگ انبالوی اس موضوع کو بالخصوص مرکزِ غور و فکر ٹھہراتے تھے۔

اسی زمانے میں لاہور کے چند تعلیم یافتہ افراد نے اس طرف توجہ دی۔ ان میں خواجہ عبدالوحید اور مولانا ابوالخیر عبداللہ بھی شامل تھے۔ علامہ اقبال کے مداحین ایک جمعیت بنانے کے متعلق غور و فکر کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت علامہ سے مفصل گفتگو ہوئی تھی اور سب احباب کا خیال تھا کہ اس جماعت کی قیادت علامہ اقبال کے سپرد ہو۔ مولانا ابوالخیر عبداللہ اس انجمن کے سرگرم اور بانی ارکان میں سے تھے اور وہ علامہ کے بہت مداح تھے۔ اکثر علامہ کی خدمت میں جاتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ دونوں میں یہ علمی تعلق جو جوانی میں پیدا ہو گیا تھا، آخر دم تک قائم رہا۔

خواجہ عبدالوحید اپنی بیاض میں تحریکِ شبان المسلمین کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ان کی ڈائری کے اوراق کے مندرجات میں اس انجمن کے ارکان کے نام بھی موجود ہیں۔ اس انجمن کی تشکیل کے

متعلق ڈاکٹر سید ظفر الحسن سے مفصل خط و کتابت ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے محمد محمود اور برہان احمد فاروقی کو اس انجمن کی ابتدائی کارروائیوں میں شرکت کے لیے علی گڑھ سے بھیجا۔ مولانا ابو الخیر عبداللہ اس انجمن کے سرگرم رکن تھے اور اس کے ہر جلسے میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ انجمن کی تمام کارروائی خواجہ عبدالوحید کے گھر پر ہوتی تھی۔ ایک جلسے کی کارروائی خواجہ عبدالوحید کی زبانی پیشِ خدمت ہے۔

"۲۹ اپریل ۱۹۳۵ء — تین بجے صوفی (تبسم) صاحب اور شیخ حسام الدین (میرے مکان پر) تشریف لائے۔ ساڑھے تین بجے ابو الخیر (عبداللہ) صاحب اور (محمد شریف) پنی صاحب آ گئے۔ پھر علی گڑھ والے اصحاب تشریف لائے۔ ساڑھے پانچ بجے تک اجتماع رہا۔ مجوزہ جمعیۃ شبان المسلمین کے متعلق طویل گفتگو ہوئی اور ہر معاملے میں ہم سب لوگوں کی رائے متفق ہوئی۔ ساڑھے پانچ بجے مہمان رخصت ہوئے۔

علی گڑھ سے جو بزرگوار تشریف لائے تھے ان میں سے ایک محمد محمود صاحب مسلم یونیورسٹی میں فلاسفی کے لیکچرار ہیں اور دوسرے برہان احمد (فاروقی) صاحب وہاں ریسرچ اسکالر ہیں۔ اوّل الذکر بہت ذہین اور سمجھ دار ہیں۔ ان کی گفتگو دلپذیر اور پسندیدہ ہے۔ دوسرے صاحب بہت کم بات کرتے تھے، اگرچہ بات کرنا جانتے ضرور تھے۔ ان لوگوں کا خلوص، ان کا جوش دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کا علی گڑھ سے لاہور آنا ہی ان کے خلوص اور جوش کا زبردست ثبوت تھا۔"[1]

انجمن کے ارکان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اس کی صدارت علامہ اقبال قبول کریں۔ خواجہ عبدالوحید انجمن کی تشکیل کے متعلق علامہ سے پہلے ہی بات چیت کر چکے تھے۔ آپ انجمن کے متعلق مولانا ابو الخیر عبداللہ کے مشوروں کو زیادہ وقعت دیتے تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ انجمن کا قیام جلد عمل میں لایا جائے۔ مگر علامہ اس زمانے میں بھوپال گئے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ اقبال کی واپسی سے قبل تمام ابتدائی کارروائی مکمل ہو جائے۔ آپ نے اپنی بیاض میں اس کارروائی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔

"۱۹ اگست ۱۹۳۵ء — پرسوں سردار محمد خان صاحب سے تبادلۂ خیالات ہوا اور اسی روز (محمد شریف) پنی صاحب

---

[1] اقبال کے حضور از خواجہ عبدالوحید۔ نقوش اقبال نمبر ۱۲۳ — ص ۳۹۹

اور ابوالخیر (عبداللہ) صاحب سے گفتگو ہوئی۔ احباب کا خیال تھا کہ سر اقبال کے زیر قیادت جماعت کا قیام فی الفور شروع کر دیا جائے۔ ادھر آج سردار محمد اور (مولوی خدا بخش) ارمان صاحب کی معیت میں حضرت مولانا احمد علی صاحب) سے تبادلۂ خیالات کیا اور جلد از جلد دوسرا سلسلہ قائم کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں تجویز ہوئی کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب کی طرف سے ایک دو آدمی مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی خدمت میں حاضر ہو کر تجویز پیش کریں اور درخواست کریں کہ وہ اس سلسلے کی امارت قبول فرمالیں اور صوبہ وار نائب امیر مقرر فرمادیں۔ دوسری طرف آئندہ چہارشنبہ کے روز میرے مکان پر اجتماع ہوگا اور علامہ سر محمد اقبال کے عقیدت مندوں کو اپنی تنظیم پر آمادہ کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ علامہ کی بھوپال سے واپسی تک تمام کام تیار ہو جائے۔[۵۲]

ارکان کے تفصیلی غور و خوض کے بعد آخر انجمن کے قواعد و ضوابط تیار کیے گئے۔ اس کا نام انجمن شبان المسلمین رکھا گیا اور اس کے یوم تاسیس ۲۱ اگست ۱۹۳۵ کو مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہوئے۔

انجمن کا نام	جمعیۃ شبان المسلمین
یوم تاسیس	۲۱ اگست ۱۹۳۵
صدر	علامہ اقبال
پروونشنل سکرٹری	نجم الثاقب
خزانچی	بدرالدین بدر

اس جلسے میں سید نذیر نیازی، مولانا ابوالخیر عبداللہ، ڈاکٹر عبدالغنی، ڈاکٹر عبدالحمید ملک، ثاقب، افضل، عبدالرشید طارق، محمد شریف بنی، خواجہ غلام دستگیر اور مولوی خدا بخش ارمان نے شرکت کی تھی۔ خواجہ عبدالوحید صاحب نے اس دن کے جلسے کی کاروائی کو اپنی بیاض میں مندرجہ ذیل میں قلم بند کیا ہے۔

"۲۱ اگست ۱۹۳۵ —— آج ہمارے ہاں مجوزہ جمعیۃ شبان المسلمین کے ہمدردوں کا جلسہ ہوا، جس میں جمعیۃ کی بنیاد رکھ دی گئی —— نیز ارکان نے تحریری طور پر اطاعتِ امیر کا عہد کیا اور جمعیۃ کی امارت کے لیے علامہ سر محمد اقبال کا اسم گرامی تجویز ہوا۔ پروونشل سکرٹری کا کام ثاقب صاحب کے سپرد ہوا اور خزانچی (بدرالدین) بدر صاحب مقرر ہوئے۔"

---

[۵۲] اقبال کے حضور از خواجہ عبدالوحید۔ نقوش اقبال نمبر ۱۲۳۔ ص ۳۹۹ = ۴۰۰

آج ہمارے ہاں کا اجلاس بہت کامیاب رہا۔ غیر معمولی رونق تھی۔ نذیر نیازی صاحب نے گفتگو کو بہت پُر لطف بنا دیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبد الغنی بھٹی، ڈاکٹر عبد الحمید ملک، ثاقب صاحب، افضل صاحب (بدر الدین) بدر صاحب، (عبد الرشید) طارق صاحب، ابوالخیر (عبد اللہ) صاحب، (محمد شریف) بنی صاحب، خواجہ غلام دستگیر صاحب اور (مولوی خدا بخش) ارمان صاحب بھی تھے۔[۵۳]

جمعیۃ شبان المسلمین کا نصب العین ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج اور اقبال تھا۔ اس عظیم اور اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ارکان کی تعداد میں اضافہ بے حد ضروری تھا۔ چنانچہ سارے ملک میں رکن سازی کی مہم کو شروع کرنے کے لیے باقاعدہ فارم طبع کرائے گئے۔ فارم کی نقل درج ذیل ہے۔

"۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال کے حصول کے لیے جو جماعت قائم کی گئی ہے، میں اس کا رکن بننے کے لیے تیار ہوں، اور اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ امیر کی اطاعت قرآن و سنت کے مطابق بہر حال اور ہر وقت بلا چون و چرا کروں گا۔

۲۔ میں متمنی ہوں کہ اس جماعت کی امارت علامہ سر محمد اقبال مدظلہ کے دست مبارک میں ہو۔

نام .... پتا .... دستخط ...."[۵۴]

جمعیۃ شبان المسلمین بوجوہ ترقی نہ کر سکی، چنانچہ اس کا آخری جلسہ ۱۴ مارچ ۱۹۳۶ کو خواجہ عبد الوحید کے گھر پر منعقد ہوا۔ اس اہم جلسے میں راجہ حسن اختر، پروفیسر منیر الدین، نجم الثاقب، محمد شریف بنی، ڈاکٹر عبد الغنی بھٹی اور مولانا ابوالخیر عبد اللہ نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں انجمن کے مقاصد پر مفصل بحث کے بعد یہ بات علم میں آئی کہ لوگ جمعیۃ کے اغراض و مقاصد پر کلی طور پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہتے بلکہ وہ اس جمعیۃ کی صرف ایک شق یعنی حضرت علامہ کے نظریات کی تشہیر چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ ایک دار المطالعہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح کے باہمی اختلافات کی بنا پر جمعیۃ نشو و نما نہ پا سکی۔ خواجہ عبد الوحید نے اس جلسے کی کارروائی کو اپنی بیاض میں ان الفاظ میں رقم کیا ہے۔

۱۴ مارچ ۱۹۳۶ — آج میرے مکان پر معتقدین اقبال کا اجتماع ہوا، جس میں راجہ حسن اختر صاحب اور پروفیسر منیر الدین کے علاوہ ثاقب صاحب (محمد شریف) بنی صاحب، ابوالخیر (عبد اللہ)، ڈاکٹر (عبد الغنی) بھٹی صاحب

---

۵۳ اقبال کے حضور از خواجہ عبد الوحید — نقوش اقبال نمبر ۱۲۳، ص ۳۰۰ ۵۴ ایضاً، ص ۳۱۷

بھی شریک ہوئے اور ظاہر ہوا کہ لوگ اصل تجویز درباره جمعیۃ شبان المسلمین پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سب محض اس بات کے حامی تھے کہ ایک دارالمطالعہ قائم کیا جائے۔ جہاں اقبال کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہوا کرے۔ چنانچہ اس پر یہ اجلاس ختم ہو گیا۔"[۵۵]

جمعیۃ کی ابتدا سے اس کی انتہا تک مولانا ابوالخیر عبداللہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ وہ معتقدِ اقبال تھے۔ اس کے علاوہ مولانا مختلف اوقات میں علامہ کے پاس آتے رہتے تھے۔ وہ ان بہت سی علمی، ادبی، مذہبی اور تعلیمی مجلسوں میں شریک رہے تھے جن میں علامہ اقبال موجود ہوتے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ایک علمی محفل کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۹۲۷ء میں سید سلیمان ندوی انجمن حمایتِ اسلام کے ۴۲ ویں سالانہ جلسے کی تقریبات میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے۔ یہ جلسہ ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ کو اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی وسیع گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا۔ سید صاحب کا پنجاب میں یہ پہلا دورہ تھا، اس لیے لاہور کے مختلف علمی اور ادبی حلقوں میں ان کے شایانِ شان پذیرائی کی گئی۔ سید صاحب نے مولانا ظفر علی خاں کے ہاں دفتر "زمیندار" میں قیام کیا تھا اور اسی دفتر میں ۱۵ اپریل ۱۹۲۷ء کو علامہ اقبال کی پہلی مرتبہ سید صاحب سے بالمشافہ ملاقات ہوئی۔

سید صاحب کے اعزاز میں بہت سی پُرتکلف اور شاندار دعوتیں دی گئیں۔ ان مجالس میں انواع و اقسام کے کھانوں کے علاوہ مذہبی، علمی اور ادبی مسائل پر بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے ایک دعوتِ طعام کا ذکر کیا ہے جو پروفیسر خواجہ محمد سلیم، شعبہ انگریزی، لاہور گورنمنٹ کالج، نے اپنے گھر پر سید صاحب کے اعزاز میں دی تھی۔ اس میں ملک کی نامور ادبی، مذہبی، سیاسی اور تعلیمی شخصیات مدعو تھیں۔ اس دعوت میں مولانا ابوالخیر عبداللہ بھی شریک تھے۔

"قبلہ سید صاحب (سید سلیمان ندوی) کو خواجہ محمد سلیم نے اپنے مکان واقع کوٹھی داراں کشمیری بازار پرانی کوتوالی کے قرب میں دعوتِ طعام دی۔ جس کی تاریخ ۱۷ اپریل (۱۹۲۷) اتوار کے دن طے ہوئی۔ اس دعوت میں خاص طور پر سید صاحب کو چند علمی مخطوطات سے روشناس کرانا مقصود تھا جو

---

۵۵ اقبال کے حضور از خواجہ عبدالوحید۔ نقوشِ اقبال نمبر ۱۲۳ - ص ۴۰۰

خواجہ محمد سلیم (حال پروفیسر لسان انگریزی، گورنمنٹ کالج لاہور) کے مجموعہ علمی نوادرات میں تھے۔ یہ دعوت کئی حیثیتوں سے لاہور میں ایک یادگار دعوت ہے۔ اس دعوت میں ذیل کے حضرات شامل تھے۔

پروفیسر شیرانی صاحب مرحوم، پروفیسر اقبال مرحوم، سید طلحہ صاحب، خواجہ عبدالوحید، ملک عنایت اللہ، ملک محمد امین ایڈووکیٹ، ملک لطیف (حال اسٹیشن ماسٹر لاہور)، مولانا ظفر علی خان، چودھری محمد حسین، سید عبداللہ (ڈاکٹر سید محمد عبداللہ سابق پرنسپل اورینٹل کالج)، ابوالخیر عبداللہ، مسٹر بشیر بمبئی بوٹ ہاؤس ڈبی بازار، ملک لال دین قیصر، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، بابو عبدالماجد صاحب، علامہ سر محمد اقبال، سید سلیمان ندوی، شیخ عبدالرشید اور سید واحد شاہ ایڈووکیٹ۔[۵۶]

سید سلیمان ندوی نے خواجہ محمد سلیم کے ہاں کی دعوت کے بارے میں یوں لکھا ہے۔ مگر وہ خواجہ صاحب کا نام محمد سلیم کی بجائے سلیم الدین لکھ گئے ہیں۔

"خواجہ سلیم الدین صاحب نے ممتاز اہل علم اور نوجوان دل دادگان فن کو اپنے "خوان نعمت" پر جمع کیا اور ایک غریب الدیار کی عزت بڑھائی۔"[۵۷]

مولانا ابوالخیر عبداللہ عاشق اقبال تھے۔ آپ علامہ اقبال کی تعلیمات اور فلسفے کے زبردست حامی تھے۔ علامہ کی ذات میں مولانا کو عظیم عاشق رسول کے علاوہ بیان مرد انسانیت نظر آتا تھا یہاں مولانا ابوالخیر عبداللہ کا مختصر سوانحی خاکہ یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کیونکہ مولانا کی شخصیت میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جن کو علامہ اقبال ایک مرد مومن کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ مولانا توکل، استغنا اور عشق رسول کی مجسم تصویر تھے۔

مولانا کا نام محمد عبداللہ تھا۔ مگر بعد میں آپ نے اپنے نام کے شروع میں اپنی کنیت ابوالخیر کا اضافہ کر لیا تھا۔ اس طرح ان کا پورا نام "ابوالخیر محمد عبداللہ" ہوگیا۔ لیکن عام طور پر وہ "ابوالخیر عبداللہ" ہی لکھا کرتے تھے۔ کالج میں تمام احباب ان کو صرف "مولانا" کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے۔

آپ ۱۶ جولائی ۱۹۰۳ء کو خلیفہ سعادت الدین کے ہاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بہت

---

۵۶ علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی از عبداللہ چغتائی (مطالعہ اقبال مرتبہ گوہر نوشاہی) ص ۷۷

۵۷ اقبال، سلیمان ندوی کی نظر میں۔ اختر راہی، ص ۲۱۹

متقی اور پرہیزگار شخص تھے۔ آپ کا گھرانہ مذہبی تھا۔ اس ماحول میں پرورش پاکر مولانا نے سکول کی تعلیم سے فراغت پائی اور ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ آفس ریلوے میں تقریباً دس سال تک ملازمت کرتے رہے۔ اسی ملازمت کے دوران ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ دفتری فائلوں میں طبیعت اچاٹ رہتی تھی۔ چنانچہ ریلوے کی ملازمت چھوڑ کر مختصر عرصے کے لیے گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں زبان و ادبیات فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ مگر گھریلو مجبوریوں اور ذمہ داریوں کے سبب لاہور سے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لیے مارچ/اپریل ۱۹۴۷ء کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اردو اور پنجابی مخطوطات کی فہرست سازی کی اہم خدمت قبول کی اور دسمبر ۱۹۵۷ء تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ان کے علمی اور ادبی مزاج کے عین مطابق تھا، اس لیے نہایت حسن و خوبی سے جاری رہا۔ ۷ دسمبر ۱۹۵۷ء کو وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں شعبہ فارسی سے منسلک ہوگئے اور یونیورسٹی لائبریری میں مخطوطات کی فہرست سازی سے مستعفی ہوگئے۔ ۱۹۵۸ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ اور اسلامیہ کالج سول لائنز کو جو کہ پہلے ایک ہی پرنسپل کے ماتحت، ایک ہی کالج متصور ہوتا تھا، دو الگ الگ کالجوں کی حیثیت دے دی گئی تو اسلامیہ کالج سول لائنز کے پہلے پرنسپل، علم و ادب کے گوہر شناس پروفیسر حمید احمد خاں (۱۹۰۳ - ۱۹۷۴) مقرر ہوئے۔ پروفیسر حمید احمد خان نے اس کالج کو ماڈل کالج بنانے کے لیے علم و ادب کے بڑے بڑے اساتذہ کو یہاں جمع کر لیا چنانچہ وہ مولانا کو ریلوے روڈ سے اس کالج میں لے آئے۔ ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء تک مولانا جانفشانی سے علم و ادب کے موتی اپنے طلبا پر نچھاور کرتے رہے۔ لاہور کی زمین سے اُٹھنے والا یہ خمیر تقریباً چونسٹھ سال کی جدوجہد سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد پھر اسی خاک میں پیوند ہوگیا۔

درمیانہ قد، دوہرا جثہ، وضع دار اور مرنجان مرنج اور چہرے پر مستقل مسکراہٹ کا نام ابوالخیر عبداللہ تھا۔ جس زمانے میں آپ اقبال کے پاس جاتے تھے، اس وقت تیس بتیس سال کے تنومند اور پُرجوش جوان ہوں گے۔ مگر جب میں نے ان کو دیکھا اس وقت ان کے ہاتھ اور پاؤں میں رعشہ تھا۔ کمزور مگر بلند حوصلہ تھے۔ حرفِ شکایت سے ان کی زبان ناآشنا تھی۔ سادہ مگر بے داغ لباس زیبِ تن کرتے تھے۔ کیا مجال لباس پر کوئی دھبہ ہو۔ ان کے صاف شفاف کپڑوں کی مانند ان کا دل بھی اجلا اور صاف تھا۔ سب کا احترام کرتے تھے، اس لیے سب کے محترم تھے۔

زبان وادبیاتِ فارسی اور اُردو کے عالم تھے۔ مگر ریاکاری اور منافقت کے معنی سے آگاہ نہ تھے۔ نیکی اور راستی، خوش خصالی اور خوش طبعی ان کی شخصیت کا حصہ تھیں۔ کم آمیز اور کم سخن تھے، مگر مردم بیزار نہ تھے۔ آپ کی ذات بے شمار صفاتِ جمیلہ اور اوصافِ حمیدہ سے مزین تھی۔

نہایت مہربان، ہمدرد، خلیق، ملنسار اور مشفق استاد تھے۔ طلبا کی راہنمائی اور ان کے تعلیمی مسائل کے حل کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے۔ پابندیٔ وقت میں یگانہ تھے۔ کلاس میں مقررہ وقت پر پہنچ کر سبق کا آغاز کرنا، سبق کو لفظاً لفظاً پڑھانا۔ نظم و نثر کے صوری اور معنوی محاسن و عیوب بیان کرنا، ان کی شخصیت کا جزو بن چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ شہر لاہور میں فارسی کے قدیم اسلوبِ تدریس میں بے مثال تھے۔

مولانا نے زندگی کے مصائب اور مسائل کا مقابلہ جواں مردی، ثابت قدمی اور استقلال سے کیا۔ آپ کی رفیقۂ حیات تین بچیوں اور دو بچوں کو کم سنی میں ان کے حوالے کر کے خالقِ حقیقی کے پاس چلی گئیں، لیکن مولانا ان بچوں کے لیے باپ کا سایہ اور ماں کی ممتا کی مکمل تصویر بن گئے۔ اس مصیبت میں راضی برضا تھے۔ اس دور میں ان کی رشتے کی ایک بہن ان کی حقیقی مددگار ثابت ہوئیں جنھوں نے بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت اور ان کے شادی بیاہ میں مولانا کا ساتھ دیا۔

مولانا کی شخصیت توکل کی عمدہ اور مکمل تصویر تھی۔ دو چھوٹی بچیوں کی شادی کی تاریخ تک طے ہو چکی تھی مگر گھر میں شادی کا سامان اور جہیز نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ان کی بہن روز تقاضا کرتیں کہ ان بے ماں بچیوں کی باعزت رخصتی کے لیے پیسوں کا بندوبست کرو۔ مگر وہ صبر و رضا اور توکل کے پتلے ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے کہ اللہ تعالیٰ ضرور انتظام کر دے گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں۔ اہلِ خانہ بے قرار اور فکر مند مگر مولانا پُرسکون اور مطمئن تھے، حتّٰی کہ ایک دن مولانا کا ایک حبیب صدیق ان کی ملاقات کو آیا اور دورانِ گفتگو ذکر کیا کہ ایک معقول رقم ماہوار سے دس ہزار روپے کی ایک کمیٹی شروع کر رہا ہوں۔ مولانا نے ان سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا، اور انھوں نے مولانا کو پہلی کمیٹی دے دی۔ اس طرح اس دس ہزار روپے کی رقم سے وہ اپنے فرض سے بخوبی سبکدوش ہو گئے۔ خدا نے بزرگ و برتر اپنے بندوں کو نا امید نہیں کرتا۔

مولانا سراپا شرافت اور پیکرِ دیانت تھے۔ دنیا کے زر و مال سے بے نیاز، صدق و صفا کا نمونہ

تھے۔ ساری زندگی کرایہ کے مکان میں رہے۔ یہ گھر ایک سکھ ڈاکٹر سنت سنگھ کی ملکیت تھا۔ ڈاکٹر سنت سنگھ اندرون شاہ عالمی دروازہ (حال شاہ عالم مارکیٹ) میں پریکٹس کرتا تھا ۔۔۔ ۱۹۴۷ء فسادات کا زمانہ تھا، پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ کوئی مسلمان اندرون شاہ عالمی دروازہ جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ مگر مولانا اس زمانے میں بھی باقاعدگی سے ہر ماہ اپنے مالکِ مکان کو اس کی دکان پر کرایہ پہنچانے جایا کرتے تھے۔ پاکستان بن چکا تھا۔ ڈاکٹر سنت سنگھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور پیش کش کی کہ یہ مکان آپ مجھ سے اپنے نام لکھوالیں۔ مولانا نے اس تجویز کو مسترد کردیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ بددیانتی تھی۔ پھر ایک دور جالیات کا تھا کہ کیسے کیسے لوگ کیا کیا بن گئے۔ مگر مولانا نے پھر بھی یہ گھر اپنے نام منتقل نہیں کرایا، حالانکہ واجب الادا کرایہ ایک ہزار روپے تھا اور اس کی کل قیمت آسان قسطوں میں ادا کی جاسکتی تھی۔ مولانا نے کبھی قرض نہیں لیا تھا۔ اس درویش منش کے پاس ایک ہزار روپے کہاں تھے۔ اور نہ اس غیور نے کسی عزیز سے ایک ہزار روپے مستعار لینا پسند کیا۔ نصف صدی تک اس گھر میں رہے، نوجوانی سے موت تک۔ مگر مکان کسی اور مسلمان دوست کے نام منتقل کروا دیا اور اس طرح خود ڈاکٹر سنت سنگھ سے اس مسلمان کے کرایہ دار بن گئے۔ دیانت اور درویشی کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ان کے بڑے لڑکے ڈاکٹر محمد عبدہ ماجد اب بھی اس گھر میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہائش پذیر ہیں۔

۱۹۵۰ مولانا کے لیے خوشی لے کر نہ آیا۔ اس سال ان کو اپنے نوجوان طالب علم بیٹے کی نعش کو کندھا دینا پڑا۔ محمد شعیب میٹرک کا ہونہار طالب علم تھا کہ اللہ کو پیارا ہوا۔ مولانا اس صدمہ جانکاہ سے شدید افسردہ دل ہوگئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رضا پر خوش تھے۔ اپنی زندگی میں ہی تمام ذمہ داریوں سے سرخرو ہو چکے تھے۔

یونیورسٹی لائبریری میں جناب ڈاکٹر سید عبداللہ کی زیرِ نگرانی مخطوطات کی فہرست سازی کا شعبہ کام کر رہا تھا۔ مولانا اپریل ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۵۷ تک اسی شعبے سے منسلک رہے۔ آپ نے اس عرصے میں شیرانی، آزاد، کیفی، پیرزادہ اور جنرل کولیکشن کے تقریباً اردو فارسی ہزار مخطوطات کی توضیحی فہرست مرتب کی۔ بادامی رنگ کے کاغذ پر مرتب شدہ یہ فہرست یونیورسٹی لائبریری میں "ڈاکٹر سید عبداللہ کیٹلاگ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کیٹلاگ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے مگر ابھی تک

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ قَالَ مَامِنْ مُسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ یَزْرَعُ زَرْعًا فَیَاْکُلُ مِنْهُ اِنْسَانٌ اَوْطَیْرٌ اَوْبَهِیْمَةٌ اِلَّا کَانَتْ لَهٗ صَدَقَةٌ۔

(جامع ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی فضل الغرس)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے یا کوئی فصل بوتا ہے اور اس سے کوئی انسان یا جانور یا ڈنگر ڈھور کچھ کھالیتا ہے تو وہ اس مسلمان کی طرف سے صدقہ ہے۔

یہ حدیث الفاظ کے اعتبار سے نہایت مختصر ہے لیکن اس میں ایک بہت بڑی بات بتائی گئی ہے۔ اس میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ایک پودا لگاتا ہے، یا کاشت کاری کرتا ہے، پھر اس سے اللہ کی کوئی بھی مخلوق انسان، جانور یا مویشی فائدہ اٹھاتے ہیں؛ اس میں سے کچھ کھالیتے ہیں یا درخت کے سائے میں بیٹھ کر آرام کرتے ہیں، وہ اس مسلمان کی بہت بڑی خدمت ہے۔ جو فائدہ اس درخت یا پھل یا زراعت سے اٹھایا جاتا ہے وہ اس مسلمان کی طرف سے جو درخت لگاتا یا کاشت کرتا ہے صدقہ متصور ہوگا۔

اندازہ کیجیے، صدقے کی تعریف کتنی وسیع ہے، ہر وہ فائدہ جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے کسی شکل اور صورت میں اٹھاتا ہے، صدقے کی ذیل میں آتا ہے۔ عام طور یہ سمجھا جاتا ہے کہ صدقے اور خیرات کا اطلاق صرف اس روپے پیسے پر ہوتا ہے جو ایک صاحب ثروت کسی غریب، نادار یا مستحق آدمی کو دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ بھی صدقہ ہے اور اپنے اندر اجر و ثواب کی بہت بڑی مقدار لیے ہوئے ہے لیکن کسی کو اس صورت میں فائدہ پہنچانا جو مندرجہ بالا حدیث میں درج ہے، یہ بھی صدقہ کہلاتا ہے اور یہ صدقہ عام ہے جو صرف انسانوں تک محدود نہیں، جانور بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں

صدقے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی سے عملاً یا قولاً ہمدردانہ اور مخلصانہ برتاؤ کرنا، اگر وہ کسی ذہنی، جسمانی اور مالی طور پر پریشانی میں مبتلا ہے تو اس کو رفع کرنے کے لیے کوشاں ہونا۔ اگر وہ ضرورت مند اور بھوکا ہے تو اس کے لیے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے سامان مہیا کرنا۔ اگر بیمار ہے تو علاج کی سہولتیں بہم پہنچانا، اگر بھولا بھٹکا ہے تو اس کی صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرنا اور اگر خلاف شرع امور کا مرتکب ہے تو اس کی اصلاح کرنا اور نیکی کی طرف متوجہ کرنا۔ اگر بے کار ہے تو اس کے لیے کاروبار کی کوئی جائز صورت پیدا کرنا۔ بہر حال صدقے کی تعریف بڑی وسیع ہے اور اس کی حدیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر وہ چیز جو دوسرے کے لیے تسلی اور تسکین کا باعث ہو، صدقے کی عمومی تعریف میں آتی ہے —— اس طرح قدم قدم پر نیکی اور خیرات وحسنات بکھری پڑی ہیں۔ یہاں تک کہ کسی کو خندہ پیشانی سے پیش آنا اور اس سے شفقانہ اسلوب میں بات کرنا بھی صدقے میں داخل ہے۔ صحیح مشورہ دینا بھی صدقہ ہے۔

روپے پیسے کا صدقہ تو عام طور پر غربا ومساکین اور مستحقین ہی کو دیا جاتا ہے لیکن صدقے کی جو صورت اس حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے اس میں امیر اور غریب سب شامل ہیں۔ امیر بھی درخت کے سائے کا محتاج ہے اور اس میں بیٹھ کر آرام کرتا ہے۔ اگر وہ بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتا اور اونچے اونچے محلوں میں سکونت رکھتا ہے، جب بھی اسے درخت کے سائے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ مسافر ہے تو اس صورت میں دھوپ کی شدت اور سورج کی تمازت سے بچنے کے لیے لازماً درخت سے فائدہ اٹھائے گا۔ اگر وہ گھر میں ہے اور قریب ہی کسی غریب آدمی نے سایہ دار درخت لگا رکھا ہے تو وہ اس کے نیچے چارپائی یا کرسی بچھائے گا۔ یعنی یہ وہ صدقہ ہے جو غریب امیر پر اور امیر غریب پر کرتا ہے۔

سرکاری شاہ راہوں پر جو مزدور کام کرتے اور دو رویہ درخت لگاتے ہیں اگرچہ وہ اس کی اجرت لیتے ہیں تاہم یہ بھی صدقے کی ایک بہترین اور ہمیشہ رہنے والی صورت ہے۔ اس کے غریب اور امیر سب محتاج ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۹

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

تاثرات

مولانا غلام مرشد جو ایک عرصے سے بیمار تھے، ۴ استمبر ۱۹۷۹ کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم جید عالم اور نامور خطیب تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر علوم متداولہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں "انگہ" میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی، مزید حصولِ علم کے لیے دیوبند پہنچے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔ ان سے حدیث اور کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ اس ذہین و فطین طالب علم سے حضرت استاذ کو خاص قلبی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا اور وہ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ معقولات کی تکمیل کے لیے اجمیر کا قصد کیا اور وہاں کے فاضل اساتذہ سے مطولات اور اونچے درجے کی کتابیں [illegible]

فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور تشریف لائے اور یہاں کے مدرسہ [illegible] نانیہ میں فرائض تدریس انجام دینا شروع کیے۔ کافی عرصے تک اس مدرسے میں طلبائے علم کو مستفید فرماتے رہے۔ اس اثنا میں ان کی شہرتِ علمی تمام اصحابِ علم اور اربابِ فکر کے حلقوں تک پہنچ چکی تھی، جس سے متاثر ہو کر ۱۹۳۵ء میں انھیں لاہور کی بادشاہی مسجد میں منصبِ خطابت پر فائز کر دیا گیا۔ سالہا سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں سنہری مسجد (رنگ محل، لاہور) میں درسِ قرآن مجید کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے جاری رہا۔ درسِ قرآن میں الفاظ کے لغوی معنی، اصطلاحی مفہوم، تفسیری نکات اور ربطِ آیات کی وضاحت کرتے اور متعلقہ آیت سے جو مختلف و متنوع مسائل مستنبط ہوتے، ان کی صراحت فرماتے۔ نیز مشکل مقامات کا ایسے علمی مگر آسان الفاظ میں حل پیش کرتے کہ سامعین کے فہم کی گرفت میں آسکے۔ اس اعتبار سے یہ درسِ قرآن بڑی جامعیت اور انفرادیت کا حامل ہوتا تھا۔

[illegible] عرصے تک انجمن حمایتِ اسلام کی نائب صدارت کے عہدے پر بھی متمکن رہے۔

مولانا غلام مرشد مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک اور متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ وسعت

(باقی بر صفحہ ۱۱)

جناب ثروت صولت

یوگوسلاویا کے شہر اُسکپ میں عثمانی دور کی یادگاریں

اُسکپ جسے انگریزی میں (SKOPJE) لکھا جاتا ہے یوگوسلاویا کا ایک اہم تاریخی شہر ہے اور اس وقت یوگوسلاویا کی ریاست مقدونیہ کا دارالحکومت ہے۔ ترکی زبان میں اس شہر کو اُسکُپ کہا جاتا ہے۔ چودھویں صدی میں یہ شہر سرویا کی حکومت کے ماتحت تھا۔ ۱۳۸۹ء میں سلطان مراد خان اوّل نے سرویا کو عثمانی سلطنت کا باجگزار بنالیا اور اس طرح اسکپ پر عثمانی ترکوں کی بالادستی قائم ہوگئی۔ ۱۳۹۲ میں سلطان بایزید یلدرم نے اُسکُپ کو براہِ راست عثمانی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس وقت یہاں کوئی شہر نہیں تھا صرف ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ شہر کی بنیاد بایزید یلدرم نے رکھی اور اس کے بعد مراد ثانی نے اس کو توسیع و ترقی دی۔ عثمانی دور میں اُسکُپ ولایت قوصووہ (KOSOVO) کا صدر مقام اور بلقان میں شمال مشرقی سمت عثمانی فتوحات اور مہموں کے لیے مرکز کا کام دیتا تھا۔ ترکوں نے شہر کو مسجدوں، حماموں، مدرسوں، کتب خانوں، خانقاہوں اور دوسری عمارتوں سے آراستہ کیا۔ سترھویں صدی میں یہاں دس ہزار پختہ مکانات، ایک سو بیس مسجدیں، ایک سو دس سبیلیں اور بیس خانقاہیں تھیں۔ مدرسے، حمام اور کلب وغیرہ ان کے علاوہ تھے۔ اسکپ کا شہر جنوب مشرقی یورپ میں اسلامی تہذیب اور تمدن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ترکوں نے اپنے پانچ سو سالہ دورِ اقتدار میں جو تعمیری کام انجام دیے ان کی نشانیاں آج بھی قدیم شہر کے چپے چپے میں بکھری پڑی ہیں۔ ترکی ادب کے ارتقا میں بھی اس شہر کا اہم حصہ ہے۔ جدید ترکی کے سب سے بڑے شاعر یحییٰ کمال بیاتلی اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۶۸۹ میں جب آسٹریا کی فوج نے چھاپہ مارا تو اس کو جلا کر راکھ کردیا۔ ۱۹۱۲ میں جنگِ بلقان میں یہ شہر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس طرح اس شہر پر مسلمانوں کا اقتدار پانچ سو اکیس سال قائم رہا۔ اسکپ جب ترکوں کے ہاتھ سے نکلا تو اس وقت شہر کی ۳۲ ہزار آبادی میں سترہ ہزار مسلمان تھے۔ ۲۶ر جولائی ۱۹۶۳ء کو یہاں ایک شدید زلزلہ آیا اور اسلامی دور کی کئی عمارتیں اس درجہ شکستہ ہوگئیں کہ استعمال کے قابل نہیں رہیں۔ اہلِ سرویا کے حملے کے بعد یہ دوسری بڑی تباہی تھی جس کا اس شہر کی تاریخی یادگاروں کو سامنا کرنا پڑا۔

بہرحال ان تباہیوں کے باوجود شہر کے قدیم حصے کی عمارتوں پر آج بھی ترکی کی گہری چھاپ ہے اور ہر جگہ مسلمانوں کے ثقافتی اثرات نظر آتے ہیں۔ جرمن، ترکی اور یوگوسلاویا کی زبانوں میں شہر کی تاریخی یادگاروں سے متعلق متعدد تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔ ذیل کا مضمون ایک ترک فاضل ڈاکٹر سماوی اے یی جہ (EYiCE) کے مقالے کا ترجمہ ہے جو انقرہ کے ماہنامہ ترک کلتورو (TÜRK KÜLTÜRÜ) کی ستمبر ۱۹۶۳ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر سماوی نے زلزلے سے دو سال قبل ۱۹۶۱ میں اسکپ میں کچھ وقت گزارا تھا اور انھوں نے تاریخی عمارتوں کی تصویریں بھی لی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ مضمون بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ [مترجم]

قلعہ

ہر پرانے شہر کی طرح اسکپ میں بھی ایک قلعہ ہے۔ اولیا چلپی کے زمانے میں اس قلعے میں تین سو فوجی حفاظت کے لیے موجود رہتے تھے۔ قلعہ تراشے ہوئے پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ فصیل دوہری دیواروں کی ہے اور اس میں ستر برج ہیں۔ قلعے کی بنیاد غالباً ترکوں سے پہلے کی ہے لیکن قلعہ عثمانی دور کے آغاز میں تعمیر کیا گیا۔ ایک دروازے پر سلطان مراد ثانی کا نام اور ۱۴۴۶ء کندہ ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم قلعے کا ایک حصہ اس زمانے میں تعمیر کیا گیا ہوگا۔

جامع مراد ثانی

اسکپ میں ترکوں کے دور میں کئی بڑی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ ان میں سب سے اہم سلطان مراد ثانی کی مسجد ہے جس کو "جامع خونکار" بھی کہا جاتا ہے۔ مسجد کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد مراد ثانی نے ۱۴۳۶ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس کے بعد ۱۵۳۷ء میں یہ مسجد جل گئی اور سلیمان قانونی کے زمانے میں ۱۵۳۸ اور ۱۵۴۲ کے درمیان اس کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ ۱۶۸۸ میں جب آسٹریا کی فوجوں کا اسکپ پر قبضہ ہوا تو یہ مسجد ایک بار پھر آتش زنی کا نشانہ بنی اور سلطان احمد سوم نے ۱۷۱۰ء کے قریب اس کو پھر بنوایا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں سلطان محمد رشاد کے زمانے میں مسجد کی ایک مرتبہ پھر مرمت کی گئی۔ اس طرح یہ مسجد اب اپنی ابتدائی شکل میں نہیں ہے۔ مسجد کی بازو کی دیواریں اور رواق کسی قدر قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ اندرونی حصہ ستونوں کی دو قطاروں کے ذریعے تین حصوں میں تقسیم ہے۔ مسجد کی چھت لکڑی کی ہے جو اس قسم کی عمارتوں کے لیے عجیب معلوم ہوتی ہے۔ رومیلی میں ترکوں کے

تعمیر کردہ بیشتر میناروں کی طرح اس مسجد کا مینار بھی بہت بلند ہے۔

جامع مصطفیٰ پاشا

یہ مسجد ۱۴۹۲ یا ۱۴۹۳ کی تعمیر ہے۔ اس کو مصطفیٰ پاشا کسی شخص نے تعمیر کروایا تھا جس کے بارے میں علم نہیں کہ وہ کون تھا۔ مسجد کے بانی مصطفیٰ پاشا کا جب ۱۵۱۹ میں انتقال ہوا تو وہ اسی مسجد کے پاس دفن کیا گیا۔ عام طور پر مسجد کے بانی کے نام کو اس دور کے دوسرے لوگوں کے ناموں سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے جن کے نام مصطفیٰ پاشا تھے۔ اس مسجد کا نقشہ اور بیرونی منظر سیدھا سادا ہے لیکن اندرونی حصے صناعی کے نقطۂ نظر سے، خصوصاً دروازے، محراب اور منبر قابل دید ہیں۔ مسجد تین گنبدوں پر مشتمل ہے جن میں ایک بڑا ہے اور دو یکساں۔

جامع نور مالہ مینار

یہ مسجد ولایت تارلی کے امیر محمد بے نے ۱۴۹۴ء میں دریائے وردار کے پل کے پاس تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد ۱۹۲۵ میں گرادی گئی تھی اور اب اس کی جگہ ایک فوجی بارک تعمیر کی گئی ہے۔ یہ بات مجھے ان اخباروں سے معلوم ہوئی جن میں زلزلے کی خبریں دی گئی تھیں۔ لیکن قدیم عمارت کی جو ایک دو تصاویر ملتی ہیں ان کی مدد سے ہم اس کے طرز تعمیر کو کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ اس مسجد کا مینار چونکہ چکر دار تھا اس لیے اس کو نور مالہ مینار یعنی چکر دار مینار والی مسجد کہا جاتا تھا۔

جامع یحییٰ پاشا

یہ مسجد رومیلی کے حاکم سیدی بے یحییٰ پاشا نے ۱۵۰۴ میں بنوائی تھی۔ اس مسجد کے مینار کی بلندی پچاس میٹر ہے اور یہ اسکوپ شہر کا سب سے اونچا مینار ہے۔ مسجد مربع شکل میں ہے اور پانچ حصوں میں تقسیم ہے۔ اس کی چھت عجیب قسم کی نوکدار چھت ہے۔ ممکن ہے اس مسجد میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہوں اور اصل میں یہ مسجد گنبد والی ہو لیکن گنبد کے گر جانے کے بعد موجودہ چھت ڈالی گئی ہو۔

۱۴۶۹ میں اسحاق بے کے لڑکے محمد بے نے جامع محمد بے کے نام سے جو مسجد بنوائی اس کے بارے میں ان معلومات کے علاوہ جو مسجد کے کتبے پر درج کی گئی ہیں مزید معلومات حاصل کرنا ممکن نہیں۔

جامع اسحاق بے

اسکوپ کی بڑی مسجدوں میں دو مسجدیں ایسی ہیں جو فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے اور ان کے بانیوں کی تاریخی

اہمیت کی وجہ سے قابلِ توجیہہ ہیں۔ ان میں ایک جامع اسحاق بے ہے جس کو آلاجہ جامع بھی کہتے ہیں۔ یہ مسجد مراد ثانی کے دور میں ۱۴۳۸ء میں اسحاق بے بن پاشایگت ( ) نے بنوائی تھی۔ پاشایگت اس فوج میں شامل تھے جس نے اسکپ فتح کیا تھا۔ ۱۵۱۹ء میں اس مسجد کو اسحاق بے کے پوتے حسن بے نے مزید وسعت دی اور اس کی تجدید کی۔ پاشا یگت اور ان کے گھر والوں نے رومیلی کی فتح اور اس کو ترک رنگ دینے میں عظیم کردار ادا کیا ہے۔ موجودہ ترکی میں تراقیا (یوروپی ترکی) سے لے کر یوگوسلاویا میں سرویا تک اس خاندان کے اثرات عمارتوں کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسجد کے دائیں اور بائیں سمت میں مسافروں کے لیے خاص طرز کے کمرے بنے ہوئے تھے جن کو ترکی میں تابخانہ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی مسجدوں کو زاویہ والی مسجد کہا جاتا ہے۔ بعد میں ان کمروں اور گنبددار وسطی حصے کے درمیان حائل دیوار کو ہٹا دینے سے اس مسجد نے وہ شکل اختیار کر لی جس کو ترکی میں محلہ مسجد یا بازار مسجد کہا جاتا ہے۔

جامع علیسی بے

اسحاق بے کے بیٹے علیسی بے کی تعمیر کی ہوئی مسجد بھی بالکل اسی طرز کی ہے، لیکن طرزِ تعمیر جامع اسحاق بے سے کسی قدر بہتر ہے۔ طغرائی انداز میں جو کتبہ ہے اس میں مسجد کی تاریخ تعمیر ۱۴۷۵ء دی ہوئی ہے۔ یہ عالی شان عمارت پانچ گنبدوں پر مشتمل ہے جو ضخامت میں یکساں ہیں۔ دونوں اطراف میں دو دو تابخانے حجرے ہیں۔ اس طرز کی عمارتوں کا ابتدائی عثمانی دور میں بہت رواج تھا اور میرے خیال میں یہ حجرے درویش صفت اور صالح مسافروں کے قیام کے لیے بنائے جاتے تھے اور اس طرح اس دور کی مسجدوں نے اجتماعی اور دینی اداروں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

چند اور مسجدیں

کتابوں اور تصویروں کو دیکھنے سے اسکپ میں اور بھی چھوٹی چھوٹی مسجدوں کا پتا چلتا ہے جو عثمانی دور میں تعمیر کی گئی تھیں۔ شہر پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اور بھی مسجدیں نظر آتی ہیں۔ مسجدوں کی ایک بڑی تعداد اسکپ کے ترکوں کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد گرا دی گئی۔ کچھ زلزلے میں گر گئیں۔ مثال کے طور پر مداح بابا مسجد کا اب صرف ایک مینار باقی رہ گیا ہے۔ جامع قورشونلو خان پندرھویں صدی کی تعمیر ہے۔ ایک گنبد والی مسجد ہے اور اس کی دیواریں پتھر اور اینٹوں کے صاف ستھرے کام کا اچھا نمونہ ہیں۔ اس کا مینار مختصر سا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بونے کے سر پر بڑا سا کلاہ رکھ دیا گیا ہو۔ اس قسم کا مینار ایک اور مسجد کا ہے جسے آراستہ مسجد کہتے ہیں۔ یہ معمولی سی

مسجد ہے۔ شہر کی مسجدوں میں جامع خاتون مُجکلر بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس کی چھت سادہ ہے، لیکن باہر کی دیواروں پر پتھروں اور اینٹوں کا ملا جلا کام قابلِ توجہ ہے۔ سامنے کے حصے میں توازن پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس مسجد میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

خانقاہیں

۱۹۳۰ میں اُسکپ میں پندرہ خانقاہیں اور ان کے آثار موجود تھے۔ ان میں سے آٹھ خانقاہیں اب بھی آباد ہیں۔ ان میں رفاعی خانقاہ سب سے بڑی ہے جس کا کتبہ ۱۹۴۰ء میں پھر سے لکھا گیا ہے۔ ایک اور بڑی خانقاہ مولوی خانہ ہے۔ یہ پہلے ملک احمد پاشا کی حویلی تھی جو سترھویں صدی میں رومیلی کے والی تھے۔ رفاعی خانقاہ کے پاس قبرستان میں سترھویں صدی کے لوگوں کی قبریں ہیں۔ پروفیسر ایچ۔ ڈبلو دودا (DUDA) کی طرف سے شائع کی ہوئی تصویروں اور معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی خانہ عثمانی سلطنت کے آخری دور میں بڑا ہے یہ پھر از سرِ نو بنایا گیا اور اس وقت وہ اپنی اسی حالت میں موجود ہے۔ اولیا چلپی نے سکپ میں مداح بابا اور لقمان بابا کی خانقاہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

مدرسے

اُسکپ کے قدیم مدرسوں کی تعداد اور ناموں سے واقف ہونے کے باوجود ہمارے پاس ایسی معلومات نہیں جن سے ان کے فنِ تعمیر پر مفید روشنی پڑ سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمام بڑی مسجدوں میں ایک مدرسہ ہوتا تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ جنگِ بلقان کے زمانے میں شہر میں بارہ مدرسے کام کر رہے تھے۔ ان میں ایک مکتب سلطانی یا اُسکپ کالج تھا جس میں سلطان محمد رشاد پنجم ۱۹۱۱ میں رومیلی کی سیاحت کے دوران قیام پذیر ہوئے تھے۔ اس مدرسے کی عظیم عمارت آخری دور کے عثمانی طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

حمام

ترکوں نے اپنی مملکت کے ہر شہر کی طرح اُسکپ میں بھی کئی حمام تعمیر کیے۔ اولیا چلپی نے عیسیٰ بے چفتہ حمام اور جامع یحییٰ پاشا کے پاس واقع قزلر حمام اور شیخ گُل حمام کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں کم از کم چھ سات حمام ایسے موجود تھے جو صناعی اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے تھے اور غالباً اب بھی موجود ہیں۔ ان میں ایک داؤد پاشا حمام ہے جسے بوسنہ (بوسنیا) کے سنجق بے داؤد پاشا نے ۱۴۷۲ء میں بنوایا تھا۔ آخری دور میں اس کی مرمت بھی کی گئی۔ اس کا سامنے کا حصہ اینٹ اور پتھر کا ہے اور دو

کمرے لباس بدلنے کے لیے مخصوص ہیں - اس کی تعمیر عثمانی دور کے دوسرے حماموں کی طرح کی گئی ہے - اس پر جو کتبے لگے ہوئے ہیں ان کی تصاویر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اب اس حمام کو میوزیم بنا دیا گیا ہے - تیتنگل حمام اب استعمال کے قابل نہیں رہا - اس کی دیواریں پتھر اور اینٹ کے کام کا خوب صورت نمونہ ہیں -

دریائے وردر کا پل

اسکپ میں ترکوں کی ایک اہم یادگار دریائے وردر کا شاندار پل ہے - اس پل کے گرد و نواح کا علاقہ اب بالکل بدل گیا ہے اور پل کے چاروں طرف جدید طرز کی عمارتیں بن گئی ہیں - میں نے یہ پل ۱۹۶۱ میں دیکھا تھا اور شہر کے دونوں حصوں کو ملانے والی پُر ہجوم شاہ راہ اب بھی اسی پل پر سے گزرتی ہے - محکمۂ سیاحت کے ایک کتابچے کے مطابق جس کی علیمی بے کے آثار خانہ کی ایک دستاویز سے تصدیق ہوتی ہے، یہ پل سلطان مراد ثانی کے دور سے تعلق رکھتا ہے - اس کے علاوہ اسکپ کے عثمانیوں کے ہاتھ سے نکلنے سے ذرا پہلے دریائے وردر پر ایک جدید طرز کا پل بھی تعمیر کیا گیا تھا جس کا نام محمود شوکت پاشا پل تھا -

نظام آب رسانی

ترکوں نے اپنے دور میں اسکپ میں آب رسانی کا نہایت عمدہ نظام قائم کیا تھا - اولیا چلپی کے مطابق شہر میں ایک سو دس حوض اور فوارے تھے جن سے مختلف محلوں کو پانی بہم پہنچایا جاتا تھا - اگرچہ اس تعداد کی توثیق نہیں کی جا سکتی اور اس تعداد میں مبالغہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ ان کی بڑی تعداد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ برباد ہو گئی ہو - اس وقت اسکپ کے شمال مغرب میں اور اسکپ اور کچانک کے درمیان سے گزرنے والی شاہ راہ کے داہنی طرف شاندار پختہ نہریں (Aqueduct) دیکھی جا سکتی ہیں - ان محرابی نہروں کو بعض روایات کے مطابق علیے بے نے اور بعض روایات کے مطابق مصطفیٰ پاشا نے بنوایا تھا - اس وقت ان نہروں کے ۴۲ ستون اور ۵۵ محرابیں موجود ہیں - یہ محرابیں اکہری اینٹوں کی ہیں اور ستون پتھر اور اینٹ کے ہیں - ان نہروں کی پچھلی صدی کے آغاز میں حمزہ پاشا نے مرمت کی تھی - اسکپ کی یہ محرابی نہریں رومیلی میں پروان چڑھنے والے ترکی تمدن کا قابل ذکر نمونہ ہیں -

بازار اور منڈیاں

اسکپ کا شہر ایک بڑا تجارتی مرکز بھی تھا - چنانچہ ترکوں نے یہاں کئی بدستان اور کاروان سرائیں تعمیر کروائیں - اسکپ کا بدستان حسب معمول ایک قلعہ نما عمارت ہے جس کا دروازہ فولادی ہے -

بدستان جامع آلاجہ کے وقف کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ بازار ۱۹۴۲ تک موجود تھا، لیکن اس کے بعد کیا ہوا، یہ معلوم نہ ہو سکا۔

اُسکپ کی سراؤں میں قورشُنلو خان جس کو اب عجائب گھر بنا دیا گیا ہے سب سے شاندار ہے۔ پروفیسر ت۔ اوکچ (OKIG) کے ایک نوٹ کے مطابق یہ جگہ موذن زادہ حاجی مصلح الدین کی ملکیت تھی جنھوں نے سرائے کے پاس ایک مسجد تعمیر کی تھی اور ۱۵۵۰ء میں اس کو وقف قرار دیا تھا۔ یہ سرائے پتھر اور اینٹ کی سنگین عمارت ہے۔ درمیان میں ایک صحن ہے جس کے گرد اینٹوں کے گول ستونوں پر قائم محراب دار رواق ہیں۔

اسحاق بے کی بنائی ہوئی سرائے صولوخان دودا (DUDA) کے بیان کے مطابق خراب و خستہ ہونے کے باوجود اس وقت تک استعمال میں تھی۔ یہ بھی قورشونلو خان کی طرح دو منزلہ ہے اور صحن کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ اولیا چلیبی کے سفرنامے میں اور بھی کئی سراؤں کے نام ملتے ہیں، لیکن ان میں سے کون کون سی سرائیں اب موجود ہیں یہ معلوم نہیں۔

اسکپ کا گھنٹہ گھر بھی شہر کی عمارتوں میں ایک امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔ ترکی زبان میں اس کو "ساعت قُلّہ سی" کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد بہت پرانی ہے۔ اولیا چلیبی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس گھڑی کے گھنٹے کی آواز ایک دن کے فاصلے سے سُنی جا سکتی ہے۔ بعد میں اس کی کئی مرتبہ مرمت کی گئی۔ موجودہ عمارت ۱۸۸۹ کی ہے۔

قبرستان اور مقبرے

ترکوں کے زمانے کے قبرستان اور مقبروں کے بارے میں بھی ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں۔ جب اُسکپ عثمانی سلطنت میں شامل تھا تو ایک پوسٹ کارڈ پر ایک قبرستان کی تصویر دی گئی تھی، جس میں صرف سنگ ہائے مزار نظر آتے تھے۔ لیکن اس قبرستان کے علاوہ شہر میں کئی ایسے مقبرے موجود ہیں جو تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں بعض فنی کمال کے ایسے نادر نمونے ہیں جو ترکی فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے تحقیقات کا موضوع بن سکتے ہیں۔ چکر دار مینار والی مسجد کے پاس واقع قرلی ایلی بے محمد کا مقبرہ جسے مسجد کے ساتھ گرا دیا گیا ایک ایسا مقبرہ تھا جس کا بالائی حصہ شش گوشی (چھ کونوں والی) کلاہ کی طرح تھا۔ ابن بیکو اور کچانکلی کے مقبرے بھی گرا دیے گئے ہیں، لیکن ان کی تعمیری خصوصیات کے بارے میں ہمارے پاس وثیقے موجود ہیں۔

شہر کے مشرقی حصے میں ایک پہاڑی ڈھلوان پر واقع قبرستان کے سب سے اونچے حصے میں ایک مقبرہ ہے جسے لوگ قاضی بابا یا غازی بابا کا مقبرہ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مقبرہ دراصل اسکپ کے قاضی اور مشہور تذکرہ نگار عاشق چلپی متوفی ۱۵۷۱ء کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ اور اس کے ساتھ ہی خانقاہ آگ لگنے سے جل گئی تھی اور بعد میں حاجی غالب نے موجودہ شکل میں اس کو تعمیر کروایا۔ مقبرہ آٹھ گوشوں کی گنبد دار عمارت ہے۔

ایک اور مقبرہ فاتح غازی کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پاشا یگت کا ہے اور عوام اسے ملاح بابا کا مقبرہ کہتے ہیں۔ پاشا یگت نے اناطولیہ سے آکر رومیلی کی فتح میں بڑا کردار ادا کیا اور ان کی افسانوی شخصیت کے نقوش ترکی تراقیا میں کیشان یگت نامی گاؤں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اسحاق بے کا مقبرہ جو جامع اسحاق بے کے پاس ہے شہر کے مقبروں میں سب سے شاندار ہے۔ یہ آٹھ گوشوں والے گنبد کی شکل میں ہے۔ بالائی حصوں میں رنگین نقش و نگار ہیں۔ جہاں تک مصطفےٰ پاشا کے مقبرے کا تعلق ہے، یہ نسبتاً سادہ ہے۔ خاتون جکلر مسجد کے پاس خاتون جک مقبرہ اور جامع خونکار کے پاس واقع علی پاشا داغستانی کا مقبرہ کلاسیکی عثمانی طرز کا نمونہ ہیں۔ اوپر ایک ایک گنبد ہے۔ محرابیں نوکدار ہیں اور ستونوں پر قائم ہیں۔ جامع خونکار کے پاس ہی بیگی خان کا مقبرہ ہے جو ۱۵۵۶ء یا ۱۵۵۷ء کی تعمیر ہے۔ یہ مربع شکل کا مسقف مقبرہ ہے۔ اوپر ایک گنبد ہے۔

ایک اور مقبرہ آلتی ایاک (چھ پاؤں) کے نام سے موسوم ہے۔ گنبد نہیں ہے۔ اس کا اسلوب کلاسیکی ہے اور ستونوں پر قائم محرابوں کے درمیان ایک انتہائی خوب صورت قبر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یحتی بے کی قبر ہے۔

غازی بابا پہاڑی پر اسکپ سے کوبالووا کی طرف جانے والی سڑک پر کرال قزی تربیسی (بادشاہ کی لڑکی کی تربت) واقع ہے۔ یہ مقبرہ گنبد دار ہے۔ عمارت مربع شکل کی ہے اور چار ستونوں پر قائم ہے۔ یہ بھی ترکی انداز کا کھلا مقبرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سٹیفن کوترومانووک (STEFAN KOTRO MANOVIC) کی لڑکی کیتھرائن دفن ہے۔

ماخذ

۱۔ صالح عاصم: اسکپ تاریخچہ سی مطبوعہ ۱۹۳۲ء۔ اس کتابچے میں اولیا چلپی کے بیانات اور

۱۹۳۲ء میں اُسکپ کی صورت حال کو یک جا کر دیا گیا ہے۔

2. HERBERT DUDA : BALKANTURKISCHE STUDIEN (WIEN 1948.)

۳۔ ای - ایچ - آئیور: ی ، یوگوسلاویا میں ترکوں کی یادگاریں اور اوقاف - یہ دودا کی کتاب پر مبنی ایک مقالہ ہے جو ۱۹۵۷ء میں VAKIFLER DERGISI III (رسالہ اوقاف) میں شائع ہوا تھا۔

۴۔ توموکی : مقدونیہ کے انتہائی توجیہہ مقبرے - یہ مقالہ سروی زبان میں ہے اور اسکپ یونیورسٹی ٹکنیکل فیکلٹی کے سالنامہ ۵۸-۱۹۵۷ میں شائع ہوا۔

۵۔ کپانکلی محمد پاشا کا وقف نامہ جس کو حسن کلیشی (KALESI) اور محمد محمید و وچ- (MC-HMEDOVIC) نے ۱۹۵۸ میں اسکپ سے شائع کر دیا تھا۔

(بقیہ تاثرات)

معلومات اور علم و فضل میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اپنی رائے کے عالم دین تھے۔ نہایت خوددار اور حق گو تھے۔ نتائج سے بے پروا ہو کر بر سرِ منبر کلمۂ حق کہنا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ تحقیقِ مسائل اور طرقِ اظہار میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا۔ جو بات صحیح سمجھتے، بلا جھجک بیان کر دیتے۔ اس سلسلے میں کسی متعین اور مخصوص فقہی مسلک کو ملحوظِ خاطر نہ رکھتے — ان میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ غرورِ علم سے دل بالکل پاک تھا اور ذرائع شہرت سے اجتناب کرتے تھے، اسی لیے چھپنے سے ہمیشہ چھپتے رہے۔ ان کی ساختِ جسم اور جلالتِ علم کی بنا پر قرآن کے الفاظ میں کہنا چاہیے کہ بسطۃ فی العلم والجسم تھے۔

مرحوم نے تحریکِ قیامِ پاکستان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مل کر جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد ڈالی اور پاکستان کی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے بے حد تگ و دو کی۔

افسوس ہے، اس قسم کے اصحابِ فضل و کمال تیزی سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانچے ہی ٹوٹ گئے ہیں، جن میں ان اوصاف کے حامل لوگ ڈھل کر تیار ہوتے تھے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

پروفیسر مولانا علم الدین سالک
مرتب: پروفیسر احسان الٰہی سالک

مراد بیگم عُرف مُغلانی بیگم

(۲)

روشن الدولہ رستم جنگ نواب بھکاری خان کی شورش

ابدالی سے سند حاصل کرنے کے بعد بھی بیگم کا راستہ صاف نہیں ہوا تھا۔ ابھی اسے بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا تھا۔ قدم قدم پر رکاوٹ اور جگہ جگہ مصیبت تھی جسے دور کیے بغیر نہ اس کا راستہ صاف ہو سکتا اور نہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ دہلی میں اس کے دشمن موجود تھے، جو اس کے اقتدار پر حسد کرتے تھے اور اسے زک کرکے اپنے حسد و عداوت کی تسکین چاہتے تھے۔ اس کے اپنے دربار میں بھی ایسے بدخواہ اور ذلیل ذہنیت رکھنے والے امرا کی کمی نہ تھی جو یہ خیال کرتے تھے کہ ان کا اقبال اس کے زوال سے وابستہ ہے۔ بعض ایسے تھے جو معین الملک کی وفات کے بعد اس کے خرد سال بچے کی نظامت میں کسی بڑے عہد کی امید رکھے تھے۔ مگر انھیں امیدوں میں ناکامی ہوئی تھی، اس لیے وہ بھی اس کے خلاف تھے۔ ایسے امیروں میں نواب بھکاری خان بھی تھا۔ وہ معین الملک کا جگری دوست، سچا بہی خواہ اور بااختیار اہل کار تھا اور اس کی سرکار میں مختار و مدار المہام تھا۔ اس نے بڑی بڑی خدمات سرانجام دی تھیں۔ وہ ان چند امرا میں سے ایک تھا جن پر معین الملک پورا اعتماد رکھتا تھا اور اپنے مخلص جاں نثاروں اور باوفا دوستوں میں شمار کرتا تھا۔ ان خدماتِ جلیلہ کی بنا پر جو وہ معین الملک کی سرپرستی میں انجام دے چکا تھا اور جس کا علم دہلی دربار کو بھی تھا وہ خیال کرتا تھا کہ معین الملک کے خرد سال بچے کی نظامت میں نیابت کا عہدہ اسے ضرور ملے گا اور وہ پہلے کی طرح صوبے اور ناظم کے خاندان کی خدمات بجالاتا رہے گا۔ مگر حالات اور واقعات نے اس کے ان ارادوں کے خلاف پلٹا کھایا۔ بھکاری خان کی خواہشات کے خلاف منعم خان اس جلیل القدر رتبے پر فائز ہوا، جس کی تاک میں وہ لگا بیٹھا تھا۔ اس ناکامی اور مایوسی نے اس کے جذبات اور غم و غصے کو بے حد مشتعل کیا۔ وہ رنج کی وجہ سے آپے سے باہر ہو گیا اور اس شکست کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کیا، اس ارادے

کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے دہلی کا رُخ کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ معین الملک (میر منو) کا بھائی انتظام الدولہ اپنی بھاوج کے خلاف تھا اور اُسے قدم قدم پر زک دیتا تھا تھا۔ اسے مصیبتوں میں اُلجھا کر خوش ہوتا تھا۔ بھکاری خان کو اس مخاصمت اور عداوت کا علم تھا اور وہ اس سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب وقت آگیا ہے کہ نیابت کی کوشش کی جائے اور انتظام الدولہ کو اس کا ذریعہ بنایا جائے۔ وہ مغلانی بیگم کو تکلیف میں ڈالنے کے لیے اس کی پوری مدد کرے گا۔ اس طرح اسے نیابت کی سند مل جائے گی۔ ان خیالات اور ارادوں کو دل میں پالتے ہوئے وہ دہلی کے وزیر انتظام الدولہ سے ملا۔ وہ بھی بھکاری خاں کو مغلانی کے خلاف پاکر بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے دستخطوں سے اسے نیابت کی سند عطا کی اور اپنی کامل اعانت کا یقین دلاتے ہوئے اُسے فوراً لاہور پہنچنے کا حکم دیا۔ بھکاری خان شاداں و فرحاں لاہور آیا، نیابت کی سند پیش کی۔ مُغلانی بیگم یہ دیکھ کر حیران رہ گئی، مگر اس نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ بڑے دل گردے کی عورت تھی۔ اس نے فرمان اور سندِ نیابت کو ماننے سے انکار کر دیا اور بھکاری خاں کو ذلیل کر کے دربار سے نکال دیا۔ بیگم کے اس رویے اور اپنے مقاصد میں ناکامی سے اس کا غرور ٹوٹ گیا اور مایوسی اور ناکامی کے عالم میں اس نے فیصلہ کیا کہ اب اُسے پنجاب کی حکومت جبر و تشدد اور استبداد اور قوت کے استعمال سے حاصل کرنی چاہیے۔ اس فیصلے کے بعد اس کے دربار میں آمد و رفت ترک کر دی اور سازش کا وسیع جال بچھایا۔ اس نے خفیہ طور پر شر پسند قسم کے لوگ اپنے ساتھ ملانے شروع کیے اور تھوڑے ہی عرصے میں بہت سے افراد اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ قصور کے پٹھانوں نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ جب اُسے اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا تو اس نے بغاوت کا اعلان کیا اور اپنے محلات کے چبوتروں پر توپیں نصب کر دیں۔ بیگم نے ان حرکات سے روکنا چاہا مگر شورش پسندی کا بھوت اس کے سر پر سوار تھا۔ اس نے اس فہمائش کو بیگم کی کمزوری پر محمول کیا اور پہلے سے زیادہ عزم کا اظہار کیا۔ بیگم کے احکام کو پسِ پشت ڈال کر میدان میں اُتر آیا اور اپنے حریفوں کو یہ دکھانے کے لیے کہ وہی حقیقی طاقت و قوت کا سرچشمہ ہے، اس نے لوگوں کو دبانا شروع کیا اور ہر طریقے سے رعایا کو پریشان کرنے لگا۔ اس نے مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کرنے کے لیے سنہری مسجد کی بنیاد بھی رکھی۔ کہتے ہیں جب یہ مسجد تعمیر ہو کر تیار ہوئی تو ایک شاعر نے چپ چاپ یہ شعر رات کی تاریکی میں مسجد کے دروازے پر لکھ دیا:

بنا کردہ مسجد بھکاری خان بلشت   زراز زندہ بگرفت و از مردہ خشت

نواب نے یہ شعر پڑھا تو مارے غصے کے پیچ و تاب کھانے لگا اور برافروختہ ہو کر شاعر کی گرفتاری اور قتل کا حکم دیا۔ مگر پوری تحقیق و تفتیش کا نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہ ہوا اور اس کا کوئی سراغ نہ ملا[۱]۔

ادھر بیگم بھی غافل نہ تھی، وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور بظاہر خاموش اور بے تعلق معلوم ہوتی تھی مگر اندر ہی اندر تدبیر کر رہی تھی اور حالات کا مقابلہ کرنے اور بھکاری کے ارادوں کو ناکام بنانے میں مشغول تھی۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھی کہ اگر بھکاری خان کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ آزادانہ طور پر جو چاہے کرے اور اس کی باغیانہ حرکات اور شورش پسندانہ عزائم سے چشم پوشی کر لی جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اختیارات اور حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور اسے اور اس کی اولاد کو ذلت و رسوائی سے نامرادی اور ناکامی کی موت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ جانتی تھی کہ قوت کے دو زبردست ستون رعایا اور سپاہ ہیں۔ اگر انھیں قبضے میں کر لیا جائے تو پھر وہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ لوگ بھکاری خان کی چیرہ دستی اور ظلم سے تنگ آ چکے تھے اور اس کے ہر مخالف کی مدد کے لیے تیار تھے۔ سپاہ دولت کی بھوکی تھی، جو اُن کی حرص زر پوری کرے گا وہ اس کے ساتھ ہوگی۔ مغلانی بیگم نے خفیہ طور پر مغل سپاہ سے ساز باز شروع کی اور اُسے یقین دلایا کہ وہ نہ صرف ان کی تنخواہ میں بہت زیادہ اضافہ کرے گی بلکہ ان کا اعزاز بھی بڑھائے گی۔ یہ جادو سپاہ پر چل گیا اور وہ نواب بھکاری خان کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ خواجہ مرزا خان جیسا معتدل اور معتمد افسر بھی نواب بھکاری خان کا ساتھ چھوڑ کر بیگم سے آملا۔ بیگم نے اسے ایمن آباد کا علاقہ جاگیر میں دیا۔ اس طرح وہ خوش ہو گیا۔ اپنی وفاداری اور خلوص کا یقین دلانے کے لیے تنہائی میں وہ دربار میں آیا۔ نواب بھکاری خان سے ملا اور موقع پا کر اُسے گرفتار کر لیا اور خواجہ شہید خان کی حراست میں دے دیا[۲]۔ مغلانی بیگم کو ابھی کسی قدر اطمینان کا موقع ملا ہی تھا کہ ایک اور زبردست حادثہ پیش آیا جو اس کی اقتدار پسند اور جاہ پرست

---

[۱] عمدۃ التواریخ از سوہن لال، جلد اوّل - ص ۱۳۹

[۲] تحفۂ شاہ عامرہ - ص ۹۹

طبیعت کے سراسر منافی تھا۔ اس وقت مرکز کی طاقت بالکل کمزور تھی اس لیے مختلف علاقے اپنی آزادی کا اعلان کرکے دہلی کی حکومت سے باغی ہو رہے تھے۔ ہر جگہ بغاوت کے شعلے اُٹھ رہے تھے اور فتنہ و فساد کی آگ ہر طرف مشتعل ہو رہی تھی۔ اس قسم کے حالات معین الملک کی ناگہانی موت کی وجہ سے لاہور میں بھی پیدا ہو چکے تھے اور کم سن بچوں کی نظامت نے حالات کو اور زیادہ بدتر بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں دو عملی کا دور دورہ تھا۔ ایک طرف احمد شاہ ابدالی اسے اپنا مفتوحہ علاقہ تصور کرتا تھا اور وہاں اپنا عمل دخل رکھنا چاہتا تھا۔ دوسری جانب دہلی کا برائے نام شہنشاہ اسے اپنے ماتحت تصور کرتا تھا۔ یہ دو عملی خود سر اور خود غرض امرا کے لیے اپنی من مانی کارروائیوں کے لیے نہایت مفید تھی اور پھر اس صورت میں جبکہ وہاں کی عنان حکومت ایک عورت کے ہاتھ میں تھی، جسے اکثر امیر اپنی خودداری اور مردانہ وجاہت کے منافی خیال کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ خود یہاں کے مالک بن جائیں تو نظامِ حکومت زیادہ مضبوط، پائدار اور عوام کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ سکھوں کو بھی دوبارہ سر اُٹھانے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے پھر قدیم پیشہ غارت گری شروع کر دیا۔

قاسم خان کی بغاوت

اس دورِ اختلال میں ایک ترکی امیر قاسم کے سر میں یہ سودا سمایا کہ وہ سب کو مٹا کر خود لاہور کے صوبے پر قبضہ کرکے یہاں امن و امان قائم کرے۔ وہ معین الملک کا پروردہ تھا اور سپاہی سے ترقی کرکے جمعدار کے عہدے تک پہنچا تھا۔ اس نے معین الملک کی موت پر مُغلانی بیگم کو بڑی مدد دی اور بھکاری خاں کی تجاویز و تدابیر کا خاتمہ کرکے اس نے بیگم کے لیے راستہ صاف کیا۔ اس خدمتِ جلیلہ کی وجہ سے اُسے پٹی کا فوجدار نامزد کیا گیا تھا۔ بیگم اس کی خدمات سے اس قدر خوش تھی کہ اسے "پسر" کہہ کر پکارتی تھی۔ اس نے پٹی کی فوجداری کے وقت اسے کچھ توپیں عنایت کی تھیں۔ تین سو بدخشانی پیادے جو تلاشِ معاش کے لیے وہاں پہنچے تھے۔ ایک سو ترکی سپاہ، کئی ہزار پیادہ اور گھڑسوار سپاہی اور ہزاروں روپے بھی اس موقع پر عطا کیے[۵۳] یہ اظہارِ عنایت تو ایک خاص موقع پر ہوا تھا، اس کے علاوہ وہ بارہا اس کی عنایات سے بہرہ ور ہو چکا تھا۔

---

۵۳ سرکار - ۲، ص ۳ - ۵۲

لاہور سے رخصت ہوتے وقت قاسم خاں نے بیگم کی اجازت سے معین الملک کے خانہ دار غلام طہماسپ بیگ مسکین کو اپنے ہمراہ کیا تھا۔ اس نے پہلا پڑاؤ لاہور سے دو کوس کے فاصلے پر کوٹ لکھپت پر کیا۔ جہاں دوسرے دن مسکین بھی اس سے آملا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ مہمان نوازی کے اصول دل کھول کر ادا کیے اور دو سو اشرفیاں رقص و سرود پر صرف کرنے کے لیے عطا کیں۔[۵۴]

معین الملک کی وفات اور بعد کے پیدا شدہ حالات نے سکھوں کو پھر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع دیا۔ وہ ہر طرف سرکشی دکھانے لگے، چنانچہ مفتی علی الدین لکھتا ہے کہ

گروہ سکھیاں از سبب سستیٔ عمل بیگم صاحبہ و عزل و نصب ناسبان سکھیان غلبہ گرفتہ بودند۔[۵۵]

ایسا اتفاق ہوا کہ سکھوں سے اسی دن مڈبھیڑ ہوگئی۔ عام رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جارحانہ اقدام کرکے انھیں ختم کیا جائے، مگر خان اس تجویز کے خلاف تھا۔ اس نے نیم دلی سے سکھوں کا مقابلہ کیا اور کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کی اور کچھ عرصہ بعد اس نے آٹھ ہزار آٹھ سو (۸۸۰۰) سکھوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ لاہور کی جانب آیا اور اپنے خیالاتِ فاسدہ کا اظہار شروع کیا۔ وہ لاہور پر قبضہ کرکے دہلی کی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس لیے سکھوں کو بے دریغ روپیہ، اور اوزار اور اسلحہ سے نوازا۔ اس سے اس کی فوج میں بد دلی پیدا ہوگئی، اس وقت وہ شاہ بلاول کے مرقد کے قریب مقیم تھا۔ ایک دن اس کے سپاہیوں نے اس کے خیمے کی طنابیں کاٹ دیں اور اسے گرفتار کرکے بیگم کے پاس لے آئے۔ اس نے اسے اپنے محل میں نظر بند کرکے سخت چوکی پہرہ مقرر کیا۔ اب خانہ جنگی کا خدشہ ختم ہوگیا۔ مگر ابھی اسے چین کہاں۔ مئی ۱۷۵۴ء کو لاہور کا کم سن گورنر اور بیگم کا لڑکا محمد امین فوت ہوگیا۔ مسکین اور دوسرے مورخوں کا خیال تھا کہ بھکاری خاں نے اسے ایک خواجہ سرا کے ذریعے زہر دلوا دیا تھا۔ بیگم نے اس حادثے کے بعد اپنی نظامت کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے نمائندے دہلی اور قندھار روانہ کیے تاکہ وہ اس کے لیے سند حاصل کریں۔ اس معاملے میں اس کا مد مقابل عماد الملک وزیر دہلی ہو سکتا تھا جس کے ساتھ معین الملک کی لڑکی کی سگائی ہو چکی تھی۔ اس کی سفارت دہلی اس وقت پہنچی جب بادشاہ اور وزیر (عماد) کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ باہمی اتحاد رخصت ہو چکا تھا۔ یہ اس کے لیے نیک

---

[۵۴] سرکار بحوالہ روزنامچہ مسکین

[۵۵] تاریخ پنجاب از مفتی علی الدین - ورق ۱۱۷/الف

فال تھی کیونکہ ان حالات میں اس وقت پنجاب کے معاملات کی طرف توجہ دینا ناممکن تھا۔ احمد شاہ کے بعد عالمگیر ثانی نے منعم خان کو پنجاب کی نظامت دی، مگر اصلی قوت و شوکت کا سرچشمہ بیگم تھی، جس کے ہاتھ میں تمام طاقت اور عنانِ حکومت تھی۔

اختلال نظم و نسق

اب بیگم کے تمام حریف میدان سے بھاگ نکلے تھے اور ایسا کوئی امیر باقی نہ رہا تھا جو اس کے مقابلے میں امارت کا دعویٰ کر سکے یا اس کے خلاف بغاوت کرے۔ گویا اب وہ پنجاب کی مختارِ مطلق تھی اور بلاشرکت غیرے عنانِ اختیار ہاتھ میں لے کر حکومت کر رہی تھی۔ مگر یہ امر اس وقت کی رسوم و رواج اور روایات کے سراسر منافی تھا کہ ایک پردہ نشین خاتون ایک صوبے کی نظامت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا کر ذاتی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ ترکی امیر اسے اپنی غیرت کے سراسر خلاف کرتے تھے ان کے تصور میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا کہ ایک عورت کی تخلیق کی غایت حکومت کرنا بھی ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنا حق خیال کرتے تھے۔ اس لیے اس کے خلاف دل ہی دل میں جذبات اُبھر رہے تھے اور حقارت کے احساسات بیدار ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ بیگم کے ایک قریب ترین عزیز (ماموں) نے برملا کہہ دیا۔

گفتہ خواجہ سرایان ہر کجا شدہ پیش رفت کہ برآید کام مردان زان فریق نامراد[۵۶]

یہ تو گھر کی حالت تھی۔ صوبے کے حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ وہ ایک آہنی عزم، مستقل مزاج اور باعزم ناظم کے متلاشی تھے۔ تاکہ بدنظمی، بدامنی، اختلال اور پریشانی حالات کا قلع قمع کیا جائے۔ سب سے بڑھ کر اس تصویر کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ بیگم کے ہاتھ، کان اور آنکھیں خواجہ سرا تھے۔ وہ ان کے ذریعے دیکھتی، ان کے واسطے سے سنتی اور ان کے توسط سے معاملات کو طے کرتی تھی۔ اس لیے اب خواجہ سراؤں کا دور دورہ تھا۔ صوبے کے امرا اور دیوان جیسے دیوان بخشی، فوجدار وغیرہ سب سے اول منعم خان کے سلام و مجرا کو حاضر ہوتے تھے۔ پھر وہاں سے بیگم کی ڈیوڑھی پر حاضری دیتے سلام کرتے اور احکام کے منتظر رہتے، جو بیگم کی طرف سے خواجہ سرا انھیں سناتے تھے۔ اس وقت بیگم کے سب سے بڑے رفیقِ کار اور مشیر تین خواجہ سرا تھے۔ میاں خوش فہم، میاں ارجمند اور میاں

---

۵۶ مآثر الامرا۔ جلد ا، ص ۳۶۰

مہابت ...! سب سے بڑی بدبختی یہ تھی کہ شامتِ اعمال سے یہ تینوں شاذ و نادر کسی مسئلے پر متفق ہوتے تھے - یہ چیز ملک سے بڑھ کر بیگم کی تباہی اور ہلاکت کا باعث ثابت ہوئی - اس طرح تمام وقار ختم ہوگیا - نظامِ حکومت میں خلل پیدا ہوا - فتنہ و سرکشی نے ہر طرف سے سر اٹھانا شروع کیا - جا بجا فساد رونما ہوئے - چنانچہ ایک مورخ لکھتا ہے :

" بیگم کی سادگی کی وجہ سے ہر ایک افسر اپنے معاملات کو اپنے رنگ میں پیش کرتا تھا اور باہمی تعاون نام کو نہ تھا - غلام خواجہ سرا حکومت کر رہے تھے - کاشت کار پہلے سے بدتر حالات میں تھے - تمام نظام درہم برہم ہوگیا تھا - سکھوں نے زیادہ شدت سے سرکشی کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا "[۵۷]

ایسی صورت میں ہوتے اس لیے کہ ملک کا نظم و نسق تباہ ہو جائے اور کیا ہو سکتا تھا - ملتان کا علاقہ ابدالی کے ناظم کے ماتحت تھا - امرتسر، پٹیالہ، پٹھانکوٹ، کلانور میں سکھوں کی قوت نے زور پکڑ لیا تھا - گجرات کے چار عمال (یعنی گجرات، اورنگ آباد، پسرور اور سیالکوٹ) پر مشتمل تھے جو رستم خان کے ماتحت تھے، اور وہ ابدالی کا نامزد اور اپنے علاقے کا مختار تھا - آدینہ بیگ دوآب جالندھر کا مالک تھا جو لاہور سے آزاد تھا - ستلج اور جمنا کا درمیانی علاقہ شہنشاہ دہلی کے ماتحت تھا - فقط لاہور اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ایسا تھا جو ہنوز لاہور کے ماتحت تھا، مگر وہاں بھی بغاوت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے -

خاوند کی جوان مرگی، اختیارات کا اتنا، حریفوں پر فتح - یہ وہ اسباب تھے جنھوں نے بیگم کو آپے سے باہر کر دیا تھا -

دہلی دربار کے اعلیٰ ترین افسروں کی خامیاں اور اخلاقی کمزوریاں تھیں - یہ بات چنداں مستحسن نہ تھی - اس کے علاوہ آزاد روش اختیار کرنے نے اور بھی آزاد کر دیا -

مسکین کہتا ہے :

" بعضے شب تا علی الصباح ہم از حضور بیگم صاحبہ رہائی نمی شد بلکہ اکثر بعضے سخنہا کہ عقل ہرگز قبول نکند برزبان می آوردند "[۵۸]

---

[۵۷] سیر المتاخرین ۳، ص ۵۱ — سرکار ۱، ص ۴۴

[۵۸] مسکین - مزید دیکھو غلام علی لاہوری — شاہ عالم نامہ مطبوعہ کلکتہ، ص ۲۶ — میشو پرشاد ۳۹ ب — خزانۂ عامرہ، ص ۹۸ - ۹۹

درباری بھلا اسے کب برداشت کرسکتے تھے۔ بیگم نے اب جو رویہ اختیار کیا تھا وہ کہاں تک اعتنا کے قابل ہوسکتا تھا۔ انھوں نے تنگ آکر بغاوت شروع کی۔ سب سے اوّل خواجہ مرزا خان اوزبک نے علم بغاوت بلند کیا۔ وہ معین الملک کا معتمد امیر تھا۔ اکثر سکھوں کے خلاف مہمات پر نامزد ہوتا رہا اور کامیاب رہا تھا۔ اوزبک سپاہیوں کو اس پر پورا اعتماد تھا۔ اپنے آقا کی موت کے بعد وہ بھکاری خان کے ساتھ مل گیا مگر مدبّر عورت نے اسے خان کا خطاب اور ایمن آباد کا پرگنہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس نے اپنے علاقے میں امن وامان قائم کیا۔ سکھوں کا خاتمہ کیا، اس طرح اس کا رعب قائم ہوگیا۔

بھکاری خان صاحبِ تدبر تھا، وہ جانتا تھا کہ حالات نے اُسے مغلوب کر دیا ہے، مگر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا اور کوشش ترک کر دینا ایسی شاہراہِ عمل نہ تھی جو ایک باتدبیر، بلند ہمت، عالی حوصلہ انسان کے شایانِ شان ہوتی۔ اس نے خواجہ مرزا کے بھائی خواجہ محمد سعید خان سے سلسلہ جنبانی شروع کیا اور کہا: "درحرم نواب مغفور رخنہ پدید آمد" لیکن اس صورت میں مناسب اور سیدھا راستہ یہی ہے کہ انتظام کی عنان مرزا خواجہ اپنے قبضے میں لے لے۔ وہ اس فیصلے کی رو سے لاہور آیا۔ خواجہ سعید نے فوج اور سپاہ کو پیشتر ازیں اپنے ساتھ ملا رکھا تھا، وہ خواجہ مرزا کے ساتھ مل گئے۔ اس نے بیگم کو حراست میں لے کر اسے ایک مکان میں نظر بند کر دیا اور اس کی ڈیوڑھی کی تلاشی لینی شروع کی اور اسے جواہرات اور قیمتی زیورات، سونا چاندی کے اسباب اور مال و دولت سے بالکل خالی کر دیا۔ اس طرح اس عظیم الشان ڈیوڑھی میں کوئی بھی قابل ذکر چیز باقی نہ رہی۔ مسکین کہتا ہے:

اس کے بعد مرزا خواجہ بیگم کو اس کے محل میں واپس لایا۔ اس وقت میں (مسکین) اور محمد عاقل زرہ بکتر پہنے بیگم کے قصر میں گئے۔ انھوں نے ایک خواجہ سرائے کے ذریعے یہ گزارش پہنچائی کہ خواجہ مرزا اور بھکاری خان اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر انھیں حکم دیا جائے تو وہ انھیں اسی وقت ایک ہی وار میں ختم کرسکتے ہیں۔ مگر انھیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔

اگلی صبح کو سات یا آٹھ ہزار یو۔ پی پیادوں نے مرزا خواجہ کے آدمیوں پر حملہ کیا مگر وہ شکست کھا کر تتر بتر ہوگئے۔ اب اسے سرکاری محل سے علیحدہ کرکے اس کی ماں کی ڈیوڑھی میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ بات بھی زیادہ موثر ثابت نہ ہوئی۔ وہ نظم و نسق کے قائم کرنے میں ناکام رہا۔ اس کے ہم وطن سپاہیوں نے

اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے مقامی افسر اور با اثر لوگوں نے اپنے اپنے حلقے میں اپنا اثر قائم کرلیا۔ اس کے باوجود خواجہ نے سکھوں کو دبا لیا۔ مرزا خواجہ نے اپنی صوبے داری کا اعلان کیا اور سب امیروں کو مجبور کیا کہ وہ نذر نیاز پیش کریں اور آداب و کورنش بجالائیں۔ اس طرح باہمی چشمک پھر سے پیدا ہو گئی اور باہمی عدم اتحاد اور حسد و رقابت کے جذبات پھر سے بیدار ہونے۔ ادھر مغلانی بیگم بھی مارے غصے کے انتقام کے انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ وہ ہر قیمت پر بھکاری اور مرزا کا زوال دیکھنا چاہتی تھی اور اس طرح اپنی تباہی کا بدلہ لے کر دل ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے اپنی سفارت قندھار بھیجی، اس میں خواجہ عبد اللہ خان (بیگم کا ماموں) عبد الصمد خان سابق ناظم لاہور کا چھوٹا بیٹا اور نواب زکریا خان کا چھوٹا بھائی شامل تھے۔ انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے سامنے مغلیہ سرداروں کی مخالفت و چیرہ دستی کا شکوہ کیا اور یہ ذہن نشین کرایا کہ میر منو کی وفات کے بعد پنجاب میں فتنہ و فساد، بدامنی اور قتل و غارت کی ساری ذمہ داری مغل سرداروں پر عائد ہوتی ہے۔

بادشاہ نے ان کی باتوں پر غور کیا اور پشاور کے ناظم جہان خان کے بھائی امان خان کو چار ہزار سپاہ کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ پنجاب میں جائے اور پھر سے بیگم کو وہاں کے اختیار سونپ آئے۔ یہ امیر جو باہم منافقت سے اکٹھے تھے بھلا تازہ دم افغان فوجوں کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ خواجہ مرزا اور اس کے ساتھی بھاگ گئے۔ شہر میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا۔ ایک مصنف کہتا ہے کہ "چالیس لاکھ روپے فوج نے لوگوں سے لوٹے۔ بیگم کو گدی پر متمکن کیا گیا اور خواجہ عبد اللہ اس کا نائب مقرر ہوا۔ بھکاری خان بیگم کے حوالے ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بیگم کے روبرو لایا گیا۔ بیگم نے اسے بری طرح سے پٹوایا۔ وہ بے بہا کے جوتے اور لاٹھیاں پڑیں کہ پناہ بخدا۔ خواجہ سرا اسے گھونسے مارتے تھے اور ساتھ ہی کہتے تھے کہ تمھاری گردن پر دو خون ہیں (معین الملک کا اور محمد امین خاں کا) یہ ان کا قصاص ہے۔" جب وہ بے ہوش ہونے لگا تو بیگم نے اپنے خنجر سے اسے دو چرکے لگائے۔ آخر وہ اسی حالت میں مرگیا۔ اس کی لاش شہر پناہ کی خندق میں پھینک دی گئی۔[۵۹]

(باقی آئندہ)

---

۵۹ خزانہ عامرہ، ص ۹۹ — سیر المتاخرین جلد دوم، ص ۵۱ — شاہ عالم نامہ، ص ۲۶ — سوہن لال، ۱، ص ۱۳۹۔ غلام علی (بھکاری خان کا بیٹا تھا)۔

جناب رحمت فرخ آبادی ایم۔ اے

مقدمہ بغاوت کراچی اور مولانا محمد علی جوہر

ـــــ تیسری اور آخری قسط ـــــ

مولانا محمد علی جوہر کے بیان کے بعد مندرجہ ذیل فرد جرم ملزموں کو پڑھ کر سنائی گئی۔

آج بتاریخ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو بی، سی، کینیڈی، آئی، سی، ایس جوڈیشنل کمشنر سندھ کی عدالت میں مندرجہ ذیل افراد (۱) محمد علی رام پوری، (۲) حسین احمد مدنی دیوبندی (۳) ڈاکٹر سیف الدین کچلو امرتسری (۴) پیر غلام مجدد سرہندی مٹیاری (۵) مولانا نثار احمد کانپوری (۶) بھاوتی کرشنا تیر تھ جی (۷) شوکت علی رام پوری۔ جنھیں ایس، ایم، ملانی، سٹی مجسٹریٹ کراچی نے سشن سپرد کیا تھا، پیش کیے جاتے ہیں۔

(الف) اور آپ ساتوں ملزم کسی وقت یا اوقات میں فروری ۱۹۲۰ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء کے درمیان کراچی اور برطانوی ہند کے دیگر مقامات پر مسلمان افسروں اور سپاہیوں کو فوجی ملازمت سے باز رکھنے کی سازش میں شریک تھے اور آپ نے دفعہ ۱۲۳ ب / دفعہ ۱۱۵ اور ۱۳۱ تعزیرات ہند کے تحت قابل تعزیر جرم کا ارتکاب کیا، جس کی سماعت کا سشن کورٹ کو اختیار ہے۔

(ب) مزید برآں ملزم نمبر ۱ محمد علی نے غالباً ۹ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں اس قسم کے الفاظ کہے کہ "اس وقت ہر مسلمان کے لیے برطانوی فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی ہونے کی ترغیب دینا مذہباً ناجائز ہے" ان الفاظ سے ملزم کا یہ ارادہ تھا یا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مسلمان افسر اور سپاہی اپنی اپنی ملازمتوں سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس طرح ملزم زیر دفعہ ۵۰۵ تعزیرات ہند کے قابل تعزیر جرم کا مرتکب ہوا، جس کی سماعت اس عدالت کے دائرہ اختیار میں ہے۔

(ج) اور یہ کہ مندرجہ سازش کی تائید اور حمایت میں جولائی یا اگست ۱۹۲۱ء کے دوران سازشی جماعت کے ایک رکن یا ارکان نے مسلمان افسروں کو ملازمت چھوڑ دینے کی ترغیب دی اور ان میں کتابچے تقسیم کیے جو عدالت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ گویا اس طرح انھوں نے زیر دفعہ ۱۲۰/۱۹۰ الف

۱۳۱ تعزیرات ہند جرم کا ارتکاب کیا جس کی سماعت کا اس سیشن کورٹ کو اختیار ہے۔

(د) اور یہ کہ ملزم ۲ سے ۷ تک نے ملزم نمبر ایک کے ساتھ سازش کر کے اسی کی طرح زیرِ دفعہ ۵۰۵ تعزیراتِ ہند مذکورہ بالا جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس لیے وہ زیرِ دفعہ تعزیراتِ ہند ۱۰۹/ ۵۰۵ مجرم ہیں، اور اس کی سماعت کا اس کورٹ کو اختیار ہے۔

(ہ) ملزم نمبر ایک محمد علی نے غالباً ۹ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں زیرِ دفعہ ۵۰۵ یا دفعہ ۱۳۱ تعزیراتِ ہند جس جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس کے ساتھ اس جرم میں دس سے زیادہ افراد شریک کار رہے ہیں۔ ملزم نے آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی میں اپنی تقریر میں کہا کہ "تمام مسلمانوں کا بالعموم اور تمام علما کا بالخصوص یہ فرض ہے کہ وہ (مذہبی احکام کا حوالہ دیتے ہوئے) ان الفاظ کو ہر مسلمان فوجی ملازم کے ذہن نشین کرا دیں۔ اس طرح ملزم زیرِ دفعہ ۱۱۷ تعزیراتِ ہند قابلِ تعزیر جرم کا مرتکب ہوا، جس کی سماعت اس عدالت کے اختیار میں ہے۔

(و) مزید یہ کہ ملزم نمبر ۲ سے ملزم نمبر ۷ تک نے ملزم نمبر ایک محمد علی کے ساتھ سازش کر کے اور اس طرح کی زیرِ دفعہ ۱۱۷ تعزیراتِ ہند مذکورہ جرم کا ارتکاب کیا ہے، اسی لیے وہ بھی زیرِ دفعہ ۱۱۷/ ۱۰۸ تعزیراتِ ہند قابلِ تعزیر جرم کے مرتکب ہیں، جس کی سماعت کی یہ عدالت مجاز ہے۔

اس کے بعد عدالت نے ملزموں سے ارتکابِ جرائم کے بارے میں پوچھا کہ آیا وہ مرتکب ہوتے ہیں یا نہیں، تو سب نے اقبالِ جرم سے انکار کیا۔ پھر ارکانِ جیوری کے ناموں کا اعلان ہوا، جس میں مندرجہ ذیل پانچ افراد شامل تھے۔

(۱) مسٹر دیارام گدومل (۲) مسٹر ڈی، سوزا، سی (۳) مسٹر رام چند تلسی داس (فورمین)
(۴) مسٹر ڈی کرز آر (۵) مسٹر کریٹچل ڈی

ارکانِ جیوری کے ناموں کے بعد ان کے وکیلِ استغاثہ نے عدالت سے خطاب کیا اور اس کے بعد استغاثہ نے گواہوں کے بیانات ہوئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ابتدائی سماعت کی عدالت میں استغاثہ نے [illegible] پیش کیے تھے، لیکن سیشن [illegible] ان میں سے مندرجہ ذیل گواہوں کو پیش نہ کیا:

[illegible] والا مسودات [illegible]

۲۔ جے رام داس۔ صوبیدار۔ ۹۸ انفنٹری بڑودہ۔

۳۔ محمد ہاشم صوبیدار ۱۰۶۔ پائنیر کوئٹہ۔

۴۔ مسٹر کیکی، پی، اے۔ ڈپٹی کمشنر پولیس بمبئی۔

۵۔ مسٹر ڈھولارام نروان مارداڑی، سب انسپکٹر سی، آئی، ڈی، پونا۔

۶۔ مسٹر موٹوانی نمائندہ اخبار ڈیلی نیوٹائمز۔ کراچی۔

۷۔ سید عبدالکریم انسپکٹر سی، آئی ڈی پولیس۔ مدراس۔

۸۔ مسٹر اسمارٹ ڈبلیو، ڈبلیو۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی۔

البتہ مندرجہ ذیل چار نام ہمیں ملتے ہیں، جنھیں استغاثے نے صرف سشن کورٹ ہی میں پیش کیا۔

۱۔ فرینک بروسٹر۔ سرکاری ماہر فنِ تحریر شملہ۔

۲۔ پھول چند۔ سب انسپکٹر پولیس، پونا

۳۔ سندر ناتھ سبن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سامٹ۔

۴۔ محمد حسین صوبیدار۔ ۱۰۶۔ ہزارہ از کوئٹہ۔

سشن کورٹ کی سماعت کے دوسرے دن مورخہ ۲۵ راکتوبر ۱۹۲۱ء کا اہم واقعہ یہ ہے کہ سماعت شروع کرنے کے لیے جب جج عقب کے دروازے سے کمرۂ عدالت میں داخل ہوا تو سامعین کی اکثریت اس کے احترام میں کھڑی ہو گئی لیکن علی برادران اور ان کے رفقا اور سامعین کی کچھ تعداد بیٹھی رہی، چنانچہ جب جج نے خشم گین نگاہوں سے ملزموں کی طرف دیکھا تو انھیں مطالعے میں مصروف پایا۔ اس پر اس نے سرشتہ دار سے کہا کہ وہ ملزموں کو عدالت کے احترام میں کھڑے ہونے کا حکم دے، لیکن انھوں نے سرشتہ دار کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر جج نے ان کی کرسیاں اٹھا لینے کا حکم دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے فوراً چند کاغذات زمین پر بچھائے اور ان پر بیٹھ گئے اور مولانا محمد علی نے اپنا کوٹ فرش پر بچھا دیا اور اس پر شنکر اچاریہ سے بیٹھنے کو کہا۔ ایک دفعہ پھر جج نے رہنماؤں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، جسے انھوں نے نہ مانا۔ اس پر پولیس سپرنٹنڈنٹ سے جج نے کہا کہ وہ ملزموں کو زبردستی کھڑا کرے۔ جب وہ مولانا محمد علی کے پاس آیا اور جج کے الفاظ دہرائے کہ عدالت کے احترام میں کھڑے ہو جاؤ، تو انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں حکومت کا احترام ہوتا تو اس عدالت

میں ہم پر یہ مقدمہ کیوں چلایا جاتا، جج جو چاہے کہے ہم خود کھڑے ہونے کو تیار نہیں، وہ ہمیں صرف جبر اور طاقت ہی سے کھڑا کر سکتا ہے ۔ اس پر جج نے کہا کہ اگر تم نے اپنی ہی بات پر زور دیا تو میں تم پر توہین عدالت کے الزام میں مقدمہ چلاؤں گا۔ اس سلسلے میں ضیاء الدین احمد برنی لکھتے ہیں کہ مقدمہ کراچی میں سرکاری وکیل نے جس سے مولانا کی پرانی شناسائی تھی، آخر ایک دن پوچھ ہی لیا کہ مسٹر محمد علی میں نے دیکھتا ہوں کہ آپ جج کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے، حالانکہ آپ دیکھتے ہیں کہ میں خود کھڑا ہو جاتا ہوں تو مولانا محمد علی نے جواب دیا کہ آپ کو تو اس بات کی فیس ملتی ہے[1]

اسی طرح تیسرے دن یعنی ۲۶ راکتوبر ۱۹۲۱ء اور مابعد جب ملزم رہنمایانِ قوم کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے تو پچھلے دن کی طرح فرش پر ہی بیٹھ گئے اور سامعین کی اکثریت نے بھی ان کی پیروی کی۔

بعد میں جب جج نے ملزم رہنمایانِ قوم سے جرح کرنا چاہی تو سب نے یہی جواب دیا کہ اگر ہمارا بیان نہیں لیا جائے گا تو ہم کسی سوال کا جواب نہ دیں گے۔ یہ تمام کارروائی خلافِ قانون اور ناجائز ہے۔ اس طرح استغاثے کی طرف سے شہادتوں کے ختم ہونے کے بعد عدالت نے ملزموں سے اپنی صفائی پیش کرنے اور گواہ پیش کرنے کو کہا تو سب نے انکار کر دیا اور مولانا محمد علی نے کہا کہ میں ارکانِ جیوری کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ عدالت نے مجھے بیان دینے کی اجازت نہیں دی۔

سیشن کورٹ کے اجلاس کے چوتھے دن کی کارروائی ۲۷ اکتوبر کو ہوئی، اس دن وکیلِ استغاثہ نے ملزموں کے خلاف الزامات کے ثبوت میں ساڑھے تین گھنٹے تک دلائل اور گواہوں کے بیانات کے حوالے دیئے تعزیراتِ ہند کی متعلقہ دفعات پر اظہار خیال کیا۔

وکیل استغاثہ کی بحث کے ختم ہونے کے بعد مولانا محمد علی نے ارکانِ جیوری کو خطاب کیا۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ خطاب زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خطاب دوسرے دن بھی جاری رہا۔ اس سلسلے میں حسن ریاض لکھتے ہیں کہ جیوری کے سامنے محمد علی نے دو روز تقریر کی۔ عجیب تقریر، عظیم تقریر، فصاحت و بلاغت میں بے نظیر، دلائل و براہین میں لاثانی۔ جس وقت مولانا محمد علی کی یہ

---

[1] سہ ماہی نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر جلد دوم صفحہ ۱۱۶۱

تقریر شائع ہوئی تو سب نے کہا کہ جیوری کے سامنے سقراط کے ایڈریس کے بعد یہ دوسرا ایڈریس ہے [۱۵] درحقیقت مولانا محمد علی جوہر کے اس خطاب کو مقدمات کی تاریخ کا شاہ کار کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے اس خطاب میں مقدمے کی نوعیت کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ مقدمہ یاس انگیز حد تک کمزور ہے اور اس میں بے بنیاد شہادتیں پیش کی گئی ہیں اور یہ کہ یہ مقدمہ ان کے اور ان کے رفقا کے خلاف نہیں بلکہ خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ:

"مجھے اپنی صفائی پیش کرنا منظور نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ یہ مقدمہ ہمارے خلاف نہیں خود حکومت کے خلاف، اس جج کے خلاف، حکومت کی طرف سے مقدموں کی پیروی کا جو نظام ہے، اس کے خلاف اور اس تمام قانون کے خلاف ہے جس کے تحت یہ مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ اس وقت جو مسئلہ زیر بحث ہے بہت صاف اور واضح ہے، چنانچہ اس سلسلے میں، میں نے ماتحت عدالت میں بھی حکومت کا شکریہ ادا کیا تھا کہ وہ پہلی بار کھلے بندوں ہمارے سامنے آئی اور اس نے ہمارے لیے ایک اور موقع فراہم کردیا کہ ہم اس سے ایک صاف اور صحیح مسئلے سے متعلق فیصلہ کراسکیں۔ یہ صاف اور صریح مسئلہ ہے کہ برطانوی رعایا کے لیے خدا کا قانون زیادہ اہم ہے یا بادشاہ کا قانون، یعنی ایک انسان کا قانون . . . اس مسئلے پر بہت حد تک دنیا کی تاریخ کا دارومدار ہے کہ اس مہذب صدی میں انسان کا حکم زیادہ قابل اطاعت ہے یا خدا کا۔ مقدمے کا عنوان محمد علی اور اس کے ساتھی ایک طرف اور برطانوی حکومت دوسری طرف نہیں، بلکہ خدا ایک طرف اور انسان دوسری طرف ہے، یعنی یہ مقدمہ خدا اور بندے کے درمیان ہے"۔

انھوں نے کہا کہ سارا سوال یہ ہے کہ کیا ملکہ وکٹوریہ کے اعلان سے مسلمانوں کے مذہب کی حفاظت ہوتی ہے یا نہیں۔ میرا دعویٰ یہ ہے اور میں اس کے بارے میں آپ کا فیصلہ چاہتا ہوں کہ اگر ہم ایک مسلمان سپاہی کو برطانوی فوج کی نوکری چھوڑ دینے کو کہیں اور مسلمانوں کو برطانوی فوج میں بھرتی ہونے سے روکیں اور ہم یہ ثابت کردیں کہ ایسا کہنے کا حکم ہمیں قرآن کریم نے دیا ہے تو نہ ہم قانون کی گرفت میں آسکتے ہیں اور نہ آپ ہمیں سزا دے سکتے ہیں، یعنی جہاں تعزیراتِ ہند اور قرآن پاک ایک دوسرے کے خلاف نہیں پڑتے وہاں تو تعزیراتِ ہند کا حکم مسلّم، لیکن جہاں تعزیراتِ ہند

پاکستان ناگزیر تھا — ص ۱۱۵

احکام قرآنی کے خلاف ہو جاتے، وہاں تعزیرات ہند کا حکم نہیں چل سکتا - یہ ہے ہمارا مقدمہ۔ اگر میں اپنے اس دعوے میں غلطی پر ہوں تو آپ مجھے بتا دیں، میں مطمئن ہو جاؤں گا۔

اپنے اس جیوری کے خطاب میں مولانا محمد علی نے مذہبی آزادی کی اہمیت بھی بیان کی اور اس بات پر بھی زور دیا کہ ملکہ وکٹوریہ، شاہ ایڈورڈ اور شاہ جارج نے اپنے اعلانات میں ہماری مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی کہا کہ "جب مجھے اپنے ملک میں سوراج مل جائے گا تو میری کوشش یہ ہوگی کہ کوئی شخص میرے ہم وطنوں کو ان کے خدا اور اس کے عاید کردہ احکام سے ورغلانے کی کوشش نہ کرسکے، لیکن جب تک میں برطانوی ہند میں رہتا ہوں، میرا حق ہے کہ میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے نام پر اپنے مذہب کی حفاظت کا مطالبہ کروں۔ اگر میں ہندو ہوتا تو بھی میں یہی کہتا۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "ہم آقاؤں کی تبدیلی نہیں چاہتے کہ انگریز نکلیں تو کوئی اور طاقت ہمارے سروں پر سوار ہو جائے - بے شک ہم اس ملک میں جلد از جلد ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں کہ جو متحدہ ہندوستان کے لوگوں کے سامنے جواب دہ ہو۔"

مجرمانہ سازش کے تحت معاہدہ کرنے کے الزام کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر نے کہا کہ:

"مجرمانہ سازش کے سلسلے میں ہم پر آپس میں معاہدہ کرنے کا جو الزام ہے، اب اس کی حقیقت بھی سنیے۔ کسی آدمی نے، کسی ایک آدھ گواہ نے بھی یہ نہیں کہا کہ اس نے ہمیں آپس میں سازش کرنے یا جرم کو ارتکاب کرنے کے لیے معاہدہ کرتے ہوئے دیکھا یا سنا یا اسے ہم پر اس کا شک ہوا۔ میں فروری ۱۹۲۰ میں انگلستان میں تھا اور غالباً خاص اسی دن جس دن کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی اور اس میں یہ قرار داد منظور کی گئی، میں قائم مقام وزیر ہند سے مل رہا تھا۔ یہ ہے میرے خلاف مجرمانہ سازش کرنے کی شہادت۔ شاید اسی لیے جرم کو ثابت کرنے کے لیے بجائے ثبوت کے محض قیاس آرائی سے کام لیا گیا۔

انھوں نے مزید کہا کہ اسی طرح دو اور ملزم جو ہماری طرح کٹہرے میں موجود ہیں، ان کو بھی اس خلافت کانفرنس میں اس قرار داد پر تقریر کرنے سے پہلے آپس میں معاہدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان حضرات سے تو مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اس خاص مسئلے سے متعلق شریعت کا حکم بتائیں، چنانچہ انھوں نے بتا دیا اور اس میں فوج کے بارے میں جو کچھ تھا وہ کسی فعل کے کرنے کا ارتکاب نہ تھا بلکہ اسلام کے ایک قانون کا اعلان تھا اور بس۔ اب آپ ہی اندازہ لگا لیجیے کہ اس سے مجرمانہ سازش کے لیے معاہدہ کرنے کا ثبوت

کہاں سے آ گیا!"

مولانا محمد علی جوہر نے آل انڈیا خلافت کانفرنس کراچی کی اس قرارداد کو جو اس مقدمے کی بنیاد تھی ایک مستقل عزم اور پکے ارادے کا فیصلہ قرار دیا اور پھر دفعہ ۵۰۵ کے تحت جو الزام لگایا گیا تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ خدا سے وفاداری ہر چیز پر مقدم ہے۔ پھر تاریخ کے حوالے سے یہ بھی ثابت کیا کہ آج کے مجرم کل کو سزاوارِ تحسین ہوا کرتے ہیں، اور پھر اپنے خطاب کے آخر میں کہا کہ" مجھے بادشاہ سے کوئی ذاتی عناد نہیں اور نہ جج سے اور نہ حکومت ہی سے۔ میری پبلک تقریروں میں سے ایک مثال بھی میرے اس دعوے کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔ حضرات! اور یہ ٹھیک بھی نہیں۔ ہمیں اپنے اعمال میں پبلک کے بھلے کو پیش رکھنا چاہیے نہ کہ کسی سے اپنی ذاتی پرخاش کو . . . حضرات! ہم دونوں بھائیوں کے نام حضرت علی کے متبرک نام پر رکھے گئے ہیں، اور میرے نام کا ایک جزو تو اس ذات کے نام پر ہے جو حضرت علی سے بھی بڑی ہے، میں اپنی ذاتی پرخاش کے لیے تو ایک راکھشش کو بھی قتل کرنے میں شریک نہیں ہو سکتا لیکن خدا کے لیے تو میں ہر ایک کو قتل کر سکتا ہوں اور کسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اپنے بھائی کو قتل کر سکتا ہوں، اپنی پیاری بوڑھی ماں کو، اپنی بیوی کو، اور اپنے بچوں کو سب کو خدا کے لیے اور خدا کی راہ میں قتل کر سکتا ہوں —— خدا مجھے اس کی توفیق دے۔ (جب مولانا محمد علی جوہر ان الفاظ پر پہنچے تو ان کی آواز بھرا گئی اور ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ بالکل نڈھال ہو کر بیٹھ گئے)۔

مولانا محمد علی جوہر کے خطاب کے بعد بالترتیب مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے ارکانِ جیوری سے خطاب کیا، اور مقدمے کی کارروائی کے چھٹے دن یعنی ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو پیر غلام مجدد سرہندی، مولانا نثار احمد کانپوری، شری شنکر اچاریہ اور مولانا شوکت علی نے خطاب کیا۔ ہم طوالت کے خوف سے ان رہنماؤں کے بیانات سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

مقدمے کی کارروائی کے ساتویں دن یعنی یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو عدالت کے سررشتہ دار نے فردِ جرم ارکانِ جیوری کو پڑھ کر سنائی۔ پھر جج نے ارکانِ جیوری سے خطاب کیا، اس کے بعد ایک بج کر دس منٹ پر عدالت نے جیوری کو صلاح مشورے کے لیے وقت دیا۔ چنانچہ ساڑھے تین بجے عدالت کا اجلاس دوبارہ ہوا، تو جیوری کے سرپنچ مسٹر رام چند تلسی داس نے جج کے دریافت کرنے پر ارکانِ جیوری کی طرف

سے کہا کہ دفعہ ۱۳۱ اور ۱۲۰ (ب) کے بارے ارکانِ جیوری کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ملزموں میں سے کسی پر بھی نہ تو ملک معظم کی فوج کے سپاہیوں کو ورغلانے کی سازش کا الزام ثابت ہوتا ہے اور نہ کسی سپاہی کو فوج کی خدمت سے روکنے کا، اس لیے ہماری رائے میں جملہ ملزم بے قصور ہیں۔ چنانچہ جج نے جیوری کے اس فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے دفعہ ۱۳۱ اور ۱۲۰ (ب) کے جرائم سے ملزموں کو باعزت طور پر بری کر دیا۔

بقایا دفعات کے بارے میں سر جج نے کہا کہ اس سلسلے میں دیارام گدومل کی رائے یہ ہے کہ تمام ملزم جملہ الزام سے بے قصور ہیں لیکن ہم چار کی متفقہ رائے یہ ہے کہ سوامی شنکر اچاریہ کے سوا باقی تمام ملزم دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ قصوروار ہیں اور مولانا محمد علی پر دفعہ ۱۱۷ کا جرم بھی ثابت ہے۔ ارکانِ جیوری نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ انھوں نے فیصلہ کرتے وقت ملزموں کے مذہبی عقائد کو ملحوظ نہیں رکھا۔ چنانچہ جج نے ارکان جیوری کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سوامی شنکر اچاریہ کو تو بری کر دیا لیکن باقی تمام ملزموں کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا دی اور مولانا محمد علی کو زیر دفعہ ۱۱۷ مزید دو سال کی سزا کا حکم سنایا لیکن یہ شرط عاید کر دی کہ دونوں سزائیں ایک ساتھ شروع ہوں گی۔

قید بامشقت کی سزا عام طور پر سول عدالتیں، سیاسی رہنماؤں کو سیاسی مقدمات میں نہیں دیتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگیو کی ذاتی درخواست پر جو انھوں نے ۳ نومبر ۱۹۲۱ء کو وائسرائے سے کی، قید سخت کی پابندی ختم کر دی گئی، لیکن اس کا باضابطہ اعلان نہ کیا گیا، کیونکہ وائسرائے کے خیال میں ایسے اعلان سے تحریک ترک موالات کو بڑی تقویت ملتی ہے[۵۳]

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی پر الگ الگ زیر دفعہ ۱۲۴ اور ۱۵۳، ایک اور مقدمہ چلایا جانے والا تھا، لیکن حکومت نے ان مقدموں کو واپس لے لیا اور ان کی سماعت کی نوبت نہ آئی۔

مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقا سینٹرل جیل کراچی میں غالباً فروری ۱۹۲۲ء تک رہے، اس کے بعد کراچی سے منتقل کر دیئے گئے۔ اس عرصے میں ان پر کیا بیتی؟ اس بارے میں سر حاجی عبداللہ ہارون نے ۸ فروری کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام لکھا کہ "ان کو کھانا اچھا نہیں ملتا اور اس وجہ سے جیل

---

۵۳ Life and Times of Muhammed Ali by Afzal Iqbal, Lahore 1974, P: 278-279.

میں کم مقدار میں کھاتے ہیں۔ کل سے جیل میں سب قیدیوں نے اسٹرائیک کی ہے۔ سنا ہے مولانا شوکت علی اور ان کے ساتھیوں سے بُرا برتاؤ دیکھ کر کی ہے۔ اللہ اکبر کے نعروں کی آواز دور دور سے سننے میں آتی ہے۔[۴۶]

اسی طرح ۱۰ فروری کو اس افواہ پر کہ علی برادران کو قتل کر کے جیل کے احاطے میں دفن کر دیا گیا ہے، ایک جمِ غفیر جس کا کوئی لیڈر نہ تھا جمع ہو گیا، چنانچہ فساد کو روکنے کے لیے مولانا محمد علی نے اُن کے سامنے تقریر کی اور واپس جانے کی درخواست کی۔ ۲۸ فروری کو مولانا شوکت علی، ڈاکٹر کچلو، مولوی نثار احمد کان پوری اور پیر غلام مجدد سرہندی سے برہنہ ہو کر تلاشی دینے کو کہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر ۳ فروری کو ان کی زبردستی تلاشی لی گئی۔[۴۵]

بہر حال کراچی کے قیدی کچھ روز بعد الگ الگ کر دیے گئے۔ مولانا شوکت علی راجکوٹ گئے محمد علی کے حصے میں بیجاپور (دکن) کا جیل آیا۔ بیجاپور کے قیدی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر ناوقت اُسے چھینک آجاتی تو اس کی بھی برقی تاریں دوڑنے لگتیں۔ اسی طرح دم کے دم میں یہ خبر بھی ملک کی فضا میں گونج جاتی۔[۴۶] اسی طرح پیر غلام مجدد سرہندی کو رتناگری جیل بھیجا گیا۔ انھوں نے حسن خندہ پیشانی سے رتناگری جیل میں یہ عرصہ گزارا، اس کی وجہ سے انھیں پورے برصغیر میں شہرت حاصل ہو گئی۔[۴۷] اور مولانا حسین احمد مدنی کو سابرمتی جیل احمد آباد گجرات میں داخل زنداں کیا گیا۔ وہاں ان پر جو کچھ بیتی اس کا تذکرہ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے ایک خط مرقومہ رمضان ۱۳۴۸ھ میں مولانا زاہد حسین صاحب امروہہ کے نام کیا ہے۔[۴۸]

بہر حال اگست ۱۹۲۳ء کی آخری تاریخیں تھیں کہ جب مولانا کو قیدِ فرنگ سے رہا ہوئے۔ بیجاپور جیل

---

[۴۶] سہ ماہی نقوش۔ خطوط نمبر حصہ دوم، ص ۱۱۰

Life and Times of Muhammad Ali, Page 283-284.

[۴۶] محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند اوراق جلد اول۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی ۱۹۵۴ء اعظم گڑھ، ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

[۴۷] جنب گزار بیر جن جلد اوّل۔ جی، ایم، سید۔ حیدرآباد ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۱، ۲۱۲۔

[۴۸] مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم۔ مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی۔ دیوبند ۱۳۷۲ھ، ص ۸۰، ۸۴۔

سے چپ چاپ پھانسی لائے گئے اور یہاں اسٹیشن پر چھوڑ دیے گئے - ملک بھر میں ایک جشن مسرت و شادمانی برپا ہوگیا اور لوگوں نے بے حد خوشی منائی - ملک کی کیسی کایا پلٹ ان دو برسوں میں ہوگئی، اس کا اندازہ خود مولانا محمد علی کے ایک مضمون سے کیجیے جو کئی سال کے بعد جنوری ۱۹۲۹ء کے ہمدرد میں ان کے قلم سے نکلا - انھوں نے لکھا کہ "ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہاسبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا - خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد باردولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈالنے کے مترادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیے گئے - ان کے قید ہوتے ہی پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھوداس آں جہانی آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے جس کا یادش بخیر اب پھر کلکتہ میں نام لیا گیا ہے، گیا میں سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا - پھر لطف یہ کہ ہندو مہاسبھائیوں نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کیں، جنھوں نے مذہبی تعصبات کی آگ کو بھڑکا دیا، جنھیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے اور ان کے جواب میں مسلمانان پنجاب میں اسی عنصر نے وہ زبانی جمع خرچ تبلیغ و تنظیم کے نام سے دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے - اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا اور جب مجھے جیل خانے ہی میں اس کا احساس ہوا تو میں نے اس طرح اظہار کیا کہ :

یہ حالت ہوگئی ہے، ایک ساقی کے نہ ہونے سے — کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

یہ تھی وہ روداد چمن جو دوسری گرفتاری سے رہائی پر میں نے سنی [۵۹]

لیکن گاندھی جی نے یہ تحریک اس طرح اچانک کیوں ختم کی، کیا گورکھپور کے موضع چورا چوری کے حادثے سے وہ زیادہ متاثر تھے - اس بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے مولانا حسن ریاض لکھتے ہیں کہ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان تحریک میں بڑی قوت کے ساتھ شریک تھے - خود کانگریس کے نظام میں ان کا غلبہ تھا اور خلافت کے معاملے میں ان کے ساتھ صریح زیادتی کرنے کے بعد حکومت اس تلاش میں تھی کہ کسی طرح اس نقصان کی تلافی کر کے مسلمانوں کے دل سے اس کی تلخی کو رفع کرے - لہٰذا یہ قرینہ تھا کہ

---

۵۹ محمد علی - ذاتی ڈائری کے چند ورق - جلد اوّل، ص ۱۱۶ : ۱۱۷

ملک کے آئندہ سیاسی بندوبست میں وہ مسلمانوں کے مطالبات کو وقعت کی نظر سے دیکھتی۔ مسٹر گاندھی کو یہ منظور نہ تھا، اس لیے انھوں نے سمجھوتے کی ہر تجویز مسترد کر دی اور پھر تحریک کو یکایک اس لیے بند کیا کہ کانگریس اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں مسلمانوں کا جو دخل ہو گیا تھا، وہ ختم ہو جائے۔[۱۰]

اس طرح راجا غضنفر علی خاں نے ان خیالات کا اظہار کیا کہ خلافت کمیٹی اور کانگریس کی مشترکہ تحریک عدم تعاون کے زمانے میں مسلمانوں نے وقتی طور پر اس سوال کو پس پشت ڈال دیا تھا جو سر سید احمد خاں اور سید امیر علی کے وقت سے ان کے سیاسی تدبر کا جزو بنا ہوا تھا کہ ہندوستان کی جمہوری آزادی کے نظام میں مسلم اقلیت کی پوزیشن کیا ہو گی؟ جو تحریک علما کے اس فتوے کے تابع تھی کہ مسلمانوں کے لیے انگریزی حکومت کے ساتھ ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس تحریک کے لیے سیاسی نفع و نقصان اور عواقب و نتائج کے متعلق سوچ بچار کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ جہاں تک مولانا محمد علی جوہر کے انداز فکر کا تعلق تھا، اس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم قوم کے مستقبل کا سوال کسی مرحلے پر بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا، لیکن وہ دو باتوں میں امتیاز کرتے تھے، اگر کسی انقلابی تحریک کے ذریعے ہندوستان میں انگریزی حکومت کو ختم کیا جا سکے تو مولانا اس کے مابعد کا خطرہ مسلم قوم کے نقطۂ نگاہ سے قبول کرنے کو تیار تھے، لیکن اگر بظاہر انقلابی تحریک کا مقصد صرف یہ ہو کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈال کر اس کے ہاتھ سے آزادی کا آئین حاصل کیا جائے اور نافذ کرایا جائے تو پھر مولانا کے خیال کے مطابق اس آئین میں مسلمانوں کی جگہ پہلے سے متعین کرانے کا مطالبہ لامحالہ درست اور ضروری تھا۔[۱۱]

بہرحال تحریکِ خلافت کا دور برصغیر میں مسلمانوں کے لیے نہایت نازک دور تھا۔ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں تمام ہندو اور مسلمان رہنما گرفتار کر لیے گئے اور باہر رہنے والی تیسرے درجے کی قیادت اس قابل نہ تھی کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دے سکتی۔ تحریک خلافت کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے کے بارے میں مختلف رہنماؤں نے مختلف زاویۂ نگاہ اختیار کیا ہے،

۱۰؎ پاکستان ناگزیر تھا، سید حسن ریاض ۔ ص ۵۴

۱۱؎ مارشل لا سے مارشل لا تک ۔ مرتبہ سید نور احمد ۔ لاہور ۱۹۷۰ء ۔ طبع چہارم، ص ۴۰

لیکن پھر بھی اقتصادی طور پر یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ اس تحریک سے مسلمان خسارے میں رہے ، انھوں نے بڑی تعداد میں ملازمتوں سے استعفے دیے ، جائیدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں اور مکمل عدم تعاون کی راہ اختیار کی ، جبکہ ہندوؤں کا تعلق نہ ہجرت سے تھا اور نہ وہ ترکِ موالات کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کے اس نظریاتی فرق سے انگریز نے فائدہ اٹھایا اور ہندو اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے منصوبے بنائے ، چنانچہ جو سامراج مولانا محمد علی جوہر کو مذہبی آزادی تک نہ دے سکا ، اس نے ہندوؤں کی انسداد گاؤکشی ، شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کو مکمل آزادی دی ، اور اس طرح اس دور میں ہندوؤں کی مختلف تنظیموں نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ان ہی تحریکوں کے نام پر ملک کے طول و عرض میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا ۔ یہ ملک گیر فسادات اتنے دردناک تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی مولانا محمد علی جوہر کو بھی علی گڑھ میں کہنا پڑا کہ " اگر مسلمانوں اور ہندوؤں میں خوں ریزی اسی طرح جاری رہی تو ہندوستان ، ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا"[۲۱]

---

[۲۱] تاریخ نظریۂ پاکستان ۔ پیام شاہجہان پوری ۔ لاہور ۱۹۷۰ء ۔ ص ۲۷۹ ۔

جناب محمد بشیر ایم اے

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور اکابر علمائے دین

برصغیر پاک و ہند میں تجدید و احیائے دین کی مساعی کا جائزہ لیا جائے تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے زمانی تقدم کے بعد خانوادۂ شاہ ولی اللہؒ پر نظر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اللہ کے دین کی حفاظت و اشاعت میں سرگرمی، اولوالعزمی، جاں سپاری، دیدہ وری، نکتہ رسی اور حکمتِ بالغہ کا جو منظر یہاں نظر آتا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دین حق کے لیے اپنی شبانہ روز مساعی سے بے نظیر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے دین کے نام پر ہونے والی بے دینی کا تار و پود بکھیر دیا۔ پانی پت کا میدانِ کارزار سجا کر مرہٹوں کے "رام راج" کے خواب کو ہمیشہ کے لیے پریشان کر دیا۔ "امامت کبریٰ" کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے سیاسیات کو مجتہدانہ شان سے شرعی منہاج پر پیش کیا اور اس سلسلے میں "حجۃ اللہ البالغہ" تصنیف کی، اور ابھی "تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیتِ اصحابِ استعداد" کی منزل طے ہو رہی تھی کہ آپ کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔

ولیس کل ما یتمنی المرء یدرکہ   تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

آپ کے جانشینوں نے آپ کے مشن کو شایانِ شان طریقے سے آگے بڑھایا اور "تقاضائے وقت کے مطابق اسی قدوسی روح کی نسل سے ایک مردِ روحانیت کاملہ لے کر اٹھتا ہے: جس کی جامعیت مسلّم، وہ معاً مفسر بھی ہے محدث بھی، فقیہ بھی ہے اصولی بھی، مجاہد بھی ہے اور متکلم صوفی بھی، بایں ہمہ سیاسیاتِ شاہ ولی اللہ کا پورا ماہر نظر آتا ہے۔ یہ وہ پاک باز ہستی ہے جس کو اہلِ بصیرت علامۂ شہید، شاہ شہید، مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی، عالمِ نبیل، فاضلِ جلیل، فقید المثیل رحمہ اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"[1]

---

[1] مولانا غلام مصطفیٰ، دیباچہ منصبِ امامت اردو، ص ج لاہور ۱۹۴۹ء

آئندہ سطور میں چند مشائخ اور اکابر علمائے دین کے ترشحاتِ قلم اسی عظیم شخصیت کے ضمن میں پیش کیے جارہے ہیں:

سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ شاہ اسمٰعیل شہید اور شاہ محمد اسحاق کو خاص عطیۂ الٰہی قرار دیتے ہوئے یہ آیتِ قرآنی پڑھا کرتے تھے:

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحٰق [۲۵]

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق عطا کیے۔

شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسینؒ اور مولانا محمد نقی خان صاحب (ہر دو از تلامذہ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاقؒ) ایک استفتا کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں:

اس راقم الحروف نے حضرت ممدوح کو بخوبی دیکھا اور فیوض و برکاتِ ربانی ان کی صحبت سے اور انوارِ ایمانی ان کی مجالسِ وعظ و نصیحت میں پاتے، اور ہزاروں منکرین، خدائے تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب اور ہزاروں فاسقین دائم الخمر اور زانی بدکار ان کی صحبت کی برکت سے تائب اور پارسا ہوگئے۔

حضرت مولانا حافظِ قرآن مجید، ضابطِ احادیثِ رسول حمید، حاجی الحرمین الشریفین، عالمِ ربانی، باعمل، عارفِ معارفِ سبحانی، باخیر غازی و مجاہد فی سبیل اللہ، مہاجر فی محبت رسول اللہ، قامع بنیانِ شرک اور بدعت باعث احیائے سنت، حامیِ دین و ملت تھے، غرضیکہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو اس ذاتِ والاصفات نے بعوض محبت خدا اور رسول میں نثار کرکے رتبۂ شہادتِ کبریٰ حاصل کیا۔ اللھم اوصلہ فی درجات رضوانک بفضلک و رحمتک۔ (اے اللہ اپنے فضل اور رحمت سے ان کو اپنی رضامندی کے درجات تک پہنچا دے)۔

نزدیک مجیب کے مولانا مرحوم مرتبۂ اولیائے کاملین کا سا رکھتے ہیں۔ ان میں اولیائے سابقین کے سے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ شرع شریف کی رُو سے خدا کا ولی اور رسول کا مقبول وہی ہو سکتا ہے کہ جس کی صحبت میں خدا رسول کی محبت زیادہ ہووے اور ایمان صیقل پاوے، گناہ چھوٹیں اور عبادت بڑھے، اللہ جل شانہٗ کا خوف اور رسول مقبول کی راہ کی محبت دل میں پڑے، دنیا سے بیزاری اور آخرت کے کاموں میں شوق زیادہ ہو، سو یہ سب خوبیاں حضرت مولانا ممدوح کی صحبت میں موجود تھیں، اور نیز اُن کی مصنفہ کتب میں پائی جاتی ہیں۔ جن لوگوں کو دیدۂ بصیرت اور نورِ ایمان اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ہے وہ دریافت کرلیتے ہیں۔۔۔

---

[۲۵] مولانا محمد میاں۔ مسلمانوں کا شاندار ماضی، ج ۲، ص ۱۷۱، طبع لاہور ۱۳۹۷ھ / ۱۹۷۷ء

اکثر آیاتِ قرآنی و ارشاداتِ رحمانی و احادیثِ صادقہ حضرت رسولِ مقبول ﷺ کے مولانا کے حالِ صافی پر منطبق و صحیح منطوق ہیں، مگر بخوفِ طوالت بعض کو ذکر کرتا ہوں:

قال اللہ تعالیٰ ومن یخرج من بیتہ مہاجرا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ۔ الآیہ

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربہم یرزقون فرحین بما اتٰہم اللہ من فضلہ۔ الآیہ

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کے ارادے سے اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ پھر اس کو موت نے آلیا تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ واقع ہوگیا ۔ ۔ ۔

اور ان لوگوں کو جو اپنے اللہ کی راہ میں قتل ہوجائیں مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، رزق دیے جاتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے عنایت کیا ہے، اس پر خوش ہیں ۔ ۔ ۔

الغرض مولانا صاحب کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونا اور عالم دیندار، متقی اور پرہیزگار اور محدث اور حافظِ قرآن ہونا آفتاب کی مانند ثابت ہے ۔ ۔ ۔

کتبہ العبد المسکین محمد نقی ختم اللہ لہ بالحسنیٰ [۵۳]

سید محمد نذیر حسین	محمد نقی خان

مولانا محمد نقی صاحب مرحوم اپنی تصنیف لطیف "النشر در ردِ مقولاتِ عشر" میں خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"... شاہ ولی اللہ صاحب خاتم المحدثین و شاہ عبدالعزیز صاحب آخر المفسرین و شاہ رفیع الدین صاحب راس المحققین و شاہ عبدالقادر صاحب قدوۃ العارفین و شاہ محمد اسمٰعیل شہید قاطع بنیانِ معاندانِ دین و شاہ محمد اسحاق صاحب زبدۃ الصالحین و علو خاندانی این حضرات علماً و عملاً شہرۂ آفاق است و تصنیفاتِ گراں مایہ شان دلیل اول بر حقانیت و اختیار مذہب اہل سنت و ظہور سنیت ایشان کالشمس فی رابعۃ النہار است و عالمی از فیوضاتِ علمی شان حظ وافر بر داشتہ مستعد ادای شہادت

---

۵۳ محمد نذیر حسین، فتاویٰ نذیریہ ج ۱، ص ۱۰۷ تا ۱۰۸، لاہور ۱۹۰۱ء

سنیت[۵۴]

شاہ ولی اللہ صاحب خاتم المحدثین اور شاہ عبدالعزیز صاحب آخر المفسرین اور شاہ رفیع الدین صاحب رأس المحققین اور شاہ عبدالقادر صاحب قدوۃ العارفین اور دشمنانِ دین کی بنیادوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے والے شاہ محمد اسمٰعیل شہید اور خلاصۃ صالحین اور اس خانوادۂ ولی اللّٰہی کے علمی و عملی شہرۂ آفاق وارث شاہ محمد اسحاق صاحب جن کی گراں مایہ تصانیف ان کے صاحبِ حق ہونے پر شاندار دلیل ہیں۔ یہ سب وہ حضرات ہیں کہ ان کا اہلِ سنت ہونا اور ان کی سنیت کا ظہور آفتاب کی کرنوں سے زیادہ روشن ہے اور ایک عالم ان کے علمی فیض سے مالا مال ہوا ہے۔

شاہ اسمٰعیل شہید کے بارے میں مولانا محمد تقی صاحب مرحوم مزید رقم طراز ہیں:

درحق عالمی کہ مہاجر فی سبیل اللہ کشتہ جان و مال و عزت خود را در راہِ خدا و رسول فدا کردہ درجۂ شہادت دریافت والحب فی اللہ بالمومنین والبغض فی اللہ بالکفار از عادات جبلی او بود و اکثر آیاتِ قرآنی و ارشاداتِ رحمانی و احادیثِ صحیحہ نبوی بر حال و عقائد صافی او منطبق و صحیح مظنون است

قال اللہ تعالیٰ ومن یخرج من بیتہ مہاجراً الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ ۔ الآیۃ ۔

وقال اللہ تبارک وتعالیٰ

الذین جاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اعظم درجۃ عند اللہ ۔ الآیۃ ۔

وقال اللہ تعالیٰ فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیئاتھم ولادخلنھم جنت تجری من تحتھا الانھر ثواباً من عند اللہ واللہ عندہ حسن الثواب ۔ الآیۃ

الاحادیث عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یقول یوم القیمۃ این المتحابون بجلالی الیوم اظلھم فی ظلی یوم لا ظل الا ظلی ۔ رواہ مسلم

وعن معاذ بن جبل قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ تعالیٰ وجبت محبتی للمتحابین فیّ والمتجالسین فیّ والمتزاورین فیّ والمتباذلین فیّ ۔ رواہ مالک

---

[۵۴] مولانا محمد تقی، "النشر در ردِ مقولاتِ عشر" مطبوعہ در مطبع حنفی شاہجہان آباد۔ ۱۲۶۸ھ۔ ص ۴، ۵۔

وفی روایۃ الترمذی قال یقول اللہ تعالیٰ والمتحابون فی جلالی لھم منابر من نور یغبطھم النبیون والشھداء

وعن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من عباد اللہ لاناسا ماھم بانبیاء ولا بشھداء یغبطھم الانبیاء والشھداء یوم القیامۃ بمکانھم من اللہ قالوا یارسول تخبرنا من ھم قال ھم قوم تحابوا بروح اللہ علی غیر ارحام بینھم ولا اموال یتعاطونھا فو اللہ ان وجوھھم لنور وانھم لعلی نور لا یخافون اذا خاف الناس ولا یحزنون اذا حزن الناس وقرا ھذہ الایۃ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون - رواہ ابو داؤد۔[۵۵]

اس عالمِ دین کے حق میں جس نے خدا کی راہ میں ہجرت کرتے ہوئے اپنا مال اور اپنی عزت خدا ورسول پر قربان کر دی اور درجۂ شہادت کو پہنچا، جس کی مسلمانوں سے حُب فی اللہ اور کفار سے بغض فی اللہ عادت تھی، جس کے صاف ستھرے عقائد و حالات پر اکثر آیاتِ قرآنی، ارشاداتِ رحمانی اور احادیثِ صحیحہ منطبق و موافق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص اپنے گھر سے اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرے اور پھر اس کو موت آ جائے تو بے شک اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر بر حق ہوا۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

جن لوگوں نے اپنے جان و مال کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے یہاں ان کا سب سے بڑا درجہ ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور انھیں میری راہ میں ستایا گیا اور وہ قتل ہوئے اور کفار سے قتال کیا میں ضرور ان کی برائیوں کو معاف کروں گا اور انھیں ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اللہ کے یہاں یہی ان کا بدلہ ہے اور اللہ کے یہاں بہترین بدلہ ہی ملتا ہے۔

اور احادیث یہ ہیں کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ اللہ روزِ قیامت فرمائے گا وہ کہاں ہیں جو آپس میں میری بزرگی کی خاطر محبت کرتے تھے، آج میں انھیں اپنے خاص سایۂ رحمت میں جگہ دوں گا جبکہ میرے اس سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہیں۔ اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سُنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لازمی طور پر میری محبت ان لوگوں سے

---

۵۵ ایضاً، ص ۱۲

ہوگی جو میری خاطر باہمی ہم نشینی کرتے تھے، میری خاطر آپس میں ملاقات کرتے تھے اور میری ہی خاطر ایک دوسرے پر مال خرچ کرتے تھے۔ (اس کو امام مالک نے روایت کیا)۔

اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جنھوں نے آپس میں میرے عزوجلال کی خاطر محبت کی ان کے لیے نور کے منبر ہوں گے جن پر انبیا و شہدا رشک کریں گے۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بندوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ نہ تو وہ نبی ہیں اور نہ شہید، مگر قیامت کے روز ان پر انبیاء و شہدا رشک کریں گے، خداوند تعالیٰ کے ساتھ ان کے خاص قرب کی بنا پر۔ سامعین نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں بھی بتلائیے، یہ لوگ کون ہوں گے؟ فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو باہم رشتے داری نہ ہونے کے باوجود اللہ ہی کے لیے محبت کریں اور مال خرچ کریں، خدا کی قسم ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور وہ ایک خاص نور پر بلند ہوں گے، جس وقت کہ لوگ ڈر رہے ہوں گے تو وہ نہ ڈریں گے اور جس وقت لوگ غمگین ہوں گے وہ غمگین نہ ہوں گے۔ اس موقع پر آپ نے یہ آیت پڑھی، سنو، اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (ابوداؤد)

مولانا محمد بشیر الدین قنوجی شاہ اسمٰعیل شہید کے ذکر میں بایں الفاظ رطب اللسان ہیں:

"... در سنن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی است کہ حضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم فرمودہ اند کہ ان اللہ عزوجل یبعث لہذہ الامۃ علی رأس کل مأۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا **یعنی تحقیق خدائے عزوجل مبعوث خواہد کرد برائے این اُمت بر سر ہر صد سال کسی را کہ تجدید کند برائے ایں اُمت دین وی را ظہور ایں اعجاز در راس مأتہ ثالث عشر بدیں انداز گردیدہ کہ حاجی وشہید فاضل نبیل مولانا محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ طرح احیائے سنت و رد شرک و بدعت انداختند و بفضلہ تعالیٰ در عرصہ قلیل از سعی مشکور حضرت ایشاں ہزارہا مردم کہ اعتقاد ایشاں شرک باللہ و استخفاف نماز و روزہ و عمل ایشاں اہتمام بدعات و نوش بنگ و بوزہ بود بہ استغفار از شرک و معاصی خلاف ملت و اعتقاد توحید و اتباع سنت ہدایت یافتند و صدہا از اہل ہند در توحید و سنت و شرک و بدعت کہ سابقاً دریں ہا امتیازے نمی کردند تمیزے حاصل نمودند**"[۵۶]

---

۵۶ محمد بشیر الدین قنوجیؒ، الصواعق الالٰہیہ لرد الشیاطین النجدیہ، ص ۳۲، ۳۳ - در مطبع احمدی ۱۲۸۰ھ

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لیے ہر سو سال بعد ایک ایسا شخص پیدا فرمائے گا جو امت کے لیے اسی دین کو پھر تازہ کرے گا۔ اس اعجاز کا ظہور تیرھویں صدی میں اس طرح ہوا کہ حاجی، شہید، فاضل نبیل مولانا محمد اسمٰعیل نے احیائے سنت اور ردِ شرک و بدعت کی بنیاد ڈالی۔ اور اللہ کی مہربانی سے قلیل مدت میں ان کی سعی مشکور سے ہزارہا ایسے لوگ کہ جن کا اعتقاد شرکیہ تھا، نماز روزہ کی توہین ان کا شعار تھا، بدعتوں کا بہت اہتمام کرتے۔ بھنگ اور افیم کھاتے تھے، ایسے بے شمار لوگوں نے شرک و معاصی سے توبہ کی۔ ان کو توحید و اتباعِ سنت نصیب ہوئی اور سیکڑوں وہ لوگ جو توحید و سنت اور شرک و بدعت میں تمیز نہیں کرتے تھے، وہ اچھی طرح دین و سنّت کو سمجھنے لگے۔

مولانا قنوجی موصوف ایک دوسرے مقام پر مولانا رشید الدین خان (تلمیذ شاہ عبد العزیزؒ) اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے باہمی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خانِ والاشان گرہ بری مولانا بہ کمالِ ادب قدم در تکلّم مے نہاد و بحضور مولانا دخلی در سخن نمیداد و ہمیشہ بہ سرد فضائل و مناقب جمیلہ وے جناب رطیب اللسان بودو دائماً بتذکرہ محاسن و محامد شریفہ اش مہذب البیان و حق آنست کہ کسے از اقران تاب گفتگو پیش آں مزید زماں نمیداشت"[۵۷]

خانِ عالی شان حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے روبرو نہایت ادب سے کلام کرتے تھے اور کبھی ان کے سامنے کلام میں دخل انداز نہیں ہوتے تھے، وہ ہمیشہ ان کے فضائل و مناقبِ جمیلہ سے اپنی زبان کو تروتازہ رکھتے اور ان کے محاسن و محامد شریفہ کے ذکر میں ہمیشہ آراستہ بیان ہوتے اور حق یہ ہے کہ ان کے ہم عصروں میں سے کوئی بھی اس یگانۂ روزگار کے روبرو یارائے گفتگو نہ پاتا۔

مولانا محمد یعقوب خلف الصدق مولانا مملوک علی تلمیذ رشید مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"احقر مولوی اسمٰعیل شہید کو اور ان کے خاندان کے علما کو اپنا پیشوا سمجھتا ہے اور بے تعصب ان کی باتیں موافق قرآن و حدیث کے پاتا ہے"[۵۸]

---

[۵۷] ایضاً، ص ۲۶

[۵۸] مولانا محمد یعقوب، مکتوبات، ص ۲ - بحوالہ حزب الدین مرادآبادی مرحوم، اکمل البیان، ص ۸۰

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم رقم فرما ہیں :

" عالم نبیل، فاضل جلیل، نمونہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل مولانا الحافظ الحاج مولوی اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ و علی آبائہ الکرام نے جب امور شرک و بدعت کا رواج زیادہ دیکھا تو مولانا ممدوح نے بمقتضائے تائید دین جہاں تک ہو سکا، زبان سے نصیحت فرمائی، تحریروں کی بھی نوبت آئی چنانچہ رسالہ تقویۃ الایمان بھی جب ہی لکھا، جس میں نصوص صحیحہ سے نہایت سلاست کے ساتھ مضامین توحید کو اچھی طرح بیان فرمایا اور قلت حق تعالیٰ شانہ کو جملہ بنی آدم و مخلوقات پر ثابت کر کے اہلِ شرک و بدعت کو ان کے خیالاتِ باطلہ کی خرابی پر مطلع کیا، اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو صحتِ عقائد نصیب ہوئی ۔ الخ [۹]

مولانا حیدر علی رام پوری ؒ تلمیذ شاہ عبدالعزیز و مرید و خلیفہ سید احمد شہید ؒ، اپنی تصنیف ”نظام الملۃ و دفع العلۃ“ میں شاہ اسمٰعیل شہید ؒ کا ایک حوالہ نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

اور حق اس باب میں وہی ہے جو لکھا ہے علامۂ عصر محققِ دوراں، مصدق علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل مولوی اسمٰعیل شہید نے ایضاح الحق میں . . . [۱۰]

برعظیم پاک و ہند کے نامور عالم مولانا محمد انور شاہ الکشمیری رقم طراز ہیں :

وکان الشیخ عبدالعزیز یتلو الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحٰق نفع اللہ بھما ھٰذہ البلاد ۔ وادا الشیخ محمد اسحٰق حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصار رحلۃ الاقطار وصنف الشیخ محمد اسمٰعیل کتباً فی الفرق بین السنۃ والبدعۃ الظلماء فاحیی سنۃ حین کانت امیتت ومات شہیداً ۔ [۱۱]

اس کا حاصل ترجمہ ”القاسم“ شوال ۱۳۳۰ھ میں مرقوم ہے :

”حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر قرآن پاک کی یہ آیت جاری ہوجایا کرتی تھی ۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق عطا کیے ۔

---

[۹] مولانا محمود حسن، الجہد المقل حصہ دوم ص ۲، ۴

[۱۰] حیدر علی رام پوری، نظام الملۃ و دفع العلۃ، ص ۳۲

[۱۱] مولانا محمد انور شاہ ؒ . القاسم، دیوبند، رمضان ۱۳۳۰ھ بحوالہ ایضاً

آیت میں لفظِ "اسمٰعیل" کی تقدیم سے واقفانِ حال پر جو کیفیت طاری ہوتی ہوگی وہ زبان سے کہنے کی بات نہیں ہے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے درس حدیث میں اپنے آپ کو وقف کر دیا اور العلماء ورثۃ الانبیاء کا سچا منظر اہلِ علم کے روبرو پیش کر دیا۔ اور آپ کے درس کو بازگشتِ خلائق اور مرجع انام ہونے کا خلعت قبول نصیب ہوا، ہندوستان میں حدیث کا دریا بہا دیا۔ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو یہ خدمت دوسرے طرز سے عطا ہوئی۔ آپ نے سنتِ مردہ کے احیا میں عیسیٰ النفس کے جوہر دکھائے، توحید و رسالت کے اثبات، شرک و بدعت کے ابطال میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں اور جانِ عزیز کو راہ مولا میں نثار کر دیا۔[۲۱]

عمدۃ الواعظین جامع معقول و منقول مولانا عبدالرب صاحب دہلوی رم محرم ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء ایک استفتا کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

مولوی اسمٰعیل شہید فی سبیل اللہ مہاجر الی اللہ کا حال جو اپنے والد ماجد محمد عبدالخالق مرحوم سے اور دیگر علما سے سنا گیا وہ ایسا نہیں ہے کہ یہ صفحۂ قرطاس اس کی تحریر کو وفا کرے (سب) حضرات کو اُن کے اشتیاق میں یہی کہتے سنا:

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں   اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

اور ان کے وصف قرآنِ شریف اور حدیث سے ثابت اور ظاہر ہوئے ہیں:

ان الذین امنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولئک یرجون رحمۃ اللہ واللہ غفور رحیم ۔۔ الیٰ آخر الآیۃ۔[۲۲]

یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (پ۲ ع۱۱)

شاہ اسمٰعیل شہید کے ایک ہم عصر اور سید احمد شہید کے متوسلین میں سے شیخ فتح اللہ صاحب مرحوم اپنے مشہور و معروف رسالہ "حارق الاشرار" میں آپ کی ایک نظم میں بہت تعریف کی ہے:

---

[۲۱] القاسم دیوبند شوال ۱۳۳۰ھ بحوالہ عزیز الدین مراد آبادی مرحوم، مطرق الحدید، ص ۳۵، ۳۶

[۲۲] محمد عبدالرب، مطبوعہ ردتقویۃ الایمان راشد کمپنی دیوبند، ص ۲۴۴ سن ندارد

مولانا عزیز الدین مراد آبادی، مصنف "اکمل البیان" و "مطرق الحدید" شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مولانا شہید مرحوم کو کمالات کا مجموعہ عطا فرمایا تھا، وہ علم و عمل، اخلاص و اخلاق، ذہانت و متانت، دیانت و مروّت، ہمدردی، شجاعت اور بہادری دلیری میں، درمیان اپنے اقران کے ممتاز تھے ..."[۱۶۴]

ان کے بارے میں وہ اور بھی بہت کچھ تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا موصوف ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"الحق کہ حضرت سید السادات امیر المومنین سید احمد صاحب رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ المتولد یکم محرم الحرام ۱۲۰۱ھ اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ المتولد ربیع الثانی ۱۱۹۲ھ ہر دو مجددان شریعت بیضا محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بفضلہٖ تعالیٰ ہندوستان (متحدہ) میں خالص توحید و سنت قائم کرنے والے، رسومات، شرکیات و بدعات سے روکنے والے، اپنے اوائل زمانہ شباب سے تحریراً و تقریراً اعلائے کلمۃ اللہ میں تا امکان جان و مال، زبان و دل سے سرگرم و مصروف ہونے والے جو بالآخر فی سبیل اللہ جہاد دین اسلام اور مسلمانوں کی حمایت کے لیے درجۂ علیا شہادت سے نائل الرام ہوئے اور اسلام میں اس سے زیادہ کوئی درجہ نہیں ..."[۱۶۵]

مولانا ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

"حیاتِ شہیدؒ درحقیقت احیائے سنت و اماتتِ بدعت پر مقتضی ہے"[۱۶۶]

مولانا موصوف اپنی تصنیف "اکمل البیان فی تائید تقویت الایمان" میں رقم طراز ہیں :

"مشاہیر علما و فضلا، اتقیا، تلامیذ شاہ عبدالعزیزؒ و مولانا شاہ محمد اسحٰقؒ ... کی تحریرات اور فتاویٰ تقویت الایمان کی صداقت و حقانیت اور مولانا شہید مرحوم کے اوصاف و محامد میں اصلاً و نقلاً، قلمیہ و مطبوعہ محفوظ و مشتہر ہیں مثل مفتی عدالتِ عالیہ سلطانیہ سید رحمت علی خان صاحب، مولانا نواب قطب الدین

---

[۱۶۴] عزیز الدین مراد آبادی مرحوم، اکمل البیان، ص ۸۳۴ لاہور ۱۳۸۴ھ [۱۶۵] ایضاً، ص ۸۴۶۔

[۱۶۶] ایضاً، مطرق الحدید علی صاحب التحقیق الجدید، ص ۲۸

خان صاحب، مولانا مملوک علی صاحب، مولانا مفتی عنایت احمد صاحب، مولانا سخاوت علی صاحب، مولانا عبدالجلیل صاحب شہید، مولانا مفتی امام الدین صاحب، مولانا بزرگ علی صاحب، مولانا فضل امام صاحب، مولانا سید حسین شاہ صاحب بخاری، مولانا محبوب علی صاحب، مولانا آلِ حسن صاحب، مولانا انور علی صاحب، مولانا احسان کریم صاحب، مولانا سعد الدین صاحب، مولانا رافت علی صاحب، مولانا محمد نظام صاحب، مولانا محمد وحید اللہ صاحب، مولانا محمد وزیر علی صاحب، مولانا سید محمد عالم علی صاحب، مولانا عبدالخالق صاحب، مولانا خواجہ ضیاء الدین احمد صاحب، مولانا اکبر علی خان صاحب، مولانا سید محمد علی صاحب، مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی، مولانا یعقوب علی خان صاحب بریلوی تلمیذ مولانا مملوک علی صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب خلف الصدق مولانا مملوک علی صاحب وغیرہم جن کی تعداد ساٹھ ستر کو پہنچتی ہے۔۔"[17]

مولانا رحیم بخش مصنف "حیاتِ ولی" شاہ اسمٰعیل شہید کے بارے میں لکھتے ہیں:

"روزِ ازل میں جس شخص کی قسمت میں قاطع بدعت ہونا لکھا تھا، وہ شاہ عبدالغنی صاحب کے فرزند رشید اور جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید ہیں۔ جو بیڑہ خدائے ذوالجلال کی توحید پھیلانے اور شرک و بدعت کو ہندوستان سے مٹانے کا جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے اٹھایا تھا، خداتعالیٰ نے آپ کے بزرگ ہاتھوں سے اسے اس درجہ تقویت عطا کی کہ علمِ توحید کا عظیم الشان پھریرا دہلی کی سرزمین سے بلند ہوکر دور دور کی سرسبز سلطنتوں تک بڑے زور شور سے لہرانے لگا۔"[18]

مولانا محمد جعفر تھانیسری مصنف "سوانحِ احمدی" و "کالا پانی" رقم طراز ہیں:

"مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید خلف مولوی عبدالغنی صاحب، نبیرۂ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی بڑے فاضل اجل اور ذہین و متین تھے۔۔۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب شہید کے قصص ذہانت و فطانت کے بہت مشہور ہیں۔"[19]

مولانا تھانیسری، سید احمد شہید کے خلفا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[17] ایضاً۔ اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان، ص ۲۴

[18] رحیم بخش، حیاتِ ولی، ص ۴۶۸، لاہور ۱۹۷۲ء

[19] محمد جعفر تھانیسری، تواریخ عجیبہ موسوم بہ سوانح احمدی، ص ۱۸۷، مطبع فاروقی دہلی ۱۳۰۹ھ/۱۳۰۷ھ

"آپ کے بڑے خلیفوں میں مولوی عبدالحی اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید ہیں۔ یہ دونوں بزرگ بمنزلہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے آپ کے خلفا میں سے تھے۔ مولوی عبدالحی صاحب کا مزاج بوجہ بردباری اور وقار حضرت ابو بکرؓ سے اور حضرت مولانا شہید کی طبیعت بوجہ تشدد علی الکفار و فجار حضرت عمرؓ سے زیادہ تر مشابہ تھی۔"[20]

"مولوی عبدالحی صاحب سلوکِ راہ ولایت اور مراقبہ و مشاہدہ و توجہ و کشف وغیرہ کے پورے سالک اور اس فن میں استادِ کامل تھے اور مولوی محمد اسماعیل صاحب شہید سلوکِ راہ نبوت کے سالکِ کامل اور پورے عامل تھے۔ اس واسطے آپ کے ملفوظات سلوکِ راہِ نبوت کا حصہ صراطِ مستقیم کا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید کا اور سلوکِ راہِ ولایت کا حصہ مولوی عبدالحی صاحب کا لکھا ہے۔"

ہر گلے را رنگ و لوئے دیگر است"[21]

ان دونوں ستاروں کے اوصاف تحریر و بیان سے باہر ہیں۔"[22]

شاہ اسمٰعیل شہید کے سوانح نگار مرزا حیرت دہلوی رقم طراز ہیں :

"شاہ عبدالرحیم نے ایک ایسا بیج بو دیا کہ بعد ازاں آپ کی اولاد کی کوششوں سے وہ پھلا پھولا اور لہلہایا اور آخر شاہ اسمٰعیل صاحب کی بیش بہا کوششوں سے اس درخت میں پھل لگا اور الحمد للہ کہ وہ اب تک پھل دے رہا ہے اور ترو تازہ ہے۔"[23]

مولانا شہیدؒ کے وعظ کے اثر و نفوذ کا ذکر کرتے ہوئے مرزا حیرت لکھتے ہیں :

"مولانا شہید کی تقریر میں جو صفت تھی وہ عجیب تر اور رعب سحر سے بھری ہوئی تھی، لوگ گھروں سے ارادہ کر کے جاتے تھے کہ مولانا شہید کی مخالفت عین وعظ میں کریں گے، لیکن سوائے خاموشی کے کسی کو یارا نہ ہوتا تھا۔ سامعین میں سکوت سلطنت کرتا تھا، کیا مقدور تھا کہ وعظ کے بیچ میں کوئی کسی طرف اشارہ بھی کرے۔"[24]

---

[20] ایضاً، ص ۱۸۶ [21] ایضاً، ص ۱۸۷

[22] ایضاً، ص ۱۴۲۔ مطبوعہ بلالی سٹیم پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ بار دوم، سن ندارد

[23] حیرت دہلوی، حیاتِ طیبہ، ص ۲۳، ۲۴ - لاہور ۱۹۷۲ء [24] ایضاً، ص ۳۰

"آپ کا کلام جیسا فصیح ہوتا تھا، اسی قدر پُر درد اور پُر تاثیر ہوتا تھا، آپ اسلام کے سچے متبع تھے . . . آپ کی اصلاح عام تھی نہ امرا کی قید تھی نہ عوام الناس کی، نہ شرفا کی نہ رذیلوں کی، نہ وضع داروں کی نہ بدوضع لوگوں کی، اور یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ انسانی ارذل گروہ میں بھی جن کی طبائع میں صلاحیت کا بیج ان کے شنیعہ افعال سے مارا جا چکا ہے، آپ کا پُر تاثیر وعظ وقتاً فوقتاً اپنا جلوہ دکھا دیتا تھا اور ایسے گمراہ لوگوں کی لوحِ دل کا مدت کا چڑھا ہوا زنگ مٹا دیتا تھا۔

جس شخص کے وعظ میں یہ تاثیر ہو اس سے ناظر یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن بالکل یکساں تھا اور جو کچھ وہ کرتا تھا صرف خدا کے لیے، اس سے نہ اپنی ناموری مطلوب تھی، نہ حصولِ زر مدّعا تھا، نہ کسی کی ضد سے یہ کام کیا جاتا تھا۔"[۲۵]

"حق یہ ہے کہ مولانا شہید کو فطرت سے جن خاص صفتوں کا حصہ ملا تھا وہ سب ممتاز تھیں اور اُن میں خصوصیت کا رنگ ایسا تھا کہ دوسری جگہ کہیں بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔"[۲۶]

"واقعاتِ دارالحکومت دہلی" کے مصنف مولوی بشیر الدین احمد دہلوی شاہ اسمٰعیل شہید کے ذکر میں لکھتے ہیں:

" آپ بڑے مشہور، جامع کمالاتِ صوری و معنوی، نکتہ سنج کلامِ الٰہی و حدیث نبوی، عالمِ معقول و منقول تھے . . . وعظ میں ایسی زبردست اور مدلل تقریر فرماتے تھے کہ لوگوں کے سارے شک دھل جاتے تھے۔"[۲۷]

وعظ کے انقلاب آفرین اثرات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

(شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحئیؒ کے مواعظ سے) "لکھوکھا مردم شاہراہِ ہدایت پر آئے اور شوقِ ہوالحق دل میں جم گیا اور جہاد کی افضلیت ذہنوں میں بیٹھ گئی اور خود بخود چاہنے لگے کہ اگر جان و مال راہِ الٰہی میں صرف ہو تو عین سعادت ہے۔"[۲۸]

برّعظیم پاک و ہند کے ممتاز عالم مولانا محمد میاں صاحب مرحوم شاہ شہید کا تذکرہ بایں الفاظ کرتے ہیں:

"صداقت مُشک ہے۔ ممکن اس کی فطری خاصیت ہے۔ کیا اوتاتِ باطل کا نافہ اس کو چھپا لیتا ہے؟ مگر یہ پوشیدگی عارضی ہوتی ہے۔ صداقت کی مہک باطل کے نافہ میں اور تیز ہوتی رہتی ہے، حتّٰی کہ خود

---

۲۵ ایضاً، ص ۱۲۸ ـ ۱۳۰ ۲۶ ایضاً ص ۹۱۳

۲۷ بشیر الدین احمد دہلوی، واقعاتِ دارالحکومت دہلی۔ ج ۲، ص ۴۱۱ ـ آگرہ ۱۹۱۹ ۲۸ ایضاً، ص ۴۰۰

نافۂ باطل جو مشک کی طالب ہوتی ہیں وہ نافہ کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیتی ہیں اور مشکِ صداقت اپنی پوری پاکیزگی سے دل و دماغ کو معطر کرنے لگتا ہے ۔ روح کو تازگی بخشتا ہے ۔ انسانیت کے لطیف عنصر کو قوت پہنچاتا ہے اور دنیا اس منظر کو برأی العین دیکھ لیتی ہے کہ :

جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا o

حق آیا ، باطل مٹ گیا ۔ باطل اسی لیے ہے کہ مٹے ۔

حضرت اسمٰعیلؒ شہید کی پاکیزہ سیرت اسی فطری رفتار کا ایک نقشہ ہے ۔"[۲۹]

پروفیسر خلیق احمد نظامی ، سرسید احمد خان اور سید جمال الدین افغانی کے کارناموں کا موازنہ کرتے ہوئے سرسید کے فکری ارتقا کے ضمن میں لکھتے ہیں :

"سید احمد خان کی عمر ۱۱ ، ۱۲ سال کی ہوگی ، جس وقت مولانا سید احمد شہیدؒ نے اصلاح و حیرت کا علم بلند کیا ۔ ان کی تحریک کا ایک مقصد ۔ ۔ ۔ یہ تھا کہ بدیسی سمندر پار کرنے والوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے ۔ ان کی سحر کار آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی ۔ سید احمد خان نے اس تحریک کو بھی بہت قریب سے دیکھا تھا ۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا خاندان ان کے پیرزادوں کا خاندان تھا ۔ شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے وعظوں میں انھوں نے شرکت کی تھی ۔ اس تحریک نے ان کے دل و دماغ پر جو اثر کیا اس کا اندازہ آثار الصنادید سے ہوتا ہے ۔ جنگِ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے چودہ سال بعد جب وہ یہ کتاب لکھ رہے تھے تو مولانا شہید کے تذکرہ پر پہنچ کر ان کا قلم وجد کرنے لگا ۔ لیکن تحریک کی ناکامی نے ان کے دل کو توڑ دیا اور ان کو خون کے آنسو رلایا ۔"[۳۰]

عالمِ اسلام کے مایہ ناز مفکر و عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، دنیائے اسلام کے "عبقری" اور "مجتہد" علما کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

پچھلی صدیوں کے علما کے تذکرے اور کتبِ سوانح پڑھیے ، سیکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص کا ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (GENIUS) کے لقب کا اطلاق درست ہو یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو ۔

---

[۲۹] ۔ ۔ ۔ میاں ، مقالہ "اسلامی حریت کا علمبردار" مطبوعہ در مجموعہ مقالات "شاہ اسمٰعیل شہید" مرتبہ عبداللہ بٹ ، ص ۷۷ ، لاہور ۱۹۴۳ء ۔ [۳۰] نظامی ، خلیق احمد ، تاریخی مقالات ، ص ۲۶۷ ، دہلی ۱۹۶۶ء

یا کسی خاص علم میں اس نے گراں قدر اضافہ کیا ہو۔ پچھلی صدیوں میں ہم صرف چند افراد کا استثنا کر سکتے ہیں، جو اپنے زمانے کی عام علمی و ذہنی سطح سے بہت بلند تھے اور جنھوں نے دینی یا علمی دائرہ میں کوئی بڑا انقلابی کارنامہ یا علمی شاہکار پیش کیا ہو، خوش قسمتی سے ان تمام مستثنیٰ افراد کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہے۔ ان میں سے ایک حضرت مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) ہیں . . . دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) ہیں۔ تیسرے ان کے صاحب زادے شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۳۳ھ) . . . چوتھے شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی (ش ۱۲۴۶ھ) جن کی کتاب منصب امامت اور عبقات امتیازی شان رکھتی ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر بے نظیر ہے۔[۵۳۱]

"ہندوستان میں وہابی تحریک" کے مصنف ڈاکٹر قیام الدین احمد، مولانا عبدالحئی بڈھانوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ دونوں بزرگ اس تحریک کے نہایت اہم سربراہ تھے۔ دونوں بڑے پائے کے علما تھے، اور اس زمانے کے سب سے بڑے صاحب ارشاد و تقویٰ خاندان سے متعلق تھے۔ ان کے شمول نے تحریک کی وقعت کو بہت بلند کر دیا اور اس کی بعد کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا، سید احمد کے ساتھ ان کی عدیم المثال محبت و رفاقت اور ان کے ساتھ روز افزوں اور تحریک میں جد و جہد ان کے مرتے دم تک جاری رہی۔ ان کے سوانح حیات علیحدہ و مفصل تذکرہ کے متقاضی ہیں۔"[۵۳۲]

ڈاکٹر موصوف شاہ اسمٰعیل شہید کی تصانیف کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"شاہ اسمٰعیل . . . قلم کے ویسے ہی مرد میدان تھے، جیسے مصافِ جنگ میں تلوار کے سورما۔"[۵۳۳]

"تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت" کے مصنف سید ہاشمی فرید آبادی، شاہ اسمٰعیل شہید کے لسانی اور قلمی کمالات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"سید صاحب کی تبلیغ و دعوت کی زبان اور قلم ہی گویا شاہ اسمٰعیل صاحب تھے۔"[۵۳۴]

"عینی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نطقِ شاہی کی آتش باری نے بہت سی بدعتوں کے قلعے توڑے، صدہا مسلمانوں

---

۵۳۱ سید ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ کراچی ۱۹۷۲ء

۵۳۲ قیام الدین احمد، ہندوستان میں وہابی تحریک۔ ترجمہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی، ص ۶۱، کراچی ۱۹۷۲ء۔ ۵۳۳ ایضاً، ص ۶۲۔

۵۳۴ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، ج ۲، ص ۳۰۴۔ بار اول کراچی ۱۹۵۳ء

سے اطاعتِ الٰہی، ترکِ معاصی کا اقرار کرایا، بڑی بڑی رسمیں چھڑوائیں، عقدِ بیوگان کی سنت مُردہ ہوگئی تھی پھر جاری ہوگئی۔[۳۵]

اعجاز الحق قدوسی، مصنف "تذکرہ صوفیائے سرحد" و "تذکرہ صوفیائے بنگال" تحریر فرماتے ہیں:

"تاریخ شاہد ہے کہ ملتِ اسلامیہ جن بزرگوں کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی، ان میں سے ایک حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی ہیں۔ انھوں نے اس وقت آوازِ حق کو بلند کیا، جب کہ مغلیہ سلطنت کا آفتاب زوال پذیر ہوچکا تھا اور ہندوستان میں مسلمانوں کی مستحکم حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں"[۳۶]

"... شاہ اسمٰعیل شہید اس عظیم المرتبت خاندان میں پیدا ہوئے جن کا ہر فرد علم و فضل اور زہد و ورع کا ایک ستون تھا اور جن کے خاندان پر یہ مثل صادق آتی تھی کہ:

این خانہ ہمہ آفتاب است"[۳۷]

"ان کی عمر کا بڑا حصہ تبلیغ دین، احیائے سنت اور بدعات کے مٹانے میں صرف ہوا۔ ساری عمر وہ بےخوف و نڈر ہو کر حق کو سر بلند کرتے رہے"[۳۸]

"انھوں نے تقریر و تحریر کے ذریعہ سے احیائے دین، ردِ بدعات اور ترویج سنت کی جو کوششیں کیں وہ ہماری روحانی تاریخ کا روشن باب ہیں ... خلوص و للّٰہیت نے ان کے مواعظ میں یہ تاثیر پیدا کی تھی کہ لوگ جوق در جوق آپ کے مواعظ میں شریک ہوتے تھے۔ دورانِ وعظ میں لوگ خشیتِ الٰہی سے کانپ اٹھتے تھے، اور بہت سی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر رواں ہوتا تھا"[۳۹]

مولانا حکیم محمد صدیق مرادآبادی (۱۳۰۹ھ) مرحوم، تلمیذ و مرید رشید مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم نے شاہ اسمٰعیل شہید کی خدمت میں فارسی کی ایک نظم میں شاندار الفاظ میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔[۴۰]

مولانا محمد علی قصوری مرحوم، ایم اے کینٹب (مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے فرزندِ ارجمند) جو اپنے

---

۳۵ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، ج ۲، ص ۳۰۲، ۳۰۳، بار اوّل کراچی ۱۹۵۳ء

۳۶ قدوسی، اعجاز الحق، تذکرہ صوفیائے سرحد، ص ۵۲۱، لاہور ۱۹۶۶ء ۳۷ ایضاً، ص ۵۳۰

۳۸ ایضاً، تذکرہ صوفیائے بنگال، ص ۸۱، لاہور ۱۹۶۵ء

۳۹ ایضاً، تذکرہ صوفیائے سرحد، ص ۵۴۱، ۵۴۲

۴۰ ملاحظہ ہو: محمد صدیق مرادآبادی مرحوم، گلستانِ مناقب بحوالہ عزیز الدین مرادآبادی مرحوم، اکمل البیان، ص ۸۲۸ - ۹

شبانہ روز پُرخلوص مجاہدانہ کردار کے باعث یاغستان میں جماعتِ مجاہدین کی روح رواں بنے۔ نہایت زیرک، بیدار مغز، جری اور سراپا عمل انسان تھے۔ ان کی زندگی کتاب وسنت کی تعمیل سے عبارت تھی۔ جذبۂ جہاد ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور خلافتِ اسلامیہ کا قیام ان کی مساعیِ جمیلہ کا محور تھا۔

ایک موقع پر جارج روس کیپل، چیف کمشنر آف صوبہ سرحد[۱۴۱] نے سلسلہ جنبانی کرکے انہیں گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں بلایا اور انھیں پیش قرار پیش کش کرتے ہوئے کہا:

"مولوی صاحب! میں آپ کی تمام مساعی کو دیکھتا رہا ہوں اور میں نے گورنمنٹ انگریزی سے اس امر کی منظوری لے لی ہے کہ آپ کو کوئی نہایت عمدہ عہدہ دے دیا جائے تاکہ آپ کی قابلیت نمایاں ہو۔"

مولانا صاحب موصوف نے اس انگریزی پیش کش کو ٹھکرا دیا تو سر جارج نے کہا:

"میں یہ آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میری آفر (OFFER) کو مسترد کرکے آپ صرف اپنا نقصان کر رہے ہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ سرکار کی رہنمائی سے آپ مسلمانوں کے دوسرے سید احمد بن سکتے ہیں۔"

مولانا محمد علی صاحب موصوف نے اس کا جو جواب دیا وہ ملی غیرت کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے ساتھ ان کی قلبی وابستگی کا آئینہ دار اور اس امر کا واشگاف اعلان ہے کہ مولانا محمد علی صاحب موصوف کی نظر میں سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید ہی سچے مجدد ملت، مخلص مجاہد اور ملتِ اسلامیہ کے مثالی امام و رہنما تھے۔

مولانا محمد علی قصوری صاحب موصوف نے سر جارج سے کہا:

"میں آپ کی عنایت کا مشکور ہوں، لیکن میں ہندوستانی مسلمانوں کا دوسرا سرسید بننے کی بجائے دوسرا سید احمد بریلوی یا اسمٰعیل شہید بننا چاہتا ہوں۔"[۱۴۲]

---

[۱۴۱] اسے فرنٹیئر نظام حکومت سے غیر محدود اختیارات حاصل تھے اور اس کی سفارش کو گورنر جنرل آف انڈیا کبھی مسترد نہیں کر سکتی تھی۔ نیز اس کے پاس ایک فنڈ خاص مخصوص تھا جس کا کوئی حساب کتاب نہ تھا، آمد کی نہ کوئی ریکارڈ اور نہ آڈٹ۔ ملاحظہ ہو مشاہداتِ کابل و یاغستان، ص ۱۳۱، ۱۴۹۔ مصنفہ مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب۔

[۱۴۲] ایضاً، ص ۱۵۹، ۱۶۰۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

قال عمرو بن مرۃ لمعاویۃ انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من امام یغلق بابہ دون ذوی الحاجۃ والخلۃ والمسکنۃ الا اغلق اللہ ابواب السماء دون خلتہ وحاجتہ ومسکنتہ۔ فجعل معاویۃ رجلاً علی حوائج الناس۔

(جامع ترمذی، ابواب الاحکام، باب ما جاء فی امام الرعیۃ)

عمرو بن مرہ نے حضرت معاویہ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے کہ جو حکمران ضرورت مندوں اور محتاجوں اور غریبوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضرورت و احتیاج کے باوجود اس پر آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے — یہ حدیث سننے کے بعد حضرت معاویہ نے ایک آدمی کو مقرر کر دیا جو لوگوں کی ضرورتوں سے انھیں مطلع کرتا تھا۔

اس واقعہ حدیث میں ایک نہایت اہم بات بیان کی گئی ہے اور حکمران طبقے کی اس خاص نفسیات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ عام طور پر یہ لوگ مالک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تمام رعایا کے مانند ہونے کے باوجود ان کی ضروریات و حوائج کا اکثر خیال نہیں رکھتے۔ حاجت مند ان کے پاس آتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی بات سنیں گے اور ان کو تسلی بخش جواب دیں گے، لیکن یہ ان پر اپنے دروازے بند کر دیتے اور اندر آنے سے روک دیتے ہیں، نہ ان کی بات سنتے ہیں نہ ان کی شکایات کا ازالہ کرتے ہیں۔ حاجت مندوں میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو قرب و جوار سے آتے ہیں اور وہ بھی ہوتے ہیں جو دور دراز کے فاصلے طے کر کے اور خطیر رقم خرچ کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، لیکن یہ اس کا قطعی احساس نہیں کرتے، ان کی ضرورت کو خاطر میں نہیں لاتے، ان کی احتیاج اور روداد غم کو لائق اعتنا نہیں ٹھہراتے، نتیجتاً لوگ مایوس اور ناامید ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ واپس جانے والوں کا تاثر نہایت شدید ہوتا ہے اور ان کے جذبات انتہائی نازک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے ان مایوس اور مظلوم لوگوں کی دعائیں ہرگز ان کے ساتھ نہیں رہتیں، وہ حقارت آمیز الفاظ اور مظلومانہ لہجے

میں ان کا ذکر کرتے ہیں ۔ مظلوم کی آہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور اپنا اثر دکھاتی ہے اور ایک حدیث کی رو سے عرشِ الٰہی کو بھی ہلا ڈالتی ہے ۔

حکمران سے کسی مملکت کا سربراہ یا اس کے وزرا ہی مراد نہیں ہیں ، ہر وہ شخص اس کی تعریف میں آتا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں صاحبِ اختیار ہے ۔ خواہ وہ کسی دفتر کا سربراہ ہو ، کسی محکمے کا اقتدار ہاتھ میں رکھتا ہو ، یا چند یا زیادہ افراد کا حاکم اور نگیبر ہو ۔ غرض کوئی بھی چھوٹا بڑا منصب رکھتا ہو وہ اس حدیث کی ذیل میں آتا ہے ۔ اگر وہ اپنے کسی ماتحت کی بات نہیں سنتا یا اس کو قابلِ توجہ قرار نہیں دیتا ، تو حدیث کے الفاظ کی رو سے یوں سمجھیے کہ اس نے اس پر اپنے دروازے بند کر لیے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا ، وہ بھی اس پر زندہ یا بدیر اپنی مہربانیوں اور شفقتوں کے دروازے بند کر دیتا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی اگرچہ چند الفاظ پر مشتمل ہے ، لیکن اپنے اندر بڑی جامعیت اور معنویت رکھتا ہے ۔

آنحضرتؐ کا یہ ارشاد حضرت عمرو بن مرہؓ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس زمانے میں سنایا جب وہ مسلمانوں کے خلیفہ تھے ، حضرت معاویہ اپنے تمام اختیارات کے باوجود یہ سن کر چونک پڑے اور اسی وقت ایک آدمی کو اس خدمت پر مامور کر دیا کہ وہ لوگوں کی ضروریات بلا تاخیر ان کو پہنچایا کرے ۔

نقد و نظر

حقوق العباد

مصنف : جناب اوصاف علی خاں صاحب

ملنے کا پتا : مکتبہ امدادیہ، مقبول روڈ، ملتان

صفحات ۴۶۲ - اچھی کتابت، بہترین کاغذ، عمدہ طباعت، دیدہ زیب جلد، قیمت ۲۵ روپے

زیر نظر کتاب "حقوق العباد" کے گرامی قدر مصنف نواب اوصاف علی خاں صاحب، پاکستان کی عدلیہ کے معزز عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے اوصافِ گوناگوں میں شرافت و متانت اور خلوص و دین داری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور کہنا چاہیے کہ وہ اس لحاظ سے اسم با مسمّیٰ ہیں۔ ان کا دردمند دل مسلمانوں کے لیے جذبہ صداقت سے معمور ہے۔

حال ہی میں انھوں نے "حقوق العباد" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے، جو اس وقت پیشِ نگاہ ہے۔ یہ کتاب ان کے مخلصانہ جذبات کا بہترین آئینہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے تمام اوصاف نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس میں ان تمام حقوق کی وضاحت کی گئی ہے جو ایک طبقے کے دوسرے طبقے پر عائد ہوتے ہیں اور جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔

کتاب کی بنیادی صفت یہ ہے کہ اس میں تمام حقوق العباد کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے اور جگہ جگہ اصل عربی عبارتیں درج کی گئی ہیں، پھر ساتھ ہی اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ آغازِ کتاب میں "پیشِ لفظ" کے طور پر پاکستان کی سپریم کورٹ کے قابل احترام چیف جسٹس جناب ایس انوار الحق کی رائے گرامی درج ہے۔ مقدمۂ کتاب میں لائق مصنف نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلے میں بعض ضروری امور کی وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد حقوق النفس یعنی وہ حقوق جو خود انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں، معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ پھر ماں باپ کے حقوق، بیوی اور شوہر کے باہمی حقوق، قرابت داروں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، یتیموں، مسکینوں، غریبوں اور ملازموں کے

حقوق، کتاب و سنت کی رو سے تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں غلام، آقا، مزدور، مالک وغیرہ کے جو حقوق ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں اور جن ذمہ داریوں کا شریعت نے ان کو مکلف ٹھہرایا ہے، ان کی تصریح کی گئی ہے۔ عدل و احسان، حسنِ خلق، خدمتِ خلق، عہد کی پابندی، اخوت اور بھائی چارہ، مساوات، علما اور عوام کے باہمی حقوق، استاذ اور شاگرد کے حقوق و فرائض، عوام اور حکام کے ایک دوسرے پر حقوق، تاجر اور خریدار کی ذمہ داریاں اور ان کے حقوق، حتیٰ کہ حیوانوں اور جانوروں کے بارے میں انسان پر جو فرائض و حقوق عائد ہوتے ہیں، ان کو بھی صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر کتاب میں "انسانیت کا منشور اعظم" کے شاندار عنوان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع درج کیا گیا ہے۔

کتاب اپنے موضوع میں بڑی مفصل ہے اور اردو زبان میں غالباً اس سلسلے میں یہ پہلی کتاب ہے۔ لائق مصنف نے ہر بات کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے اور محنت و جاں فشانی سے اسے مکمل کیا ہے۔ اس کی ترتیب و تصنیف اور فراہمیِ مواد میں انھوں نے جو تگ و دو کی ہے اور جس خوب صورت طریقہ میں اس پورے مواد کو صفحاتِ قرطاس پر سجایا ہے، اس کی انھیں اللہ ہی جزا دے گا۔

ہم اپنے معزز قارئین سے سفارش کریں گے کہ وہ اس کا مطالعہ کریں۔ یوں تو یہ کتاب ہر قسم کے حضرات کو پڑھنی چاہیے، لیکن خطیبوں اور مقرروں کو بالخصوص اس کے مضامین و مندرجات سے استفادہ کرنا چاہیے۔

کتابیں بہت سے حضراتِ اہلِ علم لکھتے ہیں اور لکھنی چاہئیں، کیونکہ جو شخص اچھی بات جانتا ہے اور اظہار و بیان پر قدرت رکھتا ہے، اس کا فرض ہے کہ دوسروں کو بھی اس سے مطلع کرے۔ لیکن وہ شخص بہر حال داد و تحسین کا مستحق ہے، جو اپنی نازک ذمہ داریوں اور مصروف ترین لمحات میں سے وقت نکال کر محض تبلیغ و اشاعت کی غرض سے ایک علمی اور تصنیفی خدمت انجام دیتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ "حقوق العباد" کے لائق احترام مصنف نواب اوصاف علی خاں کا شمار مخلصین کے اسی گروہ میں ہوتا ہے، لہٰذا ان کے ساتھ تعاون کرنا ہمارا فرض ہے۔

تبلیغ و تربیتِ دین کے پانچ اصول

تالیف: حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی

ناشر: شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور

کاغذ، طباعت، کتابت عمدہ ۔ صفحات ۸۰ ۔ قیمت ۲ روپے

مولانا حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی، ایک مخلص عالم دین ہیں، جن کے شب و روز تبلیغ اسلام اور اشاعتِ دین میں گزرتے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے لاہور سے ۳۵ میل کے فاصلے پر بھائی پھیرو کے قریب ایک تبلیغی مرکز بھی قائم کر رکھا ہے، جس میں مبلغوں کو تربیت دینے کا اہتمام کیا گیا ہے اور ساتھ ہی حفظ و تجوید اور قرآن مجید کا ترجمہ پڑھانے کا بھی انتظام ہے۔

حافظ صاحب موصوف کی زیر تبصرہ کتاب "تبلیغ و تربیتِ دین کے پانچ اصول" ان کے تبلیغی مقاصد کی ایک کڑی ہے۔ اس میں دین کی تبلیغ و تربیت کے جن پانچ اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے، ان میں سب سے پہلا اصول، کلمۂ طیبہ کی شہادت ہے۔ دوسرا اصول اقامتِ نماز، تیسرا ادائے زکوٰۃ، چوتھا رمضان کے روزے اور پانچواں اصول حج بیت اللہ ہے۔

مصنف نے ان پانچ اصولوں میں ہر ایک کی کتاب و سنت کی روشنی میں الگ الگ مناسب الفاظ اور عام فہم انداز میں ضروری تفصیل بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ اس سلسلے میں شریعت اسلامی کے کیا احکام ہیں اور ان میں کیا روحانی فوائد مضمر ہیں۔ نیز یہ بتایا ہے کس طرح مخاطب کے ذہن میں پیوست ہو سکتی ہیں۔

تبلیغی نوعیت کی یہ کتاب بالخصوص عوام کے لیے بڑی مفید ہے۔ زبان اتنی صاف ہے کہ ہر شہری آسانی سے اصل مدعا کو سمجھ سکتا اور بات کی تہ تک پہنچ سکتا ہے۔

شیخ محمد اشرف (تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور) مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ دینی اور تبلیغی کتابوں کی نشر و اشاعت میں سرگرم اور مستعد رہتے ہیں۔

علمی رسائل کے مضامین

برہان، دہلی - اگست ۱۹۷۹

مضمون	مصنف
سیرتِ شیخین اور حضرت عثمان	مولانا سعید احمد اکبر آبادی
ایک عہد آفرین شخصیت - مولانا سید جعفر علی بستوی	مولانا عتیق الرحمٰن بستوی
کتاب نقد النثر اور اس کے مؤلف کی مجہول شخصیت	مولانا ابو المحفوظ الکریم معصومی

الحق، اکوڑہ خٹک - اگست ۱۹۷۹

مضمون	مصنف
پیامِ انسانیت	مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
شیخ عبد الفتاح ابو غدہ	مولانا بدر الحسن قاسمی
ادب اور شاعری کی تطہیر	مولانا مدار اللہ مدار
ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص کے سوانح حیات اور افکار	ڈاکٹر سعید اللہ قاضی
مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی	جناب محمد اکبر شاہ بخاری

العلم، کراچی - اپریل تا جون ۱۹۷۹

مضمون	مصنف
تصانیف مولانا شاغل بجے پوری	سید راشد علی اسدی
اسلامی نظامِ تعلیم	ترجمہ - ثناء الحق صدیقی
قصیدہ بانت سعاد کا اردو منظوم ترجمہ	پروفیسر منظور الحق صدیقی
حضرت صبغت اللہ شاہ ایرانی اور ان کی علمی خدمات	پروفیسر وفا راشدی
فکرِ اقبال کے چند پہلو	پروفیسر وقار احمد رضوی
سرسید کا جدید تعلیمی نظریۂ فکر	محترمہ امۃ الحمید کوثر
جھانسی کی رانی اور انگریز - ایک سفر نامہ	سید مصطفیٰ علی بریلوی
دولتِ سفاریہ	پروفیسر رحمت فرخ آبادی

فاران، کراچی ۔ اگست ۱۹۷۹ء

فقہائے ہند

جلد پنجم ۔ حصہ اول ——— از محمد اسحاق بھٹی

یہ "فقہائے ہند" جلد پنجم کا حصہ اوّل ہے جو برصغیر پاک و ہند کے بارھویں صدی ہجری کے ۱۶۲ فقہائے عالی مقام اور علمائے کرام کے تفصیلی حالات و سوانح پر مشتمل اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی مساعی کو محیط ہے۔ ہندوستان میں یہ اورنگ زیب عالمگیر کا عہد حکومت ہے جو علمی اور فقہی لحاظ سے انتہائی پُرثروت عہد ہے۔ اورنگ زیب نے ہندوستان پر اکیاون سال حکومت کی۔ اگرچہ اس دور کے بعض فقہائے عظام کا تعلق اس سے پہلے اور بعد کے حکم رانوں کے عہد سے بھی ہے، لیکن مقدمۂ کتاب میں صرف اورنگ زیب کی علمی و عملی زندگی کا ذکر کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ذاتی طور پر برصغیر کا یہ عظیم الشان شہنشاہ کس درجے نیک، پرہیزگار، بہادر و دلیر اور علم و علما اور فقہ و فقہا کا قدرداں تھا۔ اس کی اپنی کتابِ زندگی نہایت شاندار اور سب حکم رانوں سے ممتاز و اعلیٰ ہے اور خاندانِ مغلیہ کے اس حکم راں کے حالات انتہائی دلآویز و دلچسپ ہیں، جن کے مطالعے سے قلب و ذہن میں ایک خاص کیفیت کروٹ لینے لگتی ہے۔

صفحات ۳۵۲+۱۶=۳۶۸ قیمت ۲۴/= روپے

ملنے کا پتا :- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور

نومبر ۱۹۶۹ء

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ماہ نامہ المعارف ـ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ـ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکار نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقام اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون نمبر ۵۲۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۲ | نومبر ۱۹۷۹ | ذی الحجہ ۱۳۹۹ | شمارہ ۱۱

ترتیب

تاثرات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۷۶ سال کی عمر پاکر ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو امریکہ کے ایک ہسپتال میں وفات پائی۔ ۲۵ ستمبر کو ان کی میت لاہور لائی گئی اور ۲۶ ستمبر کو ان کی اقامت گاہ اچھرہ میں انھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء مطابق ۳ رجب ۱۳۲۱ھ کو سابق ریاست حیدر آباد کے شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ تحریری زندگی کا آغاز جمعیۃ علمائے ہند کے ترجمان اخبار "الجمعیۃ" (دہلی) سے کیا جو اس زمانے میں ایک ہفتہ وار جریدہ تھا۔ اسی دوران اسلام میں جہاد کے موضوع سے متعلق مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر یہی مضامین ضروری حک و اضافے کے بعد "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ "الجمعیۃ" سے علیحدگی کے بعد وہ حیدر آباد چلے گئے، جہاں بعض عنوانات پر کچھ کتابیں سپردِ قلم کیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اپنے عہد کی معروف شخصیت تھے۔ تصنیف و تالیف اور تحریر و تقریر میں مرحوم نے بڑی شہرت پائی اور سیاسی اور اسلامی اعتبار سے ہنگامہ خیز زندگی بسر کی۔ متحدہ ہندوستان میں جب آزادیِ وطن اور قیامِ پاکستان کی تحریک کا غلغلہ بلند تھا "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں زوردار مقالے لکھے اور اس زمانے کی سیاسی جماعتوں پر بھرپور تنقید کی اور ان کے تمام پہلوؤں کا مکمل تجزیہ کیا۔ یہ مقالے بعد میں کتابی صورت میں شائع کیے گئے۔

۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں جماعت اسلامی قائم کی اور اس کے امیر مقرر ہوئے۔ اس جماعت نے ملکی سیاسیات میں (بالخصوص قیامِ پاکستان کے بعد) اہم کردار ادا کیا اور بعض سیاسی مسائل و تحریکات میں نمایاں طور سے حصہ لیا۔

مولانا مودودی نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور مختلف عنوانات کو جو ان کے نزدیک

خاص اہمیت کے حامل تھے، ہدفِ فکر ٹھہرا یا۔ ان کا اندازِ تحریر اور اسلوب بیان چونکہ بڑا موثر اور عام فہم تھا، اس لیے ان کی تصنیفات کے دائروں نے بے حد وسعت اختیار کی اور کئی زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوئے۔ بالخصوص نوجوان طبقے کو ان کی تحریروں نے فکری اعتبار سے بہت متاثر کیا۔

مولانا مرحوم اپنے عصر کی صاحبِ عزیمت اور متحرک شخصیت تھے۔ ان کا اصل موضوع پاکستان میں اسلامی نظامِ حیات کا احیا اور نفاذ تھا۔ اس کے لیے انھوں نے بہت تگ و تاز کی اور اپنے مخاطبین کو ایک خاص ذہن اور اسلوبِ فکر عطا کیا۔ وہ ان مختلف دینی و مذہبی جماعتوں کے ۳۱ علما میں بھی شامل تھے، جنھوں نے اسلامی دستور کی تنفیذ کے لیے بائیس ۲۲ نکات مرتب کر کے حکومت کو پیش کیے تھے، اور یہ اس دور کی بہت بڑی اسلامی خدمت تھی۔

اسلامی دستور کے نفاذ و اجرا کے لیے کہنا چاہیے کہ مرحوم نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور ان کی تمام تصنیفات میں یہی جذبہ ہر مقام پر ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں، کئی مرتبہ جیل گئے اور طویل عرصے تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ تحریکِ ختمِ نبوت کے زمانے میں جن حضرات کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی، ان میں مولانا مرحوم کا نام نامی بھی شامل تھا۔

اپنی عظیم خدمات کے باوجود بعض علمی اور سیاسی حلقوں میں ان کی شخصیت متنازع فیہ رہی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مختلف مواقع پر موقع و محل کی مناسبت سے از راہِ اخلاص وہ اپنے فقہی اور سیاسی افکار بدلتے رہتے تھے۔ بسا اوقات اس سلسلے میں اپنے زورِ بیان کے بل پر حدود اعتدال سے آگے بھی نکل جاتے تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض اوقات ان کے افکار و تصورات سے اہل علم اور اصحابِ فکر نے بھرپور اختلاف بھی کیا اور ان کے نقطۂ نظر پر تنقید بھی کی۔!

بہرحال مولانا مرحوم کی وفات سے قوم ایک مخلص داعی اور ایک منجھے ہوئے مصنف اور نقاد و انشا پرداز سے محروم ہو گئی ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ عطا فرمائے اور غریقِ رحمت کرے۔ آمین

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی جو ہندوستان کے جید عالم تھے، جمعہ کے روز ۲۴ اگست ۱۹۷۹ء

مطابق ۳۰ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ کو اپنے وطن تھولینڈی ضلع رائے بریلی میں انتقال کر گئے۔

مولانا مرحوم آج کل دار المصنفین اعظم گڑھ میں علمی خدمات میں مصروف تھے۔ وہ ۲۱ اگست ۱۹۷۹ء (۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ) کو عید منانے کے لیے اعظم گڑھ سے اپنے وطن گئے اور وہاں پہنچنے پر بیماری نے اس قدر شدید حملہ کیا کہ تین دن بعد وفات پا گئے —— انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے، ندوۃ العلما لکھنؤ میں تحصیلِ علم کی، مزید تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ دہلی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو بمبئی کے روزنامہ "خلافت" کی مجلس ادارت میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں ندوۃ العلما (لکھنؤ) میں مدرس کی حیثیت سے بلائے گئے۔ اکیس سال تک وہاں رہے اور اس اثنا میں نہایت اخلاص اور محنت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ طویل عرصے تک جامعہ ملیہ (دہلی) میں بھی پڑھاتے رہے۔ اب دار المصنفین (اعظم گڑھ) میں مقیم تھے اور وہاں علمی و تصنیفی خدمت انجام دے رہے تھے۔

مولانا عبد السلام مرحوم کا شمار ہندوستان کی نامور شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ، تاریخ و رجال اور دیگر علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی نہایت مخلص، انتہائی ہمدرد اور بے حد محنتی تھے۔ دار المصنفین کی رونق ان کی ذات سے وابستہ تھی۔ جامعہ ملیہ، ندوۃ العلما اور دار المصنفین سے ان کو یکساں تعلق خاطر تھا۔ ان کی وفات سے یوں تو سب کو قلبی تکلیف ہوئی ہے، لیکن ان تین تعلیمی اور تصنیفی اداروں کو بالخصوص شدید نقصان پہنچا ہے۔ علم سب کی مشترکہ متاع ہے اور اہلِ علم سے سب کو ہمیشہ برابر کا تعلق رہا ہے، لہٰذا ان کی وفات سے پاکستان کے اصحابِ علم کو بھی انتہائی صدمہ پہنچا ہے۔

دعا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کے متعلقین و احباب کو صبر کی توفیق سے نوازے۔

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک

اسلام اور علومِ جدیدہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ربع مسکون پر جہالت کی اندھیری رات اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ ان تاریکیوں کو رفع کرنے کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہرِ تاباں بن کر فضائے مشرق و مغرب پر ضیا بار ہوئے۔ آپ ایک رفیع المرتبت اور عظیم الشان کتاب — "قرآنِ مجید" — لے کر آئے جس نے دنیا میں وہ عظیم انقلاب پیدا کیا جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ یہ کتاب صرف مذہبی احکام کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس نے روحانی و اخلاقی اصلاح کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بے شمار علوم و معارف سے بھی روشناس کیا۔ اس کتاب نے بغیر سوچے سمجھے اور آنکھیں بند کر کے مان لینے کا حکم نہیں دیا، بلکہ عقل کو استعمال کر کے اس کے ذریعے ہستی باری تعالیٰ کو پہچاننے کا حکم دیا ہے۔ اوہامِ باطلہ اور مشرکانہ ضعیف الاعتقادیوں کی تکذیب و تردید کر کے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں۔ رموزِ فطرت کو سمجھنے کی کوشش کریں، زمین و آسمان کے اسرار پر غور و خوض کریں اور اجرامِ سماوی کے عقدے حل کرنے کی سعی کریں۔ اگر وہ اس پر تدبر کریں گے تو ان کی فطرتِ سلیمہ خود بخود ان کی رہنمائی اس ہستی کی طرف کر دے گی جو ان تمام اشیا کی منظم و مدبر ہے۔

قرآن اور علوم

قرآن نے علومِ دینی و دنیوی کی تفریق نہیں کی۔ تمام ان علوم کو جن کے ذریعے انسان رموزِ کائنات کو سمجھ سکے اور ہستی باری تعالیٰ تک پہنچ سکے، سیکھنا لازمی ہے۔ قرآن نے بار بار لوگوں کو علم حاصل کرنے پر ابھارا ہے۔ لفظ "علم" یا اس کے مشتقات کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ۷۵۰ مرتبہ ہوا ہے۔ تقریباً ۷۵۰ ایسی آیات ہیں جن میں مختلف کائناتی علوم کا ذکر ہے۔ قرآن میں بجز لفظِ اللہ کے کوئی کلمہ علم سے زیادہ نہیں دہرایا گیا۔ یہ قرآن کی نظروں میں علم کی عظمت و جلالت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی، اس میں لکھنے اور پڑھنے

اور علم حاصل کرنے کی رغبت دلائی گئی۔ قرآنِ مجید میں ایسی آیات بہت کثرت سے وارد ہوئی ہیں جن میں مختلف علوم کو سیکھنے، رموزِ کائنات معلوم کرنے، اسرارِ مخلوقات پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات درج ذیل ہیں:

۱- فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ (الطارق: ۵)

انسان کو چاہیے کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ اس کی تخلیق کس چیز سے ہوئی۔

۲- أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ۝ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝ (نوح: ۱۵ تا ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کو کس طرح تہ بہ تہ پیدا کیا اور اس نے ان میں چاند کو روشن کیا، اور سورج کو چراغ بنایا اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے اگایا ایک طرح کا اگانا، پھر تم کو زمین میں ہی لوٹائے گا اور نکال کھڑا کرے گا تم کو دوبارہ، اور اللہ ہی نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنایا ہے تاکہ تم اس کے کھلے راستوں میں چلو۔

۳- وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (الذاریات: ۲۰-۲۱)

اور زمین میں مومنین کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمھارے نفوس میں بھی نشانیاں ہیں، پس کیا تم غور سے نہیں دیکھتے۔

۴- أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ۝ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝
(ق: ۶-۷)

پس کیا انھوں نے آسمان کی طرف جو اُن کے اوپر ہے، غور سے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور آراستہ کیا ہے اور اس میں درز تک بھی نہیں ہے اور ہم نے زمین کو بچھا دیا ہے اس میں مضبوط پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں اور ہم نے اس میں ہر قسم کی خوش نما چیزیں اگائی ہیں۔

إِنَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ

مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۙ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۔ (الجاثیہ : ۲ تا ۶)

بے شک آسمانوں میں اور زمینوں میں مومنین کے لیے نشانیاں ہیں اور تمھاری اور ان جانداروں کی پیدائش میں بھی جو اللہ تعالیٰ نے پھیلا رکھے ہیں، اہلِ یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔ رات اور دن کے بدل کر آنے میں اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو رزق (پانی) نازل کیا اور اس کے لیے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کیا اور اس میں اور ہواؤں کے بدل کر لانے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہ آیاتِ الٰہی ہیں جو ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔

۶۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ (لقمٰن : ۳۱)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کشتی سمندر میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے چلتی ہے۔ تاکہ وہ تم کو اپنی قدرت کے نشان دکھائے۔ بے شک اس میں ہر بڑے صابر و شاکر کے لیے نشانیاں ہیں۔

۷۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ڮ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (لقمٰن : ۲۹)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے کہ ہر ایک وقتِ مقررہ پر چل رہا ہے اور اللہ تمھارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

۸۔ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (العنکبوت : ۲۰)

کہہ دیجیے کہ تم سب زمین میں سیر و سیاحت کرو اور پھر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار خلقت کو کس طرح پیدا کیا۔ پھر اللہ ہی انھیں دوسری بار پیدا فرمائے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

۹۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ اِنَّ فِيْ

ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۔ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

کیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں ہر قسم کی عمدہ چیزیں کس قدر مقدار میں اُگائی ہیں، بے شک اس میں ایک نشانی (اللہ کی قدرت کی) اور ان میں اکثر ایمان نہیں لاتے۔

۱۰۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ○ (الفرقان: ۴۵)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے پروردگار نے سائے کو کس طرح پھیلا دیا اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ساکن بنا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر دلالت کرنے والا بنایا۔

۱۱۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (الحج: ۶۵)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی نے جو کچھ زمین میں ہے تمھارے تابع کیا ہے اور کشتی کو بھی جو سمندر میں اس کے حکم سے چلتی ہے اور آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ کہیں زمین پر گر نہ پڑے مگر اس کے حکم سے، بے شک اللہ لوگوں پر بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

۱۲۔ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِى الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○ (یونس: ۱۰۱)

کہہ دیجیے کہ زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اس پر غور و فکر کرو اور معجزے اور عبرت ناک واقعات ان لوگوں کے کام نہیں آتے جو ایمان نہیں لاتے۔

مندرجہ بالا آیات تمام علوم پر غور و فکر کرنے کے حکم کو شامل ہیں۔ علم فلک، نیچرل سائنس پہاڑوں، دریاؤں، نباتات، آسمان، ابر، پانی، ہوا اور روح کے متعلق اعلیٰ معلومات حاصل کرنا، ان چیزوں میں جو قوانینِ قدرت کے راز پوشیدہ ہیں ان کا پتا چلانے کی پُر زور ہدایات ان آیات سے مفہوم ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی پیدا کی ہوئی کئی چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدائے پاک کو ان مخلوقات کی قسم کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ نوعِ انسانی ایسی چیزوں کی

کھایا کرتی ہے جن سے اس کو فائدہ پہنچتا ہو اور اس بنا پر وہ ان اشیا کی قدر کرتی ہے۔ خداوندکریم نے انسان کے اس فطری میلان کی بنا پر اپنی بعض قابل قدر مخلوقات و مصنوعات کے فوائد اس پر آشکارا کرنے کا یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ ان کی قسم کھائی ہے اور اس طرح انسانوں کو اُن اشیا کی طرف متوجہ کیا ہے تاکہ وہ انھیں پہچانیں اور ان کے فوائد سے خبر دار ہو کر نفع اٹھائیں۔ ان کی قسم کھانے کا مآل صرف یہ ہے کہ انسان ان کا علم حاصل کرے اور مصنوعاتِ باری تعالی کے عجائب و غرائب سے واقف ہو کر اس کی عظمت و جلالت کا قائل ہو۔

اسلام اور علوم جدیدہ

پروردگارِ عالم نے اجرامِ علوی اور ان کے خواص، روشنیوں اور مواقع کی بیسیوں قسمیں کھائی ہیں۔ اس کے بعد رات کے چلنے کی قسم یوں کھائی ہے۔ "والیل اذا یسر" یعنی رات زمین کے گرد چلتی ہے، وہ دن کے پیچھے چلتی ہے اور دن اس کے پیچھے آتا ہے۔ ہر قمری مہینے کی پہلی رات کی قسم اس لیے کھائی کہ ان میں اندھیرے کا حصہ روشنی پر غالب رہتا ہے۔" والنجم اذا ھوٰی" ستارہ ڈوبنے کی قسم۔ اس ڈوبنے پر تنبیہ کرنے کے لیے کھائی۔ ستاروں کے مواقع (وہ جگہ جہاں وہ واقع ہیں) اور ان کے دورے کے دائروں کی بھی قسم کھائی ہے۔ پھر اس کے بعد فرمایا" وانہ لقسم لو تعلمون عظیم" یعنی اگر تم معلوم کرو تو یہ ایک بہت بڑی قسم ہے۔ اس سے بجز اس کے اور کیا معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قسم کھا کر انسان کو مقسم بہ کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا ہے تاکہ وہ ستاروں کے مواقع، ان کے اندازوں، دائروں اور حرکات و سکنات کی معرفت و شناخت حاصل کرے۔

فلک اور اجرامِ سماوی کی قسم کھا کر اور ان کی اہمیت کی طرف توجہ دلا کر پروردگارِ عالم نے اُن چیزوں کی اہمیت بتائی ہے جو آسمان کے نیچے ہیں یا کرۂ ارضی کو محیط ہیں۔ اس سلسلے کو غبار اور اڑانے والی ہواؤں کے ذکر سے شروع کیا اور فرمایا" والذاریات ذروا" پہاڑوں کی قسم کھائی "والتین، وطور سینین وھذا البلد الامین" گھوڑے کی بھی قسم کھائی" والعادیات ضبحاً" پھر ہر ایک ذی جنس اور محسوس ہونے والی چیز کی قسم کھائی اور فرمایا" وشاھد ومشھود۔

یہ علویات اور سفلیات کی قسمیں اس بات کا فائدہ دیتی ہیں کہ خداوند کریم نے اپنے بندوں پر علویات و سفلیات کے بارے میں غور و فکر کرنے کا حکم صادر فرمایا ـــ ان پر حساب، ہندسہ، نجوم

طبیعات، کیمیا، علم الہیئت اور علم النفس وغیرہ تمام علوم کا جاننا لازمی قرار دیا ہے، اس لیے کہ ان کو جو اللہ کی نشانیوں میں جو خداوند قادر مطلق نے کھائی ہیں انھی چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو ان علوم و فنون کا ماخذ اور سرچشمہ ہیں۔

قرآن نے علوم کی طرف متوجہ کرنے کا ایک اور طریقہ بھی استعمال کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ علم کی بہت تعریف کی ہے اور اس کے مقابلے میں جہالت کی شدید مذمت کی ہے۔ خداوند کریم نے علم کی اپنی ذات کی طرف نسبت منسوب کیا ہے اور یہ علم کی بہت بڑی تکریم ہے۔

بعینہٖ علماء و فضلا کی تعریف بھی قرآن کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ؕ (الزمر: ۹)

کیا یہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو جاہل ہیں باہم برابر ہو سکتے ہیں۔

۲۔ شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (آل عمران: ۱۸)

اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور اہل علم نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، وہ (اللہ) انصاف پر قائم ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا قابل عبادت نہیں، وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔

۳۔ يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ (المجادلہ: ۱۱)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جو تم میں سے ایمان لاتے اور ان کے جو علم سے بہرہ ور ہیں درجات بلند کرے گا۔

۴۔ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ (فاطر: ۲۸)

بے شک اللہ کے بندوں میں سے علما ہی اس سے ڈرتے ہیں۔

۵۔ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ۝ (عنکبوت: ۴۳)

ان مثالوں کو ہم لوگوں کے (فائدے) کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن انھیں صرف عالم لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اس طرح کی اور کئی آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جو علم اور علما کی جلالت شان کو بیان کرتی ہیں اور اس طرح بالواسطہ لوگوں کو تحصیل علم کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علوم

قرآن پاک کے ان واضح احکام پر عمل پیرا ہونا مسلمان کا فریضہ ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نبی قرآن کے پہلے مخاطب تھے ان احکام کی تعمیل میں لوگوں کو دین کے ساتھ ساتھ علم سیکھنے پر بھی آمادہ کیا۔ آپ نے اپنے اسوۂ حسنہ اور ارشادات عالیہ کے ذریعے آنے والی نسلوں کے لیے تحصیل علم کے بارے میں ایک دستور مرتب کر دیا اور واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا کہ اسلام کی دعوت چند خاص امور تک محدود نہیں بلکہ اسلام جملہ امور میں کمال حاصل کرنے کو مسلمان کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ آپ نے مسلمانوں میں علم کی ترویج کے لیے [illegible] جو قیدی آئے ان میں جو فدیہ نہیں ادا کر سکتے تھے لیکن لکھنے پڑھنے پر قادر تھے انھیں اس شرط پر رہا کرنا منظور کر لیا کہ وہ دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ آپ صحابہؓ کو اجنبی زبانیں سیکھنے پر رغبت دلایا کرتے تھے۔ اسد الغابہ میں مذکور ہے کہ رسول اکرم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو سریانی اور لاطینی زبانیں سیکھنے کا حکم صادر فرمایا۔ زید بن ثابت نے صرف سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی۔ آپ [illegible] نے تحصیل علم پر رغبت دلانے کے لیے جو ارشادات فرمائے ان میں سے چند اہم ارشادات درج ذیل ہیں:

۱۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ۔

تحصیل علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

۲۔ من سلک طریقا یبتغی فیہ علما سھل اللہ بہ طریقاً الی الجنۃ۔

جو آدمی حصول علم کے لیے سفر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔

۳۔ تعلموا العلم فان تعلمہ خشیۃ وطلبہ عبادۃ ومذاکرتہ تسبیح والبحث عنہ جہاد وتعلیمہ لمن لا یعلمہ صدقۃ وبذلہ لاھلہ قربۃ۔

علم سیکھو کیونکہ تحصیل علم خشیت الٰہی کے قائم مقام ہے، طلب علم عبادت ہے، اسے یاد رکھنا تسبیح ہے، [illegible] علم سکھانا صدقہ ہے اور [illegible]

۴۔ من [illegible]

وہ آدمی جو [illegible] علم [illegible]

[illegible]

۵۔ آپ نے [illegible]

[illegible]

السراء والضراء والسلاح علی الاعداء وبہ یعرف الحلال من الحرام وھو امام العمل والعمل تابعہ۔

علم وحشت میں انیس، سفر میں ساتھی، خلوت میں ہم نشین، کشائش اور تنگی میں دلیل راہ اور دشمنوں کے مقابلے میں قوت ہے، اس کے ذریعے حلال و حرام کے ماین تمیز کی جا سکتی ہے۔ علم عمل کا امام ہے اور عمل اس کے تابع ہے۔

۲۔ العلم حیاۃ الانسان وعماد الدین۔

علم اسلام کی زندگی اور دین کا ستون ہے۔

۷۔ افضل العبادۃ طلب العلم۔

طلب علم افضل عبادت ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف علم حاصل کرنے پر ہی رغبت نہیں دلائی، بلکہ علما کی بڑی تعظیم و تکریم بیان کی ہے۔ اس ضمن میں آپ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:

۱۔ انّ مثل العلماء فی الارض کمثل النجوم یھتدی بہ فی ظلمات البحر فاذا انطمست النجوم اوشک ان تضلّ الھداۃ۔

دنیا میں علما کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ستارے جن سے سمندروں کی تاریکیوں میں ہدایت حاصل کی جاتی ہے، جب ستارے چھپ جائیں تو خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں راہرو بھٹک نہ جائیں۔

۲۔ لموت قبیلۃ خیرٌ من موت عالم۔

ایک عالم کی موت سے ایک پورے قبیلے کا مر جانا بہتر ہے۔

۳۔ یشفع یوم القیامۃ ثلاثۃ، الانبیاء، ثم العلماء، ثم الشھداء۔

قیامت کے دن صرف تین گروہ سفارش کریں گے، انبیا، علما اور ان کے بعد شہدا۔

۴۔ حضور مجلس عالم افضل من صلوٰۃ الف رکعۃ وعیادۃ الف مریض وشھود الف جنازۃ۔ قیل یا رسول اللہ ومن قراءۃ القرآن؟ فقال علیہ السلام ھل ینفع القرآن الا بالعلم۔

کسی عالم کی مجلس میں حاضر ہونا ایک ہزار رکعت نماز پڑھنے اور ایک ہزار مریضوں کی عیادت کرنے اور

ایک ہزار جنازوں میں شرکت کرنے سے زیادہ افضل ہے۔ رسول کریم سے سوال کیا گیا، یا رسول اللہ۔ کیا تحصیل علم قرآن مجید سے بھی افضل ہے۔ آپ نے فرمایا قرآن بھی تو علم کی موجودگی میں ہی فائدہ دیتا ہے۔

مسلمان اور علوم

قرآن پاک اور رسول پاک کے ان واضح ارشادات کی تعمیل میں مسلمانوں نے علوم و فنون کی تحصیل کو اپنا شعار بنا لیا وہ جذبہ ہائے عرب سے نکل کر جہاں بھی گئے اس جذبے کو ساتھ لے کر گئے۔ اسلامی فتوحات کے سیلِ رواں کے سامنے دنیا کی عظیم ترین سلطنتیں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں مسلمان قیصر و کسریٰ کے وارث بن گئے، مسلمان جب مفتوح ممالک میں داخل ہوئے تو انھوں نے ان کے ساتھ وحشی اور جاہل اقوام کا سا سلوک نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جس کی ہم دورِ حاضر کی مہذب و متمدن ترین اقوام سے کبھی توقع نہیں کر سکتے۔

مسلمانوں نے ان کے علمی مراکز کی حفاظت کی اور ان کے علما کی ہر طرح تعظیم و تکریم کی، صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اپنے مفتوحین کی شاگردی حاصل کر لی اور اس میں کوئی سبکی محسوس نہ کی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم کے احکام کی پیروی میں ہو رہا تھا۔ تاریخ اسلام مسلمانوں کی علم دوستی اور غیر مسلم علما کے ساتھ حسنِ سلوک کے بارے میں واقعات سے بھری پڑی ہے۔ خلیفہ ثالث عثمانؓ بن عفان، حزیمۃ العذر الطائی نامی حرانی شاعر سے مراسم رکھتے تھے۔ وہ تاریخ ملوکِ عجم کا ماہر تھا۔ عمرو بن العاصؓ فاتح مصر کے یوحنا فیلو پونوس نامی یونانی نحوی کے ساتھ جو اسکندریہ میں مقیم تھا، تعلقات تھے۔

عبید بن شریہ اور وہب بن منبہ دونوں تاریخ قدیم کے ماہر تھے اور امیر معاویہؓ کے ان کے ساتھ دوستانہ روابط تھے۔ خالد بن یزید بن معاویہ نے تخت خلافت سے الگ ہونے کے بعد علم و حکمت کی تحصیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ اس نے اسکندریہ کے عالم ماریانوس کو جو علم کیمیا کا ماہر تھا، اپنے پاس بلا لیا اور اس کی شاگردی کر لی۔ عمر بن عبدالعزیز بڑے مذہبی خلیفہ تھے اس کے باوجود انھوں نے اسکندریہ کے طبی مدرسوں کو انطاکیہ اور حران منتقل کروایا اور اہرون بن اعین طبیب کی کتاب کناش کا سریانی ترجمہ جسے مروان بن الحکم کے حکم سے ماسرجویہ نے سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، شائع کروایا۔ یہ ابتدائی دور کی چند مثالیں ہیں، بعد میں عباسی دور میں ہارون، مامون اور ان کے جانشینوں نے علوم و فنون کی نشر و اشاعت کے لیے

جو کارنامے انجام دیے وہ اظہر من الشمس ہیں اور ان کا دہرانا تحصیل حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید اور رسول کریمؐ کے ارشادات کے زیر ہدایت مسلمانوں نے مختلف علوم و فنون کی طرف اپنی توجہ منعطف کر دی۔ انھوں نے تمام علوم کو سیکھا۔ ابتدائی دور میں ان کی حیثیت محض شاگردوں کی سی تھی۔ انھوں نے غیر اقوام کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ ترجمے کے بعد انھوں نے مختلف علوم و فنون پر پورا پورا کمال حاصل کر لیا۔ اس کے بعد ذاتی ریسرچ شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ اپنے استادوں سے بازی لے گئے۔ علوم کی تاریخ میں کندی، فارابی، رازی، غزالی، جابر بن حیان، ابن الہیثم، ابن سینا، زہراوی، البیرونی اور ایسے سینکڑوں فضلا کے نام مرقوم ہیں۔ انھوں نے یونانی اور دیگر علوم کو پڑھا اور پھر ان میں اپنی جدت طبع کی بنا پر بے پناہ اضافے کیے۔

مسلمانوں کی کتابیں عرصہ دراز تک یورپ میں درسی کتابوں کے طور پر پڑھائی جاتی رہیں اور ان کو یورپ کی مختلف زبانوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ دور حاضر میں یورپ نے علوم و فنون میں جو عظیم الشان ترقی کی اس کی بنیاد اسی علمی میراث پر ہے جو مسلمانوں نے اپنے دور عروج کے خاتمے پر یورپ والوں کے سپرد کی تھی۔ یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ مسلمانوں نے یورپ کو توہمات و غفلت کی گہری نیند سے بیدار کیا لیکن خود خواب خرگوش کے مزے لینے لگے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس نیند سے جاگیں اور علوم کی دوڑ میں آگے نکلنے کی کوشش کریں۔ وہ اس وقت تک دنیا میں سر بلند نہیں کر سکتے، جب تک کہ دوبارہ علوم میں دنیا کے قائد نہیں بن جاتے۔ اگر وہ علوم میں آگے نکلنے کی جدوجہد کریں گے تو قرآن کریم اور رسول مقبولؐ کے واضح احکام کی تعمیل کریں گے۔ ان کے لیے دنیوی علوم کے ساتھ ساتھ اخروی یقینی بھی حاصل ہوں گی۔ انھیں دہرا فائدہ ہوگا۔ دنیا میں عظمت اور آخرت میں کامیابی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض

امام غزالیؒ کی کتاب ــــ تحفۃ الملوک

امام زین الدین حجۃ الاسلام ابو حامد محمد غزالی طوسی (۴۵۰ - ۵۰۵ھ/۱۰۵۸ - ۱۱۱۱ء) عالمِ اسلام کی مایۂ ناز ہستیوں میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں دنیا میں سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان کی عربی اور فارسی کتابوں کا بڑا حصہ بھی دنیا کی کئی اہم زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ تاہم نئی تحقیقات کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی پچپن سالہ زندگی کے دوران کوئی ۹۹ کتب لکھی تھیں۔ ان سالوں میں ان کے نئے رسائل اور مکتوبات کا انکشاف ہو رہا ہے۔ "تحفۃ الملوک" بھی ایسے رسائل میں شامل ہے۔

مسلمانوں کے ادب و شعر میں ملوک و سلاطین کی طرف بہت زیادہ اعتنا پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ لوگ سیاہ سفید کے مالک رہے اور مشہور قول ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم" چنانچہ ملوک و سلاطین کی نام لکھی جانے والی کتب کے نام کثیر تعداد میں موجود ہیں جیسے سیر الملوک، نصیحۃ الملوک، اور ذخیرۃ الملوک۔ پہلی کتاب کے مصنف خواجہ نظام الملک طوسی (م ۴۸۵ھ) ہیں۔ نصیحۃ الملوک امام غزالی کی ایک مبسوط کتاب ہے[1] جسے انھوں نے ۵۰۳ھ میں لکھا اور معاصر حکمران محمد بن ملک شاہ کو پند و اندرز دیے۔ ذخیرۃ الملوک آٹھویں صدی ہجری کے مصنف میر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ) کی ایک تالیف ہے[2]۔ "تحفۃ الملوک" امام محمد غزالی کا ایک رسالہ ہے جس کے مخطوطے ان چند سالوں میں ملے۔ چنانچہ علامہ شبلی کی "الغزالی" اس کے ذکر سے خالی ہے[3]، مگر استاد جلال ہمائی سنا

---

[1] مرتبہ استاد جلال الدین ہمائی سنا۔ شائع کردہ انجمن آثار ملی تہران ۱۳۳۸ھ ش/ ۱۹۵۹ء۔ مقدمہ ۱۹۴ صفحے کا ہے اور متن ۲۶۱ صفحے کا۔ فہرس اور اشاریہ ان سے جدا ہے۔

[2] شائع کردہ شیخ نیاز علی خان۔ مرتسر ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں یہ کتاب بمبئی سے بھی شائع ہوئی تھی۔ اقم الحروف کا مرتبہ متن زیر اشاعت ہے۔

[3] البتہ شبلی تحفۃ الملوک کو نصیحۃ الملوک سمجھتے رہے ہیں۔

نے "غزالی نامہ" میں اس کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ اصل رسالے کو استاد محمد تقی پژوہ نے مجلہ دانشکدہ ادبیات مشہد کے شمارہ ۲، ۳ بابت بہار و خزاں ۱۹۶۵ء میں شائع کروا دیا (ص ۲۵۰ تا ۳۰۰)، اور راقم الحروف اسے اردو خوانوں میں متعارف کرانے کی خاطر یہ چند سطور لکھ رہا ہے۔

امام غزالی نے سلاطین و امرا کی اصلاح کے ذریعے عامۃ الناس کی اصلاح پر توجہ مبذول رکھی۔ نصیحۃ الملوک کے علاوہ ان کے مکتوبات بھی اس امر پر دلالت کرتے ہیں۔ امام موصوف کے مکتوبات کے مجموعے کا عنوان "فضائل الانام من مکاتیب حجۃ الاسلام" ہے[۵۴] اور وہ بے باکانہ پند و نصائح کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ گو یہ موضوع ان کی دیگر کتابوں جیسے احیاء علوم الدین اور ان کی فارسی تلخیص کیمیائے سعادت میں بھی ملتا ہے، مگر نیا دریافت شدہ رسالہ تحفۃ الملوک اس ضمن میں زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کا ایک حصہ نصیحۃ الملوک نامی کتاب کا خلاصہ ہے اور غالباً یہ بھی سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی التماس پر لکھا گیا ہے۔ افتتاحیے کی عبارت یوں ہے:

"... ایزد تعالیٰ سعادت دین و دنیا نثار روزگار عزیز سلطان اسلام کناد و آفتہای روزگار بد ازان دل و جان و تن بگرداند و بر دست او آن را باد کہ رضای باری عز و علا در آن بود، تا دولت ملک دنیا سعادت اخروی گردد و بعدل و حسن رای و ہمت عالی او جہان آراستہ گردد و سنتہائے نیکو نہادہ شود کہ تا جہان بود، ثواب آن بدالیون او می رسد بمنہ و کرمہ وجودہ و مشیتہ ..."

کتاب کے ابواب اور خلاصۂ مطالب

امام غزالی کی نصیحۃ الملوک کے صرف سات ابواب ہیں مگر تحفۃ الملوک کے ابواب کی تعداد گیارہ ہے۔ ان دونوں کتابوں کے ابواب میں کوئی اشتراک نظر نہیں آتا۔ دراصل پہلی کتاب کے مطالب سیاسی نوعیت کے ہیں اور اس میں سلاطین و ملوک، وزرا اور ندما اور سلاطین کے جملہ معاشرتی کی سیرت و عمل کے بارے میں باتیں بیان کی گئی ہیں، مگر تحفۃ الملوک کے مطالب، باب سوم کو مستثنےٰ کرتے ہوئے جس میں عدل و احسان اور ان کی شرائط کا ذکر ہے، دینی اور صوفیانہ ہیں۔ بادشاہ کے نام لکھے جانے کی مناسبت سے اس کا عنوان تحفۃ الملوک رکھا گیا، ورنہ اس کے دینی مطالب ملوک و

---

[۵۴] مرتبہ استاد عباس اقبال آشتیانی، تہران، ۱۳۳۲ھ / ۱۹۵۴ء

سلاطین کی نسبت سے جوڑ نہیں کھاتے - علامہ شبلی نے "الغزالی" میں جس مختصر کتاب کو نصیحۃ الملوک کہا اور اس کے مضامین کی طرف اشارہ کیا [۵۵]، وہ دراصل نصیحۃ الملوک نہیں بلکہ یہی تحفۃ الملوک معلوم ہوتی ہے - جیسا کہ پروفیسر جلال ہمائی نے نصیحۃ الملوک کے مقدمے میں واضح کیا ہے، یہ کتاب دیگر ناموں سے بھی موسوم رہی ہے، مگر اکثر مخطوطے یہ نکتہ واضح کیے دیتے ہیں کہ نصیحۃ الملوک اور تحفۃ الملوک دو جداگانہ کتابیں ہیں - اس دوسری کتاب کے عنوانات حسب ذیل ہیں :

باب یکم: اعتقاد و ایمان —— باب دوم: علما کے اختلافات کی صورت —— باب سوم: عدل و انصاف اور اس کی شرائط —— باب چہارم: طہارت اور اس کے آداب —— باب پنجم: نماز اور اس کے اسرار و رموز —— باب ششم: روزہ اور اس کی شرائط —— باب ہفتم: ادائے زکوٰۃ اور اس کے اسباب —— باب ہشتم: حج اور اس کی شرائط —— باب نہم: شکار اور فقہ حنفی کی رو سے اس کے بعض مسائل —— باب دہم: انبیائے کرامؑ اور مشائخ تصوف کی بعض حکایات —— باب یازدہم: فریضۂ جہاد -

باب یکم میں عقائد ایمانی کا بیان بصیرت افروز انداز میں ملتا ہے - عقیدۂ توحید و رسالت، فرشتوں، آسمانی کتب اور آخرت پر ایمان رکھنے اور دیگر جزئیات ایمان کے بارے میں امام موصوف نے ایمان افزا اسلوب میں بحث کی ہے - ابتدا میں ذات باری تعالیٰ کی احدیت اور قیومیت نیز "صفات" کے تعدد کا بیان ہے - آغاز کلام یوں ہے : "جان لے کہ اللہ ایک ہے - اس کا کوئی شریک نہیں - وہ یگانہ ہے - اس

---

[۵۵] الغزالی، شائع کردہ عرفان پبلشرز صدر بازار لاہور کینٹ (س ن)، ص ۲۲۵ تا ۲۲۷ - نصیحۃ الملوک (دیکھیں حوالہ ۱ بالا) کے سات ابواب کے عنوانات حسب ذیل ہیں -

باب یکم، در عدل و سیاست و سیرت ملوک و ذکر پادشاہان پیشین -

باب دوم، در سیاست وزارت و سیرت وزرای معروف - باب سوم، اندر ذکر دبیران سلاطین -

باب چہارم، در آوردن بعضی از علو همت و بلند همتی آنان - باب پنجم، در ذکر حکیمان و سخن های حکمت -

باب ششم، در شرف خرد و ذکر خردمندان - باب ہفتم، اندر ذکر زنان و خیر و شر آنان -

نصیحۃ الملوک کا عربی ترجمہ دستیاب ہے اور ان دنوں اس کا ایک اردو ترجمہ بھی اشاعت پذیر ہونے لگا ہے -

جیساکوئی دوسرا نہیں۔ اس کی ابتدا نہیں کیونکہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ وہ ہمیشہ رہے گا کہ اس کی انتہا نہیں۔ اس کا وجود اپنی ذات سے قائم ہے، مگر دوسرا کوئی وجود اس سے بے نیاز نہیں۔ وہ اپنی ذات سے قائم ہے مگر دوسروں کا وجود اس کی ذات کا محتاج ہے۔ قیوم کا مفہوم یہی ہے۔ اس کی ذات جوہر ہے نہ عرض اور نہ کوئی دوسری چیز اس جیسی ہے ۔ ۔ ۔" قرآن مجید کے ذکر میں غزالی اپنے اشعری عقائد کا اظہار کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید کلامِ قدیم ہے، غیر مخلوق ہے اور لفظی و معنوی طور پر خدا کا کلام ہے۔ اس باب کا ایک ابتدائیہ اور دو فصلیں ہیں۔

اختلاف علما کے بارے میں دوسرا باب بھی ذات و صفات اور اعمالِ دین کے اختلافات کے بارے میں ہے۔ ذات و صفات کے اختلافات کو غزالی ناروا بدعت اور کفر آموز کام قرار دیتے ہیں مگر اعمالِ دین کی جزئیات کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ فقہی اور اجتہادی اختلافات میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ ان اختلافات کو ناروا نزاعات اور مخاصمات کا موجب نہیں بننا چاہیے۔

عدل اور اس کی شرائط کے تحت تیسرے باب کی مختصر سی آٹھ فصلیں ہیں، اور دراصل یہی باب کتاب کے عنوان سے مطابقت رکھتا ہے۔ افتتاحی عبارت کا ترجمہ یوں ہے: "جان رکھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک کوئی اپنے مومن بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے، اس کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ جاننا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ کے حکم و فرمان کی مخالفت عظیم گناہ ہے اور بے حد خطرناک بات ۔ مگر دوسروں کے حقوق کی مراعات نہ کرنا اس سے بھی خطرناک ہے کیونکہ جب تک دعویٰ دار معاف نہ کرے، توبہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور ظالم کو عرصۂ محشر میں مظلوم کے سامنے پیش ہوکر صورتِ حال بنانی ہوگی اور جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کے حق سے محروم نہ کرے گا۔ ولایت معنوی کے مرتبے پر غور کریں جو نبوت کے بعد اعلیٰ ترین رتبہ ہے۔ اس مرتبے کے حامل کی سعادت کا سرمایہ بے حد عظیم ہے مگر اس رتبے والے کی شقاوت اور گناہ کی سزا بھی بے حد خطرناک ہوتی۔ ولایتِ صوری کا بھی یہی حال ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلطانِ عادل کے عدل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادات پر فائق ہے ۔ فرمانِ رسولؐ ہے کہ سات قسم کے لوگ قیامت کے دن عرشِ ایزدی کے مخصوص سایے کے نیچے ہوں گے، اوّل عادل سلطان ہے۔ دوم وہ جوان جو عبادت میں محو رہ کر پل بسا ہو۔ سوم وہ مرد جس کا دل بازار میں کام کرتے ہوئے بھی مسجد میں لگا ہو۔

پنجم وہ لوگ جن کی دوستی رضائے خداوندی کی خاطر ہو۔ ششم وہ شخص جسے حسین وجمیل عورت دعوتِ گناہ دے، مگر وہ کہے کہ "میں خدا سے ڈرتا ہوں"۔ ہفتم وہ جو دائیں ہاتھ سے اس طرح صدقہ وخیرات دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ نبی اکرم کا ارشاد ہے کہ عادل حاکم خدائے تعالیٰ کا محبوب ہے اور ظالم حکمران مغضوبِ باری تعالیٰ ہے۔ حدیثِ قدسی ہے کہ قسم اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے، سلطانِ عادل کے ایک دن کے اعمال عرشِ بریں پر پہنچتے ہیں کہ جملہ رعیت کے اعمال ان کی برابری نہیں کر سکتے اور اس کی ہر نماز کا ثواب دوسروں کی ستر ہزار نمازوں کے برابر ہوتا ہے۔ اگر عدل وانصاف کی حکمرانی کا یہ درجہ ہے تو اس نسخۂ اکسیر کو زائل کرنا اور اس سعادت سے استفادہ نہ کرنا شقاوت و بدبختی کے سوا کیا ہے؟ . . .

باب چہارم، ظاہری اور باطنی طہارت کے بارے میں ہے۔ اس باب میں جہاں غسل اور وضو و تیمم وغیرہ کے مسائل مندرج ہیں، وہاں باطنی طہارت جیسے زبان کو بدگوئی اور دل کو کینے اور عداوت سے پاک رکھنے کی تلقین بھی دلآویز انداز میں ملتی ہے۔ طہارت کے فقہی مسائل کو امام موصوف نے حنفی اور شافعی حضرات کی کتب کے حوالے میں بیان کیا ہے۔

باب پنجم تا ہشتم میں بالترتیب نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے اسرار ورموز اور ضروری مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان ابواب میں مختصر فصول ہیں اور جملہ اہم مطالب ان صفحات میں سمٹ آئے ہیں۔ مسائلِ فقہی میں حنفی اور شافعی فقہ کے فرق وامتیاز کو جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔

ابتدا میں فلسفۂ عبادت بیان کیا گیا ہے اور اسے پڑھ کر اقبال کے "جوابِ شکوہ" کا یہ شعر برملا زبان پر آنے لگتا ہے:

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالیؓ نہ رہی   فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالیؒ نہ رہی

غزالی فرماتے ہیں کہ نماز عبادت شعار بننے کے لیے آدمی کو آمادہ کرتی ہے اور اس کا مدعا یہ ہے کہ آدمی ظاہری اور باطنی تقویٰ اختیار کرے اور پاکیزگی کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ روزے کا بھی یہی مطلب ہے اور اس سے ضبطِ نفس اور تحمل کا سبق بھی ملتا ہے۔ زکوٰۃ، مالی قربانی سکھاتی ہے تاکہ انسان دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو اور مالی قربانی کا عادی ہو کر جان کی قربانی کے لیے آمادہ ہو سکے جو جہاد و قتال کے موقع کے لیے مخصوص ہے۔ امام موصوف نے حج کے معاشرتی اور روحانی فوائد پر تفصیل سے لکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ا

چار ابواب میں فلسفۂ عبادات پر ایسی باتیں تحریر کی گئی ہیں جو دل میں جذب ہوتی چلی جاتی ہیں۔

باب نہم حلال اور حرام جانوروں کے شکار کے بارے میں ہے۔ اس زمانے میں حکام و امرا شغلِ شکار کے خاص طور پر دلدادہ تھے اور مختلف جانور اور پرندے بھی فراوانی سے دستیاب تھے۔ امام غزالی نے مختلف چرندو پرند کی حلت و حرمت کے بارے میں مختصر بحث فرمائی ہے۔

باب دہم میں انبیا و مشائخ کی دل پذیر حرکات مرقوم ہیں۔ متن کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکایات معاصر سلطان کی فرمائش پر لکھی گئی تھیں۔

ابتدا میں حضرت آدم کی تخلیق، ان کے مسجودِ ملائک بننے، ابلیس کے سجدے سے انکار کرنے، حضرت موصوف کے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے اور بہشت سے نکال دیے جانے کا بیان ہے اور آخر میں اُن کی توبہ و انابت اور سرفرازی کا۔ دوسرے نمبر پر حضرت ابراہیم کا ذکر ہے۔ پہلے ان کی سخاوت کا بیان ہے کہ بھیڑ بکریوں کے تین سو ریوڑ انھوں نے راہِ خدا میں دے دیے اور خود اپنے فقر و افلاس کا ذرا خوف نہ کیا۔ دوسرا واقعہ ان کے آتش نمرود میں کود جانے اور آتش کے گل گلزار بن جانے کا ہے۔ امام غزالی اولادِ ابراہیمؑ کی برکات و سعادات سے بحث فرماتے اور اسے اعمالِ ابراہیم کی ایک صورت قرار دیتے ہیں۔ بعد کا بیان حضرت موسیٰ کے بارے میں ہے۔ حضرت موسیٰ کا ذکر قرآن کی انتیس [۲۹] سورتوں میں آیا ہے۔ ان کا صندوق میں ڈالے جانا، فرعون کے ہاں پلنا، بعد میں مدین چلے جانا اور حضرت شعیب کی زیرِ تربیت رہنا، نبوت ملنا، فرعون سے مقابلے اور کامیابیاں اور فرعون اور اس کے عساکر کی غرقابی نیز دیگر جزئیات کو امام موصوف کے بیان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے حصے کی آخری فصل اس طرح بیان کی گئی ہے۔

"بلعم باعور بنی اسرائیل کا ایک زاہد شخص تھا۔ اسے اسم اعظم کا علم تھا۔ اس نے چار سو سال تک خدا کی عبادت کی تھی۔ اسے اپنی بیوی سے پیار تھا۔ وہ عبادت کرنے کی بنا پر مستجاب الدعا تھا۔ حضرت موسیٰ جب سفر میں تھے تو کفار نے اس سے کہا کہ وہ بددعا کرے تاکہ حضرت موسیٰ صحرا سے نہ نکل سکیں۔ اس نے یہ بات نہ مانی مگر لوگوں نے اس کی بیوی کو رشوت دی اور اس نے محبت اور تہدید کے ذریعے بلعم باعور کو بددعا کرنے کے لیے راضی کر لیا۔ اس کی بددعا سے حضرت موسیٰ چالیس برس تک صحرا میں سرگرداں رہے۔ آخر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ اس سرگردانی کی علت انھیں بتائی جائے۔۔۔

آئی کہ بلعم باعور مستجاب الدعا ہے اور اس نے تمھارے خلاف دعا کی ہے۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ باوجود نبی ہونے کے کیا میں مستجاب الدعا نہیں ؟ جواب ملا، کیوں نہیں ۔ تم دعا تو کرو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے سحری کے وقت دعا کی جس سے بلعم باعور کی بددعا کا اثر زائل ہوگیا اور اسم اعظم کی پناہ سے بھی وہ محروم ہوگیا۔ بلعم باعور کا منہ کج ہوگیا اور اس کی زبان باہر نکل گئی تھی ۔ قرآن مجید میں " فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ " (الاعراف:۱۷۶) کے ذریعے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

بلعم باعور اور حضرت موسیٰ کے قصے کا ہم نے تحت اللفظ ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اس کی تلخیص لکھ دی ہے۔ بعد میں حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت عیسٰی اور حضرت محمد علیہم السلام کے چند واقعات لکھے گئے ہیں۔ یہ تمام قرآنی واقعات ہیں۔ پھر خلفائے راشدینؓ کے جود و سخا، جواں مردی، ایثار اور تقویٰ پر مبنی چند قصص لکھے گئے ہیں ۔ مشائخ میں صرف حضرت شیخ عبدالرزاق صنعانی کی ایک داستان لکھی گئی ہے۔ یہ وہی داستان ہے جو شیخ عطار نیشاپوری (م ۶۱۸ھ) کی مثنوی "منطق الطیر" میں داستان شیخ صنعان کی بنیاد بنی ہے ۔ چونکہ منطق الطیر کے ذریعے یہ داستان معروف ہے، لہٰذا اس کے لکھنے سے احتراز کیا جاتا ہے ۔ البتہ اس کا مدعا یہ ہے کہ دین داری وہی صحیح ہے جو عمل اور یقین کے ساتھ محکم ہو ورنہ بڑے بڑے مشائخ کا دعوئ اسلام زنّارداری ثابت ہوسکتا ہے ۔

تحفۃ الملوک کا باب یازدہم جہاد کے بارے میں ہے ۔ اس باب کی پانچ فصول ہیں ۔ اس کے آغاز کو ملاحظہ فرمائیں اور چھٹی صدی ہجری کے ابتدا کے عالم اسلام کے واقعات کو ذہن میں لائیں ۔ اتفاق سے ان دنوں بھی مسلمانوں کے بعض عتبات عالیہ کی سرنوشت اسی طرح ہے جس طرح امام غزالی کے زمانے میں تھی،

" اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط (التوبہ:۱۱۱)

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال خرید رکھے ہیں کیونکہ ان کے لیے بہشت ہے۔

یہاں نفس و مال کی قربانی سے جہاد کی طرف اشارہ ہے جو دین اسلام کے اصول میں سے ایک اصل ہے۔ جہاد ایک وہ ہے جو کفار سے دارالکفر میں جا کر کیا جائے، مگر فی زمانا حالات دگرگوں ہیں۔ ان دنوں کفار دیار اسلام کے کئی حصوں پر قابض ہیں اور مسلمانوں کی مساجد و منابر پر متصرف ہیں۔ روضہ حضرت خلیل ان دنوں خوک خانہ بنا ہوا ہے اور محراب حضرت زکریا اور مہد حضرت عیسٰی خم خانہ ہے۔ آج اہل کفر دندناتے پھرتے

ہیں اور شعائرِ اسلام کی کھلم کھلا تضحیک کر رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کے سلطان پر نماز کی طرح فرض ہے کہ کفار کا قلع قمع کرے اور اگر اس معاملے میں وہ بے عملی کا ثبوت دے گا تو عذابِ الٰہی سے نہیں بچ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ روزِ جزا فرمائے گا کہ میں نے تجھے قوت و قدرت دی اور تو نے دارالاسلام کو آزاد کرانے، مسلمان قیدیوں کو رہا کرانے اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی فریاد رسی کرنے کے لیے کچھ نہ کیا اور اس جرم کی سزا ابدالاباد تک کا عذاب ہے . . .“

اس باب میں امام غزالی مالی اور جانی قربانی کے فلسفے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے اور غازی اور شہید کے مرتبہ و مقام پر بحث کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب موت ناگزیر ہے تو شہید ہو جانا کس قدر قابلِ سعادت بات ہے۔ غزالی انبیا و رسل کی جنگوں اور نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے نتائج سے بحث فرماتے ہوئے ایسی باتیں کہتے ہیں کہ ان سے ایک بار پھر علامہ اقبال کا ایک بہترین شعر یاد آنے لگتا ہے :

جنگِ شاہانِ جہان غارت گری است جنگِ مومن، سنتِ پیغمبری است

ڈاکٹر نسرین اختر

اورنگ زیب عالم گیر، اقبال کی نظر میں

سترھویں صدی کا ایک مردِ مومن جس کی ذات میں علامہ اقبال کو تمام انسانی امتیازی خصوصیات مجتمع ملتی ہیں، اورنگ زیب عالم گیر ہے۔ علامہ اقبال ایسے ہی مردِ کامل کے مداح تھے اور مسلمانوں کو اسی سانچے میں ڈھلنے کی تبلیغ اور تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

گویا اقبال کے نزدیک مکمل انسان وہ ہے جس میں شخصیت، قوت و صولت، پاکیزگی و طہارت اور رحم و کرم کی خصوصیات پائی جائیں۔ ایک دوسری جگہ انہی باتوں کو یوں بیان کرتے ہیں :

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش　　خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں　　جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

اورنگ زیب عالم گیر علامہ اقبال کی نظر میں وہ مردِ مومن ہے جس کے متعلق علامہ نے کہا۔

"اگر عالم گیر دارا کے معاملے میں بھی " بادشمناں مدارا" پر عمل کرتا تو ہندوستان میں شریعتِ اسلامیہ کی حکومت کبھی قائم نہ ہوتی"[۵]

دارا شکوہ شاہ جہان اور ممتاز محل کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ مارچ ۱۶۱۵ء میں اجمیر کے قریب پیدا ہوا۔ شاہ جہان نے دارا شکوہ کو ولی عہدِ سلطنت مقرر کر دیا تھا چونکہ اس میں سیاسی بصیرت اور عسکری مہارت کا فقدان تھا، نیز وہ ہندو دھرم کے مطالعے کے نتیجے میں ویدانت سے متاثر تھا اور ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کے میل جول کی وجہ سے ہندوؤں کی طرف مائل تھا، یہ خطرہ بھی واضح

---

[۵] مقالاتِ اقبال، ص ۱۷۰۔ مرتبہ سید عبدالواحد معینی

تھا کہ اس کے حکومت سنبھالتے ہی دین کی نئی نئی تاویلیں ہوں گی، شریعت اسلام میں رخنے پڑیں گے اور مسلمانوں کے اعتقادات میں فرق آجائے گا[۵۲] اسلام کے متعلق ان دوررس اندیشوں کی بنا پر اورنگ زیب اور دارا کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ اورنگ زیب صرف دین اسلام کے تحفظ کا خواہاں تھا۔ دارا شکوہ نے حصول تخت کے لیے دھرمٹ، ساموگڑھ اور دیورائی کے مقام پر پے در پے لڑائیاں لڑیں اور شکست پر شکست کھائی۔ پھر ایران کی صفوی حکومت کے شاہ عباس دوم سے مدد حاصل کرنے کی غرض سے قندھار کے راستے ایران جارہا تھا کہ راستے میں ڈھاڈر کے افغان سردار ملک جیون نے اسے گرفتار کرکے دہلی بھجوایا جہاں کفر و الحاد اور بے دینی پھیلانے کے الزام میں اس پر مقدمہ چلا کر اُسے قتل کی سزا دی گئی۔ علما کے متفقہ فیصلے کی بنا پر اسے ۳۰ اگست ۱۶۵۹ کو قتل کیا گیا۔

دارا ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف میں کوئی فرق نہیں سمجھتا تھا، اس کی کوشش یہ تھی کہ ہندوؤں کے اعتقادات سے مسلمانوں کو روشناس کرائے[۵۳] علامہ اقبال نے دارا کے الحاد کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

تخم الحادی کہ اکبر پرورید ... باز اندر فطرت دارا دمید
شمع دل در سینہ ہا روشن نبود ... ملت ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را ... آں فقیر صاحب شمشیر را

دارا کی کوشش یہ تھی کہ اکبر کے ان ملحدانہ تصورات کو پھر سے زندہ کیا جائے جو جہاں گیر اور شاہ جہان کی مساعی سے ختم ہو چکے تھے۔ مگر خدا نے اپنے دین کو محفوظ و مامون کرنے کے لیے مرد مومن اورنگ زیب عالم گیر کو پیدا کیا جو صاحب فقر بھی تھا اور صاحب شمشیر بھی۔ اس نے اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے لیے اپنی زندگی وقف کی اور کٹھن حالات میں بھی عزم و ہمت کے دامن کو تھامے رکھا۔ اس کا نصب العین ترویج شریعت اور دین محمدی کا استحکام تھا۔ وہ ملک کے باشندوں کو وہی حقوق دینا چاہتا تھا جو اسلامی قانون کے تحت کسی ملک کی رعایا کو ملتے ہیں۔ عام مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی درستی اور ان کو مکروہات و ممنوعات شرعی سے باز رکھنے کا اہتمام کیا۔ سیاسی استحکام کے

---

۵۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۹، ص ۱۵۳۔ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

۵۳ ایضاً، ص ۱۵۴

بعد ملک میں اسلامی شریعت کے مطابق احتساب کے محکمے قائم کیے، منصب داروں کو حکم تھا کہ کوئی فیصلہ شریعت کے خلاف نہ کیا جائے۔ اورنگ زیب نے یہ محکمہ قائم کرکے اصلاح کا جو کارنامہ اس وسیع و عریض سلطنت میں سرانجام دیا وہ تاریخ اسلام کا ایک بنیادی باب ہے۔

اورنگ زیب اگرچہ ایک عظیم سلطنت کا شہنشاہ تھا مگر اس میں بوریانشین درویش کے اوصاف بھی تھے۔ وہ ایک طرف بہادر اور جری سپاہی تھا تو دوسری طرف ایک عالم باعمل تھا۔ وہ اسلامی سلطنت کو وسعت دینے کی جد و جہد کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین کے نفاذ سے ملک کو خالص اسلامی حکومت کے سانچے میں ڈھالنے کی دن رات کوشش کرتا رہا۔ وہ شاہی کر و فر کے ہوتے ہوئے بھی درویشانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کی ذات میں وہ تمام خوبیاں جمع تھیں جو ایک مرد مومن میں ہوتی ہیں۔ اقبال نے جس خودی کی تعلیم دی ہے اورنگ زیب عالمگیر اس خودی کا مکمل اور مجسم نمونہ تھا۔ ۱۹۱۰ میں علامہ نے اپنے خیالات کو ایک بیاض میں قلم بند کرنا شروع کیا تو اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق ایک طویل شذرہ لکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

اورنگ زیب کی سیاسی فطانت بغایت ہمہ گیر تھی۔ اس ملک کی مختلف قومیتوں کو ایک عالمگیر سلطنت کے تصور میں شامل کر لینا گویا اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ لیکن اس سامراجی وحدت کے حصول میں اس نے غلطی سے اپنے غیر متزلزل عزم و ہمت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا، جس کے پس پشت سیاسی تجربہ ناکافی تھا۔ اپنی متصورہ سلطنت کے سیاسی ارتقا میں وقت کے پہلو کو نظر انداز کرکے اس نے ہندوستان کی منتشر اور بے ربط سیاسی وحدتوں کو اپنی ہی زندگی میں مجتمع کر دکھانے کی توقع پر ایک لامتناہی مہم شروع کر دی۔ جس طرح سکندر پورے ایشیا پر یونان کو مسلط کرنے میں ناکام رہا، اسی طرح وہ بھی ہندوستان بھر کو پرچم اسلام کے نیچے نہ لا سکا۔ انگریز، قدیم اقوام کے سیاسی تجربات سے پوری طرح مسلح ہوکر آیا تھا۔ اس کا صبر و تحمل اور کھچوے کا سا استقلال وہاں کامیاب رہا جہاں اورنگ زیب کی جلد باز فطانت ٹھوکر کھا کر رہ گئی تھی۔ سیاسی فتح لازماً اتحاد کے ہم معنی نہیں، علاوہ ازیں سابقہ مسلم خاندانوں کی تاریخ نے اورنگ زیب پر واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار اس ملک کے باشندوں کی خیر خواہی پر اتنا منحصر نہیں، جتنا کہ خود حکمران قوم کی اپنی طاقت پر مبنی ہے، لیکن اپنے گہرے سیاسی شعور کے باوجود وہ اپنے اجداد کے کرتوتوں کے نتائج کو نہ مٹا سکا۔ سیواجی اورنگ زیب کے عہد کی پیداوار

نہیں تھا۔ اس کا وجود ان معاشرتی اور سیاسی عوامل کا رہین منت ہے جو اکبر کی حکمت عملی سے ظہور میں آئے۔ اورنگ زیب کا سیاسی فہم و ادراک صائب ہونے کے باوجود بعد از وقت ثابت ہوا، تاہم سیاسی بصیرت کی اہمیت کے پیش نظر اسے ہندوستان میں مسلم قومیت کا بانی قرار دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ نسلیں میرے اس قول کی صداقت کو تسلیم کریں گی۔ انگریز حکمرانوں میں سے سب سے پہلے لارڈ کرزن نے ہندوستان میں انگلستان کے اقتدار کے بارے میں حقیقت شناسی کا ثبوت دیا۔ ہندو قومیت بے جا طور پر اس کی پالیسی سے منسوب کی جاتی ہے، زمانہ یقیناً یہ بتادے گا کہ ہندو قومیت کا وجود لارڈ رپن کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ لہذا یہ بات واضح ہوگئی کہ سیاسی مقصد اور سیاسی ادراک میں مغل فرماں روا اور انگریز حکمران دونوں متفق ہیں۔ مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انگریز مورخ لیوں اورنگ زیب کو مطعون کرتا ہے جس کے سامراجی نصب العین کی پیروی خود اس کے اہل ملک کرتے رہے ہیں اور جس کے سیاسی ادراک کی وہ توثیق کر چکے ہیں۔ اورنگ زیب کا سیاسی طریق کار یقیناً بھدا تھا، لیکن جس عہد سے اس کی زندگی اور اس کے کارنامے وابستہ ہیں، اسی کے نقطۂ نظر سے اس طریق کار کی اخلاقی حیثیت کو پرکھنا چاہیے"[۵۴]

علامہ اقبال کو اورنگ زیب کے مرقد پر حاضری کا بہت شوق تھا، چنانچہ انھوں نے ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء کو اپنے ایک خط میں عطیہ فیضی کو لکھا۔ "حیدرآباد سے واپسی پر مجھے اورنگ زیب کے مزار کی زیارت بھی کرنی تھی جس پر میں ایک انتہائی وجد انگیز اور ولولہ خیز نظم لکھنے والا ہوں ــــ ایسی کہ اردو خوانوں کی نظر سے آج تک نہ گزری ہوگی"[۵۵] اسی طرح ۷ اپریل ۱۹۱۰ء کو ایک دوسرے خط میں عطیہ بیگم کو لکھا ــــ "اغلباً اورنگ زیب پر میری نظم جس کے مزار کی میں نے حال ہی میں زیارت کی ہے، میری آخری نگارش ہوگی ـ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم لکھنا میرا فرض ہے اور مجھے امید ہے ایک دفعہ مکمل ہونے کے بعد یہ آئندہ ایک عرصہ تک زندہ رہے گی"[۵۶] علامہ اقبال جو اپنے مرد مومن کو شاندار اور لاامثال انداز میں خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے تھے مگر قدرت نے ان کا یہ ارادہ تو پورا نہ کیا البتہ رموز بیخودی میں وہ اس فقیر منش شہنشاہ کو کچھ اس طرح خراج عقیدت

---

[۵۴] شذرات فکر اقبال ص ۷۹تا ۱۰۰ مرتبہ جاوید اقبال۔ ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب۔ لاہور

[۵۵] اقبال ــــ عطیہ بیگم از عبدالعزیز خالد، ص ۶۳ [۵۶] ایضاً، ص ۷۱

پیش کرسکے :

شاہ عالمگیر گردون آستان   اعتبار دودمان گورگان

پایۂ اسلامیان برتر ازو   احترام شرع پیغمبر ازو

درمیان کارزار کفر و دین   ترکش ما را خدنگ آخرین

تخم الحادی کہ اکبر پرورید   باز اندر فطرت دارا دمید

شمع دل در سینہ ہا روشن نبود   ملت ما از فساد ایمن نبود

حق گزید از ہند عالمگیر را   آن فقیر صاحب شمشیر را

از پیٔ احیای دین مامور کرد   بہر تجدید یقین مامور کرد

برق تیغش خرمن الحاد سوخت   شمع دین در محفل ما برفروخت

کور ذوقان داستانہا ساختند   وسعت ادراک او نشناختند

شعلۂ توحید را پروانہ بود   چون براہیم اندرین بتخانہ بود

در صف شاہنشہان یکتاستی   فقر او از تربتش پیداستی

روزی آن زیبندۂ تاج و سریر   آن سپہدار و شہنشاہ و فقیر

صبحگاہان شد بہ سیر بیشہ ای   با پرستاری وفا اندیشہ ای

سرخوش از کیفیت باد سحر   طایران تسبیح خوان بر ہر شجر

شاہ رمز آگاہ شد محو نماز   خیمہ بر زد در حقیقت از مجاز

شیر ببر آمد پدید از طرف دشت   از خروش او فلک لرزندہ گشت

بوی انسان دادش از انسان خبر   پنجۂ عالمگیر را زد بر کمر

دست شہ نادیدہ خنجر برکشید   شرزہ شیری را شکم از ہم درید

دل بخود راہی نداد اندیشہ را   شیر قالین کرد شیر بیشہ را

باز سوی حق رمید آن ناصبور   بود معراجش نماز با حضور

این چنین دل خودنما و خودشکن   دارد اندر سینۂ مومن وطن

بندۂ حق پیش مولا لاستی   پیش باطل از نعم برجاستی

تو ہم ای نادان دلی آور بدست　　شاہدی را محملی آور بدست
خویش را در بازوی خود را بازگیر　　دام گستر از نیاز و ناز گیر
عشق را آتش زن اندیشہ کن　　روبہ حق باش و شیری پیشہ کن

خوف حق عنوان ایمان است و بس
خوف غیر از شرک پنہان است و بس[۵۷]

اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق اقبال کے یہ چھبیس[۲۶] اشعار اگرچہ تعداد میں کم ہیں مگر درحقیقت ان میں پوری تاریخ قلم بند ہے۔ ان اشعار کا ایک ایک لفظ اورنگ زیب کے مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان اشعار کے پہلے بند میں علامہ نے اورنگ زیب کی جامع شخصیت اور اس کے بندۂ مومن ہونے پر جامع اور بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اورنگ زیب نے برصغیر میں اسلامی قدروں پر مشتمل اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈال کر خلافتِ راشدہ کے بعد شریعتِ محمدی کا احترام دوبارہ قائم کیا۔ علامہ نے اس بند میں یہ واضح کیا کہ اس برصغیر میں جہاں دین اور کفر کے درمیان صدیوں تک جنگ جاری رہی، عالمگیر کا وجود دراصل اسلام ہی کے ترکش کا ایک تیر تھا۔

آگے چل کر اقبال فرماتے ہیں کہ اکبر نے اس برصغیر میں کفر و ارتداد کا بیج بویا، دارا جیسے گمراہ نے دوبارہ اس بیج کی آب یاری کی کوشش کی۔ ان ناپاک اور مکروہ کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملتِ اسلامیہ کے لیے اس برصغیر میں عظیم خطرات پیدا ہوگئے تھے۔ قدرت نے بروقت ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے اورنگ زیب جیسے مردِ مومن کو پیدا کیا جس کی ذات میں خدا نے فقر اور بادشاہی کے دونوں جوہر مجتمع کر دیے تھے۔ اگر یہ مردِ مجاہد دارا شکوہ کے منصوبوں کو خاک میں نہ ملاتا تو اس برصغیر میں اسلام کے اثر و نفوذ کا خاتمہ ہو گیا ہوتا اور دین کا چراغ کفر و الحاد کے تودوں کے نیچے دب کر اس برصغیر سے ہمیشہ کے لیے بجھ گیا ہوتا۔

علامہ فرماتے ہیں کہ خدا نے اس مردِ مومن کو دینِ اسلام کے احیا اور تجدیدِ یقین کے لیے برصغیر میں پیدا کیا اور وہ زندگی کے آخری لمحے تک اس پاکیزہ نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کرتا

---

[۵۷] کلیات اقبال، ص ۹۸، ۹۹ - رموزِ بیخودی

رہا۔ اس درویش صفت بادشاہ کا مقصدِ حیات جہاں داری نہ تھا بلکہ خدمتِ خلق تھا۔ علامہ ہند کے خاتمے پر کہتے ہیں کہ ہندوستان کے بادشاہوں میں عالم گیر کا کوئی ثانی نہیں۔ اس مردِ مجاہد نے اسلام کی حقیقی خدمت کی ہے مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ جس طرح اس مردِ مومن کی زندگی ایک لاثانی اور مثالی ہے اسی طرح اس کی تربت سے بھی ایک شانِ فقر ظاہر ہوتی ہے۔

علامہ نے اورنگ زیب کے فقر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی اسلامی سیرت کے روشن پہلوؤں کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن نمازِ فجر سے پہلے عالم گیر جنگل کی طرف سیر کو گیا۔ سیر کے دوران جب نماز کا وقت آگیا تو اس مردِ مسلمان نے جنگل ہی میں نماز کی نیت باندھ لی۔ اتفاقاً ایک طرف سے ایک جنگلی شیر باہر نکل آیا جس نے عالم گیر پر حملہ کر دیا۔ شیر کے حملے سے عالم گیر حواس باختہ نہ ہوا بلکہ بڑے اطمینان کے ساتھ اس نے خنجر نکال کر شیر کا پیٹ چاک کر دیا اور پھر نماز میں مشغول ہو گیا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد علامہ اپنے لطیف پیرائے میں مومن کا تصورِ حیات بیان کرتے ہیں جس کی بنیاد فلسفۂ خودی پر ہے:

خویش را در بازو خود را باز گیر دام گستر از نیاز و ناز گیر

علامہ نے اس قصے کے خاتمے پر ایمان کی تعریف یوں کی ہے:

خوف حق عنوان ایمان است و بس خوف غیر از شرک پنہان است و بس

پیام مشرق میں ایک نظم عالم گیر کے عنوان سے ہے جس میں عالم گیر کے اس خط کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بیٹے ابو المعظم شمس الدین محمد کو لکھا تھا۔ عالم گیر کو جب معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا اس کی موت کی دعا کر رہا ہے تو اس نے شاہ زادے کو لکھا کہ اے نادان یہ تیرا خیال غلط ہے کہ خدا تیری آرزو پوری کرنے کے لیے مجھے قبل از وقت موت دے دے گا کیونکہ دنیا کا ہر ایک کام صرف خدا کی مرضی کے تحت ہوتا ہے۔ اس نظم کے اشعار یہ ہیں:

ندانی کہ یزدان دیرینہ بود بسے دید و سنجید و بست و کشود
ز ما سینۂ چاکان این تیرہ خاک شنید است صد نالۂ دردناک
بسے ہمچو شبیر در خون نشست نہ یک نالہ از سینۂ او گسست

نہ از گریہ پیرِ کنعاں تپید نہ از دردِ ایوب آہے کشید
مپندار آں کہنہ نخچیر گیر
بدامِ دعای تو گردد اسیر[۵۸]

علامہ نے اورنگ زیب کی زندگی اور کارناموں کو برصغیر میں اسلامی قومیت کی نشوونما کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔ انگریز اور ہندو مصنفین نے عالم گیر کے متعلق ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیا اور اسے سفاک، قاتل اور ظالم قرار دینے کی بھرپور کوشش کی مگر علامہ کے نزدیک اورنگ زیب نے ملک گیری کی ہوس کے لیے تلوار نہیں اٹھائی بلکہ وہ حق و انصاف کی سربلندی کے لیے زندگی کے آخری لمحات تک مصروفِ جدوجہد رہا۔ ملک گیری کی ہوس رکھنے والوں کے لیے تو علامہ اقبال کا یہ نظریہ ہے کہ:

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید تیغ او در سینۂ او آرمید

برعکس اس کے اقبال عالم گیر کے متعلق فرماتے ہیں:

عالم گیر جس کی زندگی اور کارنامے میری دانست میں ہندوستان کی اسلامی قومیت کی نشوونما کا نقطۂ آغاز ہیں، اسلوبِ ثالث کا چہرہ کشا ہے، ان لوگوں کے نزدیک جنھوں نے عالم گیر کے حالات تاریخِ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سنے ہیں، عالم گیر کا نام سفاکی و قساوت، جبر و استبداد اور مکاری اور غداری اور پولیٹکل سازشوں اور منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے، خلطِ مبحث کا خوف مانع ہے ورنہ میں متعاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر سے ثابت کرتا کہ عالم گیر کی پولیٹکل زندگی کی وجوہِ تحریک سراسر جائز اور حق بجانب تھیں۔ اس کے حالاتِ زندگی اور اس کے عہد کے واقعات کا بنظرِ انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین واثق ہوگیا ہے کہ جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں وہ واقعاتِ متاصرہ کی غلط تعبیر اور ان تمدنی و سیاسی قوتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو ان دنوں سلطنت اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالم گیر کی ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس نمونے کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں[۵۹]

---

[۵۸] کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۳۰۳ مطبوعہ شیخ غلام علی فروری ۱۹۷۳ء۔

[۵۹] مقالاتِ اقبال، ص ۱۲۸ مرتبہ سید عبد الواحد معینی۔

پروفیسر مولانا علم الدین سالک
مرتب، پروفیسر مولانا احسان الٰہی سالک

مُراد بیگم عُرف مغلانی بیگم

(تیسری اور آخری قسط)

خواجہ عبداللہ کا بیگم کو نکال دینا اور اختیار سے محروم کر دینا

مُغلانی بیگم چونکہ عورت تھی، لہٰذا کوئی امیر اس کے ماتحت نہیں رہنا چاہتا تھا۔ امان خاں اکثر مغل امیروں کو واپس لے گیا تھا، مگر اس کے پیٹھ پھیرتے ہی ۵۵۔۱۱ میں خواجہ عبداللہ نے یہ سوچا کہ بیگم کو نکال کر خود مستقل گورنر بن جائے۔ اس نے سپاہی بھرتی کیے، مگر بیگم ان کوششوں سے مرعوب نہ ہوئی۔ وہ سیاست کے داؤ پیچ خوب سمجھتی تھی۔ اس نے خواجہ کے سپاہیوں کو انعام و اکرام اور اعزاز و احترام سے نوازنے کا وعدہ کیا۔ اس طرح خواجہ عبداللہ اپنے منصوبے میں ناکام ہو گیا، مگر اس نے دم خم قائم رکھا اور اپنی سازش کو کامیاب بنانے کے طریقے سوچتا رہا۔ اس نے میر مومن اور درانیوں کے نمائندے ہادی خاں کو اپنے ساتھ ملا کر مغلانی بیگم کو حراست میں لے لیا۔ اب وہ لاہور کا بلا شرکت غیرے ناظم تھا۔ مگر اس وقت کی ضرورت یہ تھی کہ سپاہ کو ہر طرح سے خوش رکھا جائے۔ یہ روپے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا اور خزانہ خالی تھا۔ آمدنی محدود اور ذرائع مسدود تھے۔ اس نے روپیہ حاصل کرنے کے لیے چند ذرائع اختیار کیے مگر وہ ذرائع تشدد آمیز تھے۔ اس نے شہر کے دروازے بند کر دیے اور ہندو مسلم رعایا کو بلا امتیاز لوٹا اور ان پر بدکاری نمان کے حلیف اور مددگار ہونے کا الزام عائد کیا، جس نے روپیہ دینے سے انکار کیا، اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد قحط کے آثار نمودار ہوئے اور بے چینی شروع ہوئی۔ سامانِ خورد و نوش سخت گراں ہو گیا۔ زندگی اجیرن ہو گئی[۱] شہری تباہیوں میں ابھی تک کوئی قسم کی تخفیف نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور مصیبت نازل ہوئی، وہ آدینہ بیگ ناظم جالندھر دوآبہ کا حملہ تھا۔ لوگوں نے اس کے حملے پر اطمینان کا سانس لیا، کیونکہ وہ خواجہ عبداللہ کی حکومت سے تنگ آ چکے تھے۔ جب

---

[۱] خزانہ عامرہ۔ ص ۹۹ ——— موہن لال ۱۱۔ ص ۴۰۔ ۱۳۹

اس کی آمد کی خبر پہنچی تو خواجہ چپ چپاکر سندھ کی جانب بھاگ گیا۔ اس طرح شہر بغیر کسی مزاحمت کے آدینہ بیگ کے قبضے میں آگیا۔ اس نے صادق بیگ کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود جالندھر واپس چلا گیا۔

مغلانی بیگم ابھی تک اس کوشش میں تھی کہ اسے پھر سیاسی غلبہ حاصل ہو جائے اور وہ لاہور کی نظامت پر قابض ہو جائے۔ وہ تجاویز سوچتی تھی مگر انھیں کامیاب بنانے کے لیے بیرونی امداد کی اشد ضرورت تھی۔ اس کی نگاہیں بار بار دہلی کے وکیل عماد الملک کی جانب اٹھتی تھیں جو اس کا ہونے والا داماد تھا۔ اس نے اسے عریضہ لکھا کہ "مشکل کے وقت احمد شاہ نے قندھار سے میری مدد کی۔ اب مشکلات و مصائب نے مجھے پھر گھیر لیا ہے۔ آپ برائے خدا میری دست گیری اور اعانت کریں۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو کچھ سپاہی کسی طریقے سے بھیج کر اپنی منگیتر کو دہلی بلوالیں"۔

عماد الملک پنجاب کے معاملات میں مداخلت کے لیے موقع تلاش کر رہا تھا۔ وہ اس سے بے حد خوش ہوا۔ اب وہ ان معاملات کا تصفیہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کرنا چاہتا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ مغلانی بیگم کا نظم و نسق درست نہیں ہے اور نہ یہ کام کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اُسے روپے کی بھی ضرورت تھی، وہ خیال کرتا تھا کہ لاہور سے یہ ضرورت پوری ہوگی، اسے بیگم کی لڑکی سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، کیونکہ وہ پیشتر ازیں گنا بیگم سے شادی کر چکا تھا۔ گنا بیگم علی قلی خان ہفت ہزاری کی لڑکی تھی جو عالمگیر ثانی کا درباری تھا۔ وہ بے حد حسین و جمیل تھی۔ اس کے حسن و کمال اور شاعرانہ ادیبانہ طرح داریوں کا شہرہ ہندوستان بھر میں تھا۔

بہر حال عماد الملک شکار کے بہانے ۱۵ جنوری ۱۷۵۶ء کو ہانسی اور حصار کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ شہزادہ علی گوہر اور دس ہزار فوج تھی۔ ۷ فروری ۱۷۵۶ء کو وہ سرہند آیا، مگر وہیں رک گیا۔ کیونکہ آدینہ بیگ نے اسے لکھا کہ آپ سرہند میں مقیم رہیں۔ اپنا خواجہ سرا اور دو تین سپاہی میرے پاس بھیج دیں۔ میں اپنی سپاہ کی مدد سے آپ کے نام پر لاہور پر قبضہ کر لوں گا۔ یہ بھی کسی منصوبے کے تحت ہوگا۔ کیونکہ وہاں بھی ایک لشکر موجود ہے۔ اگر آپ گئے تو جنگ و جدل کا خطرہ ہے[۵۲]۔ عماد الملک کی دلی خواہش یہ تھی کہ لاہور پر ہر حالت میں قبضہ ہونا چاہیے۔ اس نے آدینہ بیگ کی تجویز کا خیر مقدم

---

۵۲ خزانہ عامرہ۔ ص ۵۲ — مآثر الامرا، حصہ سوم۔ ص ۸۹۰

کیا اور نسیم خاں کو چند ہزار فوجی دے کر آدینہ بیگ کے پاس روانہ کیا اور خود ماچھی واڑہ میں ٹھہرا۔ آدینہ بیگ نے اپنے سردار صادق خاں کو دس ہزار فوج دی اور لاہور کی جانب روانہ کیا۔ وہ لوگ بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوئے، بیگم کو سلام کے لیے حویلی میں گئے اور وہاں سے لوٹ کر خواجہ عبداللہ خاں کے پاس بھی حاضر ہوئے، اس نے دستور کے مطابق صادق خاں کو خلعت عطا کیا۔ اس کی تیاری دیکھ کر عبداللہ خاں کو گمان ہوا کہ اُسے جلد ہی حراست میں لے لیا جائے گا، لہٰذا جموں کی طرف بھاگ گیا۔ اس سے اگلے ہی روز مغلانی بیگم بڑی شان و شوکت سے اپنے شان دار محل میں داخل ہوئی۔ اس نے پھر سے حکومت کا بندوبست سنبھال لیا۔ اس موقع پر وزیر اعظم کا خط اس کے حوالے کیا گیا۔ جس میں اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ بیگم کی لڑکی کو دہلی روانہ کیا جائے۔ بیگم نے جہیز تیار کرنا اور رخصتی کا بندوبست شروع کیا۔ ان تیاریوں میں ایک مہینہ صرف ہو گیا۔ بیگم نے اپنی لڑکی عمدہ بیگم کو بے شمار جواہرات، لعل، زیورات، دولت اور سامان کے ساتھ رخصت کیا۔ وہ ۴ مارچ ۱۷۵۷ء کو وزیر کے کیمپ میں داخل ہوئی [۳]

وزیر کی یہ چال کامیاب ہوئی، اب وہ بیگم کو قبضے میں کر کے لاہور پر اپنے نمائندے متعین کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے سید جمیل الدین، نثار احمد خاں، شہر جنگ، خواجہ سعادت یاب خاں اور حکیم عباد اللہ خاں کو آدینہ بیگ کی خدمت میں روانہ کیا تاکہ وہ بیگم کو حراست میں لے کر اس کے پاس روانہ کر دے [۴]

یہ لوگ آدینہ بیگ سے ملے اور اس سے فوج لے کر تیزی کے ساتھ لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے ۱۲۰ میل کا فاصلہ ایک رات میں طے کر لیا، کہیں راستے میں پڑاؤ نہیں کیا، علی الصبح لاہور آ پہنچے۔ مغلانی اس وقت خواب استراحت میں محو حالات سے بے خبر پڑی تھی۔ انھوں نے خواجہ سراؤں کے ذریعے اسے بیدار کیا اور پھر اُسے پالکی میں بٹھا کر اپنے کیمپ میں لے گئے جو شہر سے باہر واقع تھا۔ اس کی تمام املاک اور خزانے قبضہ کر لیا۔ ۲۸ مارچ کو وہ وزیر کے کیمپ میں پہنچی۔ وزیر اس کے خیر مقدم اور استقبال کے لیے آیا۔ تلخ کلامی اور سخت اہانت آمیز الفاظ میں وزیر کی سرزنش ہوئی۔

---

[۳] سیر المتاخرین۔ ۳، ص ۵۴ [۴] غلام علی۔ تاریخ شاہ عالم ثانی۔ ص ۲۵

اس نے تہدید آمیز لہجے میں کہا: "تمھارا یہ چال چلن ملک پر تباہی اور بربادی لائے گا۔ دہلی غارت ہوگی، امرا پر نکبت اور سلطنت پر تباہی نازل ہوگی۔ احمد شاہ اس بزدلانہ روش کا بدلہ لے گا اور تم سب کو سزا دے گا۔ وزیر نے لاہور اور ملتان کی حکومت تیس لاکھ روپے سالانہ پر آدینہ کے حوالے کی اور سید جمیل الدین کو اس کا نائب نامزد کیا اور وہاں سے دہلی چلا گیا[۵۵]

اب لاہور میں پھر اختلال پیدا ہوا۔ خواجہ عبداللہ خاں جموں سے قندھار گیا۔ وہاں سے مدد لے کر لاہور پر حملہ آور ہوا اور شہر پر قابض ہو گیا۔ احمد شاہ کو ہندوستان کے حالات کی ایک ایک لمحے کی خبریں مل رہی تھیں۔ عالمگیر ثانی اور نجیب الدولہ بھی اسے حملے کی دعوت دے رہے تھے۔ مغلانی بیگم نے بھی لکھا: "مجھے میر مومن خان اور آدینہ بیگ کی غداری اور مکاری نے تباہ کر دیا ہے۔ ایک کروڑ کے قریب روپیہ میرے خسر میر قمر الدین کے محل میں مدفون ہے۔ اس کے علاوہ محل کی چھتوں میں چاندی اور سونے کے انبار چھپائے ہوئے ہیں۔ بادشاہ میں اور امیروں وزیروں میں شدید اختلافات ہیں۔ اگر اس وقت آپ نے حملہ کیا تو ہندوستان کی ساری دولت آپ کے قدموں میں ڈھیر ہوگی[۵۶]"

احمد شاہ ابدالی کے لیے یہ زریں موقع تھا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اتمام حجت کے لیے قلندر بیگ خان کو سفارت پر روانہ کیا کہ وہ وزیر کے اس رویے کے متعلق جو اس نے لاہور کے متعلق اختیار کیا ہے، استصواب رائے کرے۔ قلندر بیگ خاں کو باریابی تو ہوئی، مگر خاطر خواہ جواب نہ ملا، چنانچہ وہ مایوس ہو کر دہلی سے رخصت ہو گیا۔

ابدالی قندھار سے نکلا، پشاور آیا۔ یہاں اس نے اپنے ہراول دستے تیمور شاہ اور جہان خان سپہ سالار کے ماتحت روانہ کیے۔ انھوں نے دریائے اٹک عبور کر کے حسن ابدال جا کر دم لیا۔ گجرات پہنچ کر سامان رسد جمع کیا اور آدینہ بیگ کا تعاقب کیا۔ ایمن آباد اور بٹالہ کو لوٹا۔ آدینہ بیگ اپنے اہل و عیال اور چند خیر خواہوں کو لے کر بھاگا۔ بیاس کو نور محل کے قریب سے عبور کیا۔ مال و اسباب وہیں چھوڑ گیا، جسے ابدالی کی سپاہ نے لوٹ لیا۔

---

[۵۵] خزانۂ عامرہ، ص ۵۱ — مآثر الامرا۔ جلد سوم، ص ۵۳ — غلام علی، ص ۲۶، ۲۷ — سوہن لال، ص ۱۳۹، ۱۴۰ [۵۶] پنجاب یونیورسٹی روٹوگراف، عبرت نامہ از علی الدین، ص ۱۱۴ ب

اس سے پیشتر ابدالی کو قدم قدم پر شاہی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا، اسے پنجاب سے گزرنا محال تھا، مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ وہ کھلے دروازے دہلی تک جا پہنچا۔ وزیر اعظم نے فقیروں اور درویشوں سے دعائیں کرائیں کہ تباہی و بربادی رک جائے۔ اس نے مغلانی بیگم کے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے اسے بادشاہ کی پیشوائی کے لیے روانہ کیا۔ بیگم ۱۰ جنوری ۱۷۵۷ء کو بوقت نیم شب ابدالی سے بات چیت کے لیے روانہ ہوئی[۷] اس کے جلوس میں چار سو سواروں کا رسالہ تھا۔ وہ کرنال جا کر ابدالی سے ملی۔ بادشاہ نے بھی اس کا خیر مقدم کیا اور بیگم کو لے کر دہلی کا رُخ کیا۔

دہلی سرکار نے آغا علی رضا کو سفیر بنا کر ابدالی کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اُسے دو لاکھ کے تحائف پیش کرے اور وہیں سے واپس لوٹا دے۔ مگر ابدالی نے دو کروڑ روپیہ نقد، بادشاہ کی لڑکی کا ڈولہ اور سرہند سے لے کر افغانستان کی سرحد تک کا تمام مغربی علاقہ طلب کیا[۸]

نجیب الدولہ نریلہ کے مقام پر ابدالی کے کیمپ میں پہنچا۔ اس کے تین روز بعد عماد الملک بھی حاضر ہوا۔ اگلے روز بادشاہ ابدالی نے اسے باریابی بخشی اور سخت سرزنش کی[۹] اس کے بعد اسے حراست میں لے لیا گیا۔ ایک مہینہ بعد ۲۸ جنوری ۱۷۵۷ء کو ابدالی دہلی میں داخل ہوا، اور اس کے سپاہیوں نے نہایت بیدردی سے لوٹ کھسوٹ شروع کی۔ مغلانی بیگم نے اس وقت مخبر کا کردار ادا کیا اور ہر اس شخص کے بارے میں جو اس کا مخالف تھا یا جس نے اسے پریشان کیا تھا، تفصیل سے معلومات بہم پہنچائیں[۱۰]

اس کے بعد ابدالی نے حکم دیا کہ دہلی کے ہر گھرانے سے تاوان وصول کیا جائے۔ شہر مختلف حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ سپاہیوں کے چوکی پہرے مقرر کیے گئے۔ وصولی شروع ہوئی۔ اس قدر تشدد و عقوبت، مار پیٹ اور اذیت و سزا سے کام لیا گیا کہ کئی آدمی موت کی آغوش میں چلے گئے۔ بعض نے زہر پھانک لی، بعض ڈوب کر مر گئے۔ سزا و عقوبت کا یہ سلسلہ کوئی ایک ماہ تک جاری رہا۔ اسی اثنا

---

[۷] وقائع شاہ عالم ثانی، ص ۱۳۶ [۸] تاریخ عالمگیر ثانی۔ ص ۱۹۱

[۹] تفصیلات کے لیے دیکھو انڈین اینٹی کویری (Indian Antiquary ۱۹۰۷، ص ۴۵)

[۱۰] تاریخ حسین شاہی۔ ص ۳۷ (سوانح احمد شاہ ابدالی)

میں اس نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی زہرہ بیگم دختر عالمگیر ثانی سے کی اور اُسے تمام مالِ غنیمت دے کر پنجاب بھیج دیا تاکہ وہ اُسے افغانستان پہنچا دے۔ خود اس نے محمد شاہ کی نوجوان بیٹی حضرت بیگم سے زبردستی نکاح کیا۔[11]

۲۰ فروری ۱۷۵۷ء کو مغلانی بیگم نے بطور نذر قیمتی موتی تھالوں میں رکھ کر پیش کیے۔ ابدالی بہت خوش ہوا اور بولا کہ اب تک میں تجھے اپنی بیٹی کہہ کر پکارتا تھا، آج کے بعد تم میرے بیٹے ہو اور تمھیں سلطان مرزا کا خطاب عطا کرتا ہوں۔ اس نے فوراً اپنی پگڑی اور جیغہ جس میں قیمتی موتی ٹنکے ہوئے تھے اپنے سر سے اُتار کر اس کے سر پر رکھ دی اور اپنا پیراہن اور دوسرا لباس جو وہ اس وقت پہنے ہوئے تھا، مغلانی بیگم کو عطا کیا۔[12]

اس طرح ابدالی کو خوشی اور مسرت میں دیکھ کر مغلانی نے موقع کو غنیمت جانا اور فوراً عماد الملک کی سفارش کی اور کہا کہ اسے وکالت کا عہدہ عطا کیا جائے۔ ابدالی نے کہا میں یہ سب کچھ کرتا مگر اس نے ابھی تک تمھاری لڑکی سے شادی نہیں کی۔ بیگم نے اطلاع دی کہ نکاح خوانی اور رخصتی کی رسم آج شب ہی ادا ہونے والی ہے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے وزیر شاہ ولی خان اور سپہ سالار جہان خان کو حکم دیا کہ وہ تقریب نکاح کو کامیاب بنائیں۔ اسی شب کو ابدالی کے سامنے عمدہ بیگم کی شادی عماد الملک سے ہو گئی۔ اس موقع پر ابدالی نے عماد الملک کو دو لاکھ کے تحائف، دو ہاتھی اور چار گھوڑے دیے اور فرزند خان کا خطاب عطا کیا۔ اس نے عماد الملک کی پہلی بیوی گنا بیگم کو مغلانی کے حوالے کیا کہ وہ اُسے اپنی کنیز تصور کرے اور عماد کو حکم دیا کہ اپنی پہلی بیویوں کو طلاق دے دے۔ اس کے بعد ابدالی نے اس کو وکالت کا عہدہ عطا کیا۔[13]

۲۲ فروری کو ابدالی نے سورج مل جاٹ کی سرزنش کے لیے متھرا اور آگرہ کا رُخ کیا۔ مغلانی بیگم بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے ابدالی پر اتنا اثر ڈالا کہ اس نے جالندھر دوآبہ، جموں اور کشمیر اُسے جاگیر میں دے دیے۔ اس نے اپنے نائب وہاں بھیج دیے اور خواجہ ابراہیم خان کو وہاں کا ناظم مقرر

---

[11] سرکار - ۲ - ص ۲ - ۱۰۱ [12] تاریخ حسین شاہی

[13] انڈین اینٹی کیوری، ص ۹ - ۴۶ - ۱۹۰۷

کیا اور راجہ رنجیت دیو والیِ جموں کو وہیں رہنے دیا اور آدینہ بیگ کو لکھا کہ اس کے نائب کی حیثیت سے جالندھر کا انتظام کرے۔ اب بیگم خوش تھی کہ اسے دلی مقصد حاصل ہوگیا۔ مگر یہ سب دھوکا تھا کیونکہ جموں سے لے کر دوربنک کا تمام علاقہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو جاگیر میں مل چکا تھا۔ بیگم نے اپنی جاگیر کا انتظام شروع کیا ہی تھا کہ ابدالی نے واپسی کا ارادہ کیا۔ بیگم اس کے ہمراہ قندھار کی طرف روانہ ہوئی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ راستے ہی سے لوٹ آئی تھی۔ ابدالی نے اس سے جاگیر واپس لے کر اسے تیس ہزار سالانہ کا وظیفہ اور لاہور میں ڈیوڑھی عطا کی اور کہا کہ اب تمہارا بھائی تیمور شاہ وہاں کا ناظم ہے، تمھیں خوش ہو جانا چاہیے اور کسی دوسری رعایت کی خواہش دل سے نکال دینی چاہیے۔ اسے بیگم کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ آسانی سے نہ مانے گی، اس لیے شاہ دل خان اور جہان خان کو کہا کہ وہ اُسے ترغیب دیں کہ حکومت کے ارادے کو ترک کر دے۔ مگر بیگم نے نہ مانا۔ وہ ایک غلط امید رکھ کر اس کے ساتھ دریائے جہلم تک گئی۔ آخر مایوس ہو کر لاہور آئی اور سرائے حکیم میں آکر ٹھہری، جو بالکل خراب حالت میں تھی، اس کے دو کمرے قدرے اچھے تھے اس نے ان میں ڈیرہ جمایا۔

جہان خان کی بدسلوکی

آدینہ بیگ کو تیمور شاہ نے فرمان بھیجا اور جہان خان نے خط لکھا کہ وہ لاہور آکر باقاعدہ جالندھر دوآبہ کا چارج لے۔ مگر وہ ان کی حکومت سے بیگم کے ماتحت رہنا زیادہ مناسب خیال کرتا تھا۔ وہ ٹال مٹول کر رہا تھا کہ جہان خان نے اس کا تعاقب کیا۔ شہروں کے شہر اور قصبوں کے قصبے لُوٹ لیے۔ آدینہ بیگ نے اس شرط پر تیمور کی ماتحتی کا وعدہ کیا کہ اسے لاہور کی حاضری معاف کی جائے۔ تیمور نے یہ شرط مان لی۔ چھتیس لاکھ روپے بطور خراج دینے کا فیصلہ ہوا۔ ابھی اس پر دو ماہ نہ گزرے تھے کہ خراج کا مطالبہ ہوا۔ آدینہ بیگ نے کہا کہ سال ختم ہونے پر ادا ہوگا یا فصل کے آخر میں دیا جائے گا۔ اس پر لاہور میں طلبی کا حکم ملا۔ اس نے خطرہ محسوس کر کے خود آنے سے انکار کیا، مگر اپنے آدمی بھیجے اور تیمور شاہ کے سامنے معاملہ رکھا، اس نے کہا بات اگرچہ صحیح ہے مگر وہ لاہور آئے۔ جہان خان نے اس کے نائب اور نمائندہ دل آرام کو قید کر لیا۔ مغلانی بیگم نے سفارش کی اور اسے اپنی ضمانت پر آزاد کرا دیا اور آدینہ کو لکھا کہ وہ روپیہ کا بندوبست کر کے رقم ادا کرے۔ یہ رقم چھ لاکھ روپے

تھی۔ جب جواب نہ آیا تو اس نے اپنے جواہرات روانہ کیے تاکہ انھیں گروی رکھ کر رقم حاصل کی جائے۔

ادھر تو یہ ہو رہا تھا اور ادھر آدینہ کے ایجنٹ دل آرام کو تنگ کیا جا رہا تھا۔ وہ ایک دن بیگم کے پاس آیا اور کہنے لگا، مجھے تو یہ لوگ مار ڈالیں گے، میں کیا کروں۔ بیگم کو اس کی حالت پر رحم آیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ وہ بھاگ کر آدینہ سے روپیہ لائے اور اس میں تاخیر نہ کرے۔ جہان خان دل آرام کے بھاگ جانے سے سخت طیش میں آیا۔ اس نے بیگم کو اپنے محل میں طلب کیا اور ڈنڈوں سے پیٹنا شروع کر دیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اسے چالاک کے جواہرات نہ دے دیئے۔ دو سو سپاہیوں نے اس کا گھر محصور کر لیا جو کچھ ہاتھ لگا لوٹ لیا۔ اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر دیا گیا اور سخت عقوبت پہنچائی گئی۔

جہان خان نے آدینہ کا تعاقب شروع کیا۔ وہ پہاڑوں میں چھپ گیا۔ اس نے مرہٹوں اور سکھوں کو ساتھ ملا کر افغانوں کو ۹ اپریل ۱۷۵۸ کو لاہور سے نکال دیا۔ ان کی آمد پر جہان خان شاہدرہ کی جانب بھاگ گیا اور مغلانی بیگم کو بھی ساتھ لے گیا۔ مگر وہ وہاں سے بھاگ کر اپنی حویلی میں چلی آئی۔ اس کے بعد آدینہ بیگ کو مرہٹوں نے پچھتر لاکھ سالانہ خراج پر پنجاب دے دیا۔ اس نے لاہور کو اپنے داماد کے حوالے کیا اور خود بٹالہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

بٹالہ میں آدینہ کا شریفانہ سلوک

بیگم کا دو ہزار ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ پچاس روپے روزینہ، باورچی خانہ اور ایک اعلیٰ اور عظیم الشان حویلی جو اس کے شایانِ شان تھی، دی گئی۔ وہ تمام جواہرات جو گروی رکھنے کے لیے دیے گئے تھے واپس ہوئے۔ آدینہ مغلانی بیگم کے ملازموں کا احترام بھی کرتا تھا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ پانچ ماہ بعد آدینہ قولنج کا شکار ہو گیا، درد شدید تھا اور وہ ۱۵ ستمبر ۱۷۵۸ کو فوت ہو گیا۔[۱۴]

آدینہ بیگ کی وفات بیگم کے لیے ایک زبردست صدمہ تھی۔ وہ اب حیران تھی کہ کیا کرے، کہاں پناہ لے اور کس جگہ جائے۔ آخر اس نے جموں کے راجہ رنجیت دیو کے پاس جانے کا فیصلہ

---

[۱۴] خزانۂ عامرہ، ص ۱۰۱۔

کیا۔ راجہ کو جب اس کی آمد کا علم ہوا تو وہ پانچ میل تک اس کی پیشوائی کو آیا، گھوڑے سے اُترا، تعظیم بجالایا۔ اُسے رہنے کے لیے ایک مناسب محل عطا کیا۔ وظیفہ مقرر کیا اور گزارہ کے لیے دی۔ اس وقت مسکین بھی بیگم کے ہمراہ تھا۔ اس نے اس کی کلغی سے تین جواہر لے کر راجہ کو عطا فرمائے۔ بیگم اکتوبر ۱۷۵۸ء میں وہاں پہنچی تھی۔

جموں میں اس وقت امن وامان تھا۔ دہلی اور لاہور کے خانماں برباد خاندان وہاں مقیم تھے۔ راجہ ان کی قدر کرتا اور ان کے وظائف اور گزارے مقرر کرتا تھا انھیں ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی[۱۵] یہ خیال کر کے کہ مسلم تابعین کے وہاں آباد ہونے سے بہت فوائد مرتب ہوں گے، راجہ نے انہیں بہت مراعات دیں۔ ہر طرح سے ان کی دل جوئی کی، ان کے ساتھ نہایت شریفانہ اور مربیانہ سلوک روا رکھا۔

جموں کا زمانۂ قیام — ۱۷۵۸-۹

جموں میں بیگم کی ڈیوڑھی اودھو دیہ کے محل کے پاس تھی۔ یہ مقام اس کے شایان شان نہ تھا مگر اس سے بہتر مقام ملنا ناممکن تھا۔ یہ دیکھ کر رنجیت دیو نے مکرم کوتوال کو نیا محل بنانے کا حکم دیا۔ اس سے بیگم کی پریشانی جو مکان کی وجہ سے تھی دور ہو گئی مگر نیا محل بھی بیگم کے مذاق کے مطابق نہ تھا۔ لیکن بیگم نے پاسداری اور تالیفِ قلب کے لیے اسے خلعت عطا کیا۔ راجہ نے یہ معمول بنالیا تھا کہ وہ مہینے میں دو مرتبہ ضرور بیگم کو سلام کے لیے آتا، بیگم کا وظیفہ بڑھا کر ایک ہزار روپیہ ماہانہ کر دیا گیا۔ مگر بیگم کسی کی خیرات پر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے اس نے راجہ سے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔

اس زمانے میں جموں ایک زبردست تمدنی مرکز تھا۔ لاہور کے بہت سے اونچے خاندانوں کے لوگ، عالم، فاضل اور زمانے کے ستائے ہوئے جموں پہنچے اور بیگم نے ازراہ قدردانی ان کو خلعت اور دوشالے عطا کیے۔ اس طرح ۱۵۰ دوشالے تقسیم ہوئے۔ بیگم نے اپنی قدیم شان کو برقرار رکھا۔ یہاں بھی اس کے پاس دو سو ملازم تھے۔ وہ نہایت فیاض تھی۔ یہ عادت باوجود مالی مشکلات

---

[۱۵] بوستان شاہ ۳۴۔ب، ۳۵۔ب، مفتی علی الدین۔ ۱۵۔ الف۔

کے اس میں پائی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیڑھ برس کی قلیل مدت میں اس نے اپنی تمام نقدی ختم کر دی۔ پھر اپنے جواہرات گروی رکھے اور تیس ہزار روپیہ حاصل کیا جو تھوڑے ہی عرصے میں ختم ہو گیا۔ اب اس کی یہ حالت ہو گئی کہ روزانہ کی ضروریات کے لیے روپیہ باقی نہ رہا تھا اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی تھی۔

بیگم نے مسکین کو تین جواہرات کی قیمت چار سو روپے دی تھی، اس کے علاوہ دوسرے ملازمین کو بھی وقتاً فوقتاً تحفے تحائف عطا کیے تھے، اس مشکل وقت میں مسکین نے سب سے قیمتی اشیا اکٹھی کیں جن میں ایک قیمتی نتھنی (NOSE - RING) جو بیگم نے اس کی بیوی کو دی تھی، بیگم کی خدمت میں پیش کیں۔ مگر اس عالی ہمت خاتون نے لینے سے انکار کر دیا۔ مسکین نے یہ اشیا بیگم کے باورچی خانے کے داروغے کے حوالے کر دیں تاکہ وہ اشیا خورد و نوش پر صرف کی جائیں۔

کشمیر کی نظامت

ان دنوں راجہ سکھ جیون کشمیر کا ناظم تھا۔ وہ تقریباً نیم آزاد تھا۔ بیگم کے جموں میں آباد ہونے سے اُسے شبہ پیدا ہوا کہ وہ شاید احمد شاہ ابدالی کی مدد سے کشمیر کی نظامت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس سے وہ پریشان ہوا اور اپنے چند معتمد آدمی اس مقصد کے لیے تحفے تحائف دے کر بھیجے کہ وہ بیگم کو اس سے روکیں اور یقین دلائیں کہ اگر بیگم جموں میں اقامت اختیار کرنا چاہیں تو وہ بیگم کو خراج ادا کرتا رہے گا۔ مگر اس کے کارندوں نے حالات سے اندازہ لگایا کہ بیگم اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے، اس لیے راجہ مزید تحفے اور روپیہ روانہ نہ کرے۔

چند یوم بعد حسن منڈا کشمیریوں کی جانب سے بیگم کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ راجہ کا رقیب تھا۔ اس نے بیگم کو حکومت کا لالچ دیا اور کہا کہ ہم سب راجہ کو نکالنا چاہتے ہیں مگر کوئی قائد نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ بیگم کے خیر خواہوں نے کہا کہ یہ موقع کھونا نہیں چاہیے۔ مگر بیگم نے کہا کہ راجہ سے وعدہ ہو چکا ہے، میں کشمیر کے معاملے میں دخل نہیں دوں گی۔ چنانچہ حسن مایوس ہو کر چلا گیا، مگر اس نے سلسلۂ خط و کتابت جاری رکھا۔ اس نے لکھا کہ اگر بیگم آنا نہیں چاہتی تو وہ اپنے نائندے کو درانی سند کے ساتھ بھیج دے اور پانچ سو گھوڑے بھی روانہ کر دے تو وہ صوبے کی نظامت اُس کے لیے حاصل کرنے گا۔ اب بیگم نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا، مگر روپیہ پاس نہ تھا۔ قالین

فروخت ہوئے ۔ دو ہزار روپے حاصل کیے، مگر پردۂ تقدیر میں ابھی بہت سی تکلیفات چھپی ہوئی تھیں۔ عین اس وقت جب کشمیر کے لیے تیاریاں شروع تھیں، ایک شخص نے اپنی مکاری اور جعل سازی سے سارا کام خراب کر دیا۔ بیگم اس سے بہت پریشان ہوئی اور بالآخر مایوس ہو کر بیٹھ گئی، اس کے پاس ملازموں کی تنخواہوں کے لیے بھی کوئی پیسہ نہ تھا ۔ اس پر بعض ملازمین نے اُسے پریشان کیا، یہاں تک کہ بہروز بیگ اور افراسیاب بیگ نے بیگم پر حملہ کر کے اسے قتل کرنے کو تلوار نکالی مگر بیگم کے اوسان خطا نہ ہوئے ۔ اس نے انھیں آمادۂ قتل دیکھ کر کہا کہ "تم حق بجانب ہو تمھارا قصور نہیں، مگر اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا ۔ یہ نہ خیال کرو کہ میں نے اپنا سب کچھ تلف کر دیا۔ اگر تم مجھ پر اعتماد کرو تو میں اپنے زیورات کو گروی رکھ کر تمھاری تنخواہ ادا کر دوں گی" بیگم کی یہ بات مان لی گئی ۔ بیگم مکان کی چھت پر چڑھ گئی اور قتل قتل پکارنے لگی۔ لوگ آئے اور بیگم کے مخالفین کو گرفتار کر لیا گیا۔

انھی دنوں سعید خاں جو کسی زمانے میں لاہور میں ایک اہم منصب پر فائز تھا، جموں آیا، مسکین نے اس کے سامنے بیگم کی تباہ حالی کا ذکر کیا ۔ اس نے مدد کا وعدہ کیا ۔ مسکین اور دیگر خیر خواہ یہ چاہتے تھے کہ بیگم کی نوجوان بیٹی اپنی بہن کے پاس دہلی چلی جائے ۔ سعید خاں نے اس کا بندوبست کیا اور مسکین اسے لے کر دہلی چلا گیا اور ایک مہینے کے بعد وہاں پہنچا ۔

اتنے میں احمد شاہ کے حملے کی خبر مشہور ہوئی ۔ بیگم دہلی پہنچی جہاں اس نے ایک ہاتھی حاصل کیا اور قالین بیچ کر سامان حاصل کر کے ابدالی کے کیمپ میں گئی ۔ احمد شاہ نے بیگم کے حالات سن کر بہت افسوس کا اظہار کیا ۔ اس نے سیالکوٹ کا پرگنہ اسے جاگیر میں دیا ۔ جس کا تیس ہزار کا سالانہ خراج تھا ۔ بیگم دہلی واپس آئی ۔ اس نے ابوتراب کو اپنا نائب بنا کر روانہ کیا ۔ مگر وہ ناکام واپس لوٹا ۔ اس پر بیگم نے مسکین کو سندات وغیرہ دے کر روانہ کیا ۔ اس نے جاتے ہی ششماہی خراج کا مطالبہ وصول کیا، جو پندرہ ہزار روپیہ تھا ۔ یہ رقم بیگم کے پاس روانہ کی گئی ۔ مگر دوسری ششماہی کا خراج سکھ گردی کی وجہ سے وصول نہ ہو سکا ۔ بلکہ مسکین اور رستم خاں ناظم کو سکھوں نے گرفتار کر لیا جو بعد مشکل کچھ رقم ادا کر کے آزاد ہوئے ۔ ان ہی ایام (اکتوبر ۱۷۶۰ء) میں بیگم جموں آئی ۔ اس نے خراج میں سے پانچ سو روپیہ پیش کیا جو سکھوں کی دست برد سے بچ رہا تھا ۔ بیگم کو مزید سلسلے کی ضرورت

تھی۔ مسلین نے تمام حالات سنائے، بیگم بہت متاثر ہوئی۔

وفات

اس کے بعد وہ ۹۔۔۱ء میں دہلی آئی، مگر نہایت خستہ اور تباہ حالت میں۔ دو مہینے وہاں رہ کر واپس جموں آئی جہاں وہ کچھ عرصہ بعد فوت ہوگئی۔

مغلانی بیگم اگرچہ بعض معاملات میں ناکام تھی تاہم بے حد فیاض اور سخی تھی۔ امیر و غریب، چھوٹے بڑے، بلند و پست اس کے جود و کرم سے متمتع ہوتے تھے۔ اس کی ناکامی اور تباہی کی ذمہ داری اس کے درباریوں اور رشتہ داروں پر بھی عائد ہوتی ہے۔

عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ

ترجمہ : شاہد حسین رزاقی

یہ کتاب ڈاکٹر زبید احمد کی گراں قدر تصنیف "دی کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو عرب لٹریچر" کا ترجمہ ہے، جس میں بہت تفصیل سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ عربی ادبیات کے فروغ میں برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے کس قدر اہم حصہ لیا ہے۔ اس کتاب میں تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، کلام، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، طب، تاریخ، لغت، شعر و ادب وغیرہ سے متعلق تصانیف اور مصنفین کا تذکرہ جداگانہ ابواب میں کیا گیا ہے اور چونکہ ان تصانیف میں سے اکثر طبع نہیں ہوئی ہیں، اس لیے اس کتاب میں پیش کردہ معلومات کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی ہے۔ عربی سے مسلمانوں کے گہرے روحانی تعلق اور کتاب کی علمی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر جناب شاہد حسین رزاقی صاحب نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ رواں دواں اور شستہ ہے۔ مسلمانان پاک و ہند کی دینی و علمی تاریخ سے باخبر ہونے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

صفحات ۱۲ + ۴۲۷ قیمت ۱۶/- روپے

ملنے کا پتا : ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

تابعطش درانی

مسئلہ ثقافت اور اسلام

اردو زبان میں بعض لوگ ثقافت، تہذیب اور تمدن کو ہم معنی یا مترادفات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ثقافت کا لفظ ثقف سے نکلا ہے، جس کے معنی ہنر یا سیکھنے کے ہیں۔ انگریزی میں اس کا مترادف "کلچر" ہے جس کے معنی "ہل چلانا" یا "کھیتی باڑی" کے ہیں اور اصطلاحاً انسانوں کے طریق زندگی یا اس کل مجموعے یا طرز حیات کو کہا جاتا ہے جو انسان غیر جبلی طور پر یعنی سیکھ کر انجام دیتا ہے۔ گویا ثقافت ایک ایسی جامع اصطلاح ہے، جس میں طرز معاشرت یا طریق زندگی کے تمام نمونے آجاتے ہیں۔ یعنی انسان کس طرح رہتے سہتے، ملتے جلتے، کھاتے پیتے اور بولتے گاتے ہیں۔ ان میں وہ کام شامل نہیں جو جبلی طور پر انجام پاتے ہیں۔ مثلاً بھوک جبلی شے ہے، اس لیے یہ ثقافت میں شامل نہیں، مگر اسے مٹانے کے لیے جو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، انھیں ثقافت میں شامل کیا جائے گا۔ ای بی ٹیلر کے نزدیک ثقافت [illegible] یا ذہانت کا نام ہے جس میں مذہب، عقائد، علوم، فنون، اخلاقیات، عادات، [illegible] تمام رجحانات و [illegible] شامل ہیں جو انسان [illegible] انجام دیتا ہے۔ گویا اصطلاحاً ثقافت [illegible] اخلاق و آداب، تہذیب و تمدن اور قومی خصوصیات شامل ہوجاتی ہیں [illegible] انسانی [illegible]۔

[illegible] ثقافت [illegible] کے تحت جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے۔ ثقافت [illegible] ثقافت میں اپنا کردار ادا کرتا ہے [illegible] ثقافت وحشیانہ بھی ہوسکتی [illegible] غیر تہذیب یافتہ تھی، جو [illegible] مہذب ہوئی۔ [illegible] فلسفہ، آرٹ اور معاشرت [illegible] ان تمام طریقوں [illegible] کیا ہم اسلامی طرز زندگی کو اسلامی ثقافت کا نام [illegible] اس بنا پر ہمیں دین اور ثقافت کی [illegible] اصطلاحوں [illegible] کی ثقافت کا مطالعہ کریں تو کیا وہ [illegible] ثقافت اسلامی

کہلائے گی یا کیا اُسے مسلم ثقافت کا نام دیا جائے گا؟ یہ وہ معاملات ہیں، جن کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

تہذیب، ثقافت کا ایک حصہ یا قسم ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Civilization کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں تہذیب سے مراد سلیقہ، ادب، تعلیم اور رکھ رکھاؤ لیے جاتے ہیں۔ گویا جب ایک وحشی شخص اپنی ثقافت (طرزِ زندگی) کو باسلیقہ، باادب یا تعلیم یافتہ بنا لیتا ہے تو وہ تہذیب کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اصطلاحاً تہذیب میں تحریر کا استعمال، شہروں کا وجود، سیاسی تغیرات اور پیشہ ورانہ تخصص شامل ہے۔ جدید دور کے محققین نے تہذیب میں ہر طرح کے تکنیکی علوم کو بھی شامل کیا ہے۔ تہذیب کی ترقی میں ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنا کردار کرے۔ البتہ کسی ثقافت کے تعلیم یافتہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ اس میں تحریر کا استعمال، شہروں کا وجود، سلیقہ، آداب اور تعلیم کا کس حد تک دخل ہے۔ مثلاً حجری دور کی ثقافت جب تمام میں تہذیب میں داخل ہوئی تو اس وقت تحریر اور شہر وجود میں آچکے تھے۔ اسی طرح بھوک مٹانے کے طریقے باسلیقہ، باادب، تعلیمی یا تکنیکی ہوں تو انھیں تہذیب یافتہ کہا جائے گا۔ تہذیب کا کوئی علاقہ یا منفرد اکائی مقرر نہیں کی جا سکتی۔ عموماً پوری انسانی تہذیب کو اکائی تسلیم کیا جاتا ہے اور تین ادوار یعنی قدیم، قرونِ وسطیٰ اور عہدِ جدید میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مختلف ادوار، زبانوں، علاقوں یا قوموں کی تہذیبیں ایک بڑے جزو کا کُل ہوتی ہیں۔ مجموعی طور پر تہذیبیں ہمیشہ ارتقا پذیر رہتی ہیں۔ گویا اسلامی تہذیب بھی ایک طرح سے کُل کی حیثیت رکھتی ہے جو مسلم تہذیب کی صورت میں ارتقا پذیر ہے۔

تیسرا لفظ تمدن ہے جو تہذیب کی طرح ثقافت کی ایک شاخ ہے، یہ لفظ مدینہ سے نکلا ہے جس کے معنی شہر کے ہیں۔ تمدن کو شہر کے حوالے سے پہچاننا ضروری ہے۔ کیونکہ تمدن شہروں کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ گویا تمدن شہری طرزِ معاشرت اور معیشت کا نام ہے۔ غلطی سے تہذیب کے لفظ کو تمدن کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے یا باہم مترادف قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب ہم ہڑپا یا قدیم روما کی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل ہم اس کے تمدن کی بات کرتے ہیں۔ تمدن عارضی اور مقامی ہوتا ہے۔ ہر قوم اور علاقے کے ساتھ اس کا تمدن نشوونما پاتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ہی مٹ جاتا ہے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مختلف ادوار میں مسلمانوں کا تمدن اسلامی کہلائے گا یا وہ مسلم تمدن کی مثال ہوگا؟

ثقافت، تہذیب اور تمدن کی ان تعریفوں سے بھی ثقافت کا واضح مفہوم اگر سامنے نہیں آتا تو اس سلسلے میں اسے ایل کروب اور اس کے ایک دوست کی علمی کوشش کو دیکھنا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک ثقافت کا حقیقی تعلق (۱) معیار سے ہے (۲) اس میں شعور و ادراک بھی ایک اہم عمل ہے (۳) ضروری ہے کہ یہ معیار کسی نوع یا معاشرے کی عملی زندگی میں جاری و ساری ہو۔ (۴) اس طرزِ زندگی کو اس نہج کا ہونا چاہیے کہ اس پر صحت مند مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اسلام نے اپنا کوئی معیار، کوئی طرزِ معاشرت یا سلیقہ پیش کیا ہے؟ کیا مسلمانوں کی جداگانہ ثقافت، تہذیب یا تمدن ہے یا کبھی رہا ہے؟ کیا اسلام نے کسی قسم کی ثقافت کا آغاز کیا؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہے تو بریفالٹ کی طرح دیگر کئی مستشرقین کو اس امر کا یقین ہے کہ اگر کوئی تہذیب یا ثقافت مغربی تہذیب و تمدن کو پچھاڑ سکتی ہے تو وہ صرف اسلامی ثقافت ہو سکتی ہے جو علم و اخلاق سے آراستہ اور بہترین توانائیوں سے مسلح ہے۔ مصر و بابل کا تمدن ختم ہو گیا۔ ان کی تہذیب اُجڑ گئی اور ثقافت برباد ہو گئی۔ چین کی ثقافت عصرِ رواں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ہندو تہذیب و تمدن اوہام اور خرافات کا مجموعہ ہے اور یورپی تہذیب میکیاولی کی ابلیسی سیاست پر مبنی ہے۔

اوپر مذکور سوالوں کے ضمن میں یہ لازم آتا ہے کہ ثقافت کے وسیع مفہوم کا جائزہ لیتے ہوئے اسلامی تہذیب کا ارتقائی کھوج لگایا جائے جس کا آغاز پیغمبرِ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہوتا ہے۔ "لا الٰہ الا اللہ" وہ بنیادی کلمہ ہے، جس پر اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن کی عمارت استوار ہوتی ہے، جس کا سب سے پہلا اخلاقی مظہر "السلام علیکم" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا تینوں اصطلاحات کے جداگانہ مفہوم کا ایسا ہی تعین کرنا ضروری ہے تاکہ تین مختلف اور ممیز قسم کے ان اعتبارات کو منفرد اور علیحدہ اصطلاح حاصل ہو سکے۔ اگر ہم کلچر کے لیے تہذیب اور سوی لائزیشن کے لیے تہذیب کا لفظ استعمال کریں تو شہری تہذیب کے لیے سیاسیات کی اصطلاح "شہریت" یا "مدنیت"، بالکل موزوں نہیں ہوگی، کیونکہ یہ علی الترتیب "سٹی زن شپ" اور "سوکس" کے لیے استعمال ہوتی ہیں، جو دونوں بالکل مختلف عمل یا معیارات ہیں، اس لیے وقتی اور مدنی تہذیب کے لیے ہمیں تمدن کی اصطلاح استعمال کرنا ہوگی۔

اگر تینوں اصطلاحات کو بعینہٖ تسلیم کیا جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی ثقافت، اسلامی تہذیب اور

اسلامی تمدن میں باہم کیا فرق ہے ؟ کیونکہ تہذیب و تمدن نے اسلامی ثقافت میں اتنا بھرپور کردار ادا کیا ہے کہ آج تہذیب اور ثقافت کو جدا جدا مفہوم میں دیکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

اسلام میں زندگی اور اس کے طرز کو پرکھنے کے لیے واحد اور بنیادی معیار تقویٰ ہے، جس سے پیدا ہونے والی چند اقدار مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ توحید الٰہی اور مساجد کا قیام
۲۔ رسول اللہ کا بہ درجہ غایت احترام اور بے انتہا محبت
۳۔ السلام علیکم تہذیب کا بنیادی اور اہم جزو
۴۔ اخوت اور بھائی چارہ
۵۔ عورتوں کا معاشرتی مقام
۶۔ سادگی و خلوص، نمائش اور ریاکاری کی جگہ
۷۔ نیکی اور تقویٰ، بنیاد عزت و مقام
۸۔ مظلوموں کی داد رسی اور ظالموں کو روکنا
۹۔ جوا، قتل اور شراب نوشی کی ممانعت
۱۰۔ پاکیزگی، صفائی اور نفاست کا ذوق
۱۱۔ بے مقصد شعر گوئی کی جگہ [illegible]
۱۲۔ بدوی زندگی کی جگہ شہری زندگی
۱۳۔ روایتی ہمدردی، مہمان نوازی اور اشاعت اسلام میں جذبہ جہاد
۱۴۔ اللہ کی حاکمیت
۱۵۔ خلیفے کا انتخاب اور جواب دہی
۱۶۔ علم، ادب اور فن کے سرچشمے پر اسلام کی خصوصی چھاپ
۱۷۔ تعلیمی نظام اور درس گاہوں کا اجرا
۱۸۔ مسلمانوں کا ہر کام خدا کی خوشنودی کے لیے
۱۹۔ عوام کی خبر گیری اور انتظام سلطنت کے لیے بیت المال کا قیام۔ نظام زکوٰۃ، اوقاف [illegible]

۲۰۔ شرم و حیا اور عورت کی عزت و تکریم

۲۱۔ عدل و انصاف میں مساواتِ انسانی

۲۲۔ اطاعتِ امیر جب تک امیر پابند شریعت ہے

۲۳۔ حیرت انگیز مذہبی رواداری

۲۴۔ اسلام کے آفاقی و عالمگیر پیغام کی نشر و اشاعت

۲۵۔ اسلام کو بہ یک وقت عقل و دل سے خطاب کرنے والا مذہب تسلیم کرنا

یہ وہ اقدار اور طریقے ہیں جن پر اسلامی ثقافت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ مختلف ادوار نے ان اقدار کو کس قدر اپنایا؟ یہ ایک الگ موضوع ہے تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے مختلف زمانوں میں جن تہذیبوں اور تمدنوں کا اجراء کیا، وہ مسلم کلچر کہلانے کی مستحق ہیں۔ اسلامی تہذیب و ثقافت اس وقت وجود میں آتی ہے جب اسے پورے معیارات کے ساتھ نافذ کیا جاتا ہے اور اسلامی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں اور ملکوں میں اس تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں بارہا لوگوں نے بھرپور انداز میں دیکھی ہیں۔

جناب نجم الثاقب

توبہ و استغفار

نیکی کا نام "معروف" ہے اور بدی کے لیے قرآنی اصطلاح "منکر" ہے۔ نیکی ایک کنبہ ہے جس کی بہت سی نیکیوں سے رشتہ داری ہے۔ ایک نیکی کرنے سے سیکڑوں نیکیوں کا دروازہ کھل جائے گا۔ اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی بدی کو بھی حقیر نہیں جاننا چاہیے۔ یہ بڑی بدیوں کا راستہ کھولتی ہے۔ اگر نیکیوں کا اہتمام کرو گے تو بدیاں خود بخود رخصت ہو جائیں گی۔

انسانی اعمال کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک شعوری احساس یعنی شعور کی سطح پر قبول کر کے کسی عمل کا کرنا، دوسرا یہ کہ ذہول سا طاری ہو گیا اور اس کیفیت میں کسی عمل کا ارتکاب ہو گیا۔ پہلی صورت میں ہر گناہ کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ مگر جہاں نسیان ہو، جذبات کا تیز دھارا آیا اور اس میں بہ نکلے، دونوں میں بہت فرق ہے۔ ایک آیت سے یہ فرق سامنے آتا ہے۔

بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ: ۸۱) — (یعنی جس شخص نے ایک گناہ کیا اور پھر اس کی خطا نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہ آگ والے ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے)۔

ہاں اگر کوئی شخص ارتکابِ گناہ کے بعد توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دے گا۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (نحل، ۱۱۹) (یعنی تمہارا رب ایسے لوگوں کے لیے جنھوں نے جہالت سے برائی کی، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنے اعمال درست کر لیے، بڑی مغفرت والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

توبہ کے تین اصول ہیں: (۱) ندامت و پشیمانی کا احساس (۲) گناہ نہ کرنے کا عزمِ مصمم (۳) ترکِ گناہ

اللہ تعالیٰ کا کس قدر احسان ہے کہ وہ برائی کو اس وقت تک نہیں لکھتا جب تک کہ انسان اس کا مرتکب نہ ہو۔ لیکن اگر انسان نیکی کا پختہ ارادہ کر لے تو اسے ایک کامل نیکی کا ثواب مل جاتا ہے اور اگر وہ ایک برائی کا ارتکاب کرے تو صرف ایک برائی اس کے اعمال نامے میں درج ہوتی ہے اور اگر نیکی کرے

(باقی برصفحہ ۵۶)

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن ابی بکرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا احدثکم باکبر الکبائر؟ قالوا بلی یا رسول اللہ، قال الاشراک باللہ وعقوق الوالدین قال وجلس وکان متکئا، قال وشہادۃ الزور او قول الزور، فما زال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقولہا حتی قلنا لیتہ سکت — (جامع ترمذی - ابواب البر والصلۃ - باب ما جاء فی عقوق الوالدین)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ بہت بڑا گناہ کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، کیوں نہیں اے اللہ کے رسول۔ (ضرور بتائیے) فرمایا۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ حضرت ابوبکرہ کہتے ہیں کہ جب آنحضرت نے یہ بات بتائی، آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا: (یاد رکھو!) جھوٹی شہادت یا جھوٹی بات بھی (بہت بڑے گناہوں میں شامل ہے) آنحضرتؐ یہ بات اس انداز اور تسلسل کے ساتھ فرماتے رہے کہ ہم نے یہ چاہا کہ کاش کہ آپ چپ ہو جائیں۔!

یہ حدیث حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ابوبکرہ ان کی کنیت اور نُفَیع ان کا اسم گرامی ہے، اپنے معنی و مفہوم میں حدیث بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے خود دریافت فرمایا کہ میں تمہارے لیے اس چیز کی وضاحت نہ کر دوں کہ سب سے بڑا عمل اور سب سے بڑا گناہ یعنی اکبر الکبائر کیا ہے؟ صحابہ کا حضور کے لیے کمال اظہار ادب اور اسلوبِ خطاب ملاحظہ ہو کہ سب نے انتہائی تکریم اور بہ درجہ غایت احترام کے لب و لہجہ میں عرض کیا، بلی یا رسول اللہ، کیوں نہیں، اے اللہ کے رسولؐ ضرور بتایئے کہ سب سے بڑی معصیت کیا ہے اور وہ کون سا عمل ہے، جس کے ارتکاب سے انسان کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دو باتوں کو اکبر الکبائر قرار دیا۔ ایک اللہ کے ساتھ شرک کو، دوسرے والدین کی نافرمانی کو۔ اس وقت آپ تکیے یا کسی اور چیز کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پھر فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا، دیکھو، ایک چیز اور بھی ہے جس کا ارتکاب بہت بڑا گناہ ہے، اور وہ ہے، جھوٹی شہادت دینا یا جھوٹی بات کرنا۔

مختصر الفاظ میں شرک کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو حاجت روا سمجھنا، اس کے سامنے جھکنا، اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے کسی دوسرے کے دروازے پر دستک دینا۔ شرک عمل میں بھی ہوتا ہے، قول میں بھی ہوتا ہے اور عقیدے میں بھی۔ یہ بڑی باریک اور نازک شے ہے۔ شرک انتہائی دبے پاؤں آتا ہے اور نہایت خاموشی کے ساتھ انسان کے قول و عمل میں داخل ہوتا اور عقیدے میں سرایت کر جاتا ہے اور تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔

پھر اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باپ کی نافرمانی بھی عظیم ترین معصیت اور بہت بڑا گناہ ہے۔ ماں باپ کی اطاعت و فرماں برداری کے لیے قرآن مجید اور احادیث رسولِ اکرم میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ماں باپ کو اللہ کی بہت بڑی نعمت قرار دیا گیا اور ان کی خدمت کو نہایت ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ ان کی ہر وہ بات ماننا جو شریعت کے منافی نہ ہو، قرآن اور حدیث کی رُو سے فرض ہے۔ ماں باپ کی نافرمانی کا ذکر اس حدیث میں ایک ہی جملے میں اشراک باللہ کے ساتھ کیا گیا ہے، یعنی جس طرح کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا اکبر الکبائر ہے، اسی طرح ماں باپ کی نافرمانی کرنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور سے بیٹھ کر صحابہ کو خطاب کیا اور زور دے کر فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا اور عام بول چال میں جھوٹ بولنا بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ اس موقع پر آپ کے لب و لہجے میں تیزی آگئی اور آپ نے شدت کے ساتھ اس کی مذمت فرمائی اور بار بار اپنے الفاظ دہرائے۔ آپ کے اسلوبِ کلام میں تیزی اور شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حدیث کے راوی حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارا جی چاہتا تھا کہ اب آپ خاموشی اختیار فرمالیں کیوں کہ آپ کذب بیانی اور جھوٹی گواہی کی جس سختی کے ساتھ مذمت فرما رہے تھے، وہ آپ کے الفاظ اور پیرایۂ بیان سے نمایاں تھی۔

بلاشبہ جھوٹی گواہی اور کذب بیانی بہ درجہ غایت بدترین فعل ہے۔ اس سے انتہائی دور رس اور خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ معاشرتی بگاڑ، باہمی دشمنی، لامتناہی عداوت اور قتل و غارت کا اصل باعث یہی جھوٹی گواہی اور کذب بیانی ہے۔ جس طرح سچی گواہی نہ دینا اور سچ نہ بولنا بہت بڑا گناہ ہے، اسی طرح جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹ بولنا بھی معصیتِ کبریٰ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی اپنے اندر بڑی جامعیت اور وسعت رکھتا ہے۔ اگر اس کو مدارِ عمل ٹھہرا لیا جائے تو تمام معاشرتی اور اجتماعی برائیوں کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔

الفہرست

محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق اردو ترجمہ:- محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآنِ مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علم نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیونکر عالمِ وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۴۶ مع اشاریہ قیمت ۳۰/- روپے

ملنے کا پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

نقد و نظر

اسلام کا نظامِ تعزیرات

مصنف : عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز داؤد

ترجمہ : شعبۂ ترجمہ و تالیف طارق اکیڈمی۔ فیصل آباد

ناشر : طارق اکیڈمی، فیصل آباد

صفحات ۲۵۶ - کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، سرورق عمدہ - قیمت عام ایڈیشن ۱۸ روپے،
لائبریری ایڈیشن ۲۵ روپے -

فاضلِ گرامی جناب عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز بن داؤد نے ریاض یونیورسٹی کے شریعت کالج کے طالب علم کی حیثیت سے اسلامی علوم میں ڈپلوما حاصل کرنے کی غرض سے "العقوبات فی الاسلام" کے نام سے عربی میں ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ یہ مقالہ انھوں نے اپنے استاذِ محترم جناب حسین صدیق احمد کی نگرانی میں ۹۲-۱۳۹۳ھ کے تعلیمی سال میں سپردِ قلم کیا تھا - فاضل مصنف نے اس کی ترتیب و تدوین میں جو محنت کی اور جس کاوش سے مختلف کتابوں سے معلومات جمع کر کے اس کو ایک حسین علمی گلدستے کی شکل میں پیش کیا، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور مقالہ نگار کو امتیازی درجے میں کامیاب قرار دیا گیا۔ مقالہ چوں کہ ہر لحاظ سے معیاری تھا، اس لیے سعودی حکومت نے اس کو شائع کرنا ضروری سمجھا - اب یہ عربی مقالہ طارق اکیڈمی فیصل آباد کے شعبۂ ترجمہ و تالیف کی طرف سے "اسلام کا نظامِ تعزیرات" کے نام سے کتابی شکل میں اردو میں منتقل ہو گیا ہے -

"اسلام کا نظامِ تعزیرات" اپنے موضوع اور مندرجات کے اعتبار سے نہایت عمدہ کتاب ہے اور طارق اکیڈمی فیصل آباد نے اس کا ترجمہ کر کے اردو داں طبقے پر بہت بڑا علمی احسان کیا ہے۔ اس دور میں اس موضوع سے متعلق کتابوں کی شدید ضرورت ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ تعزیرات و حدود کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے اور اسلام میں مختلف جرائم کے مرتکب لوگوں کے لیے کیا سزائیں مقرر ہیں ؟

زیرِ نظر کتاب میں جن عنوانات سے تعرض کیا گیا اور جن امور کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں :- حدود کی تعریف ، حد کے لغوی اور اصطلاحی معنی ، تعزیر اور تادیب میں فرق ، حد اور تعزیر میں فرق ، اسلامی سزاؤں کی اقسام ، زنا کی سزا ، سزائے قذف ، شراب نوشی کی سزا ، سرقے کی سزا ، باغیوں کے متعلق احکام ، مرتد کی تعریف اور اس کی سزا ، سحر کی سزا ، قصاص وغیرہ۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے ضمنی عنوانات اور ذیلی مباحث درج کتاب ہیں - یوں تو اس کتاب کا مطالعہ ہر طبقے کے لوگوں کو کرنا چاہیے ، لیکن مختلف عدالتوں کے جج صاحبان اور وکلائے کرام کو بالخصوص اس سے مستفید ہونا چاہیے ، ان کے لیے یہ کتاب بڑی مفید ثابت ہوگی - حدود و تعزیرات کے بارے میں قانونی نوعیت کے جن مسائل سے ان کا عام طور پر عدالتوں میں واسطہ پڑتا ہے ، کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں ان کی پوری تعریف اور سزاؤں کی تفصیل بیان کی گئی ہے - ترجمہ کی زبان رواں دواں اور صاف ہے - کہیں کوئی گنجلک یا الجھاؤ نہیں ہے -

احوال و آثار میرزا اسد اللہ خاں غالب

مصنف : محمد علی فرجاد

ناشر : مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان - اسلام آباد

بہترین کتابت ، عمدہ طباعت ، شان دار کاغذ - صفحات مع مقدمہ و فہرست عنوانات وغیرہ ۲۹۰ - قیمت ۳۵ روپے

زیرِ نظر کتاب "احوال و آثار میرزا اسد اللہ خاں غالب" میرزا غالب کے بارے میں اپنی نوعیت کی بہترین کتاب ہے - اب تک اس ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے ، اس کی حیثیت اس میں معلومات افزا اضافے کی ہے - کتاب فارسی زبان میں ہے - ابتدا میں "دربارۂ ایں کتاب" کے عنوان سے کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے اور اس کے مشتملات کی مختصر طور سے تصریح کی گئی ہے - یہ فرض جناب محمد جعفر محجوب نے انجام دیا ہے - اس کے بعد جناب پروفیسر شکور احسن صاحب (استاذ پنجاب یونیورسٹی) کی تقریظ ہے - پھر کتاب کے فاضل مصنف نے مقدمہ تحریر کیا ہے - اس کے بعد لائق مصنف نے شروع سے لے کر غالب کے زمانے تک برصغیر پاک و ہند میں فارسی ادب میں جو خدمات انجام دی گئی ہیں ، اس کا جائزہ لیا ہے - کتاب کا یہ حصہ بڑا معلوماتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے اس میں بڑی تحقیق اور کاوش کا ثبوت

بہم پہنچایا ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ برصغیر میں فارسی کب آئی، کیوں کر رواج پذیر ہوئی اور پھر یہ کس طرح شعر و ادب کی زبان بنی۔ لاہور، ملتان، دہلی یا کشمیر اور بنگال وغیرہ مختلف علاقوں اور عہدوں میں فارسی کی جو ترویج ہوئی اور پھر اس نے بادشاہوں کے درباروں میں جو عروج حاصل کیا اختصار کے ساتھ اس کی تاریخ بیان کر دی گئی ہے، مغل عہدِ حکومت میں اس نے ارتقا کی جو منزلیں طے کیں، اس کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

کتاب میں غالب کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور اس کی فارسی شاعری کے دور اور اس کی مختلف اصنافِ شعری کو موضوعِ فکر ٹھہرایا گیا ہے۔ آخر میں غالب کا فارسی کلام درج کیا ہے۔ کتاب اپنے موضوع کا پوری طرح احاطہ کیے ہوئے ہے اور وسعتِ معلومات کی بنا پر لائقِ مطالعہ ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ زیب عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند علمِ فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دورِ حکومت میں کتبِ فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریقِ حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، ان کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور اکیاسی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں اور جن کو مسائلِ فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات ۴۰۸ قیمت ۱۵/- روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، بمبئی ۔ اگست ۱۹۷۹

مطالعات وتعلیقات	قاضی اطہر مبارک پوری
ہندوستان میں اسلامی علوم وفنو .	مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی
زائرینِ حرمین	قاضی اطہر مبارک پوری

البلاغ، کراچی ۔ اکتوبر ۱۹۷۹

شرعی قوانین اور ہماری غلطیاں	مولانا محمد تقی عثمانی
صدیق حمیم و رفیق قدیم ــ مولانا مفتی شفیع	مولانا قاری محمد طیب
ولیمہ کیا ہے ؟	مولانا قاری محمد اجمل خاں
حضرت مفتی محمد شفیع کی خدمت میں پانچ سال	مولانا اشفاق احمد قاسمی

بینات، کراچی ــ اگست ۱۹۷۹

حدیث میں تفقہ کا مقام	مولانا محمد یوسف طلال
اسلامی نظام اور فقہ جعفریہ	مولانا عبدالستار تونسوی

بینات، کراچی ــ اکتوبر ۱۹۷۹

مدینہ کے فقہائے سبعہ اور ان کے علمی کارنامے	جناب محمود عارف
مغرب کے احیائے علم وفن کا اسلامی پس منظر	جناب غلام ناصر مروت
اسلام کا نظام عدل و تعلیمات	مولانا بشیر احمد کشمیری

ترجمان الحدیث، لاہور ــ ستمبر ۱۹۷۹

خاتونِ مسلم کے لیے قیمتی ہدیہ	مولانا عزیز زبیدی
کمرشل انٹرسٹ (تجارتی سود)	مولانا عبدالرحمٰن کیلانی
خاندانی منصوبہ بندی	محترمہ ثریا بتول ایم اے

الحق، اکوڑہ خٹک ۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

مولانا محمد زکریا کا دورۂ برطانیہ	مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی
پاکستان میں اسلام کا مستقبل	ابن آذر
مولانا اسعد اللہ مظاہری	مولانا عبد العزیز مظاہری
مولانا اشرف الحق قادری صابری	جناب امداد صابری

فاران، کراچی ۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

سائنس قرآن کے حضور میں	عبد الوکیل علوی
حضرت حارثہ بن سراقہ انصاری	جناب طالب ہاشمی
پاکستان میں اسلامی نظام کیوں اور کیسے ؟	ریٹائرڈ جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس

معارف، اعظم گڑھ ۔ اگست ۱۹۷۹ء

مطالعہ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کے مبادیات (مسلسل)	مولانا اخلاق حسین دہلوی
امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری (مسلسل)	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
حکیم سنائی غزنوی پر بین الاقوامی سیمنار ۔ منعقدہ کابل	ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ)

معارف، اعظم گڑھ ۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

مطالعہ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کے مبادیات (مسلسل)	مولانا اخلاق حسین دہلوی
امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری (مسلسل)	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
حکیم سنائی غزنوی پر بین الاقوامی سیمنار ۔ منعقدہ کابل	ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ)

(بقیہ از صفحہ ۱۲۸) تو اللہ تعالیٰ اسے کم از کم دس نیکیوں کا ثواب عطا کرتا ہے ۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (انعام : ۱۶۰)

یعنی جو شخص نیک کام کرے گا، اس کو (اقل درجہ) اس کے دس حصے ملیں گے، اور جو شخص برا کام کرے گا اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی اور ان لوگوں پر ظلم نہ ہوگا۔

دسمبر ۱۹۷۹

المعارف

علمی اسلامی ماہنامہ

★

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

مجلسِ ادارت

ماہ نامہ المعارف ۔ قیمت فی کاپی ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ ۱۵ روپے ۔ بذریعہ وی پی ۱۶ روپے

صوبہ پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور شدہ بموجب سرکلر نمبر

S.O.BCD.Edu.G-32/71 مورخہ 10 مئی 1971

جاری کردہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب

ناشر	مقامِ اشاعت	طابع و مطبع
محمد اشرف ڈار	ادارۂ ثقافت اسلامیہ	ملک محمد عارف
اعزازی معتمد	کلب روڈ ، لاہور	دین محمدی پریس ، لاہور

فون ۵۳۹۰۸

المعارف لاہور

جلد ۱۲ | دسمبر ۱۹۷۹ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ | شمارہ ۱۲

ترتیب

تاثرات

اسلام جہاں مسلمانوں کے عقیدہ و عمل میں ایک طرح کا نظم و ضبط پیدا کرتا ہے وہاں ان کے ماہ و سال میں بھی ایک باقاعدگی اور موزونیت کا متمنی ہے۔ اسلام نے فکر و عمل کے تمام اجزا میں الگ الگ کچھ خصوصیات و دلائل فرمائی ہیں۔ سن و تقویم کی تعیین میں بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے ان خصوصیات کو پیش نگاہ رکھا ہے جو دوسرے مذاہب و ادیان سے مختلف ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے سن کا آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔ یعنی مسلمانوں نے اپنی تاریخ کی ابتدا اس وقت سے کی جب ان کا مکہ مکرمہ میں قیام ممکن نہ رہا اور مخالفینِ اسلام نے ایسی فضا پیدا کر دی کہ حالات قطعی ناموافق شکل اختیار کر گئے۔

بلاشبہ اسلام کے نقطۂ نظر سے بلکہ پوری انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے سب سے بڑا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور آپ کا افقِ وجود پر جلوہ گر ہونا ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ ساعت سعید ہے جو صحت مند تہذیب اور صاف ستھری ثقافت کو عالم وجود میں لانے کا باعث بنی ہے اور یہی وہ مرکزِ نور ہے جس سے دنیا بھر کے علوم و فنون کی مشعلیں اکتساب ضو کرتی ہیں۔ مگر مسلمانوں نے اپنی تاریخ اور سنین و شہور کا آغاز اس عظیم واقعہ سے نہیں کیا۔

دوسرا بڑا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چالیس سال بعد آتا ہے، جب کہ حضور کو اللہ کی طرف سے خلعتِ نبوت سے نوازا اور پیرہنِ رسالت سے سرفراز کیا گیا۔ آپ نے دنیا کو انسانیت کی عظمت و برتری کی تعلیم دی اور جہالت کے اندھیروں میں گھری ہوئی مخلوق کو علم و عرفان اور معرفت و ادراک کی شمع فروزاں سے مستنیر ہونے کی دعوت سے نوازا، مگر اسلامی سن کے آغاز کی بنیاد اس عظیم واقعہ کو بھی نہ بنایا گیا۔

اس سے کئی سال بعد یکے بعد دیگرے متعدد واقعات ظہور میں آئے، جن سے مسلمانوں کی حالت یکسر بدل گئی اور اسلامی زاویۂ فکر سے انقلاب و تغیر کی ایک نہایت ہی خوشگوار فضا کروٹ لینے لگی۔ اس

طویل سلسلۂ واقعات میں اولین واقعہ فتح بدر کا ہے، جو نہایت مہتم بالشان واقعہ ہے۔ کفر و اسلام کے اس پہلے معرکے میں مشرکینِ عرب نے اپنی تمام تر طاقت میدان میں جھونک دی اور ایک مسلح لشکر جرار مقابلے میں اُتر آیا لیکن ادھر صرف تین سو تیرہ افراد، جو پورا سامانِ حرب و ضرب بھی نہ رکھتے تھے۔ ان مٹھی بھر افراد نے کفر کی طاقت کو میدان کارزار میں فیصلہ کن شکست دی اور فتح و کامرانی سے ہم کنار ہوئے۔ یہ نہ صرف قلت کی کثرت پر فتح تھی بلکہ اصول اور عقیدے کی فتح تھی، ایک نئے اسلوبِ زندگی کی فتح تھی، سچائی کی فتح تھی اور اسلامی اقدارِ حیات کی فتح تھی۔ اس فتح سے مسلمانوں کے سامنے زندگی کے نئے دروازے وا ہوئے، مستقبل میں نئی فتوحات کی بشارت ملی اور آنے والے دور میں نئے امکانات ان کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ مگر اسلامی تاریخ کا نقطۂ آغاز اس کو بھی قرار نہیں دیا گیا۔

پھر اس سے چند سال بعد فتح مکہ کا واقعۂ عظمیٰ ظہور پذیر ہوا۔ یہ وہ عظیم الشان واقعہ ہے، جب کفر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسلام کے سامنے سپر ڈال دیتا اور واضح انداز میں اپنی شکست کا اعتراف کر لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ اس شان و شکوہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہیں کہ کسی کو ان کا راستہ روکنے اور ان کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہی وہ شہر مکہ ہے جہاں ان کو اس قدر سخت اذیتیں پہنچائی گئی تھیں کہ ان کا وہاں رہنا ناممکن ہو گیا تھا اور ان کی زندگی تک ختم کر دینے کے منصوبے تیار ہو چکے تھے۔ اب یہ زمانہ ہے کہ ان کا کوئی حریف اور کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ کفر کے سب بادل چھٹ چکے ہیں۔ یہ بہت بڑی سعادت تھی جو مسلمانوں کے حصے میں آئی اور مادی و معنوی کامرانیوں کی بے مثال کلید تھی جو اُن کو حاصل ہوئی۔ مگر اسلامی تقویم کی بنیاد یہ واقعہ بھی قرار نہ پایا۔

اسی طرح اسلامی تاریخ میں اور بھی متعدد ایسے واقعات سامنے آئے جو اجتماعی اور انفرادی طور پر انتہائی اہمیت کے حامل تھے، ان میں سے بعض فرحت و مسرت سے تعلق رکھتے تھے اور بعض غم و اندوہ سے، مگر اسلامی تاریخ کے آغاز کے لیے ان کو اساس نہیں بنایا گیا۔

مسلمانوں نے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں خود حضرت عمرؓ کی تجویز کے مطابق ہجرت سے اپنے سن کا آغاز کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہجرت وہ موقع ہے، جب مسلمانوں نے اللہ کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کفارِ مکہ کے مظالم برداشت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسلامی

دعوت کی ہمہ گیر نشر و اشاعت اور ترویج و تبلیغ کو اپنا مطمع نظر ٹھہرالیا۔ اس کے لیے انھوں نے جایداد چھوڑی، وطن کو خیر باد کہا اور اللہ کے مقدس گھر بیت اللہ تک سے نکل جانے کی ٹھان لی، کیونکہ دعوتِ حق کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے اور اپنی اجتماعی قوتوں کو آزادانہ ماحول میں منظم کر کے کفر کے خلاف نبرد آزمانے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ وہ اس کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور مجبوراً بیت اللہ کی مبارک وادی کی سکونت ترک کر کے مدینہ منورہ کو اپنا مسکن ٹھہرالیا کہ یہیں سے کفر کی طاقت کو آسانی کے ساتھ شکست دی جا سکتی اور اس کو اس سرزمین سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جا سکتا ہے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ اس میں وہ ہر اعتبار سے کامیاب رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فہم و فراست کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ہجرت سے اپنے سن و تقویم کی ابتدا کر کے بہت بڑی دینی بصیرت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا اور لوگوں کو یہ پیغام دینا تھا کہ اصل شے اجتماعی زندگی ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کے آغاز و ظہور کو اس وقت سے ابجا گر کریں، جب انھوں نے اجتماعی نقطۂ نظر سے پہلا اجتماعی قدم اٹھایا۔

اسلام کے ظہور پر چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور عالمِ اسلام میں پندرھویں صدی ہجری کی تقریبات شروع ہو گئی ہیں۔ یہ تقریبات دو سال جاری رہیں گی۔ پاکستان میں بھی ان تقریبات کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہر صدی میں اسلام نے انقلاب و تغیر کی بے شمار لہریں دیکھی ہیں اور ہر صدی کسی نہ کسی اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل رہی ہے۔

چودھویں صدی ہجری بھی اپنے دامن میں بہت سی خصوصیات رکھتی ہے۔ اس میں ایشیا کے بہت سے ملک آزاد ہوئے، اسلامی ممالک میں بے شمار تحریکیں اٹھیں اور وہ نئی راہوں سے آشنا ہوئے۔ اس میں لاتعداد عظیم شخصیتیں عالمِ وجود میں آئیں اور دنیا میں نئی روشنی پھیلانے کا باعث بنیں۔ ہمارا فرض ہے کہ پندرھویں صدی ہجری میں ان سب تحریکوں کا جائزہ لیں اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے اس پر غور کریں کہ مختلف اسلامی ملکوں میں اسلامیات یعنی قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم کے کن کن پہلوؤں کو لائقِ اعتنا ٹھہرایا گیا، پھر اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، سائنس اور دیگر علوم و فنون پر کیا کام ہوا، کس میدان میں تحقیق کتنی آگے بڑھی اور کون کون سی نئی باتیں ابھر کر فکر و نظر کے زاویوں میں آئیں۔ ہمیں ان سے کیا سبق ملا اور ترقی و تقدم کی کون سی راہیں ہمارے لیے ہموار ہوئیں۔ نیز ہم دیکھیں کہ کون سی چیز ادھوری رہ گئی ہے اور اسے کس نہج سے آگے بڑھانا ضروری ہے۔

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی
مترجم: رحمت فرخ آبادی ایم اے

سندھ میں علمِ سیرت کی ابتدا اور ارتقا

سیرت، جس کی جمع "سیر" ہے، عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لفظی معنی تو عادات اور حالات ہیں، لیکن فنی لحاظ سے "علم السیر" ایک علم ہے، جسے دوسرے معنوں میں "المغازی" بھی کہتے ہیں۔ مغازی کے بارے میں صاحبِ قاموس علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں کہ یہ غازیوں کے احوال و منقبت کا نام ہے[1]۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے پاس قرآن کریم کے علاوہ کوئی دوسری کتاب نہ تھی۔ احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ تھیں اور چند صحابہ کرام نے بطور یادداشت کچھ احادیث تحریر بھی کی تھیں۔

اموی دورِ خلافت میں خلیفۂ عادل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تحریک اور کوشش سے حدیث کی وسیع پیمانے پر تدوین کے ساتھ ساتھ فن سیرت و مغازی کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سیرت اور مغازی کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا کہ ایک طرف تو عاصم بن عمر انصاری (متوفی ۱۲۱ھ) کو حکم دیا کہ وہ جامع مسجد دمشق میں سیرت پر درس دیا کریں اور دوسری طرف انھوں نے اس فن کی ترتیب و تدوین کا بھی انتظام فرمایا اور اس کام کے لیے اس دور کے ایک دوسرے عالم امام محمد بن شہاب زہریؒ (متوفی ۱۲۴ھ) کو مغازی پر کتاب لکھنے کے لیے کہا۔ امام محمد بن شہاب زہریؒ نے جو فن حدیث کے امام تھے اور فن سیرت و مغازی پر بھی بہت عبور رکھتے تھے اور مدینہ کے ایک ایک انصاری کے گھر جاکر حدیث رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم معلوم کیا کرتے تھے۔ کئی صحابہ کرام سے اکتسابِ فیض کیا تھا اور مرتبے اور فضیلت کے لحاظ سے وہ تابعی تھے۔

صاحبِ کتاب روض الانف علامہ سہیلی لکھتے ہیں کہ فن مغازی میں سب سے پہلے جس نے کتاب لکھی، وہ امام زہریؒ ہیں۔ امام زہری بہت سے محدثین کے استاد تھے۔ سیر و مغازی میں ان کے دو شاگرد بہت

---

[1] قاموس فیروز آبادی۔ ص ۷۷۲

مشہور ہیں۔ ایک موسیٰ بن عقبہ اور دوسرے محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ) یہ حضرت امام مالک کے ہم عصر تھے۔ محمد بن اسحاق کے بارے میں حضرت امام مالک اور ان کے تلامذہ کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے یہ ان کی مخالفت میں بہت آگے نکل گئے ہیں[۵۲] لیکن دیگر محدثین نے انھیں فن حدیث میں "مدلس" اور فن مغازی میں محقق اور معتبر لکھا ہے۔ انھوں نے بھی کتاب المغازی تصنیف کی۔ چونکہ بعد میں محمد بن شہاب زہری کی کتاب عالم وجود میں نہ رہی، اس وجہ سے حاجی خلیفہ چلپی لکھتے ہیں کہ علم سیر میں سب سے پہلے جس شخص نے کتاب تصنیف کی وہ مشہور امام محمد بن اسحاق ہیں جو فن مغازی پر لکھنے والوں کے امام ہیں۔ امام محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کو آگے جاکر ابومحمد عبدالملک بن ہشام حمیری (متوفی ۲۱۸ھ) نے مہذب و منقح کیا اور اس کی ترتیب و تزیین کی۔ اس کتاب کو اب سیرۃ ابن ہشام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ بعد کے علما نے اسے اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا — عبدالرحمٰن سہیلی (متوفی ۵۰۹ھ) نے اس کتاب کی شرح "الروض الانف" کے نام سے لکھی۔ حنفی علما میں علامہ بدرالدین عینی (متوفی ۸۵۵ھ) نے کشف اللثام کے نام سے سیرۃ ابن ہشام کے ایک حصہ کی شرح لکھی۔ شیخ ابونصر فتح بن موسیٰ خضراوی (متوفی ۶۶۳ھ) نے سیرۃ ابن ہشام کو منظوم کیا، جو علمی دنیا کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے[۵۳]

امام زہری کے ایک دوسرے شاگرد ہشام بن عروہ تھے، وہ بھی مایہ ناز محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا انتقال محمد بن اسحاق کی وفات سے چھ سال قبل ہوا تھا۔ محدثین میں وہ بہت ثقہ اور معتبر شمار کیے جاتے ہیں۔ حدیث و سیرت کی بہت سی روایات انھوں نے اپنے والد عروہ سے سن کر بیان کی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض روایات انھوں نے محمد بن شہاب زہری سے بھی منسوب کی ہیں۔ ان کے قابل اعتماد شاگرد اور راوی دوسری صدی ہجری کے برگزیدہ امام اور محدث، امام ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن السندھی (متوفی ۱۷۰ھ) تھے۔

۱- **امام ابومعشر سندھی:** سندھ کے وہ اولین محدث تھے جنہیں فن حدیث و سیرت دونوں

---

[۵۲] مولانا حسین احمد۔ تقریر جامع ترمذی

[۵۳] کشف الظنون - حاجی خلیفہ چلپی۔ ص ۱۰۱۲

سے یکساں نسبت تھی۔ انھیں بھی محمد بن اسحاق کی طرح امام السیرۃ والمغازی کے نام یاد کیا جاتا ہے۔

حافظ ابو بکر خطیب بغدادی نے ان کے ترجمے کے ذیل میں لکھا ہے کہ نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی سیرت و مغازی میں تمام لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ انھوں نے امام سہل بن حنیف کو بھی دیکھا اور محمد بن کعب قرظی، حضرت عبداللہ بن عمر کے آزاد کردہ غلام نافع، سعید مقبری، محمد بن منکدر اور ہشام بن عروہ جیسے مشہور محدثین کے حوالے سے حدیث و سیرت پر روایات بیان کیں۔ اور ان کے حوالے سے ان کے صاحبزادے محمد سندھی، یزید بن ہارون، محمد بن عمر الواقدی اور دوسرے کئی اصحاب علم و فضل نے روایات بیان کی ہیں۔ نجیح اصل میں مدینہ منورہ میں رہائش پذیر تھے لیکن عباسی خلیفہ مہدی انھیں بغداد لے آیا، جہاں اپنی وفات تک ان کا قیام رہا۔[۵]

محمد بن ابو معشر سندھی نے کتاب المغازی کو اپنے والد امام ابو معشر سے سنا اور ان کے دو پوتوں امام داؤد اور امام حسن سندھی نے جو فن حدیث و مغازی کے عالم تھے اپنے باپ سے اس کتاب کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ اسی طرح واقدی نے بھی سیرت کی تعلیم کے لیے امام ابو معشر کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔

امام ابو معشر سندھی کے شاگرد علامہ واقدی کو محدثین کے نزدیک روایت حدیث میں ضعیف تصور کیا جاتا ہے لیکن سیرت اور تاریخ نگاری میں اس کی اہمیت سے انکار مشکل ہے۔ اسی طرح صاحب طبقات علامہ ابن سعد کا شمار بھی ان کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔

اس تحقیقی جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فن سیرت کا فن، دوسری صدی ہجری میں عالم وجود میں آیا اور ابو معشر نجیح سندھی نے اس فن پر کتاب المغازی لکھی جو ایک سندھی عالم کی فن سیرت پر مجموعی طور سے پہلی کتاب ہے۔ افسوس کہ اس وقت یہ کتاب ناپید ہے لیکن اس کی روایات مؤلف کے تلامذہ کے حلقوں اور ان کی تصانیف میں بکثرت بیان کی گئی ہیں۔

۲۔ مکاتیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ اسلام کے سلسلے میں جو خطوط لکھے تھے انھیں اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ یہ بھی سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حصہ

---

[۵] تاریخ بغداد از علامہ خطیب بغدادی، جلد ۱۳، ص ۴۲۷۔ ۴۳۰

اہم حصہ ہے۔ اس کتاب کو تیسری صدی کے ایک سندھی عالم امام ابوجعفر محمد بن ابراہیم بن عبداللہ دیبلی نے تالیف کیا ہے۔ یہ بات نہایت مسرت انگیز ہے کہ یہ کتاب زمانے کی دست برد سے محفوظ رہی اور آج ہمارے پاس موجود ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نے یہ اہم علمی فیصلہ کیا ہے کہ اس کتاب کا اصل مخطوطہ اور اس کا سندھی ترجمہ جلد از جلد شائع کیا جائے۔ یہ خدمت اس احقر (یعنی غلام مصطفٰی قاسمی) کے سپرد کی گئی ہے اور اس کا ترجمہ پہلے ہی مولانا عبدالرشید نعمانی کے حوالے کیا جا چکا ہے۔

۳۔ قوت العاشقین سندھی: یہ کتاب مخدوم ہاشم ٹھٹھوی نے ۱۱۲۷ھ میں تالیف کی۔ سندھی علما سے منسوب سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تیسری قدیم کتاب ہے جو سندھ کے عظیم محقق اور عالم مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی نے منظوم تحریر کی ہے۔ اس کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزوں پر تحقیق کی گئی ہے اور اس طرح ایک سو ساٹھ (۱۶۰) معجزے پوری تحقیق اور اسناد کے حوالوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مخدوم صاحب نے کئی جگہ اپنے عربی نعتیہ قصائد اور مناجات کو بھی درج کیا ہے اور اس طرح یہ کتاب سندھ کے دینی ادب میں کافی اہمیت کی حامل ہے، اسی طرح کئی مقامات پر عشرہ مبشرہ اور دیگر صحابہ کرام کی سیرت و فضیلت پر صحیح احادیث درج کر کے انھیں قاری کے ذہن نشین کرایا ہے۔ یہ کتاب ۳۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے کراؤن سائز میں مسلم ادبی پریس حیدرآباد سندھ نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا ہے۔

۴۔ بذل القوۃ فی حوادث سنی النبوۃ (عربی): یہ کتاب بھی مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کی تحریر کردہ ہے اور سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے اور کافی تحقیقی انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ عالم اسلام میں یہ کتاب اپنی نہج پر منفرد اور واحد ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول ہجرت سے پہلے کے دور سے متعلق ہے اور حصہ دوم ہجرت کے بعد کے دور کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ حصہ دوم کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس حصے میں غزوات، سرایا اور دیگر واقعات درج کیے ہیں۔ مخدوم صاحب نے اس کی تالیف کی ۵ ذی الحج ۱۱۶۶ھ کو ابتدا کی اور ۴ صفر ۱۱۶۸ھ کو اسے مکمل کیا۔ سیرۃ النبی پر یہ اہم ترین کتاب مخدوم امیر احمد صاحب مرحوم کے مقدمے اور تحقیق و حواشی کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ نے شائع کی ہے۔ اس کا سندھی ترجمہ بھی تیاری کے

آخری مراحل میں ہے اور جلد ہی شائع ہوگا۔

۵۔ قمر المنیر : یہ کتاب سندھی نظم میں ہے اور اس کے مصنف مخدوم عبداللہ نریی کچھ والے ہیں۔ مخدوم عبداللہ نریی سندھی ادب کے ایک بہت بڑے محسن ہیں۔ انھوں نے کنز العبرت اور خزانۂ عظیم وغیرہ جیسی ہزاروں صفحات پر مشتمل سندھی اور اسلامی کتب لکھیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ سندھی ادب کے ایسے عظیم محسن کے صحیح حالات بھی دستیاب نہیں ہیں اور ان کی تمام تصانیف کو میوںن ابوالحسن ٹھٹھوی کے ایک عزیز مخدوم عبداللہ واعظ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، جب کہ مخدوم عبداللہ نے اپنی تصانیف میں نہ صرف اپنا نام بلکہ سن تصنیف بھی دیا ہے اور اس کے ساتھ اپنے پدر بزرگوار کا نام بھی لکھا ہے۔ مخدوم عبداللہ نے یہ کتاب ۱۰۸۰ھ کے بعد تصنیف کی ہے جب کہ مخدوم عبداللہ واعظ ٹھٹھوی اس سے کافی عرصہ قبل ہی انتقال کر گئے تھے۔ اس بارے میں میں نے (یعنی غلام مصطفٰی قاسمی نے) کنز العبرت کے مقدمے میں کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بہر حال اس کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حمیدہ کے ساتھ ان کے معجزوں کا بھی بیان ہے۔ یہ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ڈیمی سائز میں بمبئی سے شائع ہو چکی ہے۔

۶۔ بدرِ منیر : یہ کتاب بھی سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے اور اسے بھی مخدوم عبداللہ نریی والے نے اپنی پہلی کتاب قمر منیر کی نہج پر ہی لکھا ہے۔

۷۔ شمائل نبوی ـــ سندھی منظوم : تالیف مخدوم عبدالسلام :۔ اس سے قبل جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ کتابیں وہ ہیں جو سندھ میں سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اصل تصانیف کا درجہ رکھتی ہیں۔ متذکرہ کتاب تیسری صدی ہجری کے مشہور محدث امام ترمذی کی شمائل نبویؐ عربی کا منظوم سندھی ترجمہ ہے۔ اصل کتاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ، اسوۂ حسنہ اور اخلاق وعادات پر دنیا کی مستند ترین کتاب ہے اور عربی مدارس کے نظام میں بھی داخل ہے، اس کتاب کی کئی شرحیں عربی میں لکھی گئیں اور اس کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی اس کے تراجم ہوئے۔ یہ منظوم ترجمہ "لاڑی سندھی" میں مخدوم عبدالسلام نے ۱۱۷۹ھ میں کیا۔ اس کا مطبوعہ نسخہ ڈیمی سائز میں ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور بمبئی سے شائع ہو چکا ہے۔

۸۔ شمائلِ نبوی ـ سندھی ترجمہ : اس کے مترجم مولانا محمد ٹھٹوی ہیں۔ یہ ترجمہ سندھی

نثر میں ہے اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ مولانا محمد بھنوی فاضل دیوبند اور عربی، فارسی اور سندھی کے ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے، ان کے کئی قصائد ان زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں، وہ رسالہ توحید کراچی کے لیے جو مولانا دین محمد وفائی کی زیر ادارت نکلتا تھا خاص طور پر شعر کہتے تھے اور راقم الحروف (غلام مصطفےٰ قاسمی) کے بہت گہرے دوست تھے۔ انھوں نے شمائل نبوی کا یہ ترجمہ مجھے دکھایا تھا جو نہایت عمدہ ہے۔ مولانا صاحب کا انتقال تین چار سال قبل ہوا ہے۔

۹۔ شمائل نبوی ـــ سندھی ترجمہ: اس کے مترجم مولانا عبد الکریم صاحب بیر شریف والے ہیں۔ یہ صرف ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ شمائل نبویؐ کی سندھی نثر میں مفصل عالمانہ شرح ہے۔ مولوی عبد الکریم صاحب نہ صرف علوم ظاہری کے ہی عالم ہیں بلکہ سندھ میں قادریہ راشدیہ سلسلے کے پیر طریقت بھی ہیں۔ یہ ترجمہ دو دفعہ شائع ہوا ہے اور اب نایاب ہے۔

۱۰۔ پیغمبر اسلام: (سندھی میں اس کتاب کا نام اسلام جو پیغمبر ہے) اس کے مصنف ہوتچند ڈیٹو مل جگتیانی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر نہ صرف مسلمان عالموں نے بلکہ غیر مسلموں نے بھی کافی کچھ لکھا ہے۔ سندھ کے ہندو جو یہاں کے کئی اولیا اور صوفیا کے مرید تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و صلوٰۃ پڑھتے تھے اور انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی عقیدت تھی۔ سندھ کے قدیم شہروں جھوک، درازا اور نوشہرو کی درگاہیں اس کے لیے کافی ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ یہ کتاب اسی جذبے کے تحت سندھ کے ایک ہندو عالم کی تحریر کردہ اور ۴۲ صفحات پر مشتمل کافی عرصہ قبل شائع ہوئی تھی۔

۱۱۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ: تالیف مولانا دین محمد وفائی۔ مطبوعہ ۱۹۳۰ء۔ مولانا دین محمد وفائی سندھی کے ایک بہترین ادیب اور عالم تھے، ان کا طرز تحریر نہایت درجہ سادہ اور عام فہم تھا۔ یہ سیرت مجمل انداز میں لکھی گئی ہے اور اس کے ۹۲ صفحات ہیں۔

۱۲۔ حیات النبیؐ: تالیف حکیم فتح محمد سیوہانی۔ حکیم صاحب کے طرز تحریر کا، مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ایک خاص انداز تھا، انھوں نے کافی تفصیل سے یہ کتاب لکھی ہے اور اسے سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے۔

۱۳۔ اخلاق محمدیؐ: یہ کتاب بھی حکیم فتح محمد سیوہانی کی تحریر کردہ ہے اور اصل میں ان کی مولانا

کتاب حیات النبی کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ کتاب کافی عرصہ قبل شائع ہوئی تھی اور اب اسی سال سندھی ادبی بورڈ نے سیرۃ النبی پر اس اہم کتاب کو حکیم صاحب مرحوم کے فرزند حکیم محمد احسن سے حاصل کر کے دوبارہ عمدہ ٹائپ اور گٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۱۴۔ ہمارے پیارے آقاؐ (سندھی): تالیف مخدوم محمد صالح بھٹی، ۹۶ صفحات، کراؤن سائز کافی عرصہ قبل شائع ہوئی۔

۱۵۔ ہمارے پیارے نبیؐ: تالیف قاضی عبدالرزاق، ۴۸ صفحات۔ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔

۱۶۔ انیس العاشقین عرف معجزات: مرتبہ سید حسن علی شاہ۔ ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۷۔ حالات نبویؐ: مرتبہ علی خان ابڑو۔ ۹۴ صفحات، کراؤن سائز میں طبع ہوئی۔

۱۸۔ رسول کریمؐ: تالیف میر گل حسن، ۷۲ صفحات، کراؤن سائز میں طبع ہوئی۔

۱۹۔ رسول مقبولؐ: مرتبہ حبیب اللہ بھٹو۔ ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۰۔ سیرت النبیؐ: جلد اول و دوم۔ تالیف مولانا فضل احمد غزنوی۔ ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۱۔ سیرت رسولؐ: مرتبہ مولوی نثار احمد۔ ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۲۔ سیرۃ مصطفیٰؐ: تالیف مولانا محمد عظیم شیدا۔ مولانا شیدا سندھ کے ایک بلند مرتبہ عالم اور شاعر ہیں۔ انھوں نے نہایت عقیدت سے اور کافی مفصل یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے مسودے پر مخدوم امیر احمد مرحوم نے نظر ثانی کی تھی اور اس کتاب کے بارے میں اپنی عالمانہ رائے دی، اس کتاب کو عمدہ طریقے پر سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے۔

۲۳۔ محسن اعظم اور محسنین (سندھی): مترجم رشید احمد لاشاری، یہ کتاب اردو میں فقیر وحید الدین نے لکھی اور اس کا سندھی ترجمہ سندھ کے ایک عالم اور شاعر مرحوم رشید احمد لاشاری نے کیا۔ یہ کتاب ڈیمی سائز میں ۴۱۲ صفحات پر مشتمل اور آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہے۔

۲۴۔ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم: تالیف علی محمد راہو۔ سیرت پاک پر یہ کتاب سندھی میں رابطہ عالم اسلامی کے لیے لکھی گئی ہے۔ کتاب کا انتساب شاہ خالد بن عبدالعزیز کے نام ہے تاریخ تالیف ۲۲ نومبر ۱۹۷۶ء ہے۔ ابتدا میں عربی قصیدہ اور اس کا آسان سندھی ترجمہ ہے۔ اس کے بعد تمہید، عظمت، اسوۂ حسنہ، اور ابتدائے آفرینش کے عنوانات کے تحت حضرت آدم علیہ السلام

سے ابتدا کی گئی ہے ۔ ابھی تک صرف جلد اول ہی شائع ہوئی ہے ۔ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی تک کا حال درج ہے ۔ ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور جگہ جگہ حوالے درج ہیں ، زبان سادہ ، آسان اور عمدہ ہے ۔ کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے آج تک سندھ کے دینی ادب میں ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے ۔ کتاب کا سائز ۲۰ × ۳۰ / ۸ ہے ۔ مولف نے اس کتاب کے لکھنے میں بڑی محنت کی ہے ۔

۲۵۔ سیرۃ طیبہ ۔ حرم سے حرم تک ؛ مولفہ پروفیسر کریم بخش نظامانی ، ناشر سندھ اسلامک پبلی کیشنز حیدر آباد سندھ ۔ سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سندھی میں یہ کتاب آفسٹ پر سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس کراچی سے طبع کروا کر حیدر آباد سندھ سے شائع کی گئی ہے ۔ یہ کتاب ڈیمی سائز کے ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے قبا تک پہنچنے کا حال تفصیل سے دیا گیا ہے اور اس لحاظ سے یہ پہلی جلد ہے ۔ پروفیسر کریم بخش نظامانی صاحب فن تقریر میں مہارت تامہ رکھنے کے ساتھ ہی فن تحریر کے بھی ایک زبردست شہسوار نظر آتے ہیں ۔ یہ کتاب کافی محنت اور محبت کے جذبے کے تحت لکھی گئی ہے ۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی چند مطبوعات

مجموعہ تفاسیر ابو مسلم اصفہانی از سید نصیر شاہ و محمد رفیع اللہ	قیمت ۵/= روپے
گلستانِ حدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	۱۲/= روپے
انتخابِ حدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	۲۷/۵۰ روپے
مقامِ سنت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	۲/۵۰ روپے
معارف الحدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	۱۲/= روپے
مسئلہ اجتہاد از مولانا محمد حنیف ندوی	۵/= روپے
اجتہادی مسائل از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	۶/= روپے
کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	۳/= روپے

ڈاکٹر محمد ریاض

علامہ میرزا محمد خان قزوینی

ایک نامور ایرانی محقق کی حیات اور تحقیقات

میرزا محمد خان کو ابتدا میں "شیخ محمد خان" بھی کہتے تھے۔ آپ ۱۸۷۷ء میں تہران میں متولد ہوئے اور ۲۷ مئی ۱۹۴۹ء کو تقریباً ۷۳ برس کی عمر میں یہیں انتقال فرمایا۔ ان کی زندگی کے ۳۶ سال یورپ میں گزرے۔ تدریس و تحقیق آپ کے مشاغل تھے اور میدانِ تحقیق میں آپ بلا نزاع معاصر ایرانی محققین کے سرخیل رہے ہیں۔ آپ نے عمدہ تحقیقات کے آداب اور نمونے ہی فراہم نہیں کیے بلکہ اس کام کے لیے لوگوں میں مناسب شوق اور جذبہ بھی پیدا کیا۔ کئی عربی اور فارسی کتابیں آپ کے مقالات کی راہنمائی کی روشنی میں گوشۂ گمنامی سے نکل کر طبع ہوئی ہیں۔ آپ درحقیقت محقق پرور اور ادیب آموز تھے۔ معاصرین میں کتنی چشمکیں اور رنجشیں ہوا کرتی ہیں مگر علامہ قزوینی کی وسعتِ ظرف اور اخلاق قابلِ تحسین ہے کہ نہ انھوں نے کسی کی برائی کی اور نہ کسی نے ان کی۔ علم و دانش کے معاملے میں انھوں نے کبھی بخل کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ کسی نے زبانی یا تحریری طور پر جو پوچھا، اپنی انتہائی معلومات کے مطابق اسے بتا دیا۔ اس طرح اپنے تسامحات اور اغلاط کو انھوں نے ہمیشہ شکریے کے ساتھ قبول کر لیا[۱]۔ سطورِ ذیل کے ذریعے ہم اس سراپا علمی اور ادبی شخصیت کی حیات اور تحقیقات کا ایک اجمالی تعارف پیش کرتے ہیں۔

ابتدائی زندگی

۱۹۲۴ء میں احباب کے اصرار پر محمد قزوینی مرحوم نے اپنی سوانحِ حیات لکھے جو "بیست مقالہ قزوینی" (تعارف آگے آرہا ہے) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس مقالے میں موصوف کے اس وقت کے حالاتِ زندگی اجمالی طور پر موجود ہیں، مگر اپنی کتابوں اور مقالوں کے سلسلے میں انھوں نے روایتی مشرقی انکساری سے کام لیا ہے۔ اس مقالے کے بموجب آپ کے والد کا نام عبدالوہاب قزوینی تھا اور آپ نے ۱۸۹۸ء

---

[۱] دیکھیے ماہنامہ یغما تہران جون ۱۹۴۹ء اور مئی ۱۹۵۰ء میں "یادے از علامہ قزوینی" کے عنوان سے مقالے۔

میں تہران میں انتقال کیا۔[۹۱] "نامۂ دانشوران ناصری" کی پہلی دو جلدوں کی تالیف میں ان کے والد بھی شریک تھے، اور انھوں نے ناصرالدین شاہ قاچار (۱۸۴۸ - ۱۸۹۶ء) کے عہد کے بعض نامور نحویوں، لغت شناسوں، فقیہوں اور ادیبوں کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں[۹۲] محمد حسن خاں اعتماد السلطنۃ کی کتاب "المآثر والآثار" کی تالیف میں بھی ان کے والد شریک رہے ہیں - عبدالوہاب عربی صرف و نحو میں متبحر تھے، اور یہ ملکہ انھوں نے اپنے بیٹے میں بھی پیدا کیا۔ علامہ قزوینی نے ابتدا میں اپنے والد اور دیگر معروف اساتذہ سے معقول و منقول علوم سیکھے - ان کے درس میں عربی صرف و نحو، فقہ، علمِ کلام، منطق و فلسفہ اور فارسی ادب شامل تھے۔ حاج شیخ ہادی نجم آبادی، سید احمد ادیب پشاوری، شمس العلما شیخ محمد مہدی قزوینی، میرزا محمد حسین خان فروغی اصفہانی، ذکاء الملک اور حاج شیخ فضل اللہ نوری سے خاص طور پر استفادۂ علمی کرنے کا انھیں اعتراف ہے - انھوں نے میرزا محمد علی خان "ذکاء الملک" کو عربی پڑھائی اور ان سے فرانسیسی سیکھی - مگر وہ خاص طور پر سید احمد ادیب پشاوری کے مدیون تھے - وہ اپنے استاد کی قوتِ حافظہ کو عربی شعرا حماد راویہ اور ابوالعلا معری کی قوائے حافظہ سے تشبیہ دے کر لکھتے ہیں کہ عربی نحو میں ان کا خصوصی تبحر اسی استاد کا مرہونِ منت ہے -

عربی، فارسی اور فرانسیسی زبانوں میں کمال حاصل کر کے اور معقولات و منقولات میں فارغ التحصیل ہو کر، محمد قزوینی تہران کے مختلف مدارس میں فرائض تدریس انجام دیتے رہے - ابتدا میں انھوں نے چند کتابیں اور مقالے عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ بھی کیے - ان میں ایک "کتاب الآیات البیّنات فی غرائب الارض والسّمٰوات" ہے جس کا فارسی ترجمہ "غرائب زمین و عجائب آسمان" کے عنوان سے انھوں نے ۱۸۹۸ء میں شائع کروایا۔ یہ مشہور لبنانی مصنف ابراہیم حورانی (۱۸۴۴ - ۱۹۱۶ء) کی کتاب ہے جو ۱۸۸۳ء میں قاہرہ میں شائع ہوئی تھی - فارسی ترجمے پر میرزا محمد حسین خان ذکاء الملک فروغی نے نظرِ ثانی کی اور ایک مقدمہ بھی تحریر کیا تھا، مگر اس کم عمری میں عربی کی ایک خاصی فنی کتاب کا فارسی ترجمہ پیش کرنا مترجم کی قوتِ بیان کا غماز ہے۔ علامہ قزوینی کے برادرِ خرد، میرزا احمد خان قزوینی اپنے کچھ کاروبار اور ملازمت کے سلسلے میں انگلستان چلے گئے تھے[۹۳]

---

۹۱ نامہ دانشوران کی ۹ جلدیں ہیں اور قُم سے شائع ہو چکی ہیں -

۹۳ بعد میں آپ ایران لوٹ آئے اور وزارتِ مالیات میں ایک افسر ہو گئے تھے۔

اپنے بھائی کی تحقیق و تدقیق کے شوق کو دیکھ کر انھوں نے لکھا کہ اگر آپ یورپ آجائیں تو یہاں کے منظم اور مرتب کتب خانوں کے ذریعے فارسی ادب کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں قلمی کتابوں سے بھی بآسانی استفادہ کیا جا سکتا ہے، بھائی کی یہ دعوت ہی ان کے سفرِ یورپ کا بہانہ بنی تھی۔

انگلستان، فرانس اور جرمنی میں

قزوینی نے تقریباً نصف زندگی یورپ میں گزاری۔ وہ ۱۹۰۴ء میں لندن گئے۔ دو سال وہاں رہے اور اس کے بعد پیرس آ گئے۔ کوئی ساڑھے چار سال کی مدت کے لیے وہ برلن بھی گئے۔ اس کے علاوہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی گھومتے رہے۔ وہ ۳۶ سال کے بعد ۱۹۳۹ء میں مستقل طور پر رہنے کی نیت سے تہران لوٹ آئے تھے۔ یورپ کے قیام کے دوران میں ہی انھوں نے ایک اطالوی خاتون سے شادی کی۔ ان کے ہاں نرینہ اولاد نہیں ہوئی، ایک ہی بیٹی ہوئی، جو ابھی حیات ہیں، ان کا نام ناہید ہے۔

یورپ کا نام قزوینی مرحوم کے لیے کئی جہات سے سود مند رہا۔ انھوں نے وہاں انگریزی اور روسی زبانیں سیکھیں اور وہاں کے کتب خانوں سے جی بھر کر استفادہ کیا۔ مستشرقین کی صحبت کے نتیجے میں انھوں نے ترقی یافتہ تحقیق و تنقید کے اسالیب اپنائے، اور اپنی کتابوں کے ذریعے انھیں دیگر ایرانیوں میں متعارف کروایا۔ بیون، امدروز، الس، براؤن، نکلسن، دیرن بورگ، باربیامینار، میلے اور کلیمنٹ ہوارٹ نام کے انگریز اور فرانسیسی مستشرق ان کے دوست رہے ہیں۔ ایڈورڈ براؤن سے ان کی خصوصی دوستی تھی۔ مسعود سعد سلمان لاہوری پر قزوینی کے فارسی مقالے کو براؤن نے انگریزی میں ترجمہ کر کے لیڈن سے شائع کروایا تھا۔ براؤن کی "تاریخ ادبیاتِ ایران" کی چار جلدوں میں کئی مقامات پر محمد قزوینی کا ذکر آیا ہے اور مؤلف نے کئی امور کے سلسلے میں ان کی آرا کو نقل کیا ہے۔

۵ جنوری ۱۹۲۶ء کو جب ۶۴ سال کی عمر میں براؤن نے انتقال کیا، تو قزوینی نے آں جہانی کی شخصیت اور خدمات کے بارے میں ایک مبسوط مقالہ لکھا جو "بیست مقالہ" میں شامل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قزوینی کی یورپ میں تدریسِ فارسی اور ادارہ گب میموریل سے ان کا ارتباط، براؤن کی مساعی سے عمل پذیر ہوا تھا۔ براؤن، گب اوقاف کے ٹرسٹیوں میں شامل تھے، اور ان کی تجویز پر محمد قزوینی نے کئی کتابیں مرتب کیں اور مذکورہ اوقاف (میموریل) کی طرف سے شائع ہوئیں۔

قزوینی لکھتے ہیں کہ "لندن کے کتب خانے دیکھ کر (بالخصوص عربی اور فارسی وغیرہ زبانوں میں قلمی

مخطوطات کے ذخائر سے) میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ زندگی یہیں گزاروں گا، مگر ایرانی "جلاوطن شدگان" فضلا کی پیرس میں موجودگی نے مجھے" بعد میں ادھر کھینچ لیا، اور وہاں کے کتب خانے بھی ویسے ہی پرکشش تھے۔" بیسوی صدی عیسوی کے اوائل میں ایران میں، یاد رہے کہ مشروطہ (آئینی حکومت) کا مطالبہ زوروں پہ تھا اور قاچاری استبدادی حکومت نے سینکڑوں حریت خواہوں کو مصلوب کروایا، جیل بھجوایا یا ملک بدر کروا دیا تھا۔ مؤخر الذکر گروہ میں سے میرزا علی اکبر خان دہخدا (علامہ دہخدا) کچھ عرصہ پیرس میں رہے، حسین کاظم زادہ ایرانشہر سوئٹزرلینڈ میں اور سید حسن تقی زادہ جرمنی میں۔ اس دوران کئی سیاسی اور ادبی فارسی رسالے ایرانیوں نے دوسرے ممالک سے جاری کر رکھے تھے جن میں حسین کاظم زادہ ایرانشہر کے مجلہ "ایرانشہر" اور سید حسن تقی زادہ کے رسالہ "کاوہ" کو فارسی ادبیات میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ علامہ قزوینی کے متعدد مقالے ان ہی دو مجلوں میں شائع ہوتے۔ ایران میں ان کے بیشتر مقالے مجلہ یادگار، مہر، ارمغان، آموزش و پرورش، شرق اور علوم مالیہ و اقتصاد شائع ہوئے ہیں۔

علامہ قزوینی کے قیام یورپ کے ضمن میں اوپر لکھا گیا ہے کہ آپ کوئی دو سال لندن میں رہے اور اس کے بعد پیرس آ گئے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران انھیں پیرس میں رہنا مشکل ہو گیا، کیونکہ ایسے اوقات میں غیر ملکی باشندوں سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے اور خاموشی سے علمی کام کرنے والوں پر جاسوسی کے شبہے کا امکان ہوتا ہے۔ ان حالات میں آپ اپنے دوست حسین علی خان نواب کے جو برلن کے ایرانی سفارت خانے میں وزیر مختار تھے، مہمان بن کر برلن چلے گئے۔ (۲۳ اکتوبر ۱۹۱۵ء) اور اگرچہ ان کا ارادہ تھا کہ وہاں صرف دو تین ماہ رہیں گے، مگر جنگ کے خاتمے تک مجبوراً وہ اسی ملک میں رہے۔ وہاں ان کے اصلی میزبان سید حسن تقی زادہ تھے (مدیر مجلہ کاوہ)۔ ایران چونکہ جنگ میں غیر جانب دار تھا، اس لیے اس ملک کے باشندوں پر جرمنی کی حکومت نے کوئی خاص سختی نہ کی، مگر جنگ کے نتیجے میں جو ناگزیر مصائب ہر کسی کو جھیلنے پڑتے ہیں، وہ جناب محمد قزوینی نے بھی جھیلے۔ اس وقت سید محمد علی جمال زادہ، میرزا ابراہیم پور داؤد، مجتہد تبریزی، سید محمد رضا مساوات اور میرزا محمد علی خان تربیت، ایسے فضلا برلن میں موجود تھے۔ علامہ قزوینی نے اپنے 'سوانحی مقالے' میں وہاں کی بعض ادبی محافل کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں سرہ نویسی؛ (یعنی عربی کلمات سے منزہ اور معرّیٰ فارسی لکھنا) کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ قزوینی معتدل فکر و نظر کے حامل تھے، اور عربی کلمات کے فارسی ادبیات سے اخراج کے سخت مخالف تھے، مگر پور داؤد

اس نظریے کے سخت حامی۔ (یہ وہی پورداؤد ہیں جنھوں نے ۱۹۳۲ء میں بمبئی کے ایک ادبی جلسے میں علامہ اقبال کی فارسی شاعری کو ادنیٰ اور معمولی قرار دے کر ایک فتنہ پیدا کیا تھا) لکھتے ہیں :

"میرزا ابراہیم پورداؤد، موجودہ زمانے کے با استعداد شعرا میں سے ہیں۔ خالص فارسی میں شعر کہتے ہیں اور ان کا اسلوب بھی نادر ہے مگر عرب نسل، عربی زبان اور عربوں کی ہر چیز کے خلاف خاصا تعصب رکھتے ہیں۔ خواجہ حافظ کا ایک معروف شعر ہے:

اگرچہ عرضِ ہنر پیشِ یار بے ادبی است   زبان خموش ولیکن دہان پر از عربی است

آپ اس شعر پر سخت تنقید کرتے تھے کہ حافظ نے "عربی" کو فن کی خوبی کیوں قرار دیا ہے؟"

مستشرقین کے بارے میں علامہ قزوینی نے چند نکات بیان کیے ہیں۔ بعض مستشرقین کی معلومات واقعی رشک کے قابل ہیں مگر بعض نام نہاد مشرق شناس ہیں، ان کے پاس اسناد ہیں، مگر اکثر امتحان لینے اور دینے والے دونوں علومِ مشرقی سے کورے ہیں، اس لیے ان کے عہدے لکھے ہوئے دیکھ کر کہ "یہ استادِ زبانہائے شرقی ہے، یا وہ ڈائرکٹر تحقیقاتِ شرقی" مرعوب نہ ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کا مطالعہ ناقص اور منتخب موضوعات پر ہے۔ قزوینی یورپ کی تحقیقاتِ شرقی اور مستشرقین کی زبان دانی کے چند دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان لوگوں کی بد ذوقی یہ ہے کہ جو لکھتے ہیں، بلا تامل چھپوا دیتے ہیں، ٹوٹی پھوٹی زبان بولنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے، انتقاد کو برا نہیں مانتے اور تالیف و تحقیق کے سلسلے میں ایک خاص قسم کی خود اعتمادی رکھتے ہیں۔

ایامِ آخر

محمد قزوینی صاحب پیرس میں مقیم تھے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ اس دفعہ آپ کے لیے وہاں رہنا اور بھی مشکل تھا، اس لیے ناچار تہران لوٹ آئے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد آپ وہاں پھر گئے اور اپنی کتابیں وغیرہ ساتھ لے کر دوبارہ تہران آ گئے۔ ۱۹۳۴ء میں ایران کی پہلی یونیورسٹی "دانش گاہِ تہران" قائم ہو گئی تھی اور علامہ قزوینی نے اپنی ہزاروں قیمتی اور نایاب کتابیں اس دانش گاہ کے "دانش کدۂ ادبیات" کو ہدیہ کر دیں۔ حکومتِ ایران کے اربابِ بست و کشاد کی خواہش تھی کہ قزوینی دانش گاہِ تہران میں تدریس بھی کریں۔ اس مقصد کے لیے ایران کی قومی اسمبلی سے ایک نیا قانون منظور کروایا گیا جس کے مطابق نامور فضلا کے لیے یونیورسٹی میں تدریس کرنا، اسناد اور عمر کے تقاضوں کا لحاظ کیے بغیر

آسان ہوگیا۔ علامہ قزوینی کے بعد کئی دیگر حضرات اس رعایت سے استفادہ کر رہے ہیں کہ یونیورسٹی اکیڈمک کونسل کی سفارش پر ایم۔ اے یا پی ایچ ڈی کی اسناد کے بغیر اور ۶۵ سال سے بھی زیادہ عمر ہونے پر وہ وظائفِ تدریس انجام دینے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ قزوینی مرحوم تحقیق و تدریس انجام دے ہی رہے تھے کہ وفات پاگئے۔ آپ شہر رے میں مشہور مفسر قرآن ابوالفتوح رازی کے مزار (منطقہ حضرت شاہ عبدالعظیم) کے جوار میں دفن ہوئے ہیں۔ ان کی وفات پر ایران کے متعدد مشاہیر، جیسے ڈاکٹر عباس اقبال آشتیانی، استاد حبیب یغمائی، استاد سید محمد محیط طباطبائی اور ڈاکٹر علی اکبر سیاسی نے مفصل تعزیتی مقالے لکھے اور نامور شعرا نے مرثیے[۵۴]۔ استاد بدیع الزمان فروزانفر نے بھی ان کی وفات پر ایک زوردار مرثیہ کہا تھا۔

ایک خاص خدمت

علامہ قزوینی نے قیامِ یورپ کے دوران ایران کے لیے ایک خاص خدمت یہ انجام دی کہ انگلستان، فرانس، جرمنی، روس اور مصر وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود عربی اور فارسی کے اہم مخطوطات کے عکس حاصل کیے اور انھیں ایران کی وزارتِ تعلیم کے حوالے کیا۔ (درحقیقت ان کی تجویز پر وزارتِ تعلیم نے ضروری رقم پہلے فراہم کردی تھی)۔ اسی طرح بعد میں استاد مصطفیٰ مینوی نے ترکی کے کتب خانوں میں موجود اہم عربی اور فارسی قلمی نسخوں کی نقول حاصل کی تھیں، اور یہ سب اب تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے کی زینت ہیں۔ سات آٹھ طبقات پر مشتمل یہ کتب خانہ اب دنیا کا ایک اہم کتب خانہ مانا جانے لگا ہے، اور اس کی شہرت میں علامہ قزوینی ایسے مشاہیر کی مساعی کو خاص دخل ہے۔

تحقیقات

محمد قزوینی کی تحقیق و تالیف کی چند خصوصیات یہ تھیں۔ آپ کسی موضوع پر انتہائی ممکنہ معلومات حاصل کیے بغیر قلم نہیں اٹھاتے تھے۔ لکھتے وقت آپ حافظے پر اعتماد نہیں کرتے تھے، مآخذ و منابع کو سامنے رکھتے تھے۔ امانتِ علمی کا آپ پورا پاس رکھتے تھے اور تحقیق میں ذاتی پسند و ناپسند کے مطابق بات نہیں کرتے تھے۔ آپ نے ازخود یا بعض احباب کے کہنے پر کئی کتابوں پر تبصرے لکھے۔ شرق و غرب کے متعدد فضلا کی وفات پر آپ نے تعزیتی مقالے ارقام کیے۔ اپنے مطالعے کے دوران آپ مختلف لغوی، تاریخ

---

۵۴ علامہ قزوینی (کتابچہ، ۸۸ صفحے؛ تہران جون ۱۹۴۹ء - (یہ کتابچہ ایران کی وزارتِ تعلیم نے شائع کیا تھا)۔

ادبی، دینی اور فنی موضوعات پر یادداشتیں حروفِ ہجا کی ترتیب سے لکھتے رہے ۔ ان یادداشتوں میں انھوں نے بعض اپنی تحقیقات کی بھی اصلاح کی ہے ۔ ان یادداشتوں کی چار قلمی جلدیں تھیں مگر استاد ایرج افشار نے مؤلف کی وفات کے بعد جب انھیں تہران یونیورسٹی کی طرف سے شائع کروایا (۱۹۳۱ء تا ۱۹۶۶ء سالوں میں) تو ان کے ۹ مجموعے بن گئے ۔ عربی سے ترجمہ کی ہوئی ان کی کتاب "غرائب زمین و عجائب آسمان" کا ذکر ہو چکا ہے ۔ مسعود سعد سلمان لاہوری پر ان کے محولہ بالا مقالے سے استاد رشید یاسمی نے اپنے "دیباچہ، دیوان مسعود بن سعد" میں استفادہ کیا ہے ۔ اوپر اشارہ ہوا ہے کہ قزوینی نے بعض ایسی کتابوں کی ضرورت طبع پر زور دیا ہے جو کسی خاص اہمیت کی حامل تھیں، اور متعدد فضلا نے ایسی کتابوں کو بعد میں شائع کروایا ۔ مجمل التاریخ والقصص کو ملک الشعرا محمد تقی بہار مشہدی نے شائع کروایا ۔ تاریخ سیستان بھی ان کے ہاتھوں طبع ہوئی ۔ تتمہ صوان الحکمہ کو ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے لاہور سے شائع کروایا ۔ (نا معلوم انھیں بھی قزوینی کی اس کتاب کے بارے میں متعدد مقالات نے تحریک کیا تھا یا نہیں ؟) ۔ ۱۹۰۸ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے لیڈن سے راوندی کی کتاب "راحۃ الصدور وآیۃ السرور" کو شائع کروایا، تو قزوینی نے اس پر ایک توصیفی تبصرہ کیا اور چند تسامحات کی طرف توجہ دلائی ۔ ابوحیان توحیدی[۵۵] کے بارے میں مفصل تحقیقات اور زین الاخبار گردیزی[۵۶] کی موضح طباعت ان کی تجاویز کے مطابق ہے ۔ فارسی شاعری کے آغاز کے بارے میں استاد ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا وغیرہ نے اپنی ادبی تاریخ میں جو کچھ لکھا، وہ قزوینی کے مقالات سے مستفاد ہے ۔ اس توضیح کے بعد ہم ان کی شائع کردہ بعض کتب اور مقالات کی فہرست دے رہے ہیں ۔

مرزبان نامہ مولفہ سعد الدین وراوینی شائع شدہ لیڈن ۱۹۰۸ء ۔ کتاب مرزبان نامہ، کلیلہ و دمنہ کی مانند ہے جس میں جانوروں اور پرندوں کی زبانی حکمت کی باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ یہ کتاب ترکی اور عربی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے ۔ اسے مرزبان بن رستم نے چوتھی صدی ہجری میں ... لہجے میں لکھا اور ساتویں صدی ہجری میں سعد الدین وراوینی نے اسے مسجع فارسی میں لکھا ۔ علاوہ قزوینی کا طبع کردہ متن کئی بار چھپ چکا ہے ۔

---

۵۵ ابوحیان توحیدی کی حیات و تالیفات پر ڈاکٹر خدامراد مرادیاں استاد عربی تہران یونیورسٹی نے مفصل تحقیقات کیں اور ان کی کتاب بنیاد نکوکاری نوریانی نے ۱۹۷۲ء میں تہران سے شائع کر دی ہے ۔

۵۶ اس تاریخ کو کئی بار شائع کیا گیا، مگر استاد عبدالحی حبیبی افغانی کا مرتبہ متن جسے ۱۹۶۶ء میں بنیاد فرہنگ نے تہران سے شائع کیا، بہتر مانا جاتا ہے ۔

(استاد ڈاکٹر خلیل خطیب رہبر آج کل اس کتاب کا ایک دوسرا متن شائع کروا رہے ہیں - اس میں عربی جملوں اور اشعار کے فارسی معانی حاشیوں میں درج ہوں گے - اس سے قبل وہ اسی طرح "گلستان" شائع کروا چکے ہیں)۔

المعجم فی معاییر اشعار العجم از شمس الدین محمد بن قیس رازی (ساتویں صدی ہجری کے مصنف) فارسی عروض اور اوزان کی بنیادی کتاب ہے - گب میموریل نے ۱۹۰۹ء میں اسے بیروت سے شائع کروایا تھا۔

چہار مقالہ از نظامی عروضی سمرقندی (چھٹی صدی ہجری کے مؤلف) جسے علامہ قزوینی نے ۱۹۰۹ء میں لیڈن سے شائع کروایا ہے۔

وجہ دین از ناصر خسرو قبادیانی (م ۴۸۱ھ) - یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں برلن سے شائع ہوئی۔ سید حسن تقی زادہ مرحوم (م ۱۹۷۰ء) نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔

سیاست نامہ از خواجہ ابو علی حسن نظام الملک طوسی (م ۴۸۵ ہجری)، طبع پیرس ۱۹۰۷ء

تذکرہ لباب الالباب از محمد عوفی بخارائی - طبع لیڈن (جلد اول ۱۹۱۱ء) - عوفی نے یہ تذکرہ ۶۲۷ھ میں اُچ (بہاولپور) میں سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار میں لکھا تھا - اس تذکرے کی جلد دوم کو پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے اس سے قبل شائع کر دیا تھا۔

تاریخ جہانگشا از عطا ملک جوینی (م ۶۸۱ھ) - چنگیز خانیوں کی اس تاریخ کی تینوں جلدیں لیڈن سے شائع ہوئی ہیں۔ (اول ۱۹۱۲ء، دوم ۱۹۲۱ء، سوم ۱۹۳۷ء)۔

لوائح جامی کا فرانسیسی ترجمہ (پیرس ۱۹۰۹ء) - اسی متن کی مدد سے ای - ایچ - ونفیلڈ نے لوائح جامی کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع کروایا۔ (اورینٹل ٹرینسلیشنز طبع اول ۱۹۱۱ء)۔

تذکرۃ الاولیا (دو جلد) از عطار نیشاپوری طبع لیڈن ۱۹۰۵ء جلد اول، ۱۹۰۷ء جلد دوم (تصحیح ڈاکٹر رینولڈ ایلن نکلسن کی ہے اور حواشی قزوینی کے)۔

ممدوحین شیخ سعدی (سعدی نامہ طبع تہران ۱۹۳۷ء میں شامل مبسوط مقالہ)۔

مقدمہ در شرح حال جمال الدین حسین ابوالفتوح رازی (تفسیر روض الجنان و روح الجنان جلد پنجم طبع تہران ۱۹۴۱ء کا ضمیمہ)۔

نفثۃ المصدور از محمد بن احمد نسوی پر تبصرہ تہران ۱۹۲۹ء - اصل کتاب کو استاد عباس اقبال آشتیانی نے ایک سال قبل تہران سے شائع کروایا تھا - علامہ قزوینی نے خوارزم شاہیوں کے سلسلے کے آخری بادشاہ سلطان

جلال الدین منکبرنی کے اس منشی (محمد بن احمد نسوی) کی عربی تالیف سیرۃ جلال الدین منکبرنی کے مقابلے سے، جو سات سال بعد لکھی گئی تھی تبصرے کا حق ادا کر دیا۔ سیرۃ جلال الدین منکبرنی ۱۸۹۱ء میں پیرس سے پہلی بار شائع ہوئی تھی اور اس کا اور نفثۃ المصدور کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے۔

دیوان خواجہ حافظ شیرازی (با ہمکاری ڈکٹر قاسم غنی) تہران، ۱۹۴۱ء

شدّ الازار و حطّ الاوزار عن زوّار المزار مولفہ معین الدین جنید شیرازی در ۷۹۱ھ۔ کتاب شیراز کے مشاہیر کے مزارات کے بارے میں ہے اور استاد عباس اقبال کی ہمکاری سے ۱۹۴۹ء میں تہران سے طبع ہوئی۔

عتبۃ الکتبہ از اتابک منتخب الملک جوینی (سلطان سنجر سلجوقی از ۵۱۲ تا ۵۵۲ھ کا درباری منشی) مراسلت کی یہ کتاب قزوینی کی وفات کے ایک سال بعد ۱۹۵۰ء میں تہران سے شائع ہوئی۔ اسی طرح فصیح خوافی کی مجمل التواریخ و امین احمد رازی کی ہفت اقلیم بھی۔ ان تینوں کتابوں میں استاد عباس اقبال آشتیانی مرحوم (م ۱۹۵۶ء) بھی شریک تالیف و تحشیہ رہے ہیں۔

مقدمہ بر التوسل الی الترسیل تالیف بہاء الدین محمد (قرن ششم ہجری کے ایک مؤلف)۔ کتاب استاد احمد بہمنیار نے مرتب کی اور علامہ قزوینی نے اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔

بیست مقالہ (در دو جلد) جلد اوّل ۱۹۲۸ء میں استاد پور داؤد نے بمبئی سے شائع کی اور جلد دوم ۱۹۳۴ء میں استاد عباس اقبال نے تہران سے۔ اس کے بعد اس کی جداگانہ اور یکجا جلدیں متعدد بار تہران سے شائع ہوتی رہی ہیں اور دونوں جلدوں کے مجموعاً کوئی ۶۰۰ صفحات ہیں۔ مقالے ۴۰ سے زیادہ ہیں، اور چند کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

حقائق الادویہ، مطبوعات جدیدۂ ملوک عرب، زبان باستان آذربائیجان، شاہنامہ پیش از فردوسی، ابوحیان توحیدی، ابوسلیمان منطقی و تالیفات وی، کتاب الابنیہ، ملوک آل باوند، تاریخ بیہقی، دربارۂ بہزاد، مطبوعات جدیدۂ فارسی وفات استاد ادوارد براون انگلیسی او تبصرہ بر مونس الاحرار ۵؎

۵؎ علامہ قزوینی کی کتب اور بعض مقالات کا ذکر متن میں ہی دیکھ لیا جائے۔

مولانا رومی — حیات و افکار

ترجمہ از جناب بشیر محمود اختر

مولانا جلال الدین رومی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ تصوف و طریقت، دعوت و ارشاد اور انسانی نفسیات کے فہم و ادراک میں اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے نہایت عمدہ انداز سے مختلف مسائل کی گرہ کشائی کی اور بہترین اسلوب سے فرد اور معاشرے کے مسائل کو سلجھایا ہے۔ اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ رومی کی دعوت کا تعلق جس طرح ان کے خاص ماحول سے تھا، اسی طرح آج بھی اس کو وہی اہمیت حاصل رہی ہے — علاوہ ازیں رومی کے عہد کی عام فضا، ایشیا کی مسلمان سلطنتوں کی حالت، رومی کے وطن قونیہ کی تاریخی اہمیت، ان کے آباو اجداد، تعلیم و تربیت اور ان کے مرشد شمس تبریز کے حالات کتاب میں درج ہیں۔

یہ کتاب پاکستان کے ممتاز مصنف اور معروف محقق ڈاکٹر افضل اقبال کی انگریزی کتاب "لائف اینڈ ورک آف رومی" کا اردو ترجمہ ہے، جو جناب بشیر محمود اختر صاحب نے کیا ہے، ترجمہ رواں دواں اور شستہ ہے۔

صفحات: ۱۴ + ۲۲۳ قیمت -/۱۸ روپے

سیّد جمال الدین افغانی — حیات و افکار

از شاہد حسین رزاقی

سید جمال الدین افغانی کا شمار ان چند نادرۂ روزگار افراد میں ہوتا ہے جو مشرق و مغرب کے ذہنی افکار کے رمز شناس تھے اور جنھوں نے دنیائے اسلام کے مسلمانوں میں ملی بیداری، سیاسی شعور اور قومی آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے از حد جد و جہد کی۔ افغانی کے بارے میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ اپنی مسلسل مساعی کی بنا پر عالم اسلامی کی نشاۃ جدیدہ کے صحیح معنوں میں معمار تھے۔ ان کا زمانہ مغربی استعمار کے عروج اور اسلامی دنیا کے زوال کا زمانہ تھا اور اس کا انھیں انتہائی قلق تھا جو انھیں چین نہیں لینے دیتا تھا — وہ غیر معمولی خوبیوں کے مالک اور بہت سی خداداد صلاحیتوں کے حامل تھے۔ علم و فضل، دینی بصیرت، ایمانی قوت، روشن خیالی، حریت پسندی، سیاسی فہم و فراست اور سحر بیانی ان کا طغرائے امتیاز تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دینِ اسلام کو فروغ حاصل ہو اور ملّتِ اسلامیہ اصلاح و ترقی کی صحیح راہوں کی طرف گام فرسائی کرے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

اس کتاب میں ان کی سعی و کوشش اور تگ و تاز کی تفصیلات خاص ترتیب اور عمدہ انداز سے بیان کی گئی ہیں۔

صفحات ۱۶ + ۲۰۴ قیمت -/۱۵ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

خلیفہ عبد الحکیم مرحوم

قرآنِ کریم کا علم النفس

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے بانی ڈائرکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم کی ایک ریڈیائی تقریر دستیاب ہوئی ہے، جو انھوں نے ۱۹۵۸ء میں کی تھی۔ اسے ریڈیو پاکستان لاہور کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔۔۔۔ (ادارہ)

مذہبی صحیفوں کے متعلق ہزارہا سال تک پیروانِ مذاہب کا یہ پختہ عقیدہ رہا کہ مذہبی صحیفے میں تمام علوم پائے جاتے ہیں۔ طبیعات، ہیئت یا علم الافلاک، نباتات و جمادات کا علم غرضیکہ حیات و کائنات کے تمام شعبوں کے متعلق مذہبی صحیفہ تمام حقیقی اور ضروری معلومات کا خزینہ ہوتا ہے۔ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے یا سورج زمین کے گرد گھومتا ہے، اس کا جواب بھی مذہبی صحیفے سے طلب کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا رہا کہ علومِ طبیعیہ یا علومِ عقلیہ کی ترقی قدم قدم پر دین سے متصادم ہوتی رہی۔ دین و دانش کی پیکار کا زیادہ تر یہی موجب تھا کہ دین عالمِ طبیعی اور عالمِ عقلی کے متعلق تفصیلی معلومات اور قوانین کا سرچشمہ خیال کیا جاتا تھا۔ اب بھی یہ صورتِ حال دنیا میں جا بجا باقی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کو یہ بصیرت حاصل ہو گئی ہو کہ دین ماہیتِ حیات اور اقدارِ حیات کی بابت ایک عقیدے یا ایک زاویۂ نگاہ کا نام ہے۔ اس کا کام اساسی طور پر ایک نظریۂ حیات پیش کرنا ہے، ہیئت یا نباتات اور جمادات کے قوانین کے متعلق تفصیلات کی تعلیم دینا یا متنازع فیہ مسائل میں حکم بننا اس کا وظیفہ نہیں ہے۔ دین کا اصلی اور انتہائی مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کو یہ بتائے کہ حیات و کائنات میں اشیا و حوادث کی کثرت ایک وحدتِ حقیقی سے سرزد ہوتی ہے، اس وحدتِ ناظمہ اور محافظِ اقدار قوت کو خدا کہتے ہیں۔

اس خدا کی فطرت ہے جو دائم و قائم ہے اور اس میں کوئی بے اصول تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ حیات و کائنات کا ہر شعبہ اس فطرت الٰہیہ کا آئینہ دار ہے اور انسانی فطرت بھی اسی فطرتِ الٰہیہ پر ڈھالی گئی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ حقیقت فقط اتنی ہے اور جو کچھ اس سے الگ یا اس کے مخالف ہے وہ محض افسون و فسانہ ہے۔

چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اصل دین فقط اتنا ہے جس کو قرآنِ کریم نے موجز ترین الفاظ میں بیان کر دیا ہے :

فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا ۔ ذٰلک الدین القیم ۔

مظاہر طبیعہ کے متعلق قرآن نے کثرت و وحدت کا ایک اساسی رشتہ بتا کر انسان کی عقل کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے تجربے، مشاہدے اور استدلال سے اس حقیقت کو زیادہ سے زیادہ اپنے اوپر منکشف کرتا چلا جائے، اس انداز سے حاصل کردہ آفاق کا علم انسان کو دنیا شناس اور خدا شناس بنا دے گا۔ خدا نے یہ کام اپنے ذمے نہیں لیا کہ مظاہر کے تفصیلی قوانین اور حوادث کے تفصیلی آئین کا سبق انسان کو پڑھائے، ایسی معلومات کا حصول انسان کی اپنی علمی اور عملی جدوجہد کا نتیجہ ہونا چاہیئے قرآن کے نظریے کے مطابق ایک عالم انفس ہے اور ایک عالم آفاق ۔ یہ دو عالم ایک ہی حقیقت وحدہ کے دو رُخ ہیں، اس لیے ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا ۔ ایک حقیقتِ واحدہ کا ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ۔

اور حقیقت اس کو کہتے ہیں جس کے ظاہر اور باطن میں تخالف نہ ہو۔ عالمِ آفاق یا عالمِ طبیعی کے متعلق دین چند اساسی اصول بتا کر اس کی مزید تحقیق کو انسان کی تلاش پر چھوڑ دیتا ہے، اور وہ اساسی اصول ایسے ہیں کہ علومِ طبعیہ یا علومِ عقلیہ اس سے باہر نہیں جا سکتے۔ اسی طرح عالمِ نفس یا نفوس کے عالم کے متعلق بھی دین کی اس خالص صورت میں جسے اسلام کہتے ہیں کچھ بنیادی بیان کیے ہیں۔ ان اصول کو بیان کرنے کے بعد قرآن اس کا متقاضی ہے کہ اب تم اپنے نفوس کا گہرا مطالعہ کرو۔ یہ ایک بے پایاں عالم ہے لیکن یہ عالم بھی اپنی ایک مخصوص فطرت رکھتا ہے اور خاص آئین کے زیرِ نگین ہے، چونکہ دین کا مقصد نفسِ انسانی کی اصلاح ہے اس لیے قرآن میں نفسیات کے اصول عالمِ آفاق کے قوانین کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ تشریح اور توضیح کے ساتھ ملتے ہیں۔ آج کی اس مختصر تقریر میں میں قرآنی علم النفس کے چند بنیادی حقائق بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ جدید سائنس نے دینی عقائد کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور جدید نفسیات نے طبیعی سائنس کی مدد سے بن کر مذہب کی پوری طرح بیخ کنی کر دی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ قرآن نفسِ انسانی کے متعلق کیا کہتا ہے

نفسِ انسانی کی ماہیت یہ ہے کہ وہ طبعی حوادث کی اتفاقی پیداوار نہیں، فطرت نے اس کو حقیقت

ازلی کا آئینہ بنانا چاہا ہے، اس میں عرفان کی صلاحیتیں ہیں، وہ محض تنازع للبقا یا STRUGGLE FOR EXISTANCE کا آلہ نہیں ہے بلکہ حقیقت شناسی کا آلہ ہے۔ خدا نے خود اپنی روح اس کے اندر پھونکی ہے، اس لیے روحِ انسانی اور روحِ الٰہی میں ایک ازلی رشتہ ہے۔ اگر نفسِ انسانی کی یہی حقیقت ہے تو اس پر اسرارِ حیات منکشف ہو سکتے ہیں۔ اس لیے لاادریت یا AGNOTECISM کا قنوطی تنگ نظری یا بے بصری کا نتیجہ ہے۔ انسان کو مایوس ہو کر سپر انداختہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ نفسِ انسانی حقیقتِ ازلی کا ہم ذات اور ہم صفات ہونے کی فطری صلاحیت رکھتا ہے۔ نفسِ انسانی خدا نہیں بن سکتا لیکن تخلق باخلاق اللہ کی مشق کرتا ہوا اس کا ہم رنگ ہوتا جاتا ہے۔ صبغۃ اللہ میں رنگے جانا اس کا مقصودِ حیات ہے۔

نفسِ انسانی دماغ کے MOLECULES یا سالمات کے تعامل کا کرشمہ نہیں بقول مولانا روم:

قالب از ما ہست شد نے ما ازو

علم یا عرفان نفسِ انسانی کی فطرت میں داخل ہے۔ علمہ البیان —— علم آدم الاسماء —— علم الانسان مالم یعلم —— علم کو جہل پر ترجیح دینا اس کی ماہیت میں داخل ہے۔ نفسِ انسانی کے لیے علم کے تمام دروازے کھلے ہیں اور کھلے ہونے چاہئیں۔

روحِ انسانی اور روحِ الٰہی کی مماثلت سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ جس قدر کسی شخص کو اپنے نفس کا عرفان ہوتا جائے گا اسی قدر اس کا عرفانِ الٰہی یا علمِ حقیقتِ ازلی بڑھتا جائے گا۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ - یہ عمل دونوں طرف سے ہوگا - عرفانِ رب سے انسان کا اپنے نفس کا عرفان بڑھے گا اور اپنے نفس کے عرفان سے عرفانِ ذات وصفاتِ الٰہیہ میں ترقی ہوگی۔

قرآن کے علم النفس میں ایک اور بنیادی حقیقت یہ بیان ہوئی ہے کہ نوعِ انسان میں اگرچہ افراد کی کثرت ہے اور ان کے انفرادی صفات میں بہت کچھ تنوع ہے لیکن اساسی طور پر تمام انسانوں کی فطرت ایک ہی ہے، اس لیے کہ تمام انسان ایک نفسِ واحدہ سے پیدا کیے گئے ہیں، جس طرح ہر نفس بذاتِ خود ایک وحدت ہے، اسی طرح تمام نفوسِ انسانیہ ایک وحدت کے رشتے میں منسلک ہیں۔ یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفسٍ واحدۃ وخلق منھا زوجہا، مرد و زن سب میں ایک ہی نفس ہے۔ جب افراد و اقوام اس حقیقت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو ایک دوسرے سے الگ

سمجھنے لگیں گے اور اس وہم میں پڑ جائیں گے کہ ایک کے نقصان سے دوسرے کو حقیقی نفع حاصل ہو سکتا ہے وہ داخلی اور خارجی فتنہ و فساد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسانی کی ابتدائی خلقت ہو یا بعد کے احیا و ارتقا کی صورت، اس کی بنا وحدتِ نفوسِ انسانی ہے، ماخلقکم ولا بعثکم الا کنفسٍ واحدۃ۔

نفسِ انسانی کی ایک اصلی اور نصب العینی حقیقت ہے اور ایک اس کی وہ حالت جو مادی اور جسمانی عالم سے وابستہ ہو کر اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی میں نفسِ انسانی کا ایک رُخ بلندی کی طرف ہوتا ہے اور دوسرا رُخ پستی کی طرف۔ اس کیفیتِ نفسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددنٰہ اسفل سافلین۔

فرائڈ کی قسم کی نفسیات کی نظر اس کے اسفل السافلین پر پڑتی ہے اور اس نے اسی پہلو کو نفس کی اصل قرار دے لیا ہے۔ فرائڈ اس کے نصب العینی یا الٰہی پہلو کو فریب فہم قرار دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن انسانی نفس کے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے اور ان کے باہمی توافق و تخالف پر روشنی ڈالتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان جب بلند ہوتا ہے تو اس کے اعضا و جوارح کے افعال بھی خدا کے اپنے افعال بن جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور فراستِ مومن اس درجے پر پہنچ جاتی ہے کہ ھو ینظر بنور اللہ اور اسفل السافلین میں گرتا گرتا یہاں تک گر سکتا ہے کہ وہ جانوروں کے مقابلے میں بھی پست تر ہو جائے۔ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل۔

جدید نفسیات نے انسان کی اندرونی کشاکش پر بہت روشنی ڈالی ہے اور اس کے اسباب و علل کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں مرض کی تشخیص کے بعد مختلف قسم کے نفسی معالجے بھی تجویز کیے ہیں۔ قرآن بھی اس نفسی پیکار کا ذکر کرتا ہے اور اس کا علاج تجویز کرتا ہے۔ قرآن کی PSYCHOTHRAPY بہت سادہ لیکن تیر بہدف نسخۂ اکسیر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خلل یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ نفس اپنی وحدت کو پسِ پشت ڈال کر کسی ایک خواہش یا چند خواہشات کو اپنے اوپر اس طرح حاوی کر لیتا ہے کہ وہ خواہشات پر قادر ہونے کے بجائے ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ کوئی ایک خواہش غیر معمولی قوت حاصل کر کے فقط آمر نہیں بلکہ امّار یعنی جابر اور ڈکٹیٹر بن جاتی ہے۔ نفس کی اس حالت کے متعلق کہا گیا ہے، ان النفس لامارۃ بالسوء

لیکن نفس میں اگر اس طرح امارہ ہونے ہی کا میلان ہوتا تو تمام انسانی نفوس قعرِ مذلت میں گر جاتے، چوں کہ یہ گری ہوئی حالت نفس کی بنیادی حقیقت میں داخل نہیں اس لیے نفس کا نصب العینی پہلو اس کو ملامت کرنے لگتا ہے۔ نفس کی اس حالت کو قرآن نفسِ لوامہ کہتا ہے اور اس کو اس زور کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ خدا اس کی قسم کھاتا ہے۔ ولا اقسم بالنفس اللوامہ۔

یہ نفس لوامہ وہی نفس ہے جسے عام طور پر ضمیر کہتے ہیں۔ یہ آواز کبھی دھیمی ہوتی ہے اور کبھی تیز۔ زندگی میں کوئی غلط راستہ اختیار کرنے سے انسان کے اندر یہ احتجاج پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص غلطی کو غلطی سمجھ لے، اس کے بعد عمل کی کوتاہی سے کبھی جو نفس سرزد ہو وہ قلب انسانی میں کوئی ناقابلِ علاج مرض پیدا نہیں کرتی، لیکن اگر بدی پر اصرار کیا جائے تو قرآن کی نفسیات کے بموجب یہ بدی مرض کی طرح لاحق ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر اخلاقی مریض اس مرض کو نہ سمجھے تو علاج نہ کرنے کی وجہ سے اس مرض میں خود بخود اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا، اللہ کے مقرر کردہ اخلاقی قوانین اور نفسی آئین اس مرض کو بڑھاتے جاتے ہیں لیکن اگر نفس لوامہ، نفسِ امارہ پر قابو پالے تو اندرونی کشاکش ختم ہو جاتی ہے اور نفسیاتی توازن قائم ہو جاتا ہے جس سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ تمام نفسی زندگی فطرتاً اسی توازن اور اطمینان کی طالب ہے۔ اور انسان بدی کے بھی جو راستے اختیار کرتا ہے وہ اس غلط فہمی کی بنا پر کرتا ہے کہ اس طریقے سے اس کو جلد سرور و سکون اور اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ ہر عمل میں حق کا ایک ہی سیدھا راستہ ہوتا ہے جسے صراطِ مستقیم کہتے ہیں اور اللہ لوگوں کو اسی راستے پر چل کر اپنے تک پہنچنے کی تلقین کرتا ہے۔ زندگی کو ایک بامقصد چیز سمجھنا اور اس کا حاصل قرار دینا ایمان کہلاتا ہے۔ ایمان کے دو پہلو ہیں، ایک عرفان اور دوسرے عملِ صالح۔ اگر زندگی کو بامعنی سمجھنے کا ایقان اور اس معنی اور مقصود کی تحقیق کے لیے عملِ صالح نہ ہو تو انسان کا نفسی خلجان ختم نہیں ہو سکتا۔

ایمان کے بغیر انسان زندگی کو ایک بے مقصد زحمت تصور کرے گا اور اس کو ہمیشہ یہی احساس ہوگا کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے یا سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہے، جسے نہ نگل سکے نہ اُگل سکے۔ قرآن نے تمام عصر کو شاہد قرار دے کر اس نفسی حقیقت کو آشکار کیا ہے۔ ان الانسان لفی خسر۔ تمام انسان زندگی میں گھاٹے ہی میں ہیں جب تک کہ وہ بلند اخلاقی نصب العین پر ایمان رکھتے ہوئے اعمالِ صالحہ کو

اپنا شیوہ نہ بنالیں۔ حق کا یقین اور پھر اس پر مستقل مزاجی سے عمل۔ جب کوئی شخص کسی نصب العین کو حق سمجھتا ہے تو اس کے حصول میں اگر اس کو تکلیف بھی پہنچے تو وہ اس زحمت کو بھی رحمت کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ وہ ایمان کی اکسیر سے نقصان کو باطنی نفع میں تبدیل کر لیتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ادھر اُدھر راحت کی تلاش میں بھٹکتا ہوا عارضی لذت کے سراب سے اطمینان کی پیاس بجھانا چاہتا ہے جس میں اسے کامیابی نہیں ہوتی۔ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے :

گر گریزی با امید راحتے ہم درآں جا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے درو بے دام نیست جز بخلوت گاہِ حق عالم نیست

اس خلوت گاہِ حق پر پہنچ کر وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جسے نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔

زمانۂ حال میں علم النفس میں انسان نے بہت ترقی کی ہے، شعور سے گزر کر تحت الشعور کی گہرائیوں میں غوطے لگائے ہیں۔ کسی نے اس تحت الشعور سے موتی نکالے ہیں اور کسی کے ہاتھ فرائڈ کی طرح زیادہ تر کیچڑ ہی آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحت الشعور میں حکمت اور الوہیت کے بے بہا موتی بھی ہیں اور کیچڑ بھی ہے۔ تحت الشعور میں وہ روحِ الٰہی بھی ہے جو نفسِ انسانی میں پھونکی گئی، اور اسفل السافلین کا کیچڑ بھی ہے۔ کیچڑ کا طالب اس میں سے کیچڑ نکالتا ہے اور موتی کا طالب موتی حاصل کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ احسنِ تقویم کے ساتھ اسفل السافلین بھی موجود ہے۔ انسانی نفس رحمانیت اور شیطنت کا میدان کارزار ہے، جنت بھی اس کے اندر سے اُبھرتی ہے اور دوزخ بھی۔ مادیت کے زیرِ اثر جو علم النفس پیدا ہوا ہے وہ اسفل کو حقیقی اور ارفع کو نفس کا ایک خوش گوار دھوکا قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی علم النفس نصب العینی انا کو حقیقی اور نفسِ اسفل کو حقیقت سے بُعد قرار دیتا ہے۔

فرنگ کی موجودہ نفسیات کا عام میلان یہ ہے کہ مادیت اور حیوانیت کو اساسی قرار دے کر انسان کی خدا طلبی کو وہم قرار دے یا سرے سے نفس کے مستقل وجود کا ہی انکار کر دے۔ میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کی بنا پر ایک اعلیٰ درجے کا علم النفس تعمیر کیا جا سکتا ہے جس کے مقابلے میں فرائڈ، ینگ، آڈلر اور واٹسن کے تصورات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

مشتے نمونہ از خروارے میں نے دو ایک نکتے قرآنی نفسیات کی اس مختصر تقریر میں بیان کیے ہیں۔ قرآن طبیعات اور ریاضیات کی کتاب تو نہیں لیکن نفسیات اس کا مخصوص موضوع ہے۔

پروفیسر محمد ایوب قادری

اسلام اور صنعت

وسائل معیشت کے شعبوں میں زراعت اور تجارت کے بعد صنعت و حرفت کا درجہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمدن و معاشرت اور ملک کی ترقی میں صنعت و حرفت کا بڑا دخل ہے اور اس سے بہت سے برکات وابستہ ہیں۔ دراصل یہ بھی تجارت ہی کا ایک حصہ ہے نیز صنعت و حرفت اور تجارت کا چولی دامن کا تعلق ہے۔

خام پیداوار کی صورت و شکل اور ترکیب بدل دینے سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، جو صنعتیں صرف انسانی ہاتھوں سے تیار ہوتی ہیں انھیں دست کاریوں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جو کل پرزوں اور مشینوں سے تیار ہوتی ہیں ان کو صنعتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلام سے قبل عرب کی صنعتی حالت

طائف: یہاں کے لوگ صنعت و حرفت میں مشغول رہتے تھے۔ طائف کی خاص صنعت چرم سازی تھی، وہاں دباغت کے کارخانے اس قدر زیادہ تھے کہ یہ بلدۃ الدباغ کے نام سے مشہور ہوا۔ طائف میں لوہار بھی تھے جو لوہے کی دست کاری میں ماہر تھے۔ طائف میں دیگر صناعوں کے علاوہ طبیب بھی تھے۔

مکہ: مکہ ایک وادی غیر ذی زرع تھا، وہاں خام پیداوار ہونے کی وجہ سے کوئی خاص صنعت نہ تھی۔ چمڑے کی صنعت صرف اونٹ کی کھالوں کی وجہ سے تھی۔

مدینہ: مدینہ میں پارچہ بافی، تلوار سازی، لکڑی کے سامان کی صنعتیں چھوٹے پیمانے پر جاری تھیں۔ سہل بن سعد کہتے ہیں کہ ایک مدنی عورت ایک حاشیہ دار چادر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ چادر میں نے اپنے ہاتھ سے بُنی ہے۔ مدینہ کے بعض یہودی اچھے صناع تھے اور ان کے کارخانے تھے، چنانچہ انصار مدینہ نے یہودیوں سے کپڑا بننا، رنگ سازی، تلواریں، زرہیں، دیگر آلات اور کاشت کاری کے آلات بنانے سیکھے۔

صنعت اور قرآن پاک

صنعت کے سلسلے میں خود قرآن پاک میں واضح اشارات ملتے ہیں۔ جہاز سازی اور کشتیوں کی صنعت کے

متعلق حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ موجود ہے۔ دھاتوں کی صنعت کے بارے میں کئی واقعے قرآن کریم میں ملتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ظروف سازی کی صنعت کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ ذوالقرنین کے قصے میں لوہے کی چادروں اور پگھلے ہوئے تانبے کا پتا چلتا ہے۔ غرض قرآن کریم میں صنعت کے متعلق اشارات موجود ہیں اور اس کی اہمیت، ضرورت اور انسانی معاشرے میں اس کے فوائد کو مانا جاتا ہے۔ فرعون کے قصے میں مینارے کی تعمیر کا تذکرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ان کے بچپن میں مٹی کے کھلونے بنانے کا ذکر ہے۔ اسی طرح زیور سازی اور پارچہ بافی کا ذکر ملتا ہے۔

صنعت اور احادیث

اسلام نے صنعت و حرفت کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے اور اس کو انسانی فلاح و بہبود کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ مقدامؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کمائی نہیں ہے، اور حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

صنعت و حرفت کا کام جلیل القدر پیغمبروں سے منسوب ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے اور جنگ کے لیے لوہے کی قمیص تیار کرنے کا کام کرتے تھے۔ خالدؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا انسان کے لیے کسب معاش کا کون سا ذریعہ بہتر ہے۔ فرمایا دست کاری (ابن ماجہ) حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے اور حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا پیشہ کرتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرانے کا کام کرتے تھے۔ (فتح الباری)

غرض اس طرح کتب تاریخ و سیر میں انبیائے کرام سے بہت سے پیشے اور صنعتیں منسوب ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں "عمل بالید" کا سراغ ملتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں چرائیں اور اس کا فخریہ طور پر ذکر فرمایا۔ آپ نے اجرت پر بھی کام کیا۔

گویا صناعوں اور دست کاروں کے درجے اس قدر بلند فرمائے کہ ان کو محبوبیت الٰہی کا مقام حاصل ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے موقع پر خندق کے کھودنے میں بھی شرکت فرمائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا اکثر کام خود کرتے تھے۔ جھاڑو خود دے لیتے تھے۔ کپڑوں میں پیوند لگا لیتے تھے۔ جوتیاں گانٹھ لیتے تھے۔ غرض کہ دست کاری، محنت اور صنعت کی عظمت کو دنیا سے تسلیم کرایا گیا ہے۔

عمل صحابہ کرامؓ

صحابہ کرامؓ نے بھی انسانی معاشرے کی ترقی و بقا کے لیے خود محنت کی اور صنعت و دست کاری کو اپنایا۔ خلیفہ

اوّل حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا کپڑے کا ایک بڑا کارخانہ مقام سنح میں تھا اور آپ خود کپڑا بیچنے جایا کرتے تھے۔ بلکہ خلافت کی ذمہ داریوں کے بعد بھی آپ نے اس کام کو جاری رکھنا چاہا۔ صحابہ کرام میں اکثر نے کوئی نہ کوئی پیشہ اپنایا یا صنعت و دست کاری اختیار کی۔ کتب اسمار الرجال میں ان صنعتوں کی صراحت موجود ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ صوفیائے کرام کسی نہ کسی پیشے، صنعت اور دست کاری سے پیٹ بھر کر تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہتے تھے۔ بڑے بڑے علما، فقہا کا تعلق دست کاری اور صنعت سے رہا ہے۔ دراصل اسلام نے تقوے کو معیارِ فضیلت قرار دیا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

مسلمانوں نے غیر مسلموں کی صنعتوں کو اپنایا

مسلمانوں نے صنعت کے میدان میں بڑی ترقی کی اور انھوں نے ہر مفید صنعت کو شروع ہی سے اپنایا۔ عہدِ نبویؐ میں جنگوں میں رومی دبابے کا استعمال کیا گیا اور مسلمانوں نے منجنیق کی صنعت کو سیکھا اور اس کا استعمال کیا۔ اسی طرح مسجد میں منبر کی ابتدا بھی ملک شام کی یادگار ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے "اسلامی معاشیات" میں اس واقعہ کو بڑا زور دے کر لکھا ہے اور اس بات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عربوں کی کمانوں سے ایرانی کمانیں مضبوط ہوتی تھیں۔ مسلمانوں نے ایرانی طرز کی کمانوں کا استعمال کیا اور بنایا۔ اس طرح حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفہ سوم کے عہد میں پون چکیوں کا استعمال ہوا۔ غرض مسلمانوں نے صنعتی ترقی میں شروع ہی سے دلچسپی لی۔

دست کاروں اور مزدوروں کے چند بنیادی مسائل

آج کل تمام دنیا میں سرمایہ داروں اور مزدوروں اور دست کاروں کے درمیان کش مکش ہو رہی ہے اور بعض انسانیت کش تحریکیں پرورش پا رہی ہیں۔ دراصل بڑے بڑے ملوں اور کارخانوں میں جو بہترین صناع اور دست کار ہیں، جن کو مزدوروں کے نام سے پکارا جاتا ہے، وہ دنیا کے بہت بڑے محسن ہیں۔

اسلام نے مزدور اور کارخانہ دار کے مسائل کو اس طرح حل کیا ہے۔ بخاری شریف کی ایک حدیث ہے۔

دخول یعنی تمھارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے تمھارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ان کو

تمہارے ہاتھ کے نیچے ڈال دیا ہے، پھر جس کا بھائی کسی کے ہاتھ کے نیچے پڑ جائے تو چاہیے کہ جو کچھ کھاتا ہو اسے کھلائے اور جو کچھ پہنتا ہو اُسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادے جو اُن کو مغلوب کر دے اور اگر ان پر بار ڈالو تو اُن کی مدد و اعانت کرو۔ اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ مزدور اور مزدوری پر لوگوں سے جو شخص کام لیتے ہوں ان کے درمیان بھائی چارہ ہو اور دونوں کی نوعیت بھائی بھائی جیسی ہو۔

۲۔ کم از کم کھانے پینے اور رہنے سہنے کی حد تک دونوں کی سطح برابر ہو، جو خود کھائے وہ مزدور کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ مزدور کو پہنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اجرت کے معاملے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ کم از کم اتنی اجرت تو مزدور کو بہرحال ملنی چاہیے کہ کھانے پینے کی حد تک وہ بے نیاز ہو سکے اور اگر مزدوری کی شرح کم ہو تو حدیث کی روشنی میں بلند کر دی جائے۔ پھر ظاہر ہے کہ دونوں طبقوں کے درمیان کشمکش ختم ہو جائے گی اور کام کی رفتار بہت بڑھ جائے گی۔

۳۔ وقت اور کام دونوں کے لحاظ سے مزدور پر اتنا بوجھ ڈالا جائے کہ جو اُسے مغلوب کر کے تھکا نہ دے۔ چنانچہ حدیث میں کام اور وقت کے مسئلے کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

۴۔ اگر کوئی کام ایسا پیش آجائے جس میں مزدور کو دشواریاں پیش آ رہی ہوں تو اس کی اعانت مزید قوت سے کی جائے۔

صنعت کی ترقی کے لیے سہولتیں پہنچانا

تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی و کامیابی کے لیے موجودہ زمانے میں دو چیزیں بہت اہم ہیں۔

۱۔ شرح مبادلہ (۲) محصول درآمد۔ اسلام کے آغاز میں پہلی چیز کا سوال ہی نہ تھا، اس لیے کہ غیر مسکوک سونے اور چاندی کی ڈلیاں کام میں آتی تھیں۔ البتہ درآمد و برآمد کے محاصل کا مسئلہ ضرور پیش آیا۔ آج کل کی قومی اور ملکی حکومتیں اپنے ملک کی صنعت و حرفت کا تحفظ اور ترقی اس طرح کرتی ہیں کہ غیر ملک کی چیزوں پر بھاری بھاری محصول اور ڈیوٹیاں لگا دیتی ہیں اور اس طرح ملکی چیزوں اور صنعتوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے، لہٰذا وہ اس اصول کا قائل نہیں کہ ایک ملک فائدہ اُٹھائے اور دوسرا تباہ ہو جائے اور دنیا میں فساد پھیلے۔ اس معاملے میں وہ بڑی رواداری دکھاتا ہے۔ اس کا اصول ہے کہ مخلوق، خدا کا ایک کنبہ ہے اور سب کو فائدہ پہنچنا چاہیے، کسی پر کوئی ظلم نہ ہو۔

خلافتِ فاروقی میں یہ سوال اٹھا کہ خلافتِ اسلامیہ میں غیر مذہب والوں سے کوئی محصول نہیں لیا جاتا ہے مگر مسلمانوں سے دوسری حکومتیں محصول لیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ۱/۱۰ حصہ مقرر کیا جو کہ عشر کہلاتا ہے اور جو ہر شخص سے لیا جائے گا اور سال میں صرف ایک مرتبہ لیا جائے گا، اگرچہ دوسری حکومتیں ہر مرتبہ محصول لیتی تھیں۔ اس طرح اسلام نے صنعت وحرفت کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے۔

ملیں اور کارخانے

جب صنعت وحرفت انسانی ہاتھوں سے نکل کر مشینوں اور ملوں کے قبضے میں چلی جاتی ہے تو سرمایہ دار اور مزدور دو طبقے سامنے آجاتے ہیں اور دونوں میں جھگڑا پیدا ہوجاتا ہے، کیونکہ توازن واعتدال باقی نہیں رہتا۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اور اس کا ایک عالمگیر نظام ہے، لہٰذا اس کے یہاں سرمایہ داری اور محنت میں ایک معتدل توازن ہے۔ اسلام ان تمام مفاسد کو بیخ وبن سے مٹانے کا داعی ہے جو صنعت کاروں اور دست کاروں کے حقوق کو پامال کرتے ہیں یا جن سے افراط وتفریط، عدمِ اعتماد اور عدمِ تعاون پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ ان اصولوں کو پیش کرتا ہے، جن سے صنعت وحرفت کو ترقی ہو، تاکہ معاشرہ آگے بڑھے اور ساتھ ہی ایک عادلانہ اور صالح نظام قائم ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ:

۱۔ اجرت اتنی دی جائے کہ کاریگر اور دست کار کا استحصال نہ ہوسکے۔
۲۔ کم سے کم اجرت پر زیادہ کام نہ لیا جائے، اسلام اس کو ظلم قرار دیتا ہے۔
۳۔ کاریگر اور مزدور کی اجرت مقرر کردی جائے تاکہ کوئی اندیشہ نہ رہے۔ اسلام اس اصول کا حامی ہے۔
۴۔ اجرت کے ادا کرنے میں حیل وحجت نہ ہو۔

مزدور کا تحفظ

اسلام نے مزدور کی اجرت کا تحفظ کیا ہے۔ مسند احمد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عاملوں کو اُن کے عمل سے حصہ دو، اس لیے تمہارا یہ عمل خدا کے لیے ہوگا جس میں تمہیں کبھی گھاٹا نہیں ہوگا۔ احادیث کی تمام کتابوں میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمہارا خادم کھانا تیار کرکے لائے تو اس کو اپنے ساتھ کھانے پر بٹھاؤ اور اگر

یہ نہ کرسکو تو کم از کم چند لقمے اس کے منہ میں ڈال دو کہ اس نے کھانا پکانے میں گرمی، دھواں اور دوسری مشقتیں برداشت کی ہیں، اس کو اپنی مشقت کا پھل ملنا چاہیے تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی مشقت سے مستفید نہیں ہوں اور محنت کا پورا ثمرہ آقا کو پہنچ رہا ہے۔

حکومت کی نگرانی

جس طرح حکومت کو اجیروں اور آجروں کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے مدافعت کا حق حاصل ہے، اسی طرح حکومت کو ان کے کام پر بھی نگرانی رکھنے کا بھی پورا پورا حق حاصل ہے۔ ابومسعود انصاری کا بیان ہے کہ ایک دن میں، اپنے غلام کو مار رہا تھا، پیچھے سے آواز آئی "ابومسعود!" میں نے مڑ کر دیکھا تو آواز دینے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ نے فرمایا اے ابومسعود، یہ معلوم کر کہ تجھ کو اپنے زیر دست پر جتنی قدرت حاصل ہے، خدا کو اس سے بہت زیادہ قدرت تجھ پر حاصل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تیرا یہ کوڑا غلام کے ہاتھ میں ہو۔"

ابومسعود کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ غلام خدا کی راہ میں آزاد ہے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو ایسا نہ کرتا تو دوزخ کی آگ تجھ کو جھلس دیتی۔ حضرت عمرؓ ہر ہفتے، مدینہ کے باہر تشریف لے جاتے تھے اور اگر کسی شخص کو ایسے کام میں مشغول دیکھتے جو اس کی برداشت سے زیادہ ہوتا تو آپ اس کے آجر کو کام ہلکا کر دینے پر مجبور کرتے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں "محتسب" مقرر کیے اور ان کو یہ حکم تھا کہ اگر کسی مزدور پر زیادتی ہو تو اس کے آجروں کو یہ حکم دیں کہ ان کی برداشت سے زیادہ اس سے کام نہ لے۔ حکومت کو مزدوروں کی صحت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ایک مرتبہ آپ کو یہ اطلاع ملی کہ کارخانہ دار بیمار مزدوروں کی عیادت کو نہیں جاتا تو آپ نے محتسب کو ہدایت کی کہ کارخانہ دار سے باز پرس کرے اور اس کو طبیب مقرر کرنے کی فہمائش کی جائے اور اگر اس کی آمدنی طبیب کا بوجھ نہ اٹھا سکے تو بیت المال کی طرف سے فوراً طبیب مقرر کر دیا جائے۔

موجودہ زمانے کے مل، فیکٹری، ورکشاپ اور کارخانہ دار اگر اس قسم کی سہولتیں صناعوں اور کاریگروں کو بہم پہنچائیں تو بہت سے مفاسد کا انسداد ہو جائے اور معاشرہ خوش حال و فارغ البال ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین کمائی مزدور کی کمائی ہے، بشرطیکہ وہ خیر خواہی اور بھلائی کے ساتھ کام والے کا کام انجام دے۔

الحاصل اسلام کے اقتصادی نظام میں صنعت و حرفت پر بھی بہت زور دیا گیا ہے تاکہ معاشرے میں مرفہ الحالی و فارغ البالی ہو۔ اسلام انبیا اور بزرگانِ دین کے پیشوں اور کسبِ معاش کے واقعات سنا کر صنعت و حرفت کی ترغیب دیتا ہے اور گھریلو دست کاری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تاکہ صنعت و حرفت ترقی کر سکے۔

فقہائے ہند

جلد پنجم ، حصہ اوّل   از محمد اسحاق بھٹی

یہ "فقہائے ہند" جلد پنجم کا حصہ اوّل ہے جو برِ صغیر پاک و ہند کے بارھویں صدی ہجری کے ۱۶۲ فقہائے عالی مقام اور علمائے کرام کے تفصیلی حالات و سوانح پر مشتمل اور ان کی علمی و فقہی اور تصنیفی و تدریسی مساعی کو محیط ہے۔ ہندوستان میں یہ اورنگ زیب عالمگیر کا عہدِ حکومت ہے جو علمی اور فقہی لحاظ سے انتہائی پُر ثروت عہد ہے۔ اورنگ زیب نے ہندوستان پر اکیاون سال حکومت کی۔ اگرچہ اس دور کے بعض فقہائے عظام کا تعلق اس سے پہلے اور بعد کے حکمرانوں کے عہد سے بھی ہے لیکن مقدمہ کتاب میں صرف اورنگ زیب کی علمی و عملی زندگی کا ذکر کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ذاتی طور پر برِ صغیر کا یہ عظیم الشان شہنشاہ کس درجے نیک، پرہیزگار، بہادر و نیک، فقہ و فقہا کا قدردان تھا۔ اس کی اپنی کتاب زندگی نہایت شاندار اور سب حکمرانوں سے ممتاز و اعلیٰ ہے اور خاندانِ مغلیہ کے اس حکمران کے حالات انتہائی دلآویز و دلچسپ ہیں، جن کے مطالعے سے قلب و ذہن میں ایک خاص کیفیت کروٹ لینے لگتی ہے۔

صفحات ۳۵۲ + ۱۶ = ۳۶۸   قیمت -/۲۴ روپے

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی چند دیگر مطبوعات

مسئلہ تعدد ازدواج از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	-/۳ روپے
ازدواجی زندگی کے لیے اہم قانونی تجاویز از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	-/۲ روپے
چند ازدواجی مسائل از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	-/۵ روپے
اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	-/۴ روپے
برِ صغیر پاک و ہند میں علم فقہ از مولانا محمد اسحاق بھٹی	-/۱۵ روپے
فقہِ عمر (شاہ ولی اللہ)، ترجمہ از مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی	-/۲۵ روپے
رویتِ ہلال از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی	-/۱ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور

پروفیسر خواجہ عبدالحمید یزدانی

مثنوی رومی کی دعائیں

دعا عربی کا لفظ اور باب "نصر ینصر" سے ہے جس کے لغوی معنی بلانے، پکارنے، رغبت کرنے، منسوب کرنے، نام رکھنے اور کسی کام کی طرف لے جانے کے ہیں۔ اس کے علاوہ عبادت کرنے اور مدد طلب کرنے کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی خدائے بزرگ و برتر سے استمداد و استغاثہ کے ہیں، خواہ یہ استغاثہ و استمداد اپنے یا کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔ اللہ تعالیٰ سے دعا تین طرح سے ہوتی ہے، اس کی توحید بیان کرنا اور اس کی حمد و ثنا کرنا، اس کی ذاتِ باری سے عفو درگزر اور رحم و کرم کی درخواست کہ جس سے اس کا قرب میسر آئے اور تیسرے دنیا کی بھلائی کی درخواست کرنا تہلیل و تحمید بھی دعا ہی کے زمرے میں آتی ہے کہ یہ بھی ایک ذریعہ ہے اللہ جل شانہٗ سے حصولِ جزا کا۔ اکثر احادیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں دعا کی فضیلت و اہمیت کی وضاحت ملتی ہے، اور اسے عبادت کہا گیا ہے۔ ہر قسم کی دعا، جس میں قضائے حاجات کے لیے دعا بھی ہے، صرف اللہ ہی سے کی جانی چاہیے۔ غیر اللہ سے دعا کرنا نہ صرف بہت بڑی گمراہی بلکہ شرک عظیم اور کفر ہے۔ دعا میں ہمیشہ ایک باضابطہ استدعا کا تصور شامل ہوتا ہے، چاہے یہ دعائے خیر ہو یا دعائے بد۔ حالات کے مطابق دعا، یعنی خدا سے استدعا کرنا، کئی طرح کی ہو سکتی ہے اور اس لحاظ سے دعا کا ترجمہ ذاتی التجا کرنا بھی ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں دعا کی بڑی اہمیت ہے۔ متقی مسلمانوں کے نزدیک دعا، انسان اور کرۂ سماوی کے درمیان رابطہ نہیں بنتی بلکہ اصل رابطہ براہِ راست دعا کرنے والے اور خدا کے درمیان ہے۔

ابتدائی فارسی مثنویوں میں دعا کا عنصر بہت کم ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو کسی خاص موقع پر ہی نظر آتا ہے۔ فارسی مثنوی نگاروں میں سب سے پہلے غالباً نظامی گنجوی نے مثنوی میں، اور وہ بھی اس کے آغاز ہی میں باقاعدہ مناجات یا دعا کا باب قائم کیا۔ اس سے قبل کسی فارسی مثنوی میں ایسا باب دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس لحاظ سے نظامی اس روایت کا بانی قرار پاتا ہے۔ بعد میں خمسۂ نظامی کی پیروی میں لکھی جانے والی تمام مثنویوں میں یہ روایت بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔ نظامی کی تین مثنویوں میں

مناجات کا الگ کوئی باب نہیں ہے بلکہ آغاز ہی میں دعا ہے یا ثنا کے بعد دعائیہ اشعار ہیں۔ البتہ سکندر نامہ میں ایک باب ہے اور مخزن اسرار میں دو باب قائم کیے گئے ہیں۔ خمسہ نظامی کا جواب لکھنے والوں نے جہاں اس روایت کو پورے طور پر نبایا وہاں اس میں کچھ اضافہ بھی کیا، یعنی مناجاتِ اوّل اور مناجاتِ دوم کے علاوہ مناجاتِ سوم اور مناجاتِ چہارم کے بھی باب قائم کیے۔ مثلاً خسرو کی مثنوی مطلع الانوار میں مناجات کے تین باب اور جامی کی تحفۂ احرار میں چار ابواب ہیں، جب کہ خواجوی کرمانی نے گوہر نامہ میں حمدِ باری اور نعتِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد مناجات کا باب رکھا ہے۔

مولانا رومی نے اس ضمن میں کسی قسم کی تقلید سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنا انداز برقرار رکھا ہے۔ ان کی مثنوی میں جتنی دعائیں ہیں، ان میں سے چند ایک تو قرآنی ہیں جن کا ذکر کسی خاص مناسبت سے آگیا ہے، اور کچھ موقع و محل کے مطابق کسی شخص کی یا خود مولانا کی اپنی ذات کے لیے ہیں۔ ان میں اگر کہیں خدائے بزرگ و برتر سے بخشش و مغفرت کی استدعا ہے تو کہیں، بلکہ زیادہ تر، نفس امارہ کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کی التجا کی گئی ہے، کہیں دعا، ظالموں اور ستم کاروں کے خلاف حضورِ حق فریاد و فغان کی صورت میں نظر آتی ہے، اور کہیں خود مولانا کسی دوسرے آدمی کو کسی پریشان کن صورت حال سے نجات پانے کے لیے دعا کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہیں یہ دعا مناجات کی صورت میں نظر آتی ہے۔

دفتر اوّل میں ایک یہودی بادشاہ کی حکایت بیان ہوئی ہے جو نصاریٰ کو اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر قتل کروا دیا کرتا تھا۔ اس کے مکار وزیر نے اسے اس قتلِ عام سے روکا کہ بقول اس کے نصاریٰ ڈر کے مارے اپنی مذہبی وابستگی چھپانے لگے تھے۔ اس کا حل اس نے اس بات میں تلاش کیا کہ ان میں باہم پھوٹ ڈال دی جائے تاکہ اس طرح وہ اپنے آپ ہی ختم ہو جائیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کی تجویز کے مطابق وزیر کو برسرِ دربار ذلیل کیا، اور وہ ترکِ دربار کر کے نصرانیوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے خود کو عیسائیت کا مبلغ ظاہر کر کے اس کا پرچار شروع کر دیا۔ نصرانی اس وزیر سے متاثر ہو کر اس کی طرف متوجہ ہونے لگے . . . غرض وزیر کا جادو چل جاتا ہے، نصاریٰ اس کے انتہائی عقیدت مند بن جاتے اور اسے نائبِ عیسیٰ کہنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ دجال محض تھا . . . دجال کے ذکر کے بعد مولانا پُر درد انداز میں ان نت نئی رکاوٹوں اور مشکلوں کا تذکرہ اور ان سے نجات کی دعا کرتے ہیں، جو نفسِ امّارہ قدم قدم پر حرص و ہوس اور ایسی ہی دوسری صورتوں میں انسان کے راستے میں پیدا کرتا رہتا ہے۔

اس نفس نے ہزاروں دام و دانہ پھیلا رکھے ہیں اور آدمی حریص پرندے کی مانند، اپنی تمام تر عظمت کے باوجود ہر لحظہ اس کے ایک نئے دام میں پھنس رہا ہے۔ مولانا نے اس سلسلے میں اللہ جل شانہٗ کی عنایاتِ پیہم اور انسان کی بے بسی اور جگر گداز مجبوری کا ذکر کر کے نفس کے ہاتھوں انسانی اعمال کے ضیاع کو انبارِ گندم اور چوہے کی سیدھی سادی روزمرہ کی تمثیل سے واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ادھر ہم گندم کا انبار لگاتے جاتے ہیں، ادھر یہ انبار اندر ہی اندر ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا دھیان اس طرف آتا ہی نہیں اور نہ ہم اس پر غور کرنے کی کوشش ہی کرتے ہیں کہ ہماری اس گندم کو چوہا بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ختم کیے جا رہا ہے۔ اس چوہے (نفس) نے ہمارے انبارِ اعمال میں نقب لگا کر اُسے کمال مکاری سے ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شیطانی وساوس آدابِ عبادت کی بجاآوری سے مانع آتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے حضور اکرمؐ سے نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بارے میں سوال کیا تو سرورِ کونینؐ نے فرمایا یہ ایک جھپٹا ہے کہ شیطان بندے کی نماز میں سے جھپٹ لیتا ہے۔[۱] مولانا کے مطابق ضروری ہے کہ انسان پہلے اس نفس کے شر کو دور کرے، پھر اعمال کی طرف متوجہ ہو۔

مولانا فخرِ موجودات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیثِ مبارکہ "حضوری کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی" کا حوالہ دے کر مذکورہ بالا تمثیل کو آگے بڑھاتے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دستِ دعا بلند کرتے ہیں۔ اس دعا میں نفسِ شوم کے مکر سے بچنے کے لیے اس ذاتِ اقدس کی عنایات و التفات کی بالواسطہ طور پر التجا کی گئی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر تیری عنایات ہمارے شاملِ حال ہو جائیں تو اس دزدِ لئیم یعنی نفس کا کیا ڈر۔ تیری ذاتِ پاک اگر ہم پر توجہ و التفات فرما دے تو اس نفس کی طرف سے ہر ہر قدم پر ہزاروں دام بچھائے جانے پر بھی ہمیں ذرہ بھر پروا یا پریشانی نہ ہوگی:

اے بسترِ دجالِ یک چشم لعین	ای خدا فریادرس نعم المعین
صد ہزاران دام و دانہ است ایخدا	ما چو مرغانِ حریصِ بینوا
دمبدم پابستۂ دامِ نویم	ہر یکی گر باز و سیمرغی شویم

---

[۱] احادیثِ مثنوی، ص ۱۱

می رہانی ہر دمی مارا و باز	سوی دامی میرویم ای بی نیاز
ما درین انبار گندم می کنیم	گندم جمع آمده گم می کنیم
می نیندیشیم آخر ما بہوش	کاین خلل در گندمست از مکرِ موش
موش تا انبار ما حفره زد است	وز فنش انبار ما ویران شد است
اوّل اے جان دفع شر موش کن	وآنگہ اندر جمع گندم جوش کن
بشنو از اخبار آن صدرِ صدور	لاصلوٰۃ تمّ الّا بالحضور
گر نہ موشی دزد در انبار ماست	گندمِ اعمال چل سالہ کجاست
ریزہ ریزہ صدق ہر روزہ چرا	جمع می ناید درین انبار ما
چون عنایاتت شود با ما مقیم	کی بود بیمی ازآن دزدِ لئیم
گر ہزاران دام باشد ہر قدم	چون تو با مانی نباشد ہیچ غم[۵۲]

اسی دفتر میں ایک شیر اور جنگلی جانوروں کی لمبی چوڑی تمثیل بیان ہوئی ہے، جس میں جانور شیر سے اپنی جان بچانے کی خاطر اسے قناعت و توکل کا درس دیتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ انہی جانوروں میں ایک خرگوش بھی ہے جو اپنی عیاری سے شیر کو ایک کنوئیں پر لے جانے اور اُسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ کنوئیں میں ایک اور شیر چھپا بیٹھا ہے جو اس کا دشمن ہے، اور یوں شیر کنوئیں میں اپنا ہی عکس دیکھ کر چھلانگ لگا دیتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ اس تمثیل کے آخری حصے میں مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس کسی نے دشمن کی بات پر یقین کیا اس کا حشر اس شیر ایسا ہی ہوا۔ دشمن اگر محبت اور دوستی کی بھی بات کرے تو اسے دام ہی سمجھنا چاہیے۔ اس کی قند بھی زہر ہی ہوگی۔ لیکن جب مقدر ہی میں ایسا معاملہ ہو تو انسان، دوست اور دشمن میں تمیز کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں مولانا کے مطابق، اللہ کے حضور گریہ و زاری اور عجز و نیاز سے کام لیتے اور تسبیح و روزہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے دعا کرنی چاہیے ... یہاں مولانا نے جو دعا تلقین فرمائی ہے اس میں اللہ جل جلالہ کو علام الغیوب، کریم العفو اور ستار العیوب ایسی صفات سے خطاب کرتے ہوئے اسی درد بھرے اور پُر تاثیر لہجے میں مکرِ بد کے بتھر

---

۵۲ کتابِ مثنوی۔ ص ۱۱

کے نیچے کچلے جانے سے محفوظ رکھنے، گناہوں کی سزا نہ دینے اور تمام موجوداتِ کائنات کی صحیح صورت دل پر ظاہر کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ پھر اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کو کتاپن اور نفس کو شیر قرار دے کر کہا گیا ہے کہ ہم سے اگر لغزشیں سرزد ہوتی ہیں تو ان کی وجہ سے اس نفس کو ہم پر مسلط نہ فرما۔ حقیقتِ اشیا اور صحیح صورت حال ہم پر واضح فرما تاکہ خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر ہم کہیں غلط کو صحیح اور مضر کو مفید نہ سمجھ بیٹھیں۔ جو کوئی تیرے قہر کا مظہر بنتا ہے وہ "نیست" (فانی) ہوتے ہوئے بھی ہستی، خود پسندی کا شکار ہو کر ظلم و تعدی کا بازار گرم کرتا اور کسی کی نصیحت سننے کو تیار نہیں ہوتا۔

چون قضا آید نہ بینی غیر پوست — دشمنان را باز نشناسی ز دوست
چون چنین شد ابتهال آغاز کن — نالہ و تسبیح و روزہ ساز کن
نالہ میکن کای تو علّام الغیوب — زیر سنگِ مکرِ بد ما را مکوب
یا کریم العفو ستار العیوب — انتقام از ما مکش اندر ذنوب
آنچہ در کونست زاشیا و آنچہ هست — دانہ ہا جان را بهر حالت کہ هست
گر سگی کردیم ای شیر آفرین — [illegible]
آب خوش را صورت آتش مده — اندر آتش صورت آبی منه
از شراب قہر چون مستی دہی — نیست ہا را صورت ہستی دہی[۵۲]

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے مولانا نے دو فرشتوں کی دعا اور اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ اس کی دعا میں ربِ کریم سے اصحابِ انفاق کے لیے اجرِ عظیم اور ان کے مال میں خیر و برکت اور بخیلوں کے لیے تباہی و بربادی اور زیان و نقصان کی درخواست کی گئی ہے۔ یہاں صاحبِ انفاق سے مراد مجاہدِ راہِ حق ہے، نہ کہ نفسانی خواہشات پر چلنے والا مسرف۔ اس دعا کے سلسلے میں حضرت بحر العلوم کا کہنا ہے کہ بعض اہلِ تصوف کے نزدیک انسان میں موجود قوتِ ملکیہ ندا دیتی ہے اور یہ ندا ہر شخص میں ہر وقت ہوتی ہے، اسے صرف گوشِ دل ہی سے سنا جا سکتا ہے۔ اور انہی کے بقول، فرشتے کی یہ ندا عالمِ ملکوت ہی میں ہو گی، کیونکہ اگر اس دنیا میں ہوتی تو ہر کوئی اسے سن لیتا۔ اس ضمن میں انہوں

---

۵۲ کتاب مثنوی، ص ۳۲۰۔۳۲۱ — مثنوی معنوی، ص ۱/۱۳۰۵ — بحر العلوم، جلد ۱، ۸۲

نے حضرت جبرئیل کی مثال دی ہے کہ جب وہ انسانی شکل اختیار کر کے حضورؐ کے پاس آئے اور ایمان و اسلام کے بارے میں حضور اکرمؐ سے سوال کیا تو اس دنیا میں ہونے کی وجہ سے تمام حاضرین نے ان کی نداسن لی۔[۵۴]

گفت پیغمبرؐ کہ دایم بہر پند — دو فرشتہ خوش منادی می کند

کای خدایا منفقان را سیر دار — ہر درمشان را عوض دہ صد ہزار

ای خدایا ممسکان را درجہان — تو مدہ اِلّا زیان اندر زیان

ای خدایا منفقان را دہ خلف — ای خدایا ممسکان را دہ تلف

منفق و ممسک محل بین بہ بود — چون محلّ باشد موثر می شود[۵۵]

دفتر دوم میں ایک مفلس قیدی کی داستان بیان ہوئی ہے۔ اس کے آخر میں صانع حقیقی کی کاریگری کے ذیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ گویا اس کی ایجاد کا تعلق عدم اور نیستی سے ہے۔ اس بنا پر مولانا "نیستی" کی طرف مائل ہونے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ بقائے حق میں فنا ہو کر ابدیت و بقا حاصل ہو سکے۔ اسی تلقین یا خیال کے پیشِ نظر وہ خدا کی طرف رجوع کرتے اور مشغولِ دعا ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ دعا "فی المناجات" کے ۱۰،۱۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ شروع کے چند اشعار میں یہ دعا اپنے اصطلاحی معنوں میں نظر آتی ہے اور باقی اشعار میں اس لاثانی ولافانی کی بعض صناعیوں کا ذکر ہے۔

اس دعا میں خدائے پاک کو وحدہٗ لاشریک کہہ کر اس سے دست گیری کرنے، گناہوں سے درگزر فرمانے اور ایسی باتیں سکھانے کی عاجزانہ التجا کی گئی ہے، جو اس کی رحمت کے حصول کا سبب بن سکیں۔

---

۵۴ حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے (اور یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں آئی ہے) کہ ہم حضور اکرم کی خدمتِ اقدس میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص اُجلے سفید کپڑے پہنے (سیاہ بالوں والا) سرورِ کونینؐ کے پاس آیا اور حضورؐ کے زانو سے زانو ملا کر اور اپنی دونوں ہتھیلیاں حضورؐ کے زانو پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس پر نہ تو سفر کا کچھ اثر معلوم ہوتا تھا جو اُسے مسافر سمجھا جاتا اور نہ ہم میں سے کوئی اُسے پہچانتا ہی تھا۔ اس نے نبی کریمؐ سے اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں دریافت کیا جس کا حضور اکرمؐ نے جواب دیا۔ جب وہ آدمی چلا گیا تو فخرِ موجودات نے فرمایا: اے عمر تو جانتا ہے کہ یہ شخص کون تھا؟ میں کہ حیرت کے مارے چُپ تھا، بولا کہ خدا اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ یہ جبرئیل تھا تم لوگوں کو دین سکھانے آیا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتبِ احادیث)

۵۵ کتاب مثنوی، ص ۵۹ - بحر العلوم، ص ۱/۱۴۲ - مثنوی معنوی، ص ۱/۲۴۱

پھر توفیقِ خداوندی، جس کی بدولت انسان اللہ کے حضور ہاتھ پھیلا کر عفو و درگزر کی درخواست کرسکتا ہے، اجابتِ حق اور خدا کی غفاری و قہاری کا ذکر کر کے اپنی خطاؤں کی اصلاح کی گزارش کی گئی ہے، اس لیے کہ یہ بھی (اصلاح وغیرہ) اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔

ای خدای پاک بی انباز و یار — دست گیر و جرم ما را درگذار

یاد ده ما را سخنهای رقیق — که ترا رحم آورد آن ای رفیق

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو — ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

گر خطا گفتیم اصلاحش تو کن — مصلحی تو، ای تو سلطان سخن

کیمیا داری که تبدیلش کنی — گرچه جوی خون بود نیلش کنی

این چنین میناگریها کار تست — این چنیں اکسیرها ز اسرار تست[۵۶]

دفترِ دوم ہی میں دورِ حضرتِ موسیٰ کے ایک گڈریے کی مناجات بیان ہوئی ہے۔ اس مناجات میں جس سیدھے سادے انداز میں خدا کو مخاطب کیا گیا ہے، اس کی نظیر کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ مناجات ایک سادہ فطرت نادان انسان کی انتہائی سادگی لیکن محبوبِ حقیقی سے بے پناہ محبت، والہانہ شیفتگی اور اخلاص کی بڑی دلکش و جاذب تصویر پیش کرتی ہے۔

گڈریے کی اسی سادگی، بالفاظِ دیگر گستاخی نے حضرت موسیٰ کو برافروختہ کر دیا اور انھوں نے اُسے ڈانٹا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ پر عتاب نازل ہوا کہ تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا۔ ہم نے ہر کسی کو الگ الگ سیرت سے نوازا ہے۔ . . یہاں مولانا کو یہ بتانا مقصود تھا کہ ادیانِ عالم کی نسبت ملتِ عشق کا انداز بالکل جداگانہ ہے اور عشاق کو صرف اس محبوبِ حقیقی ہی سے سروکار رہتا ہے اور بس:

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جدا است — عاشقان را مذہب و ملت خدا است

اب ذرا گڈریے کی دعا و مناجات ملاحظہ ہو: اے خدا تو کہاں ہے، کس جگہ ہے کہ میں تیرا چاکر بنوں، تیرا جوتا سیئوں، تیرے سر میں کنگھی کروں۔ اے خدا میری جان تجھ پر فدا ہو، میرے بال بچے میرا سب خاندان تجھ پر قربان، تو کہاں ہے؟ کہ میں تیرے اُلجھے ہوئے بال سلجھاؤں اور تیرے جوتے کو

۵۶۔ کتاب مثنوی، ص ۱۲۳

ٹانکے لگاؤں، تیرے کپڑے دھوؤں، تیرے سر کی جوئیں ماروں، اے صاحب حشمت تیری خدمت میں دودھ پیش کروں۔ اگر تو بیمار پڑجائے تو میں دل وجان سے تیری تیمارداری کروں، تیرے پیارے پیارے ہاتھوں کو چوموں، تیرے سندر پاؤں دباؤں اور جب تجھے نیند آنے لگے تو تیرا بستر جھاڑ پونچھ کر صاف کروں۔ اگر مجھے تیرے گھر کا پتا چل جائے تو میں تیرے لیے دودھ اور گھی لے کر پہنچا کروں۔ صرف یہی نہیں بلکہ لذیذ و دلکش دہی کے مٹکے بھی ساتھ لایا کروں۔ یہ ساری اشیا تیار کر کے میں صبح و شام تیرے پاس لایا کروں، میرا کام لانا ہو اور تیرا کام کھانا۔ اے خدا میری تمام بکریاں تجھ پر قربان ہیں، تیری یاد میں سراپا آہ وزاری ہوں :

دید موسیٰ یک شبانی را براہ   کو ہمی گفت "ای خدا و ای اَلٰہ
تو کجائی تا شوم من چاکرت   چارقت دوزم کنم شانہ سرت
ای خدای من فدایت جان من   جملہ فرزندان وخان و مان من
تو کجائی تا سرت شانہ کنم   چارقت را دوزم و بخیہ زنم
جامہ ات شویم، شپشہایت کشم   شیر پیشت آورم ای محتشم
ور ترا بیماری آید بپیش   من ترا غمخوار باشم ہمچو خویش
دستکت بوسم، بمالم پایکت   وقت خواب آید، بروبم جایکت
گر ببینم خانہ ات را من دوام   روغن و شیرت بیارم صبح و شام
ہم پنیر و نان ہای روغنین   خمرہا چغرات ہای نازنین
سازم و آرم بپیشت صبح و شام   از من آوردن ز تو خوردن تمام
ای فدای تو ہمہ بزہای من   ای بیادت ہی ہی و ہیہای من[۵۵]

اسی دفتر میں ایک بیمار صحابی کی داستان میں دو دعائیں بیان ہوئی ہیں۔ پہلی دعا خود صحابیؓ کی ہے۔ جنھوں نے اس خوف سے کہ گناہ گاروں کو روزِ قیامت شدید عذاب ہوگا، خدا کے حضور یہ التجا کی کہ انھیں جو کچھ بھی عذاب ہونا ہے اسی دنیا میں ہوجائے تاکہ آخرت میں اس سے نجات مل جائے۔ ان کی اس التجا

---

۵۵ کتاب مثنوی، ص ۱۴۸

کے ضمن میں ان کی زبان سے ہاروت و ماروت کی مثال بیان کی گئی ہے، جو بقول ان کے عاقل و دانا تھے کہ انھوں نے عذابِ آخرت سے بچنے کے لیے اسی دنیا میں چاہِ بابل کی قید اختیار کرلی۔ ان صحابیؓ کے مطابق ان دونوں کا یہ فعل مناسب تھا، اور وہ اس لیے کہ آگ (عذابِ آخرت) کی نسبت دھوئیں (عذابِ دنیا) کی تکلیف کم ہوتی ہے۔ یہاں دونوں جہانوں کی تکلیف و عذاب کا موازنہ کرکے دنیا میں انسان پر وارد ہونے والی تکالیف کو عذابِ آخرت سے کہیں سہل اور قابلِ برداشت بتایا گیا اور ان لوگوں کو خوش بخت کہا گیا ہے جو اسی دنیا میں عبادات وغیرہ کی تکالیف اٹھا لیتے ہیں تاکہ عالمِ آخرت میں عذاب سے بچ جائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابی کی عیادت کے لیے تشریف لے جانے پر وہ اپنی اس دعا کا ذکر حضورؐ سے کرتے ہیں کہ میں نے محض آخرت کے عذاب سے بچنے اور وہاں ہر طرح کی فراغت پانے کی خاطر اس قسم کی دعا مسلسل کی جس کے نتیجے میں مجھے اس شدید بیماری نے آلیا . . . یہ دعا اس لحاظ سے عجیب بھی ہے اور اپنی نظیر آپ بھی، کہ شاید ہی کسی مسلمان نے عذابِ آخرت کے بدلے عذابِ دنیا کی خواہش کی ہو۔ البتہ ہر مسلمان عذابِ آخرت سے بچنے اور بخشش و مغفرت ہی کی دعا کرتا ہے۔ تو گویا یہ دعا ان صحابیؓ کے انتہائے خشیت و تقویٰ کی نشاندہی کرتی ہے:

ہمچو ہاروت و چو ماروت از حزن	آہ میکردم کہ "ای خلاقِ من"
از خطر ہاروت و ماروت آشکار	چاہ بابل را نمودند اختیار
تا عذابِ آخرت این جا کشند	گربزند و عاقل و ساحر وشند
نیک کردند و بجای خویش بود	سهلتر باشد ز آتش رنج دود
حد ندارد وصف رنج آن جہان	سہل باشد رنج دنیا پیش آن
ای خنک آن کو جہادی می کند	بر بدن زجری و دادی می کند
تا ز رنج آن جہانی وارہد	بر خود این رنج عبادت می نہد"
من ہمی گفتم کہ یا رب آن عذاب	ہم درین عالم بران بر من شتاب
تا در آن عالم فراغت باشدم	در چنین درخواست تا دم میزدم
این چنین رنجوریی پیدام شد	جان من از رنج بی آرام شد[۵۵]

۵۵ کتاب مثنوی، ص ۱۶۶

صحابیؓ کی اس دعا پر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا اور اس قسم کی دعا مانگنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ پھر ہادیٔ برحق نے ان صحابی کو جو دعا یاد فرمائی وہ قرآنی دعا اور گویا تمام دعاؤں کا نچوڑ ہے۔ یہ دعا قرآنِ کریم میں ایک مرتبہ آئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں مومنوں کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ بعضے آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری دیجیے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچائیے۔" (آیہ ۲۰۱) اس سے قبل کفار کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ صرف دنیا ہی کی بہتری کے خواہاں ہیں، جو انھیں ملے گی لیکن آخرت میں انھیں عذاب چکھنا ہوگا۔

مولانا نے یہ دعا معمولی سے لفظی اضافے کے ساتھ بیان کی ہے، تاہم اس کا مفہوم وہی ہے جو قرآنِ کریم کی دعا کا ہے۔ اس کے علاوہ حضور نبی کریمؐ کی زبانِ معجز بیان سے اللہ سے مشکلیں آسان اور راہِ ہدایت کی دشواریوں کو دور فرمانے اور ہمیشہ لطف و کرم سے نوازنے کی التجا بھی ان صحابی کو سکھائی گئی ہے:

گفت پیغمبرؐ مر آن بیمار را این بگو" کای سہل کن دشوار را
آتِنا فی دارِ دنیانا حَسَن آتِنا فی دارِ عقبانا حسن
راہ را برما چو بستان کن لطیف مقصد ما لطفِ خود کن ای شریف[۵۹]

ان صحابیؓ کی داستان کے دوران، جو چند قصوں سے بیان ہوئی ہے، شیخ بہلول اور ایک سائل کا قصہ مذکور ہوا ہے۔ شیخ بہلول نے خود کو دیوانہ ظاہر کر رکھا ہے، وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتے، لیکن کوئی شخص بعض مسائل کا حل جاننے کے لیے کسی نہ کسی بہانے انھیں گفتگو پر آمادہ کر لیتا ہے ... اس داستان کے دوسرے حصے میں مولانا نے ایک جگہ باطنی علم اور ظاہری علم و گفتار کی بحث چھیڑی اور اوّل الذکر کو بہتر قرار دیتے ہوئے اللہ جل جلالہٗ کو اس کا خریدار بتایا ہے۔ پھر اس علم کے طالب بننے کی تلقین کی ہے اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے خدائے بزرگ و برتر کے بے پایاں لطف و کرم اور بخشش و نوازش کا ذکر کر کے اس سے دست گیری فرمانے اور عیبوں سے درگزر فرمانے کی التجا کی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض ہوا، مولانا سب سے زیادہ نفسِ امارہ سے خوف زدہ ہیں، اس لیے جہاں بھی انھیں موقع ملتا ہے وہ انسان کے اس سب سے بڑے دشمن سے خلاصی و نجات کی خاطر اس ذوالجلال والاکرام کے حضور گڑگڑا

---

۵۹ کتاب مثنوی، ص ۲۸؛

گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں - چنانچہ یہاں بھی ان کی یہ التجا بھرپور اور رقت انگیز انداز میں نظر آتی ہے - انھوں نے اس نفسِ امارہ کی چیرہ دستیوں کو جس پُر درد انداز اور صرف دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے، اس سے اس کے انسان پر غلبے اور بالادستی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے - . . . نفسِ پلید کی چھُری ہڈیوں تک جا پہنچی ہے - انسان اس کے آگے بے بس ہے - وہ اس کے بندِ سخت میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے - صرف ربِ رحیم ہی اس سے نجات دلا سکتا ہے - مولانا نفس کی اس زبردست گرفت کو بڑے وزنی قفل سے تشبیہ دے کر اس ذاتِ اقدس سے التجا کرتے ہیں کہ اگر تیرا فضل و کرم ہمارے شاملِ حال نہ ہو تو اس قفلِ گراں کے کھلنے کی توقع ناممکن ہے - پھر وہ آیتِ قرآنی "نحن اقرب الیہ من حبل الورید"[۱۱۰] کے حوالے سے کہتے ہیں کہ چونکہ تو خود ہم سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے اس لیے ہم اپنی جانب سے تیری جانب رُخ کرتے ہیں - یہ نفسِ امارہ اپنی مکاریوں اور فریب کاریوں سے جس طرح انسان کو اس ذاتِ خداوندی سے دور رکھتا اور جس طرح انسان اس کے ہاتھوں بے بس ہوتا چلا جاتا ہے، اس صورتِ حال کو مولانا کمال بے چارگی سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اے خدا تیرے اس قدر نزدیک ہونے کے باوصف ہم تجھ سے دور ہیں - پھر وہ اس صورتِ حال کو تاریکی کے مشابہ قرار دے کر خدا سے ظلمت اسے دور کرنے اور روشنی سے نوازنے کی التجا کرتے اور اس بات کو دہراتے ہیں کہ یہ دعا تیری ہی تعلیم کردہ اور تیری ہی بخشش و عنایت ہے - آخر میں اس ضمن میں انھوں نے قرآنی تلمیح (آتشِ نمرود سے . . .) سے استفادہ کیا ہے:

یا رب این بخشش نہ حدِ کارِ ماست — لطفِ تو لطفِ خفی را خود سزاست

دستگیر از دستِ ما ما را بخر — پردہ را بردار و پردۂ ما مدر

باز خر ما را ازین نفسِ پلید — کاردش تا استخوانِ ما رسید

از چو ما بیچارگان این بند سخت — کہ گشاید جز تو ای سلطان بخت

این چنین قفلِ گران را ای ودود — کہ تواند جز کہ فضل تو گشود؟

ما ز خود سوی تو گردانیم سر — چون توی از ما بما نزدیک تر

با چنین نزدیکیی دوریم دور — در چنین تاریکیی بفرست نور

این دعا ہم بخشش و تعلیم تست — ورنہ در گلخن گلستان از چہ رست[۱۱۱]

---

[۱۱۰] سورۂ ق آیہ ۱۶ - اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

[۱۱۱] کتاب مثنوی، ص ۱۶۵، ۱۶۶

قومِ حضرت موسیٰؑ اور اس کی پشیمانی کی داستان بیان کرتے ہوئے ایک جگہ قوم کی زبانی حضرت موسیٰ کے خشم اور حلم کا تذکرہ چھیڑا گیا ہے۔ مولانا انہی دو لفظوں کا سہارا لے کر رحمتِ ایزدی کو پکارنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دعا کیا ہے، اپنی بے انتہا کوتاہیوں، لغزشوں اور بدعہدیوں وغیرہ کا اعتراف اور اس کے جواب میں اللہ جل شانہٗ کی رحمتِ بے پایاں اور بخششِ فراواں کا تذکرہ ہے۔ گویا اس طرح اس کی رحمت کو جوش میں لانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ مولا کریم نہ صرف انسانی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے بلکہ ہر طرح کی آزمائش اور رسوائی سے محفوظ رکھے اور تاکہ شیطان کو موقع نہ مل سکے کہ وہ اسے گمراہی کی طرف لے جائے۔ یہ ساری دعا ذاتِ خداوندی کے حضور انسان کے کمالِ خضوع، انتہائے عجز و بے چارگی اور حصولِ رحمتِ باری کی کوشش کی تصویر پیش کرتی ہے۔ دیکھنے میں سادہ الفاظ اور سیدھی سادی تشبیہات و ترکیبات، لیکن دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اپنے اندر ایک جہانِ تاثیر لیے ہوئے اور دعا کنندہ کے دردِ دروں اور فریاد و فغاں کے غماز ہیں۔

دعا کے شروع میں اپنی عہد شکنی اور خدائے بزرگ و برتر کے ایفائے عہد کا ذکر ہے۔ عہدِ خداوندی کو سیکڑوں پہاڑوں سے بھی مضبوط تر اور اپنے عہد کو تنکے کی طرح ہلکا پھلکا قرار دیا ہے جو ہلکی سی ہوا چلنے سے بھی اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے۔ پھر التجا ہوتی ہے: بارالٰہا: اپنی اس قدرت کے صدقے میں جو تجھے ہماری نیرنگیوں اور بوالعجبیوں پر ہے، ہم پر رحمت فرما، ہم اپنے آپ کو اور اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھ چکے، اب ہمیں مزید آزمائشوں میں نہ ڈال تاکہ تیرے لطف و کرم سے ہماری دیگر رسوائیوں پر پردہ ہی پڑا رہے۔ تیری ذاتِ اقدس کی بخشش و عنایت اور لطف و عطوفت بے حد و بے پایاں ہے تو ہماری ضلالت و کج روی کی کوئی حد نہیں۔ اے کریم! اپنے اس بے اندازہ کرم کو اس بے مایہ خاک کی مٹھی کی ان گنت اور بے شمار لغزشوں اور کوتاہیوں پر غالب و مسلط فرما۔ ہمارے لباسِ انسانی کا صرف ایک تار بچا رہ گیا ہے۔ ہم اگر شہر تھے تو اب صرف دیوار کی صورت باقی رہ گئے ہیں۔ یا سلطانِ عالمیاں! ہماری اس بچی ہوئی پونجی کو بچا لے، ایسا نہ ہو شیطان کو خوش ہونے کا موقع مل جائے، ہمارے لیے نہیں اپنے اس لطفِ قدیم کی خاطر جو بخشش کے لیے گناہ گاروں اور خطاکاروں کو تلاش کرتا ہے ہماری اس پونجی کی حفاظت فرما۔ ہم نیکیوں کی تمام قوتیں فنا کر چکے ان کے فقط آثار ہی باقی رہ گئے ہیں۔ ...

دفتر سوم میں عہدِ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک شخص کی داستان بیان ہوئی ہے جو شب و روز خدا کے حضور یہ دعا کرتا کہ اسے کسی محنت و مشقت کے بغیر حلال کی روزی نصیب ہو۔ یہ دعا چونکہ خود مولانا کی بجائے کسی دوسرے شخص کی ہے اس لیے اس میں اس خلوص، رقت، خشوع، احساسِ عجز و بے چارگی اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی فریاد و فغاں کی صورت نظر نہیں آتی جو مولانا کی اپنی دعا کا خاصہ ہے اور جسے پڑھ کر خود قاری پر مولانا کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھی ہاتھ اٹھا کر مولانا کے ساتھ دعا مانگنے میں شریک ہو جاتا ہے۔

مذکورہ دعا کنندہ اپنی کاہلی، سستی اور دیگر نااہلیوں اور کوتاہیوں کا ذمہ دار خدا کو ٹھہراتے ہوئے جس نے اُسے اس حالت میں پیدا کیا، خود کو ایک زخمی پیٹھ والا گدھا قرار دیتا ہے جس پر گھوڑوں اور اونٹوں والا بوجھ لادا نہیں جا سکتا۔ وہ بار بار اپنی کاہلی اور خدا کی بخشش و عنایت کا ذکر کرتا اور اپنی کاہلی کے حوالے سے روزی کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مختلف بہانوں اور مختلف مثالوں سے جوش میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خود کو زندگی بھر سائے میں سونے والا کاہل کہتا ہے جسے بخشش و لطف و عنایت کا سایہ میسر ہے۔ اس کے مطابق ذاتِ باری ایسے کاہلوں اور سایہ میں سونے والوں کو شاید کسی اور ڈھب سے روزی مہیا کرتی ہے۔ پھر وہ اس کے حضور التجا کرتا ہے کہ پاؤں والے تو خود ہی روزی تلاش کر لیتے ہیں، جن کے پاؤں نہیں ان پر رحم فرما۔ اس ضمن میں وہ بارش اور زمین کی مثال لاتا ہے۔ زمین کے پاؤں نہیں ہیں لیکن تیری رحمت تہ در تہ بادلوں کو اس کی طرف بھیجتی ہے جو بارش کی صورت میں اس کی تشنگی کو دور کر دیتے ہیں۔ دوسری مثال بچے اور ماں کی ہے۔ بچے کے پاؤں چل نہیں سکتے اس کے باوجود ماں کی وساطت سے اس تک روزی پہنچتی ہے۔ سو اے ربِ کریم! میں تو اچانک اور کسی تکلیف کے بغیر روزی کا خواہاں ہوں اس لیے کہ میرا تجھ سے اس طرح روزی مانگنا ہی میری کوشش اور جد و جہد ہے:

آن یکی در عہد داؤدِ نبی نزد ہر دانا و پیشِ ہر غبی
این دعا میکرد دایم کای خدا ثروتی بی رنج روزی کن مرا
چون مرا تو آفریدی کاہلی زخم خواری سست جنبی منبلی
بر خران پشت ریش بی مراد بارِ اسبان و اشتران نتوان نهاد

کاہلم چون آفریدی ای ملی	روزیم ده ہم ز راہِ کاہلی
کاہلم من سایہ خسپم در وجود	خفتم اندر سایۂ احسان وجود
کاہلان و سایہ خسپان را مگر	روزی بنہادہ ای نوعی دگر
ہر کہ راہ پا ہست جوید روزیی	ہر کہ را پا نیست کن دلسوزیی
رزق را می ران بسوی این حزین	ابر را باران بسوی ہر زمین
چون زمین را پا نباشد جودِ تو	ابر را راند بسوی او دُو تو
طفل را چون پا نباشد مادرش	آید و ریزد وظیفہ بر سرش
روزیی خواہم بنا گہ بی تعب	کہ ندارم من زکوشش جز طلب[۱۲۱]

دفترِ سوم ہی میں ایک برگزیدہ شخصیت دقوقیؒ اور ان کی کرامات وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ یہ داستان کئی حصوں میں بیان ہوئی ہے۔ ایک جگہ ان کا یہ واقعہ مذکور ہوا ہے کہ چند لوگ سمندر کے کنارے نماز پڑھنے اور دقوقی ان کی امامت کرانے میں مصروف ہیں۔ اچانک ایک کشتی بھنور میں پھنس کر ڈوبنے لگتی ہے اور اہلِ کشتی اپنے بچاؤ کے لیے زور زور سے رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس شور و فغان سے دقوقی کی توجہ ادھر پھر جاتی ہے۔ وہاں قیامت کا سماں ہوتا ہے۔ لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر دقوقی کے دل میں ان کے لیے رحم و شفقت کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے، اور وہ ان کی نجات کی خاطر حضورِ حق سراپا دعا بن جاتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں ادا کی گئی اس دعا میں دعا کنندہ کی رقت و خشوع کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ ہر چند یہ دعا بھی دوسرے آدمی کی زبان سے ادا ہوئی ہے لیکن موقع و محل ایسی ہی رقت و خضوع کا متقاضی تھا اور مولانا نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ دراصل جیسا کہ دعا کے الفاظ سے پتا چلتا ہے، شروع میں مولانا نے دقوقی کی زبان سے اہلِ کشتی ہی کے لیے دعا مانگی ہے لیکن بعد میں دعا کا انداز عمومی ہو گیا ہے اور مولانا اہلِ کشتی کے بہانے گویا ساری ملت کی طرف سے نجات و بخشش کے لیے دعا میں مصروف ہو گئے ہیں۔

اس دعا میں اللہ جلّ جلالہٗ کی ذاتِ اقدس کو اعلیٰ و عظیم کہہ کر اہلِ کشتی کے افعال و اعمال سے

---

[۱۲۱] کتاب مثنوی، ص ۴۲۰۔

درگزر اور اُن کی دست گیری فرمانے کی التجا کی گئی ہے۔ پھر گزارش ہوتی ہے کہ اے اللہ! یہ کائنات اور اس کی ہر شے تیری قدرت مطلقہ کے قبضے میں ہے انھیں بخیر و خوبی کنارے پر پہنچا دے۔ اپنی ازلی رحیمی و کریمی کے صدقے ان کی بُرائی اور بدخواہی پر نہ جا۔ تو نے ہماری لغزشوں اور خطاؤں کے باوصف ہمیں ہمارے حق سے زیادہ عطا فرمایا اور کسی معاوضے عوضانے کے بغیر ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ جس قدر تیری ذات صاحب عظمت و جلالت ہے۔ اسی قدر ہمارے گناہ عظیم و کثیر ہیں۔ ہماری نجات و بخشش تیرے ہی ہاتھ میں ہے . . . اس دعا میں بھی مولانا نے وقوقی کی زبان سے اس فلسفے کو دہرایا ہے کہ دعا کی تعلیم بھی خدا ہی نے دی ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم نے حرص اور لالچ کی آگ میں خود کو جلا ڈالا ہے، اور یہ جو ہم تیرے حضور ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں تو یہ طریقہ بھی تو نے ہی ہمیں بتایا ہے، اسی تعلیم دعا کے صدقے میں، جس کی بنا پر تاریکیاں چھٹ گئیں اور روشنیاں پھیل گئیں، ہماری دست گیری اور رہنمائی فرما اور ہمارے گناہ معاف اور ہماری مشکلیں آسان فرما دے۔

چھٹے دفتر میں کسی طالب گنج فقیر کی داستان بیان ہوئی ہے، جسے اپنی بے صبری اور تعجیل کے سبب ندامت و پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس داستان کے ایک حصے میں ایک فقیر کی مختصر سی دعا دی گئی ہے کہ میں اپنی اس عجلت سے توبہ کرتا ہوں اور چونکہ تیری ہی ذاتِ اقدس نے در بند کیا ہے تو تو ہی اب کُھلے دا فرما۔ پھر انسان کے آلودۂ ماسوا ہونے، دعا کرنے میں بے ہنر اور اپنے خطاکار و گناہ گار ہونے وغیرہ کا اعتراف ہے۔ رات کے وقت نیند کے غلبے سے، جسے موت کے مشابہ قرار دیا گیا ہے، انسان کی جو حالت ہوتی ہے مولانا اسے مختلف تمثیلات و تشبیہات سے واضح کرتے ہیں۔ پھر رات اور دن کی آمد کے منظر کی نہایت دلکش تصویر کشی کرتے ہوئے انھوں نے سحر کے وقت خدائے بزرگ و برتر کے حضور انسانوں کی دعا و مناجات اور تسبیح و تہلیل کا ذکر کیا ہے۔ شب علامت ہے آفات و ظلمات کی۔ شب کو نہنگ آسمانی کہہ کر گویا اس کی ہولناکی ظاہر کی ہے۔ آفات سے نجات کے سلسلے میں مولانا رومی نے حضرت یونس علیہ السلام کی قرآنی تلمیح سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ سحر طلوع ہونے پر ہر کوئی اللہ کے حضور دست بدعا ہوتا اور اس کے رحم و کرم کی بھیک مانگتا ہے، چشم تیز، گوشِ باز (کھلے کان) اور جسم سُبک کی تمنا کرتا ہے تاکہ ان کی بدولت وہ کفر و ضلالت اور آفات و ظلمات کی چیرہ دستیوں سے خود کو محفوظ رکھ سکے، اور ظاہر ہے ان حالات میں صرف اسی ذاتِ باری کا دامنِ رحمت تھامنے سے انسان کی نجات ممکن ہے۔

مولانا بار بار دیدۂ بینا کی دعا کرتے ہیں تاکہ اس کی بدولت گناہ اور ثواب، اور خوب اور بد کی پہچان ہو سکے۔ اس ضمن میں مولانا نے پھر ایک قرآنی تلمیح (ساحران دربار فرعون اور حضرت موسیٰ سے متعلق) پیش کی ہے۔ ساحروں نے دربار فرعون میں حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھا تو ہر قسم کے خوف سے بے پروا ہو کر یہ کہہ دیا تھا کہ ہم رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لائے۔ مولانا کا استدلال یہ ہے کہ رب جلیل کی طرف سے دیدۂ بینا عطا ہونے پر انھیں یہ مقام حاصل ہوا ورنہ اس سے قبل وہ گویا اندھے تھے۔ یہ کہہ کر مولانا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا ذکر اور بگڑی بنانے کی دعا کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ دو ایک دعاؤں میں حضرت آدم کی توبہ کا حوالہ دے آئے ہیں، یہاں پھر کہتے ہیں کہ یہ دعا بھی خود خدا ہی نے انسان کو اول آفرینش سے سکھائی ہے ورنہ اس خاکی و فانی کی کیا مجال جو اس ذات گرامی سے یوں مخاطب ہو سکتا — وہ رحمت خداوندی کو جوش میں لانے کے لیے اس دعا کو "تیری اپنی دعا" کہہ کر اُسے قبول فرمانے کی التجا کرتے ہیں:

ہر یکی گوید بہنگام سحر — چون ز بطن حوت شب آید بدر
کای کریمی کاندر این لیل وحش — گنج رحمت بنہی و چندین چشش
چشم تیز و گوش بازو تن سبک — از شب ہمچون نہنگ ذوالحبک
از مقامات وحش روزین سپس — ہیچ نگریزیم ما با چون تو کس
ما نمی خواہیم غیر از دیدۂ — دیدۂ تیزی، گشتی، بگزیدۂ
بعد ازین ما دیدہ خواہیم از تو بس — تا نپوشد بحر را خاشاک و خس
ساحران را چشم چون رست از عمی — کف زنان بودند بی این دست و پا
ای بکردہ یار ہر اغیار را — ای بدادہ خلعت گل خار را
خاک ما را ثانیاً پالیز کن — ہیچ نی را بار دیگر چیز کن
این دعا تو امر کردی ز ابتدا — ورنہ خاکی را چہ زہرۂ این ندا
چون دعا مان امر کردی ای عجاب — این دعای خویش را کن مستجاب

مثنوی رومی میں بعض دیگر مقامات پر بھی چند دعائیں بیان ہوئی ہیں جو بڑی عمدہ ہیں ۔

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عَنْ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ يَقُولُ إِنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ أَبِي سَلَمَةَ يَقُولُ كُنْتُ غُلَامًا فِي حِجْرِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ يَدِي تَطِيشُ فِي الصَّحْفَةِ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِينِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ، فَمَا زَالَتْ تِلْكَ طِعْمَتِي بَعْدُ۔

(صحیح بخاری، جلد ثانی۔ کتاب الاطعمۃ، باب التسمیۃ علی الطعام والاکل بالیمین)

وہب بن کیسان کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمر بن ابی سلمہ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ میں (عالمِ طفلی میں) رسول اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زیر تربیت تھا کہ (ایک مرتبہ آپ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے) میرا ہاتھ پیالے کے (اندر کے کناروں میں) گھومنے لگا۔ (میری یہ حرکت دیکھ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے لڑکے! (کھانا کھاتے وقت) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھو، اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور وہ کھاؤ جو تمھارے آگے ہے۔" (عمر بن ابی سلمہ کہتے ہیں) اس کے بعد کھانے کے بارے میں میری ہمیشہ یہی عادت رہی۔

حضرت وہب بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں اور حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ صحابی۔ یعنی تابعی نے صحابی سے وہ واقعہ بیان کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھاتے وقت انھیں پیش آیا۔

کھانے پینے کے وہ آداب حدیث کی تمام کتابوں میں موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو باقاعدہ سکھائے۔ ان آداب میں تین آداب اس حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہیے۔

دوسرے دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے۔

تیسرے اپنے آگے سے کھانا چاہیے، سارے برتن میں ہاتھ نہیں چلانا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں لوگوں کو اتباعِ دین کی تعلیم دی ہے اور انھیں اللہ کی عبادت

کے طریقے سکھائے ہیں، وہاں معاشرتی آداب اور مجلسی اصول بھی وضاحت سے بتلائے ہیں، اور انھیں دین کا لازمی اور ضروری حصہ قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کے تمام احکام وہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اس کا کوئی حکم دائرۂ فطرت سے باہر نہیں اور ایسا نہیں جس کو ماننے سے انسانی ذہن اِبا کر سکے۔

اسی حدیث میں دیکھیے کہ حضور نے نہایت صراحت سے جن تین چیزوں کا حکم فرمایا ہے، ان پر عمل کرنا کتنا ضروری ہے اور یہ چیزیں انسانی فطرت سے کس درجے ہم آہنگ ہیں۔

انسان دن میں کم از کم دو دفعہ کھانا کھاتا ہے۔ کھانے میں وہ بعض دفعہ تنہا بھی ہوتا ہے اور بعض دفعہ کسی کے ساتھ بھی۔ لیکن ان آداب کا تعلق دونوں صورتوں سے ہے۔!!

اس حدیث مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بے مثال جلالت و عظمت کے باوجود خادم یا بچے کو بھی کھانے میں شریک فرماتے تھے اور اس کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے، جو خود کھاتے، وہی اس کو کھلاتے۔

اس عالمِ آب و گل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا نہ کوئی شخص پیدا ہوا، نہ پیدا ہوگا، لیکن آپ کی مہربانیوں اور رافتوں کا شامیانہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ سب اس سے سعادت اندوز ہوتے تھے۔ بوڑھے، جوان اور بچے اس سے برابر فائدہ اٹھانے کا شرف حاصل کرتے تھے۔

اس حدیث کے مطلب کی وسعت میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں، کاش انھیں سمجھنے اور پھر ان پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

نقد و نظر

پاکستانی اہلِ قلم کی ڈائریکٹری

باہتمام :- اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد
نگرانِ اعلیٰ :- مسیح الدین احمد صدیقی، ڈائریکٹر جنرل اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
مرتبہ :- فرید احمد ___ حسن عباس رضا

صفحات ۴۹۶ - کتابت، کاغذ، طباعت عمدہ - مجلد مع سرورق - قیمت درج نہیں -

اہلِ قلم جو ملک و قوم کو بہترین افکار و خیالات سے مالامال کرتے اور ان کی ذہنی اور فکری جلا کا باعث بنتے ہیں، ہمیشہ عدم التفاتی کا شکار رہے ہیں - حالاں کہ ملک و قوم کے ہر حصے میں ان کو ایک عظیم الشان اور رفیع المرتبت متاع کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے - جو لوگ ان سے استفادہ کرتے ہیں، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ بھی ان کے ضروری کوائف اور علمی سرگرمیوں سے آگاہ نہیں ہوتے -

اہلِ قلم ہر موضوع سے متعلق اظہارِ رائے کرتے اور ہر مسئلے کو نظر و بصر کا ہدف ٹھہراتے ہیں، اُن کے حالات اور تحقیقی مساعی سے واقفیت بڑی ضروری ہے - اس سلسلے میں اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے "پاکستانی اہلِ قلم کی ڈائریکٹری" شائع کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہے - اس ڈائریکٹری میں حروفِ تہجی کی ترتیب سے اہلِ قلم کے نام، سن پیدائش، پیشہ، تحریر کی زبان، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں، مکمل پتے وغیرہ تحریر کیے گئے ہیں - اکادمی کے نگرانِ اعلیٰ جناب مسیح الدین احمد صدیقی صاحب کو اس بات کا احساس ہے کہ "ڈائریکٹری میں ابھی بڑی کوتاہیاں آپ کو نظر آئیں گی" لیکن اس کے باوجود یہ بہت بڑا کام ہے جو انھوں نے پہلی مرتبہ کر دکھایا ہے - آئندہ کے لیے صدیقی صاحب ممدوح یہ عزم کیے ہوئے ہیں کہ "نئی ڈائریکٹری کی ترتیب تک یہ کوتاہیاں بڑی حد تک دور کر دی جائیں گی" ___ بہرحال اس اہم خدمت پر ہم اکادمی اور اس کے نگرانِ اعلیٰ جناب مسیح الدین احمد صدیقی صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اہلِ قلم سے درخواست کرتے ہیں کہ نئی ڈائریکٹری کی ترتیب میں وہ اُن سے تعاون کریں اور اپنے علمی و تصنیفی کوائف سے انھیں مطلع فرمائیں -

علمی رسائل کے مضامین

البلاغ، بمبئی - اکتوبر ۱۹۷۹

مطالعات وتعلیقات	قاضی اطہر مبارک پوری
مکتوب قاہرہ	مولانا خالد کمال مبارک پوری
زائرین حرمین	قاضی اطہر مبارک پوری
میری طالب علمی - پہلا مضمون اور پہلی نظم	قاضی اطہر مبارک پوری
افغانستان میں برسرِ پیکار علما	مولوی سید نصیب علی شاہ بخاری

ترجمان القرآن، لاہور - اکتوبر ۱۹۷۹

اجماعِ امت اور قانون سازی میں اس کی حیثیت	طیب شاہین لودھی
زکوٰۃ و صدقات کے اوزان و مقدار	ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی
قرآن میں ہامان کا ذکر اور مستشرقین کے اعتراضات	سید شبیر محمد سبزواری
مغربی تہذیب کا بحران	جناب ریاض الحسن نوری

الفرقان، لکھنؤ - ستمبر ۱۹۷۹

بقیۃ السلف، مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی	مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی
"تحریک خلافت" — میری نظر میں	مولانا عتیق الرحمن قاسمی بستوی

معارف، اعظم گڑھ - اکتوبر ۱۹۷۹

مطالعہ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کے مبادیات (مسلسل)	مولانا اخلاق حسین دہلوی
راجہ جے سنگھ کی رصد گاہیں	جناب شبیر احمد خاں غوری
امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری (مسلسل)	سید صباح الدین عبدالرحمن
امام ربیع بن سلیمان مرادی	حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی